میری کہانی
جواہر لعل نہرو

فہرست مضامین

پہلی بات:

یہ ساری کتاب میں نے جون ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء تک جیل میں لکھی تھی۔ اب سوا اس کے کہ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ بدلا، یا جو باتیں بعد میں کہنے کی تھیں انھیں ایک الگ باب میں لکھ دیا، اور کچھ گھٹایا بڑھایا نہیں۔ اس کے لکھنے میں اصل میں دو چیزیں میرے سامنے تھیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے لیے کوئی خاص کام ٹھہرا لوں اور اسی میں لگا رہوں، کیونکہ بے اس کے جیل میں تنہائی کے پہاڑ سے دن کاٹے نہیں کٹتے، دوسرے یہ کہ ان واقعات کا جائزہ لے ڈالوں جو ہندوستان میں پچھلے زمانے میں پیش آئے اور جن سے مجھے بھی تعلق رہا، تاکہ انھیں صاف اور سلجھی ہوئی نظر سے دیکھ سکوں۔ میں نے یہ کام اس طرح شروع کیا جیسے کوئی اپنے آپ سے اپنے دل کی باتیں کھود کھود کر پوچھتا ہے اور یہی رنگ بڑی حد تک ساری کتاب قائم رہا۔ اس کے لکھنے میں میں نے کوئی خاص اہتمام پڑھنے والوں کا لحاظ رکھ کر نہیں کیا۔ اگر مجھے پڑھنے والوں کا دھیان آیا بھی تو صرف اپنے دیس کے مردوں اور عورتوں کا۔ غیر ملکیوں کے لیے لکھنا ہوتا تو شاید میں اور طرح لکھتا یا اور چیزوں پر زور دیتا۔ اس صورت میں بعض باتوں کو جن کا یہاں رواداری میں ذکر کر دیا ہے زیادہ صراحت سے بیان کرتا اور بعض کو جنھیں یہاں تفصیل سے لکھا ہے محض سرسری طور پر لکھتا۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کے باہر کے لوگوں کو ان چیزوں سے جو تفصیل سے لکھی گئی ہیں دلچسپی نہ ہو ان کے نزدیک یہ معمولی یا ایسی کھلی ہوئی باتیں ہوں جن میں بحث کی گنجائش نہیں مگر میرے خیال میں آج کل کے ہندوستانیوں کے لیے یہ کسی قدر اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح شاید ہمارے ملک کے بعض سیاسی معاملات اور بعض اشخاص کا ذکر بھی باہر والوں کے لیے دلچسپی سے خالی ہوگا۔

امید ہے کہ پڑھنے والے اس بات کا لحاظ رکھیں گے کہ یہ کتاب ایسے زمانے میں لکھی گئی جو میری زندگی میں بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ اس کا اثر کتاب میں صاف

نظر آتا ہے۔ اگر میں معمول کی حالت میں لکھتا تو تحریر کا رنگ کچھ اور ہوتا اور میں بعض موقعوں پر زیادہ ضبط سے کام لیتا۔ مگر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ جیسی ہے ویسی ہی رہنے دوں کیونکہ شائد لوگوں کے لیے وہی شکل زیادہ دلچسپ ہو جس سے وہ جذبات ظاہر ہوتے ہیں جو لکھتے وقت میرے تھے۔

میں نے صرف یہ کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے ذہن کی نشوونما دکھاؤں۔ ہندوستان کی پچھلے زمانے کی تاریخ لکھنا مقصود نہیں دیکھنے میں یہ کتاب تاریخ سی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس سے پڑھنے والوں کو غلط فہمی ہو اور وہ اسے اتنی اہمیت دیں جس کی یہ مستحق نہیں۔ اس لیے میں یہ جتائے دیتا ہوں کہ اس میں بات کا صرف ایک ہی پہلو دکھایا گیا ہے اور وہ لازمی طور پر شخصی اور ذاتی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ بہت سے اہم واقعات کا اور بہت سے اشخاص کا، جنھوں نے واقعات پر اثر ڈالا ذکر تک نہیں ہے۔ اگر یہ سچ مچ تاریخ ہوتی تو یہ طریقہ سخت قابل اعتراض تھا لیکن یہ تاریخ نہیں آپ بیتی ہے اس لیے اتنی رعایت کی ضرور مستحق ہے۔ جو لوگ پچھلے دنوں کے واقعات کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انھیں اور ٹھکانے ڈھونڈنے پڑیں گے۔ وہاں یہ ہوسکتا ہے کہ انھیں اس کتاب سے اور اس قسم کی اور آپ بیتیوں سے تاریخ کی کڑیاں ملانے میں اور واقعات کی لڑیاں پرونے میں مدد ملے۔

میں نے اپنے بعض رفیقوں کے متعلق، جن کے ساتھ میں برسوں سے کام کر رہا ہوں اور جو مجھے دل سے عزیز ہیں، آزادی سے اظہار رائے کیا ہے۔ میں نے جماعتوں اور شخصوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور اس میں بعض جگہ سختی سے کام لیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو لوگ قومی معاملات میں قدم رکھتے ہیں انھیں ایک دوسرے سے، اور قوم سے جس کی خدمت کا یہ دعویٰ کرتے ہیں، صاف گوئی برتنی چاہیے۔ آپس میں ظاہرداری کا برتاؤ کرنے سے، ٹیڑھے سوالوں کو ٹال جانے سے نہ تو ہم

ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان معاملات کو جو ہمیں درپیش ہیں۔
سچے اتحاد عمل کی بنیاد اس پر ہونی چاہیے کہ جن باتوں میں ہم میں اتفاق ہے اور جن میں اختلاف ہے ان سب کو اچھی طرح جان لیں اور واقعات کو چاہے وہ کتنے ہی بے ڈھب ہوں آنکھ سے آنکھ ملا کر دیکھیں۔ مگر اپنے نزدیک میں نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس میں کسی شخص سے بیر یا جلن کی جھلک پائی جاتی ہو۔

میں نے جان بوجھ کر ہندوستان کے آج کل کے معاملات کو نہیں چھیڑا ہاں کہیں کہیں اور باتوں کے ذیل میں سرسری طور پر ان کا ذکر آ گیا ہے۔ جیل میں اس کا موقع نہ تھا کہ ان معاملات کی چھان بین کر کے ان سے پوری طرح بحث کر سکوں یہاں تک کہ میں خود اپنے دل میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان سے کس طرح نبٹنا چاہیے۔ رہائی کے بعد بھی میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھوں کیونکہ یہ کتاب کے مضمون کے ساتھ کھپتا نہیں تھا، غرض یہ آپ بیتی پچھلے زمانے کے واقعات کا ایک شخصی، سرسری اور ادھورا بیان ہے جو موجودہ زمانے کے لگ بھگ آ پہنچا ہے مگر اسے چھونے سے احتیاط کے ساتھ دامن بچائے ہوئے ہے۔

جواہر لال نہرو

باون وائلر

۲ جنوری ۳۶ء

خاندان کا کشمیر سے آنا

اپنے حالات آپ لکھنا بڑا مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ اگر
انسان اپنی برائی کرے تو اپنا دل دکھتا ہے اور تعریف کرے تو پڑھنے
والوں کو برا لگتا ہے۔

(ابراہم کاؤلے)

خوش حال ماں باپ کا اکلوتا بچہ، خصوصاً ہندوستان کے گھرانوں میں اکثر لاڈ
پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے۔ اور جب گیارہ برس کی عمر تک اس کے کوئی بھائی بہن نہ
ہو، پھر تو وہ بگڑنے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ میری دونوں بہنیں مجھ سے بہت چھوٹی ہیں
اور ان میں بھی کئی سال کا فرق ہے۔ اس لیے میرا بچپن تنہائی میں گذرا اور مجھے اپنی
عمر کا کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اسکول کے بچوں کی صحبت سے بھی محروم رہا،
کیونکہ مجھے کنڈر گارٹن یا کسی اور مکتب میں داخل نہیں کیا گیا بلکہ گھر پر استانیاں اور
اتالیق رکھ کر تعلیم دلائی گئی۔

ہمارے گھر میں تنہائی نہیں بلکہ خوب چہل پہل تھی۔ میرے رشتے کے بھائی
بہن اور قریبی عزیز ملا کر بہت بڑا کنبہ تھا۔ اور یہ سب ہندوستان کے دستور کے
مطابق ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ مگر میرے بھائی مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔
ان میں کچھ اسکول میں اور کچھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور مجھے بچہ سمجھ کر اپنے کام
میں اور کھیل میں شریک نہیں کرتے تھے۔ غرض میں اتنے بڑے گھرانے میں اپنے
آپ کو بالکل اکیلا پاتا تھا اور زیادہ تر اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا یا کہیں الگ بیٹھ
کر کھیلا کرتا تھا۔

ہم لوگوں کو اصلی وطن کشمیر ہے۔ اب سے کوئی سوا دو سو برس پہلے، اٹھارہویں
صدی کے شروع میں، ہمارے پردادا کے باپ کشمیر کی پہاڑی وادی کو چھوڑ کر دولت
اور شہرت کی تلاش میں نیچے زرخیز میدان میں آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اورنگ زیب

کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔فرخ سیر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ ہمارے بزرگ جن کا نام راج کول تھا کشمیر میں سنسکرت اور فارسی کے عالم کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ جب فرخ سیر کشمیر گیا تو اس کی نظر عنایت راج کول پر پڑی اور غالباً اسی کے حکم سے وہ ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ترک وطن کر کے دلی آ گئے۔بادشاہ نے انھیں جاگیر عطا کی جس میں ایک مکان بھی تھا۔ یہ مکان نہر کے کنارے واقع تھا جس کی وجہ سے راج کول نہرو کہلانے لگے۔اب خاندان کا نام ”کول“ کی جگہ ”کول نہرو“ قرار پایا۔آگے چل کر کول تو اڑ گیا اور صرف نہرو باقی رہ گیا۔

اس کے بعد جو بدامنی کا زمانہ آیا اس میں ہمارے خاندان کو تقدیر نے بہت سے نشیب وفراز دکھائے۔ ہماری جاگیر گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہوگئی۔میرے پردادا لکشمی نراین نہرو نے ”سرکار کمپنی“ کی ملازمت اختیار کی اور اس کی طرف سے دلی کے برائے نام وکیل بنا کر بھیجے گئے۔میرے دادا گنگا دھر نہرو ۱۸۵۷ء کی شورش سے پہلے، کچھ دن دلی کے کوتوال رہے تھے۔۱۸۶۱ء میں ۳۴ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہم لوگوں سے دلی ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی اور ہمارے پرانے خاندانی کاغذات اور دستاویز بھی اسی گڑبڑ میں تلف ہوگئیں۔ ہمارا خاندان اپنی ساری املاک کھو کر اور بہت سے لوگوں کی طرح جو دلی کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، آگرے پہنچا۔میرے والد اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے مگر میرے دونوں چچا خاصے جوان تھے۔ ان کو تھوڑی بہت انگریزی بھی آتی تھی۔جس کی بدولت چھوٹے بھائی نے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان والوں کو ناگہانی اور ذلت کی موت سے بچالیا۔وہ چند عزیزوں کے ساتھ، جن میں ان کی ننھی سی بہن بھی تھی دلی سے جا رہے تھے یہ لڑکی بعض کشمیری بچوں کی طرح بہت صاف رنگ کی تھی۔

رستے میں کچھ گورے ملے جنھیں شبہ ہوا کہ یہ کسی انگریز کی لڑکی ہے جسے میرے چچا چرا کر لئے جا رہے ہیں۔ ان دنوں الزام لگانا، سرسری تحقیقات کرنا اور سزا دینا یہ سارے مرحلے چند منٹ میں طے ہو جاتے تھے اور کچھ تعجب نہیں تھا کہ میرے چچا اور دوسرے عزیزوں کو سب سے قریب کے درخت پر پھانسی دے دی جاتی۔ مگر خوش قسمتی سے چچا جان کی انگریزدانی کام آ گئی اور تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ اتنے میں کوئی شخص جو ان لوگوں سے واقف تھا ادھر سے گزرا اور اس نے انھیں رہائی دلائی۔

چند سال ہمارا خاندان آگرے میں رہا اور اسی شہر میں ۶ مئی ۱۸۶۱ء (۱) کو میرے والد پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے تین مہینے پہلے دادا جان کا انتقال ہو چکا تھا ان کی ایک قلمی تصویر ہمارے یہاں اب تک موجود ہے۔ وہ مغل دربار کا لباس پہنے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک خمدار تلوار ہے۔ ان کا چہرہ مہرہ بالکل کشمیری ہے پھر بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی مغل امیر کی تصویر ہے۔ اب خاندان کی پرورش کا بوجھ میرے دونوں چچاؤں پر پڑا جو عمر میں والد سے بہت بڑے تھے۔ بڑے چچا بنسی دھر نہرو حکومت برطانیہ کے محکمہ عدالت میں نوکر ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتے رہے اور ان کا تعلق ایک حد تک خاندان سے قطع ہو گیا۔ چھوٹے چچا نند لال نہرو نے ایک ہندوستانی ریاست کی ملازمت اختیار کی اور دس برس تک رجپوتے تانے کی ریاست کھیتری میں دیوان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے قانون سیکھا او آگرے میں وکالت کرنے لگے۔

میرے والد نے انھیں کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور ان کے تعلقات میں برادرانہ لفت نے باپ بیٹے کی سی محبت کے ساتھ مل کر ایک عجیب شان پید کر دی تھی۔ والد اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے طاہر ہے کہ وہ اپنی ماں کے لاڈلے تھے۔ دادی جان اپنے ارادے کی پکی تھیں اور مجال نہ تھی کہ کوئی ان کی بات کو ٹال دے۔ ان کی

وفات کی پچاس برس ہو گئے مگر ابھی تک بوڑھی کشمیری خواتین ان کا ذکر کرتی ہیں کہ وہ بڑے طنطنے کی بی بی تھیں اور اگر کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہو تو آفت مچا دیتی تھیں۔

میرے چچا ہائی کورٹ میں جو نیا نیا قائم ہوا تھا، وکالت کرنے لگے اور جب وہ آگرے سے الہ آباد منتقل ہوا تو ہمارا خاندان بھی وہیں چلا گیا۔ اس وقت سے الہ آباد ہمارا وطن ہو گیا ہے۔ اسی شہر میں مدت کے بعد میں پیدا ہوا۔ میرے چچا کا کام رفتہ رفتہ بہت بڑھ گیا اور ان کا شمار ہائی کورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ اس عرصے میں میرے والد کانپور اور الہ آباد میں اسکول اور کالج کی تعلیم کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے صرف عربی فارسی پڑھی اور انگریزی کہیں بارہ چودہ برس کی عمر میں جا کر شروع کی۔ اس کم سنی میں وہ فارسی کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے مگر اسکول اور کالج کے زمانے میں ان کی شہرت زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے تھی۔ وہ کوئی قابل تقلید طالب علم نہ تھے۔ پڑھنے لکھنے سے زیادہ انھیں سمجھے جاتے تھے انھیں مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا بہت شوق تھا حالانکہ اس وقت تک کلکتہ بمبئی جیسے شہروں کے سوا اور جگہ ہندوستان میں ان چیزوں کا رواج بہت ہی کم تھا۔ ان کی شوخیوں کے باوجود انگریز پروفیسر ان پر مہربان تھے اور اکثر مشکلوں میں ان کی مدد کرتے تھے جن میں وہ اپنی شرارت کی وجہ سے پھنس جاتے تھے۔ ان میں سے ایک میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پرنسپل مسٹر ہیری سن بھی تھے۔ ان کا ذکر میرے والد آخر عمر میں ہم لوگوں کے سامنے بڑی محبت سے کیا کرتے تھے اور اپنی طالب علمی کی زمانے کا ایک خط جو ان بزرگ نے انہیں لکھا تھا، انہوں نے بڑی احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔

یونیورسٹی کے ابتدائی امتحانوں میں انہوں نے کوئی خاص امتیاز تو حاصل نہیں کیا مگر پاس ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ بی۔ اے کے امتحان کی نوبت آئی۔ اس

کے لئے انہوں نے بہت کم محنت کی تھی اور پہلے پرچے کے جواب جو انہوں نے دئے ان کے خیال میں بالکل نا قابل اطمینان تھے۔ یہ سمجھ کر کہ پہلا پرچہ بگڑ گیا ہے وہ کامیابی سے مایوس ہو گئے اور امتحان چھوڑ چھاڑ تاج محل کی سیر کرنے لگے۔ (ان دنوں یونیورسٹی کے امتحان آگرے میں ہوتے تھے) بعد میں ان کے پروفیسر نے انہیں بلا کر بہت ڈانٹا اور کہا کہ تمہارا پہلا پرچہ اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ تم نے سخت حماقت کی، کہ دوسرے پرچوں میں شریک نہیں ہوئے۔ بہر حال میرے والد کی یونیورسٹی کی تعلیم یہیں ختم ہو گئی۔ بی۔ اے انہوں نے پاس نہیں کیا۔

ان کے دل میں ترقی کی امنگ تھی اور وہ کوئی علمی پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نظر قانون کے پیشے پر پڑی کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں یہی ایک پیشہ تھا جس میں قابل آدمی کھپ سکتے تھے اور جسے اس میں کامیابی حاصل ہو جائے، اس کے پو بارے تھے۔ پھر ان کے سامنے بھائی کی مثال بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا اور اس میں اول نمبر پر پاس ہو کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اب انہیں اپنی پسند کا کام مل گیا یا یوں کہئے کہ جو کام ایک بار اختیار کر لیا اس میں کامیابی حاصل کرنے پر تل گئے۔

انہوں نے کانپور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کر دی۔ ترقی کی دھن میں انہوں نے خوب محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں ان ک کام چل نکلا مگر کھیل تماشوں کے شوق کا وہی حال تھا اور اب بھی ان کا تھوڑا بہت وقت اس میں صرف ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپی انہیں کشتی سے تھی۔ کانپور کے دنگل اس زمانے میں مشہور تھے۔

کانپور میں تین سال کام سیکھنے کے بعد وہ الہ آباد آ گئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان کے بھائی پنڈت نندلال نہرو کا یکا یک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ میرے والد کے لئے بہت سخت تھا۔ ایک طرف تو یہ غم

کہ وہ پیارا بھائی جس نے بیٹے کی طرح پالا تھا جد ہو گیا دوسری طرف یہ فکر کہ خاندان کا سردار اور سب سے زیادہ کمانے والا فرد اٹھ گیا۔ اس دن سے ایک بہت بڑے کنبے کی پرورش کا بہت سا بوجھ اس کم عمری میں میرے ولد پر پڑ گیا۔

انہوں نے دل میں ٹھان لی کہ وکالت میں کامیابی حاصل کر کے رہیں گے، اور کئی مہینے تک اور سب کچھ چھوڑ کر اسی میں محو رہے۔ چچا کے قریب قریب کل مقدمے انہیں کو ملے اور چونکہ انہوں نے اس کام کو بڑی عمدگی سے انجام دیا اس لئے ان کی وکالت خوب چمکی اور وہ بات جس کی انہیں دلی تمنا تھی حاصل ہو گئی۔ یعنی انہیں کام بھی زیادہ ملنے لگا اور آمدنی بھی بڑھ گئی۔ نوجوانی میں کامیاب وکیل ہو جانے کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ ان کے محبوب پیشے نے جسے اپنی محبت میں شرکت گوارا نہیں ان کی سار زندگی پر قبضہ کر لیا۔ انہیں اور کسی ذاتی یا قومی کام کا وقت ہی نہیں ملتا تھا اور چھوٹی بڑی تعطیلوں کا زمانہ بھی وکالت ہی کی نذر ہو جاتا تھا۔ انہیں دونوں نیشنل کانگرس انگریزی جاننے والے اور اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میرے والد بھی اس کے بعض جلسوں میں شریک ہوئے اور اصولی طور پر اس کے حامی بن گئے مگر اس زمانے میں انہیں اس کے کام سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایک تو انہیں اپنے پیشے سے فرصت نہیں ملتی تھی دوسرے وہ سیاسی مسئلوں اور قومی کاموں میں کچھ اٹکل بھی نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے ابھی تک ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور ان سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ کسی ایسی تحریک یا انجمن میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے جس میں انہیں دوسرے کی پیروی کرنی پڑے۔ ان میں جو خودسری بچپن اور نوجوانی میں تھی، وہ بظاہر دب گئی تھی، مگر اصل میں اس نے ایک نئی یعنی طلب قوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے انہیں ان کے پیشے میں کامیاب کیا ارو ان کے دل میں خوداری اور اعتماد نفس کے جذبات پیدا کئے۔ انہیں لڑنے کا خصوصاً زبردست سے مقابلہ کرنے کا شوق تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ

اس زمانے میں وہ سیاسی میدان کے قریب تک نہ آتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اس وقت تک نیشنل کانگرس کی سیاست میں لڑائی کو دخل بھی نہ تھا۔ بہر حال وہ اس کوچے سے نابلد تھے اور ان کے دل میں ہر وقت اپنے کٹھن پیشے کا خیال بسا رہتا تھا۔ انہوں نے ترقی کے زینے پر مضبوطی سے قدم جما لیا تھا اور ایک ایک سیڑھی کرکے اوپر چڑھتے چلے جاتے تھے۔ انہیں اس پر فخر تھا کہ اس میں کسی کے احسان یا عنایت کو دخل نہیں بلکہ یہ خود ان کے دماغ اور ارادے کا کرشمہ ہے۔

گو وہ ایک معنی میں قوم پرست تھے مگر انگریزوں کو ان کے طور طریقے کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم ہندوستانیوں کا اخلاق اس قدر پست ہو چکا ہے کہ جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہم ایک حد تک اس کے مستحق ہیں۔ وہ ان سیاست دانوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو باتیں بہت بتاتے ہیں اور کرتے کچھ نہیں، حالانکہ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ آخر اور کیا کیا جائے۔ پھر ان کی ذاتی کامیابی نے ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا کر دیا تھا کہ سب تو نہیں مگر بہت سے لوگ جب اور پیشوں میں ناکام رہتے ہیں تو سیاست کو لے بیٹھتے ہیں۔

آمدنی میں روز بروز اضافہ ہونے سے ہمارا زندگی کا طریقہ بہت کچھ بدل گیا۔ ادھر آمدنی بڑھتی گئی، ادھر خرچ بڑھتا گیا۔ روپیہ جمع کرنے کو میرے والد اپنی کمانے کی قوت کی توہین سمجھتے تھے۔ انہیں بھروسا تھا کہ جب چاہوں اور جتنا چاہوں پیدا کر سکتا ہوں۔ کھیل تماشے کے شوق اور عیش و عشرت کے ذوق میں جو کچھ ملتا اڑا دیتے۔ رفتہ رفتہ ہمارے طرز زندگی میں مغربی رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔

یہ تھا ہمارے گھر کا نقشہ جو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا۔ (۲)

---

(۱) یہ عجیب اتفاق ہے کہ رابندرناتھ ٹیگور کی ولادت بھی ۶ مئی ۱۸۶۱ کو ہوئی۔

(۲) میری پیدائش الہ آباد میں ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو ہوئی۔

بچپن کا زمانہ

میرا بچپن دنیا کے بکھیڑوں سے محفوظ، اور واقعات سے خالی تھی۔ میں اپنے رشتے کے بھائیوں کی بات چیت، جو میرے سن سے اونچے تھی سنا کرتا تھا اور بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یہ لوگ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے کہ انگریز اور کرانی ہندوستانیوں سے حقارت کا برتاؤ کرتے ہیں اور ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس ذلت کو چپ چاپ نہ سہے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ حاکم اور محکوم میں آئے دن اس طرح کے جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ اور ان کے قصے ہمارے گھر میں چھڑے رہتے تھے۔ یہ چرچا عام تھا کہ جب کبھی انگریز ہندوستانی کو مار ڈالتا ہے، اس کے ہم قوموں کو جیوری اسے بری کر دیتی ہے۔ ریلوں میں کچھ ڈبے انگریزوں کے لئے محفوظ ہوتے تھے اور چاہے گاڑی میں کتنی ہی بھیڑ ہو (ان دنوں بھیڑ ہوتی بھی بہت تھی) کسی ہندوستانی کی مجال نہ تھی کہ ان ڈبوں میں گو وہ خالی ہی کیوں نہ ہوں سفر کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ انگریز غیر محفوظ ڈبے پر قبضہ کر لیتا تھا اور کسی ہندوستانی کو اس میں قدم رکھنے نہیں دیتا تھا۔ اسی طرح پارک وغیرہ میں بھی یورپیوں کے لئے محفوظ بنچیں ہوتی تھیں مجھے بدیسی حاکموں کی ان بے ہودہ حرکتوں پر بڑا غصہ آتا تھا اور جب کوئی ہندستانی کلہ بہ کلہ جواب دیتا تھا تو میں بہت خوش ہوتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود میرے بھائیوں یا ان کے دوستوں میں سے کسی کی جھڑپ انگریز سے ہو جائے۔ پھر تو ظاہر ہے کہ ہم سب کو بڑا جوش آتا تھا۔ میرے ایک رشتے کے بھائی جو گھر بھر میں سب سے مضبوط تھے، او بدا کر انگریزوں سے اور اس سے زیادہ کرانیوں سے لڑ بیٹھتے تھے، اس لئے کہ کرانی، شاید یہ دکھانے کو کہ ہم بھی حاکم قوم میں سے ہیں، انگریز عہدہ داروں اور تاجروں سے زیادہ بدتمیزی کرتے تھے یہ جھگڑے خاص طور پر ریل کے سفر میں پیش آتے تھے۔

اگرچہ مجھے بدیسی حاکموں کا ہوا ن اور ان کا یہ برتاؤ بہت برا لگتا تھا لیکن جہاں

تک یاد ہے، افراد کی حیثیت سے مجھے انگریزوں سے کوئی کد نہیں تھی۔ میں میم استانیوں کی نگرانی میں رہ چکا تھا اور ابا جان کے انگریز دوستوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں دل میں انگریزوں کو اچھا سمجھتا تھا۔

شام کو والد سے ملنے بہت سے دوست آ جاتے تھے۔ وہ اس بوجھ کو جو دن بھر دل پر رہتا تھا اتار پھینکتے تھے اور سارا گھر ان کے قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھتا تھا۔ ان کی ہنسی سارے الہ آباد میں مشہور تھی۔ بعض اوقات میں پردے کے پیچھے سے جھانک کر انہیں اور ان کے دوستوں کو دیکھتا تھا اور اس سوچ مین رہتا تھا کہ یہ بڑے بڑے لوگ آپس میں کیا باتیں کیا کرتے ہیں۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میں پکڑ کر باہر لایا جاتا تھا۔ والد مجھے کچھ دیر اپنے گھٹنے پر بٹھا لیتے اور میں ذرا سہما ہوا بیٹھا رہتا تھا۔ ایک بار میں نے انہیں کلیرٹ یا کوئی اور لال رنگ کی شراب پیتے ہوئے دیکھا وہسکی کو تو میں پہچانتا تھا اس لئے کہ میں نے والد کو ان کے دوستوں کو اکثر اسے پیتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس نئی سرخ چیز کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے دوڑ کر اماں جان سے کہا کہ ابا جان خون پی رہے ہیں۔

میرے دل میں والد کی بے حد عظمت تھی۔ میں انہیں قوت، ہمت اور عقل کا پتلا جانتا تھا اور جتنے آدمی میں نے دیکھتے تھے سب سے برتر سمجھتا تھا۔ مجھے آرزو تھی کہ میں بھی بڑا ہو کر ان جیسا ہو جاؤں۔ مگر عظمت اور محبت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں ان کا ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں نوکروں وغیرہ پر خفا ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مجھے بہت ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے اور میں خوف سے اور کبھی کبھی طیش سے کانپنے لگتا تھا کہ نوکروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ان کا غصہ واقعی بہت برا تھا اور میں نے اس وقت کیا اس کے بعد بھی اس کی ٹکر کا غصہ نہیں دیکھا مگر یہ اچھا تھ کہ ان میں ظرافت کا مادہ تھا اور ارادے کے بہت مضبوط تھے، اس لئے عام طور پر ضبط سے کام لیتے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ ضبط کی قوت بڑھتی گئی اور آخر

عمر میں شاید ہی کبھی انہیں پہلا سا غصہ آیا ہو۔

مجھے بچپن کی جو سب سے پہلی بات یاد ہیں ان میں والد کا غصہ بھی ہے اس لئے کہ یہ مجھی پر نازل ہوا تھا۔ میں ان دنوں کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی کام کی میز پر ''دوسوت قلم'' (فاؤنٹین پن) رکھے ہوئے دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔ میں نے کہا کہ انہیں ایک ساتھ قلموں کی تو ضرورت ہونے سے رہی۔ اس لئے میں نے لے لیا۔ بعد میں جب دیکھا کہ اس قلم کی زور شور سے تلاش ہو رہی ہے تو میں بہت ڈرا مگر میں نے اقرار نہیں کیا۔ آخر پتہ چل گیا اور میرے جرم کا ڈھنڈورا بٹ گیا۔ والد بے حد خفا ہوئے اور میری خوب مرمت کی۔ میں درد کی تکلیف اور ذلت کے رنج سے بے تاب سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور کئی روز تک میرے چھوٹے سے دکھتے ہوئے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی مالش ہوتی رہی۔

مجھے یاد نہیں کہ اس سزا کی وجہ سے مجھے والد سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ غالباً میرا یہی خیال تھا کہ سزا تھی تو بالکل بجا، مگر حد سے بڑھ گئی تھی لیکن باوجود اس کے میرے دل میں ان کی عظمت اور محبت اسی طرح قائم رہی۔ اب میں ان سے ڈرنے بھی لگا۔ البتہ والدہ سے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ چاہے میں کچھ بھی کروں وہ درگذر سے کام لیں گی۔ ان کی بے اندازی محبت کی وجہ سے میں ان کے ساتھ تھا اس لئے ان سے میں زیادہ مانوس تھا۔ اور اپنے دل کی بات جو والد سے کبھی نہ کہتا ان سے کہہ دیا کرتا تھا۔ وہ چھریرے جسم اور چھوٹے قد کی تھیں۔ اور تھوڑے دن میں میرا قد ان لے لگ بھگ جا پہنچا اس لئے میرے دل میں عمر کے فرق کا احساس کم ہو گیا اور وہ مجھے اپنے برابر کی معلوم ہونے لگیں۔ مجھے ان کی پیاری صورت اور ننھے منے ہاتھ پاؤں بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ ایک نو وارد کشمیری گھرانے کی تھیں جسے اپنا وطن چھوڑے دو ہی پشتیں گذری تھیں۔

میرے دوسرے ہمراز والد کے ایک محرر منشی مبارک علی تھے۔ وہ بدایوں کے

ایک آسودہ حال خاندان سے تھے۔ ۱۸۵۷ کی شورش میں ان کا گھر اجڑ گیا اور انگریزوں کی فوج نے ان کے خاندان کو قریب قریب ختم کر دیا۔ مصیبت نے ان کے قلب میں رقت اور درد پیدا کر دیا تھا، اور وہ سب سے خصوصاً بچوں سے بڑی نرمی سے پیش آتے تھے۔ میرے لئے ان کا دامن، جانا بوجھا امن کا ٹھکانا تھا۔ جب کبھی اداس یا پریشان ہوتا انہیں کے پاس پہنچتا۔ ان کی شاندار سفید داڑھی کو دیکھ کر میں بچپن کی سادگی سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ پراچین وقتوں کے آدمی ہیں جنہیں کئی جگ کی باتیں یاد ہیں۔ انکی گود میں بیٹھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائے میں ان کے بے شمار کہانیوں میں سے الف لیلیٰ اور دوسری کتابوں کے قصے یا ۵۷ء اور ۵۸ء کے حالات سنا کرتا تھا۔ منشی جی کا انتقال بہت برسوں کے بعد میری جوانی کے زمانے میں ہوا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہیں اور ان کی یاد کو میں دل و جان سے عزیز رکھتا ہوں۔

میری والدہ اور چچی ہندوؤں کی دیو مالا کی کہانیاں اور رامائن اور مہا بھارت کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔ میری چچی یعنی پنڈت نند لال کی بیوی کو ہندوستان کی پرانی کتابوں پر عبور تھا اور انہیں اس طرح کے ہزاروں قصے یاد تھے۔ اس لئے میری معلومات ہندوستان کی دیو مالا اور کتھا مالا میں بہت بڑھ گئی۔

مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچیرے بھائی مذہبی امور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ گھر کی عورتیں طرح طرح کی رسمیں مناتی تھیں اور پوجا پاٹ کیا کرتی تھیں۔ مجھے یہ باتیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اگر چہ میں اپنے بڑوں کی تقلید میں کسی حد تک بے پروائی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے الہ آباد، بنارس اور شہروں کے مندروں میں یا ان سنیاسیوں کی خدمت میں جو بڑے مہاتما سمجھے جاتے تھے، لے جاتی تھیں۔ مگر میرے دل پر ان چیزوں کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔

پھر بڑے بڑے تہوار تھے جیسے ہولی جس میں سارا شہر رنگ رلیاں مناتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر خوب پانی پھینکتے تھے۔ یا دیوالی جس میں ایک ایک مکان میں ہزاروں دیے جلائے جاتے تھے۔ جنم اشٹمی میں آدھی رات کو کرشن کے قید خانہ میں پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے لئے آدمی رات تک جاگنا بہت مشکل تھا۔ دسہرے اور رام لیلا میں رام چندر جی کی لنکا جیتنے کی پرانی کہانی، جلوس اور سوانگ کی شکل میں دہرائی جاتی تھی اور تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ہم سب بچے محرم کا جلوس دیکھنے بھی جایا کرتے تھے جس میں علموں کے ریشمی پھریرے لہراتے تھے اور حسنؑ حسینؑ کی شہادت کا ماتم ہوتا تھا۔ دونوں عیدوں کو منشی جی اچھے اچھے کپڑے پہن کر عیدگاہ میں نماز پڑھنے جاتے تھے اور میں ان کے گھر جا کر سویاں اور دوسرے لذیذ کھانے اڑاتا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوؤں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے تہوار جیسے رکھشا بندھن، بھیا دوج وغیرہ۔ ہم کشمیریوں کے بعض خاص تہوار بھی تھے جو اور ہندوؤں میں نہیں منائے جاتے تھے۔ ان سب سے بڑا نو روز یعنی ہمارے سمت کی شروع ہونے کا تہوار تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لئے خاصی خوشی اک دن ہوتا تھا۔ گھر بھر نئے کپڑے پہنتا تھا اور بچوں کو نقدی ملتی تھی۔

مگر ان سب تہواروں سے زیادہ مجھے اس تقریب سے دلچسپی تھی جو ہر سال خاص میرے لئے ہوا کرتی تھی یعنی میری سالگرہ۔ اس دن میرے جوش کو کچھ نہ پوچھئے۔ صبح تڑکے میں ایک بڑی ترازو میں گیہوں وغیرہ سے تلتا تھا اور یہ چیزیں غریبوں کو بانٹ دی جاتی تھیں۔ پھر نئی پوشاک سج کر میں لوگوں سے تحفے لیتا تھا اور شام کو دعوت ہوتی تھی جس میں بہت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو اس برات کا دولہا سمجھ کر فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ میری سالگرہ بہت دن کے بعد آتی ہے بلکہ میں نے بہت کچھ شور بھی مچایا کہ یہ تقریب سال میں کئی بار ہوا کرے۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن وہ

آئے گا، جب سالگرہ بڑھتی ہوئی عمر کی نشانی بن کر ناگوار ہوا کرے گی۔

بعض اوقات ہمارا سارا خاندان دور کا سفر کر کے دوسرے شہر جاتا تھا کہ کسی عزیز یا دوست کی شادی میں شریک ہو۔ ہم بچوں کو اس قسم کے سفر سے بڑی خوشی ہو تی تھی۔ اس لئے کہ شادی کے زمانے میں قاعدوں کی بندشیں ڈھیلی پڑتیں ارو ہم گھر بھر میں آزادی سے پھرتے۔ شادی کے گھر میں کئی خاندان اکٹھے رہتے تھے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو جاتیں تھیں۔ ان موقعوں پر مجھے تنہائی کی شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم دل بھر کر کھیل کود اور شرارت کا لطف اٹھاتے اور کبھی کبھی بڑوں کی ڈانٹ بھی کھاتے۔

ہندوستان کے غریبوں اور امیروں کی شادیوں کو بے جا نمائش اور فضول خرچی کی وجہ سے بہت کچھ برا بھلا کہا گیا ہے اور وہ اس کی مستحق بھی ہیں۔ فضول خرچی کے علاوہ اس عامیانہ آرائش کو دیکھ کر جس میں نفاست اور خوش مذاقی کا نام تک نہیں ہوتا، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بعض صورتیں اس سے مستثنٰی بھی ہوتی ہیں۔ اس کا الزام اصل میں اوسط طبقے کے لوگوں پر ہے۔ غریب لگو بھی فضول خرچ ہوتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اکثر قرض کے بوجھ میں دب جاتے ہیں۔ مگر یہ بات جو بعض حضرات کہا کرتے ہیں، بالکل مہمل ہے کہ ان کا افلاس ان رسموں کی وجہ سے ہے۔ لوگ اس کو نہیں دیکھتے کہ غریبوں کی زندگی بالکل پھیکی اور سپاٹ ہوتی ہے اور شادی کے موقع پر جو تھوڑا سا گانا بجانا، کھانا کھلانا ہوتا ہے وہ ان کے بے روح مشقت کی خشکی میں ذرسا رس پیدا کر دیتا ہے اور دم بھر کے لئے انہیں گھر میں گھسے رہنے اور بے لطف کام میں جتے رہنے سے نجات دے دیتا ہے۔ ایسا کون بے درد ہوگا کہ ان بیچاروں کو جو کبھی کبھار ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے اس سے بھی انہیں محروم کر دے؟ آپ شوق سے فضول خرچی کو روکئے۔ تکلفات کو کم کیجئے۔

(ان بیچاروں کی غریبانہ خوشیوں کے لئے اتنے بڑے بڑے لفظ استعمال کرنا

حماقت معلوم ہوتا ہے) مگر خدا کے لئے ان کی زندگی کو اور زیادہ بے رنگ اور اداس نہ بنائیے۔

اسی طرح اوسط طبقوں میں بھی، فضول خرچی اور تکلف سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ شادیاں وہ صحبتیں ہیں جن میں دورافتادہ عزیز اور دوست مدت کے بعد مل بیٹھتے ہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ یہاں دوستوں سے ملنا سہل نہیں ہے۔ خصوصاً بہت سے دوستوں کا ایک جگہ اکٹھا ہونا بہت دشوار ہے اسی وجہ سے شادی کی تقریبیں اس قدر ہر دلعزیز ہیں۔ صرف سیاسی مجلسیں یعنی کانگرس یا اس قسم کی اور کانفرنسیں ان کا مقابلہ کرسکتی ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو لطف صحبت کے لحاظ سے بھی ان سے بڑھ گئی ہیں۔

کشمیری ایک لحاظ سے اور ہندوستان خصوصاً شمال کے رہنے والوں سے فائدے میں ہیں۔ ان کے یہاں پردے کی رسم کبھی بھی نہیں تھی۔ جب وہ نیچے کے میدانوں میں آئے اور انہوں نے یہاں پردے کا رواج دیکھا تو انہوں نے بھی اسے اختیار کرلیا اس کئے کہ وہ عموماً شمالی ہند میں رہے اور یہاں یہ شرافت کی لازمی شرط سمجھی جاتی تھی مگر پھر بھی ان میں زیادہ گہرا پردہ نہیں اور جو ہے وہ بھی صرف غیر کشمیریوں کے مقابلے میں ہے۔ آپس میں ان کے یہاں عورت مرد آزادی سے ملتے ہیں اور ہر کشمیری بے تکلف دوسرے کشمیریوں کے گھر میں داخل ہوسکتا ہے۔ ان کی تقریبوں اور دعوتوں میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ شریک ہوتے ہیں اگرچہ عموماً عورتوں کی ٹولی الگ بیٹھی ہے۔ لڑکے لڑکیاں کم وبیش برابری کے ساتھ ملتی جلتی ہیں۔ البتہ مغرب کی سی آزادی ان میں نہیں ہے۔

اس طرح سے میری زندگی کے ابتدائی سال گزرے۔ بعض اوقات جیسا کہ بڑے خاندانوں میں لازمی طور پر ہوتا ہے، آپس میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ جب یہ بہت بڑھ جاتی تو میرے والد کو خبر ہوتی، وہ بہت خفا ہوتے تھے اور ان کا

خیال تھا کہ یہ سب عورتوں کی بے وقوفی کا نتیجہ ہے۔ یہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصہ کیا ہے مگر میں دیکھتا تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے بری طرح گفتگو کرتے ہیں یا کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ مجھے اس سے بہت رنج ہوتا تھا اگر والد نے دخل دیا تو گھر بھر تھرا اٹھتا تھا۔

اس زمانے کا ایک چھوٹا سا واقعہ میرے حافظے میں اب تک نقش ہے۔ میری عمر کوئی سات آٹھ برس کی ہو گی۔ میں روز چھاؤنی کے ایک سوار کے ساتھ گھوڑے پر سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن شام کو میں گر پڑا، اور میرا ٹٹو (یہ بڑا خوب صورت جانور تھا جس میں عرب خون بھی شامل تھا) میرے بغیر گھر واپس گیا۔ والد کے یہاں اس وقت ٹینس پارٹی تھی۔ ایک ہل چل مچ گئی اور پارٹی کے سب کے سب لوگ میرے والد کے پیچھے مختلف سواریوں کا ایک جلوس بنا کر مجھے ڈھونڈھنے نکلے۔ میں انہیں راستے میں مل گیا اور انہوں نے مجھے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے میں نے کوئی بڑا بہادری کا کام کیا ہو۔

تھیوسوفی

جب میں دس سال کا ہوا تو ہم لوگ ایک نئے گھر میں اٹھ گئے جو پہلے گھر سے بہت بڑا تھا۔اس کا نام میرے والد نے ''آنند بھون'' رکھا۔اس میں ایک بہت بڑا باغ اور ایک تیرنے کا حوض تھا اور میں بڑے جوش میں روز نئی نئی چیزیں دریافت کرتا تھا۔عمارت میں اضافہ ہو رہا تھا اور کھودنے بنانے کا کام زوروں پر تھا۔میں بڑے شوق سے مزدوروں کو کام کرتے دیکھا کرتا تھا۔

تیرنے کا بڑا حوض گھر میں تھا ہی اس لئے میں بہت جلد تیرنا سیکھ لیا اور پانی سے مانوس ہو گیا۔گرمی کے لمبے تپتے دنوں میں وقت بے وقت حوض میں جا کر ڈبکی لگاتا تھا۔یہ میرے لئے ایک انوکھا تماشہ تھا اور بجلی کی روشنی جو اس میں اور سارے گھر میں لگی تھی ان دنوں الہ آباد میں نئی چیز سمجھی جاتی تھی۔سب کے ساتھ مل کر نہانے سے میں بہت خوش ہوتا تھا اور جو لوگ تیرنا نہیں جانتے تھے، انہیں پانی میں دھکیل کر یا کھینچ کر ڈرانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ان میں ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کی حالت مجھے خاص طور پر یاد ہے جو اس زمانے میں الہ آباد میں وکالت کا کام سیکھ رہے تھے۔وہ تیرنا جانتے بھی نہیں تھے اور سیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔وہ پہلی سیڑھی پر، ڈیڑھ فٹ پانی میں بیٹھے رہتے اور دوسری سیڑھی تک جانے پر بھی کسی طرح راضی نہ ہوتے۔اگر کوئی انہیں سرکانا چاہتا تو بہت چیختے چلاتے۔میرے والد کو بھی تیرنا کچھ یوں ہی سا آتا تھا۔مگر وہ دانت بھینچ کر اور تن بدن کا زور لگا کر کسی نہ کسی طرح حوض کو پار کر لیتے تھے۔

ان دنوں جنوبی افریقہ میں بور لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔مجھے اس سے بڑی دلچسپی تھی اور میں دل و جان سے بوروں کا طرفدار تھا۔لڑائی کے خبروں کے شوق میں، میں نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

مگر اسی زمانے میں ہمارے گھر میں ایک نئی بات ہوئی جس نے مری ساری

توجہ اپنی طرف کھینچ لی، یعنی میری چھوٹی بہن پیدا ہوئی۔ میں دل ہی دل میں کڑھا کرتا کہ میرے کوئی بھائی بہن نہیں اور سب کے ہیں اس لئے یہ امید بڑی خوش گوار تھی کہ ایک ننھا سا بھائی یا ننھی سی بہن ہونے والی ہے جو خاص میری ہی ہوگی۔ والد ان دنوں یورپ گئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں برآمدے میں بڑی بے چینی سے اس واقعے کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر آکر مجھے یہ خبر سنئی اور کہا کہ تم یہ خوش ہوگے کہ لڑکا نہیں ہوا اور نہ وہ باپ کے ترکے میں حصہ بٹاتا۔ اس نے یہ بات مذاق میں کہی ہوگی مگر مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ شخص سمجھتا ہے کہ میں ایسا ناپاک خیال دل میں لاسکتا ہوں۔

والد کے یورپ جانے سے ہندوستان کے کشمیری برہمنوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ انہوں نے واپس آکر پرائچشت یعنی پاک کئے جانے کی رسم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ چند سال پہلے ایک اور کشمیری برہمن یعنی پنڈت بشن نرائن در، جو آگے چل کر کانگریس کے صدر ہوئے بیرسٹری پاس کرنے انگلستان گئے تھے ان کی واپسی پر برادری کے کٹر لگوں نے انہیں ذات سے باہر کر دیا حالانکہ انہوں نے پرائچشت بھی کر لیا تھا۔ اس بنا پر برادری قریب قریب برابر کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد بہت سے کشمیری نوجوان یورپ گئے اور وہاں سے آکر اصلاح پسند فرقے میں شامل ہو گئے مگر اسی وقت جب وہ پرائچشت کر چکتے تھے۔ اس رسم کا خالی ایک ڈھکوسلا تھا جسے مذہب سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ انسان جماعت کے آگے سر جھکائے اور اس کے دستور کی ظاہری پابندی کر لے پھر وہ دھرم کے خلاف جو چاہتا کرتا اور غیر برہمن اور غیر ہندو لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا کھاتا پیتا۔

والد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کسی قسم کی رسم ادا کرنے سے یہاں تک کہ نام کے لئے پرائچشت کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ اس پر بڑی برہمی پھیلی

خصوصاً اس وجہ سے کہ والد کا طرز عمل بہت سخت اور کسی قدر حقارت آمیز تھا۔ آخر میں بہت سے کشمیری والد کے ساتھ ہو گئے اور ایک تیسرا فرقہ بن گیا۔ چند سال کے اندر جوں جوں خیالات بدلتے گئے اور پرانی بندشیں ٹوٹتی گئیں۔ ان فرقوں میں رفتہ رفتہ میل ہوتا گیا۔ کشمیری لڑکے اور لڑکیاں بہت بڑی تعداد میں یورپ اور امریکہ میں تعلیم پا کر آئے اور پرائچشت کا کوئی سوال نہیں اٹھا۔ کھانے پینے کی قید بھی قریب قریب اٹھ گئی اور چند کٹر آدمیوں خصوصاً بوڑھی عورتوں کے سوا سب غیر کشمیریوں مسلمانوں اور بدیسیوں کے ساتھ مل کر کھانے لگے۔ پردہ کشمیری عورتوں میں دوسرے فرقوں سے بھی باقی نہیں رہا۔ اس کا رہا سہا کھوج ۳۰ء کے سیاسی تحریک نے مٹا دیا۔ دوسرے فرقوں سے شادی بیاہ ابھی عام نہیں ہے مگر اس کی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ میری دونوں بہنوں کی شادی غیر کشمیریوں میں ہوئی ہے اور ہمارے خاندان کے ایک نوجوان نے ایک ہنگری کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ برادری کے باہر شادی کرنے کی مخالفت مذہبی حکم نہیں بلکہ معاشرتی مسئلہ ہے۔ بہت سے کشمیری یہ چاہتے ہیں کہ اپنی جماعت کی ''شخصیت'' اور اپنے خاص آریائی خط و خال قائم رکھیں اور انہیں ڈر ہے کہ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی انسانوں کے سمندر میں ملنے کے بعد ان چیزوں کا پتہ بھی نہ لگے گا۔ ہم لوگوں کی تعداد اس عظیم الشان ملک کی کل آبادی کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

غالباً زمانہ حال میں کشمیری برہمنوں میں سب سے پہلے مرزا موہن لال کشمیری اب سے کوئی سو برس پہلے مغربی ملکوں میں گئے۔ یہ ایک ذہن اور خوش رو نوجوان تھے اور دلی کے مشن کالج میں پڑھتے تھے۔ جب برطانوی مہم کابل بھیجی گئی تو فارسی کے ترجمان کی حیثیت سے اس کے ساتھ جانے کے لئے منتخب کئے گئے اس کے بعد انہوں نے سارے وسط ایشیا اور ایران کا سفر کیا۔ جہاں کہیں جاتے ایک نئی شادی کرتے اور وہ بھی عموماً کسی اونچے گھرانے میں۔ انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور

ایران میں ان کی شادی شاہی خاندان کی ایک لڑکی سے ہوگئی۔ اسی وجہ سے انہیں مرزا کا خطاب ملا۔ وہ یورپ گئے اور نوجوان ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے حالات اور سفر کے واقعات بڑے دلچسپ انداز میں لکھے ہیں۔

کوئی گیارہ برس کی عمر میں، میں ایک نئے اتالیق فرڈینیڈ۔ ٹ۔ بروکس کے سپرد کیا گیا۔ ان کے باپ آئرستان کے اور ماں فرانس یا بلجیم کی تھیں وہ بڑے جوش تھیوسوف تھے اور مسز اینی بیسنٹ نے والد سے ان کی سفارش کی تھی۔ تین سال تک وہ میرے ساتھ رہے اور ان کا مجھ پر کئی طرح سے بہت گہرا اثر پڑا۔ اس زمانے میں میرے صرف ایک ہی اتالیق اور تھے یہ ایک نیک دل بوڑھے پنڈت تھے جو مجھے ہندی اور سنسکرت پڑھانے کے لئے رکھے گئے تھے۔ کئی سال کی کوشش میں پنڈت جی مجھے جو کچھ پڑھا سکے وہ اتنا تھوڑا تھا کہ لاطینی کی طرح جو میں نے آگے چل کر ہیرو میں سیکھی، سنسکرت میں بھی شد بد سے آگے نہیں بڑھا۔ قصور یقیناً میرا ہی تھا۔ میں زبانیں سیکھنے میں کچا تھا خصوصاً قواعد سے مجھے مطلق دلچسپی نہ تھی۔

ف۔ ٹ بروکس نے میرے دل میں مطالعے کا ذوق پیدا کر دیا اور میں نے انگریزی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں مگر بغیر کسی سلسلے یا مقصد کے۔ بچوں اور لڑکوں کی کتابوں پر مجھے خاصا عبور تھا۔ میری محبوب کتابیں لیوئس کیرول کی تصانیف اور جنگل کی داستان (۱) اور ''کم'' تھیں۔ ''ڈان کوئشوٹ'' میں کتا ڈو درے نے جو تصویریں بنائی ہیں وہ مجھے بہت پسند تھیں۔ فریڈیوف نالسن کی کتاب ''شمال کا آخری سرا'' (۲) پڑھ کر من چلے پن کے کاموں کا ایک نیا عالم میری نظروں میں پھرنے لگا۔ اسکاٹ، ڈکنس اور تھیکرے کے ناول، مارک ٹوئین کی کتاب ایچ۔ جی ویلس کے رومان اور شیرلاک ہومس والے قصے بھی میں نے پڑھے تھے۔ ''زنڈا کے قیدی'' (۳) کے مطالعے سے مجھے بڑی عبرت ہوئی اور جیروم۔ ک جیروم کی

کتاب ''تین آدمی ایک کشتی میں'' میرے نزدیک ظرافت کی انتہا تھی۔ دو موریے کی ''ٹرلبی'' اور ''پیٹر ابٹسن'' کا نقش بھی اب تک میرے حافظے میں موجود ہے۔ شعر سے مجھے بہت شوق تھا اور گو میری زندگی نے بہت سے پلٹے کھائے مگر یہ شوق تھوڑا بہت اب تک موجود ہے۔

بروکس نے مجھے سائنس کے اسرار سے بھی آشنا کر دیا۔ ہم دونوں نے مل کر ایک چھوٹا سا معمل (۴) بنالیا۔ میں اس میں بڑی دلچسپی کے ساتھ گھنٹوں کیمیا اور طبعیات کے تجربے کرتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ، بروکس نے میری زندگی پر ایک نیا اثر ڈالا جس سے میں ایک عرصہ تک بہت متاثر رہا۔ وہ اپنی قیام گاہ میں ہر ہفتے تھیوسوفیوں کی صحبت منعقد کرتے تھے جس میں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی اصطلاحیں اور خیالات میرے دل میں بس گئے۔ وہاں فلسفے کے مسئلے چھڑے رہتے تھے۔ اوتاروں، ہمزادوں، نور کے حلقوں (۵) اور کرما (۶) کے نظریے کی بحث ہوا کرتی تھی۔ میڈم بلاواٹسکی اور دوسرے تھیوسوفیوں کی موٹی موٹی کتابوں کے علاوہ ہندو شاستروں، بدھ مت کے ''دھام پد'' فیثا غورث، اپولونیس اور مختلف فلسفیوں اور باغیوں کی تصانیف کے حوالے دئے جاتے تھے۔ بہت سی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ مگر سننے میں یہ ساری راگ مالا بہت پر اسرار اور دلکش معلوم ہوتی تھی اور میں دل میں کہتا تھا کہ دنیا بھر کے بھیدوں کی کنجی یہی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جان بوجھ کر مذہب اور دوسری دنیا کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ خصوصاً ہندو دھرم کی وقعت میری نظر میں بہت بڑھ گئی، اس کی رسموں کی نہیں بلکہ اس کے جید کتابوں اپنشد اور بھگوت گیتا کی۔ ظاہر ہے کہ ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا مگر ان کی عبارت بڑی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ میں خواب میں ہمزادوں کو دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی اپنے آپ کو آسمان پر اڑتا ہوا پاتا تھا۔ یہ خواب کہ میرا جسم آپ ہی آپ اڑتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں اکثر نظر آیا ہے۔ بعض اوقات تو یہ

بہت ہی صاف اور واضح ہوتا اور مجھے زمین اپنے قدموں کے نیچے دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں آج کل کے تعبیر بتانے والے فرویڈ وغیرہ ان خوابوں کی کیا تعبیر کریں گے۔

اسی زمانے میں مسز اینی بیسنٹ الہ آباد آئیں اور انہوں نے تھیوسوفی کے موضوع پر کئی لکچر دیے۔ میں ان کی خطابت سے بہت متاثر ہوا اور جب ان کی تقریروں سے لوٹتا تو مجھ پر ایک بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا، گویا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تھیوسوفی کی انجمن میں شریک ہونے کا ارادہ کرلیا اگرچہ میری عمر اس زمانے میں صرف تیرہ برس کی تھی۔ جب میں نے والد سے پوچھا تو انہوں نے ہنس کر اجازت دے دی۔ ان کے نزدیک اس مسئلے کی کوئی اہمیت نہ تھی نہ وہ اس کی مخالفت کی ضرورت سمجھتے تھے اور نہ موافقت کی۔ مجھے اس سردمہری سے کسی قدر تکلیف ہوئی اگرچہ اور باتوں کے لحاظ سے میری نظر میں ان کی بڑی عظمت تھی مگر یہ سمجھتا تھا کہ ان میں روحانیت کی کمی ہے۔ اصل میں وہ خود تھیوسوف رہ چکے تھے اور ابتدائی زمانے میں جب میڈم بلاوٹسکی ہندوستان آئی تھیں اس جماعت میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے مذہبی جذبے کی بنا پر نہیں بلکہ ایک نئی چیز کے شوق میں شرکت کرلی تھی اور تھوڑے ہی دن بعد الگ ہو گئے۔ مگر ان کے بعض دوست جو انہیں کے ساتھ ممبر ہوئے تھے، جمے رہے ور جماعت کے اعلیٰ روحانی مدارج پر پہنچ گئے۔

غرض میں تیرہ برس کی عمر میں تھیوسوفی انجمن کا رکن ہوگیا اور خود مسز بیسنٹ نے میرے داخلے کی رسم ادا کی۔ انہوں نے مجھے اچھی اچھی نصیحتیں کیں اور بعض پر اسرار نشانیاں تعلیم کیں جو غالباً فراماشنوں سے لی گئی تھیں۔ میرے جسم میں اس وقت ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کے بعد بنارس میں تھیوسوفوں کی کانفرنس میں شریک ہوا جہاں مجھے کرنل الکاٹ اور ان کی شان دار داڑھی کی زیارت نصیب ہوئی۔

اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اب سے تیس برس پہلے لڑکپن کے زمانے میں میری صورت کیسی تھی اور خیالات کیا تھے۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے اس تھیوسوفی دور میں میرے چہرے پر وہ افسردگی اور بے رونقی چھا گئی تھی جو پرہیزگاری کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اور تھیوسوف مردوں اور عورتوں میں اکثر نظر آتی ہے یا کم سے کم اس زمانے میں نظر آتی تھی۔ ایک برگزیدہ ہستی ہونے کے احساس نے میری صورت اور سیرت میں کچھ عجیب روڑھاپن پیدا کر دیا تھا غرض میری عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو میری صحبت ایک مصیبت معلوم ہوتی ہوگی۔

کچھ عرصے بعد ف۔ ٹ بروکس رخصت ہو گئے۔ اور مجھے تھیوسوفی سے زیادہ سابقہ نہیں رہا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد میری زندگی کا تھیوسوفی کا دور بالکل ختم ہو گیا جس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہوا کہ میں اسکول کی تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا مگر جو زمانہ ف۔ ٹ۔ بروکس کے ساتھ گزرا تھا اس کا گہرا نقش میرے دل پر باقی ہے اور میں ان کے اور تھیوسوفی کے احسان سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر سچ پوچھئے تو اس عرصے میں تھیوسوفی کی وقعت میری نظر میں بہت کم ہو گئی ہے۔ اب وہ مجھے برگزیدہ ہستیاں نہیں بلکہ معمولی قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جو سلامتی کو خطرے پر اور آسائش کو شہادت پر ترجیح دیتے ہیں البتہ مسز بیسنٹ کا میں ہمیشہ دل سے قائل رہا۔

اس کے بعد جس اہم واقعے سے میں متاثر ہوا وہ روس اور جاپان کی لڑائی تھی۔ جاپان کی فتوحات سے مجھے بڑا جوش آتا اور میں نئی نئی خبریں معلوم کرنے کے لئے بے چینی سے اخباروں کا انتظار کیا کرتا تھا۔ میں نے جاپان کے متعلق بہت سے کتابیں خریدیں اور ان میں سے بعض کو پڑھنے کی کوشش بھی کی۔ جاپان کی تاریخ میں تو میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر قدیم جاپان کے سورماؤں کے قصوں اور لیف کیڈیو ہارن کی شگفتہ عبارت میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ میرا دل قومیت کے جذبے سے

معمور تھا اور سوچا کرتا تھا کہ کاش ہندوستان اور سارے ایشیا کو یورپ کی غلامی سے نجات مل جائے۔ میں بہادری کے کاموں کے منصوبے باندھا کرتا تھا کہ یوں تلوار ہاتھ میں لے کر ہندوستان کی خاطر لڑوں گا اور اسے آزاد کراؤں گا۔

اب میری عمر چودہ برس کی ہو گی تھی۔ ہمارے گھر میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ میرے رشتے کے بھائی جو مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے، اپنے اپنے کاروبار میں لگ گئے تھے اور اب وہ مشترکہ مکان کو چھوڑ کر اپنے گھر بار الگ کر رہے تھے۔ میرے دل میں نئے خیالات اور دھندلے تصورات منڈلا رہے تھے اور مجھے عورتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔ میں اب تک لڑکوں کی صحبت میں رہنے کو ترجیح دیتا تھا اور لڑکیوں سے ملنا جلنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ مگر کبھی کبھی کشمیریوں کی دعوتوں اور تقریبوں میں جہاں حسین لڑکیاں کثرت سے ہوتی تھیں، یا واقعات پر نظر سے نظر مل جانے، یا بدن سے بدن چھو جانے سے میرے جسم میں بجلی سے دوڑ جاتی تھی۔

مئی ۱۹۰۵ء میں جب میری عمر پندرہ برس کی تھی میرے والد، مجھے میری والدہ اور میری چھوٹی بہن کو لے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔

---

(۱) The Jungle Book

(۲) Farthest North.

(۳) The Prisoners of Zenda.

(۴) Laboratory.

(۵) Auras نور کے حلقے جو تھیوسوفیوں اور دوسرے باطنیوں کے نزدیک انسانوں کو گھیرے رہتے ہیں، ہر انسان کا حلقہ الگ ہوتا ہے۔

(۶) جزا اور سزا کا ابدی دور۔

ہیرو اور کیمبرج

آخر مئی کی کسی تاریخ کو ہم لندن پہنچے۔ ڈوور سے ریل روانہ ہونے کے بعد رستے میں ہم نے یہ خبر پڑھی کہ جاپان کو ٹوشیما کے مقام پر بڑی زبردست بحری فتح حاصل ہوئی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ دوسرے ہی دن ڈربی کی گھوڑ دوڑ تھی اور ہم سب اس کا تماشا دیکھنے گئے وہاں سے لوٹ کر ہماری ملاقات ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوئی جو اس زمانے میں ایک ذہین اور مستعد نوجوان تھے اور اپنی تعلیم میں نہایت اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ان دنوں وہ لندن کے ایک ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔

میری خوش قسمتی سمجھئے کہ مجھے ہیرو میں جگہ مل گئی کیونکہ میری عمر پندرہ برس کی ہو چکی تھی اور یہ داخلے کی مقررہ عمر سے کچھ تھوڑی سے زیادہ تھی۔ میرے خاندان کے لوگ یورپ کے اور ملکوں کو چلے گئے اور وہاں سے ہندوستان واپس ہو گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے باپ کو غیروں میں بالکل اکیلا پایا مجھے تنہائی اور گھر کی یاد ستانے لگی۔ مگر یہ حالت زیادہ دن نہیں رہی۔ میرا قدم اسکول میں تھوڑا بہت جم گیا، اور پڑھنے میں اور کھیل میں وقت گزرنے لگا۔ مگر میں وہاں پوری طرح کبھی نہیں کھپ سکا۔ ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں اور شاید وہ لوگ بھی مجھے غیر سمجھتے ہوں گے، پھر بھی میں کھیلوں میں پورا حصہ لیتا تھا۔ اگرچہ ان میں کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں کر سکا۔ میرے خیال میں یہ بات مان لی گئی تھی کہ میں کسی کام سے جی چرانے والا نہیں۔

شروع میں میرا داخلہ چھوٹے درجے میں ہوا اس لئے کہ میں لاطینی بہت کم جانتا تھا مگر تھوڑے ہی دن میں مجھے ترقی مل گئی۔ بہت سے مضمونوں میں خصوصاً عام معلومات میں میں اپنی عمر کے لڑکوں سے آگے تھا۔ میرا ذوق زیادہ وسیع تھا اور میں اپنے اکثر ساتھیوں سے زیادہ کتابیں اور اخبار پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے

اپنے والد کو ایک خط میں لکھا تھا کہ انگریز لڑکے اکثر ٹھس ہوتے ہیں اور اپنے کھیلوں کے اور کسی چیز کے متعلق گفتگو نہیں کر سکتے۔ تاہم مجھے بعض تیز لڑکے بھی نظر آئے خصوصاً اونچی جماعتوں میں پہنچنے کے بعد۔

مجھے پارلیمنٹ کے عام انتخاب سے جو غالباً ۱۹۰۵ء کے آخر میں ہوا بہت دلچسپی تھی۔ اس میں لبرلک جماعت نے بڑی فتح پائی ۱۹۰۶ء کے شروع میں ہمارے استاد نے ہم سے نئی حکومت کے بارے میں سوال کیا اور انہیں بڑا تعجب ہوا کہ ساری جماعت میں صرف میں ہی نے ان کے سوال کا اچھی طرح جواب دیا۔ بلکہ کیمبل بیز میں کی مجلس وزراء کی قریب قریب پوری فہرست زبانی سنا دی۔ سیاست کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی مجھے خاص شوق تھا اور وہ ہوائی جہاز رانی کی ابتدائی نشوونما تھی۔ یہ رائٹ برادارن اور سینٹوس ڈومونٹ کا زمانہ تھا (جس کے بعد ہی ارمین لتھیم اور بلیرو یو کا دور آیا) اور میں نے اپنے جوش میں ہیرو سے والد کو لکھا تھا کہ بہت جلد میں سنیچر اتوار کی چھٹی میں ہوائی جہاز سے ہندوستان آیا کروں گا۔

میرے زمانے میں ہیرو میں چار پانچ ہندوستانی لڑکے تھے۔ ان میں سے جو اور ہوسٹلوں میں رہتے تھے ان سے میری بہت کم ملاقات ہوئی تھی۔ خود میرے ہوسٹل میں جس کے نگراں ہیڈ ماسٹر تھے، مہاراج بڑودہ کے صاجزادے تھے اور بعد میں مہاراج کپورتھلہ کے بڑے صاجزادے پرم جیت سنگھ بھی آ گئے جو اب ٹکا صاحب ہو گئے ہیں۔ وہ اس مدرسے میں بالکل نہیں کھپتے تھے۔ ہمیشہ اداس رہا کرتے اور دوسرے لڑکوں سے ملنے جلنے سے گھبراتے۔ جب یہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تو وہ بہت خفا ہوتے اور کہتے کہ کبھی کپورتھلے آئے تو سمجھ لوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے معاملہ اور بگڑ جاتا تھا۔ وہ یہاں آنے سے پہلے کچھ دن فرانس میں رہ چکے تھے اور فرانسیسی زبان روانی سے بولتے تھے مگر یہ لطف دیکھئے کہ اس سے انہیں اپنے فرانسیسی کے سبق میں کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔ یہ اس طریقہ تعلیم کی برکت تھی جو انگلستان

کے پبلک اسکولوں میں غیر زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے اختیار کیا جاتا تھا۔

ایک بار عجیب واقعہ ہوا۔ آدھی رات کو یکایک ہوسٹل کے نگراں ہمارے کمروں میں پہنچے اور سب کی تلاشی لی گئی۔ معلوم ہوا کہ پرم جیت سنگھ کی سونے کی شام کی خوشنما چھڑی غائب ہوگئی ہے۔ تلاشی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دو تین دن میں لارڈ کے میدان میں ایٹن اور ہیرو کا میچ ہوا اور اس کے بعد ہی وہ چھڑی مالک کے کمرے میں پائی گئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب اسے لے کر میچ دیکھنے گئے تھے اور پھر واپس کر گئے۔

ہمارے ہوسٹل میں اور دوسرے ہوسٹلوں میں چند یہودی بھی تھے ان لوگوں سے اچھی خاصی نبھتی تھی مگر دلوں میں سامی نسل سے کسی قدر نفرت ضرور موجود تھی۔ یہ "ملعون یہودی" کہلاتے تھے اور قریب قریب غیر شعوری طور پر میں بھی یہ سمجھنے لگا کہ ان سے نفرت کرنا فیشن میں داخل ہے۔ مگر اصل میں مجھے سامی نسل سے کوئی کد نہ تھی اور آگے چل کر کئی یہودیوں سے میری بڑی دوستی ہوگئی۔

میں ہیرو سے مانوس ہوگیا تھا اور اسے بہت پسند کرتا تھا مگر اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ میں اس کی سطح سے اونچا ہوتا جاتا ہوں۔ میرا دل یونیورسٹی کی طرف کھنچ رہا تھا۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کی خبریں انگلستان کے اخباروں میں بہت مجمل طور پر آتی تھیں۔ مگر ان سے بھی یہ پتہ چلتا تھا کہ بنگال، پنجاب اور مہاراشٹر میں بڑے بڑے واقعات ہو رہے ہیں۔ لالہ جپت رائے اور اجیت سنگھ جی جلاوطن کر دئے گئے تھے۔ بنگال میں شورش برپا تھی۔ پونا سے تلک کی جدوجہد کے متعلق تار آرہے تھے سودیشی اور بائیکاٹ کا زور تھا۔ ان سب باتوں نے میرے دل میں سخت ہیجان پیدا کر دیا تھا مگر ہیرو میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس سے میں اس کا ذکر کر سکوں۔ البتہ چھٹیوں میں اپنے رشتے کے بھائیوں سے یا اور ہندوستانی دوستوں سے ملنا ہوتا تھا اور میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا تھا۔

اسکول میں اچھا کام کرنے کے انعام میں مجھے ایک بار ج ۔م ۔ٹریویلین گاری بالڈی کی کتابیں ملیں ۔انہیں میں نے بہت شوق سے پڑھا اور بہت جلد اس سلسلے کی باقی دو کتابیں بھی مہیا کے گاری بالڈی کے سارے حالات کا غور سے مطالعہ کیا۔ میری نظروں میں یہ نقشے پھرنے لگے کہ ہندوستان میں ایسے ہی کارنمایاں انجام پا رہے ہیں اور آزادی کی خاطر بڑی بہادری سے جنگ ہو رہی ہے۔ان خیالات کی وسعت کے آگے ہیرو ایک تنگ اور محدود جگہ معلوم ہونے لگی اور میرا دل یونیورسٹی کی وسیع تر فضا کو ڈھونڈھنے لگا۔ چنانچہ میں اپنے والد کی اجازت حاصل کر کے ہیرو سے رخصت ہو گیا۔ یہاں میرا قدم صرف دو برس رہا جو مقررہ معیاد سے بہت کم تھا۔ میں ہیرو سے اپنی خوشی سے جا رہا تھا مگر مجھے یاد ہے کہ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو میرا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے اس سے ایک گونہ انس ہو گیا تھا اور اس کے چھوڑنے سے میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا۔مگر یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے واقعی رنج تھا یا نہیں۔شاید مجھے یہ احساس تھا کہ اس موقع پر اداس ہونا ضروری ہے۔اس لئے کہ ہیرو کی روایات اور گیتوں کا یہ تقاضا ہے۔ میں ان روایات سے متاثر تھا اس لئے میں نے جان بوجھ کر ان روایات کے اثر سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی تا کہ جس جگہ رہتا ہوں اس سے ہم آہنگ ہو جاؤں۔

شروع اکتوبر ۱۹۰۷ء سترہ اٹھارہ برس کی عمر، ٹرینٹی کالج، کیمبرج کا منظر، میرا دل فخر و مسرت سے معمور تھا۔اب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، اور اسکول کے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔لڑکپن کی بیڑیاں کٹ چکی تھیں اور وہ دن آ گیا تھا کہ میں اپنے آپ کو بالغ کہہ سکوں۔ میں کیمبرج کے چوڑے چوکوں اور تنگ گلیوں میں اکڑتا پھرتا تھا اور کوئی جاننے والا مل جاتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

تین سال میں کیمبرج میں رہا اور یہ تین سال بے خلل سکون اور خاموشی سے گزر گئے جیسے کیم ندی دھیرے دھیرے بہتی ہے۔ یہ بھی کیا خوش گوار زمانہ تھا۔

بہت سے دوست، تھوڑا سا کام، تھوڑا سا کھیل اور دائرہ نظر کا آہستہ آہستہ بڑھنا۔
میں نے سائنس کی سند حاصل کی جس میں میرے مضمون کیمیا، ارضیات اور نباتیات تھے مگر میری دلچسپی انہیں مضامین تک محدود نہ تھی۔ میں جن لوگوں سے کیمبرج میں یا تعطیل کے زمانے میں لندن میں ملتا تھا وہ عالمانہ انداز سے ادب، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو ان علمیت جتانے والوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر جب میں نے تھوڑی سی کتابیں پڑھ ڈالیں تو مجھے اس کا ڈھب آ گیا اور کم سے کم اتنا ہو گیا کہ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھ سکتا تھا اور معمولی موضوعوں سے اپنی ناواقفیت کا اظہار نہیں ہونے دیتا تھا۔ چنانچہ ہم نٹشے کے فلسفے (جس کا ان دنوں کیمبرج میں زور تھا) برنارڈ شا کے دیباچوں اور لوالیس ڈکنسن کی نئی کتابوں پر بحث کیا کرتے تھے۔ ہم اپنے آپ کو بہت پختہ کار سمجھتے تھے۔ عورت مرد کے تعلقات اور اخلاقی مسئلوں کا ذکر اس طرح کرتے تھے کہ گویا ہم عام معیار سے بہت اونچے ہیں اور ایوان بلاک، ہیولاک ایسلیس، کرافٹ ایبنگ، آٹو ونگر کے حوالے اس بے پروائی سے دیتے تھے جیسے ان کی سب کتابیں چاٹے بیٹھے ہیں۔ اپنے نزدیک ہم اس موضوع سے اتنی واقفیت رکھتے تھے جتنی ایک غیر ماہر فن کو ہونی چاہیے۔

مگر سچ پوچھئے تو اس قدر بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے کے باوجود ہم میں سے اکثر جنسی معاملات میں کچے اور جھینپو تھے۔ کم سے کم میرا یہی حال تھا اور بہت عرصے تک یعنی کیمبرج چھوڑنے کے بعد تک جنسی مسائل کے متعلق میری واقفیت محض نظری پہلو تک محدود رہی اس کی وجہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ ہم میں سے اکثر میں جنسی رغبت بہت قوی تھی اور گناہ کا خیال شاید ہی کسی کو ہو۔ مجھے تو بالکل نہیں تھا۔ مذہب کی روک کو اس میں مطلق دخل نہ تھا۔ ہم لوگ ان چیزوں کو غیر اخلاقی کہا کرتے تھے یعنی نہ اچھی نہ بری مگر باوجود ان سب باتوں کے کچھ تو میرے شرمیلے

پن نے اور کچھ اس کراہت نے جو عشق بازی کے مروجہ طریقوں کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ مجھے روک رکھا۔ میں ان دنوں بہت شرمیلا تھا شاید اس سبب سے کہ میرا بچپن تنہائی میں گزرا تھا۔

میرا عام تصور زندگی اس زمانہ میں ایک طرح کی دھندلی سی لذت پرستی تھی۔ اس میں کچھ تو جوانی کی ترنگ شامل تھی اور کچھ آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کا اثر۔ لطف و مسرت کی خواہش کا موٹا سا فلسفیانہ نام رکھ دینا سہل ہے مگر اصل میں میرا مقصد لذت پرستی سے اونچا تھا اس لئے کہ عیش اور آرام کی زندگی مجھے کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ میری طبیعت میں مذہبی رنگ نہیں تھا اور میں مذہب کی سختیوں کا ناپسند کرتا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ مجھے کوئی اور معیار زندگی تلاش کرنا تھا۔ مگر میری نظر بالکل سطحی تھی اور میں کسی چیز کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا اس لئے زندگی کے جمالی پہلو نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور یہ بات دل کو لگتی ہوئی معلوم ہوئی کہ انسان عامیانہ طریقے سے دنیا کی لذتوں پر نہ گرے بلکہ اپنا وقار قائم رکھے مگر اسی کے ساتھ ہر طرح کی نعمتوں کے مزے لیتا رہے اور بھری پری وسیع اور ہمہ گیر زندگی بسر کرے۔ میں زندگی کا لطف اٹھاتا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں گناہ کی کیا بات ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ خطرے کی زندگی اور من چلے پن کا کام بھی میرے لئے ایک خاص کشش رکھتے تھے۔ مجھے اپنے والد کی طرح ہمیشہ جوا کھیلنے کا شوق رہا۔ پہلے روپئے کا داؤ لگاتا تھا پھر زندگی کے بڑے بڑے مقاصد کی بازی لگانے لگا۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ میں ہندوستان کی سیاست سخت ہیجان کی حالت میں تھی اور میں اس میں بہادری سے حصہ لینے کی آرزو رکھتا تھا۔ ظہر ہے کہ یہ راہ کوئی آرام کی راہ نہیں تھی۔ ان ملی جلی خواہشوں کی وجہ سے جو کبھی کبھی آپس میں لڑ بھڑ جاتی تھیں میرے خیالات کچھ عجیب طرح سے گڈمڈ ہو گئے تھے مگر باوجود اس لئے کہ فیصلے کا زمانہ ابھی دور تھا۔ اس وقت تو میں جسمانی حیثیت سے بھی اور ذہنی حیثیت سے بھی

بڑی خوش گوار زندگی بسر کر رہا تھا۔ زندگی کے نئے نئے منظر میری نظر سے گزر رہے تھے۔ بہت کچھ کرنا تھا، بہت کچھ دیکھنا تھا، بہت سے کوچوں کی سیر کرنی تھی۔ ہم جاڑوں کی لمبی راتوں میں آگ کے گرد بیٹھے اطمینان سے بات چیت اور بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے یہاں تک کہ آگ بجھنے لگتی تھی اور ہم کانپتے ہوئے بستروں میں جا گھستے تھے۔ کبھی کبھی بحث کے دوران میں ہماری ہموار آوازیں بلند ہو جاتی تھیں اور ہم جوش میں آ کر جھگڑنے لگتے تھے مگر یہ سب جھوٹ موٹ کی باتیں تھیں۔ ہم انسانی زندگی کے مسئلوں سے مصنوعی سنجیدگی سے کھیلتے تھے اس لئے کہ یہ بھی ہمارے لئے حقیقی مسئلے نہیں تھے اور ہم دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑے تھے۔ یہ بیسویں صدی کے شروع کی، یعنی جنگ عظیم سے پہلے کی دنیا تھی۔ اس دنیا کا خاتمہ قریب تھا اور ایک دوسری دنیا پیدا ہونے کو تھی۔ ہلاکت اور تباہی اور مصیبت سے معمور، نوجوانوں کے دل کو درد والم سے بھر دینے والی۔ مگر یہ انقلاب ابھی تک مستقبل کے پردے میں چھپا ہوا تھا اور یہیں ہمیں اپنے آس پاس ترقی کا منظر دکھائی دیتا تھا جو بےفکروں کو خوش رکھنے کے لئے کافی تھا۔

میں نے لذت پرستی کا اور مختلف تصورات کا ذکر کیا ہے جن سے میں اس زمانے میں متاثر تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں ان چیزوں پر وضاحت سے غور کیا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ان کا کوئی واضح اور معین تصور انسان کے ذہن میں ہو۔ یہ محض دھندلے سے خیالات تھے جو میرے دل میں آتے جاتے تھے اور اپنا تھوڑا بہت نقش چھوڑ جایا کرتے تھے۔ میں کبھی ان فکروں میں سر نہیں کھپاتا تھا۔ میرا سارا وقت پڑھائی کھیل اور تفریح میں گزرتا تھا اور میرے سکون میں خلل ڈالنے والی صرف ایک ہی چیز تھی یعنی ہندوستان کی سیاسی کشمکش۔ کیمبرج میں جن کتابوں کا اثر میرے سیاسی خیالات پر پڑا، ان میں ٹاؤنسینڈ کی کتاب ''ایشیا اور یورپ'' بھی تھی۔

۱۹۰۷ء سے کئی سال تک ہندوستان میں ایک ہیجان کی سی کیفیت رہی۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد پہلا موقع تھا کہ یہ ملک بدیسی حکومت کے آگے چپ چاپ سر جھکانے کی بجائے اس سے لڑنے پر آمادہ تھا۔ تلک کی جدوجہد اور ان کا قید ہونا، آروند گھوش کی کوشش اور بنگال کے لوگوں کا سودیشی اور بائیکاٹ کا حلف اٹھانا، ان واقعات کی خبریں انگلستان پہنچتی تھیں اور ہم ہندوستانیوں کے دلوں کو جوش سے بھر دیتی تھیں ہم سب کے سب تلک کے پیرو تھے جو ہندوستان میں انتہا پسند کہلاتے تھے۔

کیمبرج کے ہندوستان کی ایک انجمن تھی جو ''مجلس'' کے نام سے مشہور تھی۔ اس میں ہم اکثر سیاسی مسئلوں پر بحث کرتے تھے مگر محض نمائش کے طور پر۔ ساری کوشش پارلیمنٹ اور یونیورسٹی یونین کے طور طریقوں کی نقل میں صرف ہوتی تھی اور بحث کے مضمون کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ میں مجلس میں اکثر جایا کرتا تھا مگر تین برس کے زمانے میں شاید ہی کوئی تقریر کی ہو۔ میں اپنی جھجک اور جھینپ کو کسی دور نہیں کر سکتا تھا۔ یہی مشکل مجھے اپنے کالج کی ڈیبٹنگ سوسائٹی The Maghpie and stump میں پیش آتی تھی۔ وہاں یہ قاعدہ تھا کہ جو ممبر پوری ٹرم تقریر نہ کرے اسے جرمانہ دینا پڑتا تھا۔

چنانچہ میں نے اکثر جرمانہ دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایڈون مانٹیگو جو آگے چل کر وزیر ہند ہوئے اکثر کالج کی انجمن میں آیا کرتے تھے۔ وہ ٹرنٹی کالج کے قدیم طالب علم تھے اور کیمبرج کی طرف سے پارلیمنٹ میں ممبر تھے۔ انہیں کی زبان سے میں نے پہلی بار عقیدے کی جدید تعریف سنی۔ یعنی اس چیز کا ماننا جسے عقل نہ مانتی ہو اس لئے اگر عقل نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر عقیدے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ مجھ پر سنس اس کے مطالعے کا بہت اثر تھا اور اسی اثر کی وجہ سے میں اپنی رائے کو قطعی سمجھتا تھا، اس لئے کہ انیسویں صدی کے شروع

کی سائنس بخلاف آج کل کی سائنس کے اپنے آپ پر اور اپنی دنیا پر بڑا وثوق رکھتی تھی۔

"مجلس" میں بھی اور رنج کی گفتگو میں بھی ہندوستانی طالب علم اپنے ملک کی سیاست کا ذکر کرتے وقت اکثر سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے تھے یہاں تک کہ بنگال والے جو تشدد کے کام شروع کر رہے تھے ان کی تعریف سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ آگے چل کر میں نے دیکھا کہ یہی حضرات ہندوستان کی سول سروس کے ارکان، ہائی کورٹ کے جج، بہت متین اور ثقہ وکیل وغیرہ بن گئے۔ ان قائلین کے شیروں میں بہت کم ایسے نکلے، جنہوں نے آگے چل کر ہندوستانی سیاست میں کچھ موثر حصہ لیا۔

اس زمانے کے بعض مشہور ہندوستانی سیاست دان ہمارے یہاں کیمبرج میں آئے۔ ہم لوگ ان سے ادب سے پیش آئے مگر اس میں ایک جھلک برتری کے احساس کی بھی تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ذہنی تربیت کا دائرہ بڑا ہے اور ہم ہر چیز کو زیادہ وسیع نظر سے دیکھتے ہیں، جو حضرات ہمارے یہاں تشریف لائے، ان میں بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور گوکھلے بھی تھے۔ بپن پال سے ملنے کے لئے ہم میں سے کسی کی نشست کے کمرے میں ہندوستانی طالب علم جمع ہوئے ہماری تعداد ایک درجن سے زیادہ نہ تھی۔ مگر بپن بابو اس طرح گرج رہے تھے جیسے دس ہزار کے مجمع میں تقریر کر رہے ہوں۔ آواز کا گھن اس قیامت کا تھا کہ میں ان کے الفاظ مشکل سے سمجھ سکتا تھا۔ لالہ جی کا انداز گفتگو زیادہ معقول تھا اور مجھ پر اس کا اثر ہوا۔ میں نے والد کو لکھا کہ مجھے لالہ جی کی تقریر بپن پال کی تقریر سے زیادہ پسند آئی۔ وہ اس سے خوش ہوئے اس لئے کہ ان دنوں بنگال کی شورش پسند انہیں ذرا بھی نہ بھاتے تھے۔ گوکھلے نے کیمبرج میں عام جلسے میں تقریر کی اور مجھے اس جلسے کی جو بات خاص طور پر یاد ہے وہ عبدالمجید خواجہ کا ایک سوال تھا جو انہوں نے گوکھلے کی تقریر کے بعد

پوچھا۔ خوانہ نے ہال کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک طول طویل سوال چھیڑ دیا جس کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ ہم میں سے اکثر یہ بھول گئے کہ بات کیا تھی اور شروع کیونکر ہوئی تھی۔

ہندوستانیوں میں ہردیال کی بڑی شہرت تھی مگر وہ آکسفورڈ میں تھے اور وہ بھی میرے کیمبرج کے زمانے سے پہلے۔ جن دنوں میں ہیرو میں تھا ان سے ایک دو مرتبہ لندن میں ملاقات ہوئی۔

میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنہوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگرس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ج۔م۔ سین گپتا میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود اور تصدق احمد خاں شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے۔ شاہ محمد سلیمان بھی جو اب الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں میرے زمانے میں وہاں پڑھتے تھے۔ میرے اور ہمعصر سول سروس کے رکن یا وزیر بن کر پھلے پھولے۔

لندن میں ہم شیام جی کرشن ورما اور ان کے انڈیا ہاؤس کا ذکر سنا کرتے تھے مگر میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی ان کا رسالہ Indian Sociologist ہماری نظر سے گزرتا تھا۔ ایک عرصے کے بعد یعنی ۱۹۲۶ء میں مجھے شیام جی سے جنیوا میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی جیب میں اب تک Indian Sociologist کی پرانی کاپیاں بھری ہوئی تھیں اور وہ ہر شخص کو جو ان کے قریب آتا تھا، برطانوی حکومت کا جاسوس جانتے تھے۔ لندن میں ایک طالب علموں کا مرکز بھی تھا جو انڈیا آفس نے قائم کیا تھا۔ اس کو ہم سب لوگ ہندوستانی طالب علموں کی مخبری کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور یہ خیال بڑی حد تک بجا تھا مگر بہت سے ہندوستانیوں کو چار و ناچار اس سے واسطہ رکھنا پڑتا تھا، اس لئے کہ اس کی سفارش کے بغیر یونیورسٹیوں میں داخلہ قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی حالت نے میرے والد کو بھی عملی سیاست میں کھینچ لیا۔

میں اس سے خوش تھا اگرچہ مجھے ان کے سیاسی اصولوں سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ قدرتی طور پر اعتدال پسندوں کے ساتھ شریک ہوگئے۔ جن میں سے اکثر ان کے دوست اور وکالت میں ان کے رفیق کار تھے، انہوں نے اپنے صوبے کے ایک کانفرنس میں صدارت کی اور اپنی تقریر میں بنگال اور مہاراشٹر کے انتہا پسندوں کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ وہ صوبہ متحدہ کی کانگرس کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہو گئے۔ ۱۹۰۷ء میں وہ سورت کے اجلاس میں موجود تھے، جس میں کانگرس درہم برہم ہوگئی اوراس کے بعد خالص اعتدال پسند جماعت بن گئی۔

سورت کے جلسے کے بعد ہی ہ۔ و۔ نیونسن الہ آباد میں کچھ دن والد کے مہمان رہے اور انہوں نے جو کتاب ہندوستان کے متعلق لکھی اس میں والد کا ذکر ان الفاظ میں کیا "سخاوت کے سوا وہ ہر معاملے میں اعتدال پسند ہیں۔" یہ اندازہ بالکل غلط تھا۔ والد کسی چیز میں اعتدال پسند نہ تھے بجز سیاست کے اور اس میں بھی ان کی طبعیت اپنا رنگ دکھا کر رہی یعنی رفتہ رفتہ یہ رہا سہا اعتدال بھی غائب ہو گیا۔ ان جیسا قومی جذبات، جوشیلے مزاج، مغرور طبعیت اور مضبوط ارادے کا آدمی اعتدال پسندی سے کوسوں دور تھا۔ پھر بھی ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ میں اوراس کے کئی سال بعد تک وہ دھر کے اعتدال پسند اورانتہا پسندوں کے سخت مخالف رہے اگرچہ میرے خیال میں تلک کے وہ قائل تھے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کے ذہن کی تربیت قانون اور دستور کی بنیادوں پر ہوئی تھی اس لئے وہ قدرتی طور پر ہر چیز کو قانونی اور آئینی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی معاملہ فہمی کی بدولت انہوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ سخت اور شدید الفاظ بالکل بیکار ہیں جب تک کہ عمل بھی زبان ک اہم رنگ نہ ہو اور موثر عمل کی انہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سودیشی اور بائیکاٹ سے کچھ کام چلتا معلوم نہیں ہوتا تھا اور پھر ان

تحریکوں کی تہہ میں مذہبی رنگ کی قومیت تھی جو ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی۔ وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کے حامی نہیں تھے۔ نہ وہ اسے سمجھ سکتے تھے اور نہ وہ اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ذات پات کی پابندی اور بہت سی اور قدیم رسمیں رجعت پسندی کی دلیل تھیں اور وہ انہیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کی نظر میں مغرب سمایا ہوا تھا۔ مغربی ممالک کی ترقی نے ان کے دل کو موہ لیا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ انگلستان کے تعلق کی بدولت ہم بھی ترقی کر سکیں گے۔

سمائی حیثیت سے دیکھئے تو ۱۹۰۷ء میں ہندوستنی قومیت کا نئے سرے سے ابھرنا کھلی ہوئی رجعت پسندانہ تحریک تھی۔ جیسا کہ مشرق کے اور ملکوں میں ہوا تھا ہندوستان میں بھی قومیت کی نئی تحریک لازی طور پر مذہبی چیز بن گئی۔ اعتدال پسندوں کی جماعت سماجی معاملات میں زیادہ آزاد خیال تھی۔ مگر اس میں صرف اونچے طبقے کے مٹھی بھر آدمی تھے جنہیں عام لوگوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ یہ حضرات معاشی مسئلوں پر جو کچھ غور کرتے تھے وہ صرف اونچے اوسط طبقے کے لحاظ سے جس کے ایک حصے کے وہ نمائندے تھے اور جس کی ترقی انہیں مقصود تھی، وہ چھوٹی چھوٹی سماجی اصلاحوں کی کوشش کر رہے تھے تاکہ ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ہوں اور پرانی رسمیں، جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ موقوف ہو جائیں۔

اعتدال پسندوں کے ساتھ شریک ہو کر والد نے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا بنگال اور پونا کے چند لیڈروں کو چھوڑ کر اکثر انتہا پسند نوجون تھے اور والد کو نہایت ناگور تھا کہ یہ کل کے چھوکرے الگ راہ پر چلنے کی جرات کرتے ہیں۔ وہ مخالفت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور جن لوگوں کو احمق سمجھتے تھے ان کے ساتھ نبھانا ان کے لئے غیر ممکن تھا۔ انہیں ان لوگوں سے لڑنے میں لطف آتا تھا اور جہاں موقع پایا حملہ کر دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کیمبرج سے رخصت ہونے کے بعد میں نے ان کا ایک مضمون پڑھا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے انہیں کسی قدر گستاخی

کے لہجے میں خط لکھا جس میں چبھتا ہوا فقرہ تھا کہ برطانوی حکومت یقیناً آپ کے سیاسی کاموں سے بہت خوش ہوگی۔ یہی باتیں تھیں جن پر انہیں بے حد طیش آجاتا تھا۔ وہ مجھ سے خفا ہوگئے اور قریب تھا کہ مجھے فوراً انگلستان سے واپس آنے کا حکم دیں۔

کیمبرج کے قیام کے زمانے میں یہ سوال اٹھا کہ مجھے کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ کچھ دن انڈین سول سروس کا خیال رہا کیونکہ اس وقت تک یہ بڑی چیز سمجھی جاتی تھی مگر یہ تجویز نہ والد کو پسند تھی اور نہ مجھ کو اس لئے ترک کردی گئی۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میری عمر سول سروس کے مقررہ معیار سے کم تھی اور اگر میں اس کا امتحان دینا چاہتا تو مجھے سند لینے کے بعد انگلستان میں تین چار برس اور قیام کرنا پڑتا۔ جب میں نے کیمبرج سے سند حاصل کی تو میری عمر بیس برس کی تھی اور سول سروس کے امتحان کے لئے اس زمانے میں ۲۲ سے ۲۴ سال تک کی قید تھی اور پھر کامیابی کے بعد ایک سال اور ٹھہرنا پڑتا تھا۔ میرے عزیز میرے انگلستان کے طویل قیام سے گھبرا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ میں جلد لوٹ آؤں۔ ایک اور وجہ جو والد کے نزدیک اہمیت رکھتی تھی یہ تھی کا گر مجھے سول سروس میں جگہ ملتی تو گھر سے دور مختلف مقامات پر رہنا پڑتا۔ لیکن والد اور والدہ دونوں اتنے عرصے کی جدائی کے بعد مجھے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ غرض فیصلہ یہ ہوا کہ میں اپنا آبائی پیشہ، یعنی بیرسٹری اختیار کروں اور میں انر ٹیمپل میں داخل ہوگیا۔

یہ عجب بات ہے کہ سیاست میں تو میری انتہاپسندی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ مگر سول سروس کی ملازمت یعنی ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مشین کا ایک پرزہ بن جانے کی تجویز مجھے کچھ ناپسند نہ تھی۔ چند سال کے بعد یہ خیال مجھے بہت مکروہ معلوم ہوتا۔

۱۹۱۰ء میں میں کیمبرج سے سند لے کر رخصت ہوگیا۔ میں نے سائنس کے سندی امتحان میں اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی یعنی سیکنڈ کلاس آنرس پائے اس

کے بعد دو برس تک لندن میں مٹر گشت کرتا رہا۔ قانون کے مطالعے مجھے بہت کم وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ بیرسٹری کے امتحانات میں نے ایک ایک کر کے پاس کر لئے اور بہت اچھا نہیں تو بہت برا بھی نہیں رہا۔ اور باتوں کے لحاظ سے میری زندگی کسی خاص مقصد کے گزر رہی تھی۔ ادھر ادھر کی کتابیں پڑھ کر وقت کاٹتا تھا۔ فیبین جماعت اور اشتراکیوں کی طرف توجہ رہا کرتی تھی۔ آئرستان کے مسئلے اور عورتوں کے ووٹ کی تحریک سے مجھے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں گرمی کی تعطیل میں آئرستان جانے کا اتفاق ہوا اور سن فیبن جماعت کا جو نئی قائم ہوئی تھی، اثر دل پر لے کر آیا۔

لندن میں ہیرو کے چند پرانے دوست مل گئے اور ان کی صحبت میں فضول خرچی کی عادت پڑ گئی۔ میرے والد مجھے بہت معقول جیب خرچ دیتے تھے مگر میں اکثر اس سے زیادہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ میرے والد بہت گھبرائے کہ لڑکا تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے مگر میں اصل میں یہ کارنمایاں انجام نہیں دے رہا تھا بلکہ صرف ان گانٹھ کے پورے آنکھ کے اندھے انگریزوں کی تقلید کی کوشش کر رہا تھا جو "لندن کے چھیلے" کہلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عیش و آرام کی اس بے معنی زندگی سے مجھے کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا۔ میرا جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا۔ البتہ میری خود بینی اور بڑھ گئی۔

تعطیل کے زمانے میں کبھی کبھی میں یورپ کے اور ملکوں کا سفر بھی کیا کرتا تھا۔ ۱۹۰۹ء کی گرمیوں میں جب کاؤنٹ زیپلن، فریڈرش ہافن سے اپنے نئے ہوائی جہاز میں اڑ کر برلن آئے تو میں اور والد برلن میں موجود تھے۔ میرے خیال میں یہ زیپلن کی پہلی لمبی اڑان تھی اسی لئے اس کے اعزاز میں بڑا زبردست مظاہرہ کیا گیا اور خود قیصر نے باضابطہ طور پر اس کا استقبال کیا۔ بہت بڑا مجمع جس کا اندازہ دس لاکھ اور بیس لاکھ کے درمیان کیا جاتا تھا۔ برلن کے ٹیمپل ہوف کے میدان میں اکٹھا تھا۔

زیپلن مقررہ وقت پر پہنچا اور خوبصورتی کے ساتھ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہا۔ ہوٹل آدلان نے اس زور اپنے ہر مہمان کو کاؤنٹ زیپلن کی ایک نہایت عمدہ تصویر تحفے کے طور پر دے اور میرے پاس یہ تصویر اب تک موجود ہے۔ اس کے دو مہینے کے بعد ہم نے پیرس میں ایک طیارے کو پہلے پہلے سارے شہر کا چکر لگاتے اور ایفل ٹاور کے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس کے چلانے والے کا نام میرے خیال میں کونٹ دولا میر تھا اتفاق سے اٹھارہ برس بعد جب لنڈ برگ بحراوقیانوس کو پار کر کے چمکتے ہوئے تیر کی طرح پیرس پہنچا تو میں پھر وہیں موجود تھا۔

ایک بار بار ردے میں بال بال بچ گیا۔ ۱۹۱۰ء میں کیمبرج سے سند لینے کے بعد وہاں ایک جماعت کے ساتھ سیر کرنے گیا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم لوگ ایک پہاڑی خطے میں پیدل سفر کر رہے تھے۔ دن بھر تھکے ماندے اور گرمی سے پریشان ہم اپنی منزل پر یعنی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچے اور پہنچتے ہی یہ کہا کہ ہم نہانا چاہتے ہیں۔ وہاں نہانے کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا اور ہوٹل میں اس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ البتہ یہ معلوم ہوا کہ وہاں قریب ایک چشمہ ہے اور ہم چاہیں تو اس میں غسل کر سکتے ہیں چنانچہ ایک انگریز اور میں دو آدمی میز کی چادریں یا شاید ہاتھ منہ پونچھنے کے تولئے جو ہوٹل والوں نے اپنی فیاضی سے عنایت کئے تھے لے کر وہاں پہنچے۔ یہ ایک پر شور نالہ تھا جو ایک قریب کی برف کی چٹان سے نکلا تھا۔ میں نے اس میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ پانی گہرا نہیں مگر برف کی طرح ٹھنڈا ہے اور اس کی تہہ میں غضب کی پھسلن ہے۔ میں پھسل کر گرا اور سردی سے بیہوش ہو گیا یعنی نہ تو کچھ حس باقی رہی اور نہ ہاتھ پاؤں پر قابو رہا۔ میں نے قدم جمانا چاہا مگر نہیں جما اور پانی مجھے تیزی سے بہا کر لے چلا۔ میرا انگریز ساتھی کسی نہ کسی طرح پانی سے نکلا اور چشمے کے کنارے کنارے دوڑتا رہا یہاں تک کہ اس نے میری ٹانگ پکڑ پائی اور مجھے کھینچ کر باہر نکالا۔ ہمیں اپنے خطرے کا اندازہ بعد میں ہوا۔ اس لئے کہ کوئی دو تین سو گز

کے فاصلے پر یہ پہاڑی چشمہ بہت بڑی بلندی سے نیچے گرتا تھا اور ایک آبشار بن جاتا تھا جو اس مقام کے دلچسپ مناظر میں شمار ہوتا تھا۔

۱۹۱۲ء کی گرمی میں، میں نے بیرسٹری کی سند حاصل کر لی اور اسی سال خزاں کے موسم میں سات برس کے قیام کے بعد انگلستان سے ہندوستان روانہ ہوا۔ اس عرصے میں دو مرتبہ تعطیل میں گھر آ چکا تھا۔ مگر اب کی بار مستقل طور پر واپس آ رہا تھا۔ جب میں نے بمبئی میں قدم رکھا تو سوا خود بینی کے کوئی صفت مجھ میں نظر نہیں آتی تھی۔

انگلستان سے واپسی

اور زمانہ جنگ کی سیاست

۱۹۱۲ء کے آخر میں سارے ہندوستان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی تلک جیل میں تھے۔ انتہا پسند اچھی طرح کچلے جا چکے تھے اور ان کی حالت بے چرواہے کی بھیڑوں کی سی تھی۔ تقسیم بنگال کو منسوخ کرانے کی کوشش میں ناکامی ہونے کے بعد بنگال میں بھی ایک سناٹا چھا گیا تھا اور اعتدال پسند جماعت منٹو مارلے اسکیم کے نفاذ کے بعد کونسلوں کے جال میں پھنس چکی تھی۔ البتہ ان ہندوستانیوں کا کچھ خیال لوگوں کو ضرور تھا جو بیچارے پردیس میں پڑے تھے۔ خاص کر جنوبی افریقہ کے ہندوستان کا۔ کانگریس بھی اس زمانے میں معتدل خیال کی جماعت تھی۔ بس سال کے سال جلسلہ ہو جاتا اور چند بے جان سے تجویزیں منظور ہو جاتیں غرض اس میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔

۱۹۱۲ء میں بانکی پور کانگریس کے جلسے میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے میں بھی شیرک ہوا تھا۔ اس وقت یہ انگریزی داں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا ایک میلہ معلوم ہوتی تھی۔ جدھر دیکھو بس کوٹ پتلونوں کی نمائش تھی۔ اس پر کسی سیاسی جلسے کا شبہ تک نہ ہوتا تھا۔ نہ کوئی جوش و خروش تھا اور نہ کشاکش۔ معلوم ہوتا تھا کہ دوستوں کی بے تکلف صحبت ہے۔ گوکھلے جو اسی زمانے میں افریقہ سے واپس آئے تھے اس جلسے میں موجود تھے اور سب سے نمایاں تھے وہ بے چین طبعیت کے آدمی تھے۔ سرگرمی اور جوش عمل کے پتلے معلوم ہوتے تھے۔ اس سارے مجمع میں وہی ایک ایسے شخص تھے جو سیاست کی سچ مچ کوئی اہمیت سمجھتے تھے اور قومی کام کو کام کی طرح کرنا چاہتے تھے بہر حال میں ان سے متاثر ہوا۔

جب وہ بانکی پور سے روانہ ہوئے تو بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ وہ اس وقت

پبلک سروس کمیشن کے رکن تھے، اس لئے سفر میں فرسٹ کلاس کا ایک پورا ڈبہ انہیں مل جاتا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ نا ساز تھی۔ اور یوں بھی وہ ناموس صحبت سے گھبراتے تھے اس لئے چاہتے تھے کہ تنہائی میں ذرا سکون مل جائے۔ کانگرس کی مصروفیت کے بعد انہیں امید تھی کہ ریل میں یہ سکون میسر آجائے گا۔ بہر حال انہیں ایک اکیلا ڈبہ مل گیا۔ لیکن باقی گاڑی کلکتہ جانے والے ڈیلی گیٹوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر بھوپندر ناتھ باسو جو بعد میں انڈیا کونسل کے ممبر رہے ہیں ان کے پاس تشریف لائے اور باتوں باتوں میں ان سے اسی ڈبے میں آجانے کی اجازت چاہی۔ مسٹر گوکھلے گومگو میں پڑ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ مسٹر باسو بڑے باتونی ہیں۔ لیکن بیچارے آخر کرتے کیا۔ اخلاقاً اجازت دینا پڑی چند منٹ بعد مسٹر باسو پھر آئے اور پوچھا کہ اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو میں اپنے ایک دوست کو بھی ساتھ لیتا آؤں۔ مسٹر گوکھلے کو ناچار پھر ہاں کرنا پڑی۔ گاڑی روانہ ہونے سے پہلے مسٹر باسو یہ بھی کہہ گزرے کے مجھے اور میرے دوست کو اوپر والے گدے پر سونے میں بڑی تکلیف ہوگی اس لئے اگر زحمت نہ ہو تو آپ اوپر چلے جائیں۔ تا کہ ہم دونوں نیچے کے گدوں پر لیٹ سکیں۔ غالباً یہ صورت طے ہوئی اور بے چارے گھوکھلے کو ساری رات بڑی بے چینی سے اوپر گزارنی پڑی۔

میں نے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی اور اس نئے کام میں میرا تھوڑا بہت جی بھی لگنے لگا۔ یورپ سے واپسی پر شروع شروع میں چند مہینے تو لطف سے کٹے۔ کیونکہ مجھے وطن وپس آنے اور بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی بڑی خوشی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ زندگی جو میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ گزار رہا تھا بے کیف معلوم ہونے لگی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ لایعنی اور بے مقصد زندگی کے جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ شاید میری دورخی تعلیم اس بے اطمینانی اور پریشانی کا باعث فہو۔ میں نے انگلستان میں سات برس تک رہا تھا اس لئے مجھ پر وہاں کی تہذیب وتمدن کا کافی اثر

تھا۔ ممکن ہے اسی وجہ سے میرا یہاں دل نہ لگتا ہو۔ خوش قسمتی سے گھر کی فضا کچھ غنیمت تھی اس لئے یہاں مجھے سکون ملتا تھا لیکن سارے دن گھر ہی میں تو رہتا تھا۔ اکثر وقت بار لائبریری اور کلب میں گزرتا تھا۔ یہاں دونوں جگہ زیادہ تر وکیل ہی ہوتے تھے اور ان میں ہر وقت بس اپنے پیشے اور قانون کی باتیں چھڑی رہتی تھیں۔ غرض ذہنی نشوونما کی کوئی صورت نہ تھی اور نہ تفریح یا دل بہلانے کا کوئی معقول انتظام تھا اس لئے میری طبیعت پر ایک اداسی سی طاری رہنے لگی۔

ای۔ ایف۔ فارسٹر نے حال ہی میں جی۔ لوئس۔ ڈکنسن کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ڈکنسن نے ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ فرمائے تھے کہ ”ان دونوں قوموں میں میل جول کیوں نہیں ہوسکتا؟ محض اس لئے کہ ہندوستانی انگریزوں پر اجیرن ہو جاتے ہیں یہ ایک صاف اور صریح حقیقت ہے۔“ بہت ممکن ہے کہ اکثر انگریزوں کا یہی خیال ہو اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ فارسٹر اپنی ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں ”کہ ہندوستان کا رہنے والا ہر انگریز یہ سمجھتا ہے کہ اور صحیح سمجھتا ہے کہ وہ ایک فاتح فوج کا سپاہی ہے چنانچہ اسی کے مطابق وہ اپنا رویہ بھی رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں ان قوموں کے درمیان باہمی مراسم اور بے تکلفی کیسے بڑھ سکتی ہے۔ انگریز اور ہندوستانی قوموں کے درمیان باہمی مراسم اور بے تکلفی کیسے بڑھ سکتی ہے۔ انگریز اور ہندوستانی دونوں ایک دوسرے کے سامنے بنتے ہیں اس لئے انہیں ایک دوسرے کی صحبت کھل جاتی ہے۔ ہر ایک دوسرے پر بار ہوتا ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اس سے جس قدر جلد چھٹکارا مل جائے اچھا ہے تاکہ اطمینان کا سانس لے اور آزادی سے اٹھ بیٹھ سکے۔“

عموماً انگریزوں کو ایک ہی قسم کے ہندوستانیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے یعنی سرکاری لوگوں سے۔ باشعور اور معقول ہندوستانیوں کی صحبت انہیں کہاں نصیب ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ انہیں اس ڈھب پر نہیں لاسکتا کہ کھل مل کر باتیں

کریں۔ برطانوی حکومت نے ہمارے یہاں سرکاری طبقہ کو چاہے وہ انگریز ہو یا ہندوستنی سماجی حیثیت سے بھی بہت زیادہ اہمیت دے دی ہے لیکن یہ طبقہ بے انتہا تنگ نظر اور مردہ دل واقعہ ہوا ہے۔ نوجوان اور ہونہار انگریز بھی ہندوستان آتے ہی ذہنی اور علمی اعتبار سے مجہول بن جاتا ہے اور زندہ دلی سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ دن بھر وہ دفتر کی ان مسلوں میں سر کھپاتا ہے جو ہمیشہ گشت میں رہا کرتی ہیں اور کبھی ختم ہونے کو نہیں آتیں اس کے بعد وہ تھوڑی سی ورزش کرتا ہے پھر اپنے ہم جنسوں کے پاس کلب میں چلا جاتا ہے وہاں وہسکی پیتا ہے اور پنچ اور لندن کے دوسرے ہفتہ وار رسائل پڑھتا ہے۔ یہی اس کا روز کا معمول ہے۔ کتابیں تو وہ شاید ہی کبھی پڑھتا ہو۔ اور اگر کبھی جی چاہا تو اپنی کوئی پرانی محبوب کتاب اٹھالیتا ہے اور تھوڑی دیر اس سے دل بہلاتا ہے۔ پھر جب رفتہ رفتہ اس کا دماغ شل اور ذہن کند ہو جاتا ہے تو ہندوستان کو الزم دیتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کو کوستا ہے اور شورش کرنے والوں کی اس جماعت کو برا بھلا کہتا ہے جو اس کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیتی ہے لیکن وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس ذہنی اور دماغی تنزل کی اصل وجہ ہندوستان کا بے لگام استبدادی طرز حکومت ہے اور وہ خود اس مشین کا یک چھوٹا سا پرزہ ہے۔

انگریز افسروں کو یورپ جانے کے لئے جلد جلد رخصت ملتی رہتی ہے اس کے باوجود اگر ان کی یہ کیفیت ہے تو سمجھ لیجئے کہ ان کے ہمسر یا ماتحت ہندوستانی افسروں کی کیا حالت ہوگی جو انہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی نئ دہلی کے انگریز اور ہندوستانی اعلیٰ حکام کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ترقی، تبادلہ، رخصت اور اسی قسم کے لغویات ملازمت ان کی رام کہانی سنی ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شاید ہی کوئی دوسری چیز اس سے زیادہ سوہان روح ہوتی ہو۔

ہندوستان کے متوسط طبقے خاص کر انگریزی جاننے والوں کی زندگی پر اس سرکاری فضا نے کافی اثر کیا اور اس سانچے میں اسے ڈھال دیا۔ کلکتہ، بمبئی جیسے

بڑے شہر تو ایک حد تک اس سے محفوظ ہیں۔ باقی ہر جگہ کے غیر سرکاری لوگ یعنی وکیل ڈاکٹر وغیرہ بھی اس کا شکار ہو گئے ہیں حتیٰ کہ نیم سرکاری یونیورسٹیوں کی ادبی فضا بھی اس سے مسموم نظر آتی ہے۔ یہ سب لوگ باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور عوام سے حتی کے متوسط طبقے کے نسبتاً نیچے درجے کے لوگوں سے بھی انہیں کوئی تعلق نہیں رہتا۔ سیاسیات متوسط طبقے کے اونچے لوگوں تک محدود تھی۔ ۱۹۰۶ء کے بعد سے بنگال میں قومی تحریک نے پہلے پہل اس کفر کو توڑا۔ اور اس طبقے کے ادنیٰ درجے کے لوگوں میں بلکہ ایک حد تک عوام میں بھی نئی روح پھونک دی۔ یہ رفتار آگے چل کر گاندھی جی (۱) کی رہبری میں زیادہ تر ہو گئی۔ قومی تحریک اگرچہ حیات بخش ہوہے لیکن اس کا مطمح نظر نہایت محدود ہوتا ہے اور اس میں اتنی قوت عمل اور توجہ صرف کرنی پڑتی ہے کہ دوسرے کاموں کے لئے مہلت نہیں ملتی۔

انہی وجوہ سے انگلستان سے واپسی کے بعد چند سال تک میں بہت دل برداشتہ رہا۔ اپنے پیشے میں مجھے پورا انہماک پیدا نہیں ہوا تھا اور سیاسیات میں اس وقت مجھے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنچانے کا موقعہ نہ تھا کیونکہ میرے نزدیک سیاسیات کا مفہوم صرف یہ تھا کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جارحانہ کاروائی کی جائے بااین ہمہ میں کانگرس میں داخل ہو گیا اور کبھی کبھی اس کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ جب کوئی خاص موقع پیش آتا تھا مثلاً ہندوستانی مزدوروں کو اقرار نامے لکھوا کر فی جی لے جانے کے خلاف جدوجہد کرنے کا سوال یا جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا مسئلہ تو میں سرگرمی سے اس میں کود پڑتا تھا اور دل و جان سے کوشش کرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ محض دفع الوقتی تھی کوئی مستقل شغل نہ تھا۔

مجھے سیر و شکار کی طرف کچھ رغبت تھی لیکن کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ دراصل میں صحرا نوردی کی خاطر شکار کو جاتا تھا۔ جانوروں کو ہلاک کرنا مقصد نہ تھا۔ میں خاص طور پر اس کے لئے مشہور تھا کہ شکار میں میں نے کبھی خون نہیں بہایا البتہ ایک مرتبہ

کشمیر میں اتفاق سے ایک ریچھ ضرور مارا تھا۔ بالآخر ایک ہرن کا ایسا واقعہ پیش آیا تھا کہ شکار کا یہ تھوڑا بہت شوق بھی ختم ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ یہ بیچارہ بے ضرر جانور زخمی ہو کر میرے پاؤں کے قریب آ کر گر پڑا اور آنسوؤں سے دبڈبائی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر نہایت حسرت سے میری طرف دیکھا۔ یہ پرنم اور غمگین آنکھیں اب تک مجھے یاد ہیں اور عرصے تک ان کا تصور مجھے ستاتا رہا۔

اس زمانے میں مسٹر گوکھلے کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی سے میں بہت متاثر تھا۔ میں نے کبھی اس میں شریک ہونے کا خیال نہیں کیا کیونکہ اول تو ان کا سیاسی نقطۂ نظر میرے معیار سے بہت کم تھا۔ دوسرے اس وقت تک میرا ارادہ وکالت ترک کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن میرے دل میں اس سوسائٹی کے اراکین کی بڑی عزت تھی کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی اور محض گزارے کے لائق تھوڑا سا معاوضہ قبول کر لیتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہاں بالکل صحیح اصولوں پر نہ بھی سہی لیکن کم سے کم یکسوئی سے ٹھوس اور مسلسل کام تو ہوتا ہے۔

ہاں ایک مرتبہ مسٹر سری نواس شاستری کی ایک بات سے مجھے بڑا صدمہ پہنچا۔ اگرچہ اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہوں نے الہ آباد میں طالب علموں کے ایک جلسے میں تقریر فرمائی اور انھیں نصیحت کی کہ ہمیشہ اپنے استادوں کی عزت و فرماں برداری اور حاکم وقت کے بنائے ہوئے تمام قواعد و ضوابط کی سختی سے پابندی کیا کرو۔ باتیں تو یہ بڑے مزے کی تھیں لیکن مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اقتدار پرستی پر جو غیر معمولی زور دیا گیا تھا اس کی وجہ سے یہ مجھے کچھ نامناسب اور لچر سی معلوم ہوئیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ شاید اس نیم سرکاری فضا کا اثر ہے جو ہندوستان پر چھائی ہوئی ہے۔ مسٹر شاستری نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ لڑکوں سے یہ خواہش بھی کی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی حرکتوں کی فوراً اپنے افسروں کو اطلاع دیا کریں۔ دوسرے معنوں میں وہ گویا ایک دوسری کی مخبری کیا کریں اور خفیہ پولیس کی

خدمت انجام دیں۔ مسٹر شاستری نے کھلے کھلے الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا لیکن ان کی منشا یہی تھا۔ اس لئے میں اس جلیل القدر لیڈر کے دوستانہ مشورے کو حیرت سے سن رہا تھا۔ میں حال ہی میں انگلستان سے واپس آیا تھا۔ وہاں اسکول اور کالج میں یہ بات ہمارے ذہن نشین کرائی گئی تھی کہ اپنے ساتھی کو کبھی دغا نہ دینا۔ وہاں کی تہذیب میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا کہ اپنے ساتھی کا راز معلوم کر کے پھر مخبری کی جائے اور اس طرح اسے پریشانی میں مبتلا کیا جائے لیکن یہاں اس کے بالکل برعکس بات سن کر میں حیران رہ گیا اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ مسٹر شاستری کے اخلاق نظریہ میں اور اس نظریہ میں جس کی مجھے انگلستان میں تعلیم دی گئی تھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

جنگ عظیم شروع ہوتے ہی ہماری توجہ کا رخ ادھر پھر گیا۔ چونکہ یہ لڑائی بہت دور ہو رہی تھی اس لئے شروع شروع میں ہم پر اس کا زیادہ اثر نہیں پڑا اور سچ پوچھئے تو ہندوستان کو اس کی تباہ کاریوں کا پورا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ بہر حال اس کی وجہ سے سیاسی تحریک رک گئی اور اس کی اہمیت کم پڑ گئی۔ قانون تحفظ ہند نے سارے ملک کو اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا۔ جنگ کے دوسرے سال سے ملک میں گولیاں چلنے کی اور طرح طرح کی سازشوں کی خبریں آنے لگیں اور یہ معلوم ہوا کہ پنجاب میں رنگروٹ بھرتی کرنے میں انتہائی جبر و تشدد سے کام لیا جا رہا ہے۔

اگرچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کیا جاتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کے ساتھ دلی ہمدردی کسی کو نہ تھی۔ جرمنی کی فتوحات سن سن کر جتنی خوشی انتہا پسندوں کو ہوتی تھی اتنی ہی اعتدال پسندوں کو۔ جرمنی سے کسی کو الفت نہ تھی۔ محض یہ جذبہ کام کرتا تھا کہ اپنی آنکھوں سے اپنے فاتح کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھیں۔ یہ گویا کمزور اور بیکس شخص کے انتقام کا جذبہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس جنگ کے متعلق بیشتر ہندوستانیوں کے دلوں میں طرح طرح کے جذبات موجود تھے۔

مجھے قوموں سے زیادہ فرانس سے ہمدردی تھی۔ اتحادیوں کی طرف سے برابر نہایت بیباکی سے پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ اور اگرچہ ہم اس کا زیادہ اعتبار نہیں کرتے تھے پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پھر شروع ہوگئی۔ لوکمانیہ تلک جیل سے رہا ہو کر آ گئے اور ایک ہوم رول لیگ انہوں نے اور ایک مسز بیسنٹ نے قائم کی۔ میں دونوں میں شریک ہو گیا۔ لیکن زیادہ تر کام مسز بیسنٹ کی لیگ میں کیا۔ ہندوستانی سیاست میں مسز بیسنٹ کی سرگرمیاں برابر بڑھتی گئیں۔ کانگرس کے سالانہ جلسوں میں بھی کچھ جوش وخروش نظر آنے لگا اور مسلم لیگ بھی کانگرس کے قدم بہ قدم چلنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے۔ ہم نوجوان عموماً بہت مسرور تھے کیونکہ ہمیں یہ امید تھی کہ بہت جلد کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ مسز بیسنٹ کی نظر بندی سے تعلیم یافتہ طبقے میں اور زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور سارے ملک میں ہوم رول کی تحریک کو اس سے بہت تقویت پہنچی۔ ان دنوں لیگوں میں نہ صرف وہ پرانے انتہا پسند شریک ہوئے تھے جو ۱۹۰۷ء کے بعد کانگرس سے کنارہ کش ہو گئے تھے بلکہ متوسط طبقے کے نئے نئے کارکن بھی شامل ہو گئے لیکن عوام تک ابھی ان کا اثر نہیں پہنچا تھا۔

مسز بینٹ کی نظر بندی سے بوڑھوں اور اعتدال پسندوں میں بھی ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نظر بندی سے کچھ پہلے جب میں اخباروں میں مسٹر سری نواس شاستری کی زوردار تقریریں پڑھا کرتا تھا تو میں بے انتہا متاثر ہوتا تھا۔ لیکن نظر بندی سے چند روز پہلے یا شاید چند روز بعد مسٹر شاستری نے یکایک خاموشی اختیار کر لی۔ جب عمل کا وقت آیا تو وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے اس لئے ان کی اس خاموشی پر بہت زیادہ مایوسی اور ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ کیونکہ اس وقت صحیح رہبری کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ شاید اسی کے بعد سے یہ بات میرے دل پر نقش ہو

گئی ہے کہ مسٹر شاستری عملی آدمی نہیں ہیں اور معرکہ آرائی سے ان کی طبعیت کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔

بہر حال دوسرے اعتدال پسند رہنما اس وقت برابر شریک رہے لیکن کچھ عرصے بعد بعض تو پیچھے ہٹ گئے اور بعض نے جو قدم بڑھایا تھا اس پر قائم رہے۔ حکومت ہند نے اس زمانے میں یورپ کے نمونے پر متوسط طبقے میں سے ایک انڈین ڈیفنس فورس ترتیب دینا شروع کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس پر بہت بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ بہت سی صورتوں میں یورپین فورس کے مقابلے میں ہندوستانی فورس کے ساتھ خراب سلوک روا رکھا گیا تھا۔ اس لئے ہم میں سے اکثر حضرات کا یہ خیال تھا کہ جب تک یہ ذلت آمیز امتیاز نہ اٹھ جائے ہمیں تعاون نہ کرنا چاہیے۔ بالآخر بہت کچھ بحث مباحثہ کے بعد یو۔ پی میں ہم نے طے کیا کہ ہمیں بھی شریک ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ کچھ بھی سہی ہمارے نوجوان کو فوجی تعلیم تو حاصل ہو گی۔ میں نے بھی اس فورس میں نام لکھانے کے لئے اپنی نوجوان کو فوجی تعلیم تو حاصل ہو گی۔ میں نے ابھی اس فورس میں نام لکھانے کے لئے اپنی درخواست بھیج دی اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم نے الہ آباد میں ایک کمیٹی قائم کی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مسز بسینٹ کی نظر بندی کی خبر ملی۔ بس اس وقت جوش وخروش سے فائدہ اٹھا کر میں نے کمیٹی کو جس کے رکن والد، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو اور مسٹر سی وائی چنتامنی تھے اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ حکومت کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنا جلسہ اور ڈیفنس فورس کے متعلق تمام کاروائی منسوخ کر دے۔ چنانچہ فوراً اس قسم کا اعلان شائع کر دیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ بعض دستخط کرنے والوں کو بعد میں اس کا افسوس ہوا ہو گا کہ جنگ کے زمانے میں انہوں نے ایسی مخالفانہ حرکت کیوں کی۔

مسز بسینٹ کی نظر بندی سے متاثر ہو کر میرے والد اور دوسرے اعتدال پسند

رہنما بھی ہوم رول لیگ میں شریک ہو گئے۔ چند مہینے کے بعد ان میں سے اکثر حضرات مستعفی ہو گئے۔ لیکن میرے والد بدستور اس میں شریک رہے اور الہ آباد کی شاخ کے صدر منتخب ہوئے۔

رفتہ رفتہ میرے والد کو اعتدال پسند جماعت کے عقائد سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔ انہیں یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ جو حکومت ہماری کوئی پروا نہ کرتی ہو اور ہم سے حقارت کا برتاؤ کرے ہم خواہ مخواہ اس کی تابعداری اور خوشامد کریں لیکن پرانے انتہا پسند فرقے کی طرف بھی ان کا رجحان نہ تھا کیونکہ ان کے الفاظ میں سختی وار طریقہ کار میں شدت تھی۔ اور یہ دونوں باتیں اس وقت انہیں پسند نہ تھیں۔ مسز بسیٹ کی نظر بندی اور اس کے بعد کے واقعات سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ لیکن مستقل طور پر آگے قدم بڑھانے میں انہیں تامل تھا۔ اس زمانے میں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اعتدال پسند جماعت کی ترکیبیں محض بیکار ہیں لیکن کیا کیا جائے۔ جب تک ہندو مسلم قضیہ طے نہیں ہوتا تمام کوششیں بے سود ہیں چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے تو میں تیز قدم سے قدم نوجوانوں کے دوش بدوش چلنے کو تیار ہوں۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنوء کانگریس نے کانگریس اور لیگ کی مشترکہ اسکیم منظور کر لی۔ اس کا خاکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ہماری ہی گھر میں بیٹھ کر تیار کیا تھا۔ والد کو اس سے بے انتہا مسرت ہوئی کیونکہ اس سے متحدہ جدوجہد کے دروازے کھل گئے تھے۔ اب وہ خوشی خوشی آگے بڑھنے کو تیار تھے چاہے اعتدال پسند جماعت کے پرانے رفقا کا انہیں ساتھ چھوڑنا پڑے پھر بھی وزیر ہند کی حیثیت سے ایڈورڈ ماٹیگو کے ہندوستان آنے تک اور ان کے دورے کے زمانے میں بھی والد ان کے ساتھ رہے۔ اصل اختلاف تو ماٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے شائع ہونے کے بعد شروع ہوا اور بالکل قطع تعلق اس وقت ہو گیا جب 1918 کی گرمیوں میں یو۔ پی کی اسپیشل کانفرنس کا جلسہ میرے والد کی صدارت میں لکھنوء میں منعقد ہوا۔ اعتدال پسندوں نے یہ سمجھ کر

کہ یہ کانفرنس مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کی سخت مخالفت کرے گی۔ پہلے ہی سے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس کے بعد اس اسکیم پر غور کرنے کے لئے کانگریس کا جو خاص اجلاس ہوا اس میں بھی یہ لوگ شریک نہیں ہوئے۔ بس اس زمانے سے اعتدال پسند کانگریس سے علیحدہ ہیں۔

اعتدال پسندوں کی یہ حرکت کہ وہ ہر موقع پر چپکے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے کانگریس کے اجلاس اور دوسرے عام جلسوں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے اور اگر اکثریت مخالف ہوتو اپنا نقطہ نظر پیش کرتے اور اس کے لئے لڑنے کی ہمت بھی نہ کر سکتے۔

میرے نزدیک قومی کام کرنے والوں کو کسی طرح زیب نہ دیتی تھی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، ملک کے اکثر حضرات کی یہی رائے تھی اور مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ جھجک اور بزدلی بھی ایک حد تک انہیں ہندوستنی سیاسیات سے خارج کرنے کا باعث ہوئی۔ جب اعتدال پسندوں کی جماعت نے کانگریس کا بائیکاٹ کر دیا تو پرھ ان میں سے کوئی شخص اس کے جلسوں میں شریک نہیں ہوا۔ البتہ کچھ عرصے صرف مسٹر شاستری شریک ہوتے رہے اور تنہا اپنا نقطہ نظر پیش کرتے رہے۔ اسی سبب سے لوگوں کی نظروں میں ان کی وقعت بڑھ گئی۔

جنگ کے ابتدائی زمانے تک میں سیاسی اور قومی کاموں میں کھل کر حصہ نہ لیتا تھا خاص کر جلسوں میں تقریر کرنے سے بچتا تھا کیونکہ عام مجمع میں زبان کھولتے ہوئے ابھی مجھے خوف اور جھجک سی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ عام جلسوں میں انگریزی میں تقریریں نہ ہونا چاہیے اور اپنے متعلق مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ میں ہندوستانی میں اچھی طرح بول سکوں گا۔ بہر حال الہ آباد میں پہلی مرتبہ میں نے تقریر کی۔ اس وقت کا ایک معمولی سا واقعہ اب تک مجھے یاد ہے۔ غالباً یہ ۱۹۱۵ کا ذکر ہے لیکن مجھے صحیح تاریخوں کا خیال نہیں ہے اور واقعات کا سلسلہ

بھی میرے ذہن میں کچھ غلط غلط سا ہے۔ اس وقت حکومت نے پریس کا گلا دبانے کے لئے ایک نیا قانون بنایا تھا اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا گیا۔ اسی جلسے میں میں نے مجبوراً انگریزی میں نہایت مختصر تقریر کی۔ جلسہ ختم ہوتے ہی ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے ڈائس ہی پر مجھے گلے لگالیا اور بھر مجمع میں پیار کرنا شروع کیا۔ میں گھبرا اٹھا۔ ڈاکٹر سپرو نے جوش کی یہ وجہ نہ تھی کہ میں نے کوئی بڑی بات کہی تھی یا اچھے انداز سے کہی تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں قومی کام تقریروں تک ہی محدود تھا اس لئے وہ پھولے نہ ساتے تھے کہ میں نے مجمع کے سامنے زبان تو کھولی۔ گویا قومی کام کے لئے ایک نیا کارکن ہاتھ آ گیا۔

مجھے خیال ہے کہ الہ آباد کے اکثر نوجوانوں کو اس وقت تھوڑی سی یہ امید تھی کہ شاید ڈاکٹر سپرو سیاسیات میں آگے قدم بڑھائیں۔ اعتدال پسندوں کی ساری جماعت میں انہی سے یہ توقع تھی کیونکہ وہ جذباتی آدمی تھے اور کبھی کبھی جوش میں آجاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں میرے والد بہت ٹھنڈی مٹی کے معلوم ہوتے تھے لیکن اس راکھ کے نیچے کافی آگ دبی ہوئی تھی۔ شروع شروع میں تو ہم ان کی قوت ارادی کی وج سے ان سے مایوس ہو چکے تھے اور ان کے مقابلہ میں ڈاکٹر سپرو سے زیادہ امیدیں رکھتے تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کی قومی خدمات بھی بہت زیادہ تھیں اس لئے ہماری نظریں ان کی طرف بھی بڑھتی تھیں۔ ہم ان سے گھنٹوں بات چیت کرتے اور اس پر زور دیتے کہ اس وقت ملک کی معقول رہبری فرمائیے۔

اس زمانے میں ہمارے گھر میں سیاسی مسائل پر خوب گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ اوجہاں یہ ذکر چھڑا فوراً جھڑپ ہو جاتی تھی والد نہایت غور سے اس چیز کا مطالعہ کر رہے تے کہ میرا رجحان انتہا پسندی کی طرف ہے اور میں سیاست میں باتیں بنانے کا سخت مخالف اور عملی کام کرنے کا حامی ہوں۔ میں کیا عملی کام چاہتا تھا

یہ اسوقت واضح نہ تھا لیکن کبھی کبھی والد کو یہ خیال ہوتا تھا کہ بنگال کے بعض نوجوانوں کی طرح میں بھی تشدد کی طرف جا رہا ہوں۔ اس سے انہیں بڑی تشویش ہوتی تھی حالانکہ میرا رجحان اس طرف قطعی نہ تھا۔ صرف یہ خیال ہر وقت پریشان کیا کرتا تھا کہ موجودہ صورت ہمیں بزدلی کے ساتھ گوارا نہ کرنی چاہیے بلکہ اب کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے لیکن کوئی ایسی نتیجہ خیز کاروائی جس سے قوم کا بیڑا پار ہو آسان نہ تھی۔ تاہم میرے نزدیک ہماری انفرادی اور قومی عزت کا تقاضا یہی تھا کہ ہم غیر ملکی حکومت کے خلاف زیادہ جارحانہ کاروائی کریں۔ والد بھی اعتدال پسندوں کے نظریہ سے دل برداشتہ تھے اور ان کے دماغ میں بھی خاموش کش مکش جاری تھی۔ لیکن ان میں ایک خاص آن تھی جب تک انہیں یقین نہ ہو جاتا کہ اب کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا وہ اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہٹتے۔ ہر نیا قدم وہ خوب سوچ سمجھ کر اٹھاتے اور جو قدم آگے بڑھ جاتا اس کا پیچھے ہٹنا ناممکن تھا ان کا ہر فعل وقتی جوش کا نہیں بلکہ انتہائی غور و خوج کا نتیجہ ہوت تھا اور ایک مرتبہ طے کر لینے کے بعد پھر ان کی غیرت اس کی اجازت بھی نہ دیتی تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں۔

ان کے سیاسی عقائد میں ظاہری تبدیلی مسز بیسنٹ کی نظر بندی کے بعد سے شروع ہوئی۔ اس وقت سے وہ درجہ بدرجہ برابر آگے بڑھتے گئے اور اپنے اعتدال پسند رفقا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا حتی کہ ۱۹۱۹ء میں حادثہ پنجاب کے بعد انہوں نے اپنی قدیم معاشرت اور اپنا پیشہ سب کچھ تج دیا اور گاندھی جی کہ شروع کی ہوئی تحریک میں تن من دھن سے شریک ہو گئے۔

لیکن یہ تو ابھی بہت بعد کا ذکر ہے۔ ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان انہوں نے یہ طے نہیں کیا حتا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کچھ تو ان کے دل میں ابھی شکوک باقی تھے اور کچھ وہ میری طرف سے بہت پریشان تھے۔ اس لئے حالات حاضری پر وہ سکون کے ساتھ گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ اکثر و بیشتر ہماری گفتگو اس طرح یکایک ختم ہو جاتی

تھی کہ وہ بگڑنے لگتے۔

گاندھی جی سے میں پہلے پہل ۱۹۱۲ء میں لکھنو کانگریس میں ملا تھا۔ جنوبی افریقہ میں انہوں نے حکومت جا جس دلیری سے مقابلہ کیا تھا ہم سب اس کے معترف اور مداح تھے لیکن ہم نوجوانوں کو وہ عجیب وغریب شخص اور کچھ غیر سیاسی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے اس وقت کانگریس یا ملک کی سیاست میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور صرف جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے معاملے تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھا۔ اسکے کچھ عرصے بعد ہی انہوں نے چمپارن میں چائے کے کاشتکاروں کی حمایت میں جو معرکے فتح کیے ان سے ہم میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ ہندوستان میں بھی اپنی طریق کار پر عمل کرنے کو تیار ہیں اور اس سے کامیابی کی امید بھی ہوتی ہے۔

لکھنوء کانگریس کے بعد مسز سروجنی نائیڈو نے الہ آباد میں چند پر جوش تقریریں کیں۔ یہ تقریریں حب الوطنی کے جذبے سے لبریز تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان سے بہت متاثر ہوا کیونکہ میں بھی اس وقت خالص قوم پرست تھا اور کالج کے زمانے کے اشتراکی خیالات کب کے دب چکے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں روجر کیس منٹ نے اپنے مقدمے کے دوران میں جو حیرت انگیز تقریر کی اس سے پوری طرح یہ اندازہ ہوا کہ گلام قوم کے ایک فرد کے کیا احساسات ہونا چاہیے۔ پھر آئر لینڈ میں ایسٹر کے زمانے میں ایک بغاوت ہوئی اور ناکام رہی۔ لیکن اس ناکامی میں بھی ایک خاص سبق اور ایک خاص کشش تھی کیونکہ حقیقی جراءت ہمیشہ ناکامیوں پر ہنسا کرتی ہے اور پکار پکار کر کہتی ہے کہ کسی قوم کی روح کو جسمانی قوت سے کچلا نہیں جا سکتا۔

اس وقت میرے یہ خیال تھے لیکن مطالعہ ابھی جاری تھا اس لئے میرے دماغ میں اشتراکی چنگاریاں کبھی کبھی روشن ہو جاتی تھیں۔ ابھی یہ باتیں بہت مبہم سی تھیں

ان کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی بلکہ یہ محض قیاسی اور نوع انسانی کے مفاد سے متعلق تھیں۔
جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد میرا محبوب مصنف برٹرنیڈ رسل تھا۔

ان عقائد کی وجہ سے میرے اندر ایک عجیب کش مکش بڑھتی جا رہی تھی۔اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجھے وکالت کے پیشے سے نفرت ہوتی جاتی تھی لیکن بالفعل میں نے اسے جاری رکھا کیونکہ وکالت چھوڑ دینے کے بعد کوئی کام ہی نہ تھا۔بہر حال یہ مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ قومی کام خاص کر جارحانہ قسم کے قومی کام کے ساتھ جس کا میں حامی تھی، وکالت نبھ نہیں سکیت۔اس وجہ سے نہیں کہ ان میں آپس میں کوئی بیر ہے بلکہ اس لئے کہ دونوں کے لئے پورے وقت اور زور کی ضرورت ہوتی ہے۔کلکتہ کے مشہور وکیل سر راس بہاری گھوش نہ جانے کیوں مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔انہوں نے مجھے وکالت میں کامیابی حاصل کرنے کے سلسلہ میں بہت سے نصیحتیں کیں اور خاص طور پر یہ مشورہ دیا کہ اپنی پسند کو کوئی قانونی موضوع لے کر اس پر کتاب لکھ ڈالو۔ان کا خیال تھا کہ ایک مبتدی وکیل کی تربیت کا یہ سب سے بہتر طریقہ ہے۔انہوں ن ے یہ بھی وعدہ کیا کہ میں اس کتاب کے لئے تمہے کافی مواد دوں گا اور اس پر نظر ثانی بھی کر دوں گا۔لیکن میری وکالت کی کامیابی کے لئے ان کے یہ سب نیک مشورے بیکار تھے۔کیونکہ میرے نزدیک اس سے بڑی کوئی حماقت نہ تھی، کہ میں اپنا وقت اور سارا زور قانونی کتابیں لکھنے پر صرف کر وں۔

بڑھاپے میں سر اس بہاری گھوش بڑے بدمزاج اور چڑ چڑے ہو گئے تھے اور ان کے شاگرد وکیل ان سے خائف رہتے تھے لیکن اس کے باوجود میں انہیں پسند کرتا تھا کیونکہ ان کی کمزوریوں میں بھی کچھ بانکپن ضرور تھا۔ایک مرتبہ والد اور میں شملہ میں ان کے مہمان تھے۔غالباً یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔اس زمانے میں ناٹیگو چیمسفورڈ اسکیم شائع ہوئی تھی۔ایک دن انہوں نے چند دوستوں کی دعوت کی۔ان

میں مسٹر کھاپرڈے بھی تھے۔ یہ دونوں سیاسیات میں بالکل متضاد خیالات رکھتے تھے غرض جبکھانے کے بعد بحث شروع ہوئی تو ان دونوں میں خوب تناتنی ہوگئی۔ سر راس بہاری پکے اعتدال پسند تھے اور مسٹر کھاپرڈے اس زمانے میں تلک کے خاص پیرو سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں تو وہ ایسے نرم ہوگئے کہ اعتدال پسند بھی ان سے ہزار درجے بہتر تھے۔ مسٹر کھاپرڈے نے مسٹر گوکھلے پر (جنہیں انتقال کئے ابھی چند سال ہوئے تھے) اعتراض کرنا شروع کئے اور کہا کہ وہ تو انگریزوں کے مخبر تھے اور لندن میں خود میرے خلاف انہوں نے مخبری کی۔ سر راس بہاری بھلا یہ کب برداشت کرسکتے تھے۔ وہ بپھر گئے اور کہا کہ مسٹر گوکھلے بہترین شخص اور میرے خاص دوست تھے میں انکے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرسکتا۔ اس پر مسٹر کھاپرڈے نے مصتر سری نواس شاستری کی طرف رخ بدل دیا۔ سر راس بہاری نے اگرچہ اسے بھی اچھے کانوں نہیں سنا۔ لیکن کچھ زیادہ غصہ نہ ہوئے کیونکہ وہ مسٹر شاستری کے ایسے معتقد نہ تھے جیسے مسٹر گھوکھلے کے۔ بلکہ انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ جب تک مسٹر گوکھلے زندہ رہے وہ برابر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی مالی امداد کرتے رہے لیکن ان کے انتقال کے بعد سے اپنا چندہ بند کردیا۔ اس کے بعد مسٹر کھاپرڈے تلک کی تعریف کرنے لگے۔ انہوں نے فرمایا تلک ایک عظیم الشان ہستی اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ تو پورے سادھو تھے۔ "سادھو" سر راس بہاری نے جھلا کر فوراً جواب دیا۔ "سادھوں سے مجھے نفرت ہے۔ مجھے ان سے کیا واسطہ!"

---

(۱) میں نے اس کتاب میں اکثر جگہ مسٹر گاندھی یا مہاتما گاندھی کو گاندھی جی لکھا ہے کیونکہ وہ خود اپنے نام کے ساتھ مہاتما کا استعمال پسند نہیں کرتے اور "جی" کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن انگریز مصنفوں کے مضامین اور کتابوں میں اکثر اس کی عجیب عجیب تاویلیں میری نظر سے گذری ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ محبت کا کلمہ ہے یعنی گاندھی جی کے معنی ہیں۔ "اچھے پیارے گاندھی"۔ یہ [illegible] اور ہندوستانی تہذیب سے

ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہمارے یہاں ''جی'' ہر شخص کے نام کے ساتھ عام طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت، لڑکا ہو یا لڑکی یا بچہ۔ اس سے محض احترام ظاہر ہوتا ہے جیسے مسٹر۔ مسز یا مس وغیرہ سے۔ ہندوستانی زبان میں القاب و آداب اور اعزازی خطابوں کی کمی نہیں ہے۔ ''جی'' ان میں سب سے معمولی اور تکلف سے پاک ہے لیکن اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل مکمل ہے۔ میرے بہنوئی آر۔ ایس پنڈت نے مجھے بتلایا کہ لفظ ''جی'' نہایت قدیم اور دقیع تاریخ رکھتا ہے۔ یہ سنسکرت کے لفظ آریہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں معزز یا شریف النسل (وہ مفہوم نہیں جو نازی اس لفظ کا سمجھتے ہیں) رفتہ رفتہ پراکرت میں آریہ بگڑ کر اجا ہو گیا۔ اور پھر اجا صرف ''جی'' رہ گیا۔

میری شادی اور ہمالیہ کا سفر

میری شادی دہلی میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ بسنت پنچمی کا دن تھ جو ہندوستان میں موسم بہار کی آمد آمد کی کبر دیتا ہے۔ اس سال کی گرمیوں میں چند مہینے کے لئے کشمیر گیا۔ اپنے کنبہ کے لوگوں کو تو میں نے نیچے وادی میں چھوڑا اور خود ایک رشتے کے بھائی کے ساتھ کئی ہفتے پہاڑوں پر گھومتا رہا اور لداخ والی سڑک پر بہت دور تک گیا۔

میں نے ان تنگ اور سنسان وادیوں کو جو دنیا میں سب سے اونچے ہیں اور جن کا سلسلہ تبت سطح مرتفع تک چلا گیا ہے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ درہ زوجیلہ کی چوٹی پر سے ایک طرف ہرے بھرے پہاڑ نظر آتے تھے اور دوسری طرف سر بفلک پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور برف کے چشمے ہمارے استقبال کے لئے بڑھ رہے تھے۔ اس کی سرد ہوا تیر کی طرح لگتی تھی۔ دن میں دھوپ بھی خاصی تیز ہوتی تھی اور فضا اتنی صاف تھی کہ ہمیں اکثر چیزوں کے فاصلے کے متعلق دھوکا ہو جاتا تھا یعنی دور کی چیزین بھی بالکل نزدیک معلوم ہوتی تھیں۔ ویرانی بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ آگے چل کر سبزے اور درختوں نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا صرف کھری پہاڑیاں رہ گئیں یا برف۔ البتہ کہیں کہیں پھول نظر آتے تھے جن کو دیکھ کر دکل خوش ہو جاتا۔ مجھے فطرت کے ان ویران اور سنسان رمنوں میں عجیب لطف آتا تھا۔ میری رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا اور وجد کا عالم طاری تھا۔

اس سفر میں ایک عجیب ہیجان خیز واقعہ پیش آیا۔ جب ہم درہ زوجیلہ سے آگے بڑھے تو ایک مقام پر جسے شاید متایاں کہتے ہیں یہ معلوم ہوا کہ امرناتھ کا غار یہاں سے صرف آٹھ میل ہے۔ اگر چہ بیچ میں ایک برف پوش پہاڑ حائل تھا اور اسے عبور کرنا تھا لیکن ہم نے سوچ کہ آٹھ میل کی بھلا کیا حقیقت ہے۔ اپنے جوش اور

ناتجربہ کاری کی بنا پر دل میں ٹھان لی کہ وہاں ضرور پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہم اپنے کیمپ سے (جو ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا) روانہ ہو گئے اور ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ اسی جگہ کا ایک چرواہا ہمارا رہبر تھا۔

ہماری کمر میں رسی بندھی تھی اور اس کی مدد سے ہم برف کی چٹانوں پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہماری مشکلیں بڑھنی شروع ہوئیں اور سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ قلیوں پر اگرچہ کم بوجھ تھا لیکن ان میں سے بعض خون تھوکنے لگے۔ اب برف پڑنی شروع ہوئی اور پہاڑوں پر بری طرح پیر پھسلنے لگے۔ ہم تھک کر پست ہو چکے تھے اور ایک ایک قدم اٹھانے کے لئے خاص کوشش کرنا پڑتی تھی۔ پھر بھی ہم اس احمقانہ حرکت سے باز نہ آئے۔

ہم اپنی کیمپ سے صبح ۴ بجے روانہ ہوئے تھے۔ بارہ گھنٹے کی مسلسل چڑھائی کے بعد برف سے ڈھکا ہوا ایک وسیع میدان نظر پڑا۔ اس کا نظارہ بڑا دلکش تھا کیونکہ برف کی چوٹیاں اس کے چاروں طرف سر نکالے کھڑی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمالیہ کے سر پر موتیوں کا تاج رکھا ہے یا دیوتاؤں کا اکھاڑہ ہے، جس میں بیٹھ کر وہ دنیا کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ برف اور کہر کی وجہ سے بہت جلد یہ منظر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ جس مقام پر ہم تھے اس کی بلندی کیا تھی؟ غالباً ۱۵ یا ۱۶ ہزار فٹ سے کم نہ ہوگی۔ کیونکہ امرناتھ کی غار سے ہم بہت اونچائی پر تھے۔ اب ہمیں اس برف کے میدان کو جو آدھ میل کے قریب تھا عبور کرنے کے بعد دوسری طرف اتر کر امرناتھ پہنچنا تھا۔ ہم نے خیال کیا کہ اب چڑھائی ختم ہو گئی اس لئے ہماری مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ گو ہم تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن کامیابی کی خوشی میں ہم نے سفر کی یہ دوسری منزل بھی شروع کر دی۔ اب بڑی نازک صورت پیش تھی کیونکہ قدم قدم پر کھڈ تھے اور تازہ برف سے بہت سے خطرے کی

جگہیں ڈھک گئی تھیں۔ ایک دفعہ تو اس نے برف نے میری جان ہی لی ہوتی کیونکہ جیسے ہی میں نے اس پر قدم رکھا وہ دھنس گئی اور میں ایک خوفناک کھڈ میں جا پڑا۔ یہ اتنا زبردست اور گہرا تھا کہ اگر کوئی چیز اس کی تہ تک پہنچ جائے تو ہزار سال تک وہاں محفوظ رہ سکتی تھی لیکن میری کمر میں رسی بندھی تھی۔ دوسری کھد کی دیوار سے چمٹ گیا تھا۔ غرض بڑی مشکل سے مجھے باہر کھینچا گیا۔ اگر چہ اس حادثے سے ہماری ہمتوں نے بہت کچھ جواب دے دیا تھا پھر بھی ہم اپنے ارادے پر قائم رہے اور آگے قدم بڑھایا۔ لیکن اب یہ کھڈ تعداد میں جتنے زیادہ بڑھتے جاتے تھے، اتنی ہی ان کی وسعت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ہمارے پاس انہیں عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس لئے مجبوراً ہم تھکے ہارے اور مایوس واپس آئے اور امرناتھ کے غار کو دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

کشمیر کی ان اونچی اونچی وادیوں اور پہاڑوں میں میرا دل کچھ ایسا موہ لیا کہ میں نے ایک بار پھر یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے بارہا کشمیر جانے کی تجویزیں کیں اور طرح طرح سے سفر کے منصوبے باندھے لیکن کوئی پورا نہ ہوا۔ ایک مرتبہ یہ سوچا کہ تبت کی حیرت انگیز جھیل مانسرور اور کیلاش پہاڑ کو جو اس کے نزدیک ہی ہے۔ دیکھنے چلیں گے۔ اس خیال ہی سے میں نے پھولا نہ سماتا تھا۔ لیکن آج اسے کوئی اٹھارہ برس ہو گئے ہیں اور اب بھی میں مانسرور اور کیلاش سے اتنا ہی دور ہوں جتنا پہلے تھا۔ بلکہ اس قدر اشتیاق کے باوجود کشمیر جانا بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ سیاسی اور قومی کاموں کے ہجوم میں گھرتا چلا گیا۔ پہاڑوں پر چڑھنے یا سمندروں کا پار کرنے کے بجائے میری جہاں گردی کی خواہش مجھے جیل خانے لے آئی لیکن اب بھی میں وہاں کے خیال سے اپنا دل بہلایا کرتا ہوں کیونکہ اس سے بھی ایک مسرت حاصل ہوتی ہے اور پھر اس کے سوا جیل خانے میں کام ہی کیا ہے۔ میں اس دن کا تصور کیا کرتا ہوں جب میں ہمالیہ کی سیر کرتا پھروں گا اور اسے پار کر کے

اپنی محبوب جھیل اور پہاڑ پر پہنچ جاؤں گا۔ مگر اس عرصے میں زندگی کی دھوپ کہیں سے کہیں پہنچی۔ جوانی ڈھل چکی ہے اور ابھی اس سے بدتر وقت آنے والا ہے اس لئے کبھی کبھی تو دل میں یہ مایوس کن خیال آنے لگتا ہے کہ کیلاش اور مانسرور دیکھنا میری قسمت میں نہیں ہے۔ شاید بڑھاپا اس کی اجازت نہ دے گا لیکن چاہے منزل مقصود نظر آئے یا نہ آئے سفر میں بجائے خود ایک لذت ہے۔ والیٹر ڈے لا میر نے سچ کہا ہے۔

"یہ پہاڑ میرے دل میں سمائے ہوئے ہیں۔ ان کے خطروں میں شام کے شفق کی رنگینی ہے۔ اور اب تک میری روح میری آنکھوں میں کھلی ہوئی۔ تمہاری پر سکون برف کی تمنا میں تڑپ رہی ہے۔"

سیاسیاست میں گاندھی جی کی آمد

ستیاگرہ اور امرتسر

جنگ عظیم کے خاتمے کے وقت ہندوستان میں ایک خاص بے چینی پائی جاتی تھی اگرچہ بہت دبی ہوئی تھی۔ صنعتوں کو کافی فروغ ہو چکا تھا اور سرمایہ داروں کی بدولت اور اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ چوٹی کے یہ مٹھی بھر آدمی اس جنگ کی بدولت خوب پھلے پھولے تھے۔ قوت حاصل کرنے کی دھن میں ان کی ہوس بڑھ گئی تھی اور وہ اپنے منافع کو کسی کام میں لگانے اور اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے موقے ڈھونڈ رہے تھے لیکن ملک کی اکثریت اتنی خوش نصیب نہ تھی۔ وہ تو اس بوجھ کے ہلکا ہونے کی آس لگائے بیٹھی تھی جو اسے کچلے ڈالتا تھا۔ اوسط طبقے میں ہر جگہ یہ امید پائی جاتی تھی کہ بہت کچھ آئینی تبدیلیاں ہونے والی ہیں جس سے اپنے ملک کی حکومت کی باگ ڈور بڑی حد تک خود ہمارے ہاتھوں میں آجائے گی۔ گویا ہمارے سامنے ترقی کی نئی نئی راہیں کھل جائیں گی اور اس طرح ہمارے دن پھر جائیں گے۔ سیاسی جدو جہد نہایت پر امن اور آئینی طریقے پر برابر بڑھ رہی تھی اور لوگ وثوق کے ساتھ حکومت خود اختیاری کا ذکر کرنے لگے تھے۔ اس بے چینی کے کچھ نہ کچھ آثار عوام میں اور خاص کر کسانوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ پنجاب کے دیہات میں جبریہ بھرتی کی تلخیوں کو یاد کر کے اب تک لوگوں کے دل بے چین ہو جاتے تھے۔ حکومت نے کوما گتا مارو' وغیرہ کے لوگوں کو سازشی مقدموں کے ذریعے جس بے دردی سے کچلا تھا اس سے عام طور پر ناراضی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو سپاہی محاذ جنگ سے واپس آئے تھے وہ پہلے کی طرح کل کے آدمی نہیں رہے تھے۔ ذہنی اعتبار سے ان میں کافی تبدیلی ہوگئی تھی اس لئے ان میں بھی بے اطمینانی کے آثار موجود تھے۔

اتحادیوں نے شرائطِ صلح میں ترکوں کے ساتھ بہت ذلت کا برتاؤ کیا تھا۔ اور خلافت کا تو قلع قمع کر دیا۔ مسلمانوں میں اس پر غم و غصہ کا اظہاری کیا جا رہا تھا۔ اور ہیجان بڑھ رہا تھا۔ ابھی صلح نامہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے لیکن آثار برے نظر آتے تھے۔ بہر حال مسلمان سہ چہ بہت برہم تھے لیکن ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے۔

اس وقت سارے ہندوستان پر شدید انتظار اور امید و بیم کی کیفیت طاری تھی۔ لوگوں کو حکومت سے بڑی امیدیں تھیں لیکن ان میں شک اور تشویش کی جھلک موجود تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب رولٹ بل شائع ہوا۔ اس کی رو سے حکومت کو اندھا دھند مقدمے چلانے اور گرفتاریاں کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اور قانون میں عام طور پر جو احتیاط ہوتی ہے اور جو ضابطے برتے جاتے ہیں اس بل میں ان کا نام تک نہ تھا۔ اس کے شائع ہوتے ہی سارے ہندوستان میں غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حتیٰ کہ اعتدال پسند جماعت بھی اس تحریک میں شریک ہوگئی اور بل کی مخالفت کرنے میں اس نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سچ پوچھئے تو ملک کے گوشہ گوشہ سے ہر خیال کے ہندوستانیوں نے عام طور پر اس کی مخالفت کی۔ پھر بھی ارباب حکومت نے اسے منظور کرا لیا اور یہ قانون بن گیا۔ البتہ اتنی عنایت کی گئی کہ اس کی معیاد صرف تین سال مقرر کی گئی۔

آج پندرہ سال بعد اس بل پر ایک نظر ڈالئے اور اس کی وجہ سے جو طوفان اٹھا تھا اس پر ذرا غور کیجئے تو بہت کچھ سبق مل سکتا ہے۔ یہ قانون نافذ تو ہو گیا لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے اس کی معیاد کے تین برس میں ایک مرتبہ بھی اس سے کام نہیں لیا گیا حالانکہ تین سال کا یہ زمانہ امن اور سکون سے نہیں گزرا بلکہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سب سے زیادہ شورش کا زمانہ تھا۔ غرض حکومت برطانیہ نے عام مخالفت کے باوجود ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جس سے اس نے کبھی کوئی کام نہ لیا اور خواہ مخواہ چھیڑ کر شورش پیدا کی۔ اگر یہ خیال ہو تو بے جا نہیں کہ شاید اس قانون کا مقصد ہی

ہنگامہ پیدا کرنا تھا۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ آج پندرہ برس بعد یہاں ایسے متعدد قانون جو رولٹ بل سے کہیں زیادہ سخت ہیں نافذ ہیں اور ان پر آئے دن عمل بھی ہوتا رہتا ہے اگر موجودہ قوانین اور ہنگامی فرمانوں سے جن کے زیر سایہ ہم برطانوی حکومت کی برکتوں کا لطف اٹھا رہے ہیں، رولٹ بل کا مقابلہ کیا جائے تو وہ آزادی کا پروانہ معلوم ہوگا۔ ہاں ایک فرق ضرور ہے اس وقت ملک کے نظم ونسق میں ہمارا زیادہ ہاتھ نہ تھا۔ لیکن اب ۱۹۱۹ء کے بعد ہمیں نام نہاد حکومت خود اختیاری کی بہت بڑی قسط جسے ماٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کہتے ہیں مل چکی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی بڑی ایک اور قسط ملنے والی ہے۔ یعنی ہم ترقی کر رہے ہیں۔

گاندھی جی اوائل ۱۹۱۹ء میں بہت بیمار پڑ گئے۔ انہوں نے بستر علالت ہی پر سے وائسرائے سے درخوقاست کی کہ وہ رولٹ بل پر اپنی منظوری صادر نہ فرمائیں، لیکن حسب معمول یہ درخواست بھی ٹھکرا دی گئی اور گاندھی جی نے ایک حد تک اپنی مرضی کے خلاف ملک کی عام تحریک کی رہبری پہلے پہل اختیار کی۔ انہوں نے سیتا گرہ سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اسکے ممبروں کو یہ عہد کرنا ہوت تھا کہ اگر رولٹ ایکٹ ہم پر نافذ ہوا تو ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے۔ اس کے علاوہ ان قوانین کو بھی جنہیں سبھا وقتاً فوقتاً قابل اعتراض قرار دے گی تسلیم نہ کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں گویا انہیں کھلم کھلا اور جان بوجھ کر قید گوارا کرنی تھی۔

جب پہلی مرتبہ اخباروں میں یہ تجویز میری نظر سے گزری تو اسے دیکھتے ہی جیسے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ میں نے خیال کیا کہ بالآخر ہماری مشکل کا ایک حل نکل آیا یعنی ایک ایسا طریقہ عمل معلوم ہوگیا جو سیدھا اور سچا بھی ہے اور ممکن ہے موثر بھی ثابت ہو۔ میں جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ فوراً سیتا گرہ سبھا میں شامل ہو جاؤں مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ قانون شکنی کے نتیجے میں جیل جانا ہو

گاے۔ یا اگر آیا بھی تو میں نے اس کی کوئی پروانہ نہ کی۔ یکا یک میرا تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا میں سمجھتا تھا کیونکہ والد پر اس نئی تحریک کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ نئی تجویزوں کی رو میں بہنے کے عادی نہ تھی بلکہ جب کوئی نیا قدم اٹھاتے تھے تو ہمیشہ اس کے نتائج کو اچھی طرح سوچ سمجھ لیتے تھے۔ چنانہ جب انہوں نے سیتا گرہ سبھا اور اسکے پروگرام پر غور کیا تو انہیں یہ چیز بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ فرماتے تھے کہ آخر چند آدمیوں کے جیل جانے سے کیا فائدہ ہوگا اور حکومت پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اصول مخالفت کے علاوہ دراصل ذاتی مصلحتوں سے زیادہ متاثر تھے۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ میں جیل جاؤں۔ جیل میں جانے کا دستور ابھی تک عام نہیں تھا۔ اس لئے قید کے خیال سے ہی لوگوں کو وحشت ہوتی تھی۔ والد کو اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت تھی۔ وہ اپنے جذبات کو ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن س ضبط کے پردے میں محبت کے خزانے چھپے ہوئے تھے۔

ایک مدت تک وہ ذہنی کش مکش میں مبتلا رہے۔ چونکہ ہم دونوں کو اس کا احساس تھا کہ ایسے اہم مسائل درپیش ہیں جن سے ہماری زندگیوں میں ایک انقلاب ہو جائے گا اس لئے جہاں تک ہو سکتا تھا ہم ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ ان کی پریشانی کھلی ہوئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اگر میرے بس کی بات ہو تو میں اسے ضرور رفع کر دوں لیکن یہ میں دل میں ٹھان چکا تھا کہ سیتا گرہ کا راستہ ضرور اختیار کروں گا۔ غرض ہم دونوں بڑی مصیبت میں تھے۔ راتوں کو تنہا ٹہلا کرتا تھا اور اسی ادھیڑ بن میں رہتا کہ اس مشکل کے حل ہونے کی کوئی صورت نکلے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ والد نے فرش پر سونا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جیل خانے میں مجھے زمین ہی پر سونا پڑے گا اس لئے وہ اس کی تکلیف کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔

والد کی دعوت پر گاندھی جی الہ آباد تشریف لائے۔ ان دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں لیکن میں وہاں موجود نہ ہوتا تھا۔ اس گفتگو کا یہ نتیجہ ہوا کہ گاندھی جی نے

مجھے پیش قدمی کرنے سے منع کر دیا اور یہ نصیحت کی کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس سے تمہارے والد پریشان ہوں۔ مجھے ان کی یہ بات کس طرح پسند نہ آئی لیکن اس سے پیشتر کہ میں کچھ طے کروں ہندوستان میں چند واقعات ایسے پیش آئے جن سے تمام صورت حال ہی بدل گئی اور سیتا گرہ سبھا کو اپنی سرگرمیاں بند کرنا پڑیں۔

سیتا گرہ کا دن منایا گیا۔ سارے ملک میں مکمل ہڑتال ہوئی اور تمام کاروبار بند رہا۔ دہلی اور امرتسر میں پولیس اور فوج نے عوام پر گولی چلائی اور بہت سے بے گناہ ہلاک ہوئے امرتسر اور احمد آباد میں بلوہ ہوا۔ جلیانوالے باغ میں قتل عام ہوا۔ پھر پنجاب کا صوبہ باقی ہندوستان سے اس طرح جدا کر دیا گیا جیسے اس پر ایک بھاری پردا پڑا ہو اور باہر والوں کو اندر کی کوئی چیز نظر نہ آئے۔ وہاں سے کوئی خبر بھی نہ آتی تھی۔ نہ وہاں کے لوگ باہر آسکتے تھے اور نہ باہر والوں کو وہاں جانے کی اجازت تھی۔

اکا دکا کوئی شخص جو اس آت سے نکل بھاگتا تھا وہ اتنا بدحواس ہوتا تھا کہ وہاں کو کوئی حال بیان نہ کرسکتا تھا۔ ہم باہر وائے بیکسی اور لاچاری میں ذرا ذرا سی خبروں کا آسرا لگائے بیٹھے رہتے تھے اور نفرت ہمارے دلوں میں گھر کر رہی تھی۔ ہم میں سے بعض لوگ اس پر تلے ہوئے تھے کہ کھلم کھلا پنجاب کے مصیبت زدہ علاقے میں جائیں اور مارشل لاء کے ضابطوں کی خلاف ورزی کریں لیکن ہمیں برابر روکا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں تحقیقات کرنے اور مظلوموں کو امداد پہنچانے کے لئے ایک بہت بڑا ادارہ قائم ہوا۔

حکومت نے خاص خاص علاقوں سے مارشل لا ہٹالیا اور باہر والوں کو وہاں جانے کی اجازت ہوئی تو بڑے بڑے کانگریسی لیڈر اور دوسرے کارکن چاروں طرف سے پنجاب پہنچ گئے اور انہوں نے امداد اور تحقیقات کے کام کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ امدادی کام تو بیشتر پنڈت مدن موہن جی مالویہ اور سوامی شردھا

نند جی کی رہبری میں ہوا اور تحقیقاتی کام زیادہ تر میرے والد اور مسٹر آر داس نے انجام دیا۔ گاندھی جی اس کام میں خاص طور پر دلچسپی لے رہے تھے اور اکثر کام کرنے والوں کو مشورے دیتے تھے۔ دیش بندھو داس نے امرتسر کے علاقے کی تحقیقات اپنے ذمے لے اور میں ان کے ساتھ کیا گیا تا کہ ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کے ساتھ اور ان کی ماتحتی میں کام کیا اور اس طرح مجھے جو تجربہ حاصل ہوا میں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ ان کی خوبیوں کو دیکھ کر میرے دل میں ان کی عزت بہت بڑھ گئی۔ جلیانوالا باغ اور اس بدنصیب گلی کے متعلق جہاں انسانوں کے پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ زیادہ تر شہادتیں ہماری موجودگی میں گزریں۔ یہ شہادتیں بعد کو کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں شائع ہوگئیں۔ اس سلسلے میں ہم بارہا جلیانوالا باغ بھی گئے اور اس کے چپے چپے کا نہایت غور سے جائزلیا۔

جہاں تک مجھے خیال ہے ایک مرتبہ مسٹر ایڈورڈ تھامسن نے جنرل ڈائر کی حمایت میں ایک عجیب توجیہ کی تھی۔ یعنی جنرل ڈائر کو یہ گمان تھا کہ باغ میں نکاس کے دوسرے راستے بھی ہیں اس لئے وہ اتنی دیر تک گولی چلاتے رہے۔ مانا کہ جنرل ڈائر کو یہ غلط فہمی تھی یا واقعی وہاں دوسرے دروازے موجود بھی تھے لیکن ان کی ذمہ داری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بہرحال ان کا یہ خیال کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کوئی شخص اگر اس بلند جگہ پر کھڑا ہو جہاں وہ کھڑے تھے تو باغ کی ساری زمین اس کی نظر کے سامنے ہوگی اور اسے یہ صاف دکھائی دے گا کہ وہ چاروں طرف سے کئی کئی منزل کے مکانوں سے گھرا ہوا ہے۔ صرف ایک جگہ کوئی سو فٹ کے قریب مکان نہیں ہیں بلکہ پانچ فٹ کی ایک نیچی سی دیوار بنی ہے۔ ایک تو گولیوں کا قاتلانہ بوچھار کشتوں کے پشتے لگا رہی تھی۔ دوسرے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا اسلئے ہزاروں آدمی اس دیوار پر ٹوٹ پڑے اور اسے پھاندنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ

دیکھ کر مشین گن کا رخ اس طرح کر دیا گیا تا کہ لوگ زندہ نہ بچنے پائیں۔ یہ بات ہماری فراہم کردہ شہادتوں سے اور اس دیوار پر گولی کے بے شمار نشانوں سے ثابت ہوتی ہے اس کا ثبوت بھی موجود ہے کہ جب سارا قصہ ختم ہو گیا تو دیوار کے دونوں طرف مردوں اور زخمیوں کے ڈھیر لگے تھے۔

۱۹۱۹ء کے آخر میں مجھی ءرات کی گاڑی سے امرتسر سے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں جس ڈبے میں داخل ہوا وہ بالکل بھرا ہوا تھا۔ اوپر کے ایک گدے کے سوا سب مسافر سو رہے تھے۔ چنانہ میں اس خالی گدے پر لیٹ گیا۔ صبح اٹھ کر معلوم ہوا کہ میرے سب ہم سفر فوجی افسر ہیں۔ وہ زور زور سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے جو خواہ مخواہ میرے کانوں میں پڑتی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص بڑے فاتحانہ انداز سے گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جلیانوالہ باغ کے سورما جنرل ڈائر یہی ہیں اور اپنے امرتسر کے مشاہدات بیان کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی دون میں فرمایا کہ اس وقت سارا سرکش شہر میرے رحم و کرم پر تھا اگر میں چاہتا تو اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیتا لیکن میں نے رحم کھا کر چھوڑ دیا۔ وہ لاہور میں ہنٹر کمیٹی کے روبرو اپنی شہادت دے کر واپس آ رہے تھے۔ مجھے ان کی گفتگو سن کر اور ان کی یہ شکاوت دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔ وہ دہلی کے اسٹیشن پر گلابی دھاری کا پاجامہ اور ڈریشنگ گون پہنے ہوئے اتر گئے۔

پنجاب کی اس تحقیقات کے دوران میں گاندھی جی کو میں نے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا۔ اکثر ہماری کمیٹی کو ان کی تجویزیں عجیب و غریب معلوم ہوتی تھیں۔ شروع میں وہ انہیں پسند بھی نہ کرتی تھی۔ لیکن گاندھی جی ہمیشہ اس طرح بحث کرتے اور ایسی ایسی ولیلیں پیش کرتے کہ انہیں تسلیم کرا کے چھوڑتے پھر بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہو جاتا کہ ان کا مشورہ واقعی نہایت معقول تھا۔ اس طرح ان کی سیاسی بصیرت پر مجھے اعتماد ہو گیا۔

والد پر پنجاب کے حادثہ اور اس کی تحقیقات کا بہت گہرا اثر پڑا۔ ان چیزوں نے جیسے ان کے قانونی اور آئینی خیالات کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اور ان کا دماغ رفتہ رفتہ اس انقلاب کے لئے تیار ہو گیا جو ایک سال بعد ان کی زندگی میں لانے والا تھا۔ وہ اعتدال پسندی کے پرانے عقیدے کو تو کب کا ترک کر چکے تھے۔ سب سے بڑے اعتدال پسند اخبار لیڈر (الہ آباد) سے دل برداشتہ ہو کر انہوں نے اوائل ۱۹۱۹ء میں الہ آباد سے ایک دوسرا روزنامہ انڈی پینڈینٹ کے نام سے نکالا۔ اس اخبار کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن شروع ہی سے اس کا انتظام بہت خراب تھا اور اس کی ذمہ داری کسی نہ کسی حد تک ڈائریکٹر، ایڈیٹر، میجر اور ان کے عملے، سب پر عائد ہوتی تھی۔ میں بھی اس کا ڈائرکٹر تھا حالانکہ مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس کے جھگڑے قضیوں سے میری رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ بہر حال اس کی جاری ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے اور والد دونوں کو پنجاب جانا پڑا۔ ہماری اس طویل غیر موجودگی میں اخبار کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی اور وہ مالی مشکلات میں پھنس گیا۔ اس مصوبیت سے پھر وہ کبھی نہ نکل سکا۔ اگر چہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں اس نے کچھ سنبھالا لیکن ہمارے جیل جانے کے بعد تو رہا سہا شیرازہ بھی بکھر گیا اور ۱۹۲۳ء میں وہ بالکل بند ہو گیا۔ اخبار کی ملکیت کے اس تلخ تجربے نے میرے ایسے اوساط خطا کئے کہ اس کے بعد پھر کبھی میں نے کسی اخبار کا ڈائرکٹر بننا منظور نہ کیا۔ اس کے علاوہ میں یہ بار کیسے اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یا تو میں جیل میں رہتا تھا یا اگر باہر ہوتا تو اور کام کیا کم تھے۔

۱۹۱۹ء کے آخری ہفتہ میں والد نے امرتسر کانگریس کی صدارت فرمائی۔ انہوں نے اعتدال پسند یا لبرل لیڈروں کے نام (جنہوں نے اب یہ لقب اختیار کر لیا تھا) ایک دردناک اپیل شائع کی اور ان سے درخواست کی کہ مارشل لاء کی تباہ کاریوں نے جو نئی صورت حالات پیدا کر دی ہے اس کا لحاظ کر کے آپ اس اجلاس میں

ضرور شریک ہوں۔ اس اپیل میں والد نے لکھا تھا کہ پنجاب کا دل جو زخموں سے چور چور ہے آپ کو پکار رہا ہے۔ کیا آپ اس کی آواز پر لبیک نہ کہیں گے؟ لیکن انہوں نے والد کی حسب منشا جواب نہیں دے اور شرکت سے انکار کر دیا۔ ان کی امیدیں تو ان نئی اصلاحات کی طرف لگی ہوئی تھیں جو مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ کی سفارشوں کی بنا پر نافذ ہونے والی تھیں۔ اس انکار سے والد کو بہت صدمہ ہوا اور ان کے اور لبرل جماعت جو خلیج حائل ہو چکی تھی وہ زیادہ وسیع ہو گئی۔

امرتسر کانگریس گویا پہلی گاندھی کانگریس تھی۔ لوکمانیہ تلک بھی اس میں شریک ہوئے اور اس کی کاروائی میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مندوبین کی اکثریت کی، اور ان سے زیادہ اس مجمع کی، جو باہر موجود تھا۔ رہنمائی کے لئے گاندھی جی پر نظر پڑتی تھی۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی مطلع پر ''مہاتما گاندھی کی جے'' کا نعرہ چھا رہا تھا۔ علی برادارن اسی زمانے میں نظر بندی سے رہا ہوئے اور فوراً کانگریس کی شرکت کے لئے امرتسر پہنچ گئے۔ اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت اور نئی حیثیت اختیار کرنا شروع کر دی۔

مولانا محمد علی اس کے بعد ہی خلافت کا وفد لیکر یورپ چلے گئے۔ ہندوستان میں خلافت کمیٹی پر روز بروز گاندھی جی کا اثر بڑھتا گیا اور اس نے ان کے پر امن ترک موالات کے اصولوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ مجھے خلافت کے رہنماؤں اور علماء ک ایک ابتدائی جلسہ یاد ہے جو دہلی میں جنوری ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا۔ خلافت کا ایک وفد وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہونے والا تھا اور گاندھی جی بھی اس میں شریک ہونے کو تھے۔ لیکن گاندھی جی کے دہلی پہنچنے سے پہلے مجوزہ ایڈریس کی ایک نقل حسب رواج وائسرائے کو بھیج دی گئی۔ جب گاندھی جی نے آ کر مسودہ پڑھا تو اسے سخت ناپسند کیا اور یہاں تک کہا کہ اگر اس میں معقول ترمیم نہ کی گئی تو میں وفد میں شریک نہ ہوں گا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ ایڈریس نہایت مبہم ہے اور اس میں

محض لفاظی سے کام لیا گیا ہے اور مسلمانوں کے کم سے کم مطالبوں کو واضح طور پر پیش نہیں کیا ہے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ نہ وائسرائے کے ساتھ انصاف ہے نہ برطانوی حکومت کے ساتھ، نہ قوم کے ساتھ اور نہ خود اپنے ساتھ۔ وہ کہتے تھے کہ آپ کو ایسے لمبے چوڑے مطالبے پیش نہ کرنا چاہیں جن پر زور دینے کے لیے آپ تیار نہ ہوں بلکہ ایسے الفاظ میں جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، وہ مطالبے صاف صاف پیش کر دینا چاہیے۔ اگر محض باتیں بنانا مقصود نہیں ہے اور سچ مچ آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو صرف یہی باعزت اور سیدھا سچا راستہ ہے۔

ہندوستان کے سیاسی اور غیر سیاسی حلقوں میں یہ خیال بالکل نیا تھا۔ ہم لوگ تو مبالغے اور لفاظی کے عادی تھے اور ہمیشہ ہمارے دماغ میں سودا چکانے کا خیال رہتا تھا۔ بہر حال گاندھی جی اپنے خیال پر جمے رہے اور وائسرائے کے پرائیوٹ سکرٹری کو ایک خط لکھا کہ مجوزہ ایڈریس مبہم اور ناقص ہے اور اس کے ساتھ چند نئے پیرہ گراف اضافہ کرنے کے لئے بھیجے جن میں کم سے کم مطالبے درج کر دیئے تھے۔ وائسرائے نے بہت دلچسپ جواب دیا۔ انہوں نے یہ نئے پیرہ گراف شامل کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ اصل ایڈریس ہی میری رائے میں مناسب ہے۔ گاندھی جی کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اس مراسلت کے بعد مجھ پر اور خلافت کمیٹی پر اب کوئی ذمہ داری نہیں رہی اس لئے وہ وفد میں شریک ہو گئے۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت خلافت کمیٹی کے مطالبات پورے کرنے والی نہ تھی اور لڑائی یقینی تھی اس لئے علماء سے ترک موالات اور خصوصاً عدم تشدد پر طول طویل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ گاندھی جی نے ان سے یہ کہا کہ میں آپ کی خدمت کے لئے دل و جان سے حاضر ہوں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ عدم تشدد اور اس کے تمام لوازم کو پوری طرح تسلیم کریں۔ یہ نہ ہو کہ دل میں شبہ باقی رہے اور آگے چل کر اس اصول کی پابندی میں ڈھیل ڈال دی جائے یا ٹال مٹول سے کام لیا جائے۔

عدم تشدد کا اصول علماء کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آ سکتا تھا۔ بہر حال وہ اس پر رضامند ہو گئے، لیکن یہ واضح کر دیا کہ ہم اسے عقیدے کی حیثیت سے نہیں بلکہ سیاسی مصلحت کے طور پر اختیار کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا مذہب حق کی حمایت میں تشدد کی اجازت دیتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں سیاسی تحریک اور خلافت کی تحریک نے ساتھ ساتھ قوت پکڑی دونوں ایک ہی راستے پر چلنے لگیں۔ آخر جب کانگرس نے گاندھی جی کے پر امن ترک موالات کا اصول تسلیم کر لیا تو دونوں بالکل مل گئیں۔ خلافت کمیٹی پہلے ہی یہ اصول تسلیم کر چکی تھی اور یکم اگست اس لڑائی کے شروع کرنے کے لئے مقرر کر گئی تھی۔

سال کے آغاز میں اس طریقہ کار پر غور کرنے کے لئے مسلمانوں کا ایک جلسہ (شاید یہ مسلم لیگ کونسل کا جلسہ تھا) الہ آباد میں سید رضا علی کے مکان پر منعقد ہوا۔ مولانا محمد علی ابھی یورپ سے واپس نہ آئے تھے البتہ مولانا شوکت علی موجود تھے۔ مجھے اس جلسہ کا منظر یاد ہے کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے انتہائی مایوسی ہوئی تھی۔ مولانا شوکت علی تو واقعی سرتاپا جوش تھے لیکن ان کے سوا باقی سب لوگ بہت افسردہ اور گھبرائے ہوئے تھے۔ بظاہر وہ کوئی سخت کاروائی کرنے کو تیار نہ تھے لیکن مخالفت کرنے کی بھی ان کی ہمت نہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کیا یہ لوگ ایک انقلابی تحریک کی رہنمائی کریں گے اور سلطنت برطانیہ کا مقابلہ کریں گے؟ گاندھی جی نے ان کے سامنے تقریر کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس تقریر کو سن کو وہ پہلے سے زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے خاص تحکمانہ انداز میں تقریر کی۔ انکی گفتگو میں کافی انکسار لیکن ہیرے کی سی صفائی اور سختی تھی۔ ان کا لہجہ خوشگوار اور نرم تھا لیکن انتہائی صداقت اور استقلال کو ظاہر کرتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نرمی اور گہرائی تھی لیکن ان سے طوفان خیز سرگرمی اور عزم کے شرارے نکل رہے تھے۔ انہوں نے

فرمایا۔ ''ایک زبردست دشمن سے بہت بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ اگر آپ اس جنگ میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو جانا چاہیے اور اپنے آپ کو عدم تشدد اور انضباط کا نہایت سختی سے خوگر کرنا چاہیے۔ جب جنگ چھڑتی ہے تو فوجی قانون نافذ ہوتا ہے اس لئے اگر ہمیں فتح حاصل کرنا ہے تو ہماری پرامن جنگ میں بھی مختار کل کی حکومت اور فوجی قانون کا دور دورہ ہوگا۔ آپ کو پورا اختیار رہے کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں مجھے نکال باہر کریں مجھے سزا دیں یا میرا سر اڑا دیں۔ لیکن جب تم آپ مجھے اپنا سپہ سالار تسلیم کریں آپ کو میری شرائط ماننا پڑیں گی۔ یعنی مختار کل کے حکم کی تعمیل اور فوجی ضابطے کی پابندی کرنا پڑے گی۔ مگر یہ حکومت آپ کی خوشنودی اور رضامندی پر منحصر ہوگی اور اس میں آپ کے اشتراک عمل کی ضرورت ہوگی اس لئے جس وقت آپ کا مجھ سے جی بھر جائے مجھے نکال دیجیے گا۔ کچل ڈالئے گا یقین کیجیے کہ میں شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ لاؤں گا۔

غرض کہ اس قسم کی کچھ باتیں گاندھی جی نے کیں۔ ان فوجی اصطلاحوں سے اور کہنے والے کے اٹل جوش صداقت سے اکثر سامعین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن مولانا شوکت علی وہاں موجود تھے تاکہ قدم نہ اکھڑنے دیں۔ چنانچہ جب رائے شماری کا وقت آیا تو اکثرت نے شرماحضوری میں چپ چاپ اس تجویز، یعنی جنگ کے حق میں رائے دے دی۔

جلسے سے واپس ہوتے وقت میں نے گاندھی جی سے پوچھا کہ کیا جنگ اسی طرح شروع کی جاتی ہے۔ مجھے تو جوش وخروش کی توقع تھی، ولولہ انگیز تقریریں سننے کی امید تھی۔ میں آنکھوں سے شعلے نکلتے دیکھنا چاہتا تھا، لیکن اس کے خلاف وہاں تو ادھیڑ عمر کے ضعیف القلب حضرات کا بے ضرور اجتماع تھا۔ مگر انہی لوگوں کو رائے عامہ سے مجبور ہو کر اعلان جنگ کرنا پڑا۔ دراصل ان میں سے بہت تھوڑے حضرات

بعد کو میدان میں آئے۔ بہتوں نے سرکاری عہدوں کی پناہ لے لی۔ مسلم لیگ نہ اس وقت مسلمانوں کی رائے عامہ کی کوئی معقول نمائندگی کرتی تھی اور نہ اب کرتی ہے۔ البتہ ۱۹۲۰ء کی خلافت کمیٹی زیادہ نمائندہ اور بااثر جماعت تھی اور یہی جماعت پورے جوش وخروش کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئی۔

عدم تعاون کے افتتاح کے لئے مہاتما جی نے یکم اگست مقرر کی تھی۔ اگرچہ کانگریس نے ابھی باضابطہ اس تجویز کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسی روز لوکمانیہ تلک کا بمبئی پہنچے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا اور اس عظیم الشان مظاہرے میں شریک ہوا جس میں اس قدر زبردست مجمع تھا کہ معلوم ہوتا تھا بمبئی کی لاکھوں کی آبادی اپنے محبوب رہنما سے اظہار عقیدت کرنے کے لئے اُمڈ آئی ہے۔

میرا مسوری سے شہر بدر ہونا

اور اس کے نتیجے

شروع میں میرے سیاسی خیالات بھی وہی تھے جو شہری اوسط طبقے کے ہوتے ہیں کیونکہ میں اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس زمانے میں (بلکہ بڑی حد تک اب بھی) متوسط طبقہ ملکی سیاست پر حاوی تھا۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں اسی طبقے کی نمائندگی اور مختلف صورتوں سے انہی کی بہتری کی کوشش کرتے تھے۔ اعتدال پسند تو خص کر متوسط طبقے کے اونچے درجے کے ان مٹھی بھر لوگوں کے نمائندے تھے جو برطانوی دور میں پھلے پھولے ہیں۔ اس لئے وہ ایسی فوری تبدیلی گوارا نہیں کر سکتے تھے جس سے ان کی موجودہ حیثیت اور ذاتی مفاد خطرے میں پڑ جائے۔ برطانوی حکومت اور زمینداروں کے اعلیٰ طبقے سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ رہے انتہا پسند تو وہ بھی متوسط طبقے کے نیچے درجے کے لوگوں کے نمائندے تھے۔ کارخانے کے مزدوروں میں جن کی تعداد جنگ کی وجہ سے کافی بڑھ گئی تھی بعض بعض جگہ محض مقامی طور پر تنظیم تھی اور ان کا اثر بہت ہی کم تھا۔ کسان بیچارے نا سمجھ فلاکت زدہ اور مصیبتوں کا شکار تھے، وہ اپنی بدنصیبی پر صابر وشاکر رہتے تھے اور حکومت، زمیندار، مہاجن، ادنیٰ عہدے دار، پولیس، وکیل، مذہبی پیشوا غرض ہر ایک انہیں کچلتا اور لوٹتا تھا۔

کوئی اخبار بیں شخص مشکل سے اس کو تصور کر سکتا تھا کہ ہندوستان میں لاکھوں کسان اور مزدور بھی بستے ہیں یا کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ اینگلو انڈین اخبارات تو اعلیٰ افسروں کے مشاغل کی خبروں سے بھرے ہوتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے شہروں اور پہاڑوں کے رہنے والے انگریزوں کی تفریحوں کا ان کی دعوتوں، ناچ رنگ کی محفلوں اور کھیل تماشوں کا حال خوب تفصیل سے لکھا جاتا تھا۔ ہندوستانی نقطہ نظر

سے کوئی تذکرہ نہ کرتا تھا حتی کہ کانگریس کے اجلاسوں کا حال بھی کسی پچھلے صفحے پر چند سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ دراصل اس قسم کی خبروں کو وہ کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ ہاں اگر کوئی ہندوستانی خواہ معروف ہو یا غیر معروف کانگریس کا مذاق اڑاتا تھا یا اس پر نکتہ چینی کرتا تھا تو اسے خوب بڑھا چڑھا کر لکھتے تھے۔ کبھی کبھی کسی ہڑتال کا مختصرا سا ذکر ہوتا تھا اور دیہی علاقے صرف اس وقت نمایاں ہوتے تھے جب وہاں کوئی بلوہ ہو جاتا تھا۔

ہندوستانی اخبار اپنے اینگلو انڈین معاصرین کی نقل کرتے تھے۔ لیکن قومی تحریکوں کو ذرا زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ویسے انہیں بھی چھوٹے بڑے عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر اور ان کے تبادلے اور ترقیوں سے دلچسپی تھی۔ جب کبھی کسی افسر کا تبادلہ ہوتا تو الوداعی پارٹی کا ہونا لازمی تھا اور ایسے موقعوں پر ہمارے اخبارات یہ ضرور لکھتے کہ "بڑے جوش و خروش کا اظہار کر گیا" اگر کسی زرعی علاقے کا نیا بدوبست ہوتا جس سے ہمیشہ حکومت کی مالگذاری میں اضافہ ہوا کرتا ہے تو یہ اخبار ضرور کچھ شور مچاتے کیونکہ اس کا اثر زمیندار کی جیب پر پڑتا تھا۔ غرض اس مرقع میں غریب کسان کہیں نظر نہ آتا۔ عموماً ان اخباروں کے مالک زمیندار یا کارخانے دار ہوتے تھے اس لئے وہی ان کی پالیسی پر حاوی ہوتے تھے۔ یہ تھی ان اخباروں کی حقیقت جسے "قومی پریس" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اپنے ابتدائی زمانے میں خود کانگریس برابر مطالبہ کیا کرتی تھی کہ ان علاقوں میں بھی استمراری بندوبست کر دیا جائے جہاں اب تک نہیں ہے۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ زمینداروں کے حقوق مسلم ہو جائیں۔ کسانوں کا کوئی خیال نہ تھا۔

لیکن پچھلے بیس برس میں قومی تحریک کی وجہ سے حال بدل گئی ہے اب تو اینگلو انڈین اخبار بھی ہندوستانی سیاسیات کے لئے جگہ نکالنے پر مجبور ہیں ورنہ ہندوستانی نہیں ہرگز نہ خریدیں۔ لیکن وہ ہندوستانی مسائل کو اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں

ہندوستانی اخباروں کی نظر بھی کچھ وسیع ہوگئی ہے۔اب وہ بھی مزدوروں اور کسانوں کا تذکرہ مربیانہ انداز میں کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی ایک فیشن ہوگیا ہے۔اسکے علاوہ ان کے خریداروں کو دیہی اور صنعتی معاملات سے زیادہ دلچسپی ہوتی جاتی ہے۔لیکن حقیقت میں جیسے وہ پہلے اپنے مالکوں یعنی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مفاد کی حمایت کرتے تھے اسی طرح اب بھی کرتے ہیں۔ بہت سے والیان ریاست بھی اخباروں میں روپیہ لگانے لگے ہیں۔وہ اس ترکیب سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی کوڑی کوڑی وصول کرلیتے ہیں۔اکثر اخباروں کے مالک اور نگراں کانگریس کا نام لوگوں میں بہت مقبول ہے اس لئے بہت سے افراد اور بہت سی جماعتیں اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔کچھ اخبار ایسے بھی ہیں جو زیادہ آزاد خیالی سے کام لیتے ہیں لیکن انہیں مطالبہ کے سخت قوانین اور سنسر کا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اخبار بند نہ کردیا جائے یا ضمانت نہ طلب کرلی جائے۔

۱۹۲۰ء میں مجھے کھیتوں یا کارخانوں کی حالت کا بالکل علم نہ تھا کیونکہ میرے سیاسی خیالات کی مصیبت میں گرفتار ہے اس لئے آزادی حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔لیکن یہ میں اچھی طرح سمجھتا کہ آزادی کے بعد متوسط طبقہ ملک کی سیاست پر حاوی ہوجائے گا۔چمپارن (بہار) اور کیرا (گجرات) میں گاندھی جی کی زرعی تحریکوں کے بعد مجھے کسانوں کے مسئلے سے بھی کچھ دلچسپی ہوگئی تھی۔لیکن ۱۹۲۰ء کے سیاسی ہنگاموں اور ترک موالات کی تحریک سے جو شروع ہونے والے ہی تھی۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ اس طرف کچھ توجہ کرتا۔

اس زمانے میں مجھے ایک نئی چیز سے دلچسپی پیدا ہوگئی جو آگے چل کر میری زندگی میں خاص اہمیت اختیار کرنے والی تھی، یعنی تقریباً بلا ارادے مجھے کسانوں سے سابقہ پڑا اور اس کی عجیب صورت ہوئی۔

میری ماں اور میری بیوی کملا دونوں کچھ بیمار تھیں اس لئے مئی ۱۹۲۰ء کے پہلے
ہفتے میں، میں انہیں مسوری لے گیا۔ میرے والد اس وقت ایک بڑی ریاست کے
مقدمے کی پیروی کر رہے تھے اور مسٹر سی۔آر۔ داس دوسرے فریق کے وکیل
تھے۔ ہم مسوری کے سیوائے ہوٹل میں جا کر اترے۔ امان اللہ خاں کے تخت نشین
ہونے کے بعد افغانستان اور برطانیہ میں ۱۹۱۹ء میں ایک مختصر سی جنگ ہو گئی تھی۔
اس زمانے میں ان دونوں حکومتوں کے نمائندے مسوری میں موجود تھے اور
مصالحت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ افغانی نمائندے سیوائے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے
لیکن وہ سب سے الگ تھلک رہتے تھے۔ الگ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ہوٹل کے عام
کمرے میں کبھی قدم نہ رکھتے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک مہینے کے قیام
میں ان میں سے کسی شخص کو میں نے دیکھا تک نہ تھا یا اگر دیکھا بھی ہو تو پہچانتا نہ تھا۔
یکایک ایک دن شام کے وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس ہمارے یہاں پہنچے اور صوبہ متحدہ
کی حکومت کا ایک خط مجھے دکھایا، جس میں مجھ سے اس قسم کے اقرار نامہ کا مطالبہ کیا
تھا کہ میں افغانی وفد سے کوئی راہ و رسم یا تعلق نہ رکھوں گا۔ یہ بات مجھے عجیب سی
معلوم ہوئی۔ کیونکہ پچھلے ایک مہینہ کے قیام میں، میں ان میں سے کسی سے نہیں ملا تھا
نہ آئندہ اس کی کوئی امید تھی۔ سپرنٹنڈنٹ موصوف بھی یہ بات اچھی طرح جانتے
تھے۔ کیونکہ وہ ان کی خاص نگرانی کر رہے تھے اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس کے
سینکڑوں آدمی لگے ہوئے تھے۔ بہر حال اس طرح کا اقرار نامہ لکھنا میری طبعیت
کے خلاف تھا اس لئے میں نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر آپ دہرہ
کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل لیں تو اچھا ہو، میں نے ان کی اس تجویز کو منظور کر لیا
اور ان سے ملا لیکن چونکہ میں اقرار نامہ لکھنے سے برابر انکار کرتا رہا اس لئے مجھے حکم
دیا گیا کہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر دہرہ دون کے ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ اس کا
یہ مطلب تھا کہ مسوری سے میں چند گھنٹے کے اندر روانہ ہو جاؤں۔ میرا دل تو نہ چاہتا

تھا کہ اپنی بیماریاں اور بیوی کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ لیکن اس وقت سول نافرمانی شروع نہیں ہوئی تھی اس لئے میں نے اس حکم کی خلاف ورزی کرنا مناسب نہ سمجھا اور مسوری سے روانہ ہو گیا۔

اس زمانے میں سرہارکورٹ بٹلر صوبہ متحدہ کے گورنر تھے۔ میرے والد انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے والد نے انہیں ایک دوستانہ خط لکھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ احمقانہ حکم یقیناً آپ نے جاری نہ کیا ہوگا بلکہ شملہ کے کسی حضرت کی یہ کارستانی ہے۔ سرہارکورٹ نے جواب دیا کہ یہ حکم تو بالکل بے ضرر سا تھا اور اگر جواہر لال اس کی تعمیل کر دیتے تو اس میں ان کی کوئی بے عزتی نہ ہوتی۔ والد نے انہیں پھر خط لکھا اور ان کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ بالفعل اگرچہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن اس کی والدہ یا بیوی کی علالت کی وجہ سے کوئی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اس حکم کی ذرا پروا نہ کرے گا اور ضرور مسوری جائے گا۔ اتفاق سے میری والدہ کی طبعیت زیادہ خراب ہو گئی۔ یہ اطلاع پاتے ہی والد اور میں دونوں فوراً مسوری کو روانہ ہو گئے۔ لیکن روانگی سے ذرا پہلے ہمیں حکومت کا تار ملا کہ وہ حکم منسوخ کر دیا گیا ہے اور تمہیں مسوری جانے کی آزادی ہے۔

دوسرے دن صبح ہم مسوری پہنچے تو ہوٹل کے صحن میں سب سے پہلے ہماری نظر ایک افغان پر پڑی جو میری ننھی بچی کو گود میں لئے کھلا رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ افغانستان کے وزیر اور اس وفد کے رکن ہیں۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ میرے شہر بدر کئے جانے کے بعد ہی افغانیوں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی اور انہیں ہم لوگوں سے اتنا تعلق خاطر ہو گیا کہ سالار وفد روزانہ میری ماں کو پھلوں اور پھولوں کی ایک ٹوکری بھیجا کرتے۔

اس کے بعد والد اور میں وفد کے دو ایک ارکین سے ملے اور ان لوگوں نے

ہمیں افغانستان آنے کی دعوت دی۔ افسوس ہے کہ ہمیں وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔ معلوم نہیں کہ وہاں کے جدید انقلابات کے بعد بھی ان کی وہ دعوت قائم ہے یا اب منسوخ ہوگئی۔

مسوری سے شہر بدر کیئے جانے کے بعد میں دو ہفتہ تک الہ آباد میں رہا اس زمانے میں کسانوں کی تحریک سے مجھ کچھ لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لگاؤ بڑھتا گیا اور اس سے میری ذہنیت پر بہت کچھ اثر پڑا۔ اکثر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر میں مسوری سے نکالا نہ گیا ہوتا اور اس زمانے میں الہ آباد میں بیکار نہ ہوتا تو اس وقت میرا کیا رنگ ہوتا۔ بہر حال کبھی نہ کبھی تو کسانوں کی تحریک سے مجھے ضرور سابقہ پڑتا لیکن شاید اس کی نوعیت مختلف ہوتی ور مجھ پر اس کا اثر بھی کچھ اور ہوتا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتہ میں کوئی دو سو کسان ضلع پا تاب گڈھ سے پچاس میل چل کر الہ آباد پہنچے تا کہ مقتدر رہنماؤں کو اپنے حال زار کی طرف توجہ دلائیں۔ رام چندر نامی ایک شخص ان کا رہبر تھا۔ یہ خود کوئی مقامی کسان نہ تھا۔ مجھے معلوم ہو کہ یہ لوگ جمنا گھاٹ پر زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں چند دوستوں کے ساتھ انہیں دیکھنے گیا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ حلقدار ان سے اتنا وحشیانہ سلوک کرتے ہیں اور اس بری طرح لوٹتے ہیں کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ انہوں نے ہم سے منتیں کیں کہ ہمارے ساتھ چل کر تحقیقات کیجئے اور ہمیں تعلقداروں کے غضب سے بچایئے کیونکہ وہ اس بات سے اور زیادہ ناراض ہو گئے ہیں کہ ہم ان کی شکایت کرنے الہ آباد کیوں آئے۔ ہم نے لاکھ عذر کیا مگر یہ کسان کسی طرح نہیں مانے اور سچ مچ ہم سے چمٹ گئے۔ آخر مجھے ان سے وعدہ کرنا پڑا کہ دو تین دن بعد میں ضرور آؤں گا۔

میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں گیا اور ریل اور پکی سڑک سے بہت دور تین دن گاؤں میں گذارے۔ اس دورے سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے

دیکھا کہ سارے دیہات جوش وخروش سے بھرے ہوئے ہیں اوران میں عجیب ہیجان برپا ہے۔ زبانی اطلاع پر دم بھر میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوجاتے تھے۔ ایک گاؤں دوسرے کوخبر کرتا تھا اور دوسرا تیسرے کواسی طرح آناً فاناً تمام گاؤں خالی ہوجاتے اورمرد،عورتیں اور بچے چاروں طرف جلسہ گاہ کی طرف بھاگتے نظر آتے۔ اس سے زیادہ تیزی سے ''سیتارام'' کا نعرہ کام کرتا تھا۔ جہاں یہ نعرہ بلند ہوا اس کی آواز فضا میں پھیلی، فوراً دوسرے گاؤں کے لوگ یہی نعرہ لگاتے ہوئے امڈ آتے تھے بلکہ بعض تو تیزی سے دوڑتے تھے۔ عورتوں اورمردوں، سب کی چیتھڑے لگے تھے۔ لیکن ان کے چہرے جوش سے تمتماتے تھے اوران کی آنکھوں میں ایک خاص چمک نمودار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا انہیں یقین ہے کہ کوئی معجزہ ہونے والا ہے جس سے ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔

انہوں نے ہم پر الفت ومحبت کی بارش کردی۔ وہ ہمیں ایسی امید ومحبت بھری نظروں سے دیکھتے جیسے ہم راحت ومسرت کا پیام لے کر آئے ہیں یا وہ خضر راہ ہیں جو انہیں ''منزل موعوذ'' پر پہنچا دیں گے۔ ان کی مصیبتوں اور اتھاہ محبتوں کو دیکھ کر افسوس اورشرم سے میری گردن جھک گئی۔ شرم تو مجھے خود اپنی عیش وآرام کی زندگی پر اور شہروں کی اس ادنیٰ سیاست پر محسوس ہوئی جو وطن کے ان نیم برہنہ بیٹوں اور بیٹیوں کی اتنی بڑی جماعت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اوررنج سے اس لئے کہ ہندوستان کی مفلسی اورتنزل کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا تھا۔ اب میری نظروں کے سامنے مادر وطن کا ایک نیا تصور قائم ہوگیا۔ یعنی ننگی۔ بھوکی۔ ستم رسیدہ اورتباہ حال! غرض ان لوگوں کو ہم پر جو دور کے ایک شہر سے سرسری طور پر یہاں آئے تھے غیر معمولی بھروسا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوتی تھی اورایسی نئی ذمہ داری کا بار محسوس ہوتا تھا جس کے خوف سے میں کانپا جاتا تھا۔

میں نے ان کے مصیبتوں کی ان گنت کہانیاں سنیں اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ

لگان کے روز افزوں بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ ناجائز طور پر ان سے زبردستی روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ انہیں کھیت سے بیدخل کیا جاتا ہے اوران کی جھونپڑیاں تک چھین لی جاتی ہیں۔ پھراوپر سے مار پڑتی ہے۔ غرض چاروں طرف سے خونخوار گدھ (یعنی زمینداروں کے کارندے، مہاجن اور پولیس وغیرہ) ان پر ٹوٹ پڑے ہیں اوران کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ وہ بیچارے سارے دن محنت کرتے ہیں۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہاتےہیں۔ لیکن شام کوانہیں پتہ چلتا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ ہماری چیز نہیں ہے۔ ہمارا انعام توصرف ٹھوکریں اورگالیاں ہیں اورفاقے ہماری قسمت میں لکھے ہیں۔ جولوگ وہاں موجود تھے ان میں سے اکثر کے پاس کاشت کے لئے ایک چپہ زمین نہ تھی۔ زمینداروں نے انہیں بیدخل کردیا تھا۔ نہ ان کے پاس کھیت تھا کہ وہ اس پر گذر کرسکیں اور نہ جھونپڑی کہ وہاں جا کر پڑ رہیں۔ زمین خوب زرخیز ہے، لیکن اس بار بہت زیادہ ہے۔ جوت کا رقبہ کم ہے اور بہت سے لوگ اس کے خواستگار ہیں۔ زمین کی اس مانگ کو دیکھ کر زمیندار ان سے ناجائز نذرانے وصول کرتے ہیں کیونکہ ازروئے قانون وہ لگان نہیں بڑھا سکتے اور آسامی کے پاس کوئی چارہ کارہی نہیں ہے اس لئے وہ مہاجن سے روپیہ قرض لیتا ہے اورزمیندار کی نذر کرتا ہے۔ پھر جب یہ نوبت آتی ہے کہ نہ تو وہ قرض ادا کرسکتا ہے اورنہ لگان توبیدخل کردیا جاتا ہے اورہاتھ جھاڑ کرکھڑا ہو جاتا ہے۔

یہ صورت عرصے سے جاری تھی اوررعیت کاافلاس روز بروز بڑھ رہا تھا پھراب کونسی ایسی بات ہوئی کہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا اورسب دیہات یکا یک اٹھ کھڑے ہوئے۔ معاشی حالت یقیناً خراب تھی لیکن یہ توتمام اودھ میں یکساں تھی۔ پھر ۲۰ء کی کسانوں کی ہلچل صرف پرتاب گڈھ رائے بریلی اورفیض آباد کے اضلاع تک کیوں محدود رہی۔ دراصل یہ جوش وخروش ایک حیرت انگیز شخص رام چندر کی بدولت پیدا ہوا۔ جسے لوگ عام طور پر بابا رام چندر کہا کرتے تھے۔

رام چندر مہاراشٹر کا رہنے والا تھا اور پابند مزدور کی حیثیت سے فجی ہو آیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے رفتہ رفتہ اودھ کے ان اضلاع کا رخ کیا۔ وہ یہاں کے دیہات میں گشت لگاتا۔ تلسی داس کی رامائن گا گا کر سناتا اور کسانوں کی تکلیفیں ہمدردی سنا کرتا تھا۔ وہ کچھ ایسا پڑھا لکھا نہ تھا اور کسی حد تک کسانوں سے اس نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن اس میں تنظیم کی غیر معمولی قوتیں تھیں۔ اس نے کسانوں کو مل بیٹھنا اور اپنی مصیبتوں پر غور اور بحث کرنا سکھایا۔ گویا ان میں اتحاد عمل کا ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ کبھی کبھی بڑے بڑے جلسے بھی ہوتے تھے اور اس طرح کسانوں کو اپنی قوت کا احساس ہوتا تھا۔ ''سیتا رام'' بہت پرانا اور عام نعرہ ہے لیکن اس نے اسے جنگی اہمیت دے دی۔ یہ کسی حادثے یا اہم واقعے کی اطلاع کا نشان اور مختلف دیہات میں اتحاد کا ایک ذریعہ ہو گیا فیض آباد، پرتاپ گڈھ اور رائے بریلی میں رام چندر اور سیتا کے پرانے فسانے بہت عام ہیں۔ کیونکہ یہ اضلاع سلطنت اجودھیا میں شامل تھے اور تلسی داس کی کتاب ہندی رامائن عوام میں بہت مقبول ہے۔ اکثر لوگوں کو اس کی بہت سی نظمیں زبانی یاد ہیں۔ رام چندر اس کتاب کے اقتباسات نہایت موقع موقع سے سنایا کرتا تھا۔ اس میں اسے بہت ملکہ حاصل تھا۔ کسانوں کی تھوڑی بہت تنظیم کرنے کے بعد اس نے ان سے طرح طرح کے وعدے کیئے۔ اگرچہ وعدے نہایت مبہم تھے۔ لیکن بھولے بھالے کسانوں کو ان سے بڑی بڑی امیدیں ہو گئی تھیں۔ رام چندر کے سامنے کوئی باضابطہ لائحہ عمل نہ تھا، اس لئے جب اس نے دیکھا کہ جوش اپنے پورے شباب پر پہنچ گیا ہے تو اپنی ذمہ داری دوسروں کے سر ڈالنے کی کوشش کی۔ اسی مقصد سے وہ بہت سے کسانوں کو الہ آباد لایا تاکہ دوسرے لوگوں کو اس تحریک سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔

رام چند ایک سال اور کسانوں کی تحریک میں نمایاں حصہ لیتا رہا اور دو تین مرتبہ جیل بھی گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نہایت غیر ذمہ دار اور ناقابل اعتماد شخص

تھا۔

کسانوں کی تحریک کے لئے اودھ کا علاقہ خاص طور پر موزوں تھا۔ یہ تعلقداروں کا **ملک** ہے جو اپنے آپ کو 'اودھ کے نواب' کہتے ہیں۔ زمینداری کے نظام کی سب سے مکروہ صورت یہاں نظر آتی ہے۔ تعلقداروں کی زیادتیاں ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھیں اور ایسے کسانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی، جن کے پاس کاشت کے لئے ایک چپہ زمین نہ تھی اور مزدوری پر ان کی گذراوقات تھی۔ وہاں صرف ایک قسم کے آسامی تھے۔ اس لئے متحدہ جدوجہد آسانی سے ممکن تھی۔

زرعی اعتبار سے ہندوستان کو سرسری طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی بڑے بڑے زمینداروں کا علاقہ اور ان چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کا علاقہ جو اپنی آراضی کے خود مالک ہیں۔ کہیں کہیں یہ دونوں خلط ملط بھی ہیں۔ بنگال، بہار اور صوبہ جات متحدہ میں زمینداری کا طریق رائج ہے۔ اکثر ان کسانوں کی حالت جو خود اپنی آراضی کے مالک ہیں نسبتاً بہتر ہوتی ہے لیکن بعض جگہ وہ بھی بڑی مصیبت میں ہیں۔ عام طور پر پنجاب اور گجرات کے کسان (جنہیں مالکانہ حقوق حاصل ہیں) زمینداری کی بہت سے قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً دخیل کار وغیرہ دخیل کار، کاشتا کر شکمی کاشتکار وغیر۔ ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ متحد اور متفق ہو کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں اودھ میں نہ تو دخیل کاشتکار تھے اور نہ موروثی صرف معیادی کاشتکار تھے اور جہاں زمینداروں کو کسی دوسرے شخص نے زیادہ نذرانہ دینے کا وعدہ کیا فوراً انہیں بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ یہاں ایک ہی قسم کے کاشتکار تھے اس لئے انہیں منظم کرنا زیادہ آسان تھا۔

عملاً اودھ میں معیادی کاشتکاروں کو معیاد کے اندر ہی بیدخل کر دینے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ عام طور پر زمیندار وصول شدہ زرلگان کی رسید نہیں دیتے تھے۔

اس لئے باآسانی اس سے انکار کر کے آسامی کو بیدخل کرا سکتے تھے اور وہ بیچارہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکتا تھا۔ زرلگان کے علاوہ بہت سی ناجائز وصولیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایک تعلقہ میں تو مجھے معلوم ہوا کہ کوئی پچاس مختلف ناموں سے کسانوں سے زبردستی روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس تعداد میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ تعلقدار اپنے ہر کام کے لئے اسامیوں سے روپیہ وصول کرتے ہیں تعلقدار کے خاندان میں اگر کوئی شادی ہے تو اسامی روپیہ دیں۔ اس کا لڑکا اگر غیر ممالک میں تعلیم پا رہا ہے تو اسامی اس کا بار برداشت کریں۔ گورنر صاحب یا کسی اعلیٰ افسر کو پارٹی دینا ہے تو اس کے اخراجات بھی اسامیوں کے ذمہ۔ تعلقدار صاحب موٹر یا ہاتھی خریدنا چاہتے ہیں تو قیمت اسامیوں سے وصول کی جائے۔ ان وصول یابیوں کے خاص نام بھی ہوتے تھے مثلاً موٹرانہ (یعنی موٹر کی خریداری کا ٹیکس) ہاتھیانہ (یعنی ہاتھی کی خریداری کا ٹیکس) وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے اودھ کے کسانوں میں ہلچل پیدا ہوگئی تو کوئی تعجب نہیں البتہ یہ بات قابل تعجب ضرور تھی کہ شہر والوں کی مدد یا سیاسی کارکنوں کی مداخلت کے بغیر یہ تحریک خود بخود زور پکڑ گئی۔ کسانوں کی اس تحریک کو نہ کانگرس سے کسی قسم کا تعلق تھا نہ ترک موالات سے، جو اسی زمانے میں شروع ہوئی تھی، کوئی واسطہ تھا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید ان دونوں عام اور زبردست تحریکوں کی بنیادی وجوہ یکساں تھیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کسانوں نے گاندھی جی کی ۱۹۱۹ء کی ہڑتالوں میں پورا حصہ لیا تھا اور اس کے بعد گاندھی جی کا نام ان پر جادو کا سا اثر کرتا تھا۔

مجھے اس بات سے اور زیادہ حیرت ہوئی کہ شہر والے کسانوں کی اس زبردست تحریک سے بالکل ناواقف تھے۔ کسی اخبار میں اس کے متعلق ایک سطر بھی نہ نکلی تھی۔ انہیں دیہات سے کوئی دلچسپی اور تعلق ہی نہ تھا مجھے اس شدت سے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ ہم عوام سے اس قدر دور اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور ہماری ساری جدوجہد اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے۔

دیہات میں گشت

تین دن دیہات میں گزار کر میں الہ آباد واپس آیا اور کچھ دن کے بعد پھر وہاں گیا۔ ان مختصر دوروں میں ہم گاؤں گاؤں پھرے۔ کسانوں کے ساتھ کھانا کھایا ان ہی کی جھونپڑیوں میں رہے۔ گھنٹوں ان سے باتیں کیں اور اکثر چھوٹے بڑے جلسوں میں تقریریں بھی کیں۔ ہم ایک چھوٹی سی موٹر میں گئے تھے اور کسان ہمارے اتنے مشتاق تھے کہ ہر رات بھر میں انہوں نے کھیتوں میں کچی سڑکیں بنا ڈالیں۔ تاکہ ہماری موٹر آسانی سے ہر جگہ پہنچ سکے۔ اکثر ہماری موٹر دلدل میں پھنس گئی اور بیسیوں آدمیوں نے بڑے خلوص و محبت کے ساتھ آن کی آن میں ہاتھوں ہاتھ اسے اٹھا کر رکھ دیا۔ آخر کار ہم نے موٹر چھوڑ دی اور باقی دورہ پیدل طے کیا۔ جہاں کہیں ہم جاتے تھے معمولی پولیس اور خفیہ پولیس والے اور لکھنوء کے ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب سایہ کی طرح ہمارے پیچھے لگے رہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے انہیں بہت پریشان کیا کیونکہ ہم سارے سارے دن کھیتوں کھیتوں پھرا کرتے تھے۔ وہ تھک کر پست ہو جاتے تھے۔ اس لئے شاید ہم سے اور کسانوں سے عاجز آ گئے تھے۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب لکھنو کے ایک نوجوان تھے ان میں کچھ زنانہ پن سا پایا جاتا تھا۔ آپ پینٹ لیدر کا پمپ پہن کر تشریف لائے تھے۔ بارہا انہوں نے ہم سے التجا کی کہ خدا کے لئے اپنی اس سرگرمی کو ذرا کم کر دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ بعد میں وہ ہمارا ساتھ نہ دے سکے اور ہار کر بیٹھ رہے۔

یہ جون کا مہینہ تھا جب ہندوستان میں سب سے زیادہ گرمی پڑتی ہے اور برسات کی آمد آمد ہوتی ہے۔ دھوپ کی شدت سے بدن جھلسا جاتا تھا اور آنکھوں کے نیچے اندھیر آ جاتا تھا۔ میں دھوپ میں نکلنے کا کبھی عادی نہ تھا۔ اور جب انگلستان سے واپس آیا تھا گرمیاں برابر پہاڑ پر گذارتا تھا۔ لیکن اب میں بھری دوپہر اور چلچلاتی دھوپ میں گھومتا تھا اور میرے سر پر ہیٹ بھی نہ ہوتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی

سے تولیہ لپیٹ لیتا تھا۔ میں دوسرے کاموں میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ گرمی کی اس شدت کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ البتہ جب میں الہ آباد واپس آیا اور دیکھا کہ میرا رنگ کس قدر سانولا ہوگیا ہے تو اس کا احساس ہوا کہ مجھ پر کیا دور گذر گیا لیکن یہ خیال کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں بھی اپنے ملک کے جفاکش لوگوں کی طرح گرمی کی تکلیفیں برداشت کرسکتا ہوں اور اب تک میں اس سے خواہ مخواہ ڈرتا تھا۔ اب مجھے اطمینان ہوگیا، کہ میں سخت سے سخت گرمی اور سردی دنوں آسانی سے جھیل سکتا ہوں اور یہ جفاکشی میرے معمولی مشاغل ہیں اور قید کے زمانے میں بہت کام آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے قوائے بہت اچھے تھے اور میں روزانہ ورزش کیا کرتا تھا۔ ورزش کا سبق میں نے اپنے والد سے سیکھا تھا۔ انہیں ورزشی کھیلوں کا تھوڑا بہت شوق تھا اور عام ورزش تو انہوں نے مرتے دم تک نہیں چھوڑی۔ ان کے سارے بال سفید ہوگئے تھے۔ چہرے کی جھریاں پڑ ئی تھیں۔ دیکھنے میں بہت بوڑھے اور فکروں کے مارے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ان کا جسم ایسا گٹھا ہوا تھا کہ مرنے سے ایک دو سال پہلے تک دیکھنے والے ان کی عمر بیس سال کم ہی جانچتے تھے۔

جون ۱۹۲۰ء میں پرتاب گڈھ جانے سے پہلے بھی مجھے اکثر دیہات سے گذرنے کا اور وہاں ٹھہر کر کسانوں سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بڑے بڑے میلوں میں گنگا کے کنارے ان کے لاکھوں کے مجمعے دیکھے تھے اور ان میں ہوم رول کی پرچار کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن اب تک مجھے اس کا پوری طرح احساس نہ ہوا تھا کہ وہ کیا ہیں اور ملک میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ اوروں کی طرح میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ حقیقت کا انکشاف تو مجھ پر پرتاب گڈھ کے اس دورے میں ہوا۔ اس کے بعد سے جب میں ہندوستان کا تصور کرتا ہوں تو ہمیشہ ان ہی ننگے اور بھوکے لوگوں کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ شاید ان دونوں فضا میں کوئی برقی طاقت کام کر رہی تھی یا شاید میرا ذہن اس وقت اتنا اثر پذیر

تھا کہ جو منظر میں نے دیکھے اور جو تاثرات حاصل مئے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے۔

ان کسانوں نے میرے حجاب کو دور کر دیا اور مجھے عام مجمعے میں بولنا سکھایا اس سے پہلے میں نے شاہد ہی مجمع میں تقریر کی ہو۔ عام جلسوں میں عموماً ہندوستانی میں تقریر کرنی پڑتی تھی اس وجہ سے میں اور بھی گھبراتا تھا۔ لیکن ان کسانوں کے جلسوں میں مجھے پے در پے تقریریں کرنی پڑیں اور ان بھولے بھالے غریبوں کے سامنے شرمانے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ میں فن خطابت سے واقف نہ تھا اس لئے میں ان کے سامنے اس طرح تقریر کرتا جیسے کوئی بات چیت کرتا ہے اور جو کچھ میرے دل و دماغ میں ہوتا وہ سیدھے سادے الفاظ میں ان سے کہہ دیتا۔ چاہے جلسے میں تھوڑے سے آدمی ہوتے یا ہزاروں لاکھوں کا مجمع ہوتا۔ لیکن میں اپنا بات چیت کا انداز ترک نہ کرتا۔ بہر حال مجھے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ میری تقریر میں خواہ کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں میرا کام اچھی طرح چل جاتا تھا۔ میرے بیان میں روانی کی کمی نہ تھی۔ شاید ان میں سے بہت سے لوگ جو کچھ میں کہتا تھا اس کا بہت سا حصہ سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ میری زبان اور میرے خیالات ان کے لئے آسان نہ تھے اور جب مجمع بہت زیادہ ہوتا تھا تو ان میں سے اکثر لوگ میری آواز بھی نہ سن سکتے تھے لیکن انہیں اس کی کچھ زیادہ پرواہ نہ تھی کیونکہ جب یہ لوگ کسی پر اعتماد کر لیتے ہیں تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں کرتے۔

میں اپنی ماں اور بیوی کے پاس مسوری چلا گیا لیکن میرا دل انہی کسانوں میں پڑا تھا اور میں پھر ان کے پاس پہنچنے کے لئے بے چین تھا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد میں نے دیہات میں گشت شروع کر دیا اور دیکھا کہ کسانوں کی تحریک برابر زور پکڑتی جا رہی ہے۔ ان مظلوموں کو بھی اب اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو چلا تھا اور یہ سر اونچا کر کے چلنے لگے تھے۔ زمیندار کے کارندوں اور پولیس کا خوف اب

ان کے دل سے کم ہوتا جاتا تھا۔ جب کبھی کوئی کسان بے دخل کیا جاتا تھا تو دوسرا کسان اس زمین کو لینے کے لئے آگے نہ بڑھتا تھا۔ زمیندار کے ملازم اب مار پیٹ کرتے بھی ڈرتے تھے اور ناجائز لوٹ بھی کم ہو گئی تھی۔ اگر کبھی اس قسم کے واقعات ہوتے تو فوراً اس کی اطلاع کی جاتی اور تحقیقات شروع ہو جاتی۔ اس وجہ سے پولیس اور زمیندار کی ملازم دونوں اپنی حرکتوں سے باز رہتے۔ تعلقدار بھی ڈرتے تھے اور حملے کی بجائے اب مدافعت کی فکر میں تھے۔ صوبہ کی حکومت نے بھی وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اودھ کے قانون لگان میں ترمیم کر دے گی۔

تعلقدار اور بڑے بڑے زمیندار جو خدا کی زمین کے مالک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑے فخر سے "رعیت کا قدرتی لیڈر" کہتے ہیں، برطانوی حکومت کے لاڈ میں بگاڑے ہوئے بیٹھے ہیں اور حکومت نے ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت دیکر یا معقول تعلیم و تربیت کا انتظام نہ کر کے انہیں مجموعی طور پر ذہنی حیثیت سے بالکل نکما کر دیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں زمیندار اپنی رعایا کے لئے تھوڑا بہت کرتے بھی رہے مگر ان لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اس لئے یہ رفتہ رفتہ زمین کے اور رعایا کی طفیلی بن کر رہ گئے۔ ان کا خاص کام یہ ہے کہ مقامی افسروں کی خوشامد کئے جائیں جن کی نظر عنایت کے بغیر وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتے اور اپنے حقوق و مراعات کے تحفظ کا برابر مطالبہ کرتے لفظ "زمیندار" سے بہت کچھ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ہر شخص کو یہی خیال ہو گا کہ ہر زمیندار بہت بڑی زمین کا مالک ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے جن صوبوں میں رعیت داری کا نظام رائج ہے وہاں ان کسانوں کو زمیندار کہتے ہیں جو اپنی آراضی کے خود مالک ہیں اور ان صوبوں میں جہاں زمیندار کہلاتے ہیں۔ اور لاکھوں وہ لوگ بھی جو انتہائی مفلسی میں بسر کرتے ہیں اور جن کی حالت معمولی کسانوں سے کسی صورت میں بہتر نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے صوبہ جات متحدہ میں تقریباً پندرہ لاکھ اشخاص کا شمار زمینداروں کے

مالکوں کی تعداد سارے صوبے میں پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی اور ان میں سے زیادہ سے زیادہ پانچ سو ایسے ہوں گے جنہیں واقعی بڑا زمیندار یا تعلقدار کہا جا سکتا ہے۔ بعض مثالیں تو ایسی موجود ہیں کہ بڑے کاشتکاروں کی حالت چھوٹے زمینداروں سے کہیں بہتر ہے۔ یہ چھوٹے اور اوسط درجے کے زمیندار دونوں اگرچہ ذہنی اعتبار سے بہت پست ہیں لیکن بحیثیت مجموعی بڑے اچھے لوگ ہیں اور ان میں اتنی اہلیت موجود ہے کہ اگر انہیں معقول تعلیم و تربیت دی جائے تو یہ بہترین شہری بن سکتے ہیں۔ انہوں نے قومی تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ لیکن چند مشہور افراد کے علاوہ بڑے بڑے زمینداروں اور تعلقداروں نے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ ان لوگوں میں روسا کی شان اور ان کی خوبیاں مطلق نہیں ہیں۔ ان کی ساری جماعت جسمانی اور دماغی ہر اعتبار سے تنزل پذیر ہے۔ گویا وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکی ہے اور اسی وقت تک زندہ ہے جب تک برطانوی حکومت جیسی کوئی بیرونی طاقت اسے سہارا دیئے ہوئے ہے۔

۱۹۲۱ء میں سال بھر میں دیہاتی علاقوں کا دورہ کرتا رہا۔ میرا میدان عمل وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ میری سرگرمیاں سارے صوبہ متحدہ میں پھیل گئیں۔ ترک موالات کی تحریک پورے زور و شور سے شروع ہو چکی تھی اور اس کی آواز گاؤں گاؤں پہنچ گئی تھی۔ ہر ضلع میں کانگریس کے کارکن اس نئے پیغام کو لے کر دیہاتی علاقوں میں نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے اکثر مبہم طریقہ نے اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ کسانوں کی شکایتیں بھی رفع ہو جائیں گی۔ سوراج ایسا عام لفظ ہے جو ہر چیز پر حاوی ہے۔ تاہم یہ دونوں تحریکیں (یعنی ترک موالات اور کسانوں کی تحریک) بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اگرچہ ہمارے صوبے میں کبھی کبھی یہ گڈمڈ ہو جاتیں تھیں اور ایک دوسرے پر بہت زیادہ اثر ڈالتی تھیں۔ کانگریس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ بازی یکا یک کم ہوئی۔ اور تمام مواضعات میں آپس کے جھگڑے طے کرنے کے

لئے پنچائتیں قائم ہوگئیں۔امن کے معاملے میں کانگریس کا اثر خصوصیت سے بہت زبردست پڑا۔کیونکہ جہاں کہیں کانگریس کے کارکن جاتے،عدم تشدد کے نئے مسلک پر خاص زور دیتے۔ممکن ہے لوگوں نے اس کی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس تحریک نے کسانوں کو تشدد سے بہت کچھ باز رکھا۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔کسانوں کی تحریکیں عام طور پر بہت بدنام ہیں کہ ان میں تشدد اور فساد ضرور ہوتا ہے۔اس زمانے میں اودھ کے بعض اضلاع کے کسان بہت مشتعل تھے اور جان پر کھیلنے کو تیار تھے۔ایک ذراسی چنگاری بھی آگ لگانے کو کافی تھی،لیکن وہ اس قدر با امن رہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔تشدد کی صرف ایک مثال مجھے یاد ہے۔ایک کسان ایک تعلقدار کے پاس پہنچا۔وہ اپنے مکان پر دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔اس نے اس بنا پر ان کے تھپڑ رسید کئے کہ وہ بد چلن تھے اور خود اپنی بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھا۔

اس کے بعد دوسرے قسم کا تشدد بھی شروع ہوا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت سے چھڑ گئی۔لیکن یہ لڑائی تو ہونا ہی تھی۔کیونکہ حکومت کسانوں کے اتحاد اتفاق اور ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کب دیکھ سکتی تھی۔کسانوں نے بلاٹکٹ ریلوں میں سفر کرنا شروع کردیا۔خاص کر جب ان کے بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے جس میں ساٹھ ہزار آدمی شریک ہوتے تھے یہ بہت بڑی تعداد میں بلاٹکٹ سفر کیا کرتے تھے۔انہیں ریل سے اتارنا مشکل ہوجاتا تھا۔جو بات پہلے کبھی نہ سنی گئی تھی وہ اب دیکھنے میں آئی یعنی اب کسان کھلم کھلا ریلوے کے حکام کی خلاف ورزی کرتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ وہ دن گئے جب آپ ہم پر سختیاں کرتے تھے۔یہ میں نہیں کہہ سکتا کس کے اشارے پر انہوں نے یہ حرکت شروع کی۔بہرحال ہم نے انہیں یہ ترغیب دی تھی۔ہم کو یکایک معلوم ہوا کہ وہ بے اعتدالی کررہے ہیں۔بعد میں جب ریلوے نے زیادہ سختی کی تو لوگوں نے یہ طریقہ چھوڑدیا۔

۱۹۲۰ء میں (جب میں کانگریس کے خاص اجلاس کی شرکت کی غرض سے کلکتہ میں تھا) کسانوں کے چند لیڈر کسی معمولی سے الزم پر گرفتار کر لئے گئے۔ ان کے مقدمے کی سماعت شہر پاتاب گڈھ میں ہونے والی تھی۔ چنانچہ پیشی کے دن کسانوں کا جم غفیر کچہری پہنچ گیا۔ کچہری کا سارا احاطہ اور جیل کی سڑک ان سے کھچا کھچ بھر گئی۔ مجسٹریٹ یہ دیکھ کر بدحواس ہوگیا اور مقدمہ دوسرے روز کے لئے ملتوی کر دیا۔ لیکن مجمع برابر بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے جیل کو بھی گھیر لیا۔ کسان مٹھی بھر چنوں پر آسانی سے کئی کئی دن گذار سکتے ہیں اس لئے وہ وہاں ڈٹے رہے آخر کار جیل ہی میں شاید سرسری سماعت کے بعد ان لیڈروں کو بری کر دیا گیا۔ مجھے یہ یاد نہیں، کہ اس کی صورت کیا ہوئی لیکن کسانوں کے نزدیک یہ ان کی بڑی زبردست فتح تھی ان کے دل میں یہ بات سما گئی کہ وہ ہمیشہ بڑی تعداد کے زور پر جو چاہیں کرا سکتے ہیں حکومت یہ صورت کب گوارا کر سکتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد اسی طرح کا ایک دوسرا موقع پیدا ہوا اور اب کسانوں کو شکست کھانی پڑی۔

یہ جنوری ۱۹۲۱ء کے آغاز کا واقعہ ہے۔ میں ناگپور کانگریس سے الہ آباد واپس آیا ہی تھا کہ مجھے رائے بریلی سے ایک تار ملا۔ اس تار میں لکھا تھا کہ یہاں فساد کا اندیشہ ہے اس لئے فوراً آؤ۔ میں دوسرے ہی دن روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ کسانوں کے بعض سربر آوردہ رہنما چند روز ہوئے گرفتار کر لئے گئے تھے اور مقامی جیل میں بند تھے۔ پرتاب گڈھ میں کسانوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اور وہاں انہوں نے جو ترکیبیں استعمال کی تھیں۔ انہیں دیکھ کر یہ لوگ بھی زبردست مظاہرہ کرنے کے لئے رائے بریلی شہر کو روانہ ہو گئے۔ لیکن اس مرتبہ حکومت اسے برداشت کرنے والی نہ تھی اس لئے مزید پولیس اور فوج اکٹھا کی گئی تاکہ کسانوں کو راستے ہی میں روک دیا جائے۔ چنانچہ شہر کے باہر ہی ندی کے کنارے پر ان کی خاص جماعت کا راستہ روک دیا گیا۔ پھر بھی بہت سے لوگ دوسرے راستوں سے

پہنچ گئے۔ مجھے اسٹیشن پر یہ حالات معلوم ہوئے اور میں وہاں سے سید حاندی کی طرف روانہ ہوا جہاں فوج اور کسان ایک دوسرے کے مقابلے پر کھڑے تھے۔ راستے میں مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا جلدی میں لکھا ہوا ایک حکم ملا کہ وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے اس لئے واپس لوٹ جاؤ۔ میں نے اسی کی پشت پر جواب لکھ دیا کہ کس قانون کی کس دفعہ کی رو سے آپ مجھے واپسی کا حکم دے رہے ہیں۔ اور جب تک ان کا جواب آئے میں نے آگے بڑھنا طے کرلیا۔ جب میں ندی کے کنارے پہنچا تو گولیوں کی آواز دوسری طرف سے آرہی تھی۔ فوج نے مجھے پل پر ہی روک لیا۔ اسی درمیان میں بہت سے خوفزدہ کسان جو ندی کی اس طرف کھیتوں میں چھپے ہوئے تھے میرے اردگرد جمع ہوگئے۔ اس لئے میں نے کوئی دو ہزار کسانوں کو اسی جگہ جلسہ کیا اور ان کے جوش کو کم کرنے اور خوف و ہراس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ بہت غیر معمولی منظر تھا۔ کیونکہ ندی کے دوسری طرف ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے بھائیوں پر گولیاں برس رہی تھیں اور ہر طرف فوج ہی فوج نظر آتی تھی۔ لیکن جلسہ بہت کامیاب ہوا اور کسانوں کے دل سے خوف جاتا رہا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ موقع واردات سے واپس آئے اور ان کی درخواست پر میں ان کے ساتھ ان کے مکان پر گیا۔ یہاں انہوں نے مجھے کسی نہ کسی بہانے سے کوئی دو گھنٹے تک روکے رکھا۔ دراصل وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ میں اپنے رفقائے کار اور کسانوں سے فوراً مل سکوں۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ ہلاک ہوئے۔ کسانوں نے منتشر ہونے یا واپس جانے سے قطعی انکار کردیا۔ لیکن وہ ہر طرح پرامن رہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر میں یا کوئی اور شخص جس پر انہیں اعتماد ہوتا وہاں موجود ہوتا اور ان سے واپس جانے کو کہتا تو وہ ضرور مان جاتے لیکن وہ ان لوگوں کا حکم ماننے کو تیار نہ تھے جن پر انہیں اعتماد نہیں تھا۔ کسی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے یہ تجویز بھی

پیش کی کہ ذرا دیر میرا انتظار کرلیں لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جہاں وہ ناکام رہے ہیں وہ ایک باغی کامیابی ہو۔ بدیشی حکومتیں جنہیں صرف اپنا رعب قائم کرنے کی فکر ہے یہ چیز کبھی گوارا نہیں کرتیں۔

اسی زمانے میں ضلع رائے بریلی میں کسانوں پر دو مرتبہ گولی چلائی گئی۔ اس کے بعد پنچایت کے ہر رکن اور کسانوں کے ہر مشہور کارکن پر عام تشدد شروع ہو گیا۔ جو اس سے بھی برا تھا۔ حکومت نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس تحریک کو کچل ڈالے گی۔ اس زمانے میں کانگریس کی ہدایت کے مطابق کسانوں میں چرخہ کاتنے کا عام رواج ہو گیا تھا۔ اس لئے چرخہ بغاوت کا نشان قرار پایا۔ بس جس کسی کے پاس چرخہ نکلتا وہ ضرور مصیبت میں پھنستا۔ اکثر چرخہ بھی چھین کر جلا دیا جاتا۔ اس طرح حکومت نے یہ کوشش کی کہ رائے بریلی اور پرتاب گڈھ کی اضلاع میں کانگریس کی تحریک اور کسانوں کی تحریک دونوں کو سینکڑوں گرفتاریوں اور دوسرے ذریعوں سے دبایا جائے۔ عموماً دونوں تحریکوں کے کارکن مشترک تھے۔

کچھ عرصہ بعد ۱۹۲۱ء میں ضلع فیض آباد کو عام تشدد سے پالا پڑا۔ وہاں بالکل عجیب طریقے سے ہنگامہ شروع ہوا۔ بعض مواضعات کے کسانوں نے ایک تعلقدار پر حملہ کیا اور اسے لوٹ لیا۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ ایک دوسرے زمیندار کے ملازموں نے جسے اس تعلقدار سے عداوت تھی ان کسانوں کو ورغلایا تھا۔ ان بیچارے بھولے بھالے لوگوں سے واقعی یہ کہا گیا کہ مہاتما گاندھی کی یہ خواہش ہے کہ تم اس تعلقدار کو لوٹ لو۔ چنانچہ انہوں نے خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ لوٹ مار کرتے وقت "مہاتما گاندھی کی جے" پکارتے جاتے تھے۔

میں نے جب یہ سنا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ یہ ضلع فیض آباد میں اکبر پور کے قریب کا واقعہ تھا۔ چنانچہ اس حادثے کے دو تین دن کے اندر ہی میں وہاں پہنچ گیا اور اسی دن میں نے ایک جلسہ کیا۔ چند گھنٹے کے اندر اندر چاروں طرف کے

مواضعات سے کوئی دس میل کی دوری سے پانچ چھ ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ میں نے انہیں بہت کچھ سخت سست کہا۔ وہ خود اپنی اور اپنے مقصد کی ذلت کا باعث ہوئے۔ اس لئے مجرموں کو سب کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہیے۔ (اس زمانے میں، میں گاندھی جی کی سیتا گرہ کے جذبے میں جہاں تک میں اسے سمجھ سکتا تھا ڈوبا ہوا تھا) چنانچہ میں نے مطالبہ کیا کہ جن لوگوں نے لوٹ مار میں حصہ لیا تھا وہ ہاتھ اٹھا دیں۔ سب یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ متعدد پولیس افسروں کی موجودگی میں دو درجن ہاتھ اٹھ گئے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ان بیچاروں پر آفت آنا یقینی ہو گیا۔

بعد میں جب میں نے ان سے تنہائی میں گفتگو کی اور ان کی سیدھی سچی کہانی سنی کہ کس طرح انہیں ورغلایا گیا تو مجھے ان پر بڑا رحم آیا اور اس کا افسوس ہوا کہ میں نے ان بے وقوف اور بھولے بھالے لوگوں کا پردہ فاش کر کے انہیں لمبی سزاؤں کا مستوجب بنا دیا۔ لیکن صرف دو تین ہی درجن شخصوں کو سزا نہیں ملی۔ حکومت کو تو یہ زریں موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس لئے ضلع میں کسانوں کے تحریک کو کچلنے کے لئے اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ یعنی کوئی ایک ہزار آدمی گرفتار ہوئے۔ ڈسٹرکٹ جیل کھچا کھچ بھر گئی اور مقدمے کی پیشیاں قریب قریب سال بھر تک ہوتی رہیں۔ بہتیرے تو مقدمے کے دوران میں جیل خانے ہی میں مر گئے۔ بہتوں کو لمبی سزائیں ہوئیں اور اس کے چند سال بعد جب میں جیل گیا تو ان میں سے بعض لڑکوں اور نوجوانوں سے وہاں ملا جو اپنی جوانی کے دل جیل خانے میں کاٹ رہے تھے۔

ہندوستانی کسانوں میں قوت مقابلہ کم ہوتی ہے۔ ان میں اتنی سرگرمی نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ عرصے تک ثابت قدم رہ سکیں۔ قحط اور وبائیں آتی ہیں اور لاکھوں کو ٹھکانے لگا دیتی ہیں۔ اس لئے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حکومت اور زمیندار کی متحدہ کوششوں کے باوجود انھوں نے پورے سال مقابلے کی زبردست قوت کا ثبوت

دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی ہمتوں نے جواب دینا شروع کیا اور حکومت کے پیہم حملے نے تحریک کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔ لیکن اندر اندر وہ اب بھی باقی تھی۔ اب پہلے کی طرح بڑے بڑے مظاہرے نہیں ہوتے تھے لیکن اکثر دیہاتوں میں پرانے کارکن موجود تھے جو دہشت کا شکار نہیں ہوئے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ سب کچھ جیل جانے کی اس تحریک سے پہلے ہوا جو کانگریس نے ۱۹۲۱ء کے آخر میں شروع کی تھی باوجودیکہ کسان پچھلے سال کافی مصیبتیں جھیل چکے تھے تاہم اس تحریک میں بھی انہوں نے کافی حصہ لیا۔

کسانوں کی تحریک سے خائف ہو کر حکومت نے قانون آراضی کی ترمیم میں عجلت سے کام لیا۔ اس سے ذرا امید ہوئی تھی کہ کسانوں کی حالت کچھ سنبھل جائے گی، لیکن جب حکومت نے دیکھا کہ اب تحریک قابو میں آ گئی ہے فوراً اس میں کانٹ چھانٹ کر دی۔ البتہ یہ ایک بری تبدیلی ہوگئی کہ اودھ کے کسانوں کو حق موروثی مل گیا۔ بظاہر یہ چیز انہیں بڑی دلکش معلوم ہوئی۔ لیکن بعد میں تجربے سے ثابت ہوا کہ اس سے ان کی مصیبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد بھی اودھ میں کہیں کہیں کسانوں کی شورش اٹھ کھڑی ہوتی تھی لیکن بہت معمولی پیمانے پر۔ مگر ۱۹۲۹ء میں جب ساری دنیا میں عام کساد بازاری کا دور دورہ ہوا تو اجناس کی قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے پھر ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔

ترک موالات

میں نے اودھ کے کسانوں کی ہلچل کا حال ذرا تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ اس نے میری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھا دئے اور مجھ پر ہندوستانی تحریک کے اس بنیادی پہلو کو روشن کر دیا جس کی طرف قوم پرستوں نے اب تک کوئی توجہ نہ کی تھی۔ کسانوں کے ہنگامے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اکثر ہوا کرتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں شدید بے چینی موجود ہے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں اودھ کے بعض علاقوں میں کسانوں کی یہ ہلچل بھی اس قسم کی تھی لیکن اس میں بعض حیرت انگیز خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے ہم لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ابتداء میں اسے سیاست دانوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اور آگے چل کر بھی باہر کے آدمیوں اور سیاست دانوں کو اس میں کچھ زیادہ دخل نہ ہوا۔ ملکی نقطہ نظر سے یہ مقامی معاملہ تھا اس لئے لوگوں نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ حتیٰ کے صوبہ متحدہ کے اخباروں نے بھی بڑی حد تک اسے نظر انداز کر دیا کیونکہ ان کے ایڈیٹروں اور شہری ناظرین کی اکثریت کے نزدیک نیم برہنہ کسانوں کے ہنگامے کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔

اس وقت پنجاب کے مظالم اور خلافت کے معاملات کا ہر طرف چرچا تھا اور ترک موالات کی تحریک ہر شخص کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی کیونکہ اسکے ذریعہ سے ان مظالم کے تدارک ہر شخص کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ قومی آزادی یا سوراج کے اصل مقصد پر اس وقت زیادہ زور دیا جات تھا۔ گاندھی جی بلند آہنگ اور مبہم مقاصد کو ناپسند کرتے ہیں۔ بجائے اس کے وہ کسی معینہ مقصد کے لئے پورا زور لگانے کو ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ پھر بھی سوراج، سیاسی مطلع پر اور لوگوں کے تصورات پر چھایا ہوا تھا۔ اور بے شمار جلسوں اور کانفرنسوں میں اکثر اس کا ذکر کیا جاتا تھا۔

۱۹۲۰ء میں کانگرس کا ایک خاص اجلاس کلکتے میں ان تمام امور پر غور کرنے

خصوصاً ترک موالات کے مسئلے کو طے کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ لالہ لاجپت رائے جو ایک عرصے کی جلاوطنی کے بعد حال ہی میں امریکہ سے واپس آئے تھے۔ اس اجلاس کے صدر تھے۔ انہیں ترک موالات کی یہ نوساختہ تجویز پسند نہ تھی اس لئے وہ اس کے مخالف تھے۔ ہندوستان کی سیاست میں عام طور پر وہ انتہا پسند مانے جاتے تھے لیکن ان کا عام رجحان درحقیقت آئین پرستی اور اعتدال پسندی کی طرف تھا وہ اپنے عقیدے یا پسند کی بنا پر نہیں بلکہ حالات سے مجبور ہو کر بیسویں صدی کے آغاز میں لوکمانیہ تلک اور دوسرے انتہا پسندوں کے دوش بدوش کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں سماجی اور معاشی معاملات سے خاص دلچسپی تھی اور اس خیال کو غیر ممالک کے قیام سے اور تقویت پہنچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی نظر اکثر ہندوستانی لیڈروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع تھی۔

ولفرڈ اسکاون بلنٹ نے اپنے ''روزنامچے'' میں گوکھلے اور لالہ جی سے اپنی ۱۹۰۹ء کی ایک ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے ان دونوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور لکھا ہے کہ ''یہ لوگ بہت محتاط ہیں اور حقیقت کا اعتراف کرنے سے جھجکتے ہیں'' لیکن یہ واقعہ ہے کہ بہت سے ہندوستانی لیڈروں کے مقابلے میں لالہ جی اس معاملے میں زیادہ جری تھے۔ بہرحال بلنٹ کے تاثرات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہماری سیاست اور ہمارے لیڈروں کے مزاج میں کتنی سکمیت تھی۔ اور ایک قابل اور تجربہ کار غیر ملک والے پر ان کا کیا اثر پڑتا تھا۔ لیکن زمانے نے اب اس مزاج کو بہت بدل دیا تھا۔

ترک موالات کی مخالفت میں وہ تنہا نہ تھے۔ ان کے ساتھ بہت بڑی اور بااثر جماعت تھی۔ دراصل کانگرس کا تمام پرانا قبیلہ گاندھی جی کی ترک موالات کی قرارداد کا مخالف تھا۔ مسٹر سی، آر۔ داس ان کی رہبری فرما رہے تھے۔ وہ اس قرارداد کی اصل منشا کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ تو اس سے بھی چار قدم آگے بڑھنے کو تیار تھے۔

اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں نئی آئین ساز مجالس کے بائیکاٹ پر اعتراض تھا۔

پرانے سربر آوردہ لیڈروں میں اس وقت صرف میرے والد گاندھی جی کی حمایت میں تھے۔ ان کے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ جن اسباب کی بنا پر ان کے رفقا اس قرارداد کی مخالفت کر رہے تھے ان کا والد پر کافی اثر تھا۔ وہ بھی ان لوگوں کی طرح ایک منزل موہوم کی طرف نیا قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں سابقہ حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی لیکن نتیجہ خیز عمل کی طرف وہ فطرتاً کھنچے تھے۔ اور یہ تجویز گو ان کے خیالات سے پوری طرح مطابقت نہ رکھتی ہو، پھر بھی عملی تجویز تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے خوب سوچ بچار کے رائے قائم کی۔ گاندھی جی اور مسٹر سی۔ آر۔ داس سے ان کی طول طویل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں مسٹر داس اور والد دونوں ایک بڑے مقدمے میں فریقین کی جانب سے وکیل تھے اس لئے آپس میں ملنے جلنے کا بہت اتفاق ہوتا تھا۔ وہ دونوں اس مسئلے کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے اور نتیجہ پر بھی دونوں میں بہت کم اختلاف تھا۔ لیکن اس ذرا سے اختلاف ہی کی بدولت کانگرس کے خاص اجلاس کے موقع پر ایک تو اصل قرارداد کے حامیوں کی صف میں نظر آئے اور دوسرے مخالفوں کی صف میں۔ تین مہینے بعد انہیں ناگپور کانگرس کے موقع پر دوبارہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ اب دونوں دوش بدوش کھڑے تھے اور اس کے بعد برابر ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے گئے۔

اس زمانے میں کلکتہ کانگریس کے خاص اجلاس سے پہلے مجھے والد سے کھل کر ملنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن جب کبھی میں ان سے ملتا تو ہر وقت انہیں اس مسئلے کی فکر میں الجھا ہوا پاتا۔ اس لئے کہ قومی پہلو کے علاوہ اس کا ایک ذاتی پہلو بھی تھا۔ ترک موالات کا مطلب یہ تھا کہ انہیں وکالت بھی ترک کرنا پڑے گی گویا اپنی سابقہ زندگی کو بالکل خیر باد کہنا اور اسے نئے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ اس میں اپنے پرانے سیاسی رفقا کو اپنی وکالت کو، اس سماجی زندگی اور اس امیرانہ معاشرت کو جس

کے وہ عادی ہو چکے تھے غرض بہت سی چیزوں کو تج دینا ہوگا۔ لیکن ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد کسی شخص کے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مالی حیثیت سے بھی یہ معاملہ کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا کیونکہ ظاہر ہے کہ وکالت کی آمدنی بند ہو جانے پر انہیں اپنے معیار زندگی میں کمی کرنا پڑے گی۔

لیکن ان کی عقل، زبردست خوداری اور فطری تمکنت ان سب کا یہ مقتضا تھا کہ وہ ایک ایک قدم کر کے آگے بڑھتے گئے اور آخر کار دل وجان سے اس نئی تحریک میں شریک ہو گئے۔ پے در پے واقعات کی وجہ سے جن کی انتہا حادثہ پنجاب اور اس کے بعد کے حالات پر ہوئی، ان کا غم وغصہ ضبط کی وجہ سے جن کی انتہا حادثہ پنجاب اور اس کے بعد کے حالات پر ہوئی، ان کا غم وغصہ ضبط کی حد سے گذر چکا تھا۔ انتہائی ظلم وہ جور کا احساس، قومی ذلت کا صدمہ ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور اظہار کی راہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن وہ جوش وخروش کی لہر میں نہیں بہے بلکہ جب ان کی عقل نے اور وکالت کے تربیت یافتہ دماغ نے تمام اونچ نیچ سوچ لی، تب انہوں نے آخری فیصلہ کیا اور گاندھی جی کے ساتھ ان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔

گاندھی جی سے ذاتی طور پر بھی وہ بہت متاثر ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے فیصلے میں اس تاثر کو بھی دخل تھا۔ جس شخص سے ان کا دل نہ ملتا اکے ساتھ ہو کر وہ کسی طرح کام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ بہر حال گاندھی جی اور والد کا ساتھ ایک اجتماع ضدین تھا۔ ایک طرف تو ایک سنت سادھو۔ ایک دیندار۔ ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنی زندگی میں تمام جسمانی لذتوں اور ہیجان پیدا کرنے والی چیزوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور دوسری طرف ایک دنیا دار تھا۔ جس نے زندگی اور اس کی عیش وعشرت کا جی بھر کے لطف اٹھایا تھا اور اس کی کبھی پرواہ نہ کی تھ کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ تحلیل نفسی کی اصطلاح میں یہ گویا باطن پسند اور ظاہر پسند طبقوں کا میل تھا تاہم دونوں کی

وابستگیاں اور مقاصد اس حد تک مشترک تھے کہ وہ برابر ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ چند سال بعد جب ان میں سیاسی اختلاف پیدا ہو گئے اس وقت بھی آپس کی گہری دوستی باقی رہی۔

والٹر پیٹر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''اگر چہ ایک ولی اللہ اور ایک عیش پسند حکیم مختلف سمتوں سے روانہ ہوتے ہیں۔ مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔ ایک کا رجحان مذہب کی طرف ہوتا ہے اور دوسرے کا اس کے خلاف لیکن چونکہ دونوں کی طبیعتیں جوش اور قوت کے لحاظ سے پست فطرت لوگوں سے ممتاز ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ایک دوسری کو اتنی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جتنا معمولی انسان کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی راہ ایک ہو جاتی ہے''۔

کانگریس کے خاص اجلاس کے بعد کانگریس کی سیاسیات میں گاندی جی کا دور شروع ہو گیا جو اب تک چل رہا ہے۔ سوا اس چند سال کے وقفے کے جب گاندھی جی خود پیچھے ہٹ گئے تھے اور انہوں نے دیش بندھو سی، آر۔ داس اور میرے والد کی رہبری میں سوراج پارٹی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔ بہر حال گاندھی کے دور کے شروع ہوتے ہی کانگریس کا رنگ ہی بدل گیا۔ یورپین لباس کہیں نظر نہ آتا تھا۔ ہر طرف صرف کھاری دکھائی دیتی تھی۔ متوسط طبقے کے نیچے درجے کے لوگ اب کانگرس کے نمائندے منتخب ہونے لگے۔ اور انہیں کا رنگ کانگرس پر چھا گیا۔ اب کانگرس کی کاروائی زیادہ تر ہندوستانی میں ہوتی تھی۔ جس صوبے میں جلسہ ہوتا تھا کبھی کبھی وہاں کی زبان سے بھی کام لیا جاتا تھا کیونکہ اکثر نمائندے انگریزی نہیں جانتے تھے اور یہ جذبہ بڑھتا جا رہا تھا کہ ہمیں اپنے قومی کام میں ایک غیر ملکی زبان استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ خاص بات یہ تھی کہ اب کانگرس کے جلسوں میں جان پڑ گئی تھی اور ہر طرف ایک نیا جوش و خروش اور خلوص نظر آتا تھا۔

کانگرس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد گاندھی جی امرت بازار پتر کا کے کہنہ مشق

ایڈیٹر شریت موتی لال گھوش کی مزاج پرسی کو گئے۔ وہ اس وقت بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ گیا۔ موتی بابو نے گاندھی جی اور ان کی نئی تحریک کو آشیرباد دی اور فرمایا کہ میں اب دوسری دنیا میں جارہا ہوں۔ یہ میں نہیں جانتا کہ وہ دوسری دنیا کہاں ہے۔ لیکن اتنا اطمینان ضرور ہے کہ اب میں برطانی راج میں نہ ہوں گا۔ کم ازکم اس سلطنت سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔

کانگریس سے واپسی پر میں گاندھی جی کے ساتھ رابندرناتھ ٹیگور اور ان کے بڑے بھائی ''بوڑو دادا'' سے ملنے شانتی نکیتن گیا۔ ہم وہاں چند روز رہے۔ مجھے یاد ہے کہ سی۔ ایف۔ انڈریوز نے مجھے چند کتابیں دی تھیں جنہیں میں نے بڑے شوق سے پڑھا اور ان سے بہت متاثر بھی ہوا۔ ان کتابوں کا موضوع افریقہ میں سامراج کا معاشی پہلو تھا۔ ان میں سے ایک کتاب یعنی موریل کی Blackmans Burden کا مجھ پر خاص طور پر اثر ہوا۔

اسی زمانے میں یا اس کے کچھ عرصے بعد سی۔ ایف۔ انڈریوز نے ہندوستان کی آزادی کی حمایت میں ایک رسالہ لکھا۔ شاید اس کا نام ''آزادی اور اس کی فوری ضرورت تھا''۔ یہ ایک نہایت عمدہ مقالہ تھا ہندوستان کے متعلق سیلے کی بعض تصانیف کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں آزادی کا دعویٰ اس خوبی کے ساتھ ثابت کیا گیا تھا کہ اس کا جواب ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ رسالہ کیا گویا ہمارے قلب کی گہرائیوں کا آئینہ تھا۔ انڈریو کی سیدھی سادھی اور پرخلوص عبارت میں ہمیں اپنے دلی جذبات، اپنی ناتمام آرزوؤں کی تصویر نظر آ گئی۔ ان کی یہ تحریر معاشی اصول یا اشتراکیت پر مبنی نہ تھی، بلکہ خالص قوم پرستی کے رنگ میں تھی۔ اول سے آخر تک ہندوستان کی روز افزوں ذلت کا احساس، اس سے نجات پانے کی بیتابانہ خواہش اور حاکم قوم کے فرد تھے کس خوبی سے ہمارے دل کی بات کہہ دی ہے۔ ترک موالات اصل میں وہی چیز تھی جس کے متعلق سیلے نے اب سے بہت د

ن پہلے کہا تھا ''یعنی یہ احساس کہ بدیسی حکمراں قوت کو اس کی حکومت کے قائم رکھنے میں مدد دینا ایک شرمناک فعل ہے'' بقول مسٹر انڈریوز ''خود انسان کی روح کے اندر جو ہیجان برپا ہوتا ہے بس وہی ایک علاج ہے اس لئے ہندوستان کی روح میں وہ اگ لگا دینے والی قوتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو یہ ہیجان برپا کردیں۔ یہ چیز دوسرے کی عنایات و مراعات، عطیات اور اعلانات سے حاصل نہیں ہوسکیت بلکہ یہ تو خود بخود اندر سے پیدا ہونی چاہیے۔ انسان کو ناقابل برداشت بوجھ سے دماغی اور روحانی طور پر چھٹکارا پانے میں جو مسرت ہوتی ہے وہی مسرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی، کہ اندرونی قوت اب واقعی بھڑی اٹھی ہے یعنی مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے کان میں یہ منتر پھونک دے اہے کہ آزاد ہو جاؤ غلام نہ رہو۔ اور ہندوستان کے دل سے لبیک کی آواز آرہی ہے۔ اس تحریک کے ذریعے سے یکایک اس کی بیڑیاں ڈھیلی ہوگئی ہیں اور آزادی کا راستہ کھل گے ہے''۔

آئندہ تین ماہ میں ترک موالات کا بڑھتا ہوا سیلاب سارے ملک میں پھیل گیا۔ نئ کونسلوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل اتنی کامیاب رہی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یہ تو نہیں ہوسکا اور نہ ہوسکتا ھتا کہ کوئی شخص کونسلوں میں نہ جانے پائے اور نشستیں خالی رہیں۔ کسی کو منتخب کرنے کے لئے چند ووٹ بھی کافی تھے یا اگر ایک شخص بھی رائے دینے نہ جاتا تب بھی بلا مقابلے انتخاب ہوسکتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ووٹروں کی اکثریت نے ووٹ دینے سے احتراز کیا اور جن لوگوں کو ملک کے پر زور مطالبے کا ذرا بھی لحاظ تھا وہ ممبری کے لئے نہیں کھڑے ہوئے۔ اتفاق سے سر ولنٹائن شیرل انتخاب کے روز الہ آباد ہی میں موجود تھے۔ انہوں نے ان مقامات کا چکر لگایا جہاں ووٹ پڑ رہے تھے۔ بائیکاٹ اتنا مکمل تھا کہ وہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، الہ آباد سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ایک پولنگ اسٹیشن تھا۔ وہاں انہیں معلوم ہوا کہ ایک ووٹر بھی نہیں آیا۔ ہندوستان سے متعلق اپنی

ایک کتاب میں انہوں نے اپنے ان مشاہدات کا تذکرہ کیا ہے۔

کانگرس کے کلکتے کے اجلاس میں مسٹر سی۔آر۔داس اور ان کے ہم خیال حضرات نے کونسلوں کے بائیکاٹ پر اعتراض کیا تھا لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد وہ کانگریس کے ساتھ رہے۔جب انتخابات ختم ہو گئے تو یہ اختلاف بھی رفع ہو گیا۔ پھر جب دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تو بہت سے بچھڑے ہوئے کانگریس کے رہنما ترک موالات کے مرکز پر دوبارہ آ ملے۔ تحریک کی غیر معمولی کامیابی اکثر ڈگمگانے والوں اور شک کرنے والوں کو خود راہ راست پر لے آئی۔

لیکن کلکتہ کانگریس کے بعد چند پرانے لیڈر کانگرس سے قطعی طور پر علیحدہ ہو گئے۔ان میں ہر دلعزیز اور مشہور و معروف مسٹر جناح بھی تھے۔مسز سروجنی نائڈو انہیں ''ہندو مسلم اتحاد کا سفیر'' کہتی تھیں اور واقعی انہیں کی کوششوں سے مسلم لیگ کانگرس کے قریب آ گئی تھی۔لیکن ایک تو کانگرس کا دوتو اساسی بدل گیا جس کی وجہ سے وہ عوام میں مقبول ہو گئی اور انہیں کی انجمن بن گئی اور دوسرے حکومت سے ترک موالات کرنا۔یہ چیزیں مسٹر جنا کو پسند نہ آئیں۔اگرچہ وہ سیاسی وجوہ کی بنا پر ان کی مخالفت کر رہے تھے لیکن سیاست کے علاوہ بعض باتیں اور بھی تھیں جن کی وجہ سے وہ کانگریس سے علیحدہ وہ گئے۔کانگرس میں اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جو سیاسی عقائد کے اعتبار سے ان سے بہت پیچھے تھے۔لیکن ان کا مزاج اور فطرت کچھ ایسی تھی کہ وہ اس نئی کانگریس کے ساتھ نہ نبھ سکتے تھے۔وہ کھدر پوش لوگوں میں جو ہندوستانی میں تقریر کرنے پر اصرار کرتے تھے اپنے آپ کو کچھ اجنبی سا محسوس کرتے تھے۔کانگریس کے باہر عوام کو جوش و خروش انہیں دیوانہ پن معلوم ہوتا تھا۔ان میں اور عوام میں اتنا ہی فرق تھا جتنا لندن کے کسی بہتر علاقہ (مثلاً سیوِلے رو اور بانڈ اسٹریٹ) اور ہندوستان کے کسی گاؤں میں ہو۔ایک مرتبہ نجی طور پر انہوں نے یہ

تجویز کی تھی کہ صرف میٹرک پاس لوگوں کو کانگریس میں داخل کیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ سچ مچ ان کا یہ منشا نہ ہو لیکن یہ چیز ان کے عام انداز کے بالکل مطابق تھی۔ غرض وہ کانگرس سے علیحدہ ہو گئے اور ہندوستانی سیاست میں بے یارو مددگار ہو کر رہ گئے افسوس ہے کہ آگے چل کر "اتحاد کا یہ پرانا پیامبر" مسلم فرقہ پرستوں کے انتہائی رجعت پسند طبقے سے میل جول رکھنے لگا۔

اعتدال پسند یا لبرل فریق کو کانگریس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ یہ لوگ صرف کانگریس سے علیحدہ ہی نہیں رہے بلکہ حکومت سے شیر وشکر ہو گئے۔ نئی اصلاحات کے ماتحت انہوں نے وزارتیں اور بڑے بڑے عہدے قبول کر لئے اور ترک موالات اور کانگرس کا مقابلہ کرنے میں حکومت کو پوری مدد دی۔ ان کی تمنا تو پوری ہو چکی تھی، یعنی چند اصلاحات مل گئی تھیں پھر انہیں جدوجہد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سارا ملک جوش وخروش سے کھول رہا تھا اور روز بروز انقلاب پسند ہوتا جاتا تھا۔ لیکن یہ لوگ کھلم کھلا انقلاب کے مخالف اور حکومت کے جزو بنتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عوام سے انہیں کوئی لگاؤ نہ رہا اور ان میں یہ عادت پیدا ہو گئی (جواب تک باقی ہے) کہ وہ ہر مسئلے کو سرکاری نقطہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اب ان پر جماعت کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا بلکہ معدودے چند افراد تھے جو چند بڑے بڑے شہروں میں کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ مسٹر سری نواس شاستری نے برطانوی حکومت کی طرف سے شاہی سفیر بن کر امریکہ اور برطانیہ کی مختلف نوآبادیوں کا دورہ کیا اور ہر جگہ کانگرس اور اپنے ہم وطنوں کو حکومت سے لڑنے پر بہت برا بھلا کہا۔

ان تمام "کامیابیوں" کے باوجود لبرل کچھ خوش نہ تھے۔ اپنے بھائیوں سے الگ تھلگ رہنے میں انسان کو کوئی مسرت نہیں ہوتی اور یہ احساس کہ دنیا میری مخالف ہے، چاہے اس مخالف کو وہ دیکھ یا سن سکے ہر شخص کے لئے سوہان روح ہو جاتا ہے۔ عوام کی تحریک میں اپنے مخالفوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔

لیکن ترک موالات کی تحریک میں گاندھی جی کی پیہم تنبیہہ اور تاکید کی وجہ سے مخالفوں کے ساتھ عوام کا رویہ نسبتاً بہت نرم اور شریفانہ تھا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس وقت کے عام فضا سے اگر حامیوں کے دل گرماتے تھے تو مخالف خود بخود سہمے جا رہے تھے۔ عام ہیجان اور انقلابی تحریکوں کا یہی دوطرفہ اثر ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ان سے عوام اور ان کے حامیوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور ان کے شخصیتیں ابھرتی ہیں اور دوسری طرف مخالفوں کا خود بخود دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ قدرتی طور پر دب جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ترک موالات کی تحریک میں رواداری کا مادہ نہیں ہے اور یہ ملک میں رائے اور عمل کی ایک بے جان یکسانی پیدا کرنی چاہتی ہے۔ یہ اعتراض صحیح تھا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ ترک موالات عوام کی تحریک تھی اور ایک عظیم الشان ہستی اس کی رہبری کر رہی تھی جس پر ہندوستان کے لاکھوں افراد کو اندھا دھند اعتقاد تھا۔ اس سے زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ عوام پر اس تحریک کا غیر معمولی اثر تھا۔ لوگوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی بیڑیاں کٹ گئی ہیں۔ اکے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہے اور ان کی رگوں میں آزادی کا خون دوڑنے لگا ہے۔ وہ خوف جو انہیں کچلے ڈالتا تھا کافور ہو گیا اور وہ بھی اب سینہ نکال کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگے۔ دیہات کے بازاروں میں بھی عام لوگوں کی زبان پر کانگرس، سوراج (کیونکہ ناگپور کانگرس نے یہ طے کر دیا تھا کہ سوراج ہماری منزل مقصود ہے) پنجاب کے مظالم اور خلافت کے چرچے رہتے تھے۔ لیکن دیہات میں لفظ ”خلافت“ کے بہت ہی عجیب معنی سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ لفظ ”خلاف“ سے بنا ہے جس کے معنی مخالفت کے ہیں گویا خلافت سے مطلب ہے ”حکومت کی مخالفت“ یہ لوگ اپنی معاشی مشکلات پر بھی خاص طور سے گفتگو کرتے تھے۔ غرضیکہ بیشمار جلسوں اور کانفرنسوں نے ان کے سیاسی معلومات میں بہت کچھ

اضافہ کردیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں ہم میں سے اکثر لوگ جو کانگریس کا کام کیا کرتے تھے ایک طرح کے نشے میں چور رہتے تھے۔اس وقت ہم جوش۔ ہمت اور زندہ دلی میں سرشار تھے۔ہمیں وہ مسرت محسوس ہوتی تھی جو کسی شخص کو اپنے مذہب پر قربان ہونے میں ہوتی ہے۔شک یا پس و پیش ہمارے پاس نہ پھٹکتا تھا۔ہمیں اپنا راستہ بالکل صاف نظر آرہا تھا اور ہم بڑھتے چلے جاتے تھے۔دوسروں کا جوش ہمیں آگے بڑھاتا تھا اور ہم دوسروں کو آگے بڑھاتے تھے اس زمانے میں ہم نے اتنی سخت محنت کی کہ شاید اس سے پہلے کبھی نہیں کی ھتی۔ہمیں معلوم تھا کہ حکومت سے جنگ کا زمانہ نزدیک آرہا ہے اس لئے ہم یہ چاہتے تھے کہ اپنی گرفتاری سے پہلے جو کچھ ہوسکے وہ کرڈالیں۔

اس کے علاوہ ہم میں آزادی کا احساس پیدا ہوگیا تھا اور اس آزادی پرہمیں ناز تھا۔اب وہ مایوسی اور سہم کی کیفیت بھی باقی نہیں رہی۔اب نہ تو وہ سرگوشیاں تھیں اور نہ وہ پہلو بچا بچا کر قانونی الفاظ میں گفتگو کرنا۔جو ہمارے دل میں ہوتا تھا ڈنکے کی چوٹ کہتے تھے۔ کیونکہ ہمیں ڈر کاہے کا تھا؟ یہی نہ کہ جیل بھیج دیے جائیں گے۔ تو اس کے لئے ہم خود ہر وقت تیار رہتے تھے۔اس سے تو ہمارے مقصد کو تقویت پہنچتی تھی۔ ہمارے پیچھے خفیہ پولیس کے سینکڑوں آدمی لگے رہتے ھتے۔ ان بیچاروں کی حالت قابل رحم ہوگئی کیونکہ ہماری کوئی بات راز ہی نہتھی جسے وہ معلوم کرتے۔ہم جو کچھ کرتے تھے وہ ہمیشہ کھلم کھلا کرتے تھے۔

ہمیں اس نتیجہ خیز کام سے بڑا اطمینان حاصل ہوتا تھا کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی کایا پلٹ گئی ہے اور آزادی کے دن بہت قریب آگئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ خوش گوار احساس بھی تھا کہ ہم اپنے مقصد اور طریق کار دونوں کے لحاظ سے اپنے حریفوں سے اخلاقی حیثیت سے برتر ہیں۔ہمیں اپنے

رہنما اور ان کے طریق کار پر ناز تھا اور کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو بھی مہاتما سمجھنے لگتے تھے۔ عین طوفان میں بلکہ خود ہی طوفان اٹھاتے ہوئے ہمیں پورا سکون اور اطمینان قلب حاصل تھا۔

ادھر ہمارا ضبط اور اعتماد نفس بڑھتا جاتا تھا اور ادھر حکومت کی صفوں میں ابتری پھیل رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی وہ پرانی دنیا جو وہ دیکھتی چلی آتی تھی بدل رہی ہے اس لئے اس میں تشدد کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کی خود اعتمادی، بے خوفی اور رعب (جس پر یہاں برطانوی حکومت قائم ہے) دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو رہا تھا۔ تھوڑے بہت تشدد سے تحریک کو اور تقویت پہنچتی تھی۔ چنانچہ حکومت نے بہت عرصہ تک پس و پیش کرنے کے بعد بڑے بڑے لیڈروں پر ہاتھ ڈالا کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو۔ ہندوستانی فوج قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ پولیس احکام کی تعمیل کرے گی یا نہیں؟ اس کش مکش میں وہ مبتلا تھی۔ خود لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے دسمبر ۲۱ء میں کہا تھا کہ حکومت ''عجب شش و پنج میں'' ہے۔

۲۱ء کی گرمیوں میں صوبجات متحدہ کی حکومت نے ضلع کے افسروں کو ایک بہت دلچسپ گشتی چھٹی بھیجی۔ یہ چھٹی بعد میں اخباروں میں بھی شائع ہوئی۔ اس میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ پیش قدمی دشمن (یعنی کانگرس) ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ بڑی بری بات ہے۔ اس کے بعد پیش قدمی کی مختلف صورتیں تجویز کی تھیں۔ جس میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ''امن سبھائیں'' قائم کی جائیں۔ ان سبھاؤں کی مہمل اور مضحک حیثیت سب پر ظاہر ہے۔ خیال یہ ہے کہ ترک موالات کا مقابلہ کرنے کا یہ خاص طریقہ ہمارے لبرل وزرا کی تجویز پر اختیار کیا گیا تھا۔

اس زمانے میں اکثر انگریز افسروں کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ ان کے دل و

دماغ پر بڑا زور پڑ رہا تھا۔ ملک میں مخالفت اور حکم عدولی کا جذبہ برابر بڑھ رہا تھا۔ جو سرکاری طبقوں پر ڈراونی اور کالی کالی گھٹاؤں کی طرح چھا گیا تھا اور چونکہ اس میں تشدد کا شائبہ بھی نہ تھا اس لئے افسروں کو جبر و تشدد کا کوئی ذریعہ اور کوئی بہانہ نہ ملتا تھا۔ انگریز عام طور پر اس کے قائل نہ تھے کہ ہندوستانی سچ مچ عدم تشدد کے حامی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ کسی پوشیدہ سازش کو چھپانے کے لئے ایک پردہ ہے جو کسی دن یکا یک ہٹ جائے گا اور ہندوستان میں زبردست غدر مچ جائے گا۔ بچپن ہی سے ان کے خمیر میں یہ عقیدہ داخل ہے کہ مشرق ایک پراسرار جگہ ہے اور اس کے بازاروں اور تنگ و تاریک گلیوں میں ہمیشہ سازشیں ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے اس طلسماتی سرزمین میں انگریز کسی معاملے کو بھید سے خالی سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ دراصل وہ کبھی یہ کوشش ہی نہیں کرتے کہ مشرق کے سیدھے سچے انسانوں کو سمجھیں۔ وہ ان سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ جاسوسوں اور خفیہ گروہوں کے قصے کہانیوں کو پڑھ کر ان کے متعلق رائے قائم کرتا ہے اور پھر وحشت کے مارے پریشان ہو جاتا ہے۔ یہی حال اپریل ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں ہوا۔ یکا یک افسروں پر خصوصاً اور تمام انگریزوں پر عموماً ایک خوف طاری ہو گیا۔ انہیں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آنے لگا اور انہوں نے خواہ مخواہ یہ سمجھ لیا کہ زبردست بلوہ یا دوسرا غدر ہونے والا ہے جس میں انگریزوں کا قتل عام ہو گیا۔ چنانچہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح بچا لینے کے فطری مگر اندھا دھند جوش میں انہوں نے وہ خوفناک حرکتیں کیں جو امرتسر کے ''جلیانوالہ باغ'' اور کرانگ لین'' کے نام سے ضرب المثل بن گئی ہیں۔

۱۹۲۱ء کا پورا سال بڑی پریشانی کا زمانہ تھا اور اس میں سرکاری ملازموں کو دق اور بدحواس کرنے کا کافی سامان موجود تھا۔ اصلی شکلیں بھی کچھ کم نہ تھیں مگر خیالی مشکلیں ان سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہاں میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے اس

ذہنی خلفشار کا پوری طرح اندازہ ہو جائے گا۔میری بہن سروپ کی شادی۔۱۰ مئی ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں ہونے والی تھی۔یہ تاریخ حسب رواج سمت کی شبھ لگن دیکھ کر اس کے مطابق مقرر کی گئی تھی۔گاندھی جی اور بہت سے مقتدر کانگریسی لیڈر جن میں علی برادارن بھی شامل تھے۔اس شادی میں مدعو تھے اوران کی سہولت کے خیال سے اسی زمانے میں الہ آباد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ بھی مقرر کر دیا تھا۔مقامی کانگریس کارکن اپنے مشہور ومعروف لیڈروں کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔اس لئے انہوں نے بڑے پیانے پر ضلع کی ایک کانفرنس کا انتظام کیا اور امید تھی کہ کانفرنس میں قرب وجوار کے کسان بھی کافی تعداد میں شریک ہوں گے۔

ان سیاسی جلسوں کی وجہ سے الہ آباد میں بری چہل پہل اور جوش وخروش تھا۔اس سے بعض لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ایک دن مجھے اپنے ایک بیرسٹر دوست سے معلوم ہوا کہ بہت سے انگریز تو بالکل بدحواس ہو گئے تھے۔انہیں اندیشہ تھا کہ شہر میں کسی وقت یکا یک بغاوت ہو جائے گی اسلئے انہیں ہندوستانی ملازموں کے اعتبار جاتا رہا تھا اور ہر وقت اپنی جیبوں میں بھرے ہوئے پستول لئے پھرتے تھے۔نجی طور پر یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے قلعے میں ہر طرح کا انتظام کر دیا گیا تھا تا کہ اگر ضرورت پڑے تو انگریزوں کی ساری آبادی وہاں منتقل ہو جائے۔مجھے سخت حیرت تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ الہ آباد جیسے اونگھتے سوتے اور پر امن شہر میں اس قسم کی بغاوت ہونے کا کسی کو خیال ہی کیونکر پیدا ہوا۔خصوصاً اس حالت میں جبکہ امن کا سب سے بڑا علم بردار وہاں آنے والا تھا۔معلوم ہوا کہ ۱۰ مئی کی تاریخ (جو اتفاقاً میری بہن کی شادی کے لئے مقرر کی گئی تھی) میرٹھ میں ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہونے کی تاریخ اور انگریزوں کا خیال تھا کہ الہ آباد میں اس کی یادگار منائی جائے گی۔

۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی تھی اس لئے بہت سے

مولوی اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا بھی سیاسی جنگ میں نمایاں حصہ لینے لگے تھے۔
ان کی وجہ سے تحریک میں ایک خاص مذہبی رنگ پیدا ہو گیا تھا اور مسلمان عام طور پر
اس مذہبی سیاست سے بہت متاثر تھے۔ بہت سے مغرب زدہ مسلمانوں نے جنہیں
اب تک مذہب سے کوئی حس نہ تھا داڑھیاں رکھ لی تھیں اور احکام شرع کی سختی سے
پابندی کرنے لگے تھے۔ مولویوں کا اثر اور اقتدار جدید خیالات اور مغربی تہذیب کی
ترقی کی وجہ سے رفتہ رفتہ گھٹ رہا تھا۔ لیکن اس تحریک کے زمانے میں وہ پھر بڑھنا
شروع ہو گیا اور مولوی مسلم قوم پر پھر حاوی ہو گئے۔ علی برادران خود مذہبی ذہنیت
کے آدمی تھے اس لئے ان کی ذات سے بھی سے فروغ ہوا۔ اور گاندھیجی کا بھی اس
میں کافی ہاتھ تھا کیونکہ وہ بھی مولویوں اور عالموں کی انتہائی عزت کرتے تھے۔

دراصل گاندھی جی تحریک کے مذہبی اور روحانی پہلو برابر زور دیتے رہتے تھے۔
ان کے نزدیک مذہب کسی اذعانی عقیدے کا نام نہیں تھا مگر وہ ایک خاص مذہبی تصور
حیات کے قائل تھے جس کا تمام تحریک پر زبردست اثر پڑا اور عوام کے لئے یہ
احیائے مذہب کی تحریک بن گئی۔ اکثر کانگریسی کارکن فطرتاً اپنے رہنما کے قدم بہ
قدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور انہیں ان کے الفاظ بھی دہراتے تھے۔ لیکن ورکنگ
کمیٹی میں گاندھی جی کے خاص خاص رفیق کار مثلاً میرے والد۔ دیش بندھو
داس۔ لالہ لجپت رائے وغیرہ مذہبی لوگ نہ تھے اور وہ سیاسی مسئل کو صرف سیاسی نظر
سے دیکھتے تھے لیکن ان کے اقوال کے مقابلے میں ان کی افعال کا اثر زیادہ پڑتا تھا۔
لوگ دیکھتے تھے کہ انہوں نے ان تمام چیزوں کو جن کی دنیا تمنا کرتی ہے تج دیا
ہے اور نہایت سادہ زندگی اختیار کی ہے۔ لوگوں کے نزدیک یہ ان کی مذہبیت کی
دلیل تھی اور اس سے احیائے مذہب کا یہ رنگ اور پکا ہوا۔

بعض اوقات میں پریشان ہو جاتا تھا کہ سیاست میں مذہب کو اتنا دخل کیوں
ہے؟ مجھے یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔ مولوی۔ مولانا اور سوامی جو کچھ اپنی تقریروں میں

کہتے تھے اسے سن کر مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا۔ مجھے ان کی تاریخ، عمرانیات اور اقتصادیات سب غلط معلوم ہوتی تھی۔ اور ہر چیز کو مذہبی رنگ دے دینے سے روشن خیالی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ گاندھی جی کے بعض جملے بھی مجھے گراں گزرتے تھے۔ مثلاً وہ اس زریں زمانے کو جو پھر لوٹ آنے والا تھا اکثر ''رام راج'' کے نام سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ لیکن میں بے بس تھا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیتا تھا کہ گاندھی جی یہ الفاظ صرف اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ یہ لوگ انہیں جانتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں درحقیقت انہیں لوگوں کے دل کی تہ تک پہنچنے کا عجیب ملکہ حاصل تھا۔

لیکن میں نے ان چیزوں کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ مجھے خوداتنی مصروفیت تھی اور تحریک اس زور شور سے بڑھ رہی تھی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دینے کا وقت ہی نہ تھا۔

ایک عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں اس لئے جب تک ہم صحیح راستے سے نہ بھٹکیں چند رجعت پسندوں کی موجودگی سے کیا ہرج تھا۔

رہے گاندھی جو تو ان کا سمجھنا تھا۔ کبھی کبھی ان کی گفتگو اس قسم کی ہوتی تھی کہ عام طور پر جدید خیالات کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن یہ ہمیں یقین تھا کہ وہ بہت بڑے اور بے مثل انسان اور عظیم الشان رہنما ہیں اس لئے ہم ان پر ایمان لے آئے اور انہیں سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا۔ اکثر ہم آپس میں ان کی انوکھی باتوں اور عجیب وغریب خیالات پر تبصرہ کیا کرتے تھے اور ہنسی میں کہتے تھے کہ سوراج کے بعد اس قسم کی حرکتوں کی ہمت افزائی نہ ہونا چاہیے۔

لیکن ہم میں سے بعض لوگ سیاسی معاملات اور دوسری چیزوں میں ان سے اس قدر متاثر تھے کہ مذہب کے معاملے میں ان کے اثر سے آزاد نہیں رہ سکتے تھے۔ جہاں براہ راست حملے سے کام نہیں نکلتا وہاں اکثر پھیر کھا کر ادھر ادھر سے بڑھنے میں قلعہ کی تسخیر میں کامیابی ہوتی ہے۔ یہی صورت میرے ساتھ ہوئی۔ مذہب کی

ظاہری رسوم کا مجھ پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے علاوہ نام نہاد مذہبی پیشوا مذہب کے نام پر لوگوں کو جو لوٹتے تھے اس سے مجھے سخت نفرت تھی۔ تاہم میری مخالفت کچھ نرم پڑ گئی۔ بچپن سے اب تک کبھی مجھ پر اتنا مذہبی رنگ نہ چڑھا تھا جتنا ۱۹۲۱ء میں چڑھا۔ اس پر بھی میں مذہب سے زیادہ قریب نہ ہو سکا۔

مجھے اپنی تحریک اور ستیا گرہ کا اخلاقی پہلو بہت پسند تھا۔ عام تشدد کے اصول پر نہ کبھی میں پورا ایمان لایا اور نہ مستقل طور پر اسے تسلیم کیا لیکن میں اس کی طرف روز بروز کھنچا جاتا تھا اور یہ خیال قائم ہوتا جاتا تھا کہ اس وقت ہندوستان میں ہماری حالت زار اور ہمارے عقائد و روایات کے لحاظ سے یہ بہترین حکمت عملی ہے۔ سیاست کو روحانیت میں سمو دینے کو (یہ اصلاح مذہب کے تنگ مفہوم میں استعمال کی گئی ہے) میں اچھی نظر سے دیکھتا تھا۔ اچھے مقصد کو اچھے ذرائع زیب دیتے ہیں۔ یہ نہ صرف اخلاقی حیثیت سے ایک اچھا اصول تھا بلکہ معقول اور عملی اعتبار سے صحیح بھی تھا۔ کیونکہ برے اور غلط ذرائع مقصد کو الٹا نقصان پہنچاتے اور نئی نئی پیچیدگیاں اور مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نہایت ہی نا زیبا اور افراد یا قوم کی خوداری سے فروتر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ذرائع استعمال کرے اور کیچڑ میں سے ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ آلودگی سے کیونکر دامن بچا سکتا ہے؟ اگر ہم جھک جائیں یا رینگنے لگیں تو پھر ہم سر اٹھا کر تیز تیز کیسے چل سکتے ہیں۔

یہ تھے اس وقت میرے خیالات۔ ترک موالات کی تحریک سے میری دلی مراد بر آئی تھی۔ یعنی میں قومی آزادی کا خواہاں تھا اور میرا خیال تھا کہ اس تحریک کے ذریعہ سے غریبوں کو لوٹنا بند ہو جائے گا۔ اس میں جو ذرائع استعمال کیے جاتے تھے ان سے میرے اخلاقی جذبے کو تسکین ہوتی تھی او مجھ میں شخصی آزادی کا احساس پید اہوتا تھا۔ یہ سکون و اطمینان اتنا زبردست تھا کہ مجھے ناکامی کی بھی کوئی پروا نہ تھی۔

کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ ناکامیاں محض عارضی ہوں گی۔ بھگوت گیتا کے مابعد الطبعی مضامین کو نہ تو میں سمجھتا تھا اور نہ اس طرف کچھ رغبت ہی تھی۔ البتہ میں ان اشلوکوں کو اکثر پڑھا کرتا تھا جو گاندھی جی کے آشرم میں پرارتھنا کے وقت پڑھے جاتے تھے۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ انسان کو اپنے مقصد میں نہایت پرسکون، مطمئن اور مستقل ہونا چاہیے۔ اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اور نتیجے کے پیچھے سرگرداں نہ پھرنا چاہیے۔ چونکہ میں خود بہت پرسکون نہ تھا شاید اسی لئے اس نصیحت کا مجھ پر بہت اثر ہوتا تھا۔

۱۹۲۱ء اور میری پہلی جیل یاترا

۱۹۲۱ء ہم لوگوں کے لئے غیر معمولی سال تھا۔ اس زمانے میں قوم پرستی سیاسیات، مذہب، پاطینت اور جنون کا ایک عجیب معجون مرکب بن گیا۔ ادھر کسانوں کی تحریک چل رہی تھی اور بڑے شہروں میں مزدوروں کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ قوم پرستی اور ایک مبہم مگر گہری تصور پرستی، بے چینی کے ان سب عناصر کو جن میں سے بعض ایک دوسرے کے مخالف تھے، متحد کرنا چاہتی تھی اور اسے اس میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ یہ قوم پرستی خود بھی ایک مرکب قوت تھی۔ اس میں تین اجزاء الگ الگ نظر آتے تھے، یعنی ہندو قوم پرستی مسلم قوم پرستی (جسکی دلچسپی ایک حد تک ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک سے وابستہ تھی) اور ہندوستانی قوم پرستی جو متقضائے وقت سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی۔ عارضی طور پر یہ تیوں قوتیں مل جل گیئں تھیں اور ساتھ ساتھ کام کر رہی تھیں۔ ہر جگہ ''ہندو مسلمان کے جے'' کے نعرے گونج رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ گاندھی جی نے ان تمام فرقوں اور جماعتوں پر نہ جانے کیا جادو کر دیا کہ رنگ برنگ کا مجمع اکھٹا ہو کر ایک ہی طرف جھک پڑا۔ وہ حقیقت میں لوگوں کی مخلوط خواہشوں کا مظہر بن گئے تھے'' (یہ فقرہ ایک دوسرے لیڈر کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔)

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ لوگوں کے اس جوش و خروش میں بدیشی حکمرانوں سے نفرت کا جذبہ نسبتاً بہت کم پایا جاتا تھا۔ قوم پرستی اصل میں ایک مخالفانہ جذبہ ہے۔ دوسری قوموں اور بیزاری اس کی غذا ہے خصوصاً غلام ملک کی قوم پرستی تو سراسر بدیسی حکمرانوں سے نفرت کے جذبے پر منحصر ہے۔ ہندوستان میں بھی ۱۹۲۱ء میں برطانیہ سے نفرت اور بیزاری موجود تھی لیکن دوسروے غلام ملکوں ے مقابلے میں بہت کم تھی۔ سچ پوچھئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی نے عدم تشدد پر غیرے معمولی زور دیا تھا۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ تحریک کے شروع ہوتے ہی لوگوں میں

آزادی اور قوت کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور انہیں یقین تھا کہ منزل مقصود ہم سے قریب ہے اس لئے سوچتے تھے کہ جب کام اتنی اچھی طرح چل رہا ہے اور کامیابی بالکل یقینی ہے تو فطرت اور غصہ کی ضرورت ہی کیا ہے یا احساس قوت نے ہم میں فراخ دلی پیدا کر دی تھی۔

مگر ہمارا دل اپنے ان معدودے چند ہم وطنوں سے صاف نہ تھا جو ہمارے حریفوں سے مل کر قومی تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ گو ہم نے اپنے طرز عمل میں بہت احتیاط سے کام لیا اور اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ان کے معاملے میں نفرت یا غصے کا کوئی سوال نہیں تھا اس لئے کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور ہم انہیں آسانی سے نظر انداز کر سکتے تھے، البتہ ان کی کمزوری، ابن الوقتی اور قوم فروشی کو دیکھ کر ہمارے دل میں حقارت کا جذبہ ضرور پید ہوتا تھا۔

بہر حال ہم بے سوچے سمجھے زور شور سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سفر کا سرور ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا، مگر منزل مقصود کا کوئی واضح تصور ہمارے سامنے نہیں تھا۔ اب یہ خیال کر کے حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے کس طرح تحریک کے نظری پہلو یعنی اس کے فلسفے اور مقصد کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ ہم سب سوراج سوراج پکارتے تھے۔ لیکن اس لفظ کا مفہوم کامل سیاسی آزادی اور جمہوری طرز حکومت تھا اور ہم اپنی تقریروں میں اس کا صاف صاف اظہاری بھی کرتے تھے۔ ہم میں سے بہت سے یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس سے لازی طور پر اس بوجھ میں کمی ہو جائے گی جو کسانوں اور مزدوروں کے طبقے کو کچلے ڈالتا ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ ہمارے اکثر لیڈر سوراج کا مفہوم مکمل آزادی سے بہت کم سمجھتے تھے۔ گاندھی جی خود اس معاملے میں بڑے مزے کی گول مول باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس پر وضاحت سے غور کیا جائے۔ مگر ان کی مبہم گفتگو سے بھی یہ صاف طور پر ظاہر تھا کہ وہ غریبوں کے حامی ہیں اور اس بات سے ہم میں سے اکثر کو بڑی تسکین

ہوتی تھی اگر چہ اسی کے ساتھ وہ امیروں کو بھی بہت اطمینان دلاتے تھے۔گاندھی جی کسی مسئلے کو عقلی طور پر حل کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ سیرت اور پرہیز گاری پر زور دیتے تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں ہندوستانیوں میں محکم ارادہ اور مضبوط سیرت پیدا کرنے میں حیرت انگزے کامیابی ہوئی لیکن بہت ایسے بھی تھے جن میں نہ محکم ارادہ پیدا ہوا اور نہ مضبوط سیرت بلکہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ڈھیلا ڈھالا جسم اور بے رونق چہرہ پرہیز گاری کی علامت ہے۔

لوگوں میں جو غیر معمولی قوت اور چستی پیدا ہوگئی تھی اسے دیکھ کر ہمارا دل اعتماد نفسِ کے جذبے سے معمور تھا۔ یہ بے، پست اور منتشر جماعت یکا یک سینہ تان کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگی اور منضبط اور متحدہ تحریک میں جو ملک میں اس سرے سے اس سرے تک اٹھتی تھی، شریک ہوگئی۔ہمیں یقین تھا کہ یہ جوش عمل بجائے خود ان میں ایسی قوت پیدا کردے گا جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کرسکتی۔اس لئے ہمیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ عمل کی تہ میں کوئی خیال بھی ہونا چاہیے۔ ہم نے اس حقیقت کو فراموش کردیا تھا کہ صحیح تخیل اور منزل مقصود کے تعین کے بغیر عوام ک ایہ سارا جوش وخروش دھواں بن کر اڑ جائے گا۔ہماری تحریک میں ایک اصلاحی عنصر تھا وہ ہمیں کسی حد تک آگے بڑھائے جا رہا تھا۔ہمیں یہ زعم تھا کہ عدم تشدد جو سیاسی اور معاشی تحریکوں کے لئے اور مظالم ک اتدارک کرنے کے لئے سب سے کارگر چیز ہے، ایک نیا پیام جو ہم ساری دنیا کو دے رہے ہیں۔سچ پوچھیے تو ہم اور سب قوموں کی طرح اس فریب نفس کا شکار ہوگئے کہ ہم ایک برگذیدہ قوم ہیں۔عدم تشدد کو ہم جنگ وجدال کا اخلاقی بدل سمجھتے تھے جو مشرقی اور جدید تہذیب کے متعلق گاندھی جی کے پرانے نظریوں کو تسلیم کرتے ہوں۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ خود بھی انہیں نا قابل عمل اور جدید حالات کے لئے نا موزوں سمجھتے ہیں۔بہر حال ہم میں سے اکثر جدید تہذیب کے کارناموں کو ٹھکرانے

کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ہندوستان کے حالات کے مطابق ان میں مناسب ترمیم کی ضرورت سمجھتے ہوں۔ مجھے تو بڑی مشینیں اور تیز رفتار سواریاں بہت پسند ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی کے خیالات کا بہت سے لوگوں پر اثر پڑا اور وہ مشینری اور اسکے استعمال کے نتائج پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ گویا صورت یہ تھی کہ بعض لوگوں کو نظر مستقل پر تھی اور بعض کی ماضی پر مگر لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس متحدہ کوشش کو جو وہ کر رہے تھے، مفید سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ ایثار اور قربانی کیلئے آسانی سے تیار ہو گئے۔

میں اور میری طرح اور بہت سے لوگ اس تحریک میں محو ہو کر رہ گئے۔ میں نے اپنی تمام پرانی دلچسپیاں اور تعلقات، پرانے دوستوں کی صحبت، کتب بینی غرض سب کچھ ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنے کام کی خبروں کی سوا اخبار تک پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس وقت تک مجھے تازہ ترین مطبوعات پڑھنے کا شوق تھا۔ اور میں کوشش کرتا تھا کہ واقعات عالم سے باخبر رہوں لیکن اب اس کے لئے وقت کہاں سے آتا؟ باوجود اس محبت کے جو مجھے اپنے خاندان سے تھی، میں نے اپنے سب عزیزوں یہاں تک کہ اپنی بیوی اور لڑکی کو بھی بھلا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے ایک عرصے کے بعد ہوا کہ اس زمانہ میں ان لوگوں کو مجھ سے کتنی تکلیف پہنچی ہوگی اور میری بیوی نے کس قدر صبر و تحمل سے کام لیا۔ میں دن رات دفتروں کمیٹیوں اور جلسوں میں رہا کرتا تھا۔ ان دونوں دیہات جانے کا زور تھا اور ہم کھیتوں ہی کھیتوں میں میلوں پیدل چلا کرتے تھے اور دور دور پہنچ کر کسانوں کے جلسوں میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ اب مجھے اس جوش کا احساس ہوا جو مجمع میں جا کر پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوا کہ مجھ میں لوگوں پر اثر ڈالنے کی قوت ہے۔ میں مجمع کی نفسیات کو تھوڑا بہت سمجھنے لگا اور اس فرق سے واقف ہو گیا جو شہر والوں اور دیہاتیوں کی ذہنیت میں ہوتا ہے۔ مجھے بڑے بڑے جلسوں کے گرد و غبار ریل پیل دھکم دھکا میں لطف آنے لگا۔ البتہ کبھی

کبھی ان کی بدنظمی سے مجھے غصہ آجاتا تھا۔ اس کے بعد بعض اوقات مجھے مخالف اور برہم مجمع سے بھی سابقہ پڑا جو اس قدر برافروختہ کیا کہ میرا ابتدائی تجربہ اور وہ اعتماد نفس جو اس کی وجہ سے مجھ میں پیدا ہوگیا تھا بہت کام آیا۔ میں نے ہمیشہ لوگوں پر بھروسہ کیا اور مجمع کے بیچ سے دراتا چلا گیا۔ اب تک وہ مجھ سے ہمیشہ بڑے اخلاق اور عزت سے پیش آئے ہیں چاہے انہیں میری رائے سے اتفاق نہ بھی ہو لیکن مجمع کا کیا اعتبار۔ ممکن ہے آئندہ مجھے تلخ تجربے پیش آئیں۔ مجھے مجمع سے اور مجمع کو مجھ سے انس ہوگیا لیکن میں نے کبھی اپنی ہستی کو اس میں محو نہیں ہونے دیا ہمیشہ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا اپنے خاص زاویہ نگاہ سے میں اس پر ناقدانہ نظر ڈالتا تھا اور ہمیشہ تعجب کیا کرتا تھا کہ اگرچہ میں ان ہزاروں افراد سے جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ عادات واطوار، جذبات وخواہشات، ذہنی اور روحانی اعتماد بھی کرتے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے کچھ سے کچھ سمجھ لیا تھا؟ کیا مجھے میرے اصلی رنگ میں دیکھنے کے بعد بھی وہ درگزر سے کام لیں گے؟ میں نے صاف گوئی برتی اور ان کے سامنے سچی بات کہنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ اکثر میں نے انہیں کھری کھری سنائیں اور ان کے توہمات اور رسم ورواج پر لعن طعن کی۔ پھر بھی وہ مجھ سے بیزار نہیں ہوئے۔ لیکن میرے دل میں یہ خیال ہمیشہ کھٹکتا رہا کہ وہ میری ذات سے جیسی وہ واقعی ہے محبت نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس خوشنما تصور سے محبت کرتے ہیں جو انہوں نے میرے متعلق اپنے ذہن میں قائم کرلیا ہے۔ لیکن یہ جھوٹی مورت کب قائم رہ سکتی ہے۔ اور کیوں قائم رہنے دی جائے؟ پھر جب یہ مورت پاش پاش ہوجائے گی اور حقیقت کھل جائے گی تو کیا ہوگا؟

مجھ میں خود پسندی کا عیب ہے لیکن ان بھولے بھالے لوگوں کے سامنے خود پسندی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ان میں اس بناوٹ اور اچھے پن کا شائبہ بھی نہیں ہے جو اکثر ہمارے اوسط طبقے کے لوگوں میں، جنہیں ان سے برتر ہونے کا دعویٰ ہے پائی

جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بیچارے عام طور پر بے حس اور انفرادی طور پر نہایت غیر دلچسپ ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ان پر بڑا ترس آتا ہے، اور اس مصیبت کو دیکھ کر جوان کے سروں پر منڈلاتی رہتی ہے، بہت دکھ ہوتا ہے۔

لیکن ہماری کانفرنسوں کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا تھا یہاں ہمارے چیدہ کارکن (جن میں میں بھی شامل تھا) پلیٹ فارم پر طرح طرح کے کرتب دکھاتے تھے۔ ہمارے انداز میں بناوٹ کی اور ہماری دھواں دھار تقریروں میں اوچھے پن کی کمی نہ تھی۔ یہ عیب ہم میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی حد تک موجود تھا۔ کسی بڑے مجمع کے سامنے پلیٹ فارم پر فطری انداز قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے اور ہم میں سے اکثر کو اتنی زیادہ شہرت حاصل کرنے کا پہلا ہی اتفاق تھا۔ اس لئے ہم اپنی وہ ہیت بنا لیتے تھے جو ہمارے نزدیک لیڈروں کی ہونی چاہیے۔ یعنی ایک غور وفکر اور سنجیدگی کی شان جس میں ہنسی مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، یہاں تک کہ مسکراتے وقت بھی ہمیں یہ خیال رہتا تھا کہ ہزاروں آنکھیں ہم پر لگی ہوئی ہیں اور اس سے متاثر ہو کر ہم طرح طرح کی مضحک حرکتیں کیا کرتے تھے۔ دوسروں کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھنا بہت مشکل ہے اس لئے میں خود اپنی تنقید نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ دوسروں کے عادات و اطوار کا بہت غور سے مطالعہ کرتا تھا اور اس سے بہت لطف اٹھاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال کر کے دل کانپ اٹھتا تھا کہ شاید دوسروں کو بھی میں اتنا ہی مضحک معلوم ہوتا ہوں۔

۱۹۲۱ء میں سال بھر کانگریس کے کارکن ایک ایک کر کے برابر گرفتار ہوتے رہے اور سزا پاتے رہے۔ مجموعی گرفتاریاں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ علی برادان کو فوج میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں طویل سزا مل چکی تھی۔ جن الفاظ کے زبان سے نکالنے پر انہیں سزا ہوئی تھی سینکڑوں پلیٹ فارموں سے ہزاروں آدمیوں نے انہیں کو دہرایا۔ گرمیوں کے زمانے میں میرے متعلق بھی یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ چند

تقریروں کی بنا پر مجمعہ پر بغاوت کا جرم عائد کیا جائے گا اور مقدمہ چلایا جائے گا۔ لیکن ایسی کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔ سال کے آخر میں معاملات حد کو پہنچ گئے۔ پرنس آف ویلز ہندوستان آنے والے تھے۔ اور کانگریس نے طے کیا تھا کہ ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ نومبر کے آخر میں بنگال میں کانگریس کے والنٹیر خلاف قانون قرار دے دئے گئے۔ اس کے بعد اسی قسم کا اعلان صوبجات متحدہ میں بھی ہوا۔ دیش بندھو داس نے صوبہ بنگال کے نام ایک ولولہ انگیز پیغام شائع کیا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوء ہیں اور میرا سارا جسم آہنی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ یہ غلامی کا قہر ہے۔ سارا ملک ایک بہت بڑا جیل خانہ ہے۔ چاہے میں آزاد ہوں یا جیل خانہ میں بند کر دیا جاؤں۔ چاہے میں زندہ رہوں یا مر جاؤں لیکن کانگریس کا کام بہر صورت جاری رہنا چاہیے۔'' صوبہ متحدہ میں بھی ہم نے حکومت کے چیلنج کو قبول کر لیا اور نہ صرف یہ اعلان کیا کہ ہماری والنٹیروں کی انجمن جاری رہے گی۔ بلکہ روزانہ اخباروں میں اپنے والنٹیروں کے نام بھی شائع کرانا شروع کر دیئے۔ پہلی فہرست میں سب سے پہلا نام میرے والد کا تھا۔ وہ والنٹیر نہ تھے۔ لیکن محض گورنمنٹ کے حکم کی خلاف ورزی کے لئے انہوں نے بھی اپنا نام لکھا لیا۔ دسمبر کے آغاز میں ولی عہد کے آنے سے چند روز پہلے کثیر تعداد میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

ہم جانتے تھے کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ حکومت اور کانگریس کے درمیان جس جنگ کا اندیشہ تھا اور وہ اب چھڑے ہی والی ہے۔ جیل خانہ ابھی تک ایک غیر معروف جگہ تھی اور جیل جانے کا خیال بالکل نئے اتھا۔ میں ایک دن الہ آباد کے کانگریس کے دفتر میں معمول کے وقت کے بعد بیٹھا پچھلا کام نبٹا رہا تھا کہ ایک کلرک گھبرایا ہوا آیا اور کہا کہ پولیس تلاشی کا حکم لے کر آ پہنچی ہے اور دفتر کی عمارت کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں بھی کچھ گھبرا گیا کیونکہ اس قسم کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ مگر میں

نے دل میں کہا کہ ذرا رعب جمانا چاہیئے اور یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ ہم بالکل مطمئن ہیں اور ہمیں پولیس کی آمد و رفت کی مطلق پرواہ نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک کلرک کو حکم دے کہ وہ پولیس افسر کے ساتھ ساتھ جا کر دفتر کے تمام کمرے دکھادے اور باقی عملے کو سختی سے تاکید کی کہ وہ پولیس کی طرف کوئی توجہ نہ کریں اور بدستور اپنا کام کرتے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے ایک دوست اور رفیق کار جو دفتر کے باہر ہی گرفتا ہوئے تھے ایک سپاہی کے ساتھ مجھ سے رخصت ہونے آئے۔ مجھے اس وقت یہ خبط سمایا ہوا تاھ کہ جیسے نئے واقعات میرے لئے آئے دن کی چیز ہیں۔ اس لئے میں اپنے دوست سے بڑی سرد مہری سے پیش آیا یعنی میں نے ان سے اور سپاہی سے بڑی بے پروائی سے کہا کہ ذرا ٹھہریئے۔ میں یہ خط ختم کرلوں۔ اس کے بعد ہی شہر سے گرفتاریوں کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ آخر کار میں نے سوچا کہ گھر چل کر دیکھنا چاہیئے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مکان پہنچا تو دیکھا کہ پولیس وہاں بھی موجود ہے اور ہماری وسیع کوٹھی کی تلاشی لے رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ والد کو اور مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔

ہم پرنس آف ویلس کے بائیکاٹ میں چاہے جتنا اہتمام کرتے ہمیں اتنی کامیابی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جتنی ان واقعات سے ہوئی۔ جہاں کہیں وہ تشریف لے گئے ہڑتالوں اور سونی سڑکوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ الہ آباد کی آمد کے موقع پ شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ چند دن بعد وہ کلکتے گئے تو اس عظیم الشان شہر میں بھی تمام چہل پہل یکا یک بند ہو گئی۔ یہ پرنس آف ویلس کے ساتھ بڑا ظلم تھا۔ کیونکہ نہ ان کا کوئی قصور تھا نہ ہمیں ان سے کوئی شکایت تھی۔ البتہ حکومت ہند ان کی شخصیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور ان کے ذریعے سے اپنی گرتی ہوئی ساکھ سنبھالنا چاہتی تھی اس لئے ہم ان کا بائیکاٹ کر رہے تھے۔

اب تو گرفتاریوں اور سزایابیوں کا تار بندھ گیا خصوصاً بنگال اور صوبجات متحدہ

میں ان صوبوں کے تمام مقتدر لیڈر اور کارکن گرفتار کر لئے گئے اور والنٹیر تو ہزاروں کی تعداد میں جیل بھیج دئے گئے۔ شروع شروع میں زیادہ تر شہر والوں نے پیش قدمی کی اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ جیل جانے والے والنٹیروں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی تو اپنے اجلاس کے وقت پوری کی پوری گرفتار کر لی گئی (اس وقت ۵۵ ممبر موجود تھے) بہت سے ایسے لوگ بھی جنہوں نے کانگریس میں یا سیاسی کاموں میں آج تک کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ جوش کے اس اڈتے ہوئے سیلاب میں بہہ گئے اور گرفتار ہونے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ایسی مثالیں بھی سننے میں آئی ہیں کہ سرکاری دفتر کا کوئی کلرک شام کو اپنے کام سے واپس آرہا ہے۔ راستے میں وہ بھی اس رو میں بہہ گیا اور گھر جانے کی بجائے جیل پہنچ گیا۔ لڑکے اور نوجوان، قیدیوں کی لاری میں گھس جاتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ہمیں بھی جیل خانے لے چلو۔ روز شام کو ہم جیل کے اندر سے سنا کرتے تھے کہ سیاسی قیدیوں کی لاریوں پر لاریاں چلی آرہی ہیں اور قومی نعرے لگائے جارہے ہیں۔ جیل خانے کھچاکھچ بھر گئے تھے اور جیل کے افسر اس غیر معمولی حالات سے سخت پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پولیس کی لاری وارنٹ کے مطابق قیدیوں کی ایک خاص تعداد لیکر روانہ ہوئی (قاعدے کی وجہ سے یا مجبوری سے انکے نام نہیں لکھے جاتے تھے) مگر جب جیل خانے کے دروازنے پر پہنچی تو اس میں اس تعداد سے کہیں زیادہ قیدی نکلے۔ جیل کے افسر حیران رہ جاتے تھے کہ اس عجیب وغریب صورت میں کیا طرز عمل اختیار کریں کیونکہ جیل مینوئل میں اس کے متعلق کوئی دفعہ نہ تھی۔

آخر حکومت نے لوگوں کو بلا تفریق گرفتار کرنے کا رویہ ترک کر دیا۔ اب صرف مشہور مشہور کارکن چن لئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کے جوش کا وہ پہلا زور کم ہو گیا۔ اور چونکہ جیل میں سارے کے سارے معتمد کارکن نہ تھے اس لئے وہ ایک

بے بسی اور تذبذب کی حالت میں پھنس گئے۔ لیکن یہ تبدیلی محض ظاہری تھی۔ ابھی فضا میں گرج اور کڑک موجود تھی۔ ملک میں بے چینی باقی تھی اور انقلابی رجحانات پائے جاتے تھے۔ دسمبر ۲۱ء و جنوری ۲۲ء میں ترک موالات کے سلسلے میں ۳۰ ہزار شخص جیل گئے۔ لیکن اگرچہ سارے نمایاں لیڈر اور کارکن جیل میں تھے مگر تحریک کے بانی اور رہبر اعظم مہاتما گاندھی ابھی باہر تھے اور روزانہ پیغامات اور ہدایات جاری کرتے رہتے تھے جس سے لوگوں میں جوش بڑھتا تھا۔ اور اکثر نامناسب حرکتیں رک جاتی تھیں۔ حکومت نے اب تک انہیں نہیں چھیڑا تھا، کیونکہ وہ اس کے نتائج سے ڈرتی تھی اور اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ہندوستانی فوج اور پولیس نہ بھڑک اٹھے۔

فروری ۲۲ء کے آغاز میں یکایک تمام منظر بدل گیا۔ جیل خانے میں یہ سن کر ہمیں بڑی حیرت و پریشانی ہوئی کہ گاندھی جی نے تمام جارحانہ کاروائیاں ایک دم سے روک دیں۔ اور عدم تعاون کی تحریک ملتوی کر دی۔ اخباروں میں ہم نے یہ بھی پڑھا کہ چوراچوری کے واقعات کی وجہ سے انہوں نے یہ طرز عمل اختیار کیا۔ یہ موضع گورکھپور کے ضلع میں ہے۔ یہاں دیہاتیوں کے ایک مجمع نے پولیس کے مظالم سے تنگ آ کر تھانے کو آگ لگا دی او چھ سات سپاہیوں کو زندہ جلا دیا۔

ہمیں جنگ کے التوا کی خبر سن کر بڑا غصہ آیا۔ کیونکہ اس وقت ہماری قوت بڑی ہوئی تھی اور ہم ہر محاذ پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ لیکن جیل خانے کے اندر ہماری مایوسی اور غصہ سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ چنانچہ عدم تعاون ختم ہو گیا اور ترک موالات کی کلی کھلنے سے پہلے مرجھا گئی۔ مہینوں کی تگ و دو اور پریشانی کے بعد حکومت نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور اب اسے پہلے پہل موقع ملا کہ پیش قدمی کرے چنانچہ چند ہفتے کے اندر اندر اس نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے طویل مدت کے لیے جیل خانے میں بند کر دیا۔

عدم تشدد یا تلوار

چوراچوری کے حادثے کی وجہ سے تحریک کا یکا یک ملتوی ہو جانا غالباً مہاتما گاندھی کے سوا تمام نمایاں کانگریسی لیڈروں کو ناگوار ہوا۔ میرے والد بھی (جو اس وقت جیل ہی میں تھے) اس سے بہت بددل ہو گئے۔ نوجوان طبقہ قدرتی طور پر زیادہ مشتعل ہوا کیونکہ ہماری بڑھتی ہوئی امیدوں کا قلعہ یکا یک بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل کا یہی ردعمل ہونا تھا۔ التوا سے زیادہ ہم ان وجوہ سے جو التوا کی تائید میں پیش کی گئیں اور ان نتائج سے جو ان سے نکلتے تھے۔ گھبرا گئے۔ مانا کہ چوراچوری کا واقعہ نہایت افسوسناک اور عدم تشدد کے اصول کے قطعی منافی تھا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ملک کے کسی کونے کا ایک گاؤں اور وہاں کے مشتعل کسانوں کا ایک گروہ جنگ آزادی کا اس طرح خاتمہ کر سکتا ہے؟ اگر تشدد کے کسی انفرادی واقعہ کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے تو عدم تشدد کی لڑائی کے اصول اور عمل میں ضرور کوئی نقص ہے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ ناممکن تھا کہ اتنی بڑی تحریک میں اس طرح کے اکا دکا واقعات پیش نہ آئیں۔ تو کیا ہمیں آگے بڑھنے سے پہلے ہندوستان کے تیس پینتیس کروڑ انسانوں کو عدم تشدد کے اصول اور عمل کی مکمل تعلیم دینا چاہیے؟ اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش بھی کریں تو خود ہم میں سے کتنے لوگ نکلیں گے جنہیں اپنے اوپر اعتماد ہوگا کہ پولیس کے انتہائی اشتعال کے باوجود وہ پوری طرح پرامن رہ سکیں گے؟ یا فرض کیجئے کہ ہم کامیاب بھی ہو جائیں تو ان بے شمار سرکاری گرگوں کا کیا علاج کریں گے جو ہماری تحریک میں چپکے سے گھس کر خود تشدد کی حرکتیں کرتے ہیں اور دوسروں کو ورغلاتے ہیں۔ اگر عدم تشدد کی تحریک چلانے کی یہی شرط ٹھہری کہ ملک کے طول و عرض میں تشدد کا ایک واقعہ بھی نہ ہونے پائے تو اس کی کامیابی معلوم۔

ہم یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ عدم تشدد کا طریقہ نہایت موثر اور نتیجہ خیز ہے۔ اسی وجہ

سے ہم نے اسے اختیار کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے کانگریس نے اسے تسلیم کیا تھا۔ گاندھی جی نے بھی اسے ملک کے سامنے نہ صرف صحیح بلکہ انتہائی موثر طریقے کی، حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اگرچہ اس کا نام ایک منفیانہ نام تھا، لیکن اس میں وہ زبردست عملی قوت موجود تھی جو ظالم کے سامنے سر جھکنے نہیں دیتی تھی۔ یہ ان بزدلوں کے لئے جو عمل سے جی چراتے ہیں پناہ کی صورت نہ تھی بلکہ وہ طاقت تھی جس کے ذریعے سے بہادر بدی اور غلامی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن بہادر اور طاقتور لوگ وہاں کیا کر سکتے ہیں جہاں معدودے چند اشخاص (جو ممکن ہے دوست کے بھیس میں دشمن ہوں) جب چاہیں اپنی بے عنوانیوں سے ہماری تحریک کو بند کرا دیں۔

گاندھی جی نے بڑی خوش بیانی اور دلنشین انداز سے جس کے وہ مالک ہیں عدم تشدد اور پرامن ترک موالات پر عمل کرنے کی سفارش کی تھی۔ ان کی زبان بہت سادی تھی اور اس میں بناوٹ نام کو نہ تھی۔ ان کی آواز اور ان کا چہرہ بہ ظاہر خوش و خروش اور جذبات سے خالی نظر آتا تھا۔ لیکن برف کی اس سطح کے نیچے دہکتی ہوئی آگ کی گرمی اور جذبات کا تلاطم خیز طوفان شبدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جو لفظ ان کی زبان سے نکلتا تھا وہ سننے والوں کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر کر آگ لگا دیتا تھا۔ جو راستہ انہوں نے بتایا تھا وہ سخت دشوار گزار ضرور تھا لیکن یہ ہمت والوں کا راستہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ منزل مقصود تک پہنچا کر رہے گا۔ اسی امید و بیم پر ہم نے اسے اختیار کیا اور آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ گاندھی جی نے "تلوار کے مشرب" کے موضوع پر ۱۹۲۰ء میں ایک مشہور و معروف مضمون لکھا تھا۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"بیشک میرا یہ ایمان ہے کہ اگر صرف دو ہی صورتیں سامنے ہوں یعنی بزدلی یا تشدد تو تشدد پر عمل کرنا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ ہندوستان بزدلی کے ساتھ اپنی ذلت کا خود شکار ہو جائے۔ میں یہی

چاہوں گا کہ وہ اپنی عزت کے تحفظ کی خاطر ہاتھ میں تلوار اٹھالے۔
لیکن یہ میرا عقیدہ ہے کہ عدم تشدد، تشدد سے بہر صورت برتر ہے۔
انتقام کے مقابلے میں عفو میں زیادہ مردانگی ہے۔

عفو سپاہی کی آن ہے لیکن وہ عفو اس وقت کہلائے گا جب انتقام کی طاقت موجود ہو۔ اگر کوئی بے بس اور لاچار عفو کا دعوی کرے تو اس کی کوئی وقعت نہیں۔ ایک چوہا بلی کو اس وقت کبھی معاف نہیں کرسکتا جبکہ وہ پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہو۔۔۔لیکن میں ہندوستان وک وکمزور نہیں سمجھتا۔ نہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتا ہوں۔۔
۔اس معاملے میں آپ کو کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیے۔ میرا منشا یہ ہے کہ قوت جسمانی طاقت پر منحصر نہیں بلکہ یہ اٹل قوت ارادی سے پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔میں خیالی دنیا کا رہنے والا نہیں ہوں۔ مجھے تو عملی اصول پرست ہونے کا دعوی ہے۔ عدم تشدد کا مذہب محض رشیوں اور مینوں کے لئے نہیں ہے بلکہ عام انسانوں کے لئے بھی ہے۔ جس طرح تشدد درندوں کا خاصہ ہے اسی طرح عدم تشدد انسانوں کی فطرت ہے۔
درندوں کی روح خوابیدہ ہوتی ہے وہ جسمانی طاقت کے سوا کسی دوسریت اصول سے واقف نہیں ہوتے لیکن انسانی شرف کا یہ تقاضا ہے کہ وہ بلندتر اصول یعنی روحانی قوت کا نظریہ پر عمل کرے۔

اسی لئے میں نے ہندوستان کے سامنے قربانی کا قدیم اصول پیش کرنے کی جرات کی ہے۔ستیا گرہ اوراس کے لوازم یعنی ترک موالات اور سول نافرمانی وغیرہ سب تکلیف برداشت کرنے کے اصول کے دوسرے نام ہیں۔ جن رشیوں نے تشدد کے طوفان میں عدم تشدد کا نظریہ معلوم کیا وہ نیوٹن سے زیادہ ہوشمند تھے۔ دراصل وہ

لنگٹن سے اچھے سپاہی تھے۔ فن سپہ گری کے ماہر ہوتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ہتھیار سب عبث ہیں اس لئے جنگ سے اکتائی ہوئی دنیا کو انہوں نے یہ پیغام دیا کہ تمہاری نجات تشدد میں نہیں بلکہ عدم تشدد میں ہے۔

عدم تشدد پر عامل ہونے کا یہ مقصد ہے کہ انسان جان بوجھ کر تکلیفیں برداشت کرے۔ اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ ظالم کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے بلکہ اس کے مقابلے میں اپنا پورا زور صرف کیا جائے اور دل و جان سے اس کی مخالفت کی جائے چنانچہ اس قانون کے تحت یہ ممکن ہے کہ تن تنہا ایک فرد اپنی عزت اپنے مذہب اور اپنی روح کو بچنے کے لئے ظالم سلطنتوں کی مجموعی طاقتوں کا مقابلہ کریا ور اس کی بنیادوں کو ہلا دے۔

میں ہندوستان کو کمزور سمجھ کر اسے عدم تشدد پر عمل کرنے کی ترغیب نہیں دیتا ہوں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنی قوتوں اور طاقتوں کا احساس کرتے ہوئے اس پر عمل کرے۔۔۔۔ میں ہندوستان کو جتانا چاہتا ہوں کہ اس کے پاس ایسی روح ہے جو کبھی فنا نہیں ہوسکتی۔ جو جسمانی کمزوری کے باوجود فتحمند ہوسکتی ہے اور جو ساری دنیا کی مجموعی جسمانی طاقتوں کا مقابلہ کرسکتی ہے۔

میں ترک موالات کی اس پر امن تحریک کو آئرلینڈ کی سن فین تحریک سے ممتاز کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ اپنے تخیل کے اعتبار سے تشدد کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی لیکن میں تشدد کے حامیوں کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ وہ پر امن ترک موالات کو آزما کر دیکھیں اس میں کوئی فطری کمزوری نہیں جس سے ناکامیابی کا خطرہ ہو۔ ہاں اگر اسے عام

تائید حاسل نہ ہو تو ناکامی کا امکان ضرور ہے۔ اس وقت البتہ حقیقی خطرہ پیدا ہوگا۔ جوشیلے لوگ قومی ذلت کو زیادہ عرصے تک گوارا نہیں کر سکیں گے اس لئے ان کا غیض وغضب دوسرے راستے تلاش کرے گا۔ ممکن ہے ہندوستان تلوار کا طریقہ اختیار کر کے وقتی طور پر فتح حاصل کر لے لیکن اس ہندوستان پر مجھے ہر گز فخر نہ ہوگا۔ میں ہندوستان سے اس طرح وابستہ ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب اس کا ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان ساری دنیا کے لیے ایک پیغام رکھتا ہے۔"

گاندھی جی کے ان دلائل کا ہم پر بہت اثر پڑا لیکن ہمارے لئے یہ بحیثیت مجموعی کانگرس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہب یا مستقل مسلک نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف ایک حکمت عملی تھی اور اس سے بعض نتائج کی توقع تھی اور انہیں نتائج کی کسوٹی پر اسے کسنا تھا۔ افراد تو اسے مذہب یا مستقل مسلک بنا سکتے تھے لیک کوئی سیاسی انجمن جب تک اسے سیاسی کہلانے کا دعویٰ ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔

چورا چوری کے واقعات اور اس کے نتائج نے ہمیں موقع دیا کہ ہم عدم تشدد کے نشیب وفراز پر غور کریں۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ اگر التوائے تحریک کے معاملے میں گاندھی جی کے دلائل صحیح ہیں تو پھر ہمارے مخالفوں کو ہمیشہ یہ اختیار رہو گا کہ جب چاہیں ایسی صورت پیدا کر دیں جس سے جنگ خواہ مخواہ بند کرنا پڑے۔ کیا یہ عدم تشدد کا نقص تھا، یا گاندھی جی کی تشریح کا؟ بہر حال وہی اس کی بانی اور موجد تھے۔ اس لئے ان سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ یہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ اور ان کے بغیر ہماری تحریک چل ہی نہیں سکتی تھی۔

کئی سال بعد ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہونے سے پہلے گاندھی جی نے اس مسئلے کو صاف کر دیا جاس سے ہمیں بہت کچھ اطمینان ہوگیا۔ انہوں نے

فرمایا کہ تشدد کے انفرادی واقعات کی وجہ سے تحریک کو بند نہ ہونا چاہیے۔ اگر ان نا خوشگور حادثات کی وجہ سے جن کو ہونا کسی حد تک یقینی ہے۔ ہماری عدم تشدد کی جنگ جاری نہیں رہ سکتی تو سمجھنا چاہیے کہ یہ ہر موقع کے لئے موزوں طریق عمل نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو ماننے کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھے کیونکہ ان کے نزدیک صحیح طریق عمل ہر موقع پر کارگر ہوتا ہے۔ اور انتہائی ناموافق حالات میں بھی کسی نہ کسی حد تک جاری رہ سکتا ہے۔ یہ تشریح جس نے عدم تشدد کے دائرے کو وسیع کر دیا، گاندھی جی کی رائے میں تبدیلی کا نتیجہ تھی یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

اگرچہ اکثر لوگوں کو یہی خیال تھا۔ لیکن حقیقت میں فروری ۱۹۲۲ء میں سول نافرمانی التوا محض چورا چوری کے واقعے کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ اسباب کا ایک سلسلہ تھا جس کی یہ آخری کڑی تھی۔ گاندھی جی اکثر تقریباً وجدانی طور پر کام کرتے ہیں۔ عوام کے ساتھ ان کا قریبی تعلق بہت عرصے سے ہے اس لئے عظیم الشان اور ہر دلعزیز رہبروں کی طرح ان میں بھی یہ معلوم کرنے کا ملکہ پیدا ہو گیا ہے کہ عام لوگوں کا رجحان اس وقت کیا ہے وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ اسی احساس سے متاثر ہو کر وہ اپنے طرز عمل کو بدلتے ہیں اور بعد میں اپنے رفقا کی حیرت اور خفگی کے خیال سے اپنے فیصلے کو دلائل کے غلاف میں لپیٹ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ دلائل بہت ناکافی معلوم ہوتے ہیں مثلاً چورا چوری کے بعد سول نافرمانی کے التوا کے معاملے میں۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری تحریک ظاہری قوت اور عام جوش و خروش کے باوجود انتشار کی حالت میں تھی۔ تنظیم اور انضباط کو فور ہو چکا تھا۔ قریب قریب چوٹی کے تمام آدمی جیل میں تھے اور عوام کو ابھی اتنی تربیت نہیں ملی تھی کہ بطور خود سلیقہ سے کام جاری رکھ سکیں۔ ہر کس و ناکس جو چاہتا کانگریس کمیٹی پر قبضہ کر سکتا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو بہت سے نااہل لوگ اور سرکاری گرگے صف اول میں آ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے چند مقامی کانگریس اور خلافت کمیٹیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہیں روکنے

کی کوئی صورت نہ تھی۔

ایسی لڑائیوں میں اس قسم کی باتیں ہونا لازمی ہیں۔لیڈروں کو جیل جانے سے سبقت کرنی پڑتی ہے اور کام دوسروں پر چھوڑنا پڑتا ہے ایسی صورت میں صرف یہی کیا جا سکتا ہے کہ عوام کو چند معمولی سرگرمیوں کے جاری رکھنے کی تربیت دی جائے اور اس سے ضروری یہ ہے کہ بعض دوسری ناروا حرکتیں کرنے کی ممانعت کر دی جائے۔۱۹۳۰ء تک ہم اس قسم کی کافی تربیت دے چکے تھے اس لئے ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۲ء کی سول نافرمانی کی تحریک زیادہ منظم اور قوی تھی لیکن ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں یہ بات نہ تھی۔اس وقت لوگوں کے جوش وخروش کی تہ میں کوئی ٹھوس چیز موجود نہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر تحریک جاری رہتی تو بہت جگہ تشدد کے انفرادی واقعات ظہور میں آتے۔حکومت انہیں نہایت خونخوارہ طریق سے کچلتی اور خوف ودہشت کا دور دورہ ہوتا جس سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہو جاتیں اور دوبارہ ابھرنے کی طاقت بھی باقی نہ رہتی۔

گاندھی جی کے ذہن میں غالباً یہی دلائل تھے اور یہی اثرات کام کر رہے تھے اس لئے اگر ان مقدمات کو تسلیم کر لیا جائے اور عدم تشدد کے طریقے کے جاری رکھنے کی ضرورت کو مان لیا جائے تو ہمیں ان کے فیصلے سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ انہیں اس نکلے مسالے کو خارج کر کے نئے سرے سے عمارت بنانی تھی۔ایک دوسرے اور بالکل مختلف نقطہ نظر سے ان کا فیصلہ غلط بھی کہا جا سکتا ہے۔لیکن اس نقطہ نظر کو عدم تشدد سے کوئی تعلق نہیں۔یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف عدم تشدد کا دعوی کیا جائے اور دوسری طرف تشدد سے چشم پوشی کی جائے۔اگر اس حد تک پہنچنے کے بعد انفرادی خونریزی کے واقعات کی وجہ سے قومی تحریک دبا دی جائے تو اس کے ختم ہونے کا اندیشہ نہیں بلکہ اس قسم کی تحریکوں میں دب کر ابھرنے کی قوت ہوتی ہے۔ ظاہری شکست اکثر معاملے کو صاف کرنے اور تحریک کو نئی قوت بخشنے میں مدد دیتی

ہے۔ظاہری شکست سے کہیں زیادہ اہم اصول اور نصب العین ہے۔اگر قوم اپنے نصب العین کو آلودگی سے پاک رکھے تو بہت جلد سنبھلنے کی توقع ہوتی ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں ہمارا نصب العین تھا کیا؟ لے دے کر ایک مبہم قسم کا سوراج جس کا کوئی صاف تخیل ہمارے ذہن میں نہ تھا اور عدم تشدد کی جنگ کا ایک خاص مفہوم اگر ملک وسیع پیمانے پر انفرادی طور پر بھی تشدد سے کام لیتا تو عدم تشدد یوں ہی ختم ہو جاتا۔ رہا سوراج تو وہاں قدم جمانے کے لئے کوئی چیز نہ تھی۔لوگوں کو عام طور پر ابھی اتنی قوت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ عرصہ تک جنگ کو جاری رکھ سکتے اور اگرچہ بدیشی حکومت کے خلاف عام بددلی اور کانگرس کے ساتھ ہمدردی پائی جاتی تھی۔لیکن کوئی بنیادی قوت یا تنظیم نہ تھی۔اس لئے یہ جذبات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے تھے۔لوگ محض ہنگامی جوش میں جیل چلے گئے کیونکہ انہیں توقع تھی کہ یہ معرکہ بہت جلد فتح ہو جائے گا۔

اس لئے بہت ممکن ہے کہ ۱۹۲۲ء میں سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا فیصلہ صحیح ہو۔مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ التواء کا انداز بہت نامناسب تھا اور اس سے عوام کی اخلاقی حالت پر بڑا خراب اثر پڑا۔

شاید اس زبردست تحریک کے یکایک بند کر دینے ہی کی وجہ سے ملک میں وہ افسوسناک صورت حال پیدا ہوئی جس نے قومی تحریک کو اس قدر نقصان پہنچایا۔سیاسی جنگ میں تو انفرادی اور لاحاصل تشدد کا سدباب ہو گیا۔لیکن تشدد کے دبے ہوئے جذبے نے اور طریقوں سے ہاتھ پیر نکالنا شروع کئے۔آگے چل کر فرقہ وارانہ فسادات اٹھ کھڑے ہوئے۔مختلف جماعتوں کے فرقہ پرست جو سیاسی اعتبار سے عموماً رجعت پسند تھے۔ترک موالات اور سول نافرمانی کی ہماہمی اور غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے منہ چھپائے بیٹھے تھے۔اب انہیں موقع مل گیا اور وہ اپنی اپنی کمین گاہ سے نکل آئے۔

بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی یعنی خفیہ پولیس کے آواروں اوران لوگوں نے جوفرقہ وارانہ فساد کرا کے افسروں کو خوش کرنا چاہتے تھے۔یہی انداز اختیار کیا۔ موپلوں کی شورش بڑی بے رحمی سے دبائی جا چکی تھی۔اس وحشیانہ ظلم کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ موپلا قیدی ریل کے ڈبوں میں ٹھونس دئے گئے اور گرمی میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔بہر حال ان واقعات سے ان لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آگیا جوفرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑکایا کرتے ہیں۔بہت ممکن ہے کہ اگر سول نافرمانی روکی نہ جاتی اور حکومت اس تحریک کو سختی سے کچلتی تو شاید فرقہ وارانہ کشیدگی اتنی زیادہ بڑھنے نہ پاتی اور لوگوں میں اتنا بیکار جوش باقی نہ رہتا جس کی وجہ سے آگے چل کر یہ فساد اٹھ کھڑے ہوئے۔

سول نافرمانی بند کرنے سے پہلے ایسا واقعہ پیش آیا جس سے شاید صورت حالت بالکل بدل جاتی۔ تحریک کی پہلی لہر اس زور شور سے اٹھی کہ حکومت حیران اورخوفزدہ ہوگئی۔اس وقت لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے ایک تقریر میں کھلم کھلا اپنی پریشانی کا اعتراف کیا۔پرنس آف ویلس اس وقت ہندوستان میں تھے اوران کی موجودگی نے حکومت کی ذمہ داریوں میں اوراضافہ کر دیا تھا۔دسمبر ۱۹۲۱ء کے آغاز میں کثیر تعداد میں گرفتاریاں ہو چکی تھیں لیکن اس کے بعد ہی حکومت نے یہ کوشش کی کہ کانگریس سے کوئی سمجھوتہ کر لے۔ خاص کر ولیعہد کے کلکتے کے دورے کے خیال سے یہ پیش قدمی کی گئی تھی۔بہر حال حکومت بنگال کے نمائندوں اور دیش بندھو داس کے درمیان جواس وقت جیل میں تھے اس سلسلے میں کچھ گفت وشنید ہوئی۔معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور کانگریس کے درمیان ایک چھوٹی سی گول میز کانفرنس کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔لیکن یہ تجویز وہیں ختم ہوگئی۔کیونکہ گاندھی جی کو اس پر اصرار رہا کہ مولانا محمد علی جواس وقت کراچی جیل میں تھے اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوں۔

مسٹرسی۔آر۔ داس نے گاندھی جی کے اس رویے کو قطعاً ناپسند کیا اور بعد میں جب وہ رہا ہو کر آئے تو انہوں نے کھلم کھلا ان پر اعتراض بھی کیا اور کہا کہ گاندھی جی نے بڑی زبردست غلطی کی۔ ہم میں سے اکثر لوگ جیل میں تھے اس لئے ہمیں تفصیلات معلوم نہیں ہیں اور پورے واقعات معلوم کئے بغیر کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ایسی کانفرنس سے کوئی نتیجہ نکلنے کی امید نہیں تھی۔ اصل میں حکومت کی صرف یہ کوشش تھی کہ ولیعہد کا کلکتہ کا دورہ کسی نہ کسی طرح بخیر و خوبی گذر جائے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر کانفرنس ہوتی بھی تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا اور جو بنیادی مسائل ہمارے سامنے تھے وہ جوں کے توں رہتے۔ نو سال بعد جب ہماری قوم اور کانگرس دونوں زیادہ قومی تھیں اسی قسم کی کانفرنس ہوئی مگر اس سے کوئی عظیم الشان نتائج حاصل نہیں ہوئے لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھئے تب بھی مولانا محمد علی کی شرکت پر گاندھی جی کا اصرار میرے نزدیک بالکل درست تھا۔ وہ نہ صرف کانگریس کہ بلکہ تحریک خلافت کے بھی خاص راہنما تھے اور خلافت کا مسئلہ اس زمانے میں کانگریس کے پروگرام کا اہم جزو تھا اس لئے ان کی موجودگی قطعی ضروری تھی۔ جس حکمت عملی کی خاطر کسی رفیق کار کو نظر انداز کر دیا جائے اسے کبھی صحیح نہ سمجھنا چاہیے۔ جب حکومت انہیں جیل سے رہا کرنے تک کو تیار نہ تھی تو کیا امید ہو سکتی تھی کہ کانفرنس سے کوئی نتیجہ برآمد ہو گا۔

والد پر اور مجھ پر الزام عائد کئے گئے اور مختلف عدالتوں سے ہم دونوں کو چھ چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ مقدمے کیا تھے ایک کھیل تھا اور ہم نے اپنے اصول کے مطابق عدالتی کاروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہماری تقریروں اور دوسری سرگرمیوں میں جیل بھیجنے کے لئے کافی مواد مل سکتا تھا لیکن ہم پر جو الزام عائد کئے گئے وہ بہت دلچسپ تھے۔ دستخط واقعی انہیں کے تھے لیکن اس سے پہلے انہوں نے شاید ہی کبھی ہندی میں دستخط کئے ہوں اس لئے ان کے ہندی دستخطوں کو بہت ہی کم لوگ شناخت کر سکتے

تھے لیکن ایک خستہ حال سا شخص عدالت میں پیش ہوا جس نے حلفیہ ان دستخطوں کی شناخت کی۔ یہ شخص بالکل ان پڑھ تھا اور شناخت کرتے وقت دستخطوں والا فارم الٹا پکڑے ہوئے تھا۔ میری لڑکی کی عمر اس وقت چار برس کی تھی اور والدا سے گود میں لئے تھے۔ مقدمہ کا تماشہ دیکھنے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔

مجھ پر یہ الزام تھا کہ میں نے ہڑتال کے اشتہارات تقسیم کئے۔ اس زمانے میں قانوناً یہ کوئی جرم نہیں تھا لیکن اب یہ جرم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ ہم "درجہ نوآبادیت" کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں! بہر حال مجھے بھی سزا ہو گئی۔ تین مہینے کے بعد مجھے جیل خانے میں جہاں میں اپنے والد اور دوسرے ساتھیوں کے پاس رہتا تھا یہ بتایا گیا کہ کسی نظر ثانی کرنے والی عدالت نے میرے مقدمے پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے غلط سزا دی گئی اس لئے رہا کر دیا جائے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ میری طرف سے کسی نے پیروی نہیں کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سول نافرمانی کی التوا نے نظر ثانی کرنے والے ججوں کو نیند سے چونکا دیا تھا۔ بہر حال والد کو جیل خانے میں چھوڑ کر مجھے باہر جانے کا بہت افسوس ہوا۔

میں فوراً گاندھی جی کے پاس احمد آباد جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ میرے پہنچنے سے پیشتر ہی گرفتار ہو گئے اور میری ان کی ملاقات سابرمتی جیل میں ہوئی۔ میں ان کے مقدمے کی پیشی کے وقت موجود تھا۔ یہ بڑا یادگار موقع تھا اور جو لوگ وہاں موجود تھے اسے کبھی بھول نہیں سکتے۔ جج ایک انگریز تھا اور اس نے بڑے وقار و متانت اور ہمدردی سے کام لیا۔ گاندھی جی نے عدالت میں جو بیان دیا اس سے سننے والوں کے دل ہل گئے۔ چنانچہ جب ہم عدالت سے باہر آئے تو ہمارے جذبات میں ایک تلاطم برپا تھا اور ہمارے دلوں پر ان کے سلیس فقرے اور موثر استعارے نقش تھے۔

میں الہ آباد واپس آ گیا۔ چونکہ میرے بہت سے دوست اور ساتھی ابھی جیل میں تھے اس لئے باہر مجھے تنہائی سی محسوس ہوتی تھی اور میرا جی نہیں لگتا تھا۔ کانگریس

کے اداروں میں سے اس وقت ابتری ہوگئی تھی اس لئے میں نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کی خاص طور پر کوشش شروع کر دی۔ سول نافرمانی کے التوا کے باوجود ہمارے پروگرام کا یہی جزو بحال رکھا گیا تھا۔ الہ آباد میں قریب قریب تمام کپڑے کے تاجروں نے یہ قسم کھالی تھی کہ بدیشی کپڑا نہیں منگائیں گے۔ اوراس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس انجمن کے قواعد میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جو کوئی اس عہد کو توڑے گا اس پر جرمانہ کیا جائیگا۔ مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے بڑے بڑے تاجروں نے اپنا عہد توڑ دیا ہے اور بدیشی کپڑا منگا رہے ہیں۔ یہ گویا ان بے چاروں کے ساتھ بڑی نا انصافی تھی جو اپنے عہد پر قائم تھے۔ ہم نے بہت کچھ کہاسنا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اور تاجروں کی دوکانوں پر دھرنا دیا جائے۔ دھرنا دینے کا خیال ظاہر کرنا تھا کہ ہمارا کام بن گیا۔ فوراً جرمانے ادا کئے گئے اور نئے سرے سے قسمیں کھائی گئیں۔ جرمانے کی جو رقم وصول ہوئی وہ تاجروں کی انجمن ہی کو دیدی گئی۔

دو تین دن بعد ہی میں چند ساتھیوں کے ساتھ جو تاجروں سے گفت وشنید کرنے میں میرے شریک تھے پھر گرفتار کرلیا گیا۔ اب ہم پر یہ الزام لگایا کہ ہم تاجروں پر مجرمانہ تشدد کیا اور زبردستی ان سے روپیہ وصول کیا۔ خاص مجھ پر چند اور الزام بھی لگائے گئے تھے جس میں ایک جرم بغاوت بھی تھی۔ میں نے مقدمہ کی پیروی نہیں کی لیکن عدالت میں ایک طویل بیان داخل کیا۔ مجھے تین جرموں کے مواخذے میں سزا دی گئی جن میں ایک جرم یہ بھی تھا۔ کہ میں نے دوسروں پر تشدد کرکے ان سے زبردستی روپیہ وصول کیا، لیکن بغاوت کا مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ شاید یہ سمجھ لیا گیا کہ مجھے کافی سزا مل گئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، تین مختلف معیادوں کے لئے مجھے سزا ہوئی تھی جن میں دو اٹھارہ اٹھارہ مہینے کی تھیں اور دونوں ایک ساتھ شروع ہوتی تھیں۔ غرض سب ملا کر مجھے پونے دو برس کی سزا ہوئی تھی۔

یہ میری جیل یاترا تھی اور میں کوئی ڈیڑھ مہینے باہر رہ کر پھر جیل پہنچ گئے۔

لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل

۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں سیاسی کاموں کے جرم میں جیل جانا کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ یوں بھی جب سے تقسیم بنگالہ کے خلاف تحریک شروع ہوئی تھی۔ سیاسی کارکنوں کے جیل جانے کا راستہ کھل گیا تھا اور ان میں سے اکثر کو لمبی سزائیں ہوتی تھیں۔ عدالت میں باضابطہ مقدمہ چلائے بغیر بھی لوگ نظر بند کر دئے جاتے تھے۔ اس وقت کے سب سے بڑے لیڈر لوکمانیہ تلک کو ضعیفی میں ۶ سال کی قید ہوئی تھی۔ جنگ عظیم نے نظر بندیوں اور قیدوں کی یہ رفتار اور تیز کر دی۔ اب سازشوں کے مقدمے بھی اکثر چلنے لگے۔ جن میں عموماً حبس دوام یا پھانسی کی سزائیں ہوتی تھیں۔ جنگ کے زمانے میں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی نظر بند ہوئے تھے۔ اور جنگ کے بعد ہی پنجاب میں بہت سے لوگ مارشل لا کے شکار ہوئے۔ اکثروں پر سازش کے مقدمے چلائے گئے اور اکثروں کو سرسری میں سزائیں ہوئیں گویا۔ اب ہندوستان میں سیاسی کاموں کے جرم میں جیل جانا معمولی بات ہوگئی تھی۔ لیکن اب تک کوئی شخص اپنی خواہش سے جیل نہیں جاتا تھا۔ لوگوں کو اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں یا محض اس وجہ سے کہ خفیہ پولیس ان سے ناراض ہے سزا ہو جاتی تھی۔ بہر صورت لوگ یہ کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو عدالت میں پیروی کر کے اس سے بچ جائیں۔ البتہ جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی اور ان کے ہزاروں پیرووں نے تحریک ستیا گرہ کے سلسلہ میں ایک نئی مثال پیش کی تھی۔

پھر بھی ۱۹۲۱ء تک جیل خانہ ایک ان جان جگہ تھی اور بہت کم لوگوں کو یہ علم تھا کہ لوہے کے ان مہیب پھاٹکوں کے پیچھے جو نئے مجرم کو نگل جاتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ ہمارا گمان تھا کہ جیل کے باسی، بڑے خوفناک لوگ اور خطرناک مجرم ہوتے ہیں۔ جیل کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں تنہائی، ذلت اور مصیبت کا تصور قائم ہو جاتا تھا اور ان سب سے بڑھ کر ایک بے جانی بوجھی جگہ کا خوف طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء

کے بعد سے جیل جانے کے اکثر تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے بہت ساتھی وہاں پہنچ بھی گئے تھے اس لئے اب رفتہ رفتہ ہماری طبعیت اس سے مانوس ہوتی جاتی تھی۔ اور جھجک اور نفرت کے غیر ارادی جذبے میں کمی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن چاہیے۔ ہم پہلے سے اپنے دل کو کتنا ہی مضبوط کرلیں پھر بھی جب پہلے اس آہنی پھاٹک کے اندر قدم رکھتے تو سارے جسم میں ایک عجیب سنسنی اور ہیجان پیدا ہو جاتا تھا۔ ان باتوں کو اب کوئی تیرہ برس گزر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے قریب قریب تین لاکھ مرد اور عورتیں سیاسی جرائم کی پاداش میں (حالانکہ اکثروں کو تعزیرات ہند کی دوسری دفعات کے ماتحت سزائیں دی گئیں) ان پھاٹکوں کے اندر ہو آئے ہیں۔ ان میں سے ہزاروں کئی بار گئے اور آئے۔ انہیں اچھی طرح علم ہو گیا کہ اندر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس عجیب زندگی کا عادی بنانے کی بھی کوشش کی، جہاں تک کوئی شخص اس غیر طبعی کوفت اور وحشت کی زندگی کا عادی ہو سکتا ہے۔

ہم اس سے اس طرح مانوس ہو گئے تھے جیسے انسان دنیا کہ ہر چیز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ہر مرتبہ جب ہم پھاٹکوں کے اندر داخل ہوتے تھے، تو ایک حد تک وہی پرانی نظریں سبزہ زاروں، کھلے ہوئے میدانوں، آنے جانے والے راہ گیروں اور سواریوں اور ان مانوس چہروں کی طرف جو شاید عرصے تک دیکھنے کو نہ ملیں ایک رخصتی نگاہ ڈالنے کے لئے خودبخود اٹھ جاتی تھیں۔

وہ زمانہ میں پہلی مرتبہ جیل گیا اور تین مہینے بعد یکا یک رہا کر دیا گیا تھا۔ ہمارے اور جیل کے عملے، دونوں کے لیے بڑا ہیجانی زمانہ تھا۔ ان نئے قسم کے قیدیوں کے ٹوٹ پڑنے سے جیل کے افسروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ان نوواردوں کی تعداد میں بھی آئے دن غیر معمولہ اضافہ ہو رہا تھا۔ گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طوفان بڑھتا چلا آرہا ہے، جو اپنی رو میں تمام روایتی حدود کو بہا لے جائے

گا۔ اسے سے زیادہ پریشان کن ان نوواردوں کی نوعیت تھی۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ لیکن کثرت اوسط طبقے والوں کی تھی۔ بہر حال ان سب میں ایک چیز مشترک تھی۔ یعنی وہ عام مجرموں سے کیا جاتا تھا۔ افسروں کو بھی یہ تسلیم تھا لیکن مروجہ قانون کے سوا کوئی دوسرے قاعدے موجود نہ تھے۔ نہ اس قسم کا کوئی پچھلا تجربہ اور سابقہ مثال تھی کہ اس سے مطابق عمل کیا جاتا۔ عام طور سے یہ کانگرسی قیدی کچھ زیادہ حلیم اور مسکین نہ تھے۔ اس کے علاوہ جیل میں ان کی اتنی تعداد موجود تھی کہ وہاں بھی انہیں اپنی قوت پر ناز تھا۔ باہر کی زبردست ہلچل اور باہر والوں کی جیل کے حالات سے دلچسپی سونے پر سہاگہ تھی باوجود اس کے کہ ہمارا طرز عمل کسی قدر جارحانہ تھا۔ پھر بھی ہمارا عام رویہ یہی تھا کہ جیل کے افسروں کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ چنانچہ اگر ہم ان کی مدد نہ کرتے تو شاید ان کی مشکلات اور بڑھ جاتیں۔ بیچارہ جیلر اکثر ہمارے پاس آتا تھا اور ہم سے درخواست کرتا تھا کہ ذرا ان بارکوں میں چلے چلئے جہاں آپ کے رضا کار رہتے ہیں اور انہیں سمجھا دیجئے یا کسی بات پر راضی کر دیجئے۔

ہم جیل میں خود اپنی مرضی سے آئے تھے۔ بلکہ بعض رضا کار تو بن بلائے مہمان تھے یعنی زبردستی جیل میں گھس آئے تھے۔ اس لئے ان کے نکل بھاگنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اگر وہ باہر جانا چاہتے تو معافی مانگ کر یا تحریک میں آئندہ کوئی حصہ نہ لینے کا اقرار کر کے آسانی سے نکل سکتے تھے۔ بھاگنے کا بھی نتیجہ وہی ہوتا کہ ہو مقاومت مجہول کی تحریک سے الگ ہو جاتے اور جو رسوائی ہوتی وہ گھاٹے میں۔ ہمارے لکھنو جیل کے سپرنٹنڈنٹ اس بات کو خوب سمجھتے تھے اس لئے وہ اکثر جیلر سے جنہیں "خانصاحب" کا خطاب مل چکا تھا' کہا کرتے تھے کہ اگر تم چند کانگریسی قیدیوں کو نکل بھاگنے پر تیار کر دو تو میں سفارش کر کے تمہیں "خان بہادر" کرا دوں گا۔

ہمارے بہت سے ساتھی جیل خانے کے اندرونی حصے میں بڑی بڑی بارکوں

میں رکھے گئے۔ ہم میں سے کوئی اٹھارہ شخص شاید کچھ بہتر سلوک کے مستحق سمجھے گئے اس لئے ہمیں ایک پرانے پارچہ بانی کے کارخانے میں جگہ دی گئی جس کے سامنے بہت بڑا صحن بھی تھا۔ والد، میرے دو چچا زاد بھائیوں اور مجھ کو ایک علیحدہ سائبان ملا جو ۲۰ فٹ لمبا اور ۱۲ فٹ چوڑا تھا۔ ہمیں ایک بارک سے دوسری بارک میں جانے کی بھی پوری آزادی تھی۔ ہمارے عزیز و اقارب اکثر ہم سے ملنے آتے تھے اور ہمیں اخبار بھی پڑھنے کو ملتے تھے۔ چنانہ نئی گرفتاریوں کی اور تحریک کی غیر معمولی ترقی کی خبریں ہمیں روزانہ ملتی رہتی تھیں اور ان کی وجہ سے ہمارے جوش میں کمی نہ آنے پاتی تھی۔ ہم اپنا زیادہ وقت بحث مباحثہ یا گپ شپ میں گزارتے تھے۔ مجھے پڑھنے لکھنے یا کوئی ٹھوس کام کرنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ علی الصباح اٹھ کر میں اپنے سارے کمرے کو دھوتا اور صاف کرتا تاھ۔ پھر والد کے اور اپنے کپڑے دھوتا تھا اس کے باوجود چرخہ کاتتا تھا۔ سردیوں کا زمانہ تھا جو شمالی ہند کا بہترین موسم ہوتا ہے۔ شروع شروع میں ہمیں رضا کاروں کو مدرسہ جاری کرنے کی بھی اجازت مل گئی چنانچہ جو لوگ پڑھے لکھے نہ تھے انہیں ہم اردو، ہندوی اور چند ابتدائی مضامین پڑھاتے تھے اور شام کو والی بال کھیلتے تھے۔ (۱)

رفتہ رفتہ پابندیاں بڑھنا شروع ہوئیں۔ ہمیں اپنے احاطے سے باہر نکلنے کی اور ان بارکون میں جانے کی جہاں ہمارے رضا کار مقید تھے۔ ممانعت کر دی گئی چنانچہ یہ مدرسہ بھی بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں میں رہا ہو گیا۔

میں شروع مارچ میں باہر آیا تھا اور چھ سات ہفتے بعد اپریل میں پھر جیل چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ والد نینی تال کے جیل خانے میں بھیج دئے گئے تھے اور ان کی روانگی کے بعد ہی نئے قانون نافذ ہو گئے تھے۔ وہ سب قیدی جو پہلے میرے ساتھ پارچہ بانی کے کارخانے میں رہا کرتے تھے اب جیل کے اندرونی حصے میں منتقل کر دئے گئے تھے اور ان بارکوں میں رہتے تھے جن

میں علیحدہ علیحدہ کمرے نہ تھے بلکہ بڑے بڑے ہال تھے۔ ہر بارک گویا جیل خانے
کے اندر ایک اور جیل خانہ تھا اور مختلف جیلوں میں آمد و رفت کی اجازت نہ تھی۔ اب
مہینے میں ایک بار عزیزوں سے ملاقات ہو سکتی تھی اور صرف ایک خط آ جا سکتا تھا۔
کھانا بھی اب نسبتاً ادنیٰ درجہ کا ملتا تھا لیکن ہمیں اس کی اجازت تھی کہ باہر سے اپنا
کھانا منگالیں۔

جس بارک میں میں تھا اس میں کوئی پچاس آدمی رہتے تھے جگہ کی تنگی کی وجہ
سے وہاں بری بھیڑ ہو گئی تھی۔ ہمارے بستر ایک دوسرے سے تین چار فٹ کے
فاصلے پر تھے۔ اتفاق سے جتنے آدمی اس بارک میں تھے۔ ان سب کو جانتا تھا۔ اور
ان میں سے بعض میرے دوست بھی تھے۔ لیکن دن رات میں کسی وقت تخلیہ میسر نہ
آنا رفتہ رفتہ کھلنے لگا۔ ہمیشہ ایک مجمع ہر شخص کو گورتا تھا اور بہت سی چھوٹی تکلیفیں اور
ناگواریاں رہا کرتی تھیں۔

جس بارک میں میں تھا اس میں کوئی پچاس آدمی رہتے تھے جگہ کی گنگی کی وجہ
سے بڑی بھیڑ ہو گئی تھی۔ ہمارے بستر ایک دوسرے سے تین چار فٹ کے فاصلے پر
تھے۔ اتفاق سے جتنے آدمی اس بارک میں تھے۔ میں ان سب کو جانتا تھا۔ اور ان
میں سے بعض میرے دوست بھی تھے۔ لیکن دن رات میں کسی وقت تخلیہ میسر نہ آنا
رفتہ رفتہ کھلنے لگا۔ ہمیشہ ایک مجمع ہر شخص کو گھورتا تھا اور بہت سی چھوٹی تکلیفیں اور
ناگواریاں رہا کرتی تھیں۔ غرض کوئی ایسا پر سکون گوشہ نہ تھا جہاں انسان چند منٹ
چین سے بیٹھ سکے۔ ہم سب کے سامنے نہاتے تھے۔ سب کے سامنے اپنے کپڑے
دھوتے تھے۔ ورزش کے لئے بارک کے چاروں طرف دوڑا کرتے تھے۔ ہم اس
قدر بکواس اور بحث کرتے تھے کہ معقول گفتگو کرنے کا دم باقی نہ رہتا تھا اور یہ ہماری
خانگی زندگی جس کا دائرہ سینکڑوں گنا وسیع ہو گیا تھا، ایک بے رس اور بے کیف نمونہ
تھا جس میں خاندان کی خرابیاں تو سب موجود تھیں لیکن خوبی کوئی نہ تھی اور اس پر طرہ

یہ کہ لوگوں کے مذاق اور خیالات میں بہت اختلاف تھا۔ ہم سب کو اس سے بڑی سخت کوفت ہوتی تھی اور میں اکثر تنہائی کے لئے تڑپا کرتا تھا۔ اس کے بعد تو ایک زمانے میں مجھے جیل خانے میں ایسی تنہائی اور اتنا تخلیہ ملا کہ مہینوں انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گیا۔ ہاں کبھی کبھی جیل کا کوئی افسر ضرور آنکلتا تھا۔ اس حالت میں بھی میں بہت پریشان رہتا تھا اور اس وقت یہ تمنا تھی کہ کوئی اچھے ساتھی مل جائیں۔

اس وقت مجھے ۱۹۲۲ء کی لکھنو ڈسٹرکٹ جیل کی چہل پہل یاد آتی تھی۔ پھر بھی میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دونوں میں، میں پرسکون زندگی کو ترجیح ہوں، بشرطیکہ مجھے پڑھنے لکھنے کا موقع ملے۔

پھر بھی ہمارے سب ساتھی بہت مہذب اور دلچسپ لوگ تھے اور مجموعی طور پر ہماری آپس میں خوب نبھتی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کبھی کبھی دوسروں سے اکتا جاتا تھا اور چاہتا تھا کہ کچھ دیر کو تنہائی میسر آجائے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے اتنا تخلیہ نصیب ہوتا تاکہ بارک سے نکل کر صحن میں بیٹھ جاؤں۔ اب برسات شروع ہوگئی تھی اور بادل گھرا رہتا تھا اور اکثر اس کا موقع مل جاتا تھا۔ میں گرمی بھی برداشت کرتا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار بھی لیکن جہاں تک ممکن ہوتا تھا بارک کے باہر ہی پڑا رہتا تھا۔

کھلے میدان میں لیٹ کر میں آسمان اور بادلوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے شاید کبھی مجھے اس حد تک یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ بادلوں کے بدلتے ہوئے رنگ کس قدر خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔

رنگ برنگ بادلوں کا یہ نقشہ جیسے زمین کے مختلف خطے آپس میں گتھے ہوئے ہوں۔ مزے ہیں اس کے جو لیٹا ہوا یہ نظارہ دیکھتا ہو اور عیش فرصت کو دعائیں دیتا ہو۔

ہمارے لئے یہ فرصت کوئی خوشگوار چیز نہ تھی بلکہ الٹی مصیبت ہوگئی تھی لیکن

جتنا وقت میں ان چلتے پھرتے بادلوں کے نظارے میں گزارتا تھا وہ مجھے فرحت و انبساط سے لبریز کر دیتا تھا۔ مجھے اس کی خوشی تھی کہ میں نے اس قید فرنگ سے عارضی چھٹکارا پانے کی ایک نئی ترکیب معلوم کر لی۔ معلوم نہیں اب کی بار برسات نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا۔ یہ اثر نہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ اس کے بعد۔ میں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور سمندروں کے کنارے سے سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے سماں اکثر دیکھے تھے۔ میں اس کے نور میں نہایا تھا اور وقتی طور پر اس کی عظمت و جلال سے متاثر بھی ہوا تھا۔ لیکن عموماً ان چیزوں کو معمولی بات سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتا تھا۔ اب جیل میں سورج کے طلوع اور غروب کا منظر دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں افق ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ بہت دن چڑھے جب سورج کی تمازت بڑھ جاتی تھی تو اس کی شعاعیں ہمارے قید خانے کی دیواروں پر نمودار ہوتی تھیں۔ رنگ کہیں دیکھنے میں نہ آتے تھے۔ غرض ہماری آنکھیں روز روز وہی مٹیالے رنگ کی دیواریں دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں۔ وہ دھوپ چھاؤں اور رنگوں کی بھوکی تھیں۔ اس لئے جب برسات کے بادل قسم قسم کے روپ بدلنے، طرح طرح کے رنگوں سے کھیلتے، جھومتے، اٹھلاتے اڈکر آسمان پر آتے تو میں حیرت اور مسرت سے انہیں دیکھتا اور مجھ پر وجد کا سا عالم ہو جاتا تھا۔ کبھی یہ بادل، کہیں کہیں سے پھٹ جاتے تو ان مے سے وہ حیرت انگیز کرشمہ دکھائی دیتا جو برسات سے مخصوص ہے۔ یعنی گہرے، نیلے رنگ کے اتھاہ سمندر میں حسن لامحدود کی ایک جھلک۔

رفتہ رفتہ ہماری پابندیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اور زیادہ سخت قانون نافذ کئے گئے۔ حکومت کو ہماری تحریک کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا اس لئے وہ چاہتی تھی کہ ہم پر دل کھول کر غصہ اتارے اور ہمیں اس گستاخی کا مزہ چکھائے کہ ہم نے اس کے مقابلے کی جرات کی۔ ان نئے قوانین اور ان کے نفاذ کے طریقوں کا یہ لازمی نتیجہ ہوا کہ اکثر جیل کے افسروں اور سیاسی قیدیوں میں ان بن ہو گئی۔ کئی مہینے تک ہم سب

نے جن کی تعداد لکھنؤ جیل میں کئی سو کے قریب ہوگئی، احتجاج کے طور پر عزیز واقارب سے ملاقات کرنا بند کردیا۔ افسروں کا یہ خیال تھا کہ ہم میں سے چند آدمی فساد کی جڑ ہیں۔ اس لئے سات اشخاص اصل بارکوں سے دور جیل کے ایک بالکل علیحدہ حصے میں بھیج دیئے گئے۔ یعنی پرشوتم داس ٹنڈن مہادیو ڈیسائی، جارج جوزف، بال کرشن شرما، دیوداس گاندھی، میں اور ایک اور شخص۔

ہم ایک چھوٹے سے احاطے میں رکھے گئے۔ یہاں کچھ تکلیف ضرور تھی، لیکن مجموعی طور پر میں اس سے بہت خوش ہوا۔ کیونکہ یہاں کم سے کم وہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی اور ہمیں کچھ زیادہ سکون اور تخلیہ میسر آ سکتا تھا۔ اب پڑھنے لکھنے اور دوسرے ضروی کام کرنے کو بھی کافی وقت ملتا تھا۔ جیل کے دوسرے ساتھیوں سے ہمارا کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ نہ باہر کی دنیا کا کوئی حال معلوم ہوتا تھا، کیونکہ اب تمام سیاسی قیدیوں کو اخبار ملنا بند ہوگئے تھے۔

اخبار تو ہمارے پاس نہیں آتے تھے لیکن جس طرح ہمیشہ جیل میں باہر کی خبریں پہنچا کرتی ہیں ہمیں بھی کچھ نہ کچھ خبریں مل ہی جاتی تھیں۔ ہر مہینے جو ملاقاتیں ہوتی تھیں یا جو خطوط آتے تھے ان سے بھی تھوڑا بہت حال معلوم ہو جاتا تھا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اب تحریک کا زور گھٹ رہا ہے۔ وقتی جوش کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور دور منزل مقصود دور ہٹی معلوم ہوتی تھی۔ کانگرس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ ایک جماعت طریق کار میں تبدیلی چاہتی تھی اور دوسری اس تبدیلی کی مخالف تھی۔ تبدیلی کے حامیوں کی رہبری دیش بندھو داس اور میرے والد کر رہے تھے۔ یہ جماعت چاہتی تھی کہ اسمبلی اور کونسلوں کے نئے انتخاب میں کانگریس بھی حصہ لے اور اگر ممکن ہو تو ان پر قبضہ کرلے۔ دوسری جماعت کی رہنمائی سری راج گوپال اچاریہ فرما رہے تھے۔ یہ جماعت ترک موالات کے اصل پروگرام کوئی ترمیم گوارا کرنے کو تیار نہ تھی۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ تحریک کے وہ زریں اصول جنہوں نے ہمیں

سیلاب کی طرح آگے بڑھایا تھا اب چھوٹے چھوٹے جھگڑے قضیوں اور اقتدار حاصل کرنے کی سازشوں سے آلودہ ہو رہے تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ جوش وخروش کی رو میں بڑے بڑے من چلے پن کے کام کر گزرنا کتنا آسان ہے۔ اور جب یہ ندی اتر جائے تو مستقل طور پر کام کو جاری رکھنا کتنا مشکل ہے۔ باہر سے جو خبریں آتی تھیں ان سے ہم میں بے دلی پھیلی ہوئی تھی اور پھر اس چڑچڑے پن کی وجہ سے جو جیل میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ہماری مشکلات اور بڑھ گئی تھیں۔ پھر بھی ہمارے دل کو یہ اطمینان تھا کہ ہم نے خودداری اور وقار کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور چاہے کچھ بھی ہوا ہم راہ راست سے نہیں بھٹکے۔ مستقبل دھندلا نظر آتا تھا اور چاہے وہ کوئی شکل اختیار کرے یا بات یقینی تھی کہ ہم میں سے اکثروں کی قسمت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزارنا لکھا ہے۔ آپس میں ہم یہی باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جارج جوزف سے اسی قسم کی گفتگو ہوئی تھی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے۔ اب تو جوزف میں زمین وآسمان کا فرق ہو گیا ہے اور وہ ہماری تحریک کی دل کھول کر مخالفت کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کبھی انہیں وہ گفتگو بھی یاد آتی ہے جو لکھنو ڈسٹرکٹ جیل کے سول وارڈ میں ایک دفعہ مجھ میں اور ان میں ہوئی تھی؟

غرض ہم روزمرہ کے معمولی کاموں اور ورزشوں سے دل بہلاتے تھے۔ ورزش کی یہ صورت تھی کہ اپنے چھوٹے سے احاطے میں چاروں طرف دوڑ لگایا کرتے تھے یا اپنے صحن کے کنوئیں سے دو دو آدمی بیلوں کی طرح جٹ کر چرس سے پانی کھینچتے تھے اور ترکاریوں کے کھیت کو جو ہمارے صحن میں تھا سینچتے تھے۔ ہم میں سے اکثر روزانہ تھوڑا بتہ سوت بھی کاتتے تھے۔ لیکن ان سردی کے دنوں اور لمبی لمبی راتوں میں میرا خاص شغل کتابیں پڑھنا تھا۔ جب کبھی سپرنٹنڈنٹ آتا، ہمیشہ مجھے پڑھتے ہوئے پاتا۔ شاید وہ اس سے کچھ کھسیا گیا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے مجھ پر فقرہ کسا اور کہا کہ میں تو اپنا تمام مطالعہ بارہ برس کی عمر ہی میں ختم کر چکا تھا۔ شاید پڑھنے

سے یہ گریز ہی اس بہادر انگریز کرنل کے کام آیا وراس نے اس پریشان کن خیالات سے بچالیا۔ اور شاید اسی کی بدولت وہ صوبہ متحدہ میں جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچا۔

جاڑے کی راتیں پہاڑ سی ہوتی ہیں اور اس زمانے میں ہندوستان میں مطلع بہت صاف ہوتا ہے چنانچہ ہمیں ستارے دیکھنے کا شوق ہوگیا۔ بعض نقشوں کی مدد سے ہم نے بہت سے ستاروں کو پہنچان لیا۔ پھر تو رات ہم ان کے نکلنے کا انتظار کیا کرتے تھے اور ان کا اس مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے تھے۔ جیسے کوئی اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملتا ہے۔

اس طرح ہمارا وقت گزر رہا تھا۔ دونوں کے ہفتے اور ہفتوں کے مہینے ہوتے جاتے تھے۔ ہم روز کی مقررہ زندگی کے عادی ہوگئے تھے۔ لیکن باہر سارا بوجھ ہماری عورتوں پر، ہماری ماؤں، بیویوں اور بہنوں پر پڑ گیا تھا۔ وہ ہمارا انتظار کرتے کرتے اکتا گئی تھیں اور انہیں خود اپنی آزادی پر شرم معلوم ہوتی تھی جبکہ ان کے پیارے جیل خانے کی آہنی سلاخوں میں بند تھے۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہماری پہلی گرفتاری کے بعد ہی پولیس نے آنند بھون کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ والد پر اور مجھ پر عدالت سے کچھ جرمانہ بھی ہوا تھا وہ اسی کو وصول کرنے آتی تھی۔ لیکن کانگرس کا حکم یہ تھا کہ جرمانہ ادا نہ کیا جائے۔ اس لئے پولیس آئے دن آدھمکتی تھی۔ اور فرنیچر میں سے جو کچھ ہاتھ لگتا وہ قرق کر کے لے جاتی ھتی۔ میری لڑکی اندرا اس وقت چار سال کی تھی۔ اسے روز کی اس لوٹ مار پر بڑا غصہ آیا۔ چنانچہ اس نے پولیس والوں کے سامنے سخت احتجاج کیا اور ان پر بہت بگڑی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے یہ ابتدائی تاثرات ہمیشہ کے لئے اسے ساری پولیس سے بدظن کر دیں گے۔

اس کے انتہائی کوشش کی جاتی تھی کہ ہم غیر سیاسی قیدیوں سے نہ ملنے پائیں

اس لئے سیاسی قیدیوں کے لئے خاص جیل مخصوص تھی۔ لیکن کبھی نہ کبھی یہ قیدی ہمیں مل جاتے تھے۔ ہمیں براہ راست بھی اور ان قیدیوں کے ذریعے سے بھی جیل کی زندگی کی حقیقت معلوم ہوء۔ یہ گویا تشدد، لوٹ مار اور بد اخلاقیوں کی ایک درد ناک داستان تھی۔ کھانا بھی انہیں بہت خراب ملتا تھا۔ میں نے خود بارہا یہ کھانا منگا کر کھانے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کسی طرح انسانوں کے کھانے کے قابل نہ تھا۔ عملہ عموماً نا اہل تھا اور اسے بہت تھوڑی تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن جب موقع ملتا تھا وہ قیدیوں اور ان کی رشتہ داروں سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جیل مینویل میں جیلر، نائب جیلر اور وارڈروں کی جو ذمہ داریاں اور فرائض درج تھے وہ تعداد مے اتنے زیادہ اور نوعیت میں اتنے مختلف تھے کہ کوئی انسان پوری طرح ان کی پابندی نہیں کر سکتا تھا اور شاید دوسرے صوبوں میں بھی جیل کی انتظامی پالیسی کو قیدیوں کی اصلاح سے یا ان کو نیکی کی تلقین کرنے اور کار آمد پیشے سکھانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جیل میں محض قیدیوں کو ستانے کے خیال سے مشقت لی جاتی تھی۔ (۲)

دراصل قیدی کو خوفزدہ کرنا اور اس سے بے چون وچرا تابعداری کرنا مقصود تھا تا کہ وہ دل میں جیل کی دہشت لے کر واپس جائے اور آئندہ قید کے ڈر سے پھر کسی جرم کا مرتکب نہ ہو۔

اب چند سال سے جیل کے حالات میں کچھ اصلاح ہوئی ہے کھانا اور کپڑا ابھی کچھ بہتر ملتا ہے اور دوسری باتوں میں بھی کسی قدر فرق ہو گیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ جو سیاسی قیدی رہا ہو کر باہر آئے انہوں نے ان نا گفتہ بہ حالات کے خلا سخت جدوجہد کی۔ ترک موالات کی وجہ سے وارڈروں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ ہو گیا تا کہ وہ سرکار کے اور زیادہ وفادار رہیں۔ اب لڑکوں اور نوعمر قیدیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی کچھ یوں ہی سی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ یہ تمام اصلاحیں غنیمت ہیں مگر

ان سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا کیونکہ روح تو اب تک وہی موجود ہے۔

زیادہ تر سیاسی قیدیوں کے ساتھ عام قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ انہیں کوئی خاص رعائتیں حاصل نہ تھیں، نہ وہ کسی خاص سلوک کے مستحق قرار دئے گئے تھے لیکن چونکہ وہ عام قیدیوں سے زیادہ سمجھ دار اور دلیر تھے اس لئے ان سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا اور نہ ان سے جا بے جا روپیہ وصول کیا جا سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سارا عملہ ان سے بغض رکھتا تھا اور جب موقع ملتا تھا جیل کے ضابطوں کی ذرا سی خلاف ورزی پر انہیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ کسی قسم کی معمولی سی لغزش پر ایک پندرہ سولہ برس کے لڑکے کو جو اپنے آپ کو آزاد کہتا تھا کوڑے لگانے کی سزا دی گئی۔ ج اسے ننگا کر کے ٹکٹکی سے باندھا گیا اور کوڑے پڑنا شروع ہوئے تو ہر کوڑے پر وہ "مہاتما گاندھی کی جے" کا نعرہ لگاتا تھا۔ ہر بار جب کوڑا اس کی کھال میں پیوست ہو کر نکلتا تھا اور خون کا فوارہ چھوٹتا تھا تو اس کی زبان سے یہی نعرہ نکلتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ بعد کو یہ لڑکا شمالی ہند کی تخویف پسندوں کا سرگردہ بن گیا۔

---

(۱) ایک بالکل لغو قصہ اخباروں میں نکلا تھا اور تردید ہو جانے کے باوجود اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ وہ یہ کہ سر ہارکورٹ بٹلر، گورنر یو۔پی نے والد کو جیل میں شامپین کی بوتلیں بھیجی تھیں۔ یہ محض غلط ہے۔ سر ہارکورٹ نے والد کو کبھی کوئی چیز جیل میں نہیں بھیجی۔ نہ کبھی کسی شخص نے شمپین یا کسی اور قسم کی شراب بھیجی۔ جب ۱۹۲۰ء میں کانگرس نے ترک موالات کا اصول اختیار کیا اسی وقت سے والد نے شراب چھوڑ دی تھی اور اس زمانے میں وہ قطعاً تارک شراب تھے۔

(۲) یو پی جیل مینوئل کا دفعہ ۹۸۷ جسے اب نئے اڈیشن سے حذف کر دیا ہے یہ تھا کہ:۔

"جیل کی مشقت کا مقصد قیدیوں کو محض کام میں لگائے رکھنا ہے بلکہ اس کا اصل مقصد سزا دینا ہے۔ اسلئے اس چیز کو کوئی اہمیت نہ دینا چاہیے کہ ان سے ایسے کام لئے جائیں جن سے آمدنی کافی ہو بلکہ خاص طور پر یہ لحاظ رکھنا یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ جیل میں

مشقت اتنی دشوار اور نا قابل برداشت ہو کہ مجرم اس سے ڈریں۔"

اس کے مقابلے میں ذرا روسی تعزیرات کے چند دفعات ملاحظہ کیجئے۔

دفعہ ۹۔ سماجی مدافعت کے قوانین کا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگوں کو جسمانی تکلیف پہنچائی جائے یا انسانوں کو ذلیل کیا جائے یا انتقام لیا جائے اور سزا دی جائے۔

دفعہ ۲۶ سزائیں سماجی مدافعت کا ایک ذریعہ ہیں اس لئے ان میں ظلم کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے اور مجرم کو غیر ضروری اور نا مناسب تکلیف نہ پہنچانا چاہیے۔

دوبارہ رہائی

جیل میں انسان کو اکثر چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن شاید سب سے زیادہ عورتوں کی نرم آواز اور بچوں کے معصوم قہقہوں کو ترستا ہے۔ یہاں عموماً جو آوازیں کانوں میں پڑتی ہیں وہ کچھ خوش گوار نہیں ہوتیں۔ لوگوں کا لہجہ درشت اور تحکمانہ ہوتا ہے اور زبان وحشیانہ جس میں گالیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ تو ایک عجیب خواہش کا احساس ہوا۔ یعنی لکھنو ڈسٹرکٹ جیل میں یکایک مجھے یہ خیال آیا کہ سات آٹھ مہینے سے میں نے کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں سنی ہے۔

۱۳ جنوری ۲۲ء کو لکھنو جیل کے سارے سیاسی قیدی رہا کر دئے گئے۔ اس وقت لکھنو میں اسپیشل کلاس کے قیدیوں کی تعداد سو اور دو سو کے درمیان ہوگی۔ جن لوگوں کو ۲۱ء کے آخر یا ۲۲ء کے شروع میں کم و بیش ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ وہ اپنی معیاد پوری کر کے رہا ہو چکے تھے۔ البتہ جن کی لمبی سزائیں تھیں یا جو دوبارہ سزا یاب ہوئے تھے وہ باقی تھے ہمیں اس اچانک رہائی پر حیرت ہوگئی کیونکہ عام معافی کا کوئی تذکرہ سننے میں نہ آیا تھا۔ البتہ صوبہ متحدہ کی کونسل نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ تمام سیاسی قیدیوں کو فوراً آزاد کر دیا جائے لیکن ہم جانتے تھے کہ حکومت کب اس قسم کے مطالبوں کی پروا کرتی ہے۔ ہوا یہ کہ خود حکومت نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ کانگرس اس وقت حکومت کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کر رہی تھی اور کانگریسی خود آپس میں دست و گریباں تھے۔ اس کے علاوہ اکثر مشہور لیڈر رہا ہو چکے تھے۔ اسلئے یہ مہربانی کی گئی۔

جیل کے پھاٹک سے باہر نکل کر ہر انسان کو اطمینان او مسرت کا احساس ہوت ہے تازہ وا اور کھلے میدان، سڑکوں کی چہل پہل، بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملاقات۔ ان سب چیزوں سے مل ملا کر ایک نشہ سا ہو جات ہے۔ اور پہلے اس کی حرکتیں خفقان کے مریض کی سی ہوتی ہیں۔ ہم پر بھی یہ کیفیت طاری ہوئی۔ لیکن

زیادہ دیر تک نہیں رہی کیونکہ اس وقت کانگریس کی سیاست بہت بری حالت میں تھی۔ اعلیٰ مقاصد کے بجائے سازشوں کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ اس کوشش میں تھے کہ کانگریس کا سارا نظام ہمارے ہاتھ میں آجائے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایسے ناروا طریقے استعمال کر رہے تھے جس کی وجہ سے حساس لوگ سیاست کے نام سے گھبراتے ہیں۔

میں خود داخلہ کونسل کے قطعاً خلاف تھا کیونکہ میری نظر میں اس کا یہ نتیجہ ہونے والا تھا کہ ہم خواہ مخواہ سمجھوتوں پر اتر آئیں گے اور ہمارا اصل مقصد رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن حقیقت میں اس وقت ملک کے سامنے کوئی دوسرا سیاسی پروگرام ہی نہ تھا۔ تبدیلی کے مخالف "تعمیری کام" پر زور دیتے تھے۔ یہ حقیقت میں سماجی اصلاح کا پروگرام تھا اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہمارے کارکنوں کو عام لوگوں سے میل جول کا موقع ملتا تھا لیکن اس سے وہ لوگ مطمئن نہ ہو سکتے تھے، جو عملی سیاست کے قائل تھے۔ عملی احتجاج کی تحریک کو بھی اس کے بانیوں یعنی دیش بندھو داس اور میرے والد نے حکومت کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے اور اس کی مخالفت کرنے کی شکل میں اٹھایا تھا تعاون اور تعمیر کی حیثیت سے نہیں۔

مسٹر سی۔ آر۔ داس ہمیشہ سے داخلہ کونسل کے حامی تھے تا کہ اس محاذ سے بھی قومی جنگ لڑی جا سکے۔ میرے والد کی بھی یہی رائے تھی۔ ۱۹۳۰ء میں جو انہوں نے کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا منظور کر لیا تھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو گاندھی جی کی رائے کا تابع کر دینا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنگ میں پوری طاقت سے شریک ہوں اور اس کی صورت صرف یہی تھی کہ وہ گاندھی جی کے نظریہ کو حرف بہ حرف قبول کر لیں۔ اس وقت سن فین جماعت کی مثال ہمارے سامنے تھی کہ اس نے دارالعلوم کی نشستوں پر قبضہ کر کے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ ہمارے اکثر نوجوان اس سے متاثر تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی سے کہا تھا

کہ بائیکاٹ کا یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ان معاملات میں وہ بہت سخت ہیں۔
مولانا محمد علی اس وقت خلافت کا وفد لے کر یورپ گئے تھے۔واپسی پر انہوں نے بائیکاٹ کے طریقہ کو پسند نہ کیا اور فرمایا کہ میں تو سن فین جماعت کا رویہ بہتر سمجھتا ہوں۔لیکن اس معاملے میں دوسروں کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اس لئے کہ ہونا وہی تھا جو گاندھی جی چاہتے تھے۔وہ تحریک کے بانی تھے اس لئے عام طور پر یہ خیال تھا کہ جزویات کے معاملے میں انہیں پوری آزادی ملنی چاہیے۔سن فین طریقے پر ان کا خاص اعتراض یہ تھا کہ اس سے قطع نظر کہ وہ تشدد کے حامی ہیں) عوام جس خوبی سے بائیکاٹ کو اور ووٹ نہ دینے کے مفہوم کو سمجھ سکیں گے۔اس طرح سن فین طریقہ ان کی سمجھ میں نہ آئے گا۔اگر ہم اپنے آپ کو منتخب کرا کے پھر کونسل میں نہ جائیں گے تو اس سے عوام کے ذہن میں ایک الجھن سی پیدا ہوگئی۔دوسرے یہ کہ اگر ایک مرتبہ ہمارے آدمی منتخب ہو جائیں گے تو پھر انہیں کونسلوں سے لگاؤ پیدا ہو جائے گا اور وہ انہیں مشکل سے چھوڑ سکیں گے۔ہماری تحریک میں ابھی نہ تو اتنا انضباط ہے نہ اسے اتنی قوت حاصل ہے کہ انہیں زیادہ عرصے تک کونسلوں میں جانے سے روکا جا سکے۔ اس لئے کونسلوں کے ذریعے حکومت کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے بہت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طریقے استعمال کئے جائیں گے۔جن سے ہماری اخلاقی حالت پر بڑا برا اثر پڑے گا۔

یہ دلائل بہت دقیع تھے اور ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں جب سوراج پارٹی کونسلوں میں گئی تو ہم نے دیکھا کہ گاندھی جی کا خیال بہت کچھ صحیح ثابت ہوا۔پھر بھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر واقعی ۱۹۲۰ء میں کانگرس نے کونسلوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہوتا تو معاملات کیا صورت اختیار کرتے۔چونکہ اس وقت کانگریس کو خلافت کمیٹی کی حمایت بھی حاصل تھی اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسمبلی اور کونسلوں کی قریب قریب تمام انتخابی نشستوں پر قبضہ ہو جاتا۔اب (اگست ۱۹۳۴ء میں) پھر یہ تجویز ہو

رہی ہے کہ اسمبلی کے انتخابات میں کانگریس کی طرف سے امیدوار کھڑے کئے جائیں۔ چنانچہ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہو گیا لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد سے ایسے ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں کہ ہمارے سماجی اور سیاسی اتحاد میں بہت سے رخنے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے ۱۹۲۰ء میں جتنی کامیابی کی امید ہو سکتی تھی۔ آئندہ انتخابات میں وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے بعض دوسرے حضرات کے ساتھ مل کر دونوں فریقوں میں سمجھوتا کرانے کی کوشش کی لیکن ہمیں بہت کم کامیابی ہوئی اور میں تغیر کے حامیوں اور مخالفوں کے جھگڑوں سے عاجز آ گیا۔ یو۔ پی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے میں کانگریس کی تنظیم میں مصروف ہو گیا۔ سال گزشتہ کانگریس میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے بہت کچھ کام کرنے کو تھا۔ اس لئے میں نے بہت سخت محنت کی، لیکن کوئی خاص نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔ ان دنوں کوئی خاص کام نہ ہونے کی وجہ سے میں کچھ پریشان سا تھا کہ یکا یک ایک نیا میدان میرے سامنے آ گیا۔ رہائی کے چند ہفتے کے اندر ہی میں الہ آباد میونسپلٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ یہ انتخاب بالکل غیر متوقع تھا کیونکہ انتخاب سے ۴۵ منٹ پہلے تک میرا نام پیش نہیں ہوا تھا۔ بلکہ شاید کسی کو اس کا خیال نہ تھا۔ بالکل آخری وقت میں کانگریس پارٹی نے یہ اندازہ کیا کہ کانگریسیوں میں صرف مجھی کو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے لہذا انہوں نے میرا نام پیش کر دیا۔ اور میں منتخب ہو گیا۔

اس سال اتفاق سے تمام ملک میں مشہور مشہور کانگریسی میونسپلٹی کے صدر ہوئے۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس کلکتہ کارپوریشن کے پہلے میئر منتخب ہوئے۔ مسٹر وٹھل بھائی پٹیل بمبئی کارپوریشن کے صدر ہوئے اور سردار ولبھ بھائی پٹیل احمد میونسپلٹی کے۔ یوپی میں بھی کانگریسی تمام بڑی بڑی میونسپلٹیوں کے صدر ہو گئے۔

اب مختلف قسم کے بلدیاتی کاموں سے مجھے دلچسپی ہونے لگی اور میں روز بروز

اس میں زیادہ وقت دینے لگا۔ سا کے بعض پہلوؤں سے تو مجھے ایک خاص شغف ہو گیا تھا۔ میں نے اس موضوع کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ شہر کے انتظام میں اصلاحیں کرنا چاہیے۔ بع میں مجھے اندازہ ہوا کہ بالفعل ہندوستانی میونسپلٹیوں کا نظام کچھ ایسا ہے کہ بڑی اصلاحیں کرنے اور اولوالعزمی دکھانے کی گنجائش ہی نہیں ۃ ے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ کام کرنے کا موقع ضرور تھا۔ یعنی یہ کوشش ہو سکتی تھی کہ اس مشین کے پرزوں کی صفائی کر دی جائے تا کہ اس کی رفتار تیز ہو جائے۔ اسی خیال سے میں نے خاصی محنت کی۔ اس زمانے میں میری کانگریس کی مصروفیت بھی بڑھنے لگی اور صوبہ کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری ہونے کے علاوہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سیکرٹری بھی بنا دیا گیا۔ ان فرائض کے ادا کرنے میں اکثر مجھے روزانہ پندرہ گھنٹے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اور جب رات گئے میں کام ختم کرتا تھا تو تھک کر چور ہو جاتا تھا۔

جیل سے واپس آنے کے بعد سب سے پہلا خط جو میری نظر سے گزرا وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر گرم ووڈ مئرس اک تھا۔ یہ خط میری رہائی سے پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ لیکن غالباً اس وقت انہیں یہ علم ہو چکا تھا کہ میں عنقریب رہا کر دیا جاؤں گا۔ انہوں نے بڑے شفقت آمیز الفاظ میں یہ خط لکھا تھا اور مجھے یہ دعوت دی تھی کہ میں کبھی کبھی ان سے ملا کروں۔ مجھے ان کا یہ رویہ دیکھ کر تھوڑی سی حیرت ہوئی کیونکہ میں ان سے بہت کم واقف تھا۔ وہ ۱۹۱۹ء میں اس وقت الہ آباد آئے تھے جبکہ وہ وکالت چھوڑتا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے صرف ایک مقدمے میں ان کے سامنے بحث کی تھی اور ہائی کورٹ میں یہ میرا آخری مقدمہ تھا۔ کسی وجہ سے انہیں مجھ سے غائبانہ دلچسپی ہو گئی۔ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا خیال تھا کہ میں انتہا پسند ہو جاؤں گا۔ اس لئے وہ مجھ پر اتنا اثر رکھنا چاہتے تھے کہ میں برطانوی نقطہ نظر کو سمجھ سکوں۔ ترکیب تو انہیں خوب سوجھی تھی۔ بہت سے انگریزوں کی طرح

ان کی بھی یہ رائے تھی کہ ہندوستان کے اکثر انتہا پسند محض اس وجہ سے برطانیہ کے مخالف ہو گئے ہیں کہ معاشی حیثیت، سے انگریز ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے رنجش اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔ یہ قصہ بھی مشہور ہے اور ذمہ دار حضرات کی زبان سے سنا گیا ہے کہ والد انگریزوں کے ایک کلب میں داخل نہیں کئے تھے اس لئے وہ انتہا پسند اور برطانیہ کے مخالف ہو گئے۔ یہ محض بے بنیاد فسانہ ہے اور دراصل ایک دوسرا واقعہ توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان رویات سے چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط اکثر انگریز یقین کر لیتے ہیں کہ ہو نہ ہو قومی تحریک اور برطانیہ کے خلاف اشتعال کی یہی وجہ ہے۔ سچ پوچھئے تو نہ والد کو اور نہ مجھے انگریزوں سے اس قسم کی کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ انفرادی حیثیت سے انگریز ہمیشہ ہم سے بڑے اخلاق سے پیش آئے اور ہمارے ان سے بہت اچھے مرسم رہے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی کی حیثیت سے ہمیشہ یہ خیال ہمیں ستاتا تھا کہ ہماری قوم ان کی محکوم ہے۔ سچ پوچھئے تو اب بھی انگریزوں سے میری خوب نبھتی ہے سوا سرکاری افسروں کے جو مجھ پر رعب جمانا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس میں بھی ایک تفریح کا پہلو ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید انگریزوں سے میں اتنا دور نہیں ہوں جتنے لبرل حضرات یا اور بزرگ جو ہندوستان میں انگریزوں سے سیاسی تعاون کرتے ہیں۔

سرگرم ووڈ کا مقصد یہ تھا کہ دوستانہ مراسم، صاف گوئی اور خوش اخلاقی سے کام لے کر رنجش کی ا؟صل بنا کو دور کر دیں۔ میں ان سے اکثر ملتا تھا اور وہ بھی کسی میونسپل ٹیکس کے خلاف احتجاج کرنے کے بہانے سے میرے پاس آتے تھے اور دوسرے مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ ایک بار تو انہوں نے ہندوستانی لبرلوں کو خوب کھری سنائیں اور کہا کہ وہ نرے موم کی ناک، بے پیندے کے برتن، اور ہوا کے رخ پر چلنے والے ہیں بلکہ ان کے الفاظ اس سے زیادہ سخت اور حقارت آمیز تھے۔

مجھ سے کہنے لگے "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ان باتوں سے میں خوش ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے گفتگو کا رخ نئی کونسلوں اور وزارتوں کی طرف پھیر دیا۔ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ان وزارتوں کے ذریعہ سے ملک کی خدمت کرنے کے بہت سے موقعے نکل سکتے ہیں۔ مثلاً تعلیم کا مسئلہ ملک کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیا ایک وزیر تعلیم کو جسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہو لاکھوں کی قیمتیں بدلنے اور ان کی زندگیاں بنانے کا زریں موقعہ حاصل نہیں ہے؟ یہاں سے وہ گریز کر کے اصل مقصد پر آئے اور فرمایا کہ فرض کیجئے آپ جیسا شخص جو ذہین۔ دیانت دار اور با اصول ہو اور جس میں کچھ کرنے کی ہمت اور جوش بھی ہو صوبہ کا وزیر تعلیم ہو جائے تو کیا کچھ نہیں کر دکھائے گا۔ اس کے بعد انہوں نے گورنر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا جو حال ہی میں ہوئی تھی اور مجھے یقین دلایا کہ تمہیں اپنی پالیسی کو عملی جامہ پہنچانے کی پوری آزادی ہوگی۔ پھر فوراً ہی انہیں احساس ہوا کہ شاید ہو حد سے بڑھ گئے اس لئے وہیں سے بات بنائی اور کہا کہ ظاہر ہے میں کسی کی طرف سے سرکاری طور پر زبان تو دے نہیں سکتا۔ صرف ذاتی طور پر ایک تجویز پیش کر رہ ہوں۔

سرگرم ووڈ نے جس حکمت عملی اور داؤں پیچ سے یہ تجویز پیش کی، اس سے میں بہت محفوظ ہوا۔ یہ خیال تو کبھی آ ہی نہیں سکتا تھا کہ وزیر کی حیثیت سے حکومت کے ساتھ کام کروں۔ اس سے بڑھ کر مکروہ میرے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی میرے لئے دل میں یہ تمنا ضرور پیدا ہوئی کہ کاش مجھے ٹھوس اور مستقبل تعمری کام کرنے کا موقع ملتا۔ کسی کام کو بگاڑنا، مخالفانہ جدو جہد یا ترک موالات کرنا انسان کے لئے کوئی طبعی چیز نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے۔ ہماری قسمت ہی میں لکھا ہے کہ ہم اس سرزمین تک جہاں ہمیں کچھ تعمیر کرنا ہے جنگ وجدال اور

تباہیوں کے ریگستان میں سے گزر کر پہنچیں۔ شاید ہم میں سے اکثر لوگ اپنی زندگیاں انہیں دشوار گزار منزلوں کو طے کرنے میں صرف کر دیں گے اور ہماری اولا دیا اولا کی اولاد کو یہ موقع نصیب ہوگا کہ وہ تعمیر شروع کر سکے۔

اس زمانے میں کم سے کم صوبہ متحدہ میں وزارتیں تکے سیر بکتی تھیں وہ دو لبرل حضرات جو ترک موالات کے زمانے میں وزارت پر مامور تھے علیحدہ ہو چکے تھے۔ جب تک کانگرس کی تحریک سے موجودہ نظام کے تہ و بالا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس وقت تک حکومت نے کانگرس سے لڑنے کے لئے لبرل وزیروں کو آلہ کار بنا رکھا تھا۔ اس وقت ان کی بڑی قدر و عزت تھی۔ کیونکہ حکومت اسی کو غنیمت سمجھی تھی کہ دکھانے کیلئے اس کے کچھ حامی تو رہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ قدر و منزلت ان کا حق ہے حالانکہ یہ تو محض کانگریس کے زبردست حملے کا ایک ردعمل تھا۔ چنانچہ جب یہ حملہ ختم ہوگیا تو یہ لبرل وزیر بھی حکومت کی نظروں سے گر گئے اور ان کی قدر و منزلت کافور ہو گئی۔ وزیروں کو بہت برا معلوم ہوا مگر کیا کر سکتے تھے۔ آخر وہ استعفا دینے پر مجبور ہو گئے اس کے بعد نئے وزیروں کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر اس میں جلد کامیابی نہیں ہوئی۔ کونسل میں جو مٹھی بھر لبرل تھے انہوں نے اپنے رفقا کی وفاداری میں جن کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تھی، وزارت قبول کرنے سے گریز کیا۔ باقی ممبر زیادہ تر زمیندار تھے۔ ان میں معدودے چند ایسے ہوں گے جنہیں تھوڑا بہت تعلیم یافتہ کہا جا سکتا تھا۔ چونکہ کانگریس نے کونسلوں کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس لئے وہاں عجب عجب طرح کے لوگ پہنچ گئے تھے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ اسی زمانے میں یا اس کے کچھ عرصے بعد ایک صاحب کو یو۔ پی میں وزارت پیش کی گئی تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے یہ مغالطہ نہیں ہے کہ میں غیر معمولی طور پر عقل مند آدمی ہوں۔ پھر بھی میں اپنے خیال میں اور شاید دوسروں کے نزدیک بھی تھوڑی بہت عقل ضرور رکھتا ہوں۔ کیا حکومت چاہتی ہے کہ

میں وزارت قبول کر کے دنیا پر ظاہر کروں کہ میں محض احمق ہوں۔

اس طعن میں کچھ حقیقت ضرور تھی۔لبرل وزیر اگرچہ تنگ خیال تھے اور سیاسی یا سماجی معاملات میں ان کی نظر وسیع نہ تھی لیکن یہ محض ان کے غلط عقیدے کا قصور تھا۔ کم سے کم ان میں آئینی قابلیت تو تھی اور انہوں نے معمولی دفتری کام تو سمجھ بوجھ کر کیا، لیکن ان کے جانشینوں نے جو زمیندار طبقے کے افراد تھے معمولی باتیں بھی واجبی ہی واجبی پائی تھی۔میرے نزدیک تو ان کے متعلق بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ سکتے تھے۔کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گورنر نے انہیں محض اس وجہ سے منتخب کر کے اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا ہے کہ ہندوستانیوں کی نا اہلیت ثابت ہو سکے۔ان پر ریچرڈ گارنٹ کا یہ مصرع بالکل صادق آتا تھا۔

”قسمت نے تجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا“

تا کہ دنیا یہ کہہ سکے کہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے“

بہر حال یہ وزرا تعلیم یافتہ ہوں یا نہ ہوں مگر انہیں زمیندار ممبروں کی تائید حاصل تھی اور وہ اعلیٰ افسروں کو عمدہ عمدہ پارٹیاں دے سکتے تھے۔فاقہ کش کسانوں کی گاڑھی کمائی کا اس سے بہتر اور کیا مصرف ہو سکتا تھا۔

شکوک اور ذہنی کش مکش

میں نے اپنے لئے طرح طرح کے مصروفیتیں پیدا کرلیں تاکہ میں جن الجھنوں میں پڑا ہوا تھا، ان کو بھول جاؤں، لیکن سوالوں سے کہاں نجات مل سکتی تھی جو میرے دل و دماغ میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے تھے اور جن کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اب عمل کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے آپ سے پیچھا چھڑاؤں۔ ۱۹۲۰ اور ۱۹۲۱ء کی طرح اب میری سرگرمیاں سراسر اظہار خودی کے لئے نہیں تھیں۔ یوں سمجھئے کہ میں نفس کی تنگ چاردیواری کو توڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ اور اب ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بہت سی نئی چیزیں، نئے خیالات، نئی تحریکیں دیکھیں جن پر اب تک نظر ہی نہیں پڑتی تھی۔ روشنی کی جگہ بوھتی ہوئی تاریکی کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ گاندھی جی کی رہبری پر مجھے اب بھی پورا اعتماد تھا لین اب میں ان کے پروگرام کے بعض حصوں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اس میں ایک مشکل یہ تھی کہ وہ جیل میں تھے اور ان کی رائے اور مشورے سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس وقت کانگرس میں دو جماعتیں تھیں یعنی داخلہ کونسل کی حامی جماعت اور سابقہ پروگرام میں تبدیلی کی مخالف جماعت۔ مجھے ان دونوں میں سے کسی سے دلچسپی نہ تھی۔ پہلی جماعت تو کھلم کھلا اصلاح پسندی اور آئین پرستی کی طرف جا رہی تھی جو میرے نزدیک بندگلی کا راستہ تھا۔ رہے تبدیلی کے مخالف تو وہ اگرچہ مہاتما کے کٹر چیلے سمجھے جاتے تھے لیکن بڑے لوگوں کے تمام چیلوں کی طرح وہ بھی ان کی تعلیم کی روح کے نہیں بلکہ الفاظ کے پجاری تھے۔ ان میں کوئی موثر چیز نہ تھی اور عملی طور پر وہ بے ضرر، اللہ والے لوگ تھے۔ جن کی حیثیت سماجی مصلحین سے زیادہ نہ تھی البتہ ان میں ایک خوبی ضرور تھی یعنی کسانوں سے ان کا رشتہ برابر قائم تھا۔ سوراج پارٹی والوں سے جو کونسلوں کے داؤں پیچ میں پھنس کر رہ گیا تھے یہ پھر بھی اچھے تھے۔

میرے رہا ہوتے ہی دیش بندھو داس نے مجھے اپنا ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی۔ اگرچہ خود میرے ذہن میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے لیکن میں ان کی دلیلوں سے متاثر نہیں ہوا۔ میرے والد کو بھی سوراج پارٹی قائم کرنے کی دھن تھی۔ یہ ان کی عجیب وغریب خصوصیت تھی کہ انہوں نے اس معاملے میں کبھی مجھ پر زور یا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ اگر میں ان کا شریک کار ہو جاتا تو انہیں بڑی مسرت ہوتی لیکن انہیں میرے جذبات کا بڑا پاس تھا۔ اس لئے اس معاملے میں انہوں نے مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا۔

اس زمانے میں مسٹر سی۔ آر۔ داس اور میرے والد میں بہت گہری دوستی ہو گئی۔ اس کی نوعیت سیاسی رفاقت سے کہیں زیادہ تھی۔ اس میں وہ گرمجوشی اور خلوص تھا کہ مجھے دیکھ کر حیرت ہو گئی۔ کیونکہ زیادہ عمر میں گہری دوستیاں بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ میرے والد کے سینکڑوں ملنے والے تھے اور قدرت نے انہیں یہ ملکہ عطا کیا تھا کہ وہ سب کے ساتھ ہنسی خوشی سے گزار دیتے تھے۔ لیکن دوستی کے معاملے میں وہ بہت محتاط تھے بلکہ آخری عمر میں تو بہت روکھے ہو گئے تھے۔ تاہم دیش بندھو کے اور ان کے بیچ سے تمام رکاوٹیں رفتہ رفتہ ہٹ گئی تھیں اور ان کے دل ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ میرے والد ان سے نو برس بڑے تھے۔ لیکن جسمانی حیثیت سے وہ ان سے زیادہ قوی اور تندرست تھے۔ اگرچہ دونوں نے قانونی تربیت پائی تھی اور وکالت میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن بہت سی باتوں میں وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مسٹر داس وکیل ہونے کے باوجود شاعر تھے اور جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہوں نے بنگلہ زبان میں بڑی عمدہ نظمیں لکھی ہیں وہ بڑے اچھے خطیب تھے اور طبیعت میں مذہبی رجحان تھا۔ برخلاف ان کے میرے والد خشک عملی آدمی تھے اور انہیں تنظیم کا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ مذہب سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ایک جنگجو سپاہی کی طرح ہمیشہ مارنے مرنے کو تیار رہتے تھے۔ جن لوگوں کو

وہ بیوقوف سمجھتے تھے ان سے نبھانا ان کے لئے ناممکن یا کم سے کم دشوار تھا اور مخالفت کی انہیں مطلق برداشت نہیں تھی اسے وہ اعلان جنگ سمجھ کر لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ غرض دیش بندھو اور والد باوجود اتنے اختلافات کے باہم شیر و شکر ہو گئے۔ اور سوراج پارٹی کی رہنمائی کے لئے یہ عجیب و غریب زبردست جوڑی بن گئی جس میں ایک شخص دوسرے کی کمزوریوں کی تلافی کرتا تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے پر بے حد اعتماد تھا۔ یہاں تک کہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو عام اجازت تھی کہ وہ ہر بیان یا ہر اعلان پر بغیر پوچھے دوسرے دستخط کر سکتے ہیں۔

یہی وہ شخص عنصر تھا جس نے سوراج پارٹی کو اتنا مستحکم کر دیا اور جس کی بدولت اسے ملک میں اس قدر قوت اور اقتدار حاصل ہو گیا۔ لیکن شروع ہی سے اس میں تفریق کے عناصر موجود تھے کیونکہ بہت سے نام و نمود چاہنے والے اس خیال سے اس میں شریک ہو گئے تھے کہ کونسلوں کے ذریعے سے ترقی کی مدارج آسانی طے ہو سکیں گے پھر اس میں بعض پکے اعتدال پسند بھی تھے جن کا خیال تھا کہ حکومت سے اور زیادہ تعاون کیا جائے۔ انتخاب کے بعد جیسے ہی یہ رجحانات ظاہر ہوئے پارٹی کے لیڈروں نے ان کی سختی سے مخالفت کی۔ میرے والد نے تو صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ "سڑے گلے عضو" کو کاٹ پھینکنے میں ذرا تامل نہ کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر عمل بھی کیا۔

۱۹۲۳ء کے بعد سے مجھے گھر پر بڑا سکون اور مسرت حاصل ہونے لگی اگرچہ میں وہاں بہت کم وقت گزارتا تھا۔ میں اس معاملے میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ سارے خاندان سے میرے تعلقات بڑے خوش گوار رہیں اور پریشانی اور مصیبت کے وقت میں وہ لگو ہمیشہ دلاسا دیتے ہیں اور میری مدد کرتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں اپنی نااہلی کا احساس کر کے بڑی شرم آتی ہے۔ خصوصاً جب میں اس پر غور کرتا ہوں کہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے ہماری معاشرت میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی تھی اب ہم

بہت سادہ زندگی گذارنے لگے تھے اور ملازموں کی تعداد بھی بہت کم کردی گئی۔ پھر بھی معمولی آرام و آسائش کی کمی نہ تھی۔ کچھ تو فضولیات کو ترک کرنے کے خیال سے اور کچھ روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے ہم نے بہت سی چیزیں فروخت کردیں۔ مثلاً گھوڑے گاڑیاں یا گھر کا وہ سامان جو ہماری موجودہ طرز زندگی سے میل نہ کھاتا تھا۔ کچھ فرنیچر پولیس اٹھالے گئی اور اس نے بیچ ڈالا۔ غرض فرنیچر اور نوکروں کی کمی کی وجہ سے ہمارے گھر میں وہ آرائش اور صفائی باقی نہیں رہی تھی اور مالیوں کے نہ ہونے سے سارا باغ اجڑ گیا تھا تقریباً ۳ سال تک گھر کے باغ کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ خرچ کے معاملے میں والد کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا اس لئے وہ زیادہ جزرسی کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خالی وقت میں مقدمات میں مشورہ دینے کا کام شروع کردیا تاکہ تھوڑی بہت آمدنی ہوجایا کرے۔ اس کام کے لئے انہیں بہت کم وقت ملتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اچھا خاصا روپیہ کمالیا۔

یہ خیال میرے لئے سوہان روح تھا کہ میرا سارا بار والد پر ہے۔ جب سے میں نے وکالت ترک کی ہے میری کوئی آمدنی نہیں رہی تھی۔ البتہ چند حصوں کا منافع ضرور آتا تھا۔ میرا اور میری بیوی کا خرچ کچھ زیادہ نہ تھا بلکہ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ہم کتنا کم خرچ کرتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں اس کا انکشاف کرکے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ میرا خیال تھا کہ کھادی کے کپڑوں اور تیسرے درجے کے سفر میں خرچ ہی کیا ہوتا اس وقت چونکہ میں والد کے ساتھ رہتا تھا اس لئے مجھے یہ اندازہ تھا کہ گھر کے چھوٹے چھوٹے متفرق خرچ ملا کر خاصی بڑی رقم ہوجاتی ہے۔ بہر حال روپے کی کمی میرے لئے کبھی پریشانی کا باعث نہیں ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو میں کافی روپیہ پیدا کرسکتا ہوں اور ہمارا گذارا بہت تھوڑے میں ہوسکتا ہے۔

ہماری وجہ سے والد پر کچھ ایسا بوجھ نہیں پڑتا تھا اور اگر اس قسم کا ذرا سا اشارہ بھی

کیا جاتا تو انہیں سخت تکلیف ہوتی پھر بھی والد کا دست نگر ہونا اچھا نہ لگتا تھا چنانچہ میں تین سال تک برابر اس مسئلے پر غور کرتا رہا لیکن کوئی صورت نہ نکلی۔ آمدنی کا ذریعہ نکال لینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن اس کے معنی یہ ہوتے کہ مجھے قومی کام ترک کرنا پڑتا یا کم از کم اس میں بہت کمی ہو جاتی۔ اب تک تو میں سارا وقت کانگرس اور میونسپلٹی کے کام میں صرف کرتا تھا۔ محض روپیہ پیدا کرنے کے لئے ان کاموں کو ترک کرنا مجھے کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ اس وجہ سے میں نے بڑے بڑے صنعتی اداروں کی ان پیش کشوں کو منظور نہیں کیا جو مالی حیثیت سے نہاتے پر منفعت تھیں۔ وہ مجھے اتنی بڑی رقم کچھ میری اہلیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ غالباً اس وجہ سے دینے کو تیار تھے کہ میرے نام سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور میں اس طرح کسی بڑی صنعت سے متعلق نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وکالت دوبارہ شروع کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا مجھے اس سے سخت نفرت تھی۔ اور یہ نفرت روز بروز بڑھتی گئی۔

۱۹۲۴ء کی کانگرس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ جنرل سیکرٹریوں کو تنخواہ دینا چاہیے اس وقت ایک سیکرٹری میں بھی تھا۔ میں نے اس تجویز کو پسند کیا کیونکہ میرے نزدیک یہ طریقہ بالکل غلط تھا کہ کسی شخص کو اس کے گذارے کے لائق بھی تنخواہ نہ دی جائے اور پھر اس سے یہ توقع کی جائے کہ وہ رات دن کام میں لگا رہے۔ ایسی صورت میں ہمیں خواہ مخواہ وہ لوگ تلاش کرنے پڑیں گے جو گھر کے کھاتے پیتے ہوں لیکن اس قسم کے رئیس لوگ عموماً سیاسی خدمات کے لئے موزوں نہیں ہوتے اور نہ ان سے ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کانگرس کو کچھ زیادہ خرچ نہ کرنا پڑتا کیونکہ ہم لوگ بہت کم گذارہ لیتے لیکن ہندوستان میں لوگوں کے ذہن میں یہ عجیب وغریب اور مہمل خیال جم گیا ہے کہ قومی سرمائے میں سے تنخواہ نہیں لینی چاہیے۔ حالانکہ سرکاری خزانے سے لوگ بہ خوشی تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ بہر حال والد نے اس سے سخت اختلاف کیا کہ میں کوئی تنخواہ قبول کروں۔ میرے

شریک کار دوسرے سیکرٹری کو بھی روپے کی سخت ضرورت تھی، لیکن انہوں نے بھی کانگرس سے تنخواہ لینا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شرم نہیں آتی تھی اور میں تنخواہ لینے کے لئے بالکل تیار تھا، لیکن ان حالات میں مجھے بھی تنخواہ سے دست بردار ہونا پڑا۔

صرف ایک مرتبہ میں نے والد سے اس مسئلے پر گفتگو کی۔ اور ان سے عرض کیا کہ مجھے اپنا سارا بوجھ آپ پر ڈالنا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے حتی الامکان انتہائی لجاجت سے اور بڑے ایرپھیر سے یہ بات ان سے کہی تھی تاکہ انہیں کسی طرح تکلیف نہ ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سخت حماقت ہوگی۔ اگر تم قومی کام کرنے کے بجائے روپیہ کمانے میں اپنا تمام یا اکثر وقت صرف کرو۔ میں تو آسانی سے چند روز میں اتنا کما سکتا ہوں کہ تمہاری اور تمہاری بیوی کی سال بھر کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ دلیل نہایت معقول تھی لیکن میرا ضا کسی طرح مطمئن نہ ہوا۔ بہر حال میں ان کی مرضی پر چلتا رہا۔

یہ خانگی معاملات اور مالی مشکلات ۲۳ء کے آغاز سے ۲۵ء کے آخر تک جاری رہیں۔ اس اثناء میں سیاسی حالات میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ مجھے میری مرضی کے خلاف آل انڈیا کانگریس کے بہت سے عہدے سپرد کر دیئے گئے اور مختلف ذمہ داریوں میں زبردستی کھینچ لیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کی سیاست بھی نہایت ہی عجیب تھی۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس گیا کانگرس کے گذشتہ اجلاس کے صدر ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی صدر تھے۔ لیکن کمیٹی کی اکثریت ان کے اور ان کی سوراجی پالیسی کے خلاف تھی۔ اکثریت اور اقلیت میں بہت تھوڑا سا فرق تھا اور دونوں جماعتیں قریب قریب برابر تھیں۔ ۲۳ء کی شروع گرمیوں میں جب بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو یہ کش مکش حد سے گذر گئی اور مسٹر داس نے استعفاء دے دیا۔ اس کے بعد دونوں کے بین بین ایک

چھوٹی سی وسطی جماعت پیدا ہوئی اور اس نے نئی ورکنگ کمیٹی ترتیب دی۔ اس جماعت کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں کوئی تائید حاصل نہیں تھی اور وہ سابقہ دو جماعتوں میں سے ایک کی حمایت سے قائم رہ سکتی تھی۔ ان میں سے کسی سے بھی مل کر وہ دوسری جماعت کو شکست دے سکتی تھی۔ ڈاکٹر انصاری اس کے صدر تھے اور میں دو اور حضرات کے علاوہ سیکرٹری تھا۔

بہت جلد ہمیں دونوں طرف سے مشکلات کا سامنا ہوا۔ گجرات تبدیلی کے مخالفوں کا مرکز تھا۔ چنانچہ اس صوبے نے صدر دفتر کے احکام کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی سال گرمیوں کے اختتام پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک دوسرا جلسہ ناگپور میں ہو۔ جہاں اس وقت قومی جھنڈے کے معاملے میں ستیا گرہ ہو رہی تھی۔ ہماری ورکنگ کمیٹی جو بدنصیب وسطی جماعت پر مشتمل تھی مختصر اور بے کاری زندگی کے بعد یہاں ختم ہو گئی۔ اسے دراصل اس لئے ہٹنا پڑا کہ یہ کسی گروہ کی نمائندگی نہیں کرتی تھی اور پھر ان لوگوں پر جن کے ہاتھ میں کانگریس کی باگ تھی رعب جمانا چاہتی تھی۔ اس کمیٹی نے گجرات کے حکم عدولی پر مذمت کی قرارداد پیش کی اور چونکہ اس میں ناکامی ہوئی اس لئے اسے استعفے دینا پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ استعفیٰ دینے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بوجھ سر سے اتر گیا۔ پارٹی بازی کا یہ مختصر سا تجربہ بھی مجھے بہت گراں گذرا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ بڑے بڑے کانگریسی بھی کس طرح سے سازشیں کر سکتے ہیں۔

اس جلسے میں مسٹر سی آر سی۔ داس نے مجھ پر یہ فقرہ کسا تھا کہ تم تو بالکل ٹھنڈی مٹی ہو۔ غالباً اس وقت کا خیال صحیح تھا کیونکہ یہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ مقابلہ کن لوگوں سے ہے۔ اپنے بہت سے احباب اور رفقائے کار کے مقابلے میں واقعی میں ٹھنڈی مٹی ہوں لیکن عام طور پر مجھے ہمیشہ یہی خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں جذبات یا غصہ کی لہر میں بہہ نہ جاؤں۔ برسوں سے میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں ٹھنڈی مٹی بن جاؤں لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں مجھے جس حد تک کامیابی ہوئی ہے وہ محض سطحی ہے۔

ریاست نابھا کا پر مذاق واقعہ

سوراج پارٹی والوں اور ان کے مخالفوں میں کش مکش جاری تھی اور سوراج زور پکڑ رہے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں دہلی میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس ہوا اس میں سوراجیوں کو ایک فتح حاصل ہوئی۔ اس اجلاس کے بعد ہی مجھے ایک عجیب اور غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔

پنجاب میں سکھوں، خصوصاً ان کی اکالی جماعت اور حکومت کے درمیان لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ ان کے اصلاح پسند طبقے نے یہ طے کرلیا تھا کہ بد اطوار مہنتوں کو نکال کر اپنے گوردواروں کو ان کے وجود سے پاک کرنا چاہیے اور تمام گوردواروں اور ان کے اوقاف پر قبضہ کرلینا چاہیے۔ حکومت نے اس معاملے میں مداخلت کی اور اس سے اور اکالیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ یہ تحریک کسی حد تک اس بیداری کی وجہ سے شروع ہوئی جو ترک موالات نے پیدا کردی تھی اور اکالی پر امن ستیا گرہ ہی کے اصولوں کی پیروی بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے ان میں سے خاص واقعہ گورو کے باغ کی مشہور جنگ کا ہے جس میں بیسیوں سکھوں کو (ان میں بہت سے سابق فوجی بھی تھے) پولیس نے نہایت بے دردی سے پیٹا۔ لیکن انہوں نے نہ تو پولیس پر ہاتھ اٹھایا اور نہ اپنے مقصد سے منہ موڑا۔ سارے ہندوستان کو ان کی جرات و استقلال پر حیرت ہوگئی۔ حکومت نے گوردوارہ کمیٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا اور یہ جنگ کئی برس تک جاری رہی۔ آخر کار سکھوں کو فتح ہوئی۔ کانگریس کو قدرتی طور پر سکھوں سے ہمدردی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک اس نے بطور اظہار دوستی اپنی طرف سے ایک ذمہ دار شخص کو امرتسر میں متعین کردیا تھا تاکہ وہ اکالی تحریک کی تمام سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر رہے۔

جس واقعہ کا میں ذکر کروں گا اسے سکھوں کی عام تحریک سے کچھ زیادہ تعلق نہیں

تھا۔لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ سکھوں کی یہی ہل چل تھی ۔ پنجاب
کی وہ سکھ ریاستوں یعنی پٹیالہ اور نابھا کے رئیسوں میں آپس میں سخت عداوت تھی ۔
آخر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند نے مہاراجہ نابھا کو گدی سے اتار دیا۔ اس معزولی
سے تمام سکھوں میں سخت بے چینی پیدا ہوگئی۔ اور انہوں نے ریاست میں بھی اور
ریاست سے باہر بھی اس کے خلاف سخت عمل احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے دوران
میں ریاست کے نئے منتظم نے جیتو میں ایک مذہبی تقریب کو روک دیا۔ اس حکم کے
خلاف احتجاج کرنے اور اس ممنوعہ تقریب کو منانے کے لئے سکھوں نے جیتو میں
جتھے بھیجنا شروع کئے۔ پولیس ان جتھوں کو روک کر خوب مارتی۔ پھر گرفتار کر کے دور
کہیں جنگل میں لے جا کر چھوڑ دیتی۔ میں وقتاً فوقتاً اخباروں میں اس مار دھاڑ کا
حال پڑھا کرتا تھا۔ کانگریس کے خاص اجلاس کے بعد دہلی میں مجھے معلوم ہوا کہ
ایک اور جتھا عنقریب جانے والا ہے او مجھے دعوت دی گئی کہ میں وہاں چل کر اپنی
آنکھ سے سب کچھ دیکھ لوں۔ میں نے خوشی سے یہ دعوت قبول کر لی اور سوچا کہ جیتو
دہلی کے قریب ہی تو ہے۔ صرف ایک دن کا معاملہ ہے کیوں نہ چلا چلوں۔ میرے
دو کانگریسی رفیق۔ اے۔ ٹی۔ گڈوانی اور مدارس کے مسٹر کے سنتانم بھی میرے
ہمراہ ہو لئے۔ جتھا بہت دور سے پیدل چل کر آ رہا تھا۔ انتظام یہ کیا گیا کہ ہم لوگ
قریب اسٹیشن پر اتر جائیں۔ پھر سڑک سے ٹھیک اس وقت جیتو پہنچ جائیں جب جتھا
وہاں پہنچنے والا ہو۔ غرض ہم ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ گئے اور جتھے سے کچھ فاصلے پر
اسکے پیچھے پیچھے بیل گاڑی پر روانہ ہوئے۔ جیتو پہنچنے پر پولیس نے جتھے کو روکا اور فوراً
ہم پر ایک حکمنامے کی تعمیل کی جس پر نابھے کے انگریز منتظم کے دستخط تھے۔ اس کی رو
سے ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ نابھے کی حدود میں ہرگز داخل نہ ہو یا اگر ہو چکے ہو تو فوراً
واپس چلے جاؤ۔ اسی قسم کے حکمنامے سنتانم اور گڈوانی کو بھی دئے گئے لیکن ان پر
ان کے نام درج نہیں تھے کیونکہ نابھے کے افسر شاید ان سے واقف نہ تھے۔ میرے

ہمراہیوں نے اور میں نے پولیس افسر کو یہ جواب دیا کہ ہم جتھے میں شامل نہیں بلکہ محض تماشائی کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ ہمارا یہ ارادہ ہے کہ ریاست کے قوانین کی خلاف ورزی کریں۔ اس کے علاوہ چونکہ ہم نابھے کے حدود میں داخل ہو چکے ہیں اس لئے داخل نہ ہونے کو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہا واپس جانا تو ہم یکایک ہوا میں غائب ہونے سے رہے۔ جیتو سے اگلی گاڑی کئی گھنٹے بعد جاتی ہے اس لئے گاڑی چھوٹنے تک یہیں ٹھہریں گے چنانچہ ہم فوراً گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دئے گئے۔ ہمارے وہاں سے چلے جانے کے بعد جتھے کے ساتھ وہی برتاؤ کیا گیا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔

سارے دن پولیس نے ہمیں حوالات میں رکھا اور شام کو پیدل اسٹیشن لے چلی۔ سنتانم اور میں ایک ہتھکڑی میں بندھے تھے ان کی بائیں کلائی میں کڑا پڑا تھا اور میری سیدھی میں۔ اور ہتھکڑی کی زنجیر پولیس کا ایک سپاہی پکڑے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا۔ گڈوانی کے بھی ہتھکڑی پڑی تھی اور پیچھے پیچھے تشریف لا رہے تھے۔ غرض ہم اس طرح جیتو کی سڑکوں پر گذر رہے تھے جیسے کوئی شخص کتوں کے گلے میں زنجیر ڈالے انہیں گھسیٹتا لئے جا رہا ہو۔ شروع شروع میں ہمیں کسی قدر غصہ آیا مگر واقعے کے مضحک پہلو کا احساس ہوا اور ہم نے اس کا پورا لطف اٹھایا لیکن رات بڑی بے لطفی سے کٹی۔ ریل کے تیسرے درجہ کے ڈبے کھچا کھچ بھرے تھے اور گاڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور شاید آدھی رات کو کہیں گاڑی بدلنا بھی پڑی، کچھ رات تو اس طرح گذری اور کچھ نابھے کی حوالات میں۔ ساری رات بلکہ دوسرے دن دوپہر تک (جب تک ہم نابھا جیل میں داخل نہ ہو گئے) ان مشترک ہتھکڑیوں اور زنجیروں نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔

ہم میں سے ہر شخص ایک دوسرے کی مدد کے بغیر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ساری رات اور آدھے دن دوسرے شخص کے ساتھ ہتھکڑی میں بندھا رہنا ایسا

تلخ تجربہ ہے کہ دوبارہ اس کا مزہ چکھنے کی ہوس نہیں۔

نابھا جیل میں ہم تینوں ایک نہایت ہی مکروہ اور گندی کوٹھڑی میں بند کر دئے گئے۔ یہ بہت چھوٹی اور مرطوب جگہ تھی اور چھت اتنی نیچی کہ ہم ہاتھ سے چھو سکتے تھے۔ رات کو ہم زمین ہی پر سوئے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی چوہا یا چوہیا میرے چہرے پر سے گزری اور میں سوتے سوتے یکایک خوف سے اچھل پڑا۔

دو تین دن ہم عدالت میں پیش کئے گئے اور وہاں ایک مدت تک کچھ عجیب و غریب مسخرے پن کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ مجسٹریٹ اور جج صاحب بالکل بے پڑھے معلوم ہوتے تھے۔ انگریزی تو وہ سرے سے جانتے ہی نہ تھے اور میرے خیال میں عدالتی زبان یعنی اردو لکھنے سے معذور تھے۔ ہم ہفتوں ان کے سامنے پیش ہوئے لیکن مقدمے کی سماعت کے دوران میں کبھی انہوں نے ایک حرف بھی نہ لکھا۔ جب کچھ لکھنا ہوتا تو وہ پیشکار سے لکھوا لیتے تھے۔ اس دوران میں ہم نے بہت سے معمول درخواستیں بھی دیں لیکن انہوں نے اس وقت ان پر کوئی حکم نہیں لکھا۔ وہ ہمیشہ انہیں رکھ لیتے۔ پھر دوسرے دن کسی اور سے حکم لکھوا کر لے آتے۔ ہم نے اپنے مقدمے کی باضابطہ پیروی نہیں کی۔ ترک موالات کے زمانے سے ہم مقدموں کی پیروی نہ کرنے کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ جب یہ جائز بھی رکھا جاتا تب بھی ہم اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ بہر حال میں نے عدالت میں ایک طویل بیان پیش کیا جس میں تمام واقعات پر روشنی ڈالی اور ریاست نابھا میں برطانیہ کے دور انتظام میں جو اندھیر مچا ہوا تھا اس پر کھلم کھلا تنقید کی۔

ہمارا مقدمہ اگرچہ معمولی سا مقدمہ تھا لیکن ایک مدت تک چلتا رہا۔ یکایک اس نے ایک پلٹا لیا اور ایک نئی صورت رونما ہوئی۔ ایک دن عدالت کے برخاست ہونے کے بعد ہم ایک دوسری عمارت میں روک کئے گئے پھر شام کی کوئی سات بجے ہمیں ایک کمرے میں لے گئے جہاں ایک شخص میز کرسی لگائے بیٹھا تھا اور چند اور

شخص بھی جمع تھے۔ ہمارے پرانے دوست وہ پولیس افسر صاحب بھی جنہوں نے ہیں جیتو میں گرفتار کیا تھا وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر ایک بیان دینا شروع کر دیا۔ ہم نے دریافت کیا کہ آخر معاملہ کیا ہے اور یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ اس پر ہمیں بتایا گیا کہ یہ عدالت کا اجلاس ہے او سازش کے جرم میں تم پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ یہ اس مقدمے سے بالکل جداگانہ کاروائی تھی جواب تک ہم پر چل رہا تھا اور جس میں ہم ریاست نابھا میں داخل نہ ہونے کے حکم کی خلاف ورزی میں ماخوذ تھے۔ شاید یہ خیال کیا گیا کہ اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا صرف ٦ ماہ ہے اور یہ ہمارے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کوئی زبردست الزام لگانا ضروری ہے۔ سازش کے لئے ٣ کی تعداد کافی نہ تھی اس لئے ایک چوتھا شخص جسے ہم سے قطعی کوئی واسطہ نہ تھا گرفتار کیا گیا اور ہمارے ساتھ مقدمے میں نتھی کر دیا گیا۔ ہم اس بدقسمت سکھ کو جانتے بھی نہ تھے۔ ہاں جب ہم جیتو آ رہے تھے تو اسے کھیتوں میں دیکھا ضرور تھا۔

ایک وکیل کی حیثیت سے یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ کس قدر آسانی سے بے تکلف سازش کا ایک مقدمہ کھڑا کر دیا گیا۔ الزام ازسرتاپا جھوٹا تھا۔ لیکن دکھاوے ہی کے لئے سہی کچھ نہ کچھ ضابطہ کی پابندی تو ضروری تھی۔ ہم نے جج صاحب سے کہا کہ ہمیں اس مقدمے کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی اور نہ اس کا موقع دیا گیا کہ ہم اپنی پیروی کا کوئی انتظام کر سکیں۔ لیکن اس معقول اعتراض سے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ نابھے کا یہی طریقہ ہے اگر تم وکیل کرنا چاہتے ہو تو یہیں سے کسی کو مقرر کر لو۔ جب میں نے کہا کہ شاید میں باہر سے کوئی وکیل بلانا مناسب سمجھوں، تو جواب ملا کہ نابھے کے قانون کی رو سے اس کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بعد ریاست کے عجیب عجیب قواعد و ضوابط کا ہمیں پتہ چلا اور ہم نے پریشان ہو کر جج سے یہ کہہ دیا کہ جو آپ کے جی میں آئے کیجئے، ہم اس مقدمے کی کاروائی میں کوئی حصہ نہیں لیں گے لیکن میں اس فیصلے پر برابر قائم نہ رہ سکا۔ ہمارے متعلق جو

بے سروپا جھوٹ تراشا جا رہا تھا اسے سننا اور چپ رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی ہم گواہوں کے متعلق مختصر مگر معقول رائے زنی کر دیتے تھے۔ ہم نے عدالت میں ایک بیان تحریری بھی داخل کیا جس میں تمام واقعات درج کر دئے۔ یہ دوسرے جج جو مقدمہ سازش کی ساعت کر رہے تھے پہلے جج سے زیادہ ذہین اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔

عرصے تک یہ دونوں مقدمے چلا کئے۔ ہم ان دونوں عدالتوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے کیونکہ اس طرح تھوڑی دیر کے لئے جیل کی گندی کوٹھڑی سے نجات مل جاتی تھی۔ اسی دوران میں منتظم ریاست کی جانب سے سپرنٹنڈنٹ جیل میرے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ معافی مانگ لیں اور اقرار کریں کہ فوراً نابھے سے چلے جائیں گے تو مقدمہ بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ میں نے جواب دیا کہ ہم کس بات کی معافی مانگیں۔ معافی تو ریاست کو مانگنا چاہیے کہ اس نے ہمارے ساتھ بدسلوکیاں کیں۔ اس کے علاوہ ہم کوئی اقرار کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

ہماری گرفتاری کے کوئی پندرہ دن بعد دونوں مقدمے ختم ہو گئے۔ یہ تمام وقت ثبوت فراہم کرنے میں صرف ہوا تھا اور ہم نے کوئی صفائی پیش نہیں کی تھی اس میں زیادہ عرصہ وقفوں میں گزرا کیونکہ جہاں کوئی دقت پیش آتی فوراً مقدمہ ملتوی کر دیا جاتا اور پس پردہ غالباً انگریز منتظم سے مشورے کئے جاتے۔ آخری روز جب ثبوت ختم ہو گیا تو ہم نے اپنے بیان تحریری داخل کر دئے۔ پہلی عدالت برخاست ہوئی اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ تھوڑی ہی دیر میں جج صاحب اردو لکھا ہوا ایک طول طویل فیصلہ لئے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبا چوڑا فیصلہ اس قلیل وقفہ میں نہیں لکھا جا سکتا تھا اور یہ ہمارے بیان داخل کرنے سے پہلے ہی تیار کرلیا گیا تھا۔ فیصلہ ہمیں پڑھ کر سنایا بھی نہیں گیا۔ صرف اتنا بتا دیا گیا کہ ریاست نابھے سے نکل جانے کا حکم کی خلاف ورزی میں تمہیں چھ مہینے کی سزا دی جاتی ہے۔

اس دن سازش کے مقدمے میں مجھے ڈیڑھ یا دو برس کی سزا ہوئی۔ صحیح مدت مجھے یاد نہیں ہے۔ یہ سزا پہلی ٦ مہینے کی سزا کے علاوہ تھی۔ گویا مجموعی طور پر ہمیں دو یا ڈھائی برس جیل میں گذارنے تھے۔

مقدمے کے دوران شروع سے آخر تک بہت سے دلچسپ واقعات ہوئے جن سے ہم پر ہندوستانی ریاستوں کے طرز حکومت کی، یا یوں کہئے کہ ریاستوں کی برطانوی حکومت کی حقیقت آشکارا ہوگئی۔ ساری کاروائی محض ایک ڈھونگ تھا شاید اسی وجہ سے اخباروں کے نامہ نگاروں یا باہر والوں کو عدالت میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پولیس من مانی کاروائی کرتی تھی۔ اکثر جج یا مجسٹریٹ کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو کھلم کھلا ان کے حکم عدولی کرتی تھی۔ بیچارہ مجسٹریٹ چپ چاپ اسے گوارا کرتا تھا۔ لیکن ہم ایسا کیوں کرتے اس ئے اکثر موقعوں پر میں کھڑا ہو جاتا اور اس پر زور دیتا کہ پولیس کو اپنا طرز عمل درست کرنا چاہیے اور مجسٹریٹ کا حکم ماننا چاہیے۔ بعض اوقات پولیس نہایت بے ہودہ طریقے سے ہاتھوں میں سے کاغذات چھین لیتی اور چونکہ عدالت کا نہ کوئی رعب تھا نہ وہ اس کی اہل تھی کہ کوئی حکم دے یا اپنے اجلاس میں امن وسکون قائم رکھ سکے اس لئے اس کا بہت کچھ کام ہمیں انجام دینا پڑتا تھا۔ بے چارہ مجسٹریٹ بڑی مشکل میں تھا۔ ایک طرف وہ پولیس سے خائف تھا۔ دوسری طرف ہم سے بھی کچھ سہا ہوا تھا کیونکہ ہماری گرفتاری پر ملک کے تمام اخباروں نے شور مچا رکھا تھا۔ جب ہمارے ساتھ جو سیاست میں ذرا نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہ کیفیت تھی تو بے چارے غیر معروف لوگوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا ہوگا؟

میرے والد ہندوستانی ریاستوں سے واقف تھے اس لئے نابھے میں میری غیر متوقع گرفتاری سے وہ سخت پریشان ہوگئے۔ انہیں بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس کیا آگے انہیں کوئی خبر نہ ملتی تھی۔ پریشانی میں انہوں نے

وائسرائے کو تار بھی دیا کہ میرے خیریت سے مطلع کیا جائے۔ شروع میں تو مجھ سے ملنے کے لئے ان کے نابھے آنے میں بھی روڑے اٹکائے گئے۔ آخر کار انہیں جیل خانے میں مجھ سے ملاقات کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ میری کیا مدد کر سکتے تھے کیونکہ میں مقدمے کی پیروی ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ الہ آباد واپس تشریف لے جائیں اور پریشان نہ ہوں وہ واپس تو چلے گئے لیکن ہمارے ایک ہمعصر نوجوان وکیل کپل دیو مالویہ کو نابھے میں چھوڑتے گئے تاکہ وہ مقدمے کی نگرانی کرتے رہیں۔ یقین ہے کہ نابھے کی عدالتوں کے اس مختصر سے تجربے سے کپل دیو کی قانون اور ضابطہ کی معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہوگا۔ پولیس نے کھلی عدالت میں ان کے ہاتھ سے بھی زبردستی چند کاغذات چھیننے کی کوشش کی تھی۔

ہندوستان کی اکثر ریاستیں اپنی پستی اور قدیم جاگیرداری طریقے کی وجہ سے بد نام ہیں۔ عموماً وہاں استبدادی حکومت ہے جس میں وہ شخصی قابلیت اور مروت بھی نہیں ہے جو ایسی حکومتوں میں کبھی کبھی ہوا کرتی ہے۔ اکثر وہاں عجیب عجیب واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ پھر بھی ان کی یہ نااہلی بعض وقت غنیمت ہوتی ہے اور بد نصیب رعایا کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں عملہ کمزور ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ظلم اور ناانصافی بھی کامیابی کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ اس سے ظلم کی شدت میں کمی نہیں ہوتی مگر اسکا دائرہ عمل محدود ہو جاتا ہے۔ مگر جو ب کوئی ریاست براہ راست برطانوی حکومت کی نگرانی میں آجاتی ہے تو یہ توزن بگڑ جاتا ہے اور عجیب و غریب صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جاگیرداری نظام بدستور قائم رہتا ہے۔ استبدادیت اسی طرح باقی رہتی ہے۔ پرانے قانون قاعدے ویسے ہی جاری رہیت ہیں اور انفرادی اور اجتمادی آزادی اور ہر طرح کے اظہار رائے پر وہی پابندیاں عاید رہتی ہیں۔ لیکن ایک تبدیلی ایسی ہو جاتی ہے جس

سے تمام پس منظر بدل جاتا ہے۔ یعنی عملہ زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور اس میں کسی حد تک اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان استبدادی بندشوں میں زیادہ سختی آجاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد برطانوی حکومت چند قدیم رسم و رواج اور قاعدے ضرور بدل دیتی ہے کیونکہ اچھی طرح حکمرانی کرنے میں اور تجارتی حیثیت سے حاوی ہونے میں یہ حارج ہوتے ہیں۔ لیکن شروع شروع میں رعایا پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے وہ ان سے پورا فائدہ اٹھاتی ہے اور اب غریب رعایا کو نہ صرف جاگیرداری نظام اور استبدادیت کے اصول گوارا کرنے پڑتے ہیں بلہ ایک مضبوط عملے کے ذریعے سے ان پر سختی سے عمل بھی ہونے لگتا ہے۔

میں نے نابھے میں ایک حد تک ان باتوں کا مشاہدہ کیا۔ ریاست ایک انگریز منتظم کی نگرانی میں تھی جو انڈین سول سروس کا رکن تھا۔ اسے مطلق العنان حکمراں کے پورے اختیارات حاصل تھے اور وہ صرف حکومت ہند کے ماتحت تھا۔ پھر بھی جب کبھی ہمیں معمولی سے معمولی حقوق دینے سے پہلو تہی کرنی ہوتی فوراً ریاست کے قانون قاعدوں کا حوالہ دیا جاتا۔ ہمیں قدیم جاگیرداری نظام اور جدید قسم کی استبدادی طرز حکومت دونوں کے ایک معجون مرکب سے واسطہ پڑا تھا۔ یعنی اس میں دونوں کی خرابیاں موجود تھیں اور دونوں کی خوبیاں مفقود تھیں۔

بہر حال ہمارا مقدمہ ختم ہو گیا اور ہمیں سزا ہو گئی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ فیصلے میں کیا لکھا تھا لیکن مجھ طویل سزا کی وجہ سے ہم پر اس کا رعب تھا۔ ہم نے فیصلوں کی نقل مانگی تو حکم ہوا کہ باضابطہ درخواست دو۔

اسی دن شام کے وقت جیل میں سپرنٹنڈنٹ نے ہمیں طلب کیا۔ اور ضابطہ فوجداری کے ماتحت منتظم کا ایک حکم دکھایا جس کی رو سے ہماری سزا ملتوی کر دی گئی۔ اس التوا کے ساتھ کوئی شرط نہ تھی۔ جس کے معنی یہ تھے کہ ہم قانونی طور پر بالکل آزاد تھے۔ اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ نے ایک دوسرا حکم پیش کیا جسے وہ عاملانہ حکم کہتے

تھے۔ یہ بھی انہیں منتظم صاحب نے جاری کیا تھا۔ اس کی رو سے ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہم فوراً نابھے سے نکل جائیں اور پھر کبھی بلا اجازت ریاست کے حدود میں داخل نہ ہوں۔ میں نے ان دونوں حکموں کی نقل مانگی لیکن سپرنٹنڈنٹ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہمیں ریلوے اسٹیشن پر لے جا کر رہا کر دیا گیا۔ ہم نابھے میں کسی سے واقف نہ تھے اس کے علاوہ ساری رات شہر کے پھاٹک بھی بند رکھے گئے۔ پھر ہمارے لئے باہر جانے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک ٹرین تھوڑی دیر میں انبالے جانے والی ہے چنانچہ ہم اسی میں بیٹھ گئے۔ انبالے سے میں دہلی سے پھر الہ آباد پہنچا۔

الہ آباد پہنچ کر میں نے منتظم کو خط لکھا اور ان سے دونوں فیصلوں اور دونوں حکام کی نقلیں بھیجنے کی درخواست کی تا کہ مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں کیا لکھا تھا۔ انہوں نے نقلیں دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے پھر انہیں لکھا کہ شاید میں اپیل دائر کروں لیکن وہ برابر انکار کرتے رہے۔ متواتر کوششوں کے باوجود مجھے آج تک ان فیصلوں کی زیارت نصیب نہیں ہوئی جن کی رو سے مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو دو ڈھائی سال کی سزا دی گئی تھی۔ ممکن ہے یہ سزا کے احکام آج بھی موجود ہوں وار جب برطانوی حکومت یا نابھے کے حکمراں چاہیں ان کو نافذ کر دیں۔

ہماری سزائیں اس طرح ملتوی کر کے ہم تینوں تو رہا کر دئے گئے لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ اس گھڑی ہوئی سازش کو چوتھے رکن کا کیا حشر ہوا یعنی اس بیچارے سکھ کا جو ہمارے ساتھ دوسرے مقدمے میں خواہ مخواہ نتھی کر دیا گیا تھا۔ غالباً وہ رہا نہیں ہوا۔ اس کے نہ کوئی قوت و اقتدار والے دوست تھے نہ پبلک کو اس سے کوئی ہمدردی تھی کہ اسے کوئی امداد پہنچتی۔ غرض اور بہت سے لوگوں کی طرح اس پر بھی ریاست کے قید خانے میں گمنامی کا پردہ پڑ گیا لیکن ہم نے اسے فراموش نہیں کیا۔ جو کچھ ہمارے امکان میں تھا وہ ہم نے کیا مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ گوردوارہ کمیٹی

نے اس کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ''کوما گٹا مارو'' کے ستم زدوں میں سے تھا اور بہت طویل عرصہ کے بعد حال ہی میں جیل سے باہر آیا تھا۔ پولیس کو ایسے آدمیوں کا باہر رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ چنانچہ اس نے ہمارے ساتھ اسے بھی پھانس لیا۔

گڈوانی سنتانم اور میں تینوں نابھے جیل کی کوٹھڑی سے ایک بلا اپنے ساتھ لائے یعنی معیادی بخار کے جراثیم۔ چنانچہ ہم تینوں معیادی بخار میں مبتلا ہو گئے مجھ پر بخار کا خاصا سخت حملہ تھا اور کچھ عرصے کے لئے خطرناک بھی ہو گیا تھا۔ لیکن ان دونوں کے مقابلے میں پھر بھی ہلکا تھا۔ میں تین چار ہفتے لوٹ پوٹ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن وہ دونوں تو ایک مدت تک سخت بیمار رہے۔

نابھے کے اس حادثے کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ اس کے کوئی چھ مہینے بعد گڈوانی کانگریس کے نمائندے بنا کر امرتسر بھیجے گئے تا کہ سکھ گوردوارہ کمیٹی کے حالات سے باخبر رہیں۔ کمیٹی نے جیتو کو پانچ سو آدمیوں کا ایک خاص جتھا روانہ کیا اور گڈوانی محض نگراں کی حیثیت سے نابھے کے حدود تک ان کے ساتھ گئے۔ ریاست میں داخل ہونے کا ان کا ارادہ نہ تھا۔ نابھے پہنچتے ہی جتھے پر گولیاں برسائی گئیں اور غالباً بہت سے شخص ہلاک اور زخمی ہوئے۔ گڈوانی زخمیوں کی مدد کو بڑھے لیکن ریاست کی حدود میں قدم رکھتے ہی پولیس ان پر جھپٹ پڑی۔ اور انہیں اٹھا کر لے گئی۔ عدالت میں ان کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ لیکن قریب قریب سال بھر تک وہ جیل خانے میں رکھے گئے۔ پھر جب ان کی صحت بالکل جواب دے گئی تو رہا کر دئے گئے۔

میرے نزدیک گڈوانی کی گرفتاری اور قید کے معاملے میں حاملانہ اختیارات کا نہایت ہی بے جا استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے منتظم کو (جواب بھی وہی انگریز آئی سی۔ ایس تھا) خط لکھا اور اس سے دریافت کیا کہ گڈوانی کے ساتھ آخر بدسلوکی کی

کیوں کی گئی۔انہوں نے جواب دیا کہ گڈوانی کو اس لئے قید کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہمارے پچھلے حکم کی خلاف ورزی کی اور اجازت لئے بغیر نابھے کے حدود میں داخل ہو گئے۔میں نے لکھا کہ آپ کا یہ طرز عمل قانونی حیثیت سے قطعی غلط ہے اس کے علاوہ جو شخص زخمیوں کو امداد پہنچانے آگے بڑھا ہو اس کا گرفتار کر لینا کہاں تک مناسب ہے۔میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ اپنے حکم کی نقل یا تو مجھے ارسال فرمائیے یا اخباروں میں شائع کر دیجئے۔لیکن انہوں نے ان دونوں باتوں سے انکار کر دیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں خود نابھے جاؤں اور منتظم صاحب کو موقع دوں کی انہوں نے گڈوانی سے جو سلوک کیا تھا وہی میرے ساتھ بھی کریں لیکن میرے بہت سے احباب نے اس کی مخالفت کی اور مجھے وہاں جانے سے باز رکھا۔ سچ پوچھئے تو میں نے ان دوستوں کو نصیحت کی آڑ لی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کا ایک بہانہ نکال لیا۔ کیونکہ حقیقت میں اپنی کمزوری اور نابھا جیل میں دوبارہ قدم رکھنے کے خوف ہی کی وجہ سے مجھے وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔اپنے ایک ساتھی کو اس طرح چھوڑ دینے پر میں ہمیشہ شرمندہ رہوں گا لیکن جیسا کہ ہم سب اکثر کرتے ہیں میں نے بھی شجاعت پر مصلحت کو ترجیح دی۔

کوکوناڈو، اور مولانا محمد علی

دسمبر ۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکوناڈا (دکن) میں ہوا۔ مولانا محمد علی صدر تھے۔ حسب عادت انہوں نے ایک بے حد طویل خطبہ صدارت پڑھا۔ لیکن تھا وہ دلچسپ۔ انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور فرقہ وارانہ احساسات کی نشوونما کا خاکہ کھینچا اور یہ دکھایا کہ ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں کا جو مشہور وفد آغا خاں کی سرکردگی میں وائسرائے کے پاس گیا تھا اور جس کے جواب میں حکومت نے جداگانہ انتخاب کی پہلے پہل سرکاری طور پر حمایت کی تھی وہ ایک فرمائشی سوانگ تھا اور حکومت کے اشارے سے ترتیب دیا گیا تھا۔

محمد علی نے میری مرضی کے خلاف مجھے مجبور کیا کہ ان کی صدارت کے دوران میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری کا عہدہ قبول کرلوں۔ ایسی حالت میں کہ ملک کے آئندہ پروگرام کے متعلق کوئی بات صاف طور پر میرے ذہن میں نہ تھی میں کوئی انتظامی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن محمد علی سے انکار نہ کرسکا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کوئی دوسرا شخص سیکرٹری مقرر ہوا تو شاید وہ نئے صدر کے ساتھ اس ہم آہنگی سے کام نہ کرسکے جس طرح میں کرسکتا تھا۔ جنہیں وہ پسند کرتے تھے۔ ہم میں الفت و محبت کے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان پر مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا جس میں میرے خیال میں عقلیت کی جھلک تک نہ تھی۔ میں اس معاملے میں اس کا بالکل برعکس تھا۔ مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت کا دلدادہ تھا۔ ان کی تیزی طبع کی کوئی حد نہ تھی لیکن بعض اوقات ان کے طنز کا وار بہت گہرا پڑتا تھا۔ اس کی وجہ سے کتنے دوست ان سے چھوٹ گئے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی چست فقرہ ان کے ذہن میں آئے اور وہ اسے بے کہے چھوڑ دیں۔ اس وقت انہیں اس کا ذرا خیال نہ آتا کہ نتیجہ کیا ہوگا؟

ان کی صدارت کے زمانے میں ہم دونوں میں اچھی طرح نبھی۔ اگرچہ معمولی اختلافات اکثر ہو جاتے تھے۔ میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں یہ طریقہ رائج کرنا چاہا کہ تمام اراکین کو القاب و آداب کے بغیر مخاطب کیا جائے۔ ہندوستان میں القاب کی بڑی کثرت ہے مثلاً مہاتما، مولانا، پنڈت، شیخ، سید، منشی، مولوی اور پھر مسٹر اور سکوائر۔ اب کچھ دن سے اس فہرست میں شریمت اور شری کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کا استعمال بے موقع اور بے ضرورت اس کثرت سے ہوتا ہے کہ میں انہیں مٹا کر ایک اچھی مثال قائم کرنا چاہتا تھا لیکن میری ایک بھی نہیں چلی۔ محمد علی نے مجھے ایک زور شور کا تار بھیجا جس میں صدر کی حیثیت سے یہ ہدایت کی تھی کہ پرانے دستور کو جاری رکھوں اور خصوصاً گاندھی جی کو ہمیشہ مہاتما کے لقب سے مخاطب کروں۔

ان میں اور مجھ میں خدا کے وجود کے بارے میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ محمد علی کو یہ عادت تھی کہ کانگریس کی قرارداد میں بھی کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً شکر کے طور پر یا دعا کے انداز میں۔ میں اس کے خلاف احتجاج کرتا تو وہ مجھ پر برس پڑتے اور میری بے دینی پر مجھے خوب ڈانٹتے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعد میں وہ ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ چاہے تم ظاہری طور پر کچھ بھی کرو لیکن دل سے تم مذہبی آدمی ہو۔ میں نے اکثر اس پر غور کیا کہ ان کے اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہے کہ مذہب اور مذہبی کا مفہوم کیا قرار دیا جاتا ہے۔

میں مذہبی بحث سے ہمیشہ بچتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح ہم دونوں کو غصہ آ جائے گا۔ اور ممکن ہے کہ میری کسی بات سے ان کو تکلیف پہنچے۔ ان لوگوں سے جو کسی عقیدے کے سختی سے پابند ہوں اس موضوع پر بحث کرنا ہمشہ دشوار ہوتا ہے خصوصاً مسلمانوں سے مذہب کے معاملے میں گفتگو کرنا غالباً دشوار تر ہے اس

لئے کہ ان کے مذہب میں آزادی رائے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے ان کا تو ایک سیدھا اور تنگ راستہ ہے جس سے مومن کو بال بھر بھی ادھر ادھر نہیں ہٹنا چاہیے۔ ہندو اس سے کچھ مختلف ہوئے ہیں اگر چہ ہمیشہ نہیں۔ چاہے عمل میں وہ کتنے ہی کٹر کیوں نہ ہوں۔ اور چاہے وہ کتنی ہی دقیانوسی۔ رجعت پسندانہ اور فاسد رسوم کی پابندیوں نہ ہوں، لیکن عام طور پر وہ مذہب کے متعلق سخت سے سخت انقلابی خیالات سننا اور ان پر گفتگو کرنا گوارا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی طرح وہ بھی ایک تنگ اور سیدھے راستے پر چلتے ہیں۔ ذی فہم ہندوؤں کے پاس کچھ فلسفیانہ روایات ایسی ہیں جن کا اثر ان کے اعمال پر تو نہیں پڑتا لیکن مذہبی مسائل پر عقلی نقطہ نظر سے بحث کرنے میں ضرور فرق ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت کتنی سخت ہے اور اس میں بقا کی کتنی زبردست قوت موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم ہندو فلسفی چاروک تھا) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں۔ ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں میرے نام سے پنڈت کا لقب کسی طرح جدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ میں انتہائی کوشش کرتا ہوں کہ میرے نام کے ساتھ یہ یا اسی قسم کا اور کوئی لقب استعمال نہ کیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ سوئزرلینڈ میں ایک مرتبہ ایک ترکی عالم سے ملنے گیا۔ ان کے پاس ایک تعارفی خط میں پہلے ہی بھیج دیا تھا اس خط میں میرا نام پنڈت جواہر لال نہرو لکھا ہوا تھا۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت متعجب

اور کچھ مایوس بھی ہوئے۔ کیونکہ پنڈت کے لقب سے وہ اس امید میں تھے کہ ان سے کوئی مقدس اور سن رسیدہ عالم ملنے آرہا ہے۔

مجھ سے اور محمد علی سے مذہبی بحثیں نہیں ہوتی تھیں لیکن ان میں خموشی کا وصف نہیں تھا۔ آخر چند سال بعد (غالباً ۱۹۲۵ء یا شروع ۱۹۲۶ء میں) ان کو یارائے ضبط نہ رہا اور ایک دن جب میں دہلی میں ان کے گھر ان سے ملنے گیا تو برس ہی پڑے۔ کہنے لگے کہ تم سے مذہب کے معاملے میں بحث کئے بغیر نہ مانوں گا۔ میں نے انہیں باز رکھنے کی ہزار کوشش کی اور ان کو لاکھ سمجھایا کہ میرے اور آپ کے نقطہ نظر میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے کہنے لگے کہ "یہ بحث تو آج ہوگی ضرور۔ تم سمجھتے ہو گئے کہ مجھے مذہبی جنون ہے لیکن میں آج یہ ثابت کر کے رہوں گا کہ مجھے جنون نہیں سچا جذبہ ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں مذہبی مسئل کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کر چکا ہوں اور مجھے ایک الماری دکھائی جس میں مختلف مذاہب خصوصاً اسلام اور عیسائیت پر کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں بعض جدید کتابیں ہی تھیں۔ مثلاً ایچ۔ جی۔ ویلس کی کتاب "خدا، نادید بادشاہ" جنگ کے زمانے میں جب ہوکئی سال نظر بند رہے تھے تو انہوں نے قرآن کو بار بار پڑھا تھا اور سب تفسیروں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ قرآن میں ۹۷ فیصد ایسی باتیں جو سراسر عقل کے مطابق ہیں اور قرآن سے الگ کر کے اپنی جگہ پر بھی انہیں ثابت کیا جا سکتا ہے۔ باقی ۳ فیصد باتوں کو اگر چہ عقل پہلی نظر میں تسلیم نہیں کرتی لیکن یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ جب قرآن کی ۹۷ فیصد باتوں کو اگر چہ عقل پہلی نظر میں تسلیم نہیں کرتی لیکن یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ جب قرآن کی ۹۷ فیصد باتیں یہی طور پر صحیح ہیں تو باقی ۳ فیصد بھی صحیح ہوں گی، بہ نسبت اس خیال کے کہ ہماری ناقص صحیح ہے اور قرآن غلط۔ اسطرح قرآن کے حق میں شہادت اتنی قوی تھی کہ وہ اسے سو فیصد صحیح تسلیم کرنے لگے۔

اس دلیل کی منطق اگرچہ واضح نہ تھی لیکن میں بحث سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کہا اس پر واقعہ مجھے بہت تعجب ہوا۔ کہنے لگے میرا ایمان ہے کہ جو کوئی بھی قرآن کے بے تعصب ہو کر تلاش حق کے خیال سے پڑھے گا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ باپو (گاندھی جی) نے قرآن کو غور سے پڑھا ہے اور وہ ضرور اسلام کی حقانیت کے قائل ہوں گے۔ لیکن محض خود بینی کی وجہ سے اس کا اعلان نہیں کر سکتے۔

اپنے زمانہ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں، کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔ یہ صورت بہت آہستہ آہستہ واقع ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی سال تک وہ کانگریس اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہوتے اور زور شور سے حصہ لیتے رہے۔ لیکن اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی اور بیگانگی برابر بڑھتی گئی۔ اس میں غالباً کسی فرد یا افراد کا قصور نہیں تھا۔ بلکہ ان حالات کا جو ملک میں رونما ہوئے یہ لازمی نتیجہ تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن اس افسوسناک نتیجے سے ہم میں سے بہتوں کو رنج ہوا۔ اس لئے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رہا ہو۔ سیاسی معاملے میں بہت کم اختلاف تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے وہ دل سے شیدائی تھے۔ اس بنا پر اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل پر بھی ان سے کوئی ایسا سمجھوتا اس بنا پر اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل پر بھی ان سے کوئی ایسا سمجھوتا ہو جاتا جو دونوں فریقوں کو پسند ہوتا۔ سیاسی حیثیت سے وہ ان رجعت پسندوں سے جو فرقہ وارانہ مفاد کے علمبردار بنتے ہیں کوسوں دور تھے۔

یہ ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ وہ ۱۹۲۸ء کی گرمیوں میں یورپ چلے گئے اس زمانے میں فرقہ وارانہ مسائل حل کرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی اور کامیابی کی امید ہو چلی تھی۔ اگر محمد علی اس وقت موجود ہوتے تو یقین ہے کہ حالات کچھ اور ہوتے

لیکن ان کے واپس آنے تک پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اور جب وہ نا چار انہیں مخالف گروہ کے ساتھ ہونا پڑا۔

دو برس بعد ۱۹۳۰ء میں جب سول نافرمانی پورے زور پر تھی اور ملک کے بیشمار آدمی قید میں پڑے تھے محمد علی کانگریس کے فیصلے کا کوئی پاس نہیں کیا اور گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مجھے ان کے جانے سے بہت دکھ ہوا۔ میرے خیال میں وہ خود اپنی شرکت سے خوش نہ تھے۔ ان کی لندن کی سرگرمیوں سے بھی میرے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہاں انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کی اصلہ جگہ آزادی کی جنگ میں تھی جو ہندوستان میں چھڑی ہوئی تھی نہ کہ اس بے نتیجہ کانفرنس کے اجلاس میں جو لندن میں ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے ملک کو واپس آ گئے ہوتے تو ضرور اس جنگ میں شریک ہو جاتے۔ ان کی صحت جواب دے چکی تھی اور کئی سال سے ان کی حالت بگڑتی جاتی تھی۔ لندن پہنچ کر انہیں یہ فکر چین نہیں لینے دیتی تھی کہ کچھ حاصل کرنا چاہیے اور کوئی معقول کام کرنا چاہیے۔ حالانکہ اس وقت انہیں علاج اور آرام کی سخت ضرورت تھی اسی فکر نے ان کی زندگی کا چراغ بہت جلد بجھا دیا۔ نینی جیل میں جب ان کی موت کی خبر پہنچی تو مجھے بہت سخت صدمہ پہنچا۔

ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس میں ہوئی تھی۔ میرے خطبہ صدارت کے بعض حصے ان کو پسند نہیں آئے اس لئے ان پر انہوں نے بڑی سختی سے اعتراض کیے۔ انہوں نے دیکھا کہ کانگریس آگے بڑھ رہی ہے اور اس کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ جارحانہ ہوتی جاتی ہیں۔ وہ خود جارحانہ طبیعت رکھتے تھے اس وجہ سے انہیں یہ بات پسند نہیں آتی تھی کہ وہ تو پچھلی صف میں بیٹھے رہیں اور کوئی دوسرا ان سے آگے نکل جائے۔ انہوں نے مجھے اس واقع پر یوں متنبہ کیا۔ ”جواہر! میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے موجودہ ساتھی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ جب نازک وقت آئے گا تو یہ لوگ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ اور تمہارے

اپنے کانگریسی تمہیں پھانسی کے تختے تک پہنچا دیں گے''۔ کیسی ہیبت ناک پیشین گوئی تھی!

کوکوناڈا کانگریس میں جو دسمبر ۱۹۲۳ء میں منعقد ہوئی تھی ۔ میری دلچسپی کا ایک خاص سامان بھی تھا۔ تمام ہندوستان کے رضا کاروں کی جماعت ''ہندوستانی سیوادل'' کی بنیاد وہیں رکھی گئی۔ انتظامی کام یا جیل جانے کے لئے رضا کاروں کی کمی پہلے بھی نہ تھی۔ لیکن اتحاد عمل و انضباط کی کمی ضرور تھی۔

ڈاکٹر ن۔ س۔ ہارڈیکر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ تمام ہندوستان کے رضا کاروں کی ایک ضابطہ اور منتظم جماعت قائم کی جائے اور اسے کانگریس کی ہدایات کے مطابق قومی کام کی تعلیم دی جائے۔ انہوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اس کام میں ان کی مدد کروں اور میں نے خوشی سے اسے منظور کرلیا۔ کیونکہ یہ خیال مجھے خود بہت پسند تھا۔ کوکوناڈا میں اس کام کی ابتدا ہوئی۔ بعد میں ہمیں یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ کانگریس کے بڑے رہنماؤں میں سے بہت سے حضرات سیوا دل کے مخالف تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ خطرناک بدعت ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کانگرس میں ایک فوجی عنصر کا اضافہ کیا جائے۔ ان کو یہ خوف تھا کہ کہیں یہ فوجی عنصر سول عنصر پر غالب نہ آجائے۔ دوسروں کا یہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ رضا کاروں کو صرف اتنی تربیت درکار ہے کہ اوپر سے انہیں جو حکم ملے اس کی بے چون و چرا تعمیل کریں۔ انہیں اس کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ قدم ملا کر چلنا سیکھیں۔ اس رائے کی تہ میں غالباً یہ خیال تھا کہ ایک ایسی جماعت کا وجود جسے صف بندی اور فوجی قواعد کی تعلیم دی گئی ہو، کانگرس کے عدم تشدد کی اصول کے منافی تھا۔ لیکن ہارڈیکر نے اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کردی اور سالہا سال کی ان تھک کوشش سے یہ ثابت کردکھایا کہ تربیت یافتہ رضا کار کتنے مستعد۔ کارآمد اور اسی کے ساتھ عدم تشدد کے پابند ہوسکتے ہیں۔

جنوری ۱۹۲۴ء میں کوکوناڈا سے واپسی کے بعد ہی الہ آباد میں مجھے ایک نئی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ میں اپنی یاداشت سے لکھ رہا ہوں۔ لیکن ممکن ہے تاریخوں میں گڑ بڑ ہو جائے، لیکن جہاں تک مجھے خیال ہے یہ کمبھ یا اردھ کمبھ کا زمانہ تھا جب الہ آباد میں گنگا کے کنارے اشنان کا زبردست میلہ ہوتا ہے۔ لاکھوں یاتری وہاں آتے ہیں اور گنگا جمنا کے سنگم پر اشنان کرتے ہیں اسے تربنی کہتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سرسوتی ندی جس کے افسانے مشہور ہیں زمین کے نیچے نیچے ان دونوں میں آملی ہے۔ یہاں گنگ کا پاٹ عموماً کوئی ایک میل چوڑا ہوتا ہے لیکن جاڑوں میں دریا سوکھ جاتا ہے اور بہت بڑا ریتلا میدان چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں یاتری اترا کرتے ہیں۔ اس حصے میں گنگا کی دھار بدلتی رہتی ہیں ۱۹۲۴ء میں گنگا کی دھار کچھ اس طرح واقع ہوئی تھی کہ یاتریوں کے لئے تربنی میں نہانا صریحاً خطرناک تھا اور اگر بعض احتیاطیں کرلی جاتیں اور ایک وقت میں اشنان کرنے والوں کی تعداد مقرر کی جاتی تو خطرے کے امکانات کم ہو سکتے تھے۔ مجھے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ میں ان مقدس ایام میں گنگا میں اشنان کر کے ثواب حاصل کرنے کا قائل نہ تھا لیکن میں نے اخباروں میں پڑھا کہ صوبے کی حکومت (یا مقامی حکومت) نے یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی شخص تربنی پر ہرگز نہ نہائے۔ اور اس معاملے میں پنڈت مدن موہن جی مالویہ اور حکومت کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا۔ مالویہ جی کو اس پر مذہبی نقطہ نظر سے اعتراض تھا کیونکہ اس تقریب کا سارا مقصد ہی ہے تھا کہ تربنی میں اشنان کیا جائے۔ حکومت بھی اپنی جگہ پر بالکل حق بجانب تھی کہ احتیاط کی تدابیر اختیار کرے تا کہ زیادہ حادثے نہ ہونے پائیں اور جانیں ضائع نہ ہوں۔ لیکن حسب معمول اس نے اپنا کام نہایت کھرے اور ناگوار طریقے سے شروع کیا۔

خاص کمبھ کے دن میں صبح صبح اٹھ کر میلہ دیکھنے کے لئے سنگم پر گیا۔ نہانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ گھاٹ پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ مالوی جی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

کو کوئی مہذب قسم کا الٹی میٹم بھیجا تھا۔ یعنی ان سے تربینی میں اشنان کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ مالویہ جی بہت برہم تھے اور ساری فضا پر جوش چھایا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ نے اجازت دینے سے انکار کردیا۔ اس پر مولوی جی نے سیتا گرہ کرنا طلے کر لیا اور کوئی دوسو آدمیوں کو ساتھ لے کر سنگم پر روانہ ہوئے۔ مجھے اس قسم کے واقعات سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ وقت کے وقت میں بھی سیتا گرہیوں میں شامل ہوگیا۔ سنگم کے قریب ریتلے میدان میں لکڑیوں کا ایک زبردست کھڑا بنا دیا گیا تھا تاکہ لوگ تربینی تک نہ پہنچ سکیں۔ جب ہم اس اونچے کٹھرے کے قریب پہنچے تو پولیس نے ہمیں روک دیا اور ہمارے پاس جو سیڑھی تھی اسے چھین لیا۔ چونکہ ہم عدم تشدد کے ماننے والے ستیا گرہی تھے اس لئے ہم کٹھرے کے پاس ہی ریت پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم وہاں صبح سے سہ پہر تک برابر بیٹھے رہے۔ دن چڑھتا جاتا تھا۔ دھوپ تیز ہوتی جاتی تھی۔ ریت گرم ہونے لگی اور ہم سب کو بھوک بھی لگنے لگی۔ پیدل اور سوار پولیس ہمارے دونوں طرف، پرے جمائے کھڑی تھی۔ شاید باضابطہ فوج بھی وہاں موجود تھی۔ اب ہم میں سے اکثروں کو صبر کا یارا نہ رہا اور سوچنے لگے کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ حکما بھی بے چین ہو رہے تھے اس لئے انہوں نے طے کیا کہ پیش قدمی کرنا چاہیے۔ سواروں کو کچھ حکم دیا گیا۔ چنانچہ وہ گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ مجھے یہ خیال پیدا ہوا (نہ جانے صحیح تھا یا غلط) کہ وہ ہم پر حملہ کرنے والے ہیں اور اس طرح ہمیں مار کر بھگانا چاہتے ہیں۔ سواروں کے ہاتھوں یوں رگید اجانا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا اس کے علاوہ میں بیٹھے بیٹھے بھی اکتا گیا تھا۔ اس لئے جو میرے پاس بیٹھے تھے ان سے میں نے یہ کہا کہ اب کھڑے پر چڑھائی کرنا چاہیے۔ یہ کہہ کر میں یکا یک اس پر چڑھ گیا۔ فوراً ہی بیسیوں آدمی اس پر چڑھنے لگے۔ بعض نے اس میں سے چند لکڑیاں کھینچ کر پھینک دیں۔ بس پھر راستہ بن گیا کسی نے میرے ہاتھ میں ایک قومی جھنڈا دے دیا۔ میں نے اسے

کٹہرے کے ار پر لگا دیا اور خود وہیں بیٹھا رہا۔ میں اس وقت بڑے جوش میں تھا اور یہ دیکھ دیکھ کر مجھے ایک خاص لطف آ رہا تھا کہ لوگ کٹہرے پر چڑھ رہے ہیں۔ اسے پھاند پھاند کر آگے بڑھ رہے ہیں اور سوار پولیس انہیں دھکے دے دے کر پیچھے ہٹا رہی ہے۔ یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سواروں نے اپنا کام حتی الامکان اس طرح انجام دیا کہ کسی کے چوٹ نہ آنے پائے۔ وہ اپنے لکڑی کے ڈنڈے چاروں طرف گھماتے تھے۔ لوگوں کو ان سے دھکے دیتے تھے لیکن مارتے نہیں تھے۔ اس وقت انقلابی محاصروں کا ایک دھندلا سا خاکہ میری نظروں کے سامنے کھنچ گیا۔

آخر کار میں بھی دوسری طرف کود گا اور چونکہ سخت تگ و دو کی وجہ سے مجھے بڑی گرمی لگ رہی تھی اس لئے میں نے بڑھ کر گنگا میں ایک غوطہ لگا لیا۔ جب میں واپس آیا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ مالویہ جی اور بہت سے دوسرے ستیا گرہی اب بھی وہیں بیٹھے ہیں۔ لیکن اب سوار اور پیدل پولیس کاندھے سے کاندھا ملائے ستیا گرہوں اور کٹہرے کے درمیان کھڑی تھی اس لئے میں ذرا چکر کاٹ کر گیا اور مالویہ جی کے پاس پھر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مالویہ جی پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ کسی زبردست اندرونی جذبے پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یکایک بغیر کسی سے کچھ کہے سنے پولیس والوں اور گھوڑوں کے بیچ سے عجیب و غریب طریقے سے کود کر نکل گئے۔ کوئی بھی اس طرح جست لگاتا تو دیکھ کر تعجب ہوتا۔ لیکن مالویہ جی جیسے بوڑھے اور نحیف الجثہ شخص کے لئے یہ پھرتی اور بھی حیرت انگیز تھی۔ غرض ہم سب ان کے پیچھے پیچھے چلے اور سب نے اس طرح کود کود کر نکلنا شروع کیا۔ پیدل اور سوار پولیس نے کچھ دیر تو ہمیں روکنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد چپ ہو رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہاں سے ہٹا لی گئی۔

ہمیں کچھ کچھ خیال تھا کہ حکومت ہم پر مقدمہ چلائے گی لیکن اس قسم کی کوئی

کاروائی نہیں کی گئی۔ غالباً حکومت مالویہ جی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرنا چاہتی
تھی اس لئے ان کے طفیل میں چھوٹے لوگ بھی صاف بچ گئے۔

میرے والد اور گاندھی جی

۱۹۲۴ء کے آغاز میں یکا یک یہ خبر ملی کہ گاندھی جی جیل میں سخت بیمار ہیں اس کے بعد وہ اسپتال میں منتقل کر دئے گئے اور وہاں ان کا آپریشن ہوا۔ سارے ملک میں انتہائی تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ سب سناٹے میں تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے بہر حال یہ نازک وقت گذر گیا اور ملک کے گوشہ گوشہ سے جوق در جوق لوگ انہیں دیکھنے کے لئے پونا جانے لگے۔ ابھی وہ زیر حراست قیدی کی حیثیت سے اسپتال ہی میں تھے لیکن دوستوں کی ایک مقررہ تعداد سے انہیں ملنے کی اجازت تھی چنانچہ والد اور میں بھی ان سے اسپتال میں ملنے گئے۔

وہ اسپتال سے پھر جیل خانے نہیں بھیجے گئے۔ جب وہ ذرا رو بہ صحت ہوئے تو حکومت نے ان کی باقی سزا معاف کر دی اور انہیں رہا کر دیا۔ وہ چھ سال میں سے دو سال کی سزا پوری کر چکے تھے۔ بمبئی کے قریب ساحل سمندر پر ایک مقام جوہو ہے۔ رہائی کے بعد وہ بحالی صحت کے لئے وہاں چلے گئے۔

ہمارا خاندان بھی جوہو گیا اور وہاں سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی کٹی میں ٹھہر گیا۔ ہم کئی ہفتے وہاں رہے اور ایک عرصے کے بعد مجھے دل بھر کر تفریح کا موقع ملا۔ میں بے تکلف سمندر میں تیرتا تھا۔ ساحل پر دوڑتا تھا اور گھوڑے کی سواری کرتا تھا۔ لیکن ہمارے وہاں جانے کا اصل مقصد تفریح نہ تھا۔ بلکہ ہم گاندھی جی سے گفتگو کرنے لے لئے وہاں گئے تھے۔ والد یہ چاہتے تھے کہ ان کے سامنے سوراجیوں کا نقطہ نظر پیش کریں اور اگر عملی امداد نہیں تو کم سے کم ان کا خاموش تعاون ہی حاصل ہو جائے۔ میں بھی ان مسائل پر جو دن رات میرے لیے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے ان سے گفتگو کرکے تسکین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اصل میں مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ آئندہ ان کا عملی پروگرام کیا ہوگا۔

جوہو کے بحث مباحثے میں سوراجی گاندھی جی کی تائید حاصل کرنے میں

کامیاب نہیں ہوئے اور نہ انہیں ذرا بھی متاثر کر سکے۔ بات چیت بہت دوستانہ طریقے سے ہوئی اور ایک دوسرے سے بہت اخلاق سے پیش آئے لیکن اس کے باوجود حقیقت میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ دونوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہم ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو سکتے چنانچہ اخباروں میں اسی مضمون کے اعلان شائع کر دیئے گئے۔

میں بھی جوہو سے کچھ مایوس لوٹا۔ کیونکہ گاندھی جی میرے شبہات کو بھی رفع نہیں کر سکے۔ حسب عادت انہوں نے آئندہ کی فکر میں سر کھپانے سے یا ایک طویل عرصے کے لئے کوئی پروگرام بنانے سے انکار کر دیا۔ ان کا قول تھا کہ ہمیں نہایت استقلال کے ساتھ قوم کی خدمت کرتے رہنا چاہیے اور کانگرس کی تعمیری اور اصلاحی پروگرام پر عمل کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ جارحانہ کاروائی کا وقت آ جائے لیکن میرے دل میں اصلی شبہ یہ تھا کہ فرض کیجئے وہ وقت آ بھی جائے تو کیا چورا چوری کا سا کوئی واقعہ پیش نہ آئے گا جو ہماری تمام امیدوں پر پانی پھیر دے اور دوبارہ ہماری تحریک کو روک دے؟ اس نے سوال کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن میں کوئی واضح او معین منزل مقصود نہیں تھی لیکن ہم میں سے اکثر لوگ یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ آخر ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ہمیں اس پر اصرار نہیں تھا کہ آیا کانگرس مکمل آزادی اور کسی حد تک سماجی انقلاب کی حامی ہے یا ہمارے رہنما اس سے بہت کم پر راضی ہو جائیں گے؟ ابھی چند مہینے پہلے میں نے صوبہ متحدہ کی کانفرنس ۲۳ء کے موسم خزاں میں ہوئی تھی۔ یعنی نابھے سے میری واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد۔ ان دونوں میں اس مرض میں مبتلا تھا جو نابھے سے تحفے کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں کانفرنس میں شریک تو نہیں ہو سکا لیکن میرا خطبہ صدارت وہاں پڑھ کر سنا دیا گیا جو میں نے تیز بخار میں لیٹے لیٹے لکھا تھا۔

ایک طرف تو ہم کانگرس میں مکمل آزادی کے مسئلے کو صاف کرنا چاہتے تھے ور

دوسری طرف ہمارے لبرل دوست ہم سے اتنے دور ہوتے جاتے تھے۔ (یا یوں کہیئے کہ ہم انہیں اتنا پیچھے چھوڑتے جاتے تھے) کہ وہ کھلم کھلا سلطنت برطانیہ کے جاہ وحشم پر اتراتے تھے۔ حالانکہ سلطنت ہمارے ہموطنوں کی طرح رکھتی تھیں یا انہیں گھسنے تک نہیں دیتی تھیں۔ مسٹر شاستری سفیر بن بیٹھے تھے۔ اور سرتیج بہادر سپرو نے ۱۹۲۳ء کی امپریل کانفرنس (لندن) میں بڑے فخر سے یہ اعلان کیا تھا کہ "مجھے اس بات پر ناز ہے کہ آج میرا ہی ملک سلطنت کو سلطنت بنائے ہوئے ہے۔"

غرض ہمارے اور ان لبرل لیڈروں کے درمیان کوئی معمولی خلیج نہیں بلکہ زبردست سمندر حائل تھا۔ ہم ایک دوسرے سے مختلف دنیا میں بستے تھے مختلف زبانیں بولتے تھے اور مختلف قسم کے خواب دیکھتے تھے (مجھے اسی میں شک ہے کہ وہ کوئی خواب دیکھتے بھی تھے) اس لئے کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ ہماری منزل مقصود واضح اور معین ہو جاتی ؟ لیکن یہ خیالات اس وقت معدودے چند اشخاص تک محدود تھے تعین اکثر حضرات کو پسند نہیں ہوتا۔ خصوصاً قومی تحریک میں جو فطرتاً مبہم اور تھوڑی بہت پر اسرار ہوتی ہے۔

۱۹۲۴ء کے آغاز میں پبلک کی توجہ زیادہ تر ان سوراجیوں کی طرف تھی جو اسمبلی اور کونسلوں میں گئے تھے۔ لوگ انتظار میں تھے کہ دیکھیں یہ جماعت "گھر میں گھس کر مخالفت کرنے" اور کونسلوں کو توڑنے کے لمبے چوڑے دعوں کے بعد وہاں کیا کرتی ہے۔ بہرحال شروع شروع میں سوارجیوں نے دو چار اثر ڈالنے والے کام کیئے۔ اسمبلی نے سال آئندہ کا بجٹ نامنظور کر دیا۔ اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ طے کرنے کے لیے گول میز کانفرنس کے مطالبے کی قرارداد منظور کی۔ بنگال کونسل نے بھی دیش بندھو کی رہبری میں سرکاری اخراجات کے مطالبے کو ٹھکرا دیا لیکن اسمبلی اور صوبوں کی کونسلوں دونوں میں وائسرائے یا گورنر نے ان نامنظور شدہ بجٹوں پر اپنی منظوری صادر فرما دی اور یہ حسب معمول نافذ ہو گئے۔ کونسلوں میں کچھ زوردار

تقریریں ہوئیں، کچھ جوش و خروش کا مظاہرہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے لئے سوراجیوں کو اپنی فتح کا نشہ ہو گیا۔ اور اخباروں میں موٹی موٹی سرخیوں سے مضمون نکلے لیکن اس کے آگے اور کچھ نہ تھا۔ اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے تھے، سوا اس کے کہ وہ انہیں ترکیبوں کو بار بار دہراتے۔ مگر اب ان میں کوئی جدت نہیں رہی تھی۔ لوگوں کو جوش و خروش ختم ہو گیا اور وہ اس کے عادی ہو گئے کہ وائسرائے یا گورنر نے نامنظور بجٹ یا قانون کو منظور کر کے نافذ کر دیا۔ اس کے آگے جو قدم اٹھایا جا سکتا تھا وہ کونسلوں کے اندر سوراجیوں کے امکان سے باہر تھا۔ وہ تو صرف ایوان کونسل کے باہر ہی ممکن تھا۔

اسی سال وسط ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک جلسہ احمد آباد میں ہوا۔ اس جلسے میں گاندھی جی اور سوراجیوں کے درمیان خلاف توقع ایک تیز جھڑپ ہو گئی۔ اور عجیب تماشے ہوئے۔ ابتدا گاندھی جی نے کی۔ انہوں نے کانگرس کے دستور میں بعض بنیادی تبدیلیوں کی تجویز پیش کی جس سے رکنیت کے قواعد اور رائے دہندگی کی نوعیت بدل گئی۔ اب تک جو شخص کانگرس کے آئین کی پہلی دفعہ کو تسلیم کرتا تھا۔ (یعنی سوراج کا مسلک اور پر امن ذرائع سے اس کا حاصل کرنا) اور چار آنے سالانہ ادا کرتا تھا وہ کانگرس کا رکن بن سکتا تھا۔ اب وہ رکنیت ان لوگوں تک محدود کر دینا چاہتے تھے۔ جو چار آنے کے بجائے اپنے ہاتھ کے کتے ہوئے سوت کی ایک مقررہ مقدار داخل کریں۔ اس تجویز سے حق رائے دہی پر زبردست اثر پڑتا تھا۔ اس لئے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ اس مسئلے کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر دستور کے الفاظ یا اس کے ظاہری شکل کبھی گاندھی جی کے راستے میں حائل ہوتی تھی تو اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ میں اسے کانگرس کے دستور کی توہین سمجھتا تھا اس لئے مجھے گاندھی جی کے اس طرز عمل سے سخت صدمہ ہوا اور میں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے سکرٹری کے عہدے سے استعفٰی پیش کر دیا۔ اس کے بعد بعض نئی صورتیں پیدا ہو گئیں اور میں نے اپنے استعفے پر اصرار نہیں کیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے

جلسے میں میرے والد اور مسٹر سی۔آر۔ داس نے اس تجویز کی بڑی شدومد سے مخالفت کی۔ اور بالآخر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کی غرض سے وہ اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت رائے شماری سے پہلے جلسے سے اٹھ کر چلے گئے۔ پھر بھی وہ اپنے بہت سے مخالف جلسے میں بیٹھے رہے۔ یہ تجویز اکثریت سے منظور ہوگئی۔ لیکن آخر کار واپس لے لی گئی۔ کیونکہ گاندھی جی پر سوارجیوں کے اٹھ کر چلے جانے کا اور اس مسئلے پر دیش بندھو اور والد کے سخت رویہ کا بے حد اثر ہوا۔ ان کے جذبات میں سخت ہیجان تھا۔ کسی رکن نے اتفاقاً کوئی ایسا فقرہ کہہ دیا جس سے وہ پھوٹ پڑے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں روحانی تکلیف پہنچی ہے۔ انہوں نے کمیٹی کے سامنے بڑے رقت انگیز انداز میں تقریر کی۔ جس سے اکثر اراکین کے آنسو نکل آئے۔ یہ بڑا غیر معمولی اور دل ہلا دینے والا سماں تھا (۱)

معلوم نہیں کہ وہ صرف سوت کاتنے کو رائے دہندگی کی شرط قرار دینے پر اتنے کیوں مصر تھے۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ اس کی سخت مخالفت ہوگی۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ کانگرس میں صرف وہ لوگ رہیں جو ان کے کھادی وغیرہ کے تعمیری پروگرام کے حامی ہوں۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ دوسرے یا تو اس کے قائل ہو جائیں یا نکل جائیں لیکن اگرچہ انہیں اکثریت حاصل تھی پھر بھی وہ اپنے ارادے میں نرم پڑ گئے۔ اور فریق ثانی سے سمجھوتا کرنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی کہ آئندہ دو تین ماہ میں انہوں نے اس مسئلے میں کتنے پلٹے کھائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود چکر میں ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں ہیں اور کدھر جانا چاہتے ہیں۔ کم سے کم ان کی نسبت مجھے یہ توقع نہ تھی کہ ان کی بھی ایسی حالت ہوسکتی ہے۔ میرے تعجب کی بس یہی وجہ تھی ورنہ خود یہ مسئلہ کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ خیال اپنی جگہ پر بہت مناسب تھا کہ جسمانی محنت رائے دہندگی کی شرط قرار دی جائے لیکن اس محدود شکل میں اسے پیش کرنے سے اس کا سارا مفہوم ہی خبط ہو جاتا تھا۔

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گاندھی جی کو ان مشکلات کا سامنا محض اس لئے ہے کہ وہ نامانوس میدان سے گزر رہے ہیں۔ ستیاگرہ کی عملی جدوجہد کے نشیب و فراز سے وہ خوب واقف ہیں اس لئے خودبخود ان کا قدم بالکل صحیح پڑتا ہے۔ وہ سماجی اصلاح کے لئے عوام میں نہایت خاموشی سے خود کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ خالص جنگ یا خالص صلح کے قائل تھے۔ کسی درمیانی چیز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے سوراجیوں کے اس پروگرام سے کہ کونسلوں کے اندر جا کر حکومتِ کو پریشان کریں انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص کونسلوں میں جانا چاہتا ہے تو وہ اس مقصد سے جائے کہ حکومت کے ساتھ تعاون کر کے اچھے اچھے قوانین بنوائے گا۔ اسے زیادہ آئینی طریقے سے حکومت کرنے پر مجبور کرے گا، وغیرہ وغیرہ، لیکن مخالفت کے خیال سے وہاں جانے کے کوئی معنی نہیں ہیں اور اگر مخالفت کرنا ہے تو اسے کونسلوں کے باہر رہنا چاہیے۔ سوراجی ان دونوں حالتوں کے بین بین تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی کے اور ان کے تعلقات میں گتھیاں پڑ گئی تھیں۔

آخر کار انہوں نے لوگوں کے ساتھ تصفیہ کر لیا۔ سوت کاتنے کی شرط اختیاری قرار دے دی گئی اور چار آنے ادا کر کے ممبر بننے کا اصول بھی قائم رہا۔ کونسلوں میں سوراجیوں کے کام کو گاندھی جی نے آشیرباد بھی دی، لیکن جہاں تک ان کی ذات کا تعلق تھا وہ قطعاً علیحدہ رہے۔ لوگ یہ کہنے لگے کہ وہ سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اور حکومت اور اس کے عمال نے یہ سمجھ لیا کہ ان کی ہردلعزیزی کم ہو گئی اور ان کی قوت ختم ہو چکی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ داس اور نہرو نے انہیں میدان میں نکال دیا۔ اور اب سیاسیات میں انہیں دونوں کا سکہ چلتا ہے۔ گذشتہ پندرہ برس میں کم و بیش انہیں خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے اور ہر مرتبہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارے حکمران ہندوستانیوں کے جذبات سے کس قدر ناآشنا ہیں۔ حقیقت یہ ہے

کہ جب سے گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئے ہیں جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں آئی بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے اور یہ ترقی اب بھی جاری ہے۔ لوگ چاہے ان کے حکم کی تعمیل نہ کریں کیونکہ انسان فطرتاً کمزور ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل مہاتما کی عقیدت سے معمور ہیں۔ جب حالات موافق ہوتے ہیں تو لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور زبردست تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں ورنہ خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی رہنما کسی عام تحریک کو جادو کے ذریعے وجود میں نہیں لاتا۔ بلکہ جب موزوں حالات پیدا ہو جاتے ہیں تو ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ان حالات کے لئے لوگوں کو تیار کر سکتا ہے۔ حالات کو پیدا نہیں کر سکتا۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں ان کا اثر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ جب تحریک کا زور ہوتا ہے تو یہ لوگ ان کی پیروی کرنے لگتے ہیں، جب وہ سست پڑ جاتی ہے تو نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی ان کی جو عظمت لوگوں کے دلوں میں ہے اس میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی دوسرا موثر پروگرام موجود نہیں ہے۔ لبرل اور ان ہی کی طرح کی دوسری جماعتیں، مثلاً جوابی تعاون کے حامی، کسی شمار میں نہیں ہیں۔ تخویف پسند جدید تہذیب میں ٹکسال باہر ہیں۔ اور ان کو کوئی اثر نہیں ہے۔ اشتراکی پروگرام ابھی اچھی طرح روشناس نہیں ہوا ہے اور کانگرس کے اونچے طبقے کے اراکین اس سے ڈرتے ہیں۔

۱۹۲۴ء کے وسط میں معمولی سے سیاسی اختلاف کے بعد گاندھی جی اور والد کے درمیان قدیم مراسم بھی پھر قائم ہو گئے بلکہ ان میں اور زیادہ خلوص پیدا ہو گیا۔ چاہے ان میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہوتا، لیکن ایک دوسرے کا غیر معمولی لحاظ کرتے اور حفظ مراتب میں کبھی فرق نہ آنے پاتا۔ آخر گاندھی جی میں وہ کون سی بات تھی جس کی وہ اتنی عزت کرتے تھے؟ گاندھی جی کی تحریروں کا ایک انتخاب"

خیالات کے دھارے“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ والد نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ یہ مقدمہ اس معاملے میں ان کے خیالات کا آئینہ ہے۔

وہ تحریر فرماتے ہیں ”میں نے مہاتماؤں اور مافوق الفطرت انسانوں کے تذکرے سنے ہیں۔ لیکن کبھی ان کی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ اس لئے مجھے ان کے وجود میں شک ہے۔ میں تو انسانوں اور انسانی باتوں کا قائل ہوں۔ یہ خیالات کے دھارے‘ جو اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں۔ ایک انسان کی فکر کا نتیجہ اور انسانی باتیں ہیں۔ وہ انسانی فطرت کی وہ زبردست خصوصیات کے مظہر ہیں یعنی عقیدہ اور طاقت ـــــ

جو شخص نہ عقیہد رکھتا ہے اور نہ طاقت، یہ سوال کرتا ہے کہ آخر ان سب باتوں کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ جواب کہ ”فتح یا موت“ اسے مطمئن نہیں کر سکتا ـــ لیکن ایک عاجز اور مسکین شخص غیر متزلزل عقیدے اور غیر مفتوح طاقت کی بنیادوں پر قدم جمائے سیدھا کھڑا ہے اور اپنے ہموطنوں کو مادر وطن کی خاطر قربانی کرنے اور مصیبتیں جھیلنے کا پیغام دے رہا ہے۔ اور یہ پیغام لاکھوں کروڑوں دلوں پر اثر کر رہا ہے ـــــ

اس کے بعد انہوں نے سوئن برن کے ایک مصرعہ پر اپنے مقدمے کے ختم کیا ہے۔

”کیا ہم میں شاہانہ آن بان کے لوگ نہیں،

جو دنیا کی چیزوں پر اپنا سکہ بٹھا دیتے ہیں۔“

یعنی وہ اس چیز پر زور دینا چاہتے ہیں کہ وہ ولی یا مہاتما کی حیثیت سے نہیں بلکہ انسان کی حیثیت سے گاندھی جی کے قائل ہیں۔ وہ خود بہت قوی اور محکم ارادہ رکھتے تھے اس لئے گاندھی جی کے عزم واستقلال کی بھی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس دبلے پتلے کمزور شخص میں فولاد کی سی قوت اور پہاڑ کا ثبات موجود ہے اور وہ

دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہیں جھکتا۔ اگرچہ گاندھی جی شکل سے کم رو معلوم ہوتے ہیں اور ان کا لباس ایک لنگوٹی سے زیادہ نہیں لیکن ان میں ایک شاہانہ رعب و جلال موجود ہے جس کی وجہ سے لوگ خود بخود ان کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر عجز و انکسار کرتے ہیں لیکن وہ زبردست قوت و اقتدار کے مالک ہیں اور نہیں خود اس کا احساس ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایسے تحکم کے انداز سے حکم دیتے ہیں کہ جو ان کی زبان سے نکلے سب کو ان کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ان کی پرسکون اور گہری نظریں لوگوں کو مسحور کر لیتی ہیں اور چپکے چپکے ان کے نفس کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں۔ ان کی صاف اور واضح آواز سننے والوں کے دل میں سما جاتی ہے اور اس کے جذبات پر اثر ڈالتی ہے۔ چاہے ان کا مخاطب ایک فرد ہو یا ہزاروں افراد، ان کا جادو سب سے برابر چلتا ہے اور اس جذبے کو عقل سے بہت کم تعلق ہے۔ گو وہ اس چیز کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ اپنی ابت عقلی طور پر لوگوں سے منوالیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل اور دلیل کو ان کے یہاں ثانوی حیثیت حاصل ہے انہوں نے تسخیر" کا یہ عمل خطابت کے جادو یا دلکش لفظوں کے افسوں کے ذریعے سے نہیں کیا ہے۔ ان کی زبان تو بالکل سیدھی سادی ہوتی ہے اور شاید وہ ایک لفظ بھی بے محل اور بے ضرورت استعمال نہیں کرتے۔ اصل میں ان کے انتہائی خلوص اور ان کی زبردست شخصیت نے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کے اندر قوتوں کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ شاید اس کی یہ بھی وجہ ہو کہ ان کے متعلق کچھ ایسی روایات قائم ہو گئی ہیں جنہوں نے ایک موثر فضا پیدا کر دی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک اجنبی شخص پر جو ان روایات سے واقف نہ ہو اور اس فضا سے ہم آہنگ نہ ہو، اس عمل تسخیر کا اتنا اثر نہ ہو۔ پھر بھی گاندھی جی کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اپنے مخالف کو اپنی طرف کر لیتے ہیں یا کم سے کم اس کے جوش مخالفت کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔

گاندھی جی حسن فطرت کے شیدا ہیں لیکن انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کے حسن اور کاریگری کی انہیں بہت کم حس ہے۔ مثلاً تاج محل کو مزدوروں کے بیگار کی یادگار سمجھتے ہیں۔ ان کی قوت شامہ بھی بہت کمزور ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق فن زندگی کے اصول معلوم کر لئے اور بحیثیت مجموعی اپنی زندگی میں ایک خاص حسن پیدا کر لیا۔ ان کے ہر ادا میں ایک معنویت اور لطافت ہے۔ ایک نغمہ بھی خارج از آہنگ نہیں۔ ان میں وہ ناہمواری اور ناتراشی، وہ سوقیانہ پن اور عامیانہ پن نام کو بھی نہیں جو بدقسمتی سے ہمارے اوسط طبقے میں بہت عام ہے۔ انہیں اطمینان قلب کی دولت حاصل ہے۔ وہ اسے دوسروں کو بانٹتے ہوئے زندگی کی دشوار گذار راستوں پر ہمت اور مضبوطی سے قدم رکھتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

میرے والد ان سے کس قدر مختلف تھے لیکن وہ زبردست شخصیت کے مالک تھے اور ان میں بھی ایک حد تک وہی شاہانہ انداز موجود تھا۔ انہوں نے سون برن کا جو شعر گاندھی جی کے متعلق لکھا ہے وہ خود ان پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ جس مجلس میں بھی بیٹھ جاتے سب سے سربلند اور ممتاز نظر آتے۔ جس محفل میں موجود ہوتے، بقول ایک مشہور انگریز جج کے، اسکے صدر ہی معلوم ہوتے۔ ان میں نہ عاجزی تھی نہ نرمی اور گاندھی جی کے برعکس وہ اپنے مخالفوں سے بدلہ لئے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر تحکم سے کام لیتے تھے، اس لئے لوگ ان سے یا انتہائی عقیدت رکھتے تھے یا زبردست مخالفت، ان کے ساتھ غیر جانب داری کا احساس رکھنا ناممکن تھا۔ ہر شخص مجبور تھا کہ ان سے محبت کرے یا نفرت، ان کی فراخ پیشانی، بھچے ہوئے ہونٹ، پر عزم ٹھوڑی، غرض مجموعی شکل شاہان روم کے ان مجسموں سے بہت ملتی جلتی تھی جو اٹلی کے عجائب خانے میں محفوظ ہیں۔ میرے بہت سے اطالوی دوستوں نے ان کی تصویر دیکھ کر اس مشابہت کی تصدیق کی۔ آخر عمر میں جب ان کے بال ریشم

کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ (میری طرح ان کے بال گرے نہیں بلکہ آخر تک رہے) تو ان میں ایک عجیب شوکت اور وقار پیدا ہو گیا تھا جو افسوس ہے آج کل کے لوگوں میں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ میں اپنی محبت کی بنا پر اس معاملے میں کچھ غلو کر رہا ہوں لیکن آج اس دنیا میں جو چھچھورے پن اور کمزوریوں سے بھری ہے مجھے ان کی شاندار شخصیت کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے چاروں طرف اس زبردست عزم و ثبات کو تلاش کرتا ہوں جس کے وہ مالک تھے، لیکن آج وہ کہیں نظر نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۲۴ء میں جب گاندھی جی اور سوراج پارٹی میں خوب چل رہی تھی میں نے انہیں والد کی ایک تصویر دکھائی تھی۔ اس تصویر میں والد کی مونچھیں نہیں تھیں۔ اس سے پہلے گاندھی جی نے ہمیشہ والد کے چہرے پر بڑی خوشنما مونچھیں دیکھی تھیں۔ وہ اس تصویر کو دیکھ کر چونک پڑے اور دیر تک غور کرتے رہے۔ کیونکہ مونچھوں کے نہ ہونے سے دہانے اور ٹھوڑی کی درشتی نمایاں ہو گئی تھی۔ انہوں نے ذرا خشک مسکراہٹ کے ساتھ کہا اب مجھے معلوم ہوا کیسے شخص کا مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن والد کی آنکھوں سے اور ان شکنوں سے جو اکثر ہنستے رہنے سے ان کے چہرے پر پڑ گئی تھیں۔ ان کی صورت میں ایک خاص نرمی پیدا ہو گئی تھی البتہ کبھی کبھی یہ آنکھیں غصے سے چمک بھی اٹھتی تھیں۔

والد کے لئے اسمبلی کا کام ایسا تھا جیسے بطخ تالاب میں تیرتی ہے۔ اپنی قانونی اور دستوری تربیت کی وجہ سے ان کی طبیعت کو اس سے خاص مناسبت تھی۔ وہ ستیا گرہ اور اس کی باریکیوں سے اتنے واقف نہ تھے جتنے اس کام کے نشیب و فراز سے۔ انہوں نے اپنی پارٹی میں سختی سے انضباط قائم رکھا اور دوسرے افراد اور جماعتوں کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرنے پایا تھا کہ خود ان کے آدمی انہیں پریشان کرنے لگے۔ سوراج پارٹی کو اپنے ابتدائی زمانے میں کانگریس کے اندر ان لوگوں سے مقابلہ کرنا تھا جو ترک موالات کے پرانے پروگرام

میں تبدیلی کے مخالف تھے۔ اس لئے اس میں بہت سے نا اہل لوگ بھی شامل کر لئے گئے تا کہ کانگریس میں پارٹی کو قوت بڑھ جائے۔ اس کے بعد انتخابات کا موقع آیا۔ اس کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی اور روپیہ امیروں سے مل سکتا تھا۔ اس لئے ان کی دلجوئی ضروری تھی بلکہ ان میں سے بعض سوراجی امیدوار بنا کر کھڑے کئے گئے۔ سیاسیات کے متعلق امریکہ کے ایک اشتراکی کے رائے سر اسٹیفورڈ کرپس نے لکھ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "سیاست وہ نازک فن ہے جس میں غریبوں سے ووٹ اور امیروں سے اپنے کام کے لئے روپیہ لیا جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک سے یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ ہم تمہیں دوسرے سے بچائیں گے۔"

ان تمام عناصر نے شروع ہی سے پارٹی کو کمزور کر دیا تھا۔ جب اسمبلی اور کونسلوں میں کام شروع ہوا تو اعتدال پسند جماعتوں سے سمجھوتے کرنے پڑے اور وہ جہاد کی شان زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہی۔ رفتہ رفتہ پارٹی کی شعلہ مزاجی کم ہونے لگی اور انضباط بگڑنے لگا۔ کمزور طبعیت کے لوگ اور ابن الوقت موقع پا کر اسے بدنام کرنے لگے۔ سوارج پارٹی نے کونسلوں پر اس دعوے کے ساتھ حملہ کیا تھا کہ حریفوں کی صفوں میں گھس کر لڑیں گے، لیکن حریف بھی اس کھیل میں استاد تھے چنانچہ حکومت نے طے کیا کہ وہ سوراجیوں کی صفوں میں پھوٹ ڈال کر اپنا کام بنائے گی۔ ہمارے کمزور طبیعت والے بھائیوں کے سامنے اعلیٰ عہدے پیش کئے گئے اور طرح طرح کی لالچیں دی گئیں۔ ان کا نہیں قبول کرنا تھا کہ ان کی قابلیت ان کے تدبر اور ان کی معقول پسندی کی تعریفوں کے پل باندھ دئے گئے۔ ان کے چاروں طرف ایسی خوشگوار اور موزوں فضا پیدا کر دی گئی جو کھیتوں اور بازاروں کے شور شغب و گرد وغبار سے قطعی مختلف تھی۔ پھر وہ اس سے نکل کر کہاں جا سکتے تھے۔

غرض سوراجیوں کی عام اخلاقی حالت گرنے لگی۔ ایک ایک کر کے دوسری طرف کھسکنے لگے۔ میرے والد بہت چیخے چلائے اور انہوں نے دھمکی دی کی "بیمار

عضو' کو کاٹ کر پھینک دیں گے لیکن اس دھمکی کا کیا اثر ہو سکتا تھا جبکہ وہ عضو خود ہی جدا ہونے کو تیار تھا۔ بعض سوراجی وزیر بن گئے بعض مختلف صوبوں میں گورنر کی اگزیکٹیو کونسل کے رکن ہو گئے۔ کچھ نے ایک علیحدہ جماعت ''حامیان جوابی تعاون'' کے نام سے قائم کر لی۔ یہ اصطلاح لوکمانیہ تلک نے بالکل مختلف معنوں میں استعمال کی تھی۔ اب تو اس کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ جب کوئی عہدہ ملے اسے قبول کر لو اور اسے پورا فائدہ اٹھاؤ۔ ان خرابیوں کے باوجود سوراج پارٹی کا کام چلتا رہا لیکن والد اور مسٹر داس ان باتوں سے بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے اس کے علاوہ وہ کونسلوں کے بے نتیجے کام سے بھی اکتا گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ شمالی ہندو مسلمانوں میں کشیدگی ہو گئی جو برابر بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

بعض کانگریسی جو ہمارے ساتھ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں جیل گئے تھے اب وزیر تھے یا اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مامور تھے۔ ۱۹۲۱ء میں تو ہمیں اس پر فخر تھا کہ اس حکومت نے ہمیں مجرم قرار دیا تھا اور جیل بھیجا تھا جس کے رکن بعض لبرل تھے (یہ بھی کسی زمانے میں کانگریسی تھے) لیکن اب ہم جانتے تھے کہ بعض صوبوں میں ہمیں خود اپنے رفیقوں کے ہاتھوں مجرم بننے اور جیل بھیجے جانے کا فخر حاصل ہو گا۔ یہ نئے وزیر اور اگزیکٹیو کونسل کے رکن لبرلوں کے مقابلے میں اس کام کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ وہ ہم سے اور ہماری کمزوریوں سے واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہم سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ ہمارے کام کے طریقوں سے بھی اچھی طرح آشنا تھے اور انہیں عوام کے جذبات اور مجمع کے ذہنیت کا بھی تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ نازیوں کی طرح انہوں نے بھی برسر حکومت ہونے سے پہلے انقلابی کھیل کھیلے تھے۔ اس لئے وہ پانی ان معلومات سے فائدہ اٹھا کر اپنے کانگریس کے ساتھیوں کو بہت اچھی طرح کچل سکتے تھے، جو سرکاری عہدے دار اور لبرل وزراء اپنی لاعلمی کی

وجہ سے نہیں کر سکتے تھے۔

۱۹۲۴ء میں کانگرس کا اجلاس لہگام میں ہوا اور گاندھی جی اس کے صدر ہوئے۔ ان کے لئے صدر ہونا گویا تنزل تھا کیونکہ وہ عرصہ سے کانگرس کے مستقل مہا صدر تھے۔ مجھے ان کا خطبہ صدارت پسند نہیں آیا۔ مجھے تو یہ محسوس ہوا جیسے اس میں بالکل جان ہی نہیں تھی۔ اجلاس کے اختتام پر میں گاندھی جی کے ایما سے دوبارہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سکرٹری منتخب ہوا۔ اپنی مرضی کے خلاف رفتہ رفتہ کانگریس کا نیم مستقل سیکرٹری بن گیا تھا۔

۱۹۲۵ء کی گرمیوں میں والس کی طبیعت ناساز ہوگئی اور انہیں دمے کا سخت دوراہ پڑا۔ اس لئے وہ گھر کے سب لوگوں کو ساتھ لے کر ڈلہوزی چلے گئے۔ میں بھی چند روز بعد کچھ عرصے کے لئے ان کے پاس چلا گیا۔ ڈلہوزی سے ہم چمبا کو روانہ ہوئے جو ہمالیہ کے وسط واقع ہے۔ جون کی کسی تاریخ کو ہم وہاں پہنچ گئے۔ پہاڑی راستوں پر سفر کرنے کی وجہ سے ہم تھک گئے تھے۔ ابھی ہماری تکان دور بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ہمیں ایک تار ملا جس میں چترنجن داس کی موت کی خبر درج تھی بڑی دیر تک والد سکوت کے عالم میں بیٹھے رہے۔ ان کی زبان سے ایک حرف بھی نہیں نکلا۔ البتہ غم کے بوجھ سے ان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ان کے لئے یہ بڑا جانکاہ صدمہ تھا۔ میں نے شاید کبھی ان کو اتنا متاثر نہیں دیکھا تھا۔ داس ہی ایک ایسے شخص تھے جو ان کے قریب ترین اور محبوب ترین رفیق بن گئے تھے۔ آج وہی یکا یک ان سے جدا ہو گئے اور انہیں سوراج پارٹی کا سارا بوجھ سنبھالنے کو تنہا چھوڑ گئے۔ یہ بوجھ برابر بڑھ رہا تھا اور دیش بندھو دونوں اس لایعنی کام سے اور اپنے لوگوں کی کمزوریوں سے گھبرا اٹھے تھے۔ دیش بندھو کی آخری تقریر سے جو انہوں نے فرید پور کانفرنس میں کی تھی، ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ تھک سے گئے ہوں۔

دوسرے ہی دن صبح چمبا سے روانہ ہو گئے اور پہاڑوں کو پار کر کے ڈلہوزی پہنچے

ریلوے اسٹیشن یہاں سے بہت دور تھا چنانچہ موٹر سے وہاں پہنچے اور پھر الہ آباد ہوتے ہوئے کلکتے روانہ ہو گئے۔

---

(۱) میں نے مذکورہ بالا واقعہ جیل میں محض اپنی یاد سے لکھا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میری یاد نے غلطی کی۔ اور میں نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے مباحث کے ایک اہم پہلو کونظر انداز کر دیا جس سے اصل واقعہ کی نوعیت بدل گئی۔ گاندھی جی جس قرارداد سے متاثر ہوئے تھے وہ ایک نوجوان بنگالی تخویف پسند گوپی ناتھ ساہا کے متعلق تھی۔ یہ قرارداد کمیٹی کے جلسے میں پیش ہو کر نامنظور ہو گئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس قرارداد کے ذریعہ سے اس کے فعل کی تو مذمت کی گئی تھی۔ لیکن اس کی نیت کی بنا پر اس سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ قرارداد سے زیادہ گاندھی جی کو ان تقریروں سے تکلیف پہنچی جو اس کی حمات میں کئی گئیں۔ اور یہ خیال کہ بہت سے کانگریسی دل سے عدم تشدد کے معتقد نہیں ہیں ان کے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہوا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے ینگ انڈیا میں اس جلسے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا" اپنی چار قراردادوں کے حق میں معمولی سی اکثریت تو مجھے حاصل ہو گئی۔ لیکن میں اپنے آپ کو اقلیت ہی میں سمجھتا ہوں۔ کمیٹی کی رائیں تقریباً برابر برابر تقسیم تھیں۔ گوپی ناتھ ساہا والی قرارداد نے مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا۔ جو تقریریں اس کی حمایت میں کی گئیں۔ گوپی ناتھ ساہا والی قرارداد کے بعد جلسے کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اس جلسے کے سامنے مجھے اپنا آخری رزولیشن پیش کرنا پڑا۔ جیسے جیسے جلسے کی کاروائی ہو رہی تھی میری پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس دل دکھانے والی فضا سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ میرے سپرد جو قرارداد تھی اسے پیش کرتے ہوئے مجھے خوف معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں میں نے اس چیز کو صاف کر دیا ہے یا نہیں کہ کسی مقرر کے دل میں کسی قسم کا بغض نہ تھا۔ مجھے صرف یہ خیال ستاتا تھا کہ لوگ غیر ارادی طور پر کتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دے رہے ہیں اور کانگرس کے عدم تشدد کے مسلک کو کس بری طرح ٹھکرا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر کانگرس کے اندر ستر آدمی ایسے نکل سکتے ہیں جو اس قرارداد کی حمایت کریں میرا دل تو بیٹھ گیا۔"

یہ واقعہ اور گاندھی جی کی یہ تنقید نہایت اہم ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہ کہ وہ عدم تشدد کو کتنی غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ اور اس کی مخالفت کا چاہے وہ بالکل غیر ارادی اور بالواسطہ کیوں نہ ہو ان پر کتنا زبردست اثر ہوتا تھا۔ آگے بھی انہوں نے جو کچھ کیا غالباً اس کا بیشتر حصہ اصل میں انہیں اثرات کا نتیجہ تھا۔ عدم تشدد تو گویا ان کی پالیسی اور ان کی تمام سرگرمیوں کی جان تھی۔

فرقہ پرستی کا زور

جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں ۲۳ء کے موسم خزاں میں نابھے کے جیل سے واپس آکر میں بیمار پڑ گیا۔ یہ علالت جس میں معیادی بخار کے جراثیم سے سابقہ تھا میرے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اب تک نہ میں کبھی سخت بیمار پڑا تھا اور نہ معمولی بخار یا نقاہت کی وجہ سے بستر پر پڑے رہنے کا عادی تھا۔ مجھے اپنی صحت پر تھوڑا سا گھمنڈ تھا اور میں اعتراض کیا کرتا تھا کہ ہندوستان میں لوگ ہمیشہ بیمار بنے رہتے ہیں۔ اپنی جوانی اور مضبوط قوی کی بدولت میں بچ تو گیا لیکن بحران کے گذر جانے کے بعد اس قدر کمزور ہو گیا کہ ایک عرصے تک بستر سے نہیں اٹھ سکا اور کامل صحت پانے میں بہت دن لگ گئے۔ اس زمانے میں، میں اپنے ماحول اور روزمرہ کے کام سے ایک عجیب قسم کی اجنبیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے کوئی دور سے تماشہ دیکھ رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں جزئیات کے چکر سے نکل کر مشاہدہ کر رہا ہوں۔ میرا دماغ بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ پرسکون اور خیالات زیادہ واضح تھے۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ کبھی سخت بیمار پڑے ہیں انہیں بھی اسی قسم کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا لیکن میرے لئے تو یہ ایک روحانی تجربے کی نوعیت رکھتا تھا۔ (یہاں محدود مذہبی معنی میں روحانی استعمال نہیں ہوا ہے) کیونکہ اس کا مجھ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میں سیاست کی جذباتی فضا سے بہت بلند ہو گیا ہوں اور ان چیزوں کو جواب تک میرے عمل کی محرک تھیں زیادہ وضاحت سے دیکھ رہا ہوں مگر اس بصیرت کے بعد پھر دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوئے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا بہر حال میں زندگی اور سیاست کے مذہبی پہلو سے روز بروز دور ہوتا چلا گیا۔ میں اپنے اس تجربے کا ذکر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ اس واردات کو بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ اس بات کو اب گیارہ برس ہو چکے ہیں اور ذہن میں اس کے دھندلے سے نشان باقی رہ گئے ہیں پھر بھی اتنا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا مجھ پر

اور میرے خیالات پر بہت گہرا اثر پڑا تھا اور آئندہ دو تین سال تک میں اپنا کام اسی بے تعلقی کے انداز سے انجام دیتا رہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ وہ تغیرات تھے جو سراسر میرے اختیار سے باہر تھے، اور جن سے میری طبعیت کو کوئی مناسبت نہیں تھی۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ملک کی سیاسی حالت بہت کچھ بدل گئی تھی۔ ان میں سب زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ خاص طور پر شمالی ہند میں ہندو مسلم تعلقات رفتہ رفتہ بہت کشیدہ ہو گئے تھے۔ بڑے شہروں میں بہت سے فساد ہوئے جن میں انتہائی بیدردی اور درندگی کا ثبوت دیا گیا۔ بے اعتمادی اور غصے نے جھگڑے کے ایسے ایسے نئے سبب کھڑے کر دئے جو ہم نے پہلی کبھی سنے بھی نہ تھے۔ پہلے تو نزاع کے خاص وجہ بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی تھی یا اگر کبھی دونوں کے تہوار مثلاً محرم اور رام لیلا ایک ساتھ پڑ جاتے تھے تب بھی اکثر فساد ہو جاتا تھا۔ محرم ایک دردناک سانحے کی یادگار ہے جو نوحہ و ماتم کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ اور رام لیلا ناحق پر حق کی فتح کی یادگار ہے جس کا جشن منایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں نبھ سکتیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کا ساتھ کہیں تیس سال میں ایک بار ہوتا ہے لیکن رام لیلا تو شمشی سال کے مطابق ایک مقررہ وقت پر ہوتی ہے اور محرم کا زمانہ قمری سال کے لحاظ سے ہر سال بدلتا رہتا ہے یہاں تک کہ تیس سال بعد دونوں مل جاتے ہیں۔

لیکن اب جھگڑے کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی اور یہ ایسی تھی کہ آئے دن پیش آتی تھی۔ یہ مسجد کے سامنے باجا بجانے کا سوال تھا۔ مسلمانوں کو نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجانے اور شور کرنے پر اعتراض تھا کیونکہ اس سے ان کی عبادت میں خلل پڑتا ہے۔ ہر شہر میں بے شمار مسجدیں ہیں اور ہر مسجد میں روزانہ پانچ وقت نماز ہوتی ہے۔ شور و شغب اور جلوس کی بھی کمی نہیں ہے۔ (جس میں برات اور جنازے بھی شامل ہیں) اس لئے جھگڑے کا ہر وقت موقع تھا۔ خاص طور پر مغرب

کی نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجانے یا شور کرنے پر زیادہ اعتراض ہوتا تھا اتفاق سے اسی وقت مندروں میں بھی ''سندھیا'' ہوتی ہے اور سنکھ اور گھڑیال بجتے ہیں۔ اسے آرتی کہتے ہیں۔ غرض آرتی نماز کے جھگڑوں کی کثرت ہوگئی۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک مسئلہ جو ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ کر کے ذرا سے تدبر سے طے ہوسکتا ہو آپس کی رنجش اور فساد کا باعث بن جائے لیکن مذہبی جذبات کو عقل، لحاظ یا تدبر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خصوصاً جب کوئی تیسرا فریق ایک کو دوسرے سے لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہو تو اس کا بھڑک اٹھنا معمولی بات ہے۔

شمالی ہند کے چند شہروں کے ان فسادوں کو لوگ خواہ مخواہ حد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حالانکہ اکثر شہروں اور قصبوں میں اور قریب قریب تمام دیہاتوں میں بالکل امن وسکون تھا اور ان واقعات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا لیکن اخبار ہر چھوٹے چھوٹے فرقہ وارانہ جھگڑے کو بہت بڑھا چڑھا کر لکھتے تھے۔ بہر حال یہ بالکل صحیح ہے کہ شہر والوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور رنجش بڑھ گئی تھی۔ دراصل فرقہ پرست لیڈر اس آگ کو بھڑکا رہے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ سیاسی مطالبے زیادہ سخت ہوتے جاتے تھے۔ اس فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے وہ سیاسی رجعت پسند مسلمان جو ترک موالات کے زمانے میں منہ چھپا کر بیٹھ رہے تھے پھر میدان میں نکل آئے، اور حکومت نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ اب تو وہ آئے دن نئے نئے اور بھاری بھاری مطالبے پیش کرنے لگے جس سے قومی اتحاد اور ملکی آزادی کی جڑ کٹتی تھی۔ ہندوؤں میں بھی خاص خاص فرقہ پرست لیڈر سیاسی اعتبار سے رجعت پسند تھے اور کہنے کو تو وہ ہندو مفاد کی حفاظت کے علمبردار تھے لیکن اصل میں حکومت کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے مختلف صورتوں سے بہت کوشش کی، لیکن جن مطالبات پر وہ زور دیتے تھے انہیں حاصل کرنے میں نہ وہ کامیاب ہوئے

اور نہ ہو سکتے تھے۔ البتہ انہوں نے ملک میں فرقہ پرستی کا بیج بو دیا۔

کانگریس عجیب کش مکش میں تھی۔ چونکہ وہ قومی احساسات کی نمائندگی کرتی تھی اور ان سے اثر پذیر ہوتی تھی اس لئے ان فرقہ وارانہ جذبات کا بھی اثر اس پر پڑا۔ بہت سے کانگریسی قوم پرستی کے پردے میں فرقہ پرست بن گئے لیکن کانگریس کے رہنما اپنے اصولوں پر قائم رہے اور بحیثیت مجموعی انہوں نے کسی فرقے یا فرقہ وارانہ جماعت کا ساتھ نہیں دیا۔ اب تو سکھ اور دوسری چھوٹی اقلیتیں بھی کھلم کھلا اپنے جداگانہ مطالبات پیش کرنے لگی تھیں۔ غرض ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس پر دونوں سے لعن طعن ہونے لگی۔

بہت دن ہوئے یعنی ترک موالات کے شروع میں یا اس سے بھی پہلے گاندھی جی نے فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک حل تجویز کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسئلہ صرف اکثریت کی نیک نیتی اور فراخ دلی سے طے ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کا ہر مطالبہ ماننے کو تیار تھے۔ وہ ان کا دل ہاتھ میں لینا چاہتے تھے۔ ان سے سودا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دوراندیشی اور قدر و قیمت کے صحیح اندازے کی بدولت وہ حقیقت کی تہ کو پہنچ گئے۔ لیکن دوسرے لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں بازار کا بھاؤ خوب معلوم ہے حالانکہ وہ کسی چیز کی صحیح قدر و قیمت کو نہیں پہنچانتے تھے مول تول کرنے لگے رہے۔ نہایت افسوس ہے کہ انہیں مہنگے دام تو نظر آئے مگر یہ نہ سوجھا کہ مال کیسا ہے۔

دوسروں پر نکتہ چینی کرنا اور انہیں الزام دینا آسان ہے اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کرنا بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مگر اس ناکامی کا بار کسی کی اصولی غلطیوں یا عمل کی لغزشوں پر ڈالنے کی بجائے کیا یہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ دوسروں نے جان بوجھ کر ہمارے راستے میں روڑے اٹکائے؟ ہم حکومت اور فرقہ پرستوں کو الزام دیتے ہیں اور وہ کانگریس کو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ

حکومت اور اس کے حلیف برابر ہمارے راستے میں جان بوجھ کر روڑے اٹکاتے رہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ماضی میں بھی اور اب بھی برطانوی حکومت کی یہی حکمت عملی رہی ہے کہ ہم کو آپس میں لڑائے۔ محکوموں میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کے اصول پر تمام سلطنتیں عمل کرتی ہیں اور جس حد تک وہ اپنی اسی ترکیب میں کامیاب ہوتی ہیں اسی حد تک ان کا تسلط محکوموں پر ہوتا ہے۔ ہمیں اس کی شکایت کرنے میں حق نہیں ہے یا کم سے کم اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس چیز کو نظر انداز کرنا یا اس کی کوئی تدبیر کرنا خود اپنی جگہ پر ایک زبردست غلطی ہے۔

ہم اس کی کیا تدبیر کریں؟ سودا چکانے، بھاؤ ٹھیرانے اور بازار کا سا مول تول کرنے سے تو کام نہیں چلا سکتا۔ کیونکہ ہم کتنی ہی بھاری قیمت لگائیں۔ کتنی ہی بڑھ کر بولی بولیں، ایک تیسرا فریق موجود ہے جو ہم سے زیادہ دام لگا سکتا ہے اور بھی نہیں بلکہ نقد ادا کر سکتا ہے۔ غرض جب تک ہم میں ایک مشترک قومی اور اجتماعی نقطہ نظر نہ پیدا ہو جائے۔ ہم متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم موجودہ سیاسی اور اقتصادی نظام کے چکر میں پڑے رہیں گے اور اسی پر قناعت کریں گے کہ کچھ جزوی اصلاحات ہو جائیں اور حکومت میں ہندوستانیوں کا عنصر بڑھ جائے تو اتحاد عمل کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ پھر دونوں فریقوں کا مقصد یہی ہوگا کہ مال غنیمت میں سے ہمیں بھی کچھ حصہ مل جائے اور تیسرا فریق جس کے ہاتھ میں قوت ہے خود بخود سرپنچ بنکر بیٹھ جائے گا اور چن چن کر اپنے چہیتوں کو اچھی اچھی چیزیں بانٹے گا۔

ہم اتحاد عمل کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر اس وقت قائم کر سکتے ہیں جب ہم ملک کے سیاسی نظام اور سماجی نظام کو بالکل بدل ڈالیں۔ اس لئے مکمل آزادی کے مطالبے کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے ہم جس چیز کی خاطر لڑ رہے ہیں وہ ایک بالکل نیا سیاسی نظام ہے، نہ کہ "درجہ نوآبادیت" جس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ موجودہ نظام بدستور قائم رہے۔ حکومت بظاہر ہندوستانیوں کی ہو اور پس

پردہ برطانیہ کا ہاتھ کام کرتا رہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارا مطالبہ آزادی صرف سیاسی آزادی تک محدود تھا اور اس میں سماجی تغیرات اور عام لوگوں کی معاشی آزادی کا ذکر نہیں تھا مگر اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ زنجیریں توڑ دی جائیں جن میں لندن کے تاجروں نے ہمیں جکڑ رکھا ہے اور ہمیں یقین تھا کہ اس سے سماجی نظام کے بدلنے میں سہولت ہوگی۔ اس وقت میرے یہی خیالات تھے۔ اب میں اس میں اتنا اور اضافہ کرتا ہوں کہ حقیقی سیاسی آزادی عموماً تنہا نہیں آتی، بلکہ اپنے ساتھ بہت کچھ سماجی آزادی بھی لاتی ہے۔

لیکن قریب قریب ہمارے تمام لیڈروں کی نظر موجودہ سیاسی سماجی نظام کی تنگ دائرے تک محدود تھی۔ وہ ہر مسئلے پر چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا آئینی اسی نقطہ نظر سے غور کرتے تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ برطانوی حکومت کے ڈھب پر آجاتے تھے کیونکہ حقیقت میں وہ انقلاب پسند نہیں بلکہ اصلاح پسند تھے گو کبھی کبھی عملی جدوجہد بھی کرتے رہتے تھے، لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا کہ ہندوستان کا کوئی سیاسی، اقتصادی یا فرقہ وارانہ مسئلہ اصلاحی طریقوں سے پوری طرح حل ہو سکے اب تو انقلابی خیالات اور انقلابی طریق عمل کی ضرورت تھی۔ مگر ہمارے لیڈروں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس ضرورت کو پورا کر سکے۔

ہماری جنگ آزادی کا مقصد واضح نہ ہونے سے فرقہ پرستی کو بہت تقویت پہنچی۔ عام لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کی جنگ کو ہماری روز مرہ کی مصیبتوں سے کیا تعلق ہے۔ کبھی کبھی وہ ایک نامعلوم جذبے کے ماتحت خوب لڑتے تھے لیکن یہ تو بڑا کمزور ہتھیار ہے جو آسانی سے کند بھی کیا جا سکتا ہے اور غلط مقاصد کے لئے بھی کام آسکتا ہے۔ ان کے جوش میں عقل کو دخل نہیں تھا اس لئے رد عمل کے زمانے میں فرقہ پرست بھی اسے آسانی سے بھڑکا سکتے تھے اور مذہب کا نام لیکر اس سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہندو مسلمان دونوں کے

اونچے اوسط طبقے کے لوگوں نے کس طرح مذہب کو بیچ میں لا کر ان مطالبات کے لئے عام لوگوں کی تائید اور مدد حاصل کر لی جنہیں عام طبقہ تو درکنار نچلے اوسط طبقے سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ اگر تمام فرقہ وارانہ مطالبوں کا تجزیہ کے اجائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سارا جھگڑا عہدوں اور ملازمتوں کا ہے اور یہ عہدے اونچے اوسط طبقے کے لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کونسلوں میں نشستیں مخصوص کرنے اور ان میں اضافہ کرنے کا بھی مطالبہ تھا کیونکہ انہیں پر سیاسی اقتدار منحصر سمجھا جاتا ہے۔ مگر انہیں بھی یاران طریقت نے اپنے ذاتی اثر کے بڑھانے کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے سیاسی مطالبات جن سے زیادہ سے زیادہ اونچے اوسط طبقے کے مٹھی بھر لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور قومی اتحاد و ترقی کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، بڑی ہوشیاری سے اس طرح پیش کیے گئے، گویا یہ پورے فرقے کے مطالبات ہوں اور ان کے بے وقتی کو چھپانے کے لئے ان پر مذہب کا ملمع کر دیا گیا۔

غرض اس طرح سیاسی رجعت پسند فرقہ وارانہ لیڈروں کے بھیس میں سیاسی میدان میں نکل آئے۔ ان کے طرز عمل سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا محرک فرقہ وارانہ تعصب نہیں ہے بلکہ اصل میں وہ سیاسی پیش قدمی کے راستے میں روڑے اٹکانا چاہتے ہیں۔ ہمیں سیاسی معاملات میں ان سے مخالفت کی توقع تو تھی ہی لیکن یہ دیکھ کر اور بھی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کیسی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں۔ مسلم فرقہ پرست لیڈر عجیب عجیب باتیں کہتے تھے اور انہیں نہ تو قوم پرستی کی پرواہ تھی اور نہ ہندوستان کی آزادی کی۔ رہے ہندو فرقہ پرست لیڈر یہ زبان سے قوم پرستی کا دعوی ضرور کرتے تھے لیکن عمل بالکل اس کے خلاف تھا اور چونکہ وہ کوئی معقول عملی کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اس لئے حکومت کے سامنے اپنے کو طرح طرح سے ذلیل کرتے تھے حالانکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا

لیکن اشتراکی اور اسی قسم کی "تخریبی" تحریکوں کی مذمت کرنے میں دونوں متفق تھے اور جس چیز سے اونچے طبقے کے مستقل حقوق کو نقصان پہنچتا ہو، اس کی مخالفت میں دونوں حیرت انگیز طریقے سے ایک ہو جاتے تھے۔ مسلم فرقہ پرست لیڈر اگرچہ بہت سی ایسی باتیں کہتے اور کرتے تھے جو سیاسی اور اقتصادی آزادی کے منافی تھیں لیکن انفرادی طور پر بھی اور جماعتی حیثیت سے بھی حکومت اور پبلک کے سامنے وہ اپنے آپ کو لئے دیے رہتے تھے۔ مگر ہندو فرقہ پرست لیڈروں میں اتنی خودداری بھی نہ تھی۔

کانگرس میں بہت سے مسلمان شریک تھے۔ ان کی تعداد کافی تھی اور ان میں بہت سے قابل آدمی بھی تھے بلکہ یوں کہیے کہ ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور اور ہردلعزیز مسلمان لیڈر کانگرس کے ساتھ تھے۔ ان کانگریسی مسلمانوں نے اپنی ایک جماعت "قوم پرست مسلم پارٹی" کے نام سے ترتیب دی اور فرقہ پرست مسلمان لیڈروں کا مقابلہ کیا۔

شروع شروع میں تو انہیں کچھ کامیابی ہوئی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ان کے ساتھ ہو گیا۔ لیکن وہ سب اونچے طبقے کے لوگ تھے اور ان میں کوئی موثر شخصیت نہ تھی وہ اپنے پیشے اور کاروبار میں لگ گئے اور انہیں عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ سچ پوچھئے تو کبھی تعلق پیدا ہی نہیں ہوا تھا وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مشورے اور معاہدے کرتے تھے مگر اس کام میں ان کے حریف یعنی فرقہ پرست لیڈر زیادہ ماہر تھے۔ چنانچہ ان حریفوں نے قوم پرست مسلمانوں کو مورچہ بہ مورچہ پیچھے ہٹانا شروع کیا اور انہیں ایک ایک کر کے اپنے سارے اصول ترک کرنے پڑے۔ بار بار قوم پرست مسلمانوں نے مزید پسپائی سے بچنے کے لئے یہ کوشش کی کہ اپنے مطالبات کو کم کر کے ان پر اڑ جائیں لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا کہ انہیں اور پیچھے ہٹنا پڑا اور اپنے مطالبات کو اور کم کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس کوئی

چیز باقی نہ رہی جسے وہ اپنی کہہ سکتے۔ کوئی بنیادی اصول نہ رہا جس پر وہ قدم جما کر کھڑے ہو سکتے، سوائے ایک اصول کے جو ان کی کشتی کا لنگر تھا۔ یعنی مخلوط انتخاب مگر اس کے بعد اور ایک نازک موقع آیا، جب انہیں اپنے مطالبات کم کرنے پڑے اور ان کا یہ لنگر ٹوٹ گیا۔ چنانچہ آج وہ ہر اصول اور عمل کو جس پر انہوں نے اپنی جماعت کی بنیاد رکھی تھی جسے وہ بڑے زور شور سے لے کر اٹھے تھے، کھو چکے ہیں اور ان کے پاس نام کے سوا کچھ باقی نہیں۔

انفرادی حیثیت سے قوم پرست مسلمان اب بھی کانگریس میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں لیکن جماعت کی حیثیت سے ان کی تباہی کی داستان بڑی دردناک ہے۔ یہ تباہی برسوں میں تکمیل کو پہنچی۔ لیکن اس پر آ کر مہر اسی سال ۱۹۳۴ء میں ثبت ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں اور اس کے بعد بھی کئی برس تک ان کی جماعت بہت طاقتور رہی اور انہوں نے مسلم فرقہ پرستوں کے خلاف سخت جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ گاندھی جی ان فرقہ پرستوں کے بعض مطالبات اپنی مرضی کے خلاف منظور کرنے کو تیار ہو گئے۔ لیکن ان کے رفقائے کار یعنی قوم پرست مسلم لیڈروں نے خود انہیں روکا اور بڑی سختی سے مخالفت کی۔

۱۹۲۴ء و ۲۵ء میں باہمی مشوروں اور مباحثوں کے ذریعے سے (جو اتحاد کانفرنس کہلاتے تھے) فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ ان میں سب سے مشہور وہ کانفرنس تھی جو مولانا محمد علی نے اپنے صدارت کے زمانے میں ۱۹۲۴ء میں کی۔ ان کانفرنسوں میں بہت سے نیک نیت اور پرخلوص لوگ شامل ہوئے۔ انہوں نے سمجھوتا کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ چند اچھی اچھی قراردادیں بھی منظور ہوئیں لیکن اصل مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے وہ ان کانفرنسوں سے طے نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا طے ہونا کثرت رائے پر نہیں بلکہ اتفاق رائے پر منحصر تھا۔ ان کانفرنسوں میں انتہا پسندوں کی مختلف جماعتیں بھی موجود تھیں جن کے نزدیک

سمجھوتے کا مفہوم یہ تھا کہ باقی سب لوگ ان کی رائے کے سامنے سر خم تسلیم کر دیں۔ اس لئے اتفاق رائے کیسے ہو سکتا تھا۔ سچ پوچھئے تو ان جلسوں کو دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ بعض سربرآوردہ فرقہ پرست کوئی سمجھوتا کرنا ہی نہیں چاہیت۔ ان میں سے اکثر سیاسی رجعت پسند تھے اور ان میں اور دوسرے لوگوں میں جو بنیادی طور پر سیاسی تغیرات کے خواہشمند رتھے اتحاد خیال کی گنجائش ہی نہ تھی۔

لیکن مشکلات کی اصل بنیاد زیادہ گہری تھی اور ان کا الزام محض افراد پر نہیں رکھا جا سکتا۔ اب سکھ بھی اپنے فرقہ وارانہ مطالبوں کو بڑے زور شور سے پیش کرنے لگے تھے اور پنجاب میں ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ بن گیا تھا۔ اصل میں پنجاب ہی فرقہ وارانہ نزاع کا مرکز تھا۔ وہاں ہر فرقہ دوسرے سے خائف تھا اس لئے خواہ مخواہ جوش و تعصب کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ بعض صوبوں میں کسانوں کا مسئلہ بھی فرقہ وارانہ رنگ میں نمودار ہوا۔ خصوصاً بنگال میں جہاں زمیندار عموماً ہندو ہیں اور کاشتکار مسلمان ہیں۔ پنجاب اور سندھ میں دولتمند طبقہ اور مہاجن عموماً ہندو ہیں اور قرضدار زیادہ تر مسلم کاشتکار ہین اس لئے قرض خواہ کے خلاف جو اپنا "آدھ سیر گوشت" لئے بغیر نہیں مانتا۔ غریب قرضداروں میں فطرتاً جو اشتعال ہوتا ہے اس نے فرقہ وارانہ طوفان کو اور بڑھا دیا۔ عام طور پر مسلمان غریب ہیں اس لئے مسلم فرقہ پرست لیڈروں نے اس عداوت سے جو غریبوں اور امیروں میں ہمیشہ رہا کرتی ہے، فرقہ وارانہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ حالانکہ غریبوں کی بہبودی سے ان مقاصد کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم فرقہ پرست رہنما کسی حد تک عوام کی نمائندگی کرتے تھے اور انہیں ایک قوت حاصل تھی۔ لیکن ہندو فرقہ پرست رہنما اقتصادی لحاظ سے دولتمند مہاجنوں اور پیشہ ور طبقوں کے نمائندے تھے۔ انہیں ہندو عوام کی کوئی مستقل تائید حاصل نہ تھی۔ گو کبھی کبھی وہ ان کی ہمدردی حاصل کر لیتے تھے۔

غرض فرقہ وارانہ مسئلہ معاشی جماعت بندی سے کچھ غلط ملط ہوگیا ہے اگرچہ بدقسمتی سے لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ ممکن ہے آگے چل کر یہ کھلم کھلا معاشی طبقوں کی جنگ کی شکل اختیار کر لے لیکن اگر وہ وقت آیا تو دیکھ لیجئے گا کہ آج کل کے تمام فرقہ پرست لیڈر جو مختلف فرقوں کے اعلیٰ طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں جھٹ پٹ اپنے اختلافات رفع کر لیں گے تاکہ اپنے مشترک دشمن یعنی غریبوں کے طبقے کا مقابلہ کر سکیں۔ موجودہ حالت میں بھی سیاسی سمجھوتا کر لینا زیادہ مشکل نہیں (بشرطیکہ اور یہ شرط بہت زبردست ہے) تیسرا فرقے موجود نہ ہو۔

۱۹۲۴ء میں دہلی کی اتحاد کانفرنس کے ختم ہوتے ہی الہ آباد میں ایک ہندو مسلم فساد ہوگیا۔ جہاں تک جانیں ضائع ہونے کا تعلق ہے دوسرے فسادوں کے مقابلے میں یہ کوئی بہت بڑا بلوہ نہ تھا۔ لیکن مجھے زیادہ صدمہ اس لئے ہوا کہ یہ خود میرے شہر میں واقع ہوا تھا چنانچہ میں چند اور حضرات کے ساتھ دہلی فوراً الہ آباد پہنچ گیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اصل فساد ختم ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے اثرات فرقہ وارانہ کشیدگی اور مقدمے بازی کی شکل میں عرصے تک باقی رہے۔

مجھے صحیح یاد نہیں کہ فساد کیسے شروع ہوا۔ اسی سال یا شاید اس کے کچھ عرصے بعد الہ آباد میں رام لیلا کے موقع پر پھر جھگڑا ہوا گیا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مسجد کے سامنے باجا بجانے کی ممانعت ہوگئی تھی۔ چنانچہ یہ تقریب جس میں بڑے بڑے جلوس بھی نکلتے تھے اس وقت سے بالکل بند کر دی گئی۔ اس بات کو اب آٹھ سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ لیکن اب تک الہ آباد میں رام لیلا نہیں ہوئی ضلع کے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے لئے یہ سال کا سب سے بڑا جشن ہوتا تھا لیکن اب صرف اس کی حسرتناک یاد باقی رہ گئی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں بچپن میں اور بچوں کے ساتھ رام لیلا دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اس وقت ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور وہ سارا مجمع بھی بہت خوش و خرم نظر آتا تھا جو الہ آباد کے سارے ضلع بلکہ قرب و جوار

کے دوسرے اضلاع سے آ کر یہ تماشا دیکھنے کو اکٹھا ہو جاتا تھا۔ اگرچہ یہ ہندو تہوار تھا لیکن اس میں کسی کے لئے روک ٹوک نہ تھی اس لئے مسلمان بھی بکثرت شریک ہوتے تھے اور چاروں طرف مسرت و شادمانی اور چہل پہل نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ تجارت کو بھی فروغ ہوتا تھا۔ برسوں کے بعد جب میں جوانی میں وہاں پھر گیا تو مجھے کچھ زیادہ لطف نہیں آیا بلکہ اس جلوس اور سوانگ سے وحشت ہونے لگی۔ اب میرا فنون لطیفہ اور تفریح کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں نے دیکھا کہ یہ سارا مجمع اس تماشے سے کتنا لطف اٹھاتا ہے اور کیسا خوش ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ رنگ رلیوں کا زمانہ تھا۔ بوڑھوں اور جوانوں کو چھوڑیئے۔ الہ آباد کے بچوں نے آٹھ نو برس سے یہ کھیل تماشے نہیں دیکھے ہیں اور ان کی روکھی پھیکی بے رس زندگیوں میں جوش مسرت کا جو ایک خوش گوار دن آ جاتا تھا اس سے بھی وہ محروم ہو گئے ہیں۔ یہ سب نتیجہ ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے جھگڑنے کا! سچ پوچھئے تو مذہب اور مذہبی جوش اس کا ذمہ دار ہے۔ افسوس یہ بھی کتنی مسرت کش چیز ہے!

میونسپلٹی کا کام

دو سال تک میں الہ آباد میونسپلیٹی کا کام کرتا رہا لیکن میری بد دلی برابر بڑھتی گئی۔ میں تین سال کے لئے چیر مین منتخب ہوا تھا۔ لیکن ابھی دوسرا سال شروع ہی ہوا تھا کہ میں ہی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے یہ کام دل سے پسند تھا اور میں نے اس میں بہت وقت اور توجہ صرف کی تھی۔ بڑی حد تک مجھے کامیابی بھی ہوئی اور اپنے تمام رفقائے کار کی خوشنودی کا فخر بھی حاصل ہوا۔ صوبہ متحدہ کی حکومت نے سیاسی مخالفت کے باوجود میرے بعض بلدی مشاغل کو سراہا۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتا ھا اور یہ دیکھتا تھ کہ جب کوئی معقول کام کرنا چاہتا ہوں تو میری راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ جان بوجھ کر کسی نے بھی میرے راستے میں رکاوٹیں پید انہیں کیں بلکہ مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں نے بڑی خوشی سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ ایک طرف تو حکومت کا ایک مقررہ نظام تھا اور دوسری طرف پبلک اور میونسپلٹی کے اراکین کی بے حسی۔ حکومت نے بلدی نظام کا جو آہنی ڈھانچا تیار کریا تھا اس میں بنیادی ترقی یا متنوع کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ مالی حیثیت سے میونسپلٹیاں ہمیشہ حکومت کی محتاج رہتی تھیں۔ مروجہ قوانین بلدہ کے ماتحت اس کی اجازت ہی نہ تھی کہ محصول لگانے کی، یا سماجی ترقی کی کوئی غیر معمولی تجویز پیش کی جا سکے۔ جو تجویزیں قانوناً جائز بھی تھیں ان کے لئے بھی حکومت کی منظوری لازمی تھی۔ اور یہ بڑے صبر اور ہمت کا کام تھا کہ اس قسم کی کوئی تجویز پیش کر کے برسوں منظوری کا انتظام کرتے رہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ جب کبھی اصلاح یا قومی تعمیر کا کوئی معاملہ ہوتا تو حکومت کی مشین کس مشکل سے اور کتنے آہستہ آہستہ حرکت کرتی۔ لیکن اگر کسی سیاسی مخالف کو کچلنے یا دبانے کا سوال ہوتا تو پھر اس میں کس بلا کی تیزی پیدا ہو جاتی۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب تضاد ہے۔

صوبے کی میونسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ ایک سرکاری محکمے کے ماتحت ہیں اور اس محکمے کا صدر ایک ہندوستانی وزیر ہوتا ہے لیکن عموماً یہ صدر بلدی معاملات تو کیا تمام امور عامہ میں بالکل کورے ہوتے ہیں۔ اصل میں وہ کسی شمار قطار میں نہیں ہیں اور خود ان کا محکمہ جسے انڈین سول سروس کے مستقل عہدے دار چلاتے ہیں ان کی ذرا پرواہ نہیں کرتا۔ ہندوستان کے اعلیٰ افسروں کی طرح ان عہدیداروں کی بھی یہی ذہنیت ہے کہ حکومت کا اصل کام نظم وضبط قائم رکھنا ہے اس میں کسی قدر مربیانہ شفقت کا رنگ بھی ہے لیکن اعلے پیانے پر سماجی خدمت کی ضرورت مطلق محسوس نہیں کی جاتی۔

میونسپلٹیاں ہمیشہ حکومت کی مقروض ہوتی ہیں اس لئے نظم وضبط کے بعد اسے ان سے قرضہ وصول کرنے کی فکر رہتی ہے۔ وہ بس یہی دیکھتی ہے کہ قرض کی قسطیں باقاعدہ ادا ہوتی رہیں۔ میونسپلٹی کی مالی حالت خراب نہ ہونے پائے۔ اس کے پاس تحویل میں کافی روپیہ موجود ہو۔ یہ سب باتیں نہایت ضروری اور برمحل ہیں لیکن یہ چیز ہمیشہ نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ میونسپلٹی محض روپیہ قرض لینے اور باقاعدہ ادا کرنے کا ادارہ نہیں ہے بلکہ اسے تعلیم، حفظان صحت وغیرہ کی خدمات بھی انجام دینی ہیں۔ ہندوستان کی میونسپلٹیاں یوں بھی بہت کم سماجی خدمت انجام دیتی ہیں اور جہاں مالی مشکلات پیش آئیں ان میں اور کمی کر دی جاتی ہے اور عام طور پر سب سے پہلے تعلیم پر ہاتھ صاف ہوتا ہے۔ حکمراں طبقوں کو ذاتی طور پر میونسپل مدارس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ ان کے بچے اعلیٰ درجہ کے گراں خرچ مدرسوں میں پڑھتے ہیں جنہیں عموماً حکومت سے متعدل امداد ملتی ہے۔

ہندوستان کے بڑے شہروں کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو شہر خاص جہاں بہت گنجان آبادی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ وسیع رقبہ جس میں بنگلے اور کوٹھیاں ہوتی ہیں اور ہر بنگلے سے ملحق بہت بڑا احاطہ یا باغ ہوتا ہے۔ اس علاقے کو

انگریز سول لائن کہتے ہیں۔ اسی سول لائن میں انگریز افسر اور تاجر اونچے اوسط طبقے کے ہندوستانی، وکیل، ڈاکٹر، سرکاری عہدیدار وغیرہ رہتے ہیں۔ میونسپلٹی کو سول لائن کے مقابلہ میں شہر خاص سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن خرچ سول لائن پر زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ سول لائن کے وسیع رقبہ میں زیادہ سڑکیں درکار ہیں۔ ان کی باقاعدہ مرمت، صفائی، چھڑکاؤ اور روشنی بھی ضروری ہے اور وہاں گندے پانی کے نکاس، آب رسانی اور حفظان صحت کا انتظام بھی زیادہ وسیع پیمانے پر کرنا پڑتا ہے۔ شہر کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی بلکہ غریبوں کے محلوں کی طرف تو کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ شہر میں اچھی سڑکیں بہت کم ہوتی ہیں۔ گلیوں میں روشنی کافی نہیں ہوتی اور وہاں نہ پانی کے نکاس کا انتظام ہوتا ہے نہ حفظان صحت کا۔ شہر والے ان تمام مصیبتوں کو بہت صبر اور خاموشی سے برداشت کرتے ہیں، اور شکایت کا حرف زبان پر نہیں لاتے۔ اگر کبھی شکایت کرتے ہیں تو سنتا کون ہے، کیونکہ وہ لوگ جو منہ میں زبان رکھتے ہیں اور جن کی شنوائی ہوسکتی ہے سب سول لائن میں رہتے ہیں۔

غرض کچھ تو اس بوجھ کے مساوی طور پر تقسیم کرنے اور کچھ مزید اصلاحیں کرنے کے خیال میں نے زمین کی مالیت پر محصول لگانا تجویز کیا لیکن جیسے ہی میں نے یہ تجویز پیش کی فوراً ایک سرکاری افسر (غالباً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور لکھا کہ یہ تجویز فلاں فلاں قانون اور ضابطہ آراضی کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس محصول کی زد میں زیادہ تر وہ لوگ آتے تھے جن کے بنگلے سول لائن میں تھے۔ لیکن حکوت تو چنگی جیسے بالواسطہ محصول کو پسند کرتی ہے جس سے تجارت برباد ہو جاتی ہے۔ مختلف چیزوں کی خصوصاً اشیائے خوردنی کی قیمتیں بڑھ جاتی ہے۔ اور بیچارے غریبوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اکثر ہندوستانی میونسپلٹیوں کا دارومدار اسی خلاف معاشرت اور نقصان دہ محصول پر ہے۔ مگر شاید اب بڑے بڑے شہروں میں یہ رفتہ رفتہ ہو رہا ہے۔

غرض میونسپلٹی کے چیرمین کی حیثیت سے ایک طرف تو مجھے حکومت کی اس لاشخصی مشین سے سابقہ پڑا جو دفتری گھس گھس کی عادی تھی اور نہ اپنی رفتار تیز کرنا چاہتی تھی نہ کسی نئے راستے پر چلنے کو تیار تھی اور دوسری طرف اپنے رفقائے کار میونسپلٹی کے اراکین سے جو اسی طرح پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ان میں سے بعض تصور پرست تھے اور اپنا کام بڑے جوش اور انہماک سے کرنے لگے۔لیکن بحیثیت مجموعی ان میں نہ تبدیلی یا ترقی کا جذبہ تھا اور نہ تخیل۔ ان کا خیال تھا کہ پرانے طریقے اچھے خاصے ہیں، پھر نئے نئے تجربے کرنی ء سے کیا فائدہ جن کی کامیابی موہوم ہے۔تصور پرست اور جوشیلے لوگ بھی رفتہ رفتہ بندھے ٹکے معمول کے خواب آور اثر کا شکار ہو گئے۔البتہ جب ملازموں کے تقرر کا موقع آتا تھا تو اراکین میں بڑی سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے۔مگر اس سے ان کی کارکردگی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا۔

ہر سال سرکاری اعلان، سرکاری عہدیدار اور بعض اخبارات میونسپلٹیوں اور لوکل بورڈوں کے کام پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کی برائیاں تو مسلم ہیں لیکن کوئی یہ بھی تو دیکھے کہ انہیں کس نظام کے اندر کام کرنا پڑتا ہے۔یہ نظام نہ جمہوری ہے اور نہ استبدادی بلکہ ایک درمیانی شکل ہے جس میں دونوں کی برائیاں موجود ہیں اور دونوں کی اچھائیاں مفقود۔اس بات سے انکار نہیں کہ مرکزی حکومت کو نگرانی کا اختیار رہنا چاہیے، لیکن اگر مرکزی حکومت خود جمہوری حیثیت نہ رکھتی ہو اور عوام کی ضروریات کا اسے کوئی لحاظ نہ ہو تو وہ ایسی مقامی مجلس کے ساتھ جسے عوام منتخب کرتے ہوں کیونکر نبھا سکتی ہے جہاں یہ صورت ہوتی ہے وہاں یا تو دونوں میں کشمکش رہتی ہے یا مقامی مجلس مرکزی حکومت کے سامنے بے چون و چرا سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور اس طرح مرکزی حکومت کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کیے بغیر اپنے اختیارات کا استعمال کرے۔ظاہر ہے کہ یہ صورت نہایت نامناسب ہے اور

اس جمہوری حکومت کا منشا فوت ہو جاتا ہے۔ میونسپل بورڈ کے اراکین کی نظر اپنے منتخب کرنے والوں کے مقابلے میں مرکزی قوت کی طرف زیادہ رہتی ہے اور پبلک بھی اکثر بورڈ کی پرواہ نہیں کرتی۔ حقیقی سماجی مسائل پر تو بورڈ کبھی غور کرتا ہی نہیں کیونکہ یہ اس کے اختیارات سے باہر ہیں۔ بورڈ کا خاص کام تو بس ٹیکس وصول کرنا ہے اسی وجہ سے وہ زیادہ ہر دلعزیز نہیں ہو سکتا۔

مقامی مجالس کی رائے دہندوں کی تعداد بھی بہت محدود ہے۔ چنانچہ اس کی سخت ضرورت ہے کہ رائے دہی کے لئے جو معیار مقرر کیا گیا ہے اسے کم کیا جائے تاکہ رائے دہندوں کی تعداد بڑھانے کا روزلیوشن خود نا منظور کر دیا تھا۔ غالباً کارپوریشن کے اراکین کی اکثریت اپنی موجودہ حالت پر قانع ہے۔ اس لئے انہیں کسی قسم کی تبدیلی کرنے یا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بلدی ادارے کامیابی اور کارگذاری کی کوئی اچھی مثال پیش نہیں کرتے۔ اگرچہ اس حالت میں بھی وہ ترقی یافتہ جمہوری ممالک کی بعض میونسپلٹیوں سے کم نہیں ہیں۔ عام طور پر ان میں بددیانتی نہیں پائی جاتی، البتہ نا اہلی ضرور ہے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کے ممبر اپنے عزیزوں اور دوستوں کی رعایت کرتے ہیں اور معاملات کی اہمیت کے صحیح تناسب سے ناواقف ہیں۔ لیکن یہ قدرتی امر ہے کیونکہ جمہوریت کی اہمیت کی صحیح تناسب سے ناواقف ہیں۔ لیکن یہ قدرتی امر ہے کیونکہ جمہوریت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کے پیچھے باخبر رائے عامہ ہو اور ہر شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہو۔ برخلاف اس کے ہمارے یہاں تو ہر طرف تحکم ہی تحکم نظر آتا ہے اور جمہوریت کے لوازم مفقود ہیں۔ نہ تو یہاں تعلیم عام ہے اور نہ رائے عامہ کو صحیح معلومات کی بنا پر تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ لوگ ذاتیات، فرقہ وارانہ کشاکش، یا اور چھوٹے چھوٹے قضیوں میں الجھ جاتے ہیں۔

میونسپلٹی کے معاملات میں حکومت کو صرف اتنی دلچسپی ہے کہ ''سیاسیات'' کا کہیں ذکر نہ آنے پائے۔ اگر وہ اپنی کسی قرارداد کے ذریعہ سے قومی تحریک کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے تو فوراً حکومت کے ابرو پر بل آجاتا ہے۔ میونسپل مدارس میں ایسی کتابیں پڑھانے کی بھی ممانعت ہے جن میں قوم پرستی کا شائبہ بھی ہو۔ یہاں تک کہ قومی لیڈروں کی تصویریں لگانا بھی ممنوع ہیں۔ میونسپلٹی کو یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اس کی عمارت سے قومی جھنڈا نہ اتارا گیا تو وہ معطل کردی جائے گی۔ ادھر کچھ عرصے سے اکثر صوبوں کی حکومتوں کو کد ہو گئی ہے کہ کارپوریشن اور میونسپلٹی کی ملازمت سے کانگریس والے نکال باہر کئے جائیں۔ عام طور پر اس مقصد کے حصول کے لئے میونسپلٹیوں پر دباؤ ڈالنا کافی ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ یہ دھمکی دی جاتی تھی کہ انہیں تعلیمی کاموں اور دوسرے مقاصد کے لئے جو سرکاری امداد ملتی ہے وہ روک دی جائے گی لیکن بعض صورتوں میں خصوصاً کلکتہ کارپوریشن کے معاملے میں یہ قانون بنا دیا گیا کہ جو شخص سول نافرمانی کے جرم میں یا حکومت کے خلاف کسی سیاسی تحریک کے سلسلے میں قید ہو چکا ہے وہ ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ طرز عمل خالص سیاسی وجوہ پر مبنی تھا۔ کیونکہ ان کی نااہلی یا ناموزونی کا کوئی سوال نہ تھا۔

ان چند مثالوں سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ ہماری میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو کتنی آزادی حاصل ہے اور ان میں جمہوریت کو کتنا دخل ہے حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین پر (جو ظاہر ہے کہ سرکاری ملازمت نہیں کرنا چاہتے) میونسپلٹی اور مقامی اداروں کے دروازے بند کرنے کی جو خاص کوشش کی وہ ذرا قابل غور ہے۔ اندازاً ۳ لاکھ افراد گذشتہ چودہ برس میں وقتاً فوقتاً جیل گئے۔ اس

میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ ان ۳۰ لاکھ آدمیوں میں سیاسیات سے قطع نظر بہت سے ایسے لوگ تھے جو ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ اثر آفریں، با اصول اور خدمت وایثار کا جذبہ رکھنے والے تھے۔ ان میں جوش اور عزم، قوت عمل اور دل و جان سے اپنے مقصد میں محو ہو جانے کی صفت تھی۔ غرض مفاد عامہ کے اداروں کو ان میں سے بہترین کارکن مل سکتے تھے۔ اس کے باوجود حکومت نے انتہائی کوشش کی بلکہ قانون تک نافذ کئے گئے کہ یہ لوگ ان اداروں میں نہ گھسنے پائیں گویا اسطرح ان کو اور ان کے ہمدردوں کو سزا دینا منظور تھا۔ حکومت نکمے لوگوں کو پسند کرتی ہے اور آگے بڑھاتی ہے پھر شکایت کرتی ہے کہ مقامی ادارے نا اہل ہیں اور لطف یہ ہے کہ گرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ سیاست ان مقامی اداروں کے دائرہ عمل سے خارج ہے لیکن اگر وہ حکومت کی حمایت میں سیاست میں حصہ لیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان کے مدرسوں کو ملازمت سے برطرفی کی دھمکی دیکر مجبور کیا گیا کہ وہ دیہات میں جا کر حکومت کی طرف سے پروپیگنڈہ کریں۔

گذشتہ پندرہ سال میں کانگریس کے کارکنوں کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے بھاری بھاری ذمہ داریوں کو بوجھ سنبھالا ہے اور کم سے کم ایک طاقتور اور منظم حکومت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس سخت ترین تربیت نے ان میں خود اعتمادی، لیاقت اور استقلال کی صفات پیدا کردی ہے۔ غرض ایک تحکم پسند حکومت نے ایک مدت کے نامزد بنانے والی کوششوں کے ذریعہ سے ہندوستانیوں میں جن خوبیوں کو فنا کر دیا تھا وہ اس تحریک نے پیدا کردی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس کی تحریک میں بھی دوسری عام تحریکوں کی طرح بہت سے نا لائق (بیوقوف، نا اہل اور اس سے بھی بدتر لوگ) بھر گئے تھے اور اب بھی موجود ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک کانگریسی کارکن عموماً اپنے برابر قابلیت رکھنے والے شخص سے زیادہ کارگزار اور اثر آفریں ہوتا ہے۔

اس مسئلے کے ایک پہلو پر شاید حکومت اور اس کے مشیروں کی نظر نہیں گئی اور وہ یہ ہے کہ ملک کے انقلاب پسند حکومت کی اس کوشش کو دل سے پسند کرتے ہیں کہ وہ کانگریسی کارکنوں کو تمام ملازمتوں سے محروم کر دے اور ان پر روزگار کے تمام دروازے بند کر دے۔ عام طور پر کانگریسی اس لئے بدنام ہیں کہ وہ فطرتاً انقلاب پسند نہیں ہوتے۔ نیم انقلابی تحریکوں کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد وہ پھر بے عملی کی زندگی کی بھول بھلیوں میں پھنس جاتے ہیں اور یا کوئی اور کاروبار اور پیشہ کرنے لگتے ہیں یا مقامی سیاست کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اہم مسائل ان کے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور وہ پچھلا انقلابی جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ ان کے چست اور مضبوط جسم پر چربی چھا جاتی ہے اور جوش و ہمت پر عافیت پسندی غالب آ جاتی ہے، اوسط طبقے کے کارکنوں کے اسی لازمی رجحان کو دیکھ کر زیادہ ترقی پذیر اور انقلاب پسند کانگریسی یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو کونسلوں اور میونسپلٹیوں وغیرہ کے آئینی گورکھ دھندوں میں پھنسنے سے روکیں اور انہیں ایسی ملازمت نہ کرنے دیں جن میں انہیں اپنا سارا وقت دینا پڑے اور وہ جوش عمل سے محروم ہو جائیں۔ حکومت نے کانگریسی کارکنوں کے روزگار حاصل کرنے کے راستے میں مشکلات حائل کر کے گویا ایک طرح سے ان کی مدد کی ہے۔ اب اس کا زیادہ امکان ہے کہ ان کا انقلابی جوش و خروش قائم رہے بلکہ اور بڑھ جائے۔

میونسپلٹی میں ایک سال سے زیادہ کام کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں کوئی کارآمد خدمت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا تھا کہ کام ذرا عجلت سے انجام پانے لگے اور کچھ بہتر ہو جائے۔ کوئی معقول تبدیلی عمل میں لانا بالکل ناممکن تھا اس لئے میں چیئرمین کے عہدے سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا لیکن تمام ممبروں نے مجھے مجبور کیا کہ میں استعفےٰ نہ دوں۔ سب لوگ میرے ساتھ بڑی مہربانی اور اخلاق سے پیش آتے تھے اس لئے میرے لئے یہ مشکل تھا کہ ان کی

رائے نہ مانوں۔ آخر کار دوسرے سال کے اختتام پر میں نے استعفے دے دیا۔

یہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے اسی سال موسم خزاں میں میری بیوی بہت سخت بیمار ہو گئیں اور مہینوں لکھنوء کے اسپتال میں پڑی رہیں۔ کانگرس کا اجلاس اس سال کانپور میں ہوا تھا چونکہ میں اب بھی کانگرس کا جنرل سیکرٹری تھا اس لئے ایک پریشانی کے عالم میں الہ آباد، کانپور لکھنوء دوڑا دوڑا پھرتا تھا۔

ڈاکٹروں نے میری بیوی کے متعلق یہ تجویز کیا کہ انہیں علاج کے لئے سوئزلینڈ لے جاؤ۔ میں نے بھی اسی خیال کو پسند کیا کیونکہ میں خود ہی ہندوستان سے باہر جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میرے خیالات دھندلے اور الجھے ہوئے تھے اور مجھے کوئی صاف اور سیدھی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں ہندوستان سے دور ہوں تو شاید مختلف چیزوں کو صحیح نظر سے دیکھ سکوں اور اپنے دماغ کی تاریکی کو دور کر سکوں۔

غرض مارچ ۳۲ء کے شروع میں میں اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ بمبئی سے وینس روانہ ہو گیا۔ اسی جہاز میں میری بہن اور بہنوئی رنجیت۔ ایس پنڈت بھی تھے۔ وہ ہم سے بہت پہلے یورپ کی سیر کا ارادہ کر چکے تھے۔

یورپ میں

میں تیرہ چودہ برس کے بعد یورپ جا رہا تھا۔ اس عرصے میں یورپ جنگ عظیم انقلابات، اور زبردست تبدیلیوں کے دور سے گزر چکا تھا۔ گویا وہ پرانی دنیا جسے میں نے دیکھا تھا جنگ کی تباہ کاریوں اور خونریزیوں کی نذر ہو چکی تھی اور اب ایک نئی دنیا میری منتظر تھی۔ میرا ارادہ چھ سات مہینے یا زیادہ سے زیادہ آخر سال تک یورپ میں ٹھہرنے کا تھا۔ لیکن مجھے پورے پونے دو برس وہاں قیام کرنا پڑا۔

اس زمانے میں میرے دماغ اور جسم دونوں کو بڑا سکون اور آرام نصیب ہوا ہم نے زیادہ وقت سوئزرلینڈ کے شہر جنیوا اور مونتانہ کی صحت گاہ میں گذارا۔ میری چھوٹی بہن کرشنا بھی ۱۹۲۶ء کی گرمیوں کے شروع میں ہندوستان سے آگئی اور آخر تک ہمارے ساتھ یورپ میں رہی۔ میں زیادہ عرصے تک اپنی بیمار بیوی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس لئے مجھے صرف تھوڑے تھوڑے دن کے لیے دوسرے مقامات پر جانے کا موقع ملا۔ جب انہیں کچھ صحت ہوگئی تو ہم نے فرانس، انگلستان اور جرمنی کی تھوڑی سیر کی۔ پہاڑ کی چوٹی پر جو چاروں طرف سرمائی برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں ہندوستان اور یورپ دونوں سے بالکل بے تعلق ہو گیا تھا خصوصاً ہندوستان اور وہاں کے واقعات سے تو کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ میں دنیا میں اس طرح نظر ڈالتا تھا جیسے کوئی دور سے تماشہ دیکھ رہا ہوں۔ کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا واقعات کا مشاہدہ کرتا تھا، یورپ کی سیاسی اور اقتصادی حالت اور آزادانہ معاشرتی تعلقات کو غور سے دیکھتا تھا اور ان سب چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جنیوا کے قیام کے زمانے میں انجمن اقوام اور بین الاقوامی لیبر آفس کے کاموں سے مجھے خاص دلچسپی تھی۔

لیکن سردی شروع ہوتے ہی میں سرمائی کھیلوں میں محو ہو گیا۔ کئی مہینے تک یہی میرا شغل اور یہی شوق رہا۔ برف پر پھسلنے کی مشق تو میں نے پہلے بھی کی تھی، لیکن دو

تین گز لمبی کھڑانویں پہن کر برف پر چلنا میرے لئے نئی چیز تھی اور مجھے بہت پسند آئی۔ شروع شروع میں تو بڑی تکلیف ہوئی لیکن بار بار گرنے کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور آخر کار اس میں لطف آنے لگا۔

بحیثیت مجموعی زندگی دلچسپی واقعات سے خالی تھی۔ دن گذرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری بیوی کو صحت اور طاقت حاصل ہوتی گئی۔ اس عرصے میں ہم بہت کم ہندوستانیوں سے ملے بلکہ اس چھوٹی سی پہاڑی بستی کے باشندوں کے سوا اور لوگوں سے ملنے کا موقع ہی بہت کم حاصل ہوا۔ پھر بھی یورپ کے اس پونے دو برس کے قیام میں چند ہندوستانی جلاوطنوں اور پرانے انقلاب پسندوں سے ملاقات ہوئی جن کے نام میں نے اکثر سنے تھے۔

ان میں سے ایک صاحب شیام جی کرشن ورما تھے جو اپنی بیمار بیوی کے ساتھ جنیوا میں ایک مکان کی سب سے بالائی منزل میں مقیم تھے۔ یہ دونوں بڈھے بڑھیا بالکل تنہا رہتے تھے انکے یہاں کوئی نوکر نہ تھا۔ ان کے کمرے بند بند اور گھٹے ہوئے تھے۔ ہر چیز پر گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ شیام جی کے پاس روپیہ بہت تھا لیکن وہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ چند پیسے بچانے کے لئے ٹریم پر جانے کی بجائے پیدل چلنا گوارا کرتے تھے۔ ہر شخص کو جو ان کے پاس آتا تھا شبے کی نظر سے دیکھتے تھے، اور جب تک اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے، یہی سمجھتے تھے کہ یا تو یہ انگریزوں کا جاسوس ہے یا میرے روپے کی تاک میں ہے۔ ان کی جیبوں میں ان کے رسالے (انڈین سوشیالوجسٹ) کے پرانے پرچے بھرے رہتے تھے اور جہاں موقع ہوتا بڑے جوش سے انہیں نکال کر بارہ برس پہلے کا لکھا ہوا اپنا کوئی مضمون دکھاتے تھے۔ وہ اگلے وقتوں کی باتیں کیا کرتے تھے کہ ہمپسٹیڈ کے انڈیا ہاؤس میں یہ ہوا اور یہ ہوا۔ برطانوی حکومت نے میرے پیچھے فلاں فلاں جاسوس لگائے، میں نے انہیں اس طرح پہچانا اور یوں چکمہ دیا۔ ان کے کمروں کی تمام دیواروں پر

الماریاں لگی ہوئی تھیں جن میں پرانی کتابیں بھری تھیں لیکن سب گرد آلود اور بے ترتیب تھیں اور آنے والوں کو حسرت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ فرش پر بھی کتابیں اور کاغذات منتشر پڑے رہتے تھے اور اکثر اسی حالت میں انہیں دن اور ہفتے بلکہ مہینے گذر جاتے تھے۔ غرض ساری فضا پر اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی وہاں ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت رکھتی تھی۔ انسان اس مکان کے تاریک اور سنسان بر آمدوں میں سے گذرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں موت کے فرشتے سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے اور وہاں سے باہر نکل کر اطمینان کا سانس لیتا تھا۔

شیام جی کا خیال تھا کہ اپنے روپے کا کچھ انتظام کر دیں یعنی کسی رفاہ عام کے کام کے لئے ایک وقف قائم کر دیں۔ ان کا رجحان زیادہ تر ہندوستانیوں کو غیر ممالک میں تعلیم دلانے کی طرف تھا۔ انہوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں بھی ایک متولی بن جاؤں۔ لیکن میں نے اس ذمہ داری کو اپنے سر لینے کے لئے کچھ زیادہ آمادگی ظاہر نہیں کیا۔ اول تو میں ان کی مالی معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ اگر میں نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا تو انہیں فوراً یہ خیال ہو جائے گا کہ میں بھی ان کے رپے کی فکر میں ہوں۔ کسی کو ان کی دولت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور سنا تھا کہ جرمن مارک کا بھاؤ گرا تو انہیں بہت نقصان ہوا تھا۔

جنیوا میں اکثر بڑے بڑے ہندوستانی آتے رہتے ہیں۔ لیگ اقوام کے جلسوں کی شرکت کے لئے عموماً سرکاری قسم کے آدمی آتے تھے اس لئے شیام جی ان کے پاس تو پھٹکتے بھی نہ تھے البتہ لیبر آفس میں کبھی کبھی مشہور و معروف غیر سرکاری لوگ اور مقتدر کانگریسی بھی آجاتے تھے۔ شیام جی ان سے ملنے کی ضرور کوشش کرتے اور یہ مشاہدہ نہایت ہی لطف ہوتا کہ ان پر شیام جی کی ملاقات کا کیا اثر ہوتا ہے۔ عموماً وہ ان سے گھبراتے تھے، عام صحبتوں میں ان سے بچنے کی کوشش

کرتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا گھر پر ملنے سے بھی عذر کر دیتے تھے۔ ان سے ملنا جانا یا ان کے صحبت میں دیکھا جانا خطرناک سمجھا جاتا ہے۔

اس طرح شیام جی اور ان کی بیوی اپنے گوشہ عزلت میں زندگی کے دن پورے کرتے تھے، نہ ان کے کوئی اولاد تھی نہ عزیز و اقارب، نہ دوست احباب نہ انہیں کسی چیز سے کوئی تعلق تھا نہ کسی شخص سے کوئی واسطہ۔ گویا وہ گذرے ہوئے زمانے کی یادگار تھے اور اپنا وقت مدت کا ختم کر چکے تھے۔ جدید عہد میں وہ کسی طرح نہیں کھپتے تھے۔ دنیا انہیں نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی لیکن ان کی آنکھوں میں اب بھی پرانی آگ کے شرارے موجود تھے اور اگرچہ مجھ میں اور ان میں بہت کم چیزیں مشترک تھیں پھر بھی مجھے ان سے پوری ہمدردی تھی اور میں ان کا بہت ادب کرتا تھا۔

حال ہی میں اخباروں سے ان کے انتقال کا حال معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہی اس شریف گجراتی خاتون کی موت کی خبر ملی جس نے اس جلاوطنی کے زمانے میں تمام عمر ان کا ساتھ دیا۔ سنا گیا ہے کہ اس خاتون نے غیر ممالک میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے لئے بہت کافی رقم چھوڑی ہے۔

ایک اور مشہور شخص جن کا میں اکثر نام سنا کرتا تھا مگر جن سے ملنے کا پہلے پہل سوئزرلینڈ میں اتفاق ہوا۔ راجہ مہندر پرتاپ تھے۔ ان دنوں وہ بڑے دلچسپ رجائیت پسند آدمی تھے اور شاید اب بھی ہوں۔ وہ ایک خیالی دنیا میں رہتے تھے حقیقی زندگی سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ میں پہلی مرتبہ انھیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ عجیب قسم کا مخلوط لباس پہنے ہوئے تھے جو تبت کے پہاڑوں یا سائبریا کے میدانوں کے لئے تو موزوں ہو سکتا تھا لیکن ماٹریو میں گرمیوں ے زمانے میں تو بالکل بے تکلف معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک نیم فوجی قسم کی پوشاک اور اونچے روسی بوٹ ڈانٹے ہوئے تھے۔ ان کے کوٹ میں بہت سی بڑی بڑی جیبیں لگی تھیں اور سب میں

کاغذات اور تصویریں وغیرہ بھری رہتی تھیں۔ ان میں جرمنی کے چانسلر بتھ مین ہالوگ کا ایک خط تھا، قیصر کی دستخطی تصویر تھی، تبت کے دلائی لامہ کا دیا ہوا ایک خوبصورت خریطہ تھا اور قسم قسم کے کاغذات اور فوٹو تھے۔ تعجب ہوتا تھا کہ ان جیبوں میں اتنی چیزیں کیسے سما گئیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ چین میں ان کا صندوقچہ جس میں بہت سے قیمتی کاغذات تھے کھو گیا تھا۔ اس وقت سے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ اپنے تمام ضروری کاغذات ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔اسی لئے اس کثرت سے جیبیں لگوائی تھیں۔

راجہ مہندر پرتاپ اپنی چین، جاپان، تبت اور افغانستان کی سیاحی اور مہمات کے بے شمار داستانیں سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے بڑی رنگ برنگ کی زندگی گزاری تھی اس لئے اس کا تذکرہ واقعی بہت دلچسپ تھا۔ ان کا تازہ ترین شوق ''مجلس شادمانی'' تھی جو خود انھوں نے قائم کی تھی اور جس کا مسلک یہ تھا کہ ''ہمیشہ خوش رہو''اس انجمن کو لیٹویا میں (یا شاید لتھونیا میں) سب سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ جنیوا میں یا دوسرے مقامات پر جو کانفرنسیں ہوتی تھیں ان کے شرکاء کے نام وقتاً فوقتاً وہ بہت سے پوسٹ کارڈ بھیجا کرتے تھے جن پر ان کا پیام چھپا ہوتا تھا۔ اس کو وہ پروپیگنڈہ کہتے تھے۔ ان پیامات کے نیچے وہ اپنے ہاتھ سے دستخط کرتے تھے لیکن جو نام لکھتے تھے وہ ایک عجیب طول طویل معجون مرکب تھا۔ انھوں نے مہندر پرتاپ کے تو صرف ابتدائی حروف (م۔پ) لے لئے تھے اور اس کے بعد ناموں کی ایک لمبی فہرست تھی، جن میں ان کے ہر محبوب ملک کا یک ایک نام شامل تھا اس طرح وہ اپنے بین الاقوامی اور آفاقی حیثیت کا اظہار کرتے تھے۔ یہ انوکھا نام ''خادم انسانیت'' کے موزوں لقب پر ختم ہوتا تھا۔ بہت مشکل تھا کہ کوئی شخص مہندر پرتاپ کی باتوں کو سنجیدگی سے سن سکے۔ وہ قرون وسطیٰ کی داستان کے ہیرو معلوم ہوتے تھے، گویا ڈان کوئکسوٹ راہ بھٹک کر بیسویں صدی میں آنکلے

تھے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بتہ کھرے اور پر خلوص آدمی تھے۔

فرانس میں ہم بوڑھی مادام کاما سے ملے۔ جب وہ قریب سے انسان کے چہرے کو گھورتی تھیں اور انگلی سے اشارہ کر کے ڈپٹ کر پوچھتی تھیں کہ تم کون ہو تو اس پر ایک ہیبت سی چھا جاتی تھی۔ اس سوال کے جواب پر وہ کوئی توجہ نہیں کرتی تھیں۔ (غالباً اس قدر بہری تھیں کہ سنتی بھی نہیں تھیں) خود ہی ایک رائے قائم کر لیتی تھیں اور پھر اس سے نہیں ہٹتی تھیں، خواہ واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہو۔

ہندوستانی جلاوطنوں میں ایک شخص مولوی عبید اللہ بھی تھے جن سے میں تھوڑی دیر کے لئے اٹلی میں ملا تھا۔ وہ مجھے بہت تیز آدمی معلوم ہوئے لیکن اس قسم کے جو پرانے طرز کی سیاسی جوڑ توڑ کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ جدید خیالات سے وہ باخبر نہیں تھے۔ انھوں نے "ریاسہائے متحدہ ہند" یا "ہندوستان کی متحدہ جمہوریت" کی ایک اسکیم تیار کی تھی جس میں فرقہ وارانہ مسائل کو بی قابلیت سے حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے قیام استنبول کے (جو اس وقت قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا) بہت سے واقعات سنائے۔ لیکن میں نے اس داستان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی اور مجھے اس کا خیال بھی نہیں رہا۔ چند مہینے بعد وہ لالہ لاجپت رائے سے ملے اور غالباً ان کو بھی وہی قصہ سنایا۔ لالہ جی اس سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ اسی سال کونسلوں کے انتخاب کے سلسلے میں اس قصے کا بہت چرچا رہا اور اس سے طرح طرح کے بیچ اور حیرت انگیز نتائج اخذ کئے گئے۔ کچھ دن کے بعد مولوی عبید اللہ حجاز چلے گئے اور اب برسوں سے مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملی ہے۔

برلن میں مجھے ایک اور مولوی صاحب یعنی مولوی برکت اللہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بالکل دوسری قسم کے تھے۔ یہ ایک بڑے دلچسپ، نہایت جوشیلے اور نہایت خوش خلق بزرگ تھے۔ سیدھے سادے آدمی تھے اور کچھ زیادہ قابل اور ذہین بھی

نہیں تھے لیکن نئے خیالات کو جذب کرنے اور دنیا کی رفتار کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں جب ہم سوئزرلینڈ میں تھے تو ہم کو معلوم ہوا کہ سین فرانسسکو میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھے یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔

برلن میں بہت سے ایسے لوگ ملے جنہوں نے جنگ کے زمانے میں وہاں ایک ''ہندوستانی کمیٹی'' قائم کی تھی۔ لیکن یہ کمیٹی عرصہ ہوا منتشر ہو چکی تھی۔ اس کے ارکین میں آپس میں اختلاف پیدا ہوا اور طرح طرح کے جھگڑے ہوئے کیونکہ ان میں سے ہر شخص دوسرے پر غداری کا شبہ کرتا تھا۔ سیاسی جلاوطنوں کی ہر جگہ یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ جرمنی میں جنگ کے بعد روزگار میسر آنا بہت مشکل تھا پھر بھی برلن کے ان ہندوستانیوں میں سے اکثر نے جب موقع ملا اوسط درجے کے پرسکون پیشے اختیار کر لئے اور تمام انقلابی تحریکوں سے علیحدہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ سیاست سے بھی بچنے لگے۔

جنگ کے زمانے کی اس ہندوستانی کمیٹی کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس کے ارکین میں زیادہ تر وہ ہندوستانی طالب علم تھے جو ۱۹۱۴ء کی ہنگامہ زا گرمیوں میں جرمنی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے تھے۔ وہ جرمن طلبہ کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے گیت گاتے تھے۔ ان کے کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ بیئر پیتے تھے اور ان کی تہذیب کو ہمدردی اور قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جنگ سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ اس قومی جنون کے سیلاب سے نہ بچ سکے جو اس وقت جرمنی کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ اصل میں ان میں جرمنکی دوستی کا جذبہ نہیں بلکہ برطانیہ کی دشمنی کا جذبہ کارفرما تھا اور ان کی وطن پرستی نے انہیں برطانیہ کے دشمنوں کا ہمدرد بنا دیا تھا۔ جنگ چھڑنے کے بعد ہی اور ہندوستانی جو زیادہ کھلے ہوئے انقلابی تھے سوئزرلینڈ کے راستے جرمنی پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے اپنی ایک کمیٹی بنائی اور فوراً ہر دیال کو طلب کیا جو اس وقت امریکہ کے مغربی ساحل پر تھے۔

ہردیال تو چند مہینے بعد پہنچے لیکن اس عرصے میں کمیٹی کو خاصی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اصل میں جرمن حکومت نے خود ہی اسے اہمیت دے دی تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ برطانیہ کی ہر مخالف تحریک سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ دوسری جانب ہندوستانی اس وقت کے بین الاقوامی معاملات کو اپنے قومی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے مگر انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ جرمنی محض اپنے مفاد کے لئے ان کو آلہ کار بنائے۔ اگرچہ اس وقت وہ جرمن حکومت کے بس میں تھے مگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جسے حاصل کرنے کے لئے یہ حکومت بے چین ہے۔ اس لئے انہوں نے سودا چکانا شروع کردیا اور اس پر اصرار کیا کہ ہندوستان کی آزادی کا قول وقرار کرلیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کے دفتر خارجہ نے ان سے کوئی باضابطہ معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر جنگ میں جرمنی کو فتح حاصل ہوئی تو وہ ہندوستان کو آزاد ملک تسلیم کرلے گا۔ اس وعدے پر اور بعض اور جزوی شرائط پر ہندوستانی کمیٹی نے جنگ میں جرمنی کو مدد کرنے کا اقرار کیا تھا۔ غرضیکہ اس کمیٹی کا سرکاری طور پر ہر طرح کا اعزاز و اکرام ہوتا تھا۔ اور اس کے نمائندوں کو مختلف سلطنتوں کے سفیروں کے برابر جگہ دی جاتی تھی۔

ایک چھوٹی سی جماعت کو جو زیادہ تر ناتجربہ کار نوجوانوں پر مشتمل تھی یکا یک اتنی اہمیت حاصل ہو جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں اکثروں کے سر پھر گئے۔ وہ سمجھنے لگے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ بدل رہے ہیں اور کوئی زبردست کارنامہ اور عظیم الشان مہم سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کو عجیب عجیب حادثات پیش آئے۔ بڑے بڑے خطرات سے بال بال بچے۔ جنگ کے اختتام کے زمانے میں ان کی اہمیت بہت کم ہوگئی تھی اور حکومت جرمنی نے انہیں نظر انداز کرنا شروع کردیا۔ ہردیال کا پتا تو بہت پہلے کٹ چکا تھا۔ کیونکہ کمیٹی سے ان کی بالکل نہ نبھی۔ حکومت جرمنی اور کمیٹی دونوں انہیں ناقابل اعتماد شخص سمجھے تھے اس لئے

انہوں نے بہت خاموشی سے رفتہ رفتہ انہیں کھسکا دیا۔ بہت مدت بعد جب ۱۹۲۶ء و ۱۹۲۷ء میں، میں جرمنی گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یورپ کہ اکثر قدیم باشندے ہردیال کے متعلق کتنے برے خیالات رکھتے تھے۔ اس وقت وہ سویڈن میں مقیم تھے۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

جنگ ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہیبرلن کی ہندوستانی کمیٹی بھی ختم ہو گئی۔ تمام امیدوں کے خاک میں مل جانے کے بعد ان ہندوستانیوں کو زندگی دوبھر ہو گئی، یہ لوگ بہت اونچی بازی لگا کر ہار گئے تھے اور یوں بھی جگن کے زمانے کی سرگرمی اور اہمیت کے بعد انہیں زندگی بہت بے مزہ معلوم ہوتی ہو گی اور پھر اس بے مزہ زندگی میں بھی انہیں اطمینان نصیب نہ تھا۔ ہندوستان تو واپس جا ہی نہیں سکتے تھے اور جنگ کے بعد شکست خوردہ جرمنی میں رہنا آسان نہ تھا بیچارے بڑی کشمکش میں بسر کرتے تھے بعد میں ان میں سے بعض لوگوں کو حکومت برطانیہ نے ہندوستان واپس جانے کی اجازت دیدی لیکن اکثر کو جرمنی ہی میں ٹھہرنا پڑا۔ ان کی حیثیت عجیب و غریب تھی۔ لوئی سلطنت انھیں اپنی رعیت تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان کے پاس باضابطہ پاسپورٹ نہیں تھے اس لئے جرمنی سے باہر قدم نکالنا ممکن تھا اور وہاں رہنے میں بھی بڑی مشکلوں کا سامنا تھا کیونکہ وہ سراسر مقامی پولیس کے رحم و کرم پر تھے۔ غرض ان کی زندگی خطرے اور مصیبت سے پر تھی۔ آئے دن کی پریشانیاں اور روزی کی فکر چین نہیں لینے دیتی تھی۔

۱۹۳۳ء کے آغاز میں نازی دور شروع ہوا۔ اس نے ان کی مصیبتوں میں اور اضافہ کر دیا۔ ان نے سے مفر کی یہی ایک صورت تھی کہ نازی اصولوں کو حرف بحرف تسلیم کر لیں۔ جرمنی میں اب ان غیر ملکیوں کو جو نازی (۱) نسل سے نہ ہوں خصوصاً ایشیا والوں کا رہنا پسند نہیں کیا جاتا۔ ہاں اگر وہ حکومت کی مرضی پر چلیں تو ان کو وجود گوارا کر لیا جاتا ہے ہٹلر علی الاعلان یہ کہہ چکا ہے کہ وہ ہندوستان میں

برطانوی شہنشاہی کا حامی ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ وہ برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چند ہندوستانیوں سے حکومت برطانیہ ناخوش ہے ان سے اسے کوئی ہمدردی نہیں۔

برلن میں ہم ایک اور جلاوطن سے ملے جو زمانہ جنگ کی ہندوستانی جماعت کے خاص رکن تھے ان کا نام چمپک رمن پلے تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتے تھے اور نوجوان ہندوستانی طلبہ نے انہیں طنز کے طور پر ایک شاندار خطاب (۲) دے رکھا تھا۔ ان کا تصور خالص قوم پرستی تک محدود تھا اور کسی مسئلے کو سماجی یا اقتصادی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ جرمن قوم پرستوں (یعنی فولادی خود والوں) کے ساتھ ان کی خوب نبھتی تھی۔ وہ جرمنی کے ان معدودے چند ہندوستانیوں میں تھے جن کے نازیوں سے میزان پٹ گئی تھی۔ ابھی چند مہینے ہوئے میں نے جیل میں پڑھا کہ برلن میں ان کا انتقال ہو گیا۔

دریندرناتھ چٹوپادھیائے جو ہندوستان کیا یک مشہور خاندان کے فرد تھے، بالکل دوسری قسم کے شخص تھے۔ عام طور پر وہ چٹو کے نام سے مشہور تھے اور بڑے قابل اور دلچسپ آدمی تھے۔ بیچارے ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے، پھٹے پرانے کپڑے پہن کر گزر کرتے تھے اور کبھی کبھی فاقے کی نوبت آجاتی تھی۔ مگر خوش مزاجی اور زندہ دلی نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جب میں انگلستان میں تعلیم پاتا تھا تو وہ مجھ سے چند جماعت آگے تھے۔ یعنی جس وقت میں ہیرو میں داخل ہوا تو وہ آکسفورڈ میں پڑھتے تھے۔ اس کے بعد سے پھر انہیں ہندوستان آنا نصیب نہیں ہوا۔ کبھی کبھی انہیں وطن کی یاد ستاتی ہے اور ہندوستان واپس آنے کے لئے تڑپتے ہیں۔ وطن سے ان کے تمام تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور یہ یقینی امر ہے کہ یہاں آکر ان کا جی گھبرائے گا اور یہاں کی زندگی میں نہ کھپ سکیں گے۔ لیکن اتنی مدت گزر جانے کے بعد، اس جہاں گردی کے باوجود وطن کی کشش اب بھی باقی

ہے۔ یہ روگ جسے میزینی نے "روحانی دق" کہا ہے، سب جلاوطنوں میں عام ہے
کوئی اس سے نہیں بچ سکتا۔ اگرچہ میں سیاسی جلاوطنوں کی قربانیوں کی دل سے قدر
کرتا ہوں اور مجھے ان کی مصیبتوں اور مشکلوں کا اعتراف اور ان سے ہمدردی ہے
لیکن یہ واقعہ ہے کہ جن سے ملنے کا مجھے اتفاق ہوا ان میں بیشتر حضرات سے میں
کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو دنیا کے مختلف
حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم نام سے جانتے ہیں۔ باقی
سب لوگ ہندوستان سے بے تعلق ہو گئے ہیں اور ان کے ہم وطن جن کی خاطر
انہوں نے مصیبتیں جھیلیں، انہیں بالکل بھول گئے ہیں۔ بہر حال جن چند
جلاوطنوں سے میں ملا، ان میں سے صرف چٹوپادھیا اور ایم این رائے کی قابلیت
نے مجھے متاثر کیا۔ رائے سے ماسکو میں صرف آدھ گھنٹے کی ملاقات ہوئی۔ اس
وقت وہ بہت مشہور اشتراکی تھے۔ لیکن بعد میں وہ کومنٹرن کی خالص اشتراکیت
سے بہت ہٹ گئے تھے۔ اب تین سال سے وہ ہندوستا میں قید ہیں۔ چٹو جہاں
تک مجھلے معلوم ہے باضابطہ اشتراکی نہیں تھے لیکن ان کا رجحان اشتراکیت کی طرف
ضرور تھا۔ اور سینکڑوں ہندوستانی یورپ میں مارے مارے پھرتے ہیں وہ انقلابی
طرز کی گفتگو کرتے ہیں۔ انوکھی من چلے پن کی تجویزیں سمجھاتے ہیں اور عجیب و
غریب سوالات کرتے ہیں ان پر برطانیہ کے جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

ہم بہت سے یورپیوں اور امریکیوں سے بھی ملے۔ جنیوا سے کئی بار روماں
رولاں کی زیارت کے لئے وے نودے بھی گئے۔ پہلی مرتبہ ہم گاندھی جی کا تعارفی
خط لے گئے تھے۔ ارنسٹ ٹولر کی ملاقات بھی ایک قابل قدر یادگار ہے۔ یہ جرمن
زبان کا نوجوان شاعر اور ڈراما نویس ہے لیکن اب نازیوں کے دور میں وہ جرمن نہیں
رہا ہے۔ نیو یارک کی سول لبرٹیز یونین کے بانی، روجر بالڈون کی ملاقات پر بھی
ہمیں فخر ہے۔ جنیوا میں مشہور مصنف دھن گوپال مکرجی سے ہماری دوستی ہو گئی

تھی۔ وہ عرصے سے امریکہ میں بود و باش اختیار کر چکے ہیں۔

یورپ کی روانگی سے پہلے میں ہندوستان ہی میں آکسفورڈ کی تحریک کے علمبردار فرینک بچمیں سے بھی ملا تھا۔انہوں نے اپنی تحریک کے متعلق چند کتابیں مجھے دی تھیں اور میں نے بڑے استعجاب کے ساتھ انہیں پڑھا تھا۔ یہ فوری تبدیل عقائد، اعتراف گناہ اور احیائے مذہب کی عام فضا۔ علم و عقل کے ساتھ کچھ کھپتی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگ جو بظاہر سمجھ دار معلوم ہوتے ہیں ان عجیب و غریب خیالات کو کیسے گوارا کر لیتے ہیں اور کیونکہ ان سے اتنے متاثر ہو جاتے ہیں مجھے اس تحریک کے مطالعہ کا اشتیاق پیدا ہو گیا اور جنیوا میں فرینک بچمیں سے پھر ملا انہوں نے مجھے اپنی بین الاقوامی ہاؤس پارٹی میں شرکت کی دعوت دی جو شاید رومانیہ میں ہونے والی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ وہاں جا کر میں اس نئی جذباتی تحریک کو قریب سے نہ دیکھ سکا۔میرا اشتیاق اب بھی باقی ہے اور جتنا زیادہ مجھے اس تحریک کی ترقی کا علم ہوتا ہے اتنی ہی حیرت بڑھتی ہے۔

ا۔ لانبے قد گورے رنگ اور لمبوترے سر کی نسل جو ناروے، سویڈن، جرمنی اور شمالی برطانیہ میں آباد ہے۔

۲۔ ہندوستانی انہیں ''گبھام رات'' کہا کرتے تھے جو جرمنی میں ''رائٹ آنر یبل'' کے مساوی ہے۔

ہندوستان میں پھوٹ

ہم ابھی سوئز رلینڈ پہنچے ہی تھے کہ انگلستان میں عام ہڑتال ہوگئی۔ یہ سن کر میں جوش سے بیتاب ہوگیا- فطرتاً مجھے ہڑتالیوں سے ہمدردی تھی- چندروزبعد جب ہڑتال ناکام ہوئی تو مجھے ذاتی طور پر صدمہ ہوا- کچھ مہینے بعد مجھے چندروز کے لئے انگلستان جانے کا اتفاق ہوا- کان کنوں کی جنگ ابھی جاری تھی اور رات کے وقت لندن میں نیم تاریکی کا عالم رہتا تھا- میں خود کانوں کے علاقے میں گیا- غالباًیہ ڈربی شائر میں واقع تھا۔ میں نے مردوں، عورتوں، بچوں کے فلاکت زدہ اوراترے ہوئے چہرے دیکھے۔ اس سے زیادہ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بہت سے ہڑتالیوں اوران کی بیویوں پر مقامی عدالت میں مقدمے چل رہے تھے۔ کوئی کی کانوں کے ڈائرکٹریا منیجر خودہی مجسٹریٹ تھے۔ وہ ان مقدموں کی سماعت کرتے تھےاور چھوٹے سے چھوٹے جرموں پر ہنگامی قوانین کے ماتحت کان کنوں کوسزائیں دیتے تھے۔ ایک مقدمے پرتو مجھے بڑا غصہ آیا۔ تین چار عورتیں پیش ہوئیں جن کی گودوں میں ننھے ننھے بچے تھے۔ ان غریبوں کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے ہڑتال میں شریک نہ ہونے والوں پر لعن طعن کی تھی۔ یہ نوجوان مائیں اوران کے بچے دونوں مصیبت اورفاقوں کے مارے معلوم ہوتے تھے۔ اس طویل جنگ نے ان کی اپلیتھن نکال دیا تھا، اوران کے دلوں میں ان لوگوں کی طرف سے جو ہڑتال میں شریک نہیں ہوئی تھے اوران سے ان کی روزی چھین رہے تھے۔ نفرت پیدا ہوگئی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں انصاف ایک طبقے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تو اس کی مثالیں عام ہیں۔ لیکن کم سے کم انگلستان میں مجھے یہ توقع نہ تھی، کہ اس کی ایسی کھلی ہوئی مثال نظر آئے گئی۔ اسی وجہ سے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ ایک اور چیز سے بھی مجھے بڑی حیرت ہوئی یعنی وہاں کے ہڑتالی بالکل سہمے ہوئے

تھے۔ پولیس اور حکام نے انھیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اس ذلت آمیز سلوک کو بڑی مسکینیت سے برداشت کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس طویل جنگ نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ ان کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں اور دوسری مزدور انجمنوں کے لوگ انھیں بیچ منجھدار میں چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ پھر بھی ان اور ہندوستان کے غریب مزدوروں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ برطانوی کان کنوں کی اب بھی ایک طاقت اور انجمن موجود تھی۔ ساری قوم بلکہ ساری دنیا کی مزدور انجمنوں کی ہمدردی انھیں حاصل تھی اور نشر و اشاعت کے ذرائع اور دوسرے قسم کے طرح طرح کے وسائل میسر تھے ہندوستانی مزدوروں کو یہ چیزیں بھلا کہاں نصیب! لیکن پھر بھی دونوں کے سہمے ہوئے چہروں میں بہت مشابہت تھی۔

ہندوستان میں اس سال اسمبلی اور کونسلوں کے سہ سالہ انتخابات ہونے والے تھے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس سلسلے میں جو ہنگامہ خیز بحثیں چھڑیں ان کی بھنک سوئٹزرلینڈ میں میرے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے نے سوراج پارٹی کی مخالفت میں ایک نئی پارٹی بنائی ہے، جس کا نام نیشنلسٹ پارٹی ہے۔ نہ اس وقت میری سمجھ میں آیا اور نہ اب تک میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ آخر کن اصولوں کی بنا پر یہ نئی پارٹی پرانی پارٹی سے علیحدہ ترتیب دی گئی۔ سچ پوچھئے تو آج کل ہندوستان کی اکثر پارٹیوں میں محض نام کا فرق ہے۔ کوئی اصولی اختلاف نہیں، اس میں شک نہیں کہ سوراج پارٹی نے پہلے پہل کونسلوں میں ایک نئے اور جارحانہ طرز عمل کا نمونہ پیش کیا اور ایک انتہا پسندانہ پالیسی اختیار کی لیکن اس میں اور دوسری پارٹیوں میں فرق صرف درجے کا تھا، ورنہ تھیں سب ایک ہی قسم کی۔

یہ نئی نیشنلسٹ پارٹی نسبتاً اعتدال پسندانہ خیالات رکھتی تھی اور سوراج پارٹی کی بہ نسبت اس کا رجحان حکومت کی طرف زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ خالص ہندو پارٹی

تھی اور مہا سبھا کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی۔ مالویہ جی کا اس کی رہبری کرنا قدرتی بات تھی کیونکہ خود ان کا پبلک معاملات میں قریب قریب یہی رویہ تھا۔ پرانے تعلقات کی وجہ سے وہ کانگریس کے ممبر تو رہے، لیکن خیالات کے اعتبار سے ان میں اور لبرلوں یا اعتدال پسندوں میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ وہ ترک موالات یا کانگریس کی عملی جدوجہد کے نئے طریقے کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور کانگریس کی پالیسی کے طے کرنے میں ان کو کوئی دخل نہ تھا۔ اگرچہ کانگریس والے اب بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ لیکن سچ پوچھئے تو جدید کانگریس میں ان کی کھپت نہیں ہو سکتی تھی وہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نہیں تھے اور انھوں نے کانگریس کے احکام کی خصوصاً آئین ساز مجالس کے معاملے میں تعمیل نہیں کی تھی۔ ہندو مہا سبھا میں وہ سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھے اور فرقہ وارانہ معاملات میں ان کی پالیسی کانگریس سے بالکل مختلف تھی۔ کانگریس سے انھیں وہ جذباتی تعلق تھا جو کسی شخص کو اس ادارے سے ہوا کرتا ہے جس سے شروع سے اس کا تعلق رہا ہو اور پھر یہ بھی تھا کہ جنگ آزادی کی کشش انھیں اپنی طرف کھینچتی تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ملک میں کانگریس ہی ایک ایسی جماعت ہے جو اس معاملے میں کوئی موثر کام کر رہی ہے۔ گویا ان کا دل تو اکثر کانگریس کے ساتھ ہوتا تھا۔ خصوصاً جب جنگ چھڑی ہوئی ہو۔ لیکن ان کا دماغ دوسروں کی طرف ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے نفس ہمیں ہمیشہ ایک کش مکش رہا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی وہ ایک وقت میں دو مخالف راستوں پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قومی معاملات میں ایک خلفشار پیدا ہو جاتا تھا۔ لیکن قوم پرستی خود ایک معجون مرکب ہے اور مالویہ جی خالص قوم پرست تھے۔ سماجی یا اقتصادی تبدیلیوں سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تمدنی سماجی اقتصادی ہر حیثیت سے قدیم دقیانوسی نظام کے حامی رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔

چنانچہ ہندوستان کے والیان ریاست تعلقہ دار اور بڑے بڑے زمیندار انھیں بجا طور
پر اپنا محسن اور مربی تصور کرتے ہیں۔ وہ صرف اتنی تبدیلی چاہتے ہیں اور دل سے
چاہتے ہیں کہ غیر ملکی قبضہ ہندوستان سے اٹھ جائے۔ ان کی نوجوانی کی سیاسی
تربیت اور مطالعہ اب بھی ان کے دماغ پر حاوی ہے اور وہ بیسویں صدی کی دنیا کو جو
جنگ عظیم کے بعد حرکت پسند اور انقلاب پذیر بن گئی انیسویں صدی کے سکون پسند
خیالات، ٹ۔ ہ گرین، جان اسٹوارٹ مل، گلیڈ اسٹون اور مارلے کے عینک
سے تین چار ہزار سال پرانے ہندو تہذیب و تمدن کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ یہ ایک
عجیب مخلوط اور متضاد نقطہ نظر ہے لیکن مالوی جی کو اپنے اوپر بھروسا ہے کہ وہ ہر قسم کے
متضاد خیالات میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ مسلسل قومی خدمات جو ابتدائے
عمر سے اب تک مختلف میدانوں میں انجام دیتے رہے۔ وہ غیر معمولی کامیابی جو
انھیں ہندو یونیورسٹی جیسا زبردست قومی ادارہ قائم کرنے میں حاصل ہوئی۔ ان کا
جوش اور خلوص ان کا کمال خطابت، ان کی نرمی اور بردباری، ان کی دلکش شخصیت،
ان تمام چیزوں نے مل کر ان کو ہندوستانی قوم خصوصاً ہندوؤں میں بہت محبوب او
رمقبول بنا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ بہت سے لوگ سیاسیات میں ان سے متفق نہ ہوں
اور ان کی پیروی نہ کریں مگر سب ان کو محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ قومی
کاموں کے طویل تجربے اور سن و سال کی بزرگی کے لحاظ سے وہ ہندوستانی سیاست
کے پیر دانشمند سمجھے جاتے ہیں گر خیالات کے لحاظ سے ذرا پرانے ہوگئے ہیں اور
جدید دنیا سے انھیں کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ان کی آواز اب بھی سب کو متوجہ کرتی
ہے مگر ان کی باتیں بہت سے لوگ نہ سمجھتے ہیں نہ سنتے ہیں۔

غرض یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مالویہ جی سوراج پارٹی میں شریک نہیں ہوئے
کیونکہ سیاسی معاملات میں وہ ان سے بہت آگے بڑھی تھی اور اس میں کانگریس کی
باضابطہ پیروی کی شرط تھی۔ وہ ایک ایسی پارٹی چاہتے تھے جو زیادہ اعتدال پسند ہو۔

اور سیاسی فرقہ وارانہ مسائل میں اتنی پابندیاں عائد نہ کرے۔ یہ سب صفات ان کی نئی پارٹی میں موجود تھیں جس کے وہ خود بانی اور رہبر تھے۔

البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لالہ لاجپت رائے اس نئی پارٹی میں کیوں شامل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بھی کسی حد تک اعتدال پسند اور فرقہ پرستی کی طرف مائل تھے۔ لیکن اسی سال گرمیوں میں، میں جنیوا میں ان سے ملا تھا۔ اور اس وقت ان کی گفتگو سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ سوراج پارٹی کے خلاف جہاد کرنے والے ہیں۔ مجھے اب بھی نہیں معلوم کہ یہ صورت کیسے پیدا ہوئی۔ لیکن انتخاب کے دوران میں انھوں نے چند مبہم الزامات کا ذکر کیا جس سے یہ پتہ چلا کہ وہ کن خیالات کے چکر میں تھے۔ انھوں نے کانگریس کے لیڈروں پر یہ الزام لگایا کہ وہ بیرون ہند کے لوگوں سے ساز باز رکھتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ کابل میں کانگریس کی شاخ قائم کرنے کا مقصد یہی تھا۔ باوجودیکہ ان سے بارہا اصرار کیا گیا لیکن انھوں نے نہ کبھی اس الزام کی تفصیلات بتائیں اور نہ کوئی ثبوت پیش کیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب ہندوستان کے اخبارات میرے پاس سوئزرلینڈ پہنچے اور مجھے لالہ جی کے ان الزامات کا علم ہوا تو میں حیرت میں رہ گیا۔ سکرٹیری کی حیثیت سے میں کانگریس کے تمام معاملات سے اچھی طرح واقف تھا۔ بلکہ کابل کی کمیٹی کا الحاق میں نے خود کرایا تھا (یہ تحریک اصل میں ڈیش بندھوداس کی تھی) بہر حال مجھے ان الزامات کی تفصیل نہ اس وقت معلوم تھی اور نہ اب معلوم ہے لیکن ان کی عام نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ محض بے بنیاد تھے۔ معلوم نہیں لالہ جی کو کیونکر غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ممکن ہے انھوں نے مختلف افواہوں پر اعتبار کر لیا ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مولوی عبیداللہ کی گفتگو سے متاثر ہوئے حالانکہ میرے نزدیک اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن کونسلوں کا انتخاب عجیب و غریب ہے۔ اس میں انسان کے مزاج کا

توازن بگڑ جاتا ہے اوراس کا اخلاقی معیار بدل جاتا ہے۔ جوں جوں مجھے انتخابات کا تجربہ ہوتا جاتا ہے میری حیرت بڑھتی جاتی ہے اور مجھے ان سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہوگئی ہے جو جمہوریت کے منافی ہے۔

لیکن شخصیتوں سے قطع نظر، ملک میں فرقہ وارانہ حالات کی رفتار ایسی تھی کہ یوں بھی نیشنلسٹ پارٹی اس قسم کی کسی دوسری پارٹی کا نمودار ہونا لازمی تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے خوف تھا۔ دوسری طرف ہندو اس پر مشتعل تھے کہ مسلمان ہم پر دھونس جماتے ہیں، ان میں سے بہتوں کو یہ شکایت تھی کہ مسلمان ہم پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں اور دشمن سے مل جانے کی دھمکی دیکر خاص مراعات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہندو مہا سبھا کو اسی وجہ سے اہمیت حاصل ہوگئی کہ وہ ہندو قوم پرستی کی یعنی مسلم فرقہ پرستی کے مقابلے میں ہندو فرقہ پرستی کی علمبر دار تھی۔ مہا سبھا کی مخالفانہ کاروائیوں کنے مسلم فرقہ پرستی میں اور شدت پیدا کردی۔ اس طرح عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بندھ گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں فرقہ پرستی کا دور دورہ ہوگیا۔ اصولاً یہ اکثریت اور ایک بڑی اقلیت کا مسئلہ تھا مگر عملی طور پر بعض صوبوں میں صورت حال بالکل برعکس تھی مثلاً پنجاب اور سندھ میں سکھ اور ہندو اقلیت میں تھے اور مسلمان اکثریت میں۔ لہٰذا مسلم اقلیت کو بحیثیت مجموعی سارے ملک میں اکثریت سے جو خوف تھا وہی ان صوبوں کی اقلیتوں کو ان سے تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح تھا کہ کہیں دوسرے فرقہ والے انھیں نکال باہر نہ کردیں۔ اس کے علاوہ جو مستقل حقوق کے مالک ہیں انھیں، کسی حد تک یہ خوف تھا کہ کوئی ایسا بنیادی تغیر نہ ہو جائے جس سے ان کے ذاتی مفاد خطرے میں پڑ جائیں۔

سوراج پارٹی کو فرقہ وارانہ جماعتوں سے جا ملے۔ اسی طرح بعض ہندو اراکین نیشنلسٹ پارٹی میں شریک ہوگئے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا مالویہ جی

اور لالہ جی کا اتحاد نہایت بااثر اور طاقتور ہو گیا تھا۔ لالہ جی کا پنجاب میں خاص اثر تھا اور اس صوبے میں فرقہ پرستی کا سب سے زیادہ زور تھا۔ سوراج پارٹی یا کانگریس کی طرف سے الیکشن لڑانے کا سارا بوجھ والد پر آپڑا کیونکہ سی۔ آر۔ داس اب ان کا ہاتھ بٹانے کو موجود نہ تھے۔ والد کو لڑائی میں لطف آتا تھا یہ کم سے کم اس سے گھبراتے نہیں تھے۔ بہر حال مخالفوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر انھوں نے بھی اپنا پورا زور لگا دیا۔ دونوں کی طرف سے خوب خوب چوٹیں چلیں۔ ایک نے دوسرے کے ساتھ کسی قسم کی رعایت اور مروت سے کام نہیں لیا۔ انتخاب کے بعد بھی اس کی تلخیاں ایک عرصے تک لوگوں کے دلوں سے نہیں گئیں۔

نیشنلسٹ پارٹی کو خاصی کامیابی ہوئی لیکن اس کامیابی نے اسمبلی کو سیاسی حیثیت سے بہت گرا دیا۔ اس کا پلہ اعتدال پسندی کی طرف جھک گیا۔ خود سوراج پارٹی کانگریس میں اعتدال پسند جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ پھر اپنی قوت بڑھانے کے خیال سے اس نے بہت سے مشتبہ لوگوں کو بھی داخل کر لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسکے سیاسی وقار کو بہت صدمہ پہنچا۔ نیشنلسٹ پارٹی نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا بلکہ اس سے بھی گرا ہوا۔ چنانچہ اس نے خطاب یافتوں، بڑے بڑے زمینداروں، کارخانوں کے مالکوں اور دوسرے لوگوں کو جنھیں سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا اکٹھا کر کے اپنے آپ کو ایک عجیب معجون مرکب کر لیا۔

۱۹۲۶ء کے آخر میں ایک بڑا اندوہناک حادثہ پیش آیا جس نے سارے ہندوستان میں ہل چل ڈال دی۔ اس سے روشن ہو گیا کہ فرقہ پرستی کے جوش میں ہم کتنی ذلیل سے ذلیل حرکت کر سکتے ہیں۔ سوامی شردھانند بستر علالت پر پڑے تھے۔ اور ایسی حالت میں ایک مذہبی دیوانے نے انھیں قتل کر دیا۔ اس شخص کو جو گورکھوں کے برچھوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا، اور گولیوں کی بوچھار میں بڑھتا چلا گیا تھا۔ یہی موت نصیب ہونی تھی! ابھی آٹھ سال پہلے آریہ سماجیوں

کے اسی لیڈر نے جامع مسجد دہلی کے منبر پر کھڑے ہو کر ہندو مسلمان کے جے" کے فلک شگاف نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور پورے مجمع نے "ہندو مسلمان کی جے" کے فلک شگاف نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور باہر سڑکوں پر ایک دوسرے کے دوش بدوش اپنا خون بہا کر اس نعرے پر مہر توثیق لگا دی تھی۔ آج وہ خود اپنے ہم وطن کے ہاتھوں مارا گیا جو یقیناً" یہ سمجھتا ہو گا کہ یہ ثواب کا کام ہے اور وہ اس کی بدولت جنت میں جائے گا۔

میں ہمیشہ سے جسمانی دلیری کا معترف ہوں، اس دلیری کا جس کی بدولت انسان ایک اعلیٰ مقصد کے لئے مرتے دم تک جسمانی مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ میرے خیال میں اور لوگ بھی اس کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں۔ سوامی شردھانند میں یہ دلیری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ان کا لانبا قد، گیروے کپڑوں میں لپٹا ہوا شاندار جسم، بڑھاپے کے باوجود تن کر چلنا، آنکھوں سے شرارے نکلنا، دوسروں کی کمزوری کو دیکھ کر تیوری پر بل آجانا، یہ تصویر میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اور دل پر نقش ہے۔

مظلوموں کا جلسہ بروسیلز میں

میں ۱۹۲۶ء کے آخر میں برلن آیا ہوا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظلوم قوموں کی ایک کانگرس، بروسیلز میں ہونے والی ہے۔ یہ بات میرے دل کو لگی اور میں نے ہندوستان لکھ بھیجا کہ اگر ہماری کانگرس بروسیلز کی کانگرس میں باضابطہ طور پر شرکت کرے تو اچھا ہے۔ میری تجویز پسند کی گئی اور میں اس کام کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کا نمائندہ مقرر کر دیا گیا۔

بروسیلز کی کانگرس شروع فروری ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ معلوم نہیں کہ یہ خیال سب سے پہلے کسی کے ذہن میں آیا تھا۔ برلن میں ان دنوں دوسرے ملکون کے جلاوطن اور انتہا پسند جمع ہو گئے تھے اور یہ شہر اس معاملے میں پیرس کی برابری کر رہا تھا۔ اشتمالی (کمیونسٹ) بھی وہاں کثرت سے تھے۔ یہ خیال عام تھا کہ مظلوم قوموں میں آپس میں اتحاد عمل ہونا چاہے اور انھیں مزدوروں کی انتہا پسند جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ یہ احساس روز بروز بڑھ رہا تھا کہ سب قوموں کا وہی ایک دشمن ہے جسے شہنشاہی کہتے ہیں اور سب کو جنگ آزادی میں اسی سے مقابلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ سلطنتیں جو نو آبادیوں پر قابض ہیں یعنی انگلستان، فرانس، اطالیہ وغیرہ اس قسم کی کوششوں کی مخالف تھیں مگر جرمنی جنگ عظیم کے بعد سے نو آبادیوں سے محروم ہو گیا تھا اور وہاں کی حکومت دوسری سلطنتوں کی نو آبادیوں اور ماتحت ملکوں کی تحریک آزادی کو رواداری بلکہ ہمدردی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ برلن دوسرے ملکوں کے ترقی پسندوں اور حکومت کے مخالفوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں اور سرگرم چین کے لوگ تھے جو کومن ٹانگ کی انتہا پسند پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس پارٹی کا چین میں بڑا زور تھا اور قدیم جاگیرداری نظام کے حامی اس کے سیلاب میں بہے جا رہے تھے۔ اس نئی قوت سے شہنشاہی پسند سلطنتیں بھی دبتی تھیں اور انھیں زیادتیاں کرنے اور دھمکیاں

دینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چین کے اتحاد اور آزادی کا مسئلہ کوئی دن میں حل ہوا چاہتا ہے۔ کومن ٹانگ کامیابی کے نشے میں مگن تھی مگر اسے معلوم تھا کہ ابھی اس کی راہ میں بہت سی حائل ہیں اس لئے وہ دوسری قوموں میں اپنے خیالات کا پرچار کر کے اپنی قوت بڑھانا چاہتی تھی۔ غالباً اس پرچار پر زور دینے والی اس جماعت کی انتہا پسند پارٹی تھی جو باہر کے اشتمالیوں کے ساتھ مل کر چینی قوم کا اثر دوسرے ملکوں میں اور اپنا اثر اپنے ملک اور اپنے جماعت میں بڑھانا چاہتی تھی ابھی یہ جماعت موجودہ زمانے کی طرح کئی فریقوں میں جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں تقسیم نہیں ہوئی تھی، اور بظاہر متحد نظر آتی تھی۔

اس لئے کومن ٹانگ کے نمائندوں نے جو یورپ میں موجود تھے مظلوم قوموں کی کانگرس کی تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ شاید انھیں نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر یہ تحریک اٹھائی تھی۔ بعض اشخاص جو اشتمالی پارٹی کے تھے یا اس سے ملتے جلتے خیالات رکھتے تھے شروع سے اس تجویز کے موید تھے کہ مجموعی طور پر اشتمالی اس میں نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ امریکا کی لاطینی سلطنتوں (میکسیکو وغیرہ) نے بھی عملی مدد دی کیونکہ وہ ان دنوں ریاستہائے متحدہ امریکا کی معاشی شہنشاہی سے تنگ آ گئی تھیں۔ میکسیکو جس کا صدر ایک انتہا پسند شخص تھا، ریاستہائے متحدہ امریکا کے خلاف لاطینی امریکی قوموں کو جتھا بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے برسلز کی کانفرنس سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ باضابطہ طور پر حکومت اس میں شرکت نہیں کر سکتی تھی مگر اس نے اپنے ایک ممتاز ماہر سفارت کو بھیجا کہ وہ ایک ہمدرد تماشائی کی حیثیت سے کانگرس میں شریک ہو۔

اس کے علاوہ جاوا چینی ہند، فلسطین، شام، مصر، عرب، شمالی افریقہ اور افریقی حبشیوں کی قومی انجمنوں کے نمائندے بھی آئے تھے۔ مزدور جماعتوں کی انتہا پسند پارٹیوں نے بھی اپنے آدمی بھیجے تھے اور کئی مشہور و معروف اشخاص جو سالہا

سال سے یورپ کے مزدوروں کی جدوجہد میں پیش پیش تھے، وہاں موجود تھے۔ بعض اشتمالی بھی کانگرس کی کاروائیوں میں اہم حصہ لے رہے تھے مگر وہ اشتمالیوں کے حیثیت سے نہیں بلکہ مزدوروں کی انجمنوں کے نمائندے بن کر آئے تھے۔

جارج لینسبری کانگرس کے صدر منتخب ہوئے اور انھوں نے بڑی زور شور کی تقریر کی۔ یہ بجائے خود اس بات کا ثبوت تھا کہ کانگرس کوئی سرپھروں کا مجمع یا اشتمالیوں کی جماعت کا دم چھلا نہیں ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جلسے کا برتاؤ اشتمالیوں کے ساتھ دوستانہ تھا اور بہت سے اختلافات کے باوجود بعض چیزوں میں ان کے ساتھ اتحاد کی گنجائش نظر آتی تھی۔

مسٹر لینسبری نے اس مستقل ادارے کا صدر ہونا بھی منظور کرلیا جو انجمن مخالف شہنشاہی کی نام سے قائم کیا گیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ اپنی اس ناعاقبت اندیشی پر پچھتائے یا شاید ان کے ساتھیوں یعنی برطانوی مزدور پارٹی والوں کے لیڈروں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ مزدور پارٹی ان دنوں پارلیمنٹ میں باضابطہ مخالف حکومت پارٹی تھی اور بہت جلد وزارت کے منصب پر فائز ہونے والی تھی۔ ظاہر کہ ان لوگوں کو جو آگے چل کر وزیر ہونے والے ہیں خطرناک انقلابی سیاست میں پھنسنا نہیں چاہیے۔ مسٹر لینسبری مصروفیت کا عذر کرکے انجمن کی صدرات سے الگ ہوگئے بلکہ انھوں نے اس کی ممبری سے بھی استعفادے دیا۔ اس شخص کو جس کی تقریر نے دو تین مہینے پہلے میرے دل کو لبھالیا تھا، یکایک رنگ بدلتے دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔

پھر بھی "انجمن مخالف شہنشاہی" کے بڑے بڑے سرپرست جن میں آئین اسٹائن، میڈم سن یات سین اور شاندروے من رولان بھی تھے۔ چند مہینے کے بعد آئین اسٹائن نے استعفادے دیا اس لئے کہ وہ انجمن کی اس پالیسی کے مخالف تھے کہ وہ فلسطین کے عربوں اور یہودیوں کے جھگڑے میں عربوں کی حمایت کرتی

ہے۔

بروسیلز کی کانگرس اور انجمن کی کمیٹیوں سے جو وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر ہوتی رہیں، مجھے نو آبادیوں اور ماتحت ملکوں کے بعض مسائل سمجھنے میں مدد ملی اور مغرب کے مزدوروں کے آپس کے جھگڑوں سے بھی پوری واقفیت ہوگئی۔ اخباروں اور کتابوں کے ذریعے مجھے ان کا تھوڑا سا حال پہلے سے معلوم تھا مگر یہ معلومات اوپری تھی اس لئے کہ لوگوں سے ذاتی تعلقات نہیں تھے۔ اب تعلقات پیدا ہوگئے اور کبھی کبھی ایسے مسئلوں سے سابقہ پڑنے لگا جن میں ان اندرونی جھگڑوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ دوسری اور تیسری بین الاقوامی انجمنوں میں مجھے تیسری کے ساتھ ہمدردی تھی۔ دوسری انجمن کی ساری کاروائیاں جو اس نجنگ عظیم کے بعد کیں مجھے سخت مکروہ معلوم ہوتی تھیں۔ اور اسکی پشت پناہ، برطانوی مزدور پارٹی کی حرکتوں کا ہم ہندوستانیوں کو اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ مجھے لازمی طور پر اشتمالیت سے انس پیدا ہوگیا، اس لئے کہ اس میں چاہے جتنی خرابیاں ہوں مگر کم سے کم وہ ریا کاری سے اور شہنشاہی کی حمایت سے بری ہے۔ میں اصولی طور پر اشتمالیت کا پیرو نہیں ہوا تھا۔ ابھی میں اس کی باریکیوں سے واقف نہیں تھا۔ صرف موٹی موٹی باتیں جانتا تھا اور یہ مجھے پسند آئیں۔ ان کے علاوہ روس میں جو زبردست تغیرات ہو رہے تھے انھوں نے بھی مجھے اس طرف متوجہ کیا۔ البتہ اشتمالیوں کی ان حرکتوں سے مجھے اکثر کوفت ہوتی تھی۔ وہ اپنی بات زبردستی منوانا چاہتے ہیں۔ لڑنے پر اور بدتمیزی کی حرکتوں پر تلے رہتے ہیں اور جو ان کی رائے سے اختلاف کرے اس پر فوراً کفر کو فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ غالباً مجھے یہ احساس بہ قول ان لوگوں کے اپنی ''بورژوا'' تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہوتا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ انجمن مخالف شہنشاہی کے جلسوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بحث میں، میں عموماً انگریز اور امریکی ممبروں کی طرف ہوتا تھا۔ میری اور ان

کی رائے کم سے کم طریق کار کے معاملے میں بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ ہم سب لمبی چوڑی خطیبانہ تحریکوں کو جو روزولیوشن نہیں بلکہ اعلان معلوم ہوتی تھیں۔ ناپسند کرتے تھے ہم چاہتے تھے کہ تحریک سیدھے سادے مختصر الفاظ میں پیش کی جائے مگر یورپ کی روایات اس کے خلاف تھیں۔ اکثر اشتمالی اور غیر اشتمالی ممبروں میں اختلاف رائے ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہم کوئی سمجھوتا کر لیتے ہیں۔تھوڑے دن کے بعد ہم میں سے بعض لوگ اپنے اپنے وطن چلے آئے اور کمیٹی کے اور جلسوں میں شرکت نہیں کر سکتے۔

بروسیلز کی کانگرس سے شہنشاہی پسند سلطنتوں کی نو آبادیات اور امور خارجہ کہ وزارتیں ذرا گھبرائیں۔''اینگر'' نے جو برطانوی وزارت خارجہ کا مشہور مصنف ہے اپنی ایک کتاب میں اس کا ذکر ہیجان خیز طریقے سے کیا ہے اور کہیں کہیں اس کی ہنسی بھی اڑائی ہے۔ غالباً خود کانگرس میں مختلف قوموں کے جاسوس موجود تھے یہاں تک کہ بعض نمائندے بھی خفیہ پولیس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے۔ میرے ایک امریکی دوست پیرس گئے ہوئے تھے۔ ان س ایک فرنسیسی ملنے آیا جو وہاں کی خفیہ پولیس میں ملازم تھا۔ یہ محض دوستانہ ملاقات تھی اور ان سے بعض معاملات کے متعلق کچھ پوچھنے کو آیا تھا۔ جب وہ یہ باتیں دریافت کر چکا تو اس نے پوچھا کہ آپ نے مجھے پہچانا میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔ امریکی اسے بہت غور سے دیکھتا رہا مگر بالکل نہ پہچان سکا۔خفیہ پولیس والے نے کہا کہ آپ سے بروسیلز کی کانگرس میں ملاقات ہوئی تھی جہاں میں حبشیوں کے نمائندے کی حیثیت سے چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر سیاہ روغن مل کر گیا تھا۔

انجمن مخالف شہنشاہی کا ایک اجلاس کولون میں ہوا جس میں میں بھی شریک تھا، اس کے ختم ہونے کے بعد ہم سیکو اور ونیزیٹی کی حمایت کے ایک جلسے میں شریک ہونے کے لئے ڈوسل ڈورف گئے جو کولون سے بہت قریب ہے۔ ہم اس جلسے

سے واپس آرہے تھے کہ رستے میں پولیس نے ٹوکا اور کہا کہ اپنے پاسپورٹ دکھاؤ اکثر لوگوں کے پاس پاسپورٹ موجود تھے مگر میں اپنا پاسپورٹ کولون کے ہوٹل میں چھوڑ آیا تھا اس لئے کہ ڈوسل ڈورف صرف چند ہی گھنٹے قیام کا قصد تھا۔ میں حراست میں پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اس مصیبت میں ایک انگریز اور اس کی بیوی بھی میرے ساتھ تھے ہمیں کوئی ایک گھنٹہ وہاں ٹھہرنا پڑا۔ اس اثنا میں غالباً ٹیلیفون سے پوچھ گچھ کی گئی جس کے بعد پولیس کے افسر نے ہمیں ازراہ عنایت جانے کی اجازت دی۔

آگے چل کر انجمن مخالف شہنشاہی کا رجحان اشتمالیت کی طرف اور بڑھ گیا مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نے اپنا علیحدہ رنگ قائم رکھا۔ میرا تعلق اس سے صرف خط و کتابت کے ذریعے باقی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں اس عارضی صلح میں شرکت کی وجہ سے جو حکومت ہند اور کانگرس کے درمیان ہوئی تھی یہ انجمن مجھ سے بہت خفا ہو گئی اور اس نے مجھے ایک دم سے ذات باہر کر دیا یعنی ایک روزولیوشن کے ذریعے میرا نام اس کے ممبروں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اس کے لئے اشتعال کی بہت بڑی وجہ تھی مگر اس نے مجھے صفائی کا موقع تو دیا ہوتا۔

۱۹۲۷ء کی گرمیوں میں میرے والد یورپ تشریف لائے۔ میں ان سے وینس میں ملا اور اس کے بعد کئی مہینے تک میرا ان کا اکثر ساتھ رہا ہم سب یعنی والد، بیوی، بہن اور میں مل کر چند روز کے لئے ماسکو نومبر میں گئے تا کہ سوویٹ کی دسویں سالگرہ کے جشن میں شریک ہوں۔ یہ سفر بہت تھوڑے دن کا تھا اور بہت تنگ وقت میں طے ہوا تھا مگر ہم سب کو وہاں جا کر خوشی ہوئی اس لئے کہ یہ ذرا سی جھلک بھی فائدے سے خالی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنے سے وقت میں ہمیں جدید روس کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں مگر اتنا ضرور ہوا کہ ہم اسکے متعلق جو کچھ پڑھتے تھے اسے سمجھنے لگے۔ میرے والد کے لئے یہ اجتماعی اصول بالکل

انوکھے تھے۔ ان کی ساری ذہنی تربیت قانون اور آئین کی فضا میں ہوئی تھی اور ان کے لئے اس فضا سے نکلنا سہل نہ تھا مگر انھوں نے جو کچھ ماسکو میں دیکھا اس کا ان پر یقیناً اثر ہوا۔

ہم ماسکو میں تھے کہ سائمن کمیشن کے تقرر کا پہلی بار اعلان کیا گیا۔ ہم نے یہ خبر ماسکو کے ایک جریدے میں پڑھی۔ چند روز کے بعد والد پریوی کونسل کے ایک مقدمے میں پیروی کر رہے تھے اور سر جان سائمن ان کے رفیق تھے۔ یہ ایک پرانا زمینداری کا مقدمہ تھا جس میں ابتدائی منزلوں میں میں خود بھی پیروی کر چکا تھا۔ مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر سر جان سائمن کی فرمائش سے میں بھی ایک بار ان کے دفتر میں والد کے ساتھ گیا اور مشورے میں شریک ہوا۔

۱۹۲۷ء خاتمے پر تھا اور ہمارا یورپ کا قیام بہت طول کھینچ چکا تھا غالباً اگر والد یورپ نہ آئے ہوتے تو ہم پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو جاتے۔ ہمارا مقصد تھا کہ واپسی میں کچھ دن جنوب مشرقی یورپ، ترکی اور مصر میں رہیں مگر اب اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ اس لئے کہ میری بڑی خواہش تھی کہ کانگرس کے اجلاس میں جو کرسمس کے زمانے میں مدراس میں ہونے والا تھا، شرکت کروں۔ شروع دسمبر میں میں اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کے ساتھ مارسیلز کو لمبو روانہ ہو گیا۔ میرے والد نے یورپ میں تین مہینے اور قیام کیا۔

ہندوستان کی واپسی اور سیاست کی منجھدھار میں دوبارہ کودنا

میں یورپ سے جسمانی اور دماغی حیثیت سے تازہ دم ہو کر لوٹا تھا۔ میری بیوی کو پوری صحت تو نہیں ہوئی تھی مگر پہلے سے بہت اچھی تھین اس لئے میں ان کی طرف سے بھی مطمئن تھا۔ میری رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا اور اندرونی کش مکش اور ناکامی کا احساس جو پہلے رہا کرتا تھا اس وقت بالکل نہیں تھا۔ میری نظر اب زیادہ وسیع ہو چکی تھی اور محض قومیت کا عقیدہ محدود اور ناکافی معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سیاسی آزادی بے شک بہت ضروری چیز ہے مگر یہ راہ راست کا صرف پہلا ہی قدم ہے۔ بغیر سماجی آزادی اور اور حکومت اور معاشرت کی تنظیم کے فرد کچھ زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب عالمگیر مسائل اور معاملات کو پہلے سے بہتر سمجھتا ہوں اور اس زمانے کی دنیا کو جو نت نئے رنگ بدلتی ہے نظر جما کر دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے اس عرصے میں نہ صرف موجودہ سیاسی معاملات بلکہ ان سب علمی اور تمدنی مسائل کے متعلق بھی جن سے مجھے دلچسپی تھی بہت سے کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ مجھے ان عظیم الشان، سیاسی، معاشی اور تمدنی تغیرات کے مطالعے میں بہت لطف آتا تھا جو یورپ اور امریکا میں واقع ہو رہے تھے۔ سوویٹ روس بعض ناگوار پہلوؤں کے باوجود پسند تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے لئے امیدا کا پیام لایا ہے۔ یورپ اس زمانے میں ایک حد تک امن وامان سے بسر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ زبردست کساد بازاری جو آج کل چھائی ہوئی ہے اس وقت تک رونما نہیں ہوئی تھی مگر میں یہ خیال دل میں لے آیا تھا کہ یہ امن وسکون محض عارضی ہے اور بہت جلد یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں زبردست تغیرات اور حادثات ہونے والے ہیں۔

میں سمجھتا تھا کہ اس وقت سب سے ضروری کام یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کو ان عالمگیر واقعات کی خبر دیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کے لئے تیار رہیں۔ یہ تیاری

زیادہ تر ذہنی حیثیت سے ہونی چاہئے۔ سب سے پہلے تو اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں رہنا چاہے کہ ہماری منزل مقصود کامل سیاسی آزادی ہے، یہ قطعی طور پر طے ہو جائے کہ کامل آزادی ہمارا واحد مقصد ہے، اور اس میں اور ''درجہ نوآبادیات'' کے مبہم اور الجھے ہوئے فقرے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی کے ساتھ سماجی مقصد کا تعین ہونا بھی ضروری تھا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی کانگرس سے اس معاملے میں زیادہ دور تک قدم بڑھنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے کانگرس ایک خالص سیاسی قومی جماعت ہے اور قومیت کے خیال کے سوا کسی اور طرز خیال سے آشنا نہیں ہے۔ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ اس بحث کی ابتدا کردی جائے۔ ہاں کانگرس کے باہر مزدوروں کے حلقوں میں اور نوجوانوں میں البتہ یہ چیز آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اسی لئے میں چاہتا تھا کہ کانگرس میں عہدہ قبول نہ کروں اور ایک دھندلا سا خیال یہ بھی تھا کہ چند مہینے شہروں سیدور دیہات میں جا کر رہوں اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کروں مگر یہ ان ہوئی بات تھی اور واقعات کی کشش مجھے پھر کانگریسی سیاست کی منجدھار میں کھینچ کر لانے والی تھی۔

مدارس پہنچتے ہی میں اس بھنور میں پڑ گیا میں نے ورکنگ کمیٹی میں کئی تحریکیں پیش کیں، جن میں کامل آزادی، خطرہ جنگ، انجمن مخالف شہنشاہی سے اتحاد عمل کے روزلیوشن بھیتھے۔ یہ سب ریزولیوشن منظور ہو گئے اور ورکنگ کمیٹی کی باضابطہ تحریکوں میں شامل کر لئے گئے۔ میں نے انھیں کانگرس کے کھلے اجلاس میں پیش کیا اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ سب کے سب بہ اتفاق رائے پاس ہو گئے۔ کامل آزادی کی روزولیوشن کی تائید مسز بیسنٹ تک نے کرڈالی۔ ہر طرف سے مدد ملنا بڑی خوشی کی بات تھی۔ مگر میرے دل میں یہ کھٹکا تھا کہیا تو لوگوں نے ان روزلیوشنوں کو اچھی طرح سمجھا نہیں یا انھیں توڑ مروڑ کر کچھ اور معنی پہنا لئے۔ کانگرس کے اجلاس کے تھوڑے ہی دن بعد یہ حقیقت کھل گئی اور کامل آزادی کے

رزولیوشن کی تاویلیوں کی جانے لگیں۔

میری یہ تحریکیں کانگرس کی معمولی تحریکوں سے مختلف تھیں۔ ان سے ایک نئے طرز خیال کا اظہار ہوتا تھا۔ بہت سے کانگریسی انھیں یقیناً پسند کرتے تھے۔ بعض کچھ مخالف بھی تھے مگر اس حد تک نہیں کہ مخالفت کا اظہار کریں غالباً ان حضرات کا خیال تھا کہ یہ محض نظری تحریکیں ہیں جن سے نہ کوئی فائدہ ہے نہ نقصان اور ان سے پیچھا چھڑانے کی سب سے اچھی ترکیب یہی ہے کہ انھیں پاس کرکے آگے بڑھیں اور ان معاملات پر غور کریں جو واقعی اہمیت رکھتی ہیں۔ غرض کامل آزادی کا روزلیوشن اس وقت تک محض ایک نام جذبے کا اظہار تھا جو روز بروز بڑھ رہا تھا۔ البتہ دو ایک سال بعد اس نے کانگریس کے ہم اور پر زور مطالبے کی حیثیت اختیار کرلی۔

گاندھی جی مدارس میں موجود تھے اور کانگرس کے کھلے اجلاس میں شریک ہوئے مگر انھوں نے پالیسی کی تشکیل میں حصہ نہیں لیا۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہونے کے باوجود وہ اس کے جلسوں میں نہیں آئے۔ جب سے سوراج پارٹی کا زور ہوا انھوں نے کانگریس میں یہی طریقہ اختیار کررکھا تھا مگر ان سے اکثر مشورہ لیا جاتا تھا اور کوئی اہم کاروائی بغیر ان سے کہے ہوئے نہیں کی جاتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ جو تحریکیں میں نے کانگرس میں پیش کیں وہ انھیں کہاں تک پسند آئیں۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے ان کو ناپسند کیا ہوگا۔ ان کے مضمون کی وجہ سے نہیں بلکہ اس طرز خیال کی وجہ سے جو ان سے ظاہر ہوتا تھا۔ مگر انھوں نے کبھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ میرے والد تو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یورپ گئے ہوئے تھے۔

کامل آزادی کے روزولیوشن کا بے اثر ہونا کانگرس کے اسی اجلاس میں ظاہر ہو گیا جب کہ ایک اور ریزولیوشن کے ذریعے سائمن کمیشن کی مخالفت اور بائیکاٹ کا اعلان اور اسی کے ساتھ یہ تجویز کی گئی کہ ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جائے جو

ہندوستان کے لئے ایک دستوراساسی مرتب کرے۔

یہ ظاہر تھا کہ اعتدال پسند جماعت جس سے تعاون کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، کامل آزادی کا تصور ہی نہ کرسکتی تھی۔ ان کی پہنچ زیادہ سے زیادہ درجہ نو آبادیات تک تھی۔

میں دوبارہ کانگریس کا سکرٹری بن گیا س میں کچھ تو شخصی اثر تھا یعنی میرے پرانے اورعزیز دوست ڈاکٹر انصاری، صدر کانگریس کا اصرار، اور کچھ یہ خیال تھا کہ میرے پیش کئے ہوئے متعدد رزولیشن منظور ہو گئے ہیں اس لئے مجھے خود ہی انھیں عمل میں لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کے رزولیشن نے میری تحریکوں کے اثر کو کسی حد تک زائل کردیا تھا مگر پھر بھی بہت کچھ باقی تھا۔لیکن میرے عہدہ قبول کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کانگریس آل پارٹیز کے ذریعے یا کسی اور اثر سے اعتدال اور سمجھوتے کی پالیسی نہ اختیار کرلے ان دنوں وہ کچھ ڈگمگا رہی تھی۔ کبھی اس سرے پر جھک جاتی تھی کبھی اس سرے پر۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہوسکے اسے اعتدال پسندی کی طرف نہ لوٹنے دوں اور کامل آزادی کے مقصد کو برقرار رکھوں۔

نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ہمیشہ کچھ ضمنی جلسے ہوا کرتے ہیں چنانچہ مدراس میں ان دنوں جمہوریت پسندوں کی کانفرنس کا پہلا اور آخری اجلاس ہوا اور مجھ سے اس کی صدارت کی فرمائش کی گئی۔ میں بھی اپنے آپ کو جمہوریت پسند سمجھتا تھا اور مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ مگر صدارت قبول کرنے میں مجھے تامل تھا اس لئے کہ یہ نہیں معلوم تھا، اس نئی تحریک کے چلانے والے کون ہیں اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا تعلق کسی ایسی چیز سے ہو جو برساتی مینڈک کی طرف چند روز میں ختم ہوجائے۔ میں نے صدارت تو کرلی مگر بعد میں پچھتانا پڑا۔ اس لئے اور بہت سے انجمنوں کی طرح یہ کانفرنس بھی پیدا ہوتے ہی مرگئی۔ کئی مہینے تک میں

کوشش کرتا رہا کہ اس میں جو روزلیوشن پاس ہوئے تھے ان کا پورا مضمون معلوم ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں میں کچھ عجیب بات ہے کہ نئے نئے کام شروع کرتے ہیں اور پھر انھیں چھوڑ چھاڑ الگ ہو جاتے ہیں۔ ہم پر جو بے استقلالی کا اعتراض کیا جاتا ہے اس میں بہت کچھ اصلیت ہے۔

ابھی کانگرس کا اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ دہلی سے حکیم اجمل خان صاحب کے انتقال کی خبر آئی۔ وہ کانگرس کے سابق صدر تھے اور اس کے بوڑھے مدبروں میں شمار کیے جاتے تھے مگر ان میں ایک اور بات بھی تھی جس کی وجہ سے وہ کانگرس کے تمام لیڈروں میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ انھوں نے بالکل قدیم طرز کی تعلیم و تربیت پائی تھی جس میں جدید رنگ کو ذرا بھی دخل نہ تھا اور وہ سر سے پیر تک دلی کی شاہی زمانے کی تہذیب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے شستہ اور پاکیزہ اخلاق کو دیکھے، انھیں ٹھہر ٹھہر کر دھیمی آواز سے گفتگو کرتے ہوئے اور سوکھے منہ سے مذاق کے جملے کہتے ہوئے سن کر دل خوش ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے اخلاق و آداب کے لحاظ سے پرانے طرز کے رئیس تھے۔ ان کی وضع قطع اور طرز و روش میں شاہانہ وقار کی شان تھی اور ان کا چہرہ بھی مغل بادشاہوں کی تصورے سے بہت مشابہ تھا۔ ایسے لوگ عموماً سیاست سے سروکار نہ تھا۔ وہ حکیموں کے ایک مشہور خاندان کے سردار تھے اور انھیں اپنے عظیم الشان مطب سے فرصت نہیں ملتی تھی مگر آخر عمر میں جنگ عظیم کے حادثات نے اور ان کے پرانے دوست اور رفیق کار ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اثر نے انھیں کانگرس کی طرف مائل کر دیا۔ اس کے بعد کے واقعات خصوصاً پنجاب کے مارشل لا اور تحریک خلافت نے ان کے دل پر بہت گہرا اثر ڈالا اور انھیں گاندھی جی کا نیا طریق کار یعنی ترک موالات پسند آ گیا۔ انھوں نے اپنی قابل قدر صفات اور نایاب جوہر سے کانگرس کو مالا مال کر دیا اور ان کی ذات پرانی اور نئی روشنی کے لوگوں کے درمیان رابطے کا کام دینے لگی۔ انکے اثر سے قدیم رنگ کے بزرگ

میں قومی تحریک کے حامی بن گئے اور ان کی بدولت قدیم اور جدید عناصر گھل مل گئے اور قومیت کے ہراولوں میں ضبط اور متانت کی شان پیدا ہوگئی۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کردیا۔ کیونکہ دونوں ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی مثال سے متاثر تھے۔ گاندھی جی انھیں اپنا سچا دوست جانتے تھے، ان پر دل سے اعتماد کرتے تھے اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے بارے مین ان کی رائے کو قول فیصل سمجھتے تھے۔ میرے والد اور حکیم صاحب کو ایک دوسرے سے فطری طور پر انس تھا۔

پچھلے سال ہندو مہا سبھا کے بعض لیڈروں نے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ میں ہندوؤں کے جذبات سے ناواقف ہوں اس لئے کہ میری تعلیم بہت ناقص ہے اور "فارسی" تہذیب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھ میں کوئی تہذیب بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کونسی تہذیب ہے۔ فارسی زبان سے تو بدقسمتی سے میں بالکل ناواقف ہوں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میرے والد نے ہندی ایرانی تہذیب کی فضا میں پرورش پائی تھی جو دلی کے قدیم دربار کی یادگار ہے۔ اور جس کے مرکز اس گئے گذرے زمنے میں بھی دلی اور لکھنو سمجھے جاتے ہیں۔ کشمیری برہمنوں کو زمانے کا رنگ اختیار کرنے میں خاص ملکہ ہے۔ جب وہ ہندوستان کے میدانوں میں آئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہاں ہندی ایرانی تہذیب کا دور دورہ ہے تو وہ اسی طرف ڈھل گئے اور ان میں کثرت سے فارسی اور اردو کے اچھے اچھے ادیب پیدا ہوئے۔ آگے چل کر جب انگریزی سیکھنے اور مغربی تہذیب کی ابتدائی چیزیں اختیار کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ اتنی ہی تیزی سے اس نئے سانچے میں ڈھل گئے اور ان میں کثرت سے فارسی اور اردو کے اچھے اچھے ادیب پیدا ہوئے۔ آگے چل کر جب انگریزی سیکھنے اور مغربی تہذیب کی ابتدائی چیزیں اختیار کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ اتنی ہی تیزی سے اس نئے سانچے میں

ڈھل گئے۔ مگر اب بھی ہندوستان کے کشمیریوں میں بڑے بڑے فارسی داں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر میں سر تیج بہادر سپرو اور راجہ نریندرناتھ کا نام پیش کرتا ہوں۔

غرض حکیم صاحب اور میرے والد میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ بلکہ انھوں نے برداری کے پرانے رشتے بھی ڈھونڈھ نکالے تھے۔ ان میں بڑی دوستی ہوگئی اور ایک دوسرے کو بھائی صاحب کہنے لگے۔ منجملہ اور بہت سے رابطوں کے دونوں میں ایک چھوٹا سا رابطہ سیاسی خیالات کا بھی تھا۔ حکیم صاحبکی خانگی زندگی بالکل قدیم طرز کی تھی۔ وہ خود یا ان کے خاندان والے پرانے ڈھرے کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جتنا سخت پردہ ان کے یہاں تھا میں نے کسی کے یہاں نہیں دیکھا حالانکہ حکیم صاحب کو دل سے یقین تھا کہ عورتوں کی آزادی کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے اس مسئلے پر گفتگو کی اور فرمایا کہ ترکی عورتوں نے آزادی کی جنگ میں جو کام کیا اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ مصطفےٰ کمال پاشا کو جو کامیابی ہوئی وہ زیادہ تر ترکی عورتوں ہی کی بدولت ہوئی۔

حکیم صاحب کے انتقال سے کانگرس کو بہت سخت صدمہ پہنچا اور اس کا ایک بڑا زبردست حامی اٹھ گیا۔ اس کے بعد سے ہم سب جب دلی جاتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شہر میں وہ بات نہیں رہی۔ اس لئے کہ دلی کے نام کے ساتھ ہمارے ذہن میں حکیم صاحب اور ان کے بلی ماروں والے مکان کی تصویر بسی ہوئی ہے۔

۱۹۲۸ء سیاسی اعتبار سے بڑی مصروفیت کا سال تھا اور سارے ملک میں ایک ہل چل سی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے دل میں ایک نئی امنگ ہے جو انھیں آگے بڑھائے لئے جاتی ہے۔ ایک نئی لہر ہے جو ایک سرے سے تمام مختلف جماعتوں میں دوڑی ہوئی ہے۔ غالباً اس طویل مدت میں جب میں باہر گیا ہوا تھا۔ یہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ میں نے واپس آکر دیکھا تو مجھے بہت بڑا

فرق معلوم ہوا۔ ۱۹۲۶ء کے شروع تک ہندوستان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غالباً ملک اس کشمکش سے جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک رہی اچھی طرح سنبھلنے نہیں پایا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں وہ تازہ دم، مستعد اور دبے جوش سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہر جگہ اس کے آثار نظر آتے تھے: مزدوروں میں، کاشتکاروں میں، اوسط طبقے کے نوجوانوں میں اور عموماً تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں۔

ٹریڈ یونین کی تحریک بہت ترقی کی گئی تھی اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کو جسے قائم ہوئے صرف ساتھ آٹھ سال ہوئے تھے، اتنے ہی دن میں بہت قوت حاصل ہوگئی تھی اور وہ ہر قسم کے مزدوروں کی نمائندگی کرنے والی جماعت بن گئی تھی۔ ممبروں کی تعداد یا تنظیم کے لحاظ سے تو اس نے کچھ زیادہ ترقی نہں کی تھی مگر اس کے خیالات میں انتہا پسندی اور جنگجوئی آ گئی تھی۔ ہڑتالیں اکثر ہوتی تھیں اور مزدوروں میں اپنے طبقے کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ سب سے اچھی تنظیم کپڑے کی صنعت اور ریلوے کے مزدوروں کی تھی۔ ان میں سب سے قوی اور ترقی یافتہ انجمنیں بمبئی کی گرنی کامگار یونین اور جی آئی پی ریلوے یونین تھیں۔ مزدروں کی تنظیم کی نشوونما کے ساتھ مغرب سے اندرونی جھگڑوں اور آپس کی تفریق کا بیج یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ ابھی ہندوستان کی ٹریڈ یونین کی تحریک اچھی طرح قدم بھی نہیں جمانے پائی تھی کہ یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ وہ ٹوٹ کر الگ الگ جتھوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ بعض لوگ دوسری بین الاقوامی انجمن کے پیرو تھے، بعض تیسری کے، بعض اصلاح اور اعتدال کو پسند کرتے تھے اور بعض کھلم کھلا انقلاب کے حامی تھے اور ایک سرے سے ہر چیز کو بدلنا چاہتے تھے۔ ان کے بین بین خیالات کے بہت سے درجے تھے اور بدقسمتی سے جیسا کہ عام تحریکوں میں ہوا کرتا ہے بہت سے ابن الوقت بھی موجود ہیں۔

کسانوں میں بھی حرکت نظر آتی تھی اور صوبجات متحدہ خصوصاً اودھ میں زیادہ

نمایاں تھی۔ یہاں جابجا کسانوں کے احتجاج کے جلسے آئے دن ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کو یہ محسوس ہو گیا تھا کہ نئے قانون لگان سے، جس میں کسانون کو حین حیاتی لگان داری کا حق دیا گیا تھا اور ان سے بہت کچھ وعدے کئے گئے تھے، ان کی حالت زار میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ گجرات میں جہاں رعیت داری طریقہ جاری ہے اور حکومت کو براہ راست کاشتکاروں سے سابقہ پڑتا ہے، مال گذاری بڑھانے کی وجہ سے حکومت اور کسانوں میں بہت بڑے پیانے پر لڑائی چھڑی ہوئی تھی یہ بردولی کی ستیا گرہ کی تحریک تھی جو سردار ولبھ بھائی پٹیل کی سرکردگی میں اٹھائی گئی تھی۔ جس آن بان سے یہ تحریک چلائی گئی اس کی تعریفوں سے سارا ملک گونج رہا تھا۔ بردولی کے کسانوں کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی مگر ان کی اصلی کامیابی یہ تھی کہ ان کے اس معرکے کا اثر سارے ہندوستان کے کسانوں پر پڑا۔ بردولی کان ہندوستانی کے لئے امید اور تقویت کا نشان اور فتح کو شگون بن گیا۔

۱۹۲۸ء کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس سال نوجوانوں کی تحریک نے نشو ونما پائی۔ ہر جگہ نوجوان سبھائیں قائم کی جارہی تھیں اور نوجوانوں کی کانفرنسیں ہو رہی تھیں۔ یہ جماعتیں مختلف قسم کی تھیں اور ان میں نیم مذہبی انجمنوں سے لے کر اشتراکی انجمنیں تک شامل تھیں جن میں انقلابی خیالات اور طریقوں پر بحث کی جاتی تھی۔ مگر ان انجمنوں کے اغراض ومقصد چاہے جو کچھ بھی ہوں جب نوجوان ان میں جمع ہوتے تھے تو خود بخود زمانے کے اہم سماجی اور معاشی مسائل کی گفتگو چھڑ جاتی تھی جس کا رجحان عموماً یہی ہوتا تھا کہ سارا نظام ایک سرے سے بدل دیا جائے۔

خالص سیاسی نقطہ نظر سے اس سال کی اہمیت سائمن کمیشن کے بائیکاٹ اور آل پارٹیز کانفرنس کے وجہ سے تھی جسے لوگ بائیکاٹ کا تعمیری پہلو کہتے تھے۔ اس میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ جہاں کہیں کمیشن جاتا تھا مخالفوں کا مجمع ''سائمن گو بیک'' کے نعرے لگاتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے کروڑوں باشندے سرجان

سائمن کے نام سے اور انگریزی زبان کے دو الفاظ سے جن کے سوا وہ کوئی لفظ نہیں جانتے ہیں واقف ہو گئے۔ کمیشن کے ممبروں کہ یہ الفاظ بھوت بن کر ستاتے تھے، لوگ کہتے ہیں کہ ایک بار یہ لوگ نئی دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ رات کے اندھیرے میں یہ آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ انھیں بہت برا معلوم ہوا کہ لوگ رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔ مگر اصل میں یہ آواز جس نے ان کے آرام میں خلل ڈالا گیدڑوں کی آواز تھی جن سے شہنشاہی دارالسلطنت کے لق و دق میدان بھرے رہتے تھے۔

آل پارٹیز کانفرنس کو دستور اساسی کے اہم اصول طے کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ایک عمومی پارلیمنٹری حکومت کا نظام بنانا تھا جو ہر شخص بنا سکتا تھ اشکلا اصل میں ایک ہی تھی۔ یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ یا اقلیتوں کا مسئلہ اور چونکہ کانفرنس میں تمام کٹر فرقہ پرست انجمنوں کے نمائندے موجود تھے اس لئے اس مسئلے کا حل کرنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا جو ناکام اتحاد کانفرنسوں میں پیش آچکا تھا۔ میرے والد نے جو موسم بہار میں انگلستان سے واپس آگئے تھے اس کانفرنس میں بہت بڑا حصہ لیا۔ جب اور کوئی تدبیر نہ چلی تو آخر میں ایک چھوٹی سے کمیٹی والد کی صدارت میں بنا دی گئی کہ دستور اساسی مرتب کرے اور فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق مفصل رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی کو لوگ نہرو کمیٹی کہنے لگے اور وہ رپورٹ جو اس نے آگے چل کر پیش کی نہرو رپورٹ نام سے مشہور ہوئی۔ سر تیج بہادر سپرو بھی اس کمیٹی کی رکن تھے اور رپورٹ کا ایک حصہ انھوں نے لکھا تھا۔

میں اس کمیٹی کا ممبر نہیں تھا مگر کانگرس کے سکرٹری کی حیثیت سے مجھے اس سے بہت کچھ تعلق تھا۔ میرے لئے بڑی مشکل تھی اس لئے کہ میرے نزدیک اصل مسئلہ قوت حاصل کرنے کا تھا اور دستور اساسی کے مفصل مسودوں سے کاغذ کے صفحے سیاہ کرنا محض بیکار تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ یہ چپ میل کمیٹی ہمارے مقصد کو محدود کرنے

پر تلی ہوئی تھی، اس نے جو مقصد قرار دیا تھا وہ ''نو آبادیات کا درجہ'' کہلاتا تھا مگر اصل میں اس سے بھی کم تھا۔ میرے خیال میں کمیٹی کی حقیقی اہمیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے سے فرقہ وارانہ گتھی کے سلجھنے کا امکان تھا۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ یہ مسئلہ کسی معاہدے یا سمجھوتے کے ذریعے قطعی طور پر حل ہو جائے گا کیونکہ قطعی حل کی صورت تو اسکے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کی توجہ سماجی اور معاشی مسئلوں کی طرف پھیر دی جائے مگر اس کا امکان تھا کہ کوئی عارضی معاہدہ ہی ہو جائے اور اسے لوگوں کی ایک معقول تعداد مان لے تو کسی قدر سکون کی حالت ہو جائے گی اور لوگوں کی توجہ سے دوسرے مسئلوں کی طرف ہو سکے گی۔ اس لئے میں نے کمیٹی کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی بلکہ جہاں تک ہو سکا، اس کی مدد کی۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کوشش میں کامیابی ہوا ہی چاہتی ہے۔ صرف دو تین باتیں طے ہونے کو باقی تھیں اور ان میں واقعی اہمیت صرف پنجاب کا مسئلہ رکھتا تھا جہاں ہندو، مسلمان، سکھ کی سہ رخی لڑائی ہو رہی تھی۔ کمیٹی نے اپنی رپوٹ میں پنجاب کے مسئلے پر ایک نئے پہلو سے نظر ڈالی اور اپنی سفارشوں کی تائید میں آبادی کی تقسیم کے اعداد و شمار پیش کیے۔ مگر یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں ہر فریق کے دل میں ڈر اور شبہ بیٹھا ہوا تھا اور ایک قدم جو منزل مقصود تک پہنچنے میں باقی تھا کسی سے نہیں اٹھاتے بنا۔

آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کی غرض سے لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ ہم چند آدمی پھر دہری مشکل میں پڑ گئے۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ ہوتا ہو تو اس میں روڑے نہ اٹکائیں، لیکن کامل آزادی کے مقصد کو چھوڑنا ہمیں کسی طرح گوارا نہ تھا۔ ہم نے یہ التجا کی کہ کانفرنس اس مسئلے کو یوں ہی رہنے دے تا کہ ہر جماعت اس خاص معاملے میں جو روش چاہے اختیار کرے۔ کانگرس کامل آزادی پر جمی رہے اور اعتدال پسند جماعتیں ''نو آبادیات کے درجے''

پر مگر میرے والد رپورٹ کو منوانے پر تلے ہوئے تھے اور اپنی جگہ سے ایک قدم ہٹنا نہیں چاہتے تھے اور نہ ان حالات میں ہٹ سکتے تھے۔ چنانچہ کامل آزادی کے حامیوں نے جو وہاں بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، مجھ سے فرمائش کی کہ ان کیطرف سے کانفرنس میں اعلان کردوں کہ ہم لوگ کسی ایسی چیز سے واسطہ نہیں رکھنا چاہتے جس سے کامل آزادی کے مقصد میں بٹہ لگتا ہو مگر اسی کے ساتھ ہم نے اس بات کو صاف کر دیا کہ ہم کانفرنس کی راہ میں روڑے اٹکانا نہیں چاہتے تا کہ فرقہ وارانہ تصفیے میں دقت نہ ہو۔

اتنے بڑے معاملے میں یہ طرز عمل کچھ موثر نہ تھا اور زیادہ سے زیادہ نفی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں اثبات کا رنگ پیدا کرنے کے لئے ہم نے اسی دن ''انجمن آزادی ہند'' کی بنا ڈال دی۔

آل پارٹیز کانفرنس کیکاروائی سے مجھے اس سے بھی زیادہ سخت دھچکا اس وجہ سے پہنچا کہ اس نے مجوزہ دستور اساس کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں اودھ داروں کی خاطر، ایکدفعہ یہ بھی بڑھا دی کہ ان کے حقوق اپنے اپنے تعلقے میں محفوظ رہیں گے۔ یوں تو سارا دستور ہی ذاتی ملکیت کے اصول پر مبنی تھا مگر یہ غضب دیکھئے کہ بڑی بڑی نیم جاگیرداری ریاستوں کے حقوق دستور کی اٹل بنیادوں میں داخل کئے جا رہے تھے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ کانگرس کے لیڈر اور ان سے زیادہ غیر کانگرسی لوگ اپنی جماعت کے ترقی پسند لوگوں کو چھوڑ کر بڑے بڑے زمینداروں کا ساتھ دینے پر تیار ہیں۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ ہمارے اور ہمارے بہت سے لیڈروں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل ہے اور مجھے یہ بات مہمل معلوم ہوتی تھی کہ ایسے صورت میں کانگرس کا جنرل سکرٹری رہوں، چنانچہ میں نے اس بنا پر استعفا پیش کر دیا کہ میں ''انجمن آزادی ہند'' کے بانیوں میں سے ہوں مگر ورکنگ کمیٹی نے اسے منظور نہیں کیا اور مجھ سے اور سبھاش بوس سے (جنھوں نے اسی بنا پر

استعفا دیا تھا) کہا گیا کہ تم اس انجمن کا کام کرتے رہو۔ اس کے کانگرس کی پالیسی سے ٹکرانے کی کوئی وجہ نہیں اس لئے کہ کانگرس پہلے کامل آزادی کی حمایت کا اعلان کر چکی ہے۔ میں پھر بھی راضی ہو گیا۔ مجھے استعفا واپس لینے پر آمادہ کر لینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کئی موقعوں پر میں نے اپنا استعفا واپس لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا، اور ذرا سا بہانہ ملتے ہی جھگڑا رفع ہو جاتا تھا۔

گاندھی جی نہ آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہوئے اور نہ کمیٹی کے جلسوں میں یا ہس تک کہ لکھنؤ کے اجلاس میں بھی نہیں آئے۔

اس اثنا میں سائمن کمیشن دورہ کر رہا تھا اور جہاں جاتا تھا مخالفوں کا مجمع کالے جھنڈے لئے "گو بیک" کے نعرے لگاتا پیچھے ہو لیتا تھا۔ کبھی کبھی پولیس میں اور عوام کے مجمع میں معمولی سے جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ لاہور میں بات بڑھ گئی اور سارا ملک غصے سے لرز گیا۔ وہاں سائمن کمیشن کی مخالفت کا مظاہرہ لالہ لاجپت رائے کی سرکردگی میں ہو رہا تھا۔ اور وہ سڑک کے کنارے ہزاروں مظاہرہ کرنے والوں کے آگے کھڑے تھے کہ پولیس کے ایک نوجوان انگریز افسر نے جھپٹ کر ان کے سینہ پر ڈنڈے مارنا شروع کر دئے۔ لالہ جی کو تو ذکر ہی کیا ہے سارے مجمع میں کسی شخص نے بھی مطلق تشدد سے کام نہیں لیا تھا بلکہ سب پر امن طریقے سے کھڑے تھے۔ اس پر بھی پولیس ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بری طرح مارا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص سڑکوں پر مظاہرے میں شریک ہو وہ پولیس سے جھگڑا ہو جانے کی جوکھم اٹھاتا ہے اور لالہ جی جان بوجھ کر اس خطرے میں پڑے ہوں گے مگر پھر بھی جس طریقے پر حملہ کیا گیا اور بلا وجہ جس بے دردی سے کام لیا گیا اس سے بے شمار ہندوستانیوں کو سخت دھچکا لگا۔ ان دنوں ہم لوگ پولیس کے لاٹھی چارج کے عادی نہیں تھے۔ ہمارا احساس اس وقت تک متواتر وحشیانہ حرکتوں سے کند نہیں ہوا تھا۔

ہمارے اتنے بڑے لیڈر اور پنجاب کے سب سے ممتاز اور ہر دلعزیز بزرگ کے ساتھ یہ برتاؤ نہایت شرمناک معلوم ہوا اور دبے ہوئے غصے کی ایک لہر سارے ہندوستان میں خصوصاً شمالی ہند میں دوڑ گئی۔ ہماری بے بسی اور ذلت کا کیا ٹھکانا تھا کہ ہم اپنے چنے ہوئے لیڈروں کی عزت کو بھی نہیں بچا سکتے تھے

لالہ جی کو جو جسمانی ضرر پہنچا وہ کچھ کم نہ تھا اس لئے کہ انہیں عرصے سے دل کی بیماری تھی اور ضرب ان کے سینے پر لگائی تھی۔ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس چوٹ کا اثر ان کی موت پر جو چند ہفتہ کے بعد واقع ہوئی کس حد تک پڑا۔ ان کے معالج ڈاکٹروں کی تو یہ رائے تھی کہ اسی کی وجہ سے وہ اتنی جلدی ختم ہو گئے مگر میرے خیال اس میں شبہے کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ جسمانی ضرر کے ساتھ جو دماغی صدمہ پہنچا اس نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ ان کا دل غم و غصہ سے معمور اپنی ذاتی ذلت سے زیادہ انہیں قومی ذلت کا خیال تھا جو اس حملے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

اس قومی ذلت احساس ہندوستان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور تھوڑے ہی دن بعد جب لالہ جی نے وفات پائی تو لوگوں نے اس کی وجہ اسی حملہ کو قرار دیا اور ان کے دلوں میں طیش کا جذبہ اس شدت سے اُٹھا کہ رنج پر بھی غالب آ گیا۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کیونکہ اس کی مدد سے ہم بعد کے واقعات کو سمجھ سکتے ہیں یعنی بگھت سنگھ کا نمودار ہونا اور یکا یک سارے شمالی ہند میں اس قدر ہر دلعزیز ہو جانا۔ اشخاص کو اور ان کے کاموں کو بغیر اس پر غور کئے ہوئے کہ ان کے محرکات اور اسباب کیا تھا، قابل ملامت قرار دے دینا بہت سہل ہے مگر محض بے وقوفی ہے۔ بھگت سنگھ پہلے سے مشہور نہیں تھا، اس کی ہر دلعزیزی کا سبب محض ایک تشدد اور تخویف کا فعل نہیں تھا۔ تخویف پسند ہندوستان میں تیس سال سے وقتاً وقتاً اٹھتے رہے ہیں اور انہیں سوائے بنگال ایجی ٹیشن کے ابتدائی زمانے کے کبھی اس ہر دلعزیزی کا پاسنگ بھی نصیب نہیں ہوا جو بھگت سنگھ کو حاصل ہو گئی۔ یہ ایک صریحی

حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ تخویف پسندی کی بجھی ہوئی راکھ میں کبھی کبھی دبی ہوئی چنگاریاں نکل آتی ہیں۔ مگر اب یہ چیز ہندوستان کے نوجوانوں میں مقبول نہیں ہے۔ پندرہ برس کی عدم تشدد کی تلقین نے ہنوستان کے طرز خیال کو بدل دیا ہے اور عوام تخوفے کو سیاسی طریق کار کی حیثیت سے قابل توجہ نہیں سمجھتے، بلکہ اسکے مخالف ہیں۔ نچلے متوسط طبقے اور تعلیم یافتہ طبقے پر بھی جس میں تخویف پسند عموماً پیدا ہوتے ہیں، اس پرچار کا بہت قوی اثر ہو چکا ہے جو کانگرس تشدد کے طریقوں کے خلاف کرتی رہی ہے۔ ان میں جو زیادہ تیز اور جدل باز ہیں اور انقلابی طریقوں کے حامی ہیں وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ انقلاب تخویف کے ذریعے سے نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ ایک فرسودہ اور بیکار طریقہ ہے جو انقلابی عمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ تخویف ہندوستان میں اور دوسرے ملکوں میں ختم ہوتی جاتی ہے اس کی وجہ حکومت کا جبر نہیں، اس لئے کہ اس سے تو مادہ اکھڑنے کے بجائے دب جاتا ہے اور اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے، بلکہ اس کے گہرے اور بنیادی اسباب ہیں جو عالمگیر واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کسی ملک میں تخویف کا زور ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انقلابی جذبہ بالکل ابتدائی حالت میں ہے کچھ دن کے بعد یہ دور گزر جاتا ہے اور اس کے ساتھ تخویف کی تحریک بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مقامی واقعے یا شخصی ظلم کی وجہ سے کبھی کبھی یہ آگ بھڑک اٹھے۔ ہندوستان یقینی طور پر اس دور سے گزر چکا ہے اور اکادکا وارداتیں جو کبھی کبھی ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی رفتہ رفتہ بند ہو جائیں گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام ہندوستان کے لوگ تشدد کے طریقوں کے قائل نہیں رہے۔ انفرادی تشدد اور تخویف کا خیال عام طور پر ترک کر دیا گیا ہے مگر غالباً بہت سے لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب آزادی حاصل کرنے کے لئے منظم تشدد کے طریقوں کی ضرورت ہو گی۔ جس طرح دوسرے ملکوں میں اکثر ہوتی رہی

ہے۔ یہ آج کل ایک نظری مسئلہ ہے جس کا فیصلہ وقت آنے پر موقوف ہے، اسے تخویفی طریقوں سے کوئی تعلق نہیں۔

بھگت سنگھ کو جو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی وہ اس کے تخویفی فعل کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس وجہ سے کہ اس وقت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس نے لالہ لاجپت رائے کی اور سارے ہندوستان کی لاج رکھ لی۔ اس کی ذات قومی حمیت کی نشان بن گئی۔ فعل کو تو لوگ بھول گئے اور یہ نشانی باقی رہ گئی۔ چند مہینے میں پنجاب کا ہر شہر اور ہر گاؤں اور ایک حد تک سارا شمالی ہند اس کے نم سے گونج اٹھا۔ اس کی شان میں بے شمار گیت گائے جانے لگے۔ اور اسے حیرت انگیز ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں چوٹ کھانے کے بعد لالہ لاجپت رائے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک جلسہ میں شریک ہونے کے لئے دہلی آئے ان کے جسم پر چوٹ کے نشانی باقی تھے اور اس کی تکلیف بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ یہ جلسہ لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس کے بعد ہوا تھا اور اس میں کامل آزادی کا مسئلہ بھی کسی صورت سے چھڑ گیا تھا۔ مجھے وہ بات تو ٹھیک طور پر یاد نہیں جس پر بحث ہو رہی تھی۔ مگر یہ یاد ہے کہ میں نے کسی قدر تفصیل سے تقریر کی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب کانگرس کو دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرنا ہے یا تو انقلابی طرز خیال جو ہمارے سیاسی اور سماجی نظام میں کایا پلٹ چاہتا ہے یا اصلاحی مقصد اور طریقہ۔ یہ تقریر کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور میں اسے بھول گیا ہوتا مگر اس وجہ سے یاد رہ گئی کہ لالہ جی نے کمیٹی میں اس کا جواب دیا اور اس کے بعض حصوں پر تنقید کی۔ علاوہ اور باتوں کے انہوں نے یہ بات بھی جتائی، کہ ہمیں برطانوی مزدور پارٹی سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ مجھے اس تنبیہ کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ میں کود برطانوی مزدوروں کے باضابطہ لیڈروں کا قائل نہیں تھا بلکہ مجھے سخت تعجب ہوتا اگر یہ لوگ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مدد دیتے یا ایسا کوئی کام بھی کرتے جس سے

موثر طور پر شہنشاہی کی مخالفت یا اشتراکیت کی حمایت ثابت ہوتی۔

لاہور واپس جا کر لالہ جی نے پھر میری اس تقریر کے موضوع کی طرف توجہ کی اور اپنے ہفتہ وار اخبار ''پٹیل'' میں اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک سلسلہ مضامیں لکھنا شروع کیا۔ ابھی پہلا ہی مضمون نکلا تھا اور دوسرے کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ وہ دنیا سے گذر گئے۔ ان کا وہ پہلا نا تمام مضمون جو غالباً ان کی آخری شائع شدہ تحریر ہے میرے لئے ایک خاص حسرت ناک دلچسپی رکھتا ہے۔

لاٹھی چارج کا تجربہ

لالہ لاجپت رائے کے زخمی ہونے اور وفات پانے کے بعد سائمن کمیشن جہاں کہیں گیا اس کے خلاف اور بھی زیادہ زور شور سے مظاہر کیئے گئے۔ اب وہ لکھنؤ آنے والا تھا اور وہاں کی کانگریس کمیٹی نے بہت بڑے پیانے پر اس کی" استقبال" کا انتظام کیا تھا۔ کئی دن سے بڑے بڑے جلوس نکالے جا رہے تھے اور جلسے اور مظاہرے کیئے جا رہے تھے تاکہ پروپیگنڈا بھی ہو جائے اور اصل موقع پر کام کرنے کی مشق بھی ہو جائے گی۔ میں لکھنؤ گیا اور ان میں سے بعض چیزوں میں شریک ہوئے اور ان کی کامیابی حکومت کے دل میں کھٹکنے لگی۔ اس نے ان کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کئے اور یہ احکام جاری کیئے کہ فلاں فلاں مقام پر جلوس نہ نکالا جائے۔ اسی سلسلے میں مجھے ایک نیا تجربہ ہوا اور میرے جسم نے پولیس کے ڈنڈوں اور لاٹھیوں کا مزہ چکھا۔

جلوس نکالنے کی ممانت کر دی گئی تھی اور اس کی وجہ یہ ظاہر کی گئی تھی کہ سڑک کی آمدورفت مین حرج ہوتا ہے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ جلوس اس طرح نکالیں جس میں کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ جہان تک مجھے یاد ہے ہم نے سولہ سولہ آدمیوں کے جتھے بنا کر الگ الگ سونی سڑکوں سے بھیجے کہ جلسے کے مقام پر پہنچ کر مل جائیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کے الفاظ سے یہ حکم کے خلاف ورزی تھی۔ کیونکہ سولہ آدمیوں کا جھنڈا لے کر چلنا جلوس کی تعریف میں داخل ہے ایک جتھے کے آگے آگے میں تھا اور میرے پیچھے کچھ فاصلے سے دوسرا جتھا آرہا تھا جس کے رہنما میرے رفیق کتر گووند بلبھ پنتھ تھے۔ پر کوئی دو سو گز گیا ہو گا کہ پیچھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو تین درجن پولیس کے سوار ہم پر چڑھے آرہے ہیں تھوڑی دیر کے بعد وہ آن پہنچے اور گھوڑوں کے دھکے سے ہمارا چھوٹا سا جتھا منتشر ہو گیا۔ پولیس کے سواروں نے ہمارے والنٹیروں کو

بڑے بڑے ڈنڈوں سے مارنا شروع کر کیا اور انہیں بھاگ کر گلیوں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں میں پناہ لینی پڑی۔ سواروں نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا۔ انہیں خوب پیٹا۔ میں نے بھی جب یہ دیکھا کہ گھوڑے چڑھے چلے آتے ہیں تو گھبرایا اور جی میں آیا کہ بھاگ کر جان بچاؤ۔ مگر تھوڑی دیر میں دیکھا کہ میں سڑک کے بیچ میں اکیلا کھڑا ہوں اور مجھ سے چند گز کے فاصلے پر پولیس والے ہر طرف ہمارے والینٹروں کو پیٹ رہے ہیں۔ میرے قدم خود بخود سڑک کے کنارے کی طرف ہٹنے لگے تا کہ مجھ پر نظر نہ پڑے۔ مگر میں پھر ٹھہر گیا اور اپنے دل کو سمجھایا کہ مجھے یہاں سے ہٹنا زیبا نہیں۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہو گیا مگر مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میرے ذہن میں اس وقت کیسی کشمکش تھی اور مین نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرے غرور نے یہ گوارا نہ کیا کہ کوئی نامردی کی حرکت کروں۔ مگر اس وقت مردی اور نامردی میں بس ایک ہی قدم کا فاصلہ تھا اور کوء تعجب نہ تھا کہ میں یہ قدم اٹھالیتا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سوار اپنی نئی لاٹھی ہلاتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہٹ جاؤ اور خود منہ پھیر اکر کھڑا ہو گیا۔ یہ حرکت مجھ سے بے اختیار سرزد ہوئی تا کہ سر میں اور منہ پر چوٹ نہ آئے۔ اس نے میری پیٹھ پر کس کر دو لاٹھیاں جمائیں۔ مجھے چکر آ گیا اور سارے بدن سے کانپنے لگا۔ مگر یہ دیکھ کر مجھے تعجب اور خوشی ہوئی کہ میں نے اپنی جگہ سے قدم نہیں ہٹایا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس چلی گئی اور اس نے آگے جا کر ہمارا راستہ روک دیا۔ ہمارے والنٹیر پھر اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے بہتوں کو سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ پنتھ اور ان کے ساتھی بھی آ گئے۔ ان کی بھی یہی درگت ہوئی تھی۔ ہم سب کے سب پولیس کے مقابل سڑک پر بیٹھ گئے۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا اور شام ہو گئی۔ ایک طرف بڑے بڑے حکام جمع ہو گئے اور دوسری طرف لوگوں کا مجمع یہ خبر پا کر اکٹھا ہونے لگا۔ آخر حکام اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہم جس راستہ سے جانا

چاہتے تھے اسی سے جائیں۔ جب ہم روانہ ہوئے تو وہی سوار جنہوں نے ہمیں زدوکوب کیا تھا محافظ دستے کے طور پر ہمارے ساتھ تھے۔

میں نے اس چھوٹے سے واقعے کو کسی قدر تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے کہ اس کا مجھ پر ایک خاص اثر ہوا تھا۔ مجھے جو چوٹ آئی تھی اسے میں اس خوشی میں بھول گیا کہ میں لاٹھی کھانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ ایک اور بات جس سے مجھے تعجب ہوا یہ تھی کی عین اس وقت مجھ پر لاٹھیاں پڑ رہی تھیں میرے خیالات بالکل واضح تھے اور میں اچھی طرح جان بوجھ کر اپنے جذبات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس مشق سے مجھے فائدہ پہنچا اس لئے کہ دوسرے دن اس سے بھی زیادہ سخت آزمائش ہونے والی تھی۔ دوسرے دن صبح کو سائمن کمیشن کے آنے کا وقت تھا اور ہمارا بڑا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

میرے والد اس وقت الہ آباد میں تھے اور مجھے خوف تھا کہ مجھ پر جو حملہ ہوا تھا اس کی خبر اخبار میں پڑھ کر وہ اور گھر میں سب لوگ پریشان ہوں گے۔ اس لئے میں نے شام کو انہیں ٹیلیفون کر دیا کہ میں خیریت سے ہوں آپ بالکل نہ گھبرائیں مگر وہ اس پر بھی گھبرائے۔ انہیں رات کو نیند نہیں آئی اور آدھی رات کے قریب انہوں نے فیصلہ کیا کہ خود لکھنؤ آئیں۔ آخری گاڑی چھوٹ چکی تھی، اس لئے وہ موٹر کار سے روانہ ہوئے۔ رستے میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور وہ صبح پانچ بجے کے قریب ایک سو چھیالیس میل کا سفر طے کر کے تھکے ہارے لکھنؤ پہنچے۔

اسی وقت ہم لوگ اسٹیشن جانے کے لئے جلوس کی تیاری کر رہے تھے۔ گزشتہ شام کے واقعات کی وجہ سے لکھنؤ میں اتنا جوش پیدا ہوگیا تھا جو ہماری کوششوں سے کبھی نہ ہوتا۔ اور ہزاروں آدمی اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ شہر کے مختلف حصوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس اُمڈے چلے آتے تھے۔ کانگرس کے دفتر سے بڑا جلوس روانہ ہوا جس میں کئی ہزار آدمی چار چار کی ٹولیوں میں چل رہے

تھے۔ ہم لوگ اس بڑے جلوس میں تھے۔ جب اسٹیشن کے قریب پہنچے تو پولیس نیرو کا۔ اسٹیشن کے سامنے آدھ میل مربع کا ایک کھلا میدان تھا۔ (جس پر اب نیا اسٹیشن بنایا گیا ہے) ہم لوگوں کو اس سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا۔ اور ہم اس کے ایک طرف صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے ہمارا جلوس چپ چاپ کھڑا رہا اور اس نے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر طرف پیدال اور سوار پولیس اور فوج کا ہجوم تھا۔ ہمدرد تماشائیوں کا مجمع بڑھتا گیا۔ اور ان میں سے بہت سے دو دو تین کر کے میدان میں پھیل گئے۔ یکا یک ہم نے دیکھا کہ دور سے ایک جماعت چلی آتی ہے۔ یہ فوج کے رسالے اور سوار پولیس کی دو تین لمبی صفیں تھیں جو ہماری طرف بڑھ رہی تھیں اور ان لوگوں کو جو میدان میں کھڑے تھے مارتی کچلتی چلی آتی تھیں۔ ان سواروں کا ہلہ بجائے خود ایک شاندار منظر تھا مگر اس وقت تو یہ منظر بہت دردناک تھا اس لئے کہ بچارے بے قصور تماشائی حیران پریشان گھوڑوں کا ناپوں کے نیچے کچلے جا رہے تھے۔ سواروں کی بڑھتی ہوئی صفوں کے پیچھے یہ لوگ زمین پر پڑے تھے۔ ان میں سے بعض اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے اور بعض درد سے تڑپ رہے تھے۔ میدان جنگ کا پورا نقشہ نظر کے سامنے تھا۔ مگر ہمیں اس منظر کو دیکھنے یا اس پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ سوار تھوڑی دیر میں ہمارے قریب آن پہنچے اور ان کی پہلی صف پوری رفتار سے ہمارے جلوس سے ٹکرائی۔ ہم اپنی جگہ پر جمے رہے۔ یہ دیکھ کر سواروں نے آخری لمحے میں گھوڑوں کی باگ کھینچ لی۔ گھوڑے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور ان کے اگلے پیر ہمارے سروں کے بالکل قریب تھرتھرا رہے تھے۔ اب سواروں اور پیادوں نے ہم پر لاٹھیاں اور ڈنڈے برسانے شروع کر دئے۔ یہ بڑا سخت حملہ تھا اور خیالات کی وہ وضاحت جو میں گزشتہ شام کو رکھتا تھا، اس وقت رخصت ہو گئی۔ مجھے صرف اتنا احساس باقی تھا کہ جہاں کھڑا ہوں۔ وہاں سے سرکنا نہیں چاہیے۔ میں لاٹھیوں کی بوچھاڑ سے اندھا سا ہو رہا تھا۔ کبھی

کبھی غصے سے بیتاب ہو جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ میں بھی ہاتھ چلاؤں۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ یہ کس قدر آسان ہے کہ میں اپنے سامنے والے پولیس افسر کو کھینچ کر گرا دوں اور اس کی جگہ خود سوار ہو جاؤں۔ مگر ایک مدت کی تربیت اور انضباط کام آیا اور میں نے ہاتھ اٹھایا تو مارنے کے لئے نہیں بلکہ صرف وار روکنے کے لئے۔ اس کے علاوہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے ذرا سی بھی زیادتی ہوئی تو نہایت ہی ہولناک مصیبت پیش آئے گی اور ہم میں سے ہزاروں آدمی گولیوں سے ہلاک کر دئے جائیں گے۔

معلوم ہوتا تھا کہ بہت دیر میں مگر اصل میں چند منٹ کے بعد ہماری صف بغیر ٹوٹے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اب میں اکیلا رہ گیا اور دونوں طرف سے حملے کا اندیشہ ہو گیا۔ مجھ پر کئی لاٹھیاں اور پڑیں اس کے بعد کسی نے یکایک مجھے پیچھے سے پکڑ کر اٹھا لیا جس پر میں بہت ہی جھنجھلایا۔ معلوم ہوا کہ میرے بعض نوجوان ساتھیوں نے یہ سمجھ کر کہ میری جان لینے کی جا رہی ہے، مجھے بچانے کے لئے یہ زبردستی کا طریقہ استعمال کیا تھا۔

ہم سب جلوس والے کوئی سو فٹ سرک کر پھر جم گئے۔ پولیس بھی پیچھے ہٹ گئی۔ اور ہم سے پچاس فٹ کے فاصلے پر پرا باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس عرصے میں فساد کی جڑ یعنی سائمن کمیشن اسٹیشن سے جو ہم سے آدھ میل کے فاصلے پر تھا، چپکے سے روانہ ہو گیا مگر اس پر وہ کالے جھنڈیوں اور مظاہرہ کرنے والوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ تھوڑی دیر گئے۔ میں سید حاوالد کے پاس گیا جو بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

وقتی ہیجان کے گزرنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ سارے بدن میں درد ہو رہا ہے اور میں تھک کر شل ہو گیا ہوں۔ رگ رگ مین درد ہو رہا تھا۔ سارے بدن پر زخم اور لاٹھیوں کے نشان تھے۔ مگر خوش قسمتی سے کسی ایسے حصے مین چوٹ نہیں آئی تھی

جس میں جان کا خطرہ ہو۔ میرے بعض ساتھی بہت بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ گووند ولبھ پنتھ اس ہنگامے میں میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ ان کا قد چھ فٹ سے اوپر ہے اس وجہ سے وہ خاص طور پر لاٹھیوں کا نشانہ بنے۔ اس دن کی چوٹوں کی وجہ سے انہیں بڑی تکلیف وہ بیماری لاحق ہو گئی اور وہ ایک عرصے تک اپنی پیٹھ سیدھی کرنے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئے۔ مجھے اس دن سے اپنی جسمانی طاقت اور برداشت کی قوت پر اور زیادہ گھمنڈ ہو گیا مگر میری آنکھوں میں جو تصویر پھر رہی تھی وہ لاٹھی کے حملوں کی نہیں بلکہ ان پولیس والوں کے چہروں کی ہے جو ہم پر حملہ کر رہے تھے۔ زیادہ بے دردی سے یورپی سارجنٹوں نے مارا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے کسی قدر نرمی سے کام لیا تھا۔ کس قدر خوف ناک تھے وہ چہرے جن میں نفرت اور خونخواری جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی اور ہمدردی اور انسانیت کا نام تک نہ تھا! غالباً ہم لوگوں کے چہرے بھی ایسے ہی بھیانک ہو گے۔ عدم تشدد نے نہ تو ہمارے دلوں میں حریفوں کی محبت کا جوش، پیدا کیا تھا اور نہ ہمارے چہروں کے حسن میں اضافہ کیا تھا۔ اس پر بھی ہمیں ایک دوسرے سے شکایت نہ تھی۔ ہمارے دل ذاتی عداوت اور کینے سے پاک تھے۔ اس وقت ہمارے اندر عجیب و غریب زبردست قوتیں کارفرما تھی۔ اور ہمیں جدھر چاہتی تھیں وہ ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں، ہمارے جزبات وخواہشات پر حاوی تھی اور ہمیں کٹھ پتلی کی طرح اپنے شاروں پر چلاتی تھیں۔ ہم اندھا دھند لڑ رہے تھے اور ہمیں یہ خبر نہ تھی کہ ہم کاہے کے لئے لڑ رہے تھے اور کدھر جا رہے ہیں۔ عمل کا جوش اور ہیجان ہم پر طاری تھا، مگر اس جوش کا ٹھنڈا ہونا تھا کہ ہمارے دلوں میں یہ سوال اٹھا' آخر اس سارے ہنگامے کا مقصد کیا ہے؟''

ٹریڈ یونین کانگرس

اس سال ملک کی سیاست پر سائمن کمیشن کا بائیکاٹ اور آل پارٹیز کانفرنس حاوی تھی۔ مگر میری دلچسپی اور سرگرمی کا رخ دوسرا تھا۔ کانگریس کے جنرل سکر ٹری کی حیثیت سے میں اس کی تنظیم کو قوت پہنچانے میں مصروف تھا اور خاص طور پر مجھے اس کام سے دلچسپی تھی کہ عام لوگوں کی توجہ کو سماجی اور معاشی تغیرات کی طرف پھیروں۔ مدراس کی کانگریس میں کامل آزادی کی جو تحریک اٹھائی گئی تھی اسے مستحکم کرنے کی ضرورت تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ آل پارٹیز کانفرنس ہمیں اس مقصد سے پیچھے ہٹانا چاہتی تھی۔ اس غرض سے میں نے دور دور کا سفر کیا اور بہت سے اہم جلسوں میں تقریریں کیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ۱۹۲۸ء میں چار صوبوں یعنی پنجاب، مالا بار دہلی اور صوبہ متحدہ کی کانفرنسوں میں اور بنگال اور بمبئی کے نوجوان اور طالب علمون کی انجمنوں میں صدارت کے فرائض انجام دئے۔ وقتاً فوقتاً میں صوبہ متحدہ کے دیہات میں جاتا رہا اور مزدوروں کے مجمعوں میں بھی تقریریں کرتا رہا۔ میری تقریروں کی تان ہمیشہ ایک ہی چیز پر ٹوٹتی تھی، البتہ ان کا طرز مقامی حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا تھا۔ جس قسم کا مجمع دیکھتا اسی قسم کی باتوں پر زور دیتا۔ میری تقریر کا موضوع سب کہیں سیاسی آزادی اور سماجی آزادی ہوتی تھی اور میں سماجی آزادی کو کارکنوں اور تعلیم یافتہ طبقے میں پھیلانا چاہتا تھا کیونکہ یہ لوگ جو قومی تحریک کے پشت پناہ جاتا تھا: ماضی کی شاندار روایات، بدیسی حکومت کے مادی اور روحانی نقصانات، قوم کی حالت زار، غلامی کی ذلت، قومی عزت کا تقاضا کہ ہم آزادی حاصل کریں، مادر وطن کی خاطر قربانی کی ضرورت۔ یہ وہ جانے بوجھے موضوع تھے جو ہر ہندوستانی کے دل کو متاثر کرتے ان لووں میں سے نہ تھا جو ہندوستان یا کسی اور ملک کے ماضی کی اندھادھند تعریف کرتے ہیں) یہ باتیں اپنی جگہ صحیح تھیں لیکن کثرت استعمال سے فرسودہ ہو چکی تھیں اور انھیں بار بار

دہرانے کی وجہ سے لوگ دوسرے مسئلوں اور ہماری جدوجہد کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف متوجہ نہیں ہونے پاتے تھے۔ ان سے جذبات بھڑک اٹھتے تھے مگر غوروفکر کی تحریک نہیں ہوتی تھی۔

میں ہندوستان میں اشتراکیت کا ہراول نہیں تھا بلکہ سچ پوچھئے تو میں اس میدان میں بہت پیچھے تھا اور بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا۔ بہت سے لوگ مجھ سے آگے نکل چکے تھے اور میں ان کے روش نقش قدم پر چل رہا تھا۔ مزدوروں کی اشتراکیت کی تحریک اور نوجوانوں کی اکثر انجمنیں اصولاً صریحی طور پر اشتراکیت کی حامی تھیں۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب میں یورپ سے واپس آیا، ہندوستان میں اشتراکیت کی ایک دھندلی سی فضا چھائی ہوئی تھی اور بعض افراد اس سے بھی پہلے اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ زیادہ تر یہ لوگ خیالی دنیا میں رہتے تھے مگر مارکس کے نظریہ کا اظر روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور چند اشخاص اپنے آپ کو مارکس کا پورا پیرو سمجھتے تھے۔ یورپ اور امریکا کی طرح ہندوستان میں بھی اس رجحان کو سوویٹ یونین کی نشوونما خصوصاً اس کے پنج سالہ منصوبے سے تقویت پہنچی تھی۔

مجھے اشتراکی کارکن کی حیثیت سے جو کچھ اہمیت حاصل تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ میں ایک سربرآوردہ کانگرسی تھا اور کانگرس میں ایک بڑا عہدہ رکھتا تھا۔ بعض اور مشہور کانگرسیوں پر بھی ان خیالات کا اثر ہو چلا تھا۔ یہ چیز سب سے زیادہ صوبہ متحدہ کی کانگرس کمیٹی میں نمایاں تھی اور اور ہم نے ۱۹۲۶ء ہی میں اس کمیٹی میں ایک ہلکا سا اشتراکی پروگرام بنانے کی کوشش کی تھی، ہمارصوبہ زمینداروں اور تعلقداروں کا صوبہ ہے اس لئے ہمیں سب سے پہلے زمین کا مسئلہ حل کرنا تھا۔ ہم نے یہ اعلان کیا کہ موجودہ نظام آراضی کو منسوخ کردیا جائے اور سلطنت اور کاشتکاروں کے بیچ میں درمیانی اشخاص نہ رہیں۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام کرنے ضرورت تھی اس لئے کہ جس فضا میں ہم رہتے تھے وہ اس قسم کے خیالات کی عادی نہیں تھی۔

۱۹۲۹ء میں صوبہ متحدہ کی کانگرس کمیٹی ایک قدم اور آگے بڑھی اور اس نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سامنے ایک تجویز پیش کی جو صریحی طور پر اشتراکی خیالات پر مبنی تھی۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنے اجلاس میں جو ۱۹۲۹ء میں گرمیوں کے موسم میں بمبئی میں منعقد ہوا، صوبہ متحدہ کی تجویز کے ابتدائی حصہ کو منظور کر لیا یعنی اشتراکیت کے اصول کو جس پر یہ تجویز مبنی تھی، قبول کر لیا، اس تجویز میں جو مفصل پروگرام پیش کیا گیا تھا اس پر غور کرنا آئندہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اکثر لوگ اس تجویز کو بھول گئے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کا مسئلہ ابھی سال بھر سے یکا یک کانگرس میں چھڑ گیا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اس تجویز کو بغیر کسی خاص غور کے پاس کر دیا تھا اور اکثر ممبر یہ نہیں سمجھے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

انجمن آزادی ہند کی صوبہ متحدہ کی شاخ (جس کے سب ممبر اس صوبے کے ممتاز کانگرسی کارکن تھے) بالکل اشتراکی خیالات رکھتی تھی۔ اس لئے وہ کانگرس کمیٹی سے جس میں مختلف خیالات کے لوگ تھے، کچھ آگے بڑھ گئی۔ اصل میں سماجی آزادی انجمن آزادی ہند کے مقاصد میں داخل تھی۔ ہمیں یہ امید تھی کہ ہم اس انجمن کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیلا دیں گے اور ان سے آزادی اور اشتراکیت کے پروپگنڈا کا کام لیں گے مگر بدقسمتی سے اس انجمن کو صرف صوبہ متحدہ میں کسی قدر کامیابی ہوئی اور کہیں اس کا کام نہیں چلا جس سے میں بہت مایوس ہوا۔ اس ناکامیابی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ملک میں اس انجمن کے حامیوں کی کمی تھی بلکہ اس کے اکثر کارکن کانگرس کے کارکن بھی تھے اور کانگرس نے کم سے کم اصولاً کامل آزادی کے مقصد کو اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ ہم خود کانگرس ہی کے ذریعے سے اپنا کام کر سکتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انجمن کے بانیوں میں سے بعض نے اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا اور اسے ترقی دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

وہ اس سے صرف اتنا کام لینا چاہتے تھے کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی پر زور ڈالیں اور اس میں اپنے نمائندوں کو منتخب کرائیں۔ غرض یہ انجمن کچھ زیادہ پنپنے نہیں پائی۔ جب کانگریس نے زیادہ زوردار پالیسی اختیار کی تو وہ لوگ جو انجمن کے روح روان تھے کانگریس کی طرف کھنچ آئے اور انجمن اور بھی کمزور ہو گئی۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے شروع ہوتے ہی انجمن کانگریس میں ضم ہو گئی اور اس کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۲۸ء کے نصف آخر اور ۱۹۲۹ء میں میری گرفتاری کی خبر گرم تھی نہ معلوم اخبار کی خبروں میں اور ان نجی اطلاعوں میں جو مجھے واقف کار دوستوں سے ملتی تھیں کہاں تک اصلیت تھی۔ مگر مجھے ان کی وجہ سے ایک بے اطمینانی سی رہنے لگی۔ میں ہر وقت یہ سمجھتا تھا کہ بس اب گرفتار ہوا ہی چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں تھی اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ میری آئندہ زندگی، اور چاہے جیسی بھی ہو مگر اطمینان کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہی اچھا تھا کہ میں بے اطمینانی اور فوری تغیرات اور جیل جانے کا عادی ہو جاؤں۔ میرے خیال میں مجھے ایک حد تک اور میرے خاندان کو اس کی عادت پڑ گئی۔ اور جب کبھی میرے گرفتاری ہوتی تھی تو میں اسے ایک معمولی چیز سمجھتا تھا۔ غرض گرفتاری کی افواہیں فائدے سے خالی نہ تھیں۔ ان کی وجہ سے میری روزمرہ کی زندگی میں ایک طرح کی بے چینی اور خلش کا لطف پیدا ہو گیا۔ جو دن آزادی میں گذرتا تھا وہ بہت غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ مگر خلاف توقع ۱۹۲۸ء میں مجھے بڑی لمبی مہلت ملی اور کہیں اپریل ۱۹۳۰ء میں جا کر میری گرفتاری عمل میں آئی۔ اس وقت سے مجھے جو تھوڑا بہت موقع جیل سے باہر رہنے کا ملتا ہے وہ ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے اور میں اپنے گھر میں اس طرح رہتا ہوں جیسے کوئی مہمان تھوڑے دن کے لئے آیا ہے۔ میری زندگی کچھ بے ڈھنگی سی رہتی ہے کیونکہ یہ خبر نہیں رہتی کہ کل کیا ہوگا۔ ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ جیل سے بلاوا آیا ہی چاہتا ہے۔

۱۹۲۸ء ختم ہونے کو آیا اور کلکتہ کانگریس کا اجلاس قریب آ گیا۔ میرے والد اس کی صدارت کرنے والے تھے۔ وہ ہروقت آل پارٹیز کانفرنس اور اپنی رپورٹ کی فکر میں رہتے تھے اور اس کو کانگریس میں منظور کرانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں اس کا مخالف ہوں کیونکہ میں آزادی کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھا اور انھیں یہ بات ناگوار تھی۔ ہم اس معاملے میں کچھ زیادہ بحث نہیں کرتے تھے مگر آپس میں ذہنی نزاع اور مخالفت ضرور تھی، خیالات کا اختلاف ہم میں پہلے بھی رہ چکا تھا اور اس قدر اہم تھا کہ دونوں کی سیاسی راہیں الگ الگ ہوگئی تھیں۔ مگر میرے خیال میں اتنی کشیدگی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں کو اس رنج تھا۔ کلکتے میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ میرے والد نے صاف کہہ دیا، اگر انھیں کانگریس میں کامیابی ہوئی، یعنی ان کی آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ کثرت رائے سے منظور نہ ہوئی تو وہ کانگریس کی صدارت نہیں کریں گے۔ آئینی حیثیت سے یہ بالکل معقول بات تھی مگر ان لوگوں کے لئے جو ان کی رائے کی مخالف تھے بڑی مشکل پڑ گئی اسلئے کہ وہ مخالفت کو اس حد تک بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ کانگریس میں اور شاید دوسری جماعتوں میں بھی یہ رجحان عام ہے کہ لوگ نکتہ چینی اور مخالفت کرتے ہیں مگر ذمہ داری قبول کرنے سے گھبراتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ یہ امید رہتی ہے کہ ان کی نکتہ چینی سے دوسری پارٹی اپنا رخ بدل دے گی اور کشتی کے چلانے کا بوجھ خود ان پر نہیں پڑے گا۔ جہاں ہم لوگ ذمہ داری سے محروم ہیں اور اختیارات غیر ذمہ دار حکام کے ہاتھ میں ہیں، جو معزول نہیں کئے جاسکتے، مثلاً ہندوستان کی موجودہ حکومت میں وہاں ہم نکتہ چینی (یا عملی مخالف) کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے اور اس صورت میں نکتہ چینی لازمی طور پر محض تخریبی ہوتی ہے لیکن یہاں بھی تخریبی نکتہ چینی اس وقت موثر ہوسکتی ہو جب ہم اس کے لئے تیار ہوں کہ اگر موقع ملا تو ہم حکومت کی پوری ذمہ داری قبول کرلیں گے اور ملی اور فوجی، داخلی اور خارجی تمام محکموں

کو چلائیں گے۔ محض جزوی اختیارت کا مطالبہ کرنا، جیسا کہ لبرل جماعت فوج کے معاملے میں کرتی ہے، گویا اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ ہم حکومت کے چلانے کی قابلیت نہیں رکھتا اور پھر ہماری نکتہ چینی میں کچھ زور باقی نہیں رہتا۔ گاندھی جی پر نکتہ چینی کرنیوالے اکثر یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اعتراض اور مخالفت کرنے کو تو موجود ہیں مگر اس کے قدرتی نتائج سے گھبراتے ہیں۔ کانگرس میں بہت سے لوگ ہیں جو ان کی اکثر کارروائیوں کو ناپسند کرتے ہیں اور ان پر بہت سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں مگر اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انہیں کانگرس سے الگ کر دیں یہ طریقہ سمجھ میں تو آتا ہے مگر یہ دونوں فریقوں کیساتھ ناانصافی پر مبنی ہے۔

اسی قسم کی مشکلیں کلکتہ کانگرس میں پیش آئیں۔ دونوں فریقوں میں گفت و شنید ہوتی رہی اور سمجھوتے کی راہ نکالی گئی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے بڑی الجھن اور ابتری پیدا ہوئی۔ کانگرس میں جو رزولیشن پاس ہوا اس میں آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ منظور کر لی گئی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر حکومت برطانیہ نے ایک سال کے اندر مجوزہ دستور اساسی قبول نہ کیا تو کانگرس دوبارہ کامل آزادی کو اپنا مقصد قرار دے گی۔ یہ رزولیشن یقیناً کامل آزادی کے نصب العلین سے بہت پست تھا اس لئے کہ آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ میں پورے نوآبادیات کے درجے کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا مگر غالباً یہ تجویز ایک لحاظ سے دانشمندی پر مبنی تھی اس لئے کہ اس کی وجہ سے آپس کی تفریق جس کے لئے کوئی تیار نہیں تھا، رک گئی اور کانگرس متحدہ طور پر ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر سکی۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ حکومت برطانیہ آل پارٹیز کانفرنس کے دستور اساسی کو سال بھر کے اندر منظور نہیں کرے گی۔ لڑائی کا ہونا یقینی تھا اور ملک کی حالت کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی کی رہنمائی کے بغیر لڑائی میں کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔

میں نے کسی قدر بے دلی سے کانگرس کے کھلے اجلاس میں اس رزولیوشن کی مخالفت کی مگر پھر بھی میں جنرل سکرٹری منتخب ہو گیا، چاہے جو کچھ بھی ہو میں سکرٹری کی عہدے کو نہیں چھوڑتا تھا اور کانگرس میں میری مثال برے کے مشہور پادری کی سی تھی۔ کانگرس کا صدر کوئی بھی ہو سکرٹری میں ہی رہتا تھا۔

کلکتہ کانگرس سے چند روز پہلے جھریا میں جو کوئلے کی کانوں کے علاقے کا مرکز ہے۔

آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کا اجلاس ہوا۔ میں نے صرف اس کے پہلے دو دن کے جلسوں میں شرکت کی کیونکہ اس کے بعد مجھے کلکتہ جانا تھا۔ مجھے ٹریڈ یونین کانگرس میں شرکت کا یہ پہلا موقع تھا اور میں ایک حد تک باہر کا آدمی سمجھا گیا۔ حالانکہ کسانوں میں اور کچھ دن مزدوروں میں کام کرنے کی وجہ سے مجھے عوام میں خاصی ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی تھی یہاں میں بھی اصلاح پسندوں اور انقلاب پسندوں کا وہ پرانا جھگڑا نظر آیا۔ دو اہم مسئلے زیر بحث تھے ایک تو یہ کہ دونوں بین الاقوامی انجمنوں میں سے کسی ایک سے اور انجمن مخالف شہنشاہی اور چین پیسیفک یونین سے الحاق کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ جنیوا کی بین الاقوامی مزدوروں کی کانفرنس میں نمائندے بھیجے جائیں یا نہ بھیجے جائیں۔ مگر ان مسئلوں سے کہیں زیادہ اہم وہ شاید اختلاف تھا جو کانگرس کے دونوں فریقوں میں پایا جاتا تھا۔ ایک تو پرانا ٹریڈ یونین کا فریق تھا جو معتدل سیاسی خیالات رکھتا تھا بلکہ صنعتی معاملات میں سیاست کی مداخلت کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ صرف صنعتی جدوجہد چاہتا تھا اور وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ اس کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کی حالت رفتہ رفتہ بہتر بنائی جائے۔ اس فریق کی لیڈر۔ ن۔ م۔ جوشی تھے جنھوں نے کئی بار جنیوا میں ہندوستانی مزدوروں کی نمائندگی کی تھی۔ دوسرا فریق زیادہ جنگجو تھا وہ سیاسی جدوجہد کا قائل تھا۔ اور کھلم کھلا انقلابی خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ اس پر کسی قدر اثر

ان لوگوں کا تھا جو اشتمالی یا قریب قریب اشتمالی اصول رکھتے تھے۔ یہ فریق بمبئی کے پارچہ بانی کے مزدوروں پر حاوی ہو گیا تھا اور اس کی رہنمائی میں بمبئی کے کپڑے کے کارخانوں میں ایک بہت بڑی ہڑتال ہو چکی تھی، جس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔ بمبئی میں پارچہ بانی کے مزدوروں کی ایک نئی طاقت ور انجمن "گرنی کامگار یونین" کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کا وہاں کے مزدوروں میں بہت بڑا اثر تھا۔ ایک اور طاقتور انجمن یعنی۔ جی۔ آئی۔ پی ریلوے یونین بھی انتہا پسند فریق کے اثر میں تھی۔

جب سے ٹریڈ یونین کانگرس قائم ہوئی اس کا انتظام اور اس کا دفتر ن۔ م جوشی اور ان کے فریقوں کے ہاتھ میں تھا اور جوشی ہی نے اس تحریک کو نشو و نما دی تھی۔ انتہا پسند فریق کا اثر عام ممبروں میں تو بہت تھا مگر کانگرس کے ارباب اقتدار کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی تھی اور اس کی پالیسی میں انھیں ذرا بھی دخل نہ تھا۔ صورت بہت نا قابل اطمینان تھی اور اصل حالات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ لوگوں میں ناراضی پھیلی ہوئی تھی، آپس میں جھگڑے ہو رہے تھے۔ اور انتہا پسند فریق ٹریڈ یونین کانگرس میں اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کے باوجود لوگ معاملے کو زیادہ طول دینے گھبراتے تھے کہ کہیں کانگرس میں تفریق نہ ہو جائے۔ ابھی ٹریڈ یونین کی تحریک ہندوستان میں بالکل بچپن کی حالت میں تھی اس کی قوت بہت کم تھی اور اس کے چلانے والے خود مزدور نہیں بلکہ باہر کے لوگ تھے۔ ان کے حالات میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ باہر والے مزدوروں کے ذریعے سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ٹریڈ یونین کانگرس اور مزدوروں کی دوسری انجمنوں میں یہ بات صاف نظر آ رہی تھی۔ البتہ ن۔ م جوشی نے برسوں کی جدوجہد سے یہ ثابت کر دیا تھا، کہ وہ ٹریڈ یونین کے سچے اور پکے حامی ہیں اور جو لوگ انھیں سیاسی حیثیت سے رجعت پسند یا اعتدال پسند سمجھتے تھے وہ بھی اس کے معترف تھے کہ انھوں نے

ہندوستان کے مزدوروں کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

میں جھریا کی کانگریس میں انتہا پسند فریق سے ہمدردی رکھتا تھا مگر چونکہ میں نیا آدمی تھا اور کانگریس کی خانگی جھگڑوں کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا اس لئے میں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا۔ میرے جانے کے بعد ٹریڈ یونین کانگریس کے سالانہ انتخابات ہوئے اور مجھے کلکتہ میں معلوم ہوا کہ میں آئندہ سال کے اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا ہوں۔ میرا نام اعتدال پسند فریق نے پیش کیا تھا، شاید اس وجہ سے کہ اس کے نزدیک انتہا فریق کے امیدوار کے مقابلے میں (جو ریلوے کا ایک مزدور تھا) میری کامیابی کا سب سے زیادہ امکان تھا۔ اگر میں انتخاب کے دن جھریا میں موجود ہوتا تو یقیناً مزدور امیدوار کے حق میں دست بردار ہو جاتا۔ مجھے یہ بات بہت نامناسب معلوم ہوئی کہ ایک نیا آدمی، جو خود مزدور نہیں تھا، ایک دم سے صدر بنا دیا جائے۔ یہ بھی ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کے بچپن اور اس کی کمزوری کی ایک علامت تھی۔

۱۹۲۸ء میں مزدوروں کے جھگڑوں اور ہڑتالوں کا بڑا زور رہا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا بمبئی کے پارچہ بانی کے خستہ حال اور جنگجو مزدور اس میں پیش پیش تھے۔ بنگال جوٹ مل میں بہت بڑی عام ہڑتال ہوئی۔ جمشید پور کے لوہے کے کارخانے میں (اور شاید ریلوے میں بھی) ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ جمشید پور کے ٹین کی چادروں کے کارخانے میں بڑا سخت مقابلہ ہوا اور غریب مزدور کئی مہینے تک لڑتے رہے۔ مگر باوجود اس کے کہ پبلک نے ان سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا، اس طاقتور کمپنی نے جو اس کارخانے کی مالک تھی (اور برما آئل کمپنی سے وابستہ تھی) انھیں کچل کر رکھ دیا۔

غرض ان دو سال کے عرصے میں صنعتی حلقوں میں سخت بے چینی رہی، اور مزدوروں کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ہندوستان میں

صنعت کی گرم بازاری کا زمانہ تھا۔ اور کارخانے کے مالکوں نے اس عرصے میں بے اندازہ نفع کمایا تھا۔ پانچ چھ سال تک جوٹ اور روئی کے کارخانوں کا سالانہ نفع سو فیصد رہا اور کبھی کبھی ڈیڑھ سو فیصد تک بھی پہنچ گیا۔ یہ تمام منافع مالکوں اور حصہ داروں کی جیب میں گیا اور مزدوروں کی حالت جیسی پہلے تھی ویسی ہی رہی۔ کبھی ان کی مزدوری میں خفیف سا اضافہ بھی ہوا تو اسی نسبت سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ اس زمانے میں جب کہ کروڑوں روپے کی آمدنی ہو رہی تھی مزدور بدستور بدتر سے بدتر کوٹھریوں میں رہتے تھے اور ان کی عورتوں کو پہننے کو کپڑا بھی میسر نہ تھا۔ بمبئی کے مزدوروں کی حالت تو خراب تھی ہی مگر کلکتے کے محلوں سے گھنٹہ بھر کے راستہ پر جوٹ کے مزدوران سے بھی بڑھ کر مصیبت میں گرفتار تھے۔ نیم برہنہ میلی کچیلی عورتیں چند پیسوں کے بدلے صبح سے شام تک کام کرتی تھیں تاکہ گلاسگو اور ڈنڈی میں اور بعض ہندوستانیوں کے گھروں میں دولت کی ندیاں بہتی رہیں۔

جب تک گرم بازاری کا دور رہا کارخانوں کے مالک مزے کرتے رہے مزدوروں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور ان کی زندگی اس طرح گزرتی رہی۔ مگر جب یہ دور ختم ہو گیا اور لمبے چوڑے منافع بند ہو گئے تو ظاہر ہے کہ اس کا سارا بوجھ غریب مزدوروں پر پڑا۔ پچھلے نفع کو لوگ بھول گئے تھے اور رکھا پی کے ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اب یہ کہا جاتا تھا کہ جب تک کافی نفع نہ ہو کارخانے کیسے چل سکتے ہیں؟ اسی کا نتیجہ تھا کہ صنعتی حلقوں میں بے چینی اور شورش پھیل گئی اور بمبئی میں اتنی زبردست ہڑتالیں ہوئیں جنھیں دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے اور کارخانوں کے مالک اور ارباب حکومت دونوں ڈر گئے۔ مزدوروں کی تحریک، خیالات اور تنظیم دونوں کے لحاظ سے متحد جنگجو اور خطرناک ہوتی جاتی تھی۔ سیاسی تحریک بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اگرچہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہ تھا مگر پھر بھی یہ ایک حد تک ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ایسی صورت میں حکومت مستقبل کی طرف سے ہرگز مطمئن نہیں

ہو سکتی تھی۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے یکا یک مزدوروں کی تنظیم پر وار کیا اور انتہا پسند فریق کے چند سربرآوردہ کارکنوں کو گرفتار کرلیا۔ بمبئی کی گرنی کام یونین کے لیڈر اور بنگال صوبہ متحدہ اور پنجاب کے مزدوروں کے لیڈر گرفتار کے لئے گئے۔ ان میں سے بعض اشتمالی تھے، بعض قریب قریب اشتمالی خیالات رکھتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جو صرف ٹریڈ یونین کے حامی تھے۔ اس طرح میرٹھ کا مشہور مقدمہ شروع ہوا جو ساڑھے چار برس تک چلتا رہا۔

میرٹھ کے ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے صدر میرے والد تھے اور جس کے ممبروں میں ڈاکٹر انصاری اور دوسرے حضرات کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔ ہماری سامنے بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے لئے روپیہ جمع کرنا سہل نہ تھا۔ روپے والوں کو اشتمالیوں، اشتراکیوں اور مزدوروں کی حمایت میں شورش کرنے والوں سے کچھ زیادہ ہمدردی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اور وکیل صاحبان شائلاک کی طرف اپنی خدمات صرف اس شرط پر بیچنے کو تیار تھے کہ انھیں پورے آدھ سیر گوشت کا ٹکڑا کسی نہ کسی کے جسم سے کاٹ کر دیا جائے۔ ہماری کمیٹی میں میرے والد اور بعض اور ممتاز وکیل شامل تھے اور وہ مشورہ دینے کے لئے اور عام نگرانی کرنے کے لئے ہروقت تیار تھے۔ ان لوگوں کو کوئی معاوضہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ مگر وہ مہینوں جم کر میرٹھ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ دوسرے وکیل جن سے ہم نے مدد کی درخواست کی اس مقدمے کو زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

میرٹھ کے مقدمے کے علاوہ میرا تعلق بعض اور کمیٹیوں سے رہا ہے جو م۔ ن رائے اور دوسرے سیاسی ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے قائم ہوئی تھیں۔ ہر موقع پر اپنے ہم پیشہ حضرات کی حرص کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ سب

سے پہلا بڑا دھچکا مجھے ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے مارشللا کے مقدمے کے دوران میں پہنچا تھا جبکہ ایک چوٹی کے وکیل کو اس پر اصرار تھا کہ وہ غریب جو مارشل لا کا شکار ہوئے تھے اور جن میں ایک ان کے ہم پیشہ وکیل بھی شامل تھے، ان کی بھاری فیس پوری پوری ادا کریں۔ ان میں سے بہتوں کو ان کی فیس ادا کرنے کے لئے قرض لینا پڑا یا اپنی جائیداد بیچنی پڑی۔ ہم غریب سے غریب مزدوروں سے پیسہ پیسہ جمع کرتے تھے اور وکیلوں کو بڑے بڑے چیک لکھ کر دیتے تھے۔ اس سے مجھے روحانی تکلیف ہوتی تھی کیونکہ سیاسی ملزموں اور مزدوروں کے مقدموں میں خواہ پیروی کی جائے یا نہ کی جائے نتیجہ ایک ہی نظر آتا تھا۔ بہرحال میرٹھ کے مقدمے میں کئی لحاظ سے پیروی ضروری معلوم ہوتی تھی۔

میرٹھ کے ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے والی کمیٹی کو خود ان ملزموں کی وجہ سے بڑی دقتیں پیش آتی تھیں۔ ان میں طرح طرح کے لوگ تھے جن کی طرف سے مختلف قسم کی صفائی پیش کرنی تھی اور اکثر ان میں آپس میں اختلاف رہا کرتا تھا۔ چند مہینے کے بعد ہم نے باضابطہ کمیٹی توڑ دی مگر انفرادی حیثیت سے ان لوگوں کی مدد کرتے رہے۔ سیاسی واقعات کی رفتار روز بروز ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتی گئی اور ۱۹۳۰ء میں ہم سب کے سب جیل میں پہنچ گئے۔

-------اختتام حصہ اول------------

بادلوں کی گرج

۱۹۲۹ء کی کانگرس لاہور میں ہونے والی تھی۔ دس سال کے بعد کانگرس پھر پنجاب آرہی تھی۔ لوگوں کے ذہن ۱۹۱۹ کے واقعات سے تازہ ہو گئے:۔ جلیانوالا باغ کا حادثہ، مارشل لا اور اس کی ذلتیں، امرتسر کا اجلاس اور ترک موالات کی تحریک کا شروع ہونا۔ اس دس سال کے عرصہ میں بہت کچھ ہو چکا تھا ہندوستان کا نقشہ بدل گیا تھا مگر ۱۹۱۹ء کے واقعات کی مثالیں اب بھی موجود تھیں۔ سیاسی کشمکش بڑھتی جاتی تھی اور لڑائی کی فضا تیزی سے چھا رہی تھی۔ آنے والی لڑائی کے آثار سارے ملک میں نظر آرہے تھے۔

اسمبلی اور صوبوں کی کونسلوں سے ایک مدت سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی سوائے ان چند حضرات کے جو ان مقدس حلقوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنا کام لشتم، پشتم چلا رہے تھے اور اس کی کوشش کر رہے تھے کہ حکومت کی تحکم پسندی اور استبداد پر ایک پھٹا پرانا پردہ ڈالے رہیں تاکہ ہندوستان کی ''پارلیمنٹ'' کا نام باقی رہے اور اس کی ممبروں کو الاؤنس ملتا رہا۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی آخری کامیاب کوشش جو اسمبلی نے کی وہ اس کا ۱۹۲۸ء کا رزولیوشن تھا جس میں سائمن کمیشن سے اتحاد عمل کرنے سے انکار کیا گیا تھا۔

اس کے بعد کچھ دن تک اسمبلی کے صدارت اور حکومت کے درمیان کش مکش ہوتی رہی۔ اسمبلی کے سوراجی صدر وٹھل بھائی پٹیل اپنی آزادی رائے کی وجہ سے حکومت کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے اور ان کے پر کترنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس قسم کے واقعات لوگوں کو اسمبلی کی طرف متوجہ کر لیتے تھے مگر مجموعی طور پر پبلک کی توجہ کا مرکز باہر کے واقعات تھے۔ میرے والد کونسل کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اس وقت کونسلوں سے کوئی طرف

سے بالکل مایوس ہو گئے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اس وقت کونسلوں سے کوئی کام

نہیں نکل سکتا وہ خود اس چکر سے نکلنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے۔ اگرچہ وہ آئینی دماغ رکھتے تھے اور قانونی طریقوں کے عادی تھے لیکن واقعات سے انھیں یہ افسوسناک تجربہ ہوا کہ نام نہاد آئینی طریقے ہندوستان میں بالکل بیکار ہیں۔ وہ اپنی قانونی ذہنیت کی تسکین کے لئے اس کے یہ تاویل کرتے تھے کہ ہندوستان میں نہ تو کوئی آئین ہے اور نہ قانون کی حکومت ہے اس لئے کہ یہاں محض ایک شخص یا چند اشخاص کی مرضی سے آرڈی نینس وغیرہ کی شکل میں یکا یک قانون نافذ ہو جاتے ہیں جیسے بازی گر کی ٹوپی سے خرگوش نکل پڑتا ہے۔ وہ اپنی طبیعت اور عادت کے لحاظ سے ہرگز انقلاب پسند نہ تھے اور اگر اوسط طبقے کی کوئی جمہوری ہوتی تو وہ یقیناً اس کے پشت پناہ ہوتے مگر موجودہ حالات میں انھیں ہندوستان کی آئینی شورش اور دکھاوے کی پارلیمنٹ کے نام سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔

گاندھی جی ابھی تک سیاسیات سے الگ تھے۔ سوائے اس کے کہ انھوں نے کلکتے کی کانگرس میں حصہ لیا تھا۔ پھر بھی وہ واقعات کی رفتار سے پوری طرح باخبر تھے اور کانگرس کے لیڈر اکثر ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ چند سال سے ان کا وقت زیادہ تر کھاوی کو رواج دینے میں صرف ہوتا تھا اور انھوں نے اس غرض سے ہندوستان میں لمبے لمبے دورے کئے تھے۔ انھون نے باری باری سے ہر صوبے کا دورہ کیا اور ہر ضلعے، ہر بڑے قصبے یہاں تک کہ دور افتادہ دیہات میں بھی پہنچے۔ ہر جگہ انکی وجہ سے لوگوں کا بے شمار مجمع ہوتا تھا اور ان کے پروگرام کو پورا کرنے کے لئے ان کے اسٹاف کو پہلے سے بہت کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ اس طریقے سے انھوں نے کئی بار ہندوستان کا دورہ کیا ہے اور شمال سے لے کر جنوب کے سرے تک اور مشرقی پہاڑوں سے لیکر مغربی سمندر تک اس وسیع ملک چپہ چپہ چھان ڈالا ہے۔ میرے خیال میں کسی انسان نے ہندوستان کا اتنا سفر نہیں کیا جتنا انھوں نے کیا ہے۔ اگلے زمانے میں بڑے بڑے سیلانی گذرے ہیں جو ہمیشہ چلتے رہتے تھے۔

یہ خلقی یاتری تھے جن پر ہمیشہ سفر کی دھن سوار رہتی تھی۔ مگر ان کے زمانے میں آمدو رفت کے ذریعے بہت ست تھے اور ان کی عمر بھی کی سیاحت ریل یا موٹر کے ایک سال کے سفر کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ گاندھی جی نے ریل اور موٹر سے سفر کیا مگر اس کے پابند نہیں رہے بلکہ پیدل بھی پھرے۔ اس طرح انھیں ہندوستان اور اس کے باشندوں کے متعلق وہ معلومات حاصل ہوگئیں جو کسی کو نصیب نہیں ہوئیں اور کروڑوں آدمیوں کو انھیں دیکھنے کا اور ان سے ملنے کا موقع ملا۔

۱۹۲۹ء میں وہ اپنے کھادی کے دورے کے سلسلے میں صوبہ متحدہ آئے اور سخت گرمی کے موسم میں کئی ہفتے اس صوبہ کا دورہ کرتے رہے۔ کبھی کبھی میں بھی چند روز کے لئے ان کے ساتھ چلا جاتا تھا اور پچھلے تجربے کے باوجود مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی تھی کہ ان کی کشش سے لوگوں کا کتنا زبردست مجمع اکٹھا ہوجاتا ہے۔ یہ بات سب سے زیادہ مشرقی اضلاع، مثلاً گورکھپور میں نمایاں تھی۔ جہاں لوگوں کی ہجوم پر ٹڈی دل کا گمان ہوتا تھا۔ جب ان کا موٹر دیہات سے گزرتیا تھا تو ہر چند میل کے فاصلے پر دس ہزار سے لے کر پچیس ہزار تک مجمع ہوجاتا تھا۔ اور اس بڑے جلسے میں جو روزانہ کہیں نہ کہیں ہوتا تھا لوگوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ سوائے چند بڑے شہروں کے اور کہیں ریڈیو کا انتظام نہیں تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اتنا بڑا مجمع ان کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ غالباً ان لوگوں کو سننے کی توقع بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی سے خوش ہوجاتے تھے کہ انھیں مہاتما کا درشن نصیب ہوگیا۔ گاندھی جی عموماً ان موقعوں پر بہت مختصر تقریر کرتے تھے تاکہ انھیں حد سے زیادہ تکان نہ ہو۔ اس کے بغیر اس سلسلے کو ہر روز بلکہ ہر گھنٹے جاری رکھنا قطعاً ناممکن تھا

میں صوبہ متحدہ کے پورے دورے میں ان کے ساتھ نہیں رہا کیونکہ میں ان کیلئے کچھ زیادہ کار آمد نہیں تھا اور خواہ مخواہ درشن کرنے والوں کی تعداد بڑھانے سے

کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گو مجھے بڑے مجمعوں سے وحشت نہیں ہوتی لیکن بغیر کسی معقول وجہ کے میں دھکے کھانے اور پیر کچلوانے کی تکلیف جو عموماً گاندھی جی کے ساتھیوں کے حصے میں آتی ہے، کیوں اٹھاتا۔ مجھے اور بہت سا کام کرنا تھا اور میں اپنی جدوجہد کو کھادی کے پرچار تک محدود نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لئے کہ موجودہ سیاسی حالت کے مقابلے میں مجھے یہ ایک چھوٹی سے چیز معلوم ہوتی تھی۔ گاندھی جی کی غیر سیاسی مصروفیتیں مجھے ایک حد تک ناگوار تھیں اور ان کے خیالات کی جڑ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان دنوں وہ کھادی کے کام کیلئے چندہ کررہے تھے اور اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ مجھے (درِدرنرائن) یعنی غریبوں کے خدا کے لئے روپیہ چاہئے۔ غالباً اس سے ان کا یہ منشا تھا کہ وہ گھریلو صنعتوں کے ذریعے سے غریبوں کے لئے کام مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان الفاظ کی تہ میں مفلسی کی عظمت کا خیال پوشیدہ تھا۔ گویا ان کے نزدیک خدا خاص طور پر غریبوں کا خدا ہے اور وہ اس کے برگزیدہ بندے ہیں۔ شاید مفلسی قابل نفرت چیز معلوم ہوتی ہے جس کی ہرگز تعریف نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کا مقابلہ کرکے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہئے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ میں اس نظام پر حملہ کروں جو لوگوں کے مفلس ہونے کو گوارا کرتا ہے بلکہ خود مفلسی پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ اس سے ہچکچاتے ہیں انھیں کسی نہ کسی طرح مفلسی کے وجود کی حمایت کرنی پڑتی ہے۔ ان کے دل میں خیال بسا ہوا ہے کہ دنیا میں دولت کی کمی ہے اور وہ کسی طرح دنیا کی اس حالت کا تصور نہیں کرسکتے جس میں سب کے لئے ضروریات زندگی افراط سے مہیا ہوں۔ غالباً ان کا یہ خیال ہے کہ غریب اور امیر فرق ہمیشہ باقی رہے گا۔

جب کبھی مجھے گاندھی جی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ امیر اپنی دولت کو عالم لوگوں کی امانت سمجھیں۔ یہ بہت قدیم خیال ہے جو یورپ میں قرون وسطیٰ میں بہت عام تھا اور ہندوستان میں اب

تک پایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ انسان کس طرح اس کی توقع کرسکتا ہے یا اسے سماجی مسئلے کا حل سمجھ سکتا ہے۔

آسمبلی، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ایک اونگھتی سوتی جماعت ہوتی جاتی تھی اور اس کی روکھی پھیکی کارروائیوں میں بہت کم لوگ دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دن بھگت سنگھ اور ب۔ک۔دت نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ انھوں نے مہمانوں کی گیلری سے نیچے کی منزل میں دو بم پھینکے۔ کسی کے زیادہ چوٹ نہیں آئی اور غالباً جیسا کہ ان ملزموں نے آگے چل کر بیان کیا، ان کا مقصد بھی کسی کو نقصان پہنچانا نہ تھا۔ بلکہ محض ایک ہل چل پیدا کر دینا تھا۔

چنانچہ واقعی آسمبلی میں اور سارے ملک میں ایک ہل چل مچ گئی۔ تخویف پسندوں کی دوسری کارروائیاں اس قدر بے ضرر نہ تھیں۔ ایک نوجوان انگریز افسر، جس کی نسبت یہ خیال تھا کہ اس نے لالہ لاجپت رائے کو مارا تھا، لاہور میں گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔ بنگال وغیرہ میں بھی پھر تخویف پسندوں کا زور ہو گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے کئی سازش کے مقدمے چلائے جا رہے تھے۔ نظر بندوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

لاہور کی سازش کے مقدمے میں پولیس نے عدالت میں عجیب عجیب حرکتیں کیں جس کی وجہ سے پبلک اس مقدمے کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو گئی۔ اکثر قیدیوں نے اس برتاؤ کے خلاف جوان سے عدالت اور جیل خانوں میں ہوتا تھا بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ یہ ہڑتال کس وجہ سے شروع ہوئی تھی مگر آگے چل کر اس کے مقاصد میں اس برتاؤ کا مسئلہ بھی شامل ہو گیا جو قیدیوں خصوصاً سیاسی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ بھوک ہڑتال ہفتوں چلتی رہی اور اس کی وجہ سے ملک میں ایک ہل چل مچ گئی ملزم اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ انھیں عدالت میں لیجانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کارروائی بار بار ملتوی کرنی پڑتی تھی۔ اس پر

حکومت ہند نے ایک نئے قانون کی رو سے عدالت کو یہ اجازت دی دی کہ ملزموں یا ان کے وکیلوں کی غیر موجودگی میں بھی مقدمے کی کاروائی جاری رکھی جاسکتی ہے۔ اس کی تحقیقات بھی کہ قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے انھیں کے سپرد کردی گئی۔

جس وقت بھوک ہڑتال کو شروع ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا میں لاہور میں موجود تھا۔ مجھے جیل خانے میں بعض قیدیوں سے ملنے کی اجازت دے دی گئی اور میں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے بھگت سنگھ کو عمر بھر میں پہلی بار دیکھا اور جتندر ناتھ داس اور دوسرے قیدیوں سے بھی ملا۔ یہ سب کے سب بہت کمزور اور صاحب فراش تھے اور ان سے زیادہ بات چیت کرنے کا موقع نہ تھا۔ بھگت سنگھ کا چہرہ دلکش تھا اس سے ذہانت ٹپکتی تھی اور کچھ عجیب سکون و اطمینان کی کیفیت پائی جاتی تھی غصے کا اس میں نام تک نہ تھا اس کی بات چیت اور سارے انداز میں ایک خاص نرمی تھی مگر شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک مہینے کے فاقے کے بعد ہر شخص میں روحانیت اور نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ جتندر ناتھ داس اور بھی زیادہ حلیم معلوم ہوتا تھا اور اس لڑکیوں کی سی بھولی صورت تھی۔ جس وقت میں نے اس دیکھا اور سخت تکلیف کی حالت میں تھا۔ آگے چل کر اکسٹھ دن کے فاقے کے بعد وہ دنیا سے گذر گیا۔

بھگت سنگھ کو سب سے زیادہ اس کی فکر تھی کہ وہ اپنے چچا سردار جیت سنگھ سے جو ۱۹۰۷ء میں لالہ لاجپت رائے کے ساتھ جلاوطن کئے گئے تھے ملے، یا کم از کم انکی خیر خبر معلوم کرے۔ مدتوں سے وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک افواہ یہ سننے میں آئی تھی کہ انہوں نے افریقہ میں سکونت اختیار کر لی ہے مگر کوئی یقینی بات نہیں معلوم ہوسکی۔ خدا جانے وہ اب زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

جتندر ناتھ داس کی موت سے سارے ملک میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ سیاسی قیدیوں سے بدسلوکی کا مسئلہ زور شور سے چھڑ گیا۔ حکومت نے اس کی تحقیقات کے

لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے قواعدہ بنائے گئے جن کی رو سے قیدیوں کے تین درجے قرار دئے گئے۔ سیاسی قیدیوں کا کوئی خاص درجہ نہیں رکھا گیا۔ان قواعد سے کچھ اصلاح کی امید معلوم ہوتی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سے کوئی فرق نہیں پڑا اور قیدیوں کی حالت اب تک نہایت نا قابل اطمینان ہے۔

گرمی اور برسات گزرگئی اور خزاں کا موسم آ گیا۔صوبوں کا کانگرس کمیٹیاں لاہور کانگرس کے صدر کے انتخاب میں مصروف تھیں۔انتخاب کا عمل بہت طول طویل تھا اور اگست میں شروع ہو کر اکتوبر میں ختم ہوا کرتا تھا۔۱۹۲۹ء میں سبلوگ اس پر متفق تھے کہ گاندھی جی صدر بنائے جائیں۔ دوبارہ صدر منتخب ہونے سے کانگریس میں ان کا درجہ بڑھ نہیں سکتا تھا۔اس لئے کہ وہ کئی سال سے مہا صدر مانے جاتے تھے مگر سب کا یہ خیال تھا کہ ملک میں لڑائی چھڑنے والی ہے جس کے سردار واقعتاً وہی ہوں گے۔ اس لئے اگر قانوناً کانگرس کے سردار بھی وہی بنا دئے جائیں تو اچھا ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت میں کوئی اور ایسا تھا بھی نہیں جس پر سب کی نظریں پڑتیں۔

چنانچہ صوبوں کی کمیٹیوں نے گاندھی جی کا نام صدرارت کے لئے تجویز کیا مگر انہوں نے اسے منظور نہیں کیا۔ان کا انکار بالکل صاف تھا لیکن اس میں مزید بحث کی گنجائش معلوم ہوتی تھی اور لوگوں کو امید تھی کہ وہ اپنے فیصلے کرنے کے لئے لکھنؤ میں منعقد ہوا۔اور آخر تک ہم سب کا یہ خیال تھا کہ وہ راضی ہو جائیں گے مگر وہ کسی طرح نہ مانے اور بالکل آخری لمحے میں انہوں نے میرا نام پیش کیا۔ان کے آخری انکار سے کمیٹی گھبرا گئی اور اس کے ممبروں کو یہ بات کسی قدر نا گوار ہوئی کہ گاندھی جی نے انہیں بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ اس وقت اور کوئی صدر نہیں مل سکتا تھا۔اس لئے انہوں نے چار نا چار مجھی کو منتخب کیا۔

مجھے کبھی اتنی تکلیف اور ذلت کا احساس نہیں ہوا تھا جتنا اس انتخاب کے موقع پر ہوا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بہت بڑی عزت ہے اور اگر میرا انتخاب معمولی طریقے سے ہوتا تو مجھے بے حد خوشی ہوتی مگر میں صدر دروازے سے تو کے اپہلو کے دروازے سے بھی داخل نہیں ہوا تھا بلکہ یکا یک چور دروازے سے نکل پڑا تھا۔ لوگ حیران رہ گئے اور انہیں میری صدارت قبول کرنی پڑی۔ انہوں نے بگڑی بات بنا لی اور مجھے کڑوی دوا سمجھ کر پی گئے۔ میری خودداری کو ٹھیس لگی اور جی چاہا کہ اس اعزاز کو واپس کردوں، مگر خوش قسمتی سے میں نے ضبط سے کام لیا ورنہ تماشا بن جاتا۔ میں بہت ملال اور افسردگی کی حالت میں چپکے سے اٹھ کر چلا گیا۔

غالباً اس فیصلے سے سب سے زیادہ خوشی میرے والد کو ہوئی۔ انہیں میرے سیاسی خیالات پسند نہ تھے مگر مجھے چاہتے تھے اور میری ہر کامیابی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ خود اکثر مجھ پر نکتہ چینی کرتے تھے اور مجھے جھڑک دیتے تھے مگر کسی اور کی مجال نہ تھی کہ مجھے ان کے سامنے برا کہے۔

میرا انتخاب میرے لئے بہت بڑی عزت اور بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ یہ پہلی مثال تھی کہ باپ کے بعد ہی بیٹا صدارت کی کرسی پر بٹھایا گیا۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ میں کانگرس کا سب سے کم عمر صدر ہوں (اس وقت میری عمر چالیس برس کی تھی) مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں کھوکھلے جب کانگرس کے صدر ہوئے تو ان کی بھی قریب قریب یہی عمر تھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے (اگرچہ وہ مجھ سے کچھ بڑے ہیں) اس سے بھی کم عمر میں صدارت کی۔ مگر گوکھلے ۳۷۔۳۸ برس کی عمر میں پختہ کار مدبروں میں شمار ہوتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے خاص اہتمام سے قابل احترام بوڑھوں کی سی شکل بنالی تھی جوان کے علم وفضل کے شایان شان تھی مگر مجھے تو لوگ مدبر سمجھتے تھے اور نہ کبھی مجھ پر علم وفضل کا الزام لگایا گیا اس لئے میں اب تک بڑھاپے کے شبہ سے بچا ہوا ہوں۔ حالانکہ میرے بال

سفید ہو گئے ہیں اور میرا چہرہ میری عمر کے راز کو فاش کر رہا ہے۔

لاہور کانگریس کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس اثنا میں واقعات کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود ان کے اندر قوت کام کر رہی ہے جو انہیں آگے بڑھائے لئے جاتی ہے۔ افراد خواہ اپنی کتنی ہی اہمیت سمجھتے ہوں مگر اصل میں انہیں اس تحریک میں بہت کم دخل تھا۔ انسان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی زبردست مشین کا ایک پرزہ ہے جو پوری قوت سے چل رہی ہے۔

غالباً تقدیر کے اس ریلے کو روکنے کی توقع میں حکومت نے ایک قدم آگے بڑھایا اور وائسرائے ہند لارڈ ارون نے یہ اعلان کیا کہ ایک ''گول میز کانفرنس'' منعقد کی جائے گی۔ اس اعلان میں بڑی ہوشیاری سے ایسے الفاظ رکھے گئے تھے جن کی معنی ممکن تھا کہ بہت کچھ ہوں اور یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ نہ ہوں۔ ہم میں سے اکثر لوگ دوسری صورت کو زیادہ قرین قیاس سمجھتے تھے۔ بہر حال اگر اس اعلان کے کچھ معنی تھے بھی تب بھی جو کچھ ہم چاہتے تھے اس سے بہت کم تھے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی بڑی بے صبری کے ساتھ لیڈروں کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد کی گئی۔ گاندھی جی، میرے والد، اور وٹھل بھائی پٹیل (جو اب تک اسمبلی کے صدر تھے) اور اعتدال پسند لیڈروں میں سر تیج بہادر سپرو اور دوسرے حضرات وہاں موجود تھے، ان سب نے مل کر ایک متفقہ رزولیوشن یا اعلان تیار کیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ہم وائسرائے کا اعلان بعض اہم شرطوں کے ساتھ، جن کا پورا ہونا نہایت ضروری ہے قبول کرتے ہیں۔ اگر حکومت ان شرطوں کو منظور کر لے تو ہم اس کے ساتھ اتحاد عمل کر سکتے ہیں یہ واقعی اچھی خاصی اہم شرطیں تھیں۔ (۱)

اس رزولیوشن کو سب جماعتوں کے نمائندوں سے جن میں اعتدال پسند بھی تھے اور انتہا پسند بھی منوا لینا واقعی بڑی کامیابی تھی۔ کانگریس کے نصب العین سے یہ بہت پست تھا۔ البتہ ایک متفقہ تجویز کے لحاظ سے خاصا بلند تھا۔ مگر اس میں

ایک بڑا دھوکا تھا، ان شرطوں کے متعلق کم سے کم دو فریق مختلف نقطہ نظر رکھتے تھے۔ کانگرس والے تو انہیں واقعی ناگزیر چیز سمجھتے تھے جس کے بغیر اتحاد عمل ممکن نہ تھا۔ ان کی طرف سے یہ کم سے کم مطالبہ تھا۔ یہ بات کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جو اس کے بعد منعقد ہوا بالکل صاف کر دی گئی اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ ان شرطوں کی میعاد کانگرس کے آئندہ اجلاس تک ہے مگر اعتدال پسندوں کے نزدیک یہ زیادہ سے زیادہ مطالبہ تھا اور اس پر اس حد تک زور دینے کی ضرورت نہ تھی کہ اتحاد عمل سے انکار کر دیا جائے۔ رزولیوشن میں تو ان شرطوں کو اہم قرار دیا گیا تھا مگر وہ لوگ انہیں سرے سے شرطیں ہی نہیں سمجھتے تھے۔

چنانچہ باوجود اس کے کہ ان میں سے کوئی شرط پوری نہیں کی گئی اور ہم میں سے اکثر اور ہمارے ساتھ اور ہزاروں آدمی قید کر دئے گئے مگر ہمارے اعتدال پسند اور مصالحت پسند دوستوں نے جو اس اعلان پر دستخط کرنے میں ہمارے شریک تھے، ہمیں قید کرنے والوں کے ساتھ پورا پورا اتحاد عمل کیا۔

ہم میں سے اکثر کو شبہ تھا کہ ایسا ہی کچھ ہوگا۔ (اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ حضرات اس حد تک عمل کرنے پر تیار ہو جائیں گے) پھر بھی اس وقت تھوڑی بہت امید تھی کہ اس متحدہ فیصلے کی وجہ سے جس میں کانگرس والوں نے کس قدر ضبط سے کام لیا تھا، اعتدال پسند اور دوسرے فریق بھی جنہیں بے سمجھ بوجھے حکومت سے اتحاد عمل کرنے کی عادت ہے، اپنی اس خواہش کو ضبط کریں گے۔ ہم لوگوں کو جنہیں یہ سمجھوتا سخت ناپسند تھا سب سے زیادہ خیال اس کا تھا کہ ہم کانگرس کی جماعت میں پورا پورا اتحاد قائم رکھیں۔ ایک بہت بڑی لڑائی شروع ہونے والی تھی اس لئے ہم یہ ہرگز نہیں کر سکتے تھے کہ آپس میں تفریق ہونے دیں۔ یہ معلوم تھا کہ حکومت ان شرطوں کو منظور نہیں کرے گی۔ اسلئے ہماری پوزیشن اور مضبوط ہو جائے گی اور ہم کانگرس کے نرم فریق کو بھی اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ چند ہی ہفتہ

کی بات تھی دسمبر کا مہینہ اور لاہور کانگرس کچھ دور نہ تھی۔

پھر بھی ہمارے لئے یہ مشترکہ اعلان بہت ناگوار چیز تھی۔ کامل آزادی کے مطالبے کو چھوڑنا خواہ وہ فرضی طور پر اور تھوڑی ہی مدت کے لئے کیوں نہ ہو غلط اور خطرناک پالیسی تھی اس لئے مجھ کو اس اعلان پر دستخط کرنے میں تامل تھا اور سوبھاش بوس نے تو قطعاً انکار کردیا تھا۔ پہلے میں نے بھی انکار کیا، مگر جیسا کہ میں اکثر کرتا ہوں، سب کے کہنے سننے سے دستخط کردئے۔ پھر بھی مجھے سخت صدمہ تھا اور دوسرے ہی دن میں نے کانگرس کی صدارت سے استعفا دینے کا ارادہ کرلیا اور گاندھی جی کو خط کے ذریعے سے اس کی اطلاع دی۔ غالباً میں دل سے استعفا دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ میں وقعی بے حد پریشان تھا۔ گاندھی نیا یک تسکین وہ خط لکھا اور تین دن غور کرنے کے بعد میرا جوش ٹھنڈا ہوگیا۔

لاہور کانگرس سے تھوڑے ہی دن پہلے کانگرس ارحکومت کے درمیان سمجھوتے کی ایک آخری کوشش کی گئی۔ لارڈ ارون سے ملاقات کا انتظام کیا گیا مجھے نہیں معلوم کہ اس ملاقات کی تحریک کس نے کی تھی مگر میرا خیال یہ ہے کہ شاید وٹھل بھائی پٹیل اس کے محرک تھے۔ گاندھی جی اور میرے والد کانگرس کے خیالات کی نمائندگی کررہے تھے اور شاید مسٹر جناح، سر تیج بہادر سپرو اور پریسیڈنٹ پٹیل بھی موجود تھے۔ اس ملاقات سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ گفتگو کی کوئی مشترک بنیاد نہیں تھی اور دونوں بڑے فریقوں، یعنی حکومت اور کانگرس کے خیالات میں زمیان آسمان کا فرق تھا۔ غرض ابکانگرس کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ عملی کاروائی شروع کرے۔ کلکتے میں جو ایک سال کی مہلت دی گئی تھی وہ ختم ہورہی تھی۔ اب قطعی طور پر اس کا اعلان کرنا تھا کہ کانگرس کا متصد کامل آزادی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنی تھیں۔

لاہور کانگرس سے پہلے کے ہفتوں میں مجھے ایک اور اہم کام درپیش تھا۔ آل

انڈیا ٹریڈ یونین کا اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا اور مجھے اس میں صدارت کرنی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ ایک ہی شخص چند ہفتے کے اندر نیشنل کانگرس اور ٹریڈ یونین کانگرس کی صدارت کرے۔ مجھے یہ امید تھی کہ میں دونوں کے درمیان ایک واسطے کا کام کروں گا اور انھیں ایک دوسرے سے قریب تر کردوں گا تاکہ کانگرس میں اشتراکیت اور مزدوروں کی حمایت کا جذبہ بڑھ جائے اور مزدور قومی تحریک میں شامل ہو جائیں۔

شاید یہ امید بالکل بے بنیاد تھی اس لئے کہ قومیت اشتراکیت کی راہ پر زادہ دور اسی وقت تک چل سکتی ہے جب وہ قومیت نہ رہے۔ پھر بھی میرا یہ خیال تھا کہ اگرچہ کانگرس پر متوسط طبقے کے لوگوں کا رنگ غالب ہے لیکن ملک میں وہی ایک موثر انقلابی قوت ہے۔اس لئے مزدوروں کو چاہئے کہ اس سے اتحاد عمل کریں اور اس اپنا اثر ڈالیں مگر اپنی مستقل حیثیت اور اپنے خاص خیالات کو قائم رکھیں اور میں سمجھتا تھا کہ واقعات کی رفتار سے اور عملی جدوجہد کی شرکت کی وجہ سے کانگرس میں اور زیادہ انتہاپسندی پیدا ہو جائے گی اور وہ سماجی اور معاشی مسائل سے نبٹنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ پچھلے چند سال میں کانگرس کی توجہ زیادہ تر کسان اور گاؤں کی طرف رہی تھی، اگر یہی رفتار جاری رہتی تو وہ رفتہ رفتہ ایک بہت بڑی کسانوں کی انجمن بن جاتی یا کم سے کم اس میں کسانوں کے نمائندوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اگرچہ ان کے لیڈر اوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ تھے۔

اس طرح اس بات کا امکان تھا کہ شہر اور گاؤں کی نزاع، جو ہمیشہ سی چلی آتی ہے نیشنل کانگرس اور ٹریڈ یونین کانگرس کے تعلقات پر اثر ڈالے گی۔ مگر یہ امکان بعید تھا کیونکہ موجودہ نیشنل کانگرس متوسط طبقے کے شہریوں کے ہاتھ میں ہے اور جب تک کہ قومی آزادی کا مسئلہ طے نہ ہوگا اس پر قومیت کا رنگ غالب رہے گا اور ملک میں اسی جذبے کا زور رہے گا۔ پھر بھی مجھے مناسب معلوم ہوا کہ کانگرس اور

مزدوروں کی جماعت کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی جائے اور صوبہ متحدہ میں ہم نے یہاں تک کیا کہ صوبے کی کانگرس کمیٹی میں ٹریڈ یونین کانگرس کی شاخ کے نمائندوں کو بھی دعوت دی۔ بہت سے کانگرسیوں نے بھی مزدوروں کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔

مگر مزدوروں کا انتہا پسند فریق نیشنل کانگرس سے دور ہی دور رہنا چاہتا تھا۔ انھیں اس کے لیڈروں پر اعتبار نہ تھا اور وہ اس کے خیالات کو متوسط طبقے کے رجعت پسندانہ خیالات سمجھتے تھے۔ سچ پوچھئے تو مزدوروں کے نقطہ سے یہ بات صحیح بھی تھی۔ نیشنل کانگرس جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر تھا قومیت پسندوں کی انجمن تھی۔

۱۹۲۹ء میں شروع سے آخر تک ہندوستان کے ٹریڈ یونین کے حلقوں میں ایک نئی چیز نے، یعنی اس رائل کمیشن نے جو ہندوستان کے مزدوروں کے تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور وھٹلے کمیشن کہلاتا تھا ایک ہنگامہ برپا کئے رکھا۔ انتہا پسند فریق کمیشن کا بائیکاٹ کرنا چاہتا تھا اور اعتدال پسند اتحاد عمل کرنے پر تیار تھا۔ اس میں شخصی عنصر بھی شامل ہو گیا تھا اس لئے کہ اعتدال پسند فریق کے بعض لیڈر کمیشن کے ممبر بنائے جارہے تھے اور بہت سی باتوں کے طرح اس معاملے میں بھی میری ہمدردی انتہا پسند فریق کے ساتھ تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ نیشنل کانگرس کی پالیسی بھی یہی تھی۔ ایسی حالت میں جب ہم عمل جدوجہد کے لئے تیار تھے۔ سرکاری کمیشنوں سے اتحاد عمل کرنا مہمل سی بات معلوم ہوتی تھی۔

ناگپور کی ٹریڈ یونین کانگرس میں وھٹلے کمیشن کے بائیکاٹ کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس میں اور بہت سے اور نزاعی مسائل میں انتہا پسند فریق کو کامیابی ہوئی۔ میرا حصہ اس کانگرس کی کاروائی میں محض برائے نام تھا۔ چونکہ میں اس میدان میں نیا نیا آیا تھا اور ابھی تک سے اچھی طرح واقف نہ تھا اس لئے دخل دیتے ہوئے ہچکچاتا۔ عام طور پر انتہا پسند فریق کے خیالات سے اتفاق کرتا رہا مگر جلسے کی

کاروائی میں میں نے کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا اور بجائے صدر کے ایک غیر جانب دار مقرر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ چنانچہ ٹریڈ یونین کانگرس میں تفریق ہوگئی۔ اعتدال پسند جماعت نے علیحدہ انجمن بنالی اور میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ ذاتی طور پر میرا یہ خیال تھا، کہ اعتدال پسند جماعت علیحدگی اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں ہے مگر اس میں انتہاپسند جماعت کا بھی قصور تھا اور اس نے انھیں الگ ہونے پر ایک حد تک مجبور کردیا تھا۔ ان دونوں فریقوں کے بیچ میں ایک درمیانی فریق تھا مگر وہ بالکل بے بس تھا۔ شاید اگر اس فریق کو اچھے لیڈر مل گئے ہوتے تو وہ ٹریڈ یونین کانگرس میں تفریق نہ پیدا ہونے دیتا اور اگر تفریق ہو جاتی تو اس کے اتنے افسوسناک نتائج نہ ہوتے جتنے آگے چل کر پیدا ہوئے۔

موجودہ صورت میں ہندوستان کی ٹریڈ یونین کی تحریک کو بہت سخت دھچکا پہنچا جس سے وہ ابھی تک پنپنے نہیں پائی ہے۔ حکومت پہلے ہی مزدوروں کے انتہاپسند فریق کے خلاف اعلان جنگ کرچکی تھی اور میرٹھ کا مقدمہ اس کا پہلا نتیجہ تھا۔ جنگ برابر جاری رہی۔ کارخانے کے مالکوں نے بھی اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء کے جاڑے سے دنیا میں کساد بازاری شروع ہوگئی تھی۔ ایک تو اس کا اثر مزدوروں پر پڑ رہا تھا، دوسرے ان پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، تیسرے ان کی ٹریڈ یونین کی تحریک انتہائی پستی کو پہنچ گئی تھی۔ غرض ان کے لئے بڑی مصیبت کا سامنا تھا وہ اپنی حالت کو روز بروز بگڑتے ہوئے دیکھتے تھے اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ دو ایک سال کے بعد ٹریڈ یونین کانگرس میں ایک اور تفریق اور اشتمالیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت الگ ہوگئی۔ اب اصولی حیثیت سے ہندوستان میں تین ٹریڈ یونین تھیں۔ اعتدال پسند جماعت، اصل ٹریڈ یونین کانگرس اور اشتمالیوں کا گروہ۔ عملی حیثیت سے یہ سب کمزور اور بے اثر تھے اور ان کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے عام مزدور بہت بددل ہوگئے تھے۔ مجھے ۳۰ء کے

بعد سے ان تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں رہا اس لئے کہ میں زیادہ تر جیل میں رہا۔ رہائی کے مختصر اوقات میں مجھے معلوم ہوا کہ اتحاد کی کوششیں ہورئی ہیں مگر ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔ (۲) اعتدال پسند جماعت کی قوت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ ریلوے کے مزدوران کے ساتھ مل گئے ہیں۔ انھیں دوسری جماعتوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ حکومت ان کی انجمن کو تسلیم کرتی ہے اور جنیوا کی لیبر کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے ان کی تجویزوں کو قبول کر لیتی ہے جینوا جانے کے شوق میں مزدوروں کے بعض لیڈران کے ساتھ شریک ہو گئے ہیں اور اپنی انجمنوں کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لائے ہیں۔

---

(۱) وہ شرطیں یہ تھیں:۔

۱۔ مجوزہ کانفرنس میں جتنی بحثیں ہوں وہ اس بنیاد پر ہوں کہ ہندوستان کو نو آبادیات کا درجہ دیا جائے۔

۲۔ کانفرنس میں کانگرس کے نمائندوں کے تعداد غالب ہو۔

۳۔ سیاسی قیدیوں کو عام معافی دی جائے۔

۴۔ ہندوستان کی حکومت اسی وقت سے جہاں تک موجودہ حالات میں ممکن ہو نو آبادیات کی حکومت کے اصول پر چلائی جائے۔

(۲) اس کے بعد ٹریڈ یونین کی تحریک کے اتحاد میں کچھ کامیابی ہوئی ہے اور مختلف جماعتیں ایک حد تک آپس میں اتحاد عمل کر رہی ہیں۔

کامل آزادی کا رزولیوشن اور اس کے نتائج

لاہور کانگرس کی جیتی جاگتی تصویر اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے یہ قدرتی بات ہے اس لئے کہ وہاں مجھے کچھ دن کے لئے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی میں ان جذبات پر غور کیا کرتا ہوں جو اس مصروفیت کے زمانے میں میرے دل میں موجزن تھے۔ لاہور کے لوگوں نے بہت بڑے پیانے پر اور بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جوش و خروش میری ذات میری ذات کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک اصول کے لئے ہے جس کا مظہر میں ہوں۔ پھر بھی ایک انسان کے لئے یہ بہت بڑی چیز تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہزارہا آدمیوں کی نظروں میں اور ان کے دلوں میں اس اصول کا مظہر بن جائے۔ مجھ پر عجیب بیخودی اور مسرت کا عالم طاری تھا مگر جو زبردست مسائل اس وقت درپیش تھے ان کے مقابلے میں میری ذاتی جذبات کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ ساری فضا میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑی ہوئی تھی اور موقع کی اہمیت کا خیال چھایا ہوا تھا۔ ساری فضا میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑی ہوئی تھی اور موقع کی اہمیت کا خیال چھایا ہوا تھا۔ ہم لوگ محض اظہار خیال یا نکتہ چینی یا احتجاج کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ عمل کی دعوت دینے کے لئے جس کے متعلق یقین تھا، کہ یہ سارے ملک کو ہلا دے گا، اور لاکھوں آدمیوں کی زندگی پر اثر ڈالے گا۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر ہمارا اور ہمارے ملک کا کیا انجام ہوگا۔ مگر اس وقت یہ ظاہر تھا کہ ہم کو اور ہمارے عزیزوں کو بڑی کش مکش اور مصیبت کا سامنا ہے۔ اس خیال نے ہمارے جوش و خروش میں ایک سنجیدگی کی شان پیدا کر دی تھی اور ہم اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ ہر ووٹ کے ساتھ ہم آرام و آسائش کو، گھر کی خوشیوں کو اور دوستوں کی صحبت کو خیر باد کہہ رہے تھے اور دن رات کی تنہائی اور جسمانی اور روحانی تکلیف کو دعوت دے رہے تھے۔

کامل آزادی کا اصل رزولیوشن اور آزادی کی عملی تجویز تقریباً متفقہ طور پر پاس ہوگئی۔ ہزاروں میں سے صرف پندرہ بیس آدمیوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ البتہ ایک ضمنی مسئلے پر جو ترمیم کی صورت میں پیش ہوا، واقعی ووٹ لینے کی نوبت آئی۔ یہ ترمیم کثرت رائے سے مسترد ہوگئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ رائے شماری کے نتیجے اور اصل رزولیوشن کی منظوری کا اعلان ۳۱ دسمبر کو ٹھیک بارہ بجے رات کو ہوا جب پرانا سال جا رہا تھا اور نیا سال آ رہا تھا۔ یعنی عین اس وقت جب کلکتہ کانگرس کی مقرر کی ہوئی ایک سال کی معیاد ختم ہوئی، نئی پالیسی کا فیصلہ کیا گیا اور لڑائی کی تیاری شروع ہوگئی۔ ریل نے سیٹی دے دی تھی مگر ہمیں ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کب چلے گی اور کیسے چلے گی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ لڑائی کا نقشہ بنائے اور اس پر عمل کرے مگر سب جانتے تھے کہ حقیقی فیصلہ گاندھی جی کے ہاتھ میں ہے۔

لاہور کانگرس میں صوبہ سرحد سے بھی بہت سے لوگ آئے تھے۔ صوبے کے تھوڑے بہت نمائندے کانگرس میں ہمیشہ شریک ہوا کرتے تھے چند سال سے خان عبدالغفار خان بھی آتے تھے اور ہمارے مشوروں میں حصہ لیتے تھے مگر لاہور میں پہلی بار سرحد کے پر جوش نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو کل ہندوستان کی سیاسی تحریک سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ ان کے صاف دلوں پر اس کا بہت اثر پڑا، اور وہ اپنے دلوں میں سارے ہندوستان کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک ہونے کا احساس لئے ہوئے اور جوش میں بھرے ہوئے لوٹے۔ یہ سیدھے سادے عملی آدمی تھے اور انھیں ہندوستان کے اور صوبوں کے لوگوں کی طرح لفاظی اور سخن سازی نہیں آتی تھی۔ انھوں نے فوراً اپنی تنظیم اور نئے خیالات کی اشاعت شروع کردی۔ انھیں اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور سرحد کے مردوں اور عورتوں نے جنھیں ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب کے بعد شریک ہونے کا موقع ملا

تھا ۱۹۳۰ء سے اس میں بہت نمایاں اور حیرت انگیز حصہ لیا۔

لاہور کانگرس کے تھوڑے ہی دن بعد، اس کے حکم کے مطابق، میرے والد نے اسمبلی اور کونسلوں کی کانگریسی ممبروں کو ہدایت کی کہ وہ کونسلوں کی ممبر شپ سے استعفادے دیں۔ قریب قریب سب نے ایک ساتھ استعفا دیدیا مگر چند حضرات نے انکار کردیا۔ حالانکہ یہ صریحاً اس وعدے کے خلاف تھا جو انھوں نے انتخاب کے وقت کیا تھا۔

ابھی تک ہم مستقبل کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ باوجود اس جوش و خروش کے جس کا اظہار کانگرس کے اجلاس میں ہوا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ملک ہمارے مجوزہ پروگرام پر کس حد تک عمل کرے گا۔ ہم واپسی کی سب راہیں بند کرکے آگے بڑھے تھے۔ پیچھے ہٹنا ممکن نہ تھا مگر وہ جو منزل ہمارے سامنے تھی وہ بے جانی بے دیکھی منزل تھی۔ اپنی تحریک کا افتتاح کرنے اور ملک کے مزاج کا اندازہ کرنے کے لئے ہم نے ۲۶ جنوری کو "یوم آزادی" قرار دیا اور یہ طے کیا کہ اس روز سارے ملک میں آزادی کا عہدہ لیا جائے۔

ہمیں اپنے پروگرام کی کامیابی میں شبہ تھا۔ مگر ہمارے جوش کا یہی تقاضا تھا کہ کوئی موثر عملی قدم اٹھائیں۔ چنانچہ ہم واقعات کی رفتار کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں شروع جنوری میں الہ آباد میں تھا۔ والد زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ غالباً اس سال کمبھ کا میلہ تھا اور لاکھوں مردوں عورتوں کے قافلے الہ آباد، جسے یاتری شری پریاگ کہتے ہیں چلے آرہے تھے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ زیادہ تر تو کسان تھے۔ مگر مزدوروں دکانداروں، کاریگروں، تاجروں اور تعلیم یافتہ پیشہ ور لوگوں کی خاصی تعداد تھی۔ اس عظیم الشان مجمع کو قطار در قطار دریا سے آتے جاتے دیکھ کر میں یہ سوچتا تھا کہ اگر ان لوگوں کو سول نافرمانی اور باامن عملی جدوجہد کی دعوت دیجائے تو ان پر کیا اثر ہوگا۔ ان میں کتنے ہیں جنھیں لاہور کے فیصلوں کا علم

ہے یا ان کی کچھ پروا ہے کتنی عجیب وغریب قوت ہے اس عقیدے میں انھیں ہندوستان کے گوشے گوشے سے گنگا اشنان کے لئے کھینچ لاتا ہے! کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ اس زبردست جوش عمل کا رخ کسی حد تک سیاسی اور معاشی جدوجہد کی طرف پھیر دیں جس میں خود انھیں کی بھلائی ہے؟ یا ان کے دل مذہب کی ظاہری رسموں اور روایتوں سے اس قدر معمور ہیں کہ ان میں دوسرے خیالات کی گنجائش ہی نہیں؟ مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ دوسرے خیالات بھی ان کے دلوں میں موجود ہیں اور صدیوں کے سکون اور خاموشی میں ہل چل پیدا کر رہے ہیں۔ انہی دھندلے سے خیالات اور خواہشات کے عام لوگوں میں پھیل جانے کی وجہ سے پچھلے بارہ سال میں یہ شورشیں برپا ہوئیں جنھوں نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں، کہ یہ خیالات دلوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ جن میں قوت کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ مگر پھر بھی مجھے شک تھا اور میرے دل میں بہت سے سوالات اٹھتے تھے جن کا اس وقت کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ خیالات کہاں تک پھیل چکے ہیں؟ ان کے ساتھ کس قدر طاقت ہے منظم عمل اور برداشت کی کتنی قوت ہے؟

بہت سے یاتری ہمارے یہاں بھی آتے تھے۔ ہمارے گھر ایک تیرتھ کے قریب تھا جو "بھاردوج" کہلاتا ہے اور جہاں پرانے زمانے میں ایک ابتدائی یونی ورسٹی تھی میلے کے دنوں میں ہمارے یہاں صبح سے شام تک لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ میرے خیال میں ان میں سے اکثر محض اس شوق میں آتے تھے کہ ان مشہور لوگوں کو جن کا نام سنا کرتے ہیں۔ خصوصاً میرے والد کو دیکھ لیں۔ مگر بہت سے سیاسی احساس بھی رکھتے تھے اور کانگریس کے متعلق سوالات کرتے تھے کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے اور اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ ہمارے سیاسی نعروں کو جانتے تھے اور دن بھر ہمارا گھر ان نعروں سے گونجتا رہتا تھا۔ پہلے تو میں بیس، پچاس پچاس سو سو آدمیوں کی ٹولیوں سے جو باری باری سے آتی تھیں، دو چار باتیں کرتا تھا مگر

جب دیکھا کہ اس سلسلے کا جاری رکھنا ناممکن ہے تو یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو ٹولی آتی اسے چپ چاپ سلام کر لیتا۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو میں نے چاہا کہ چھپ کر بیٹھ رہوں۔ مگر یہ کوشش بالکل بیکار تھی۔ نعروں کی گونج بڑھتی جاتی تھی۔ مکان کے برآمدے ان مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے، اور ہر کھڑکی اور دروازے سے لوگ اندر جھانک رہے تھے۔ گھر والوں کو چلنا پھرنا، کام کرنا، باتیں کرنا، کھانا کھانا دشوار تھا۔ اس سے نہ صرف الجھن بلکہ کوفت ہوتی تھی۔ مگر یہ لوگ کسی طرح نہیں مانتے تھے۔ ان کی آنکھیں پریم کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ صدیوں کے افلاس اور مصیبت کے بوجھ سے دبے ہوئے دل شکر گذاری اور محبت کے دریا بہا رہے تھے اور اس کے بدلے میں انسانی ہمدردی اور دلسوزی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ الفت و عقیدت کے اس سیلاب کو دیکھ کر دل پر عجز اور رعب نہ چھا جائے۔

ان دنوں ہماری ایک دوست ہمارے ہاں ٹھیری ہوئی تھیں۔ ان سے باتیں کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ چار چار پانچ پانچ منٹ کے بعد مجھے باہر جا کر ان لوگوں سے جو وہاں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ دو چار باتیں کرنی پڑتی تھیں اور بیچ بیچ میں ان کے شور و غل اور نعروں کی آواز چین نہیں لینے دیتی تھی۔ وہ میری یہ مصیبت دیکھ رہی تھیں اور اس سے لطف اٹھا رہی تھیں اور ان پر ایک حد تک اس ہر دلعزیزی کا رعب پڑ رہا تھا جو وہ میری طرف منسوب کرتی تھیں (حالانکہ اصل میں یہ کشش میرے والد کی تھی اور مجھے ان کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے گھیر لیا تھا) وہ یکا یک مجھ سے پوچھ بیٹھیں کہ تمہیں یہ اظہار عقیدت پسند نہیں؟ کیا تم اس پر فخر نہیں کرتے؟ مجھے جواب دینے میں تامل ہوا جس سے وہ یہ سمجھیں کہ شاید اس ذاتی سوال سے مجھے حجاب آتا ہے اور معذرت کرنے لگیں۔ حجاب تو مجھے نہیں تھا مگر اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ میں کچھ کھو سا گیا اور اپنے احساسات

پر غور کرنے لگا۔

میرے دل میں اس وقت طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قریب قریب اتفاقی طور پر میں عام لوگوں میں بہت دلعزیز ہو گیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ بھی میری قدر کرتے تھے اور نوجوان مردوں اور عورتوں کی نظر میں تو میں ہیرو بن گیا تھا اور ایک رومان کیہالے میں گرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میری شان میں گیت گائے جاتے تھے اور عجیب بے سروپا کہانیاں مشہور تھیں۔ میرے مخالف تک میری تعریف کرتے تھے اور مربیانہ انداز میں فرماتے تھے کہ اس شخص میں قابلیت اور خلوص کی کمی نہیں ہے۔

ان سب باتوں سے متاثر نہ ہونا یا تو ولی کا نام یا شیطان کا اور میں دونوں میں سے ایک بھی نہ تھا۔ مجھ پر ان کا بڑا اثر ہوا۔ یعنی ایک فخر و مسرت کا نشہ سا چھا گیا اور میرے دل میں اعتماد نفس اور قوت کا احساس ابھر آیا۔ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر سے دیکھنا بہت مشکل کام ہے مگر میرا خیال ہے کہ مجھ میں کسی قدر خودداری اور تحکم پسندی پیدا ہو گئی۔ پھر بھی میں کچھ زیادہ مغرور نہیں تھا، مگر یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھ سے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور مجھے اپنی خامیوں کا پورا پورا احساس تھا۔ غالباً مشاہدہ نفس کی عادت کی وجہ سے میرے دماغ کا توازن قائم تھا اور میں بہت سے واقعات پر، جو میری ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ بے لاگ نظر سے غور کر سکتا تھا۔ قومی زندگی کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ہردلعزیزی اکثر برے آدمیوں کو بھی حاصل ہو جاتی ہے اور یہ نیکی یا قابلیت کی لازمی نشانی نہیں ہے اب سوال یہ تھا کہ مجھے یہ ہردلعزیزی اپنی خوبیوں کی وجہ سے حاصل ہے یا اپنی خامیوں کی وجہ سے؟ آخر اس کا راز کیا ہے؟

اس کا سبب ذہنی قابلیت تو ہو نہیں سکتی تھی اس لئے کہ نہ مجھ میں کوئی خاص علمی لیاقت تھی اور نہ علمی لیاقت سے ہردلعزیزی حاصل ہوا کرتی ہے۔ اب رہیں میری

نام نہاد قربانیاں، تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں سیکڑوں، ہزاروں آدمیوں نے مجھ سے کہیں زیادہ تکلیفیں اٹھائیں یہاں تک کہ اپنی جان و مال ملک پر قربان کر دیا۔ ہیرو یا سورما کی حیثیت سے میری شہرت محض فرضی ہے مجھ میں سورمائی کا جذبہ مطلق نہیں ہے بلکہ لوگ جو ناٹک کا سارستمانہ انداز اختیار کر لیا کرتے ہیں وہ مجھے ایک احمقانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ اور رومان تو مجھے چھو بھی نہیں گئی ہے۔ کس قدر جسمانی اور ذہنی جرات مجھ میں ضرور ہے مگر یہ غالباً میرے ذاتی، خاندانی اور قومی غرور اور خود رائی کی عادت پر مبنی ہے جس کی وجہ سے میں دوسروں کے دباؤ سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔

میں نے بہت سوچا مگر اس سوال کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ اب میں نے ایک پہلو سے غور کرنا شروع کیا۔ لوگوں کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی، کہ میرے اور میرے والد کے کپڑے دھلنے کے لئے ہر ہفتے پیرس بھیجے جاتے ہیں۔ ہم نے لاکھ تردید کی مگر اس روایت کی شہرت کم نہ ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے بڑھ کر لغو حرکت اور کیا ہو سکتی ہے اور اگر کوئی ریاست کی شان دکھانے کے لئے ایسی فضول خرچی کرے تو وہ اول درجے کی حماقت کے تمغے کا مستحق ہے۔

اس طرح ایک اور روایت مشہور تھی کہ میں اسکول میں شاہزادہ ویلس کے ساتھ ساتھ پڑھتا تھا اور راور جب وہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان آئے تو انھوں نے مجھ سے ملنا چاہا مگر میں جیل میں تھا۔ حالانکہ ان کا ہم جماعت ہونا تو درکنار مجھے آج تک ان سے ملاقات یا گفتگو کرنے کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا۔

میں نے کہا تا کہ میری شہرت یا ہر دلعزیزی اس قسم کی روایتوں پر منحصر ہے ممکن ہے کہ اس کی بنیاد زیادہ مضبوط ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ لوگوں نے اس بنیاد پر امارات اور ریاست کی ان کہانیوں کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔ کم سے کم یہ خیال ضرور ہے کہ اعلٰے طبقے کے لوگوں سے ملنے جلنے اور عیش و عشرت میں بسر کرنے کا عادی ہوتے

ہوئے میں نے ان سب چیزوں کو ترک کر دیا اور اس بات کی ہندوستانیوں کے دل میں بڑی قدر ہے۔ مگر مجھے یہ شہرت کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ میں فاعلی خوبیوں کا انفعالی خوبیوں پر ترجیح دیتا ہوں اور ترک لذات اور قربانی میرے نزدیک بجائے خود کوئی بڑی خوبی نہیں ہے۔ البتہ ایک ذہنی اور روحانی تربیت کی حیثیت سے یہ قابل قدر چیز ہے اور اسی قدر ضروری ہے جیسے ایک ورزشی کے لئے سادہ اور باقاعدہ زندگی بسر کرنا۔ ان لوگوں کے لئے جو بڑے بڑے کاموں میں دخل دیتے ہیں، تکلیف برداشت کرنے اور ہر طرح کی سختیوں کے باوجود مستقل مزاج رہنے کی قوت ناگریز ہے، مگر مجھے رہبانیت کا اصول یعنی زندگی کی نفی کرنا اور راور اس کی لذتوں اور مسرتوں کو ڈر کر چھوڑ دینا ہرگز پسند نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر کسی چیز کو جس کی میں واقعی قدر کرتا ہوں ترک نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کا قدر کا پیمانہ ہی بدل جائے۔

میری دوست نے جو سوال کیا تھا کہ تمہیں لوگوں کے اظہار عقیدت پر فخر ہے یا نہیں اس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا تھا اور اس سے بھاگنا چاہتا تھا مگر اس کی عادت سی پڑ گئی تھی اور جب یہ نہ ہو تو اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ غرض دونوں طرح مشکل تھی مگر مجموعی طور پر لوگوں کا یہ جوش میری ایک اندرونی ضرورت کو پورا کرتا تھا۔ یہ خیال کہ میں ان پر اثر ڈال سکتا ہوں اور ان میں عمل کا ولولہ پیدا کر سکتا ہوں، میرے دل میں ان کے دل و دماغ پر حکومت کا احساس پیدا کرتا تھا اور ایک حد تک میری قوت پسندی کو تسکین دیتا تھا۔ دوسری طرف ان لوگوں کو بھی مجھ پر ایک غیر محسوس حکومت حاصل تھی اس لئے کہ ان کے اعتماد اور محبت سے میرے دل کی گہرائیوں میں ایک ہیجان اور میرے جذبات میں ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ باوجود میری انفرادیت پسندی کے کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ انفرادیت کے بند ٹوٹ گئے ہیں اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ان غریبوں

کے ساتھ مصیبت کے بھنور میں ڈوب جانا اس سے بہتر ہے کہ میں اکیلا کنارے پر پہنچ جاؤں۔ مگر اصل میں یہ بند اس قدر مضبوط تھے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹتے تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

غرور کا قاعدہ ہے کہ مٹاپے کی طرح آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے اور انسان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ خوش قسمتی سے دنیا کی سختیاں اسے کم کر دیتی ہیں بلکہ کچل دیتی ہیں۔ گذشتہ (چند سال سے ہم لوگ ہندوستان میں ایسی بہت سی سختیاں اٹھاتے رہے ہیں۔ ''طوفان حوادث'' کے مکتب میں موجوں کے تھپیڑے ہمارے لئے ''سیلسی استاذ'' کا کام دیتے رہے ہیں۔

یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ میرے عزیزوں، دوستوں اور رفیقوں کی بہت بڑی تعداد ہے جن کی وجہ سے میری نظر کا توازن اور دماغ کا تناسب قائم رہا۔ عام جلسوں اور میونسپلٹی ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے ایڈرسوں سے میرے اعصاب پر بہت زور پڑتا تھا اور مجھے یہ چیزیں مہمل اور اصلیت سے خالی معلوم ہوتی تھیں۔ ان ایڈرسوں کی عبارت اتنی پر تکلف اور مبالغہ آمیز ہوتی تھی اور لوگوں کے چہروں پر اس قدر تقدس اور سنجیدگی برستی تھی کہ بعض اوقات میرا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ زور سے قہقہہ لگاؤں، یا زبان نکال دوں، یا سر کے بل کھڑا ہو جاؤں تاکہ اس باوقار مجلس کی گھبراہٹ اور ان کے چہروں کی کیفیت دیکھ کر لطف آئے مگر میری شہرت اور ہندوستان کی قومی زندگی کی متانت اور ثقاہت کے حق میں یہ اچھا ہوا کہ میں نے اس قسم کی کوئی پاگل پن کی حرکت نہیں کی اور عموماً ادب قاعدے کا لحاظ رکھا مگر کبھی کبھی کسی جلسے میں یا زیادہ تر جلوس میں نے عاجز آ کر اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا۔ کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ میرے اعزاز میں جلوس نکالا گیا اور میں اپنی بیوی یا کسی اور شخص کو بگھی یا موٹر میں بٹھا کر اور خود مجمعے میں گھس کر غائب ہو گیا۔

عام مجمعوں میں ہمیشہ جذبات کو روکنے اور آداب مجلس کا خیال رکھنے سے

طبیعت پر بہت زور پڑتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ انسان ایسے موقعوں پر کچھ کھری اور روٹھی ہوئی سے شکل بنالیتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ہندوؤں کے ایک رسالے میں مجھے ہندو بیوہ سے تشبیہ دی گئی تھی، اگرچہ میں پرانی وضع کی ہندو بیواؤں کو بہت قابل قدر سمجھتا ہوں، مگر سچ پوچھئے تو اس پھبتی سے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ مضمون لکھنے والے کو بہ ظاہر میری تعریف مقصود تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ میں حلم، صبر اور ایثار کی صفات موجود ہیں اور میں افسردگی اور اداسی کے ساتھ دن رات اپنے فرض کے انجام دینے میں مصروف رہتا ہوں۔ حالانکہ میں اپنے خیال میں خاصا تیز، جنگجو اور ہنسنے ہنسانے والا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہندو بیوائیں بھی ایسی ہی ہوجائیں۔ ایک بار گاندھی جی نے ایک شخص سے کہا تھا کہ اگر ان میں ظرافت کا مادہ نہ ہوتا تو وہ خودکشی کرلیتے۔ میں اس حد تک تو نہیں جاسکتا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر کچھ لوگوں کی بدولت زندگی میں ظرافت کی چاشنی نہ ہوتی تو مجھے زندگی اجیرن ہوجاتی۔

میرے خاندان والے اور بے تکلف دوست میری ہردلعزیزی کی اور ان شاندار ایڈریسوں کی ہنسی اڑاتے تھے جو میرے سامنے پیش ہوا کرتے تھے اور جن میں (ہندوستان کے دستور کے مطابق) نہایت رنگین بیانی اور مبالغے سے کام لیا جاتا تھا، میری بیوی اور بہنیں چھانٹ چھانٹ کر پر تکلف اور شاندار الفاظ اور خطاب جو قومی تحریک کے لیڈروں کے لئے وضع کئے گئے تھے بے ادبی سے ہر وقت میرے لئے استعمال کیا کرتی تھیں۔ کبھی مجھے ''بھارت بھوشن'' (گوہر تابان ہند) کہہ کر پکارتی تھیں، کبھی ''تیاگ مورتی'' (ایثار مجسم) کہتی تھیں۔ اس طرح کی چہل سے دل بہل جاتا تھا اور پروقار جلسوں میں متین اور سنجیدہ بن کر بیٹھنے سے جو بوجھ طبیعت پر پڑتا تھا وہ ہلکا ہوجاتا تھا۔ میری چھوٹی سی اندرا بھی ان شرارتوں میں شریک ہوجاتی تھی۔ صرف میری والدہ میرے ساتھ سنجیدگی کا برتاؤ کرتی تھیں اور انھیں

یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کے پیارے بیٹے پر فقرے کسے جائیں۔ والدان باتوں سے محفوظ ہوتے تھے۔ انھیں چپ چاپ دلجوئی اور ہمدردی کرنے کا ڈھب خوب آتا تھا۔

مگر بڑے بڑے مجمعوں کے نعرے۔ بے لطف اور پریشان کن جلسے، اور سیاسی زندگی کے ہنگامے میرے قلب کی سطح کو چھوتے ہوئے گذر جاتے تھے اگرچہ کبھی کبھی ان کی خلش دیر تک محسوس ہوتی تھی۔ اصلی کش مکش میرے نفس کے اندر تھی۔ یہ خیالات کی، خواہشات کی، متضاد عقیدوں کی، داخلی نیم شعوری عناصر اور خارجی واقعات کی کش مکش تھی۔ دل کی گہرائیوں میں جس چیز کی طلب تھی وہ کہیں نہیں ملتی تھی۔ میرا نفس ایک میدان جنگ بن گیا تھا جس میں مختلف قوتیں نبرد آزما تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ کس طرح اس کش مکش سے نجات ملے۔ توازن اور ہم آہنگی کی جستجو مجھے میدان عمل میں کھینچ لائی۔ عمل سے مجھے کسی قدر سکون حاصل ہوا۔خارجی جنگ وجدل سے داخلی کش مکش کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

آخر میں جیل میں بیٹھا یہ رام کہانی کیوں لکھ رہا ہوں؟ بات یہ ہے کہ قید ہو یا آزادی، جستجو اسی ایک چیز کی ہے۔ میں اپنے پرانے احساسات اور تجربات اس امید پر قلم بند کر رہا ہوں کہ شاید اسی سے کچھ اطمینان قلب میسر آجائے۔

سول نافرمانی کا آغاز

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا گے ااور اس سے ہمیں دفعتاً یہ اندازہ ہو اکہ ملک میں کس قدر جوش اور خلوص ہے۔ ہندوستانی کے ہر حصے میں بڑے بڑے مجمعوں کو نہایت پر امن اور پر اثر طریقے سے آزادی کا عہد کرتے ہوئے دیکھنا نہایت ہی شاندار نظارہ تھا، گاندھی جی کو جس محرک کی ضرورت تھی وہ حاصل ہو گیا وہ لوگوں کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ انھوں نے اندازہ کر لیا کہ اب کام شروع کرنے وقت آ گیا ہے۔ اب واقعات کا سلسلہ بڑی تیزی سے شروع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ٹانک کے پردے ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں اور رفتہ رفتہ آخری سین کی باری آ رہی ہے۔

جب سول نافرمانی کا وقت قریب آیا اور ساری فضا میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑنے لگی تو ہمیں ۲۲۔ ۱۹۲۱ء کے واقعات اور چورا چوری کے ہنگامے کے بعد تحریک کا ملتوی کیا جانا یاد آ گیا۔ اب ملک زیادہ منضبط ہو چکا تھا اور لوگ لڑائی کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ وہ طریق کار سے کسی حد تک واقف ہو گئے تھے اور گاندھی جی کہ نقطہ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات تھی کہ لوگوں کو اس کا پورا پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عدم تشدد پر بہت سختی سے عمل کرنا چاہتے ہیں، اب سے دس سال پہلے غالباً لوگوں کو اس میں کچھ شک تھا، مگر اب شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی، پھر بھی گاندھی جی کو کیونکہ یقین ہو سکتا تھا کہ ملک کسی حصے میں بھی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی گاندھی جی کو کیونکر یقین ہو سکتا تھا کہ ملک کے کسی حصے میں بھی لوگ خود بخود یا کسی کے اکسانے سے تشدد کے مرتکب نہیں ہوں گے اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا تو اس کا سول نافرمانی کی تحریک پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا پہلے کی طرح اب بھی تحریک یکا یک بند کر دی جائے گی؟ ان باتوں کو سوچ کر بڑی الجھن ہوتی تھی۔

غالباً گاندھی جی بھی اپنے طور پر اس پر غور کر رہے تھے مگر جہاں مجھے ان کی گفتگو

سے اندازہ ہوا ان کو جو مشکل درپیش تھی وہ کچھ اور تھی۔

ان کے نزدیک معاملات کی اصلاح کے لئے صرف ایک ہی صحیح طریقہ ہو سکتا تھا۔ اور وہ عدم تشدد کا طریقہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اس سے مناسب طور پر کام لیا جائے تو اس میں ہرگز ناکامیابی نہیں ہو سکتی، اگر کوئی یہ کہے، کہ اس طریقہ کے کامیاب ہونے کے لئے ایک مناسب فضا کی ضرورت ہے اور جب تک واقعات سازگار نہ ہوں اس سے کام نہیں لینا چاہئے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عدم تشدد کا طریقہ ہر موقع پر کام نہیں دے سکتا یعنی یہ کوئی عالم گیر اور حکمی طریقہ عمل نہیں ہے۔ اس نتیجے کا گاندھی جی کسی طرح نہیں مان سکتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اسے عالمگیر اور حکمی طریقہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے نزدیک نامناسب حالات میں بلکہ تشدد اور بدامنی کی فضا میں بھی یہ طریقہ کام دے سکتا تھا۔ مختلف حالات میں اس کی صورت تو بدلی جا سکتی ہے مگر اسے چھوڑنا ممکن نہیں کیونکہ یہ اس کی ناکامیابی کا اعتراف ہوگا۔

غالباً وہ کچھ اس قسم کی باتیں سوچ رہے تھے مگر میں ان کے خیالات کا اندازہ یقینی طور پر نہیں کر سکتا۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ ان کا خیال کچھ خفیف سا بدلا ہے اور سول نافرمانی کے شروع ہونے کے بعد اگر اتفاقی طور پر ایک آدھ تشدد کا واقعہ پیش آجائے تو وہ تحریک کا بند کرنا ضروری نہیں سمجھیں گے۔ البتہ اگر تشدد خود تحریک بن جائے تو پھر وہ باامن سول نافرمانی نہیں رہے گی اور اس کی جدوجہد کو روکنا یا بدلنا پڑے گا۔ اس بات سے ہم لوگوں کو بہت کچھ تسکین ہوئی۔ اب سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ تحریک شروع کیونکہ کی جائے؟ سول نافرمانی کی کونسی صورت اختیار کی جائے جو موثر بھی ہو، قرین مصلحت بھی ہو اور لوگوں میں مقبول بھی ہو سکے؟ مہاتما جی نے ایک ذرا سے اشارے سے اس مشکل کو حل کر دیا۔

نمک کا لفظ یکا یک ایک جادو کا منتر بن گیا۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ نمک

کے محصول کی ادائیگی بند کردی جائے اور نمک سازی کے قوانین کے خلاف ورزی کی جائے۔ ہم لوگ یہ سن کر چکر میں آگئے کہ کہاں قومی جنگ اور کہاں نمک۔ ایک اور عجیب بات یہ ہوئی کہ گاندھی جی نے اپنی گیارہ شرطوں کا اعلان کردیا۔ ہماری سمجھ میں نے آیا کہ جب ہم آزادی کا مطالبہ کررہے ہے تو چند سیاسی اور سماجی اصلاحوں کی (گو وہ اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں) فہرست بنانے کے کیا معنی؟ کیا گاندھی جی کے نزدیک اس کا وہی مفہوم تھا جو ہمارے ذہن میں تھا یا وہ اس کے کچھ اور معنی سمجھتے تھے؟ مگر اب بحث اور گفتگو کا موقع نہ تھا اس لئے کہ واقعات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھ ادھر ہندوستان میں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی تحریک زور پکڑ گئی تھی اور ادھر (اگرچہ ہمیں اس وقت اس کا احساس نہ تھا) ساری دنیا میں کساد بازاری نے ایک ہل چل مچا رکھی تھی۔ چیزوں کی قیمتیں گر رہی تھیں اور گو شہر والے اسے خوش حالی کی علامت سمجھ کر خوش ہو رہے تھے مگر کسان بہت ڈر رہے تھے۔

گاندھی جی نے وائسرائے سے خط و کتابت کرنے کے بعد سابرمتی کے آشرم سے ڈنڈی کی طرف ''نمک کا دھاوا'' شروع کردیا۔ لوگ یاتریوں کی اس فوج کے کوچ کے حالات کو روز بروز غور سے دیکھ رہے تھے۔شروع کردیا۔ لوگ یاتریوں کی اس فوج کے کوچ کے حالات کو روز بروز غور سے دیکھ رہے تھے۔ اور ملک کو جوش بڑھتا جاتا تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ احمد آباد میں کیا گیا کہ لڑائی کچھ قریب شروع ہوگئی تھی مکمل تیاریاں کی جائیں۔ ہمارا سپہ سالار موجود نہ تھا اس لئے کہ وہ اپنی چھوٹی فوج کو لئے ہوئے پا پیادہ سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس نے واپس آنے سے انکار کردیا۔آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اس کی تدبیریں سوچیں کہ جب ہم لوگ گرفتار ہو جائیں تو کیا کرنا چاہئے اور پریزیڈنٹ کو بہت وسیع اختیارات دئے گئے کہ اگر کمیٹی کا اجلاس نہ ہو سکے تو وہ اس کیطرف سے ورکنگ کمیٹی کے گرفتار شدہ ممبروں کی جگہ دوسرے ممبر نامزد کردے اور اگر خود گرفتار ہو جائے تو اپنا

جانشین نامزد کر کے اپنے اختیارات اس کے سپرد کرے۔ اسی قسم کے اختیارات ہر صوبہ دار اور مقامی کمیٹی نے بھی اپنے اپنے پریذیڈنٹ کو دے دئے۔

اس طرح وہ ''ڈکٹیٹروں'' کا سلسلہ شروع ہوا جو کانگرس کی طرف سے اس تحریک کو چلاتا رہا وزیر ہند، وائسرائے اور گورنر اس پر بہت کراہت کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو کانگرس کتنی بری اور ذلیل ہے کہ وہ ڈکٹیٹر کی حکومت کی قائل ہے! ظاہر ہے کہ یہ لوگ خود تو دل و جان سے جمہوریت کا کلمہ پڑھتے تھے! کبھی کبھی ہندوستان کے اعتدال ہو سکتی تھی۔ ادھر ہندوستان میں استبداد اور مطلق العنانی کی حکومت تھی۔ آرڈیننس کے حکمراں بڑی دینداری اور پرہیز گاری کے انداز سے جمہوریت کا وعظ کہہ رہے تھے، حالانکہ شورش کا زمانہ تو ایک طرف، معمولی حالات میں بھی ہندوستان میں جمہوریت کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ یہ سچ ہے کہ برطانوی حکومت کے لئے ہندوستان میں اپنی قوت اور اغراض کی حفاظت کرنا اور اپنے مخالفوں کو دبانا ایک قدرتی بات تھی مگر اس کا یہ دعویٰ کہ وہ جمہوری طریقے سے حکومت کر رہی ہے اس قابل ہے کہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہے اور آئندہ نسلیں اس کی داد دیں اور اس سے عبرت حاصل کریں۔

کانگرس کو ایسے موقع کا سامنا تھا جس میں اس کا معمولی طریقے سے کام کرنا ناممکن تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ ایک خلاف قانون جماعت قرار دے دی جائے گی اور اس کی کمیٹیاں کھلم کھلا اپنا جلسہ نہیں کر سکیں گی۔ خفیہ کاروائی کو ہم لوگ پسند نہیں کرتے تھے اس لئے کہ ہم اپنی تحریک کو علانیہ چلانا چاہتے تھے تاکہ ہمارا وقار اور اثر لوگوں کے دلوں میں قائم رہے اور پھر خفیہ کاروائی سے کام بھی نہیں چل سکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ ہماری مرکزی جماعت اور مقامی کمیٹیوں کے تمام لیڈر قید ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں تحریک کو کون چلاتا؟ ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں تھا کہ لڑنے والی فوج کی طرح ایسا انتظام کردیں کہ جب پرانے

سپہ سالار نہ رہیں تو ان کی جگہ نئے لوگ مقرر ہو جائیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم میدان جنگ میں بیٹھ کر کمیٹیاں کرتے رہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوا بھی مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ساری کمیٹی ایک ساتھ گرفتار کر لی گئی اور یہی ہمارا مقصد بھی تھا۔ ہمیں یہ آسانی نہیں تھی کہ ہمارا فوج کا جنرل اسٹاف محاذ جنگ کے پیچھے اطمینان سے بیٹھا ہو یا غیر فوجی مجلس وزرا اور بھی زیادہ محفوظ مقام پر اپنا اجلاس کر رہی ہو۔ ہماری لڑائی اس قسم کی تھی کہ ہمارے جنرل اسٹاف اور مجلس وزرا کو عین میدان جنگ میں سب سے آگے رہنا پڑتا تھا اور وہ سب شروع ہی میں گرفتار ہو جاتے تھے اور پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہم نے اپنے ''ڈکٹیٹروں'' کو اختیارات کیا دیئے تھے؟ ان کو یہ عزت ضرور حاصل تھی کہ وہ قوم کے عزم جنگ کے مظہر بن کر آگے بڑھیں۔ ان کا اختیار بس یہیں تک محدود تھا کہ خود اپنے حکم سے جیل خانے چلے جائیں۔ ان کا حکم اسی وقت تک چلتا تھا جب تک وہ کمیٹیاں جن کے وہ نمائندے تھے صریحی مجبوری کی وجہ سے اپنا اجلاس نہ کر سکیں۔ جہاں کہیں کمیٹی کا اجلاس ہو سکتا تھا ''ڈکٹیٹر'' مقرر کیا جائے کسی بنیادی معاملے یا مسئلے میں دخل نہیں دے سکتا تھا بلکہ اسکے کے اختیارات صرف تحریک کے جزوی پہلوؤں تک محدود تھے۔ اصل میں کانگرس کی ''ڈکٹیٹری'' جیل خانے کی ایک منزل تھی اور جو لوگ گرفتار ہوتے جاتے تھے ان کی جگہ نئے آدمی آتے جاتے تھے۔

غرض احمد آباد میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنی تیاریوں کی تکمیل کی اور ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا، کیونکہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم پھر کبھی ایک جگہ جمع ہو سکیں گے یا نہیں۔ اس کے بعد ہم سب اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے تاکہ مقامی انتظامات کی تکمیل کریں یا آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی نئی ہدایات کے مطابق بقول سروجنی نائیڈو کے جیل جانے کے لئے بستر باندھ رکھیں۔

احمد آباد سے واپسی میں، میں اور میرے والد گاندھی جی سے ملنے گئے۔ وہ

اپنے یاتریوں کی فوج کے ساتھ جمبوسر کے مقام پر تھے۔ ہم چند گھنٹے ان کے ساتھ رہے، اور ہمارے سامنے ہی وہ نمک کے سمندر کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ آخری منظر جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا، کہ وہ ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے اپنے پیرووں کے آگے آگے مضبوطی سے قدم رکھتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے چہرے سے امن اور سکون، مگر اسی کے ساتھ استقلال، اور بے خوفی ظاہر ہو رہی ہے۔ بڑا پر اثر منظر تھا۔

جمبوسر میں والد نے گاندھی جی کے مشورے سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے الہ آباد والے گھر کو قوم کی خدمت میں پیش کر دیں گے، اور اس کا نام سوراج بھون رکھیں گے، الہ آباد واپس آ کر انہوں نے اس کا اعلان کر دیا۔ اور مکان کو کانگرس کے حوالے کر دیا۔ اس وسیع عمارت کا ایک حصہ ہسپتال بنا دیا گیا۔ اس وقت وہ قانونی ضابطوں کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ ڈیڑھ سال کے بعد میں نے ان کی وصیت کے مطابق باقاعدہ وقف قائم کر دیا۔

اپریل کا مہینہ آ گیا۔ گاندھی جی سمندر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اور ہم ان کے حکم کے منتظر تھے، کہ نمک سازی کے قوانین کی خلاف ورزی کر کے سول نافرمانی کا آغاز کر دیں گے۔ کئی مہینہ سے ہم والنٹیروں کو قواعد کرا رہے تھے۔ کملا اور کرشنا (میری بیوی اور بہن) بھی والنٹیروں میں داخل ہو گئی تھیں، ظاہر ہے کہ ان والنٹیروں کے پاس ہتھیار کیا چھڑی تک نہ تھی۔ انھیں قواعد کرانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے کام میں مشاق ہو جائیں۔ اور بڑے بڑے مجمعوں کا انتظام کر سکیں۔ اپریل قومی ہفتہ کا پہلا دن تھا، جو 1919 کے واقعات (یعنی ستیا گرہ کے دن سے لے کر جلیانوالہ باغ کے دن تک) کی یادگار میں منایا جاتا ہے۔ اس روز گاندھی جی نے ڈانڈی کے ساحل پر نمک سازی کے قانون کی خلاف ورزی شروع کی، اور تین چار دن کے بعد کانگرس کی شاخوں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں سول نافرمانی شروع کر دیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے کھٹکا دبا کر ایک مشین چلا دی ہے۔ سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر اور ایک، ایک گاؤں میں نمک بنانے کا چرچا تھا۔ اور اس کے عجیب، عجیب طریقے اختیار کیے جاتے تھے، ہم بالکل نہیں جانتے تھے کہ نمک کیسے بنایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے کتابوں سے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اشتہار کے ذریعے سے لوگوں کو ہدایات دیں، اور کڑھاؤ وغیرہ جمع کیے۔ غرض کسی نہ کسی طرح ایک نقصان دہ کڑوی چیز تیار کر لی، جسے ہم بڑے فخر سے لیے پھرتے تھے، اور کبھی، کبھی بڑی قیمتوں پر نیلام کرتے تھے، اس سے کچھ مطلب نہ تھا کہ نمک اچھا ہے یا برا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ نمک کے تکلیف دہ قوانین کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہمارا نمک برا سہی، مگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ لوگوں کے جوش کو بڑھتے ہوئے، اور نمک سازی کو آگ کی طرح پھیلتے ہوئے دیکھ کر ہمیں اس بات پر شرمندگی ہوئی کہ جب گاندھی جی نے پہلی بار یہ تجویز پیش کی تھی، تو ہم نے اس پر اعتراض کیا تھا۔ ہمیں حیرت تھی کہ اس شخص کو عام لوگوں پر اثر ڈالنے اور منظم طریقے سے کام کرنے کا عجیب وغریب ڈھب آتا تھا۔

۱۴، اپریل کو میں رائے پور (صوبہ متوسط) میں جہاں میں کانفرنس میں شریک ہونے جا رہا تھا، ریل سے اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اسی روز جیل خانے کے اندر میرے مقدمے کی تحقیقات ہوئی، اور نمک سازی کے قانون کے مطابق مجھے چھ مہینے کی سزا دی گئی۔ مجھے پہلے ہی گرفتاری کی توقع تھی۔ اس لئے میں نے (ان نئے اختیارات کی رو سے جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے دیے تھے) اپنی غیر موجودگی میں گاندھی جی کو کانگرس کا پریذیڈنٹ نامزد کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ انکار کر دیں گے، اس لئے دوسرا نام اپنے والد کا تجویز کیا تھا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، گاندھی جی راضی نہیں ہوئے، اور والد کانگرس کے قائم مقام پریذیڈنٹ ہو گئے۔ ان کی صحت بہت خراب تھی، مگر اس کے باوجود انہوں نے تحریک کو بڑے زور شور سے

چلایا، اور پہلے چند مہینوں میں ان کی زبردست رہنمائی اور سختی سے انضباط قائم رکھنے کی وجہ سے تحریک کو بہت فائدہ پہنچا۔ مگر ان کی جو تھوڑی بہت صحت باقی تھی برباد ہو گئی۔

ان دنوں ہر طرف سے بڑی ہیجان انگیز خبریں آیا کرتی تھیں جلوس نکلتے تھے، لاٹھیاں اور گولیاں برسائی جاتی تھیں، مشہور لیڈروں کی گرفتاری کی وجہ سے اکثر ہڑتال ہوتی رہتی تھی اور خاص خاص واقعات کی یادگار میں پشاور کا دن، گڑھ والیوں کا دن وغیرہ منائے جاتے تھے۔ بدیسی کپڑے اور برطانیہ کے ہر قسم کے مال کا قریب قریب مکمل بائیکاٹ ہو گیا تھا۔ جب میں نے یہ سنا کہ میری بوڑھی ماں اور بہنیں گرمیوں کی دھوپ میں بدیسی کپڑے کی دوکانوں کے سامنے پکٹنگ کے لئے کھڑی رہتی ہیں تو مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اور کملا نے صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کیا۔ اس نے الہ آباد شہر اور ضلع کی تحریک میں اس مستعدی اور استقلال سے کام کیا کہ جو اپنے خیال میں اسے برسوں سے جانتا تھا، حیرت میں رہ گیا۔ وہ اپنی بیماری کو بھول گئی اور دن بھر دھوپ میں دوڑتی پھرتی تھی، اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ تنظیم کی غیر معمولی قابلیت رکھتی ہے۔ مجھے جیل خانے میں ان باتوں کی مجمل سی خبریں پہنچتی تھیں۔ آگے چل کر جب میرے والد بھی جیل میں میرے پاس آ گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ کملا کے کام کے خصوصاً اس کی تنظیمی قابلیت کے کس قدر مداح ہیں۔ وہ اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ والدہ اور لڑکیاں دھوپ میں دوڑتی پھریں۔ مگر ایک آدھ بار سمجھانے کے سوانھوں نے اس معاملے میں دخل نہیں دیا۔

سب سے بڑی خبر جو اس ابتدائی زمانے میں ہم تک پہنچی وہ ان واقعات کی تھی جو ۲۳ اپریل کو پشاور میں اور اسکے بعد سارے سرحدی صوبے میں پیش آئے۔ ہندوستان میں کہیں بھی لوگ مشین گن کی گولہ باری کا مقابلہ اس قدر انضباط امن اور

بہادری سے کرتے تب بھی سارے ملک میں جوش پھیل جاتا۔ سرحدی صوبے میں یہ چیز اور بھی اہمیت رکھتی تھی اس لئے کہ پٹھان بہادری میں تو بہت مشہور واقعہ پیش آیا کہ گڑھوالی سپاہیوں نے شہر والوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کچھ تو اس وجہ سے انکار کیا کہا نھیں مجمع سے ہمدردی تھی۔ مگر ہمدردی کا جذبہ بھی عموماً اس کے لئے کافی نہیں ہوتا کہ سپاہی اتنی بڑی رجات کرے کہ اپنے افسر کے حکم کی تعمیل سے انکار کیا کہ انھیں مجمع سے ہمدردی تھی۔ مگر ہمدردی کا جذبہ بھی عموماً اس کے لئے کافی نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کیا ہوگا۔ غالباً گڑھوالی (بعض اور رجمنٹوں کی طرح جن کی عدول حکمی مشہور نہیں ہونے پائی) اس دھوکے میں تھے کہ برطانوی حکومت ختم ہو رہی ہے۔ سپاہی کو اپنی خواہش اور ہمدردی کے مطابق کام کرنے کی جرات اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے دل میں اس قسم کا خیال بیٹھ جائے۔ غالباً ملک کی عام بے چینی اور سول نافرمانی کی وجہ سے چند روز یا چند ہفتے کے لئے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ برطانوی حکومت کے خاتمہ کے دن قریب آ گئے ہیں اور اس کا اثر ہندوستانی فوج کے کچھ حصہ پر پڑا۔ بہت جلد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مستقبل قریب میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے اس کے بعد فوج میں عدول احتیاط برتی جانے لگی۔

اس زمانے میں بہت سے عجیب واقعات پیش آئے مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ خدمت تھی جو عورتوں نے قومی تحریک میں انجام دی۔ وہ بہت بڑی تعداد میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل آئیں اور اگر چہ انھیں قومی کاموں سے پہلے کبھی سابقہ نہیں، پڑا تھا، انھوں نے اس لڑائی میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ بدیسی کپڑے اور شراب کی دکانوں کی پکٹنگ انھوں نے اپنے لئے مخصوص کر لی۔ بڑے بڑے جلوس جن میں صرف عورتیں ہی عورتیں ہوتی تھیں تما شہروں میں نکلتے تھے اور عام طور پر عورتیں مردوں سے زیادہ ثابت قدمی کا ثبوت دیتی تھیں۔ ان

میں سے اکثر صوبوں میں اور مقامی حلقوں میں ''ڈکٹیٹر'' بھی بنائی گئیں۔

تھوڑے دن میں نمک سازی کے قانون کیخلاف ورزی کے علاوہ سول نافرمانی کے دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جانے لگے۔ اس میں اس وجہ سے اور بھی آسانی ہوگئی کہ وائسرائے نے کئی آرڈیننس نافذ کیے جن کی رو سے مختلف قسم کے کاموں کی ممانعت کردی گئی۔ جوں جوں آرڈیننس میں ممانت ہو وہی کام کئے جائیں۔ کانگرس اور قوم کی جدوجہد روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور جب ایک آرڈیننس سے کام نہیں چلتا تھا تو وائسرائے کو دوسرا آرڈیننس جاری کرنا پڑتا تھا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے بہت سے ممبر گرفتار ہو چکے تھے مگر انکی جگہ نئے ممبر مقرر ہوگئے تھے اور حکومت کے ہر آرڈیننس کے جواب میں ورکنگ کمیٹی ایک نیا رزولیوشن پاس کرتی تھی جس میں لوگوں کو ہدایتیں دی جاتی تھیں کہ آرڈیننس کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہئے۔ان ہدایات پر سارے ملک میں حیرت انگیز ہم آہنگی کے ساتھ عمل ہورہا تھا۔البتہ اخباروں کی اشاعت کے متعلق اس کی ہدایات کی تعمیل نہیں کی گئی۔

جب پریس آرڈیننس کی رو سے اخباروں پر مزید سختیاں عائد کی گئیں اور ان سے ضمانت مانگی جانے لگی تو ورکنگ کمیٹی نے قومیت پسند اخباروں کو ہدایت کی کہ وہ ضمانت داخل نہ کریں بلکہ اخبار کی اشاعت موقوف کردیں۔ یہ اخباروں کے لئے بڑی ٹیڑھی کھیر تھی کیونکہ اس زمانے میں اخباروں کی مانگ خاص طور پر بڑھ گئی تھی۔ پھر بھی بہت سے اخباروں نے جن میں اعتدال پسند اخبار شامل نہ تھے اپنی اشاعت بند کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں مگر ان اخباروں سے زیادہ دن تک صبر نہیں ہوسکا اس لئے کہ ایک تو اشاعت کے بڑھنے کا لالچ تھا اور دوسرے ان سے یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ ان اعتدال پسند حریف ان کے کاروبار پر قبضہ کرلیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر نے اپنی اشاعت دوبارہ شروع کردی۔

۵ مئی کو گاندھی جی گرفتار ہو گئے۔ ان کی گرفتاری کے بعد مغربی ساحل پر نمک سازی کے مرکزوں پر بہت بڑے پیانے پر حملے شروع کر دئے گئے۔ ان حملوں میں پولیس کی وحشیانہ بے رحمی کے بہت افسوسناک واقعات رونما ہوئے۔ بمبئی ان دنوں تحریک کا مرکز تھا اور وہاں بڑی زبردست ہڑتالیں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے اور آئے دن لاٹھی چارج ہوا کرتے تھے۔ لاٹھی چارج کے مجروحوں کی خبر گیری کے لئے کئی ہنگامی ہسپتال قائم ہو گئے۔ بمبئی نے اس زمانے میں بہت نمایاں کام کئے اور بڑا شہر ہونے کی وجہ سے ان کاموں کو شہرت بھی خوب حاصل ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہات میں بھی اس قدر اہم واقعات رونما ہوئے مگر مشہور نہ ہو سکے۔

جون کے نصف آخر میں میرے والد بمبئی گئے اور والدہ اور کملا کو بھی ساتھ لے گئے۔ ان کا نہایت شاندار استقبال ہوا اور ان کے قیام کے زمانے میں پولیس نے بہت شدید لاٹھی چارج کئے۔ لاٹھی چارج بمبئی میں روزمرہ کی چیز ہو گئی تھی۔ کوئی دو ہفتے کے بعد وہاں ایک رات کو لوگوں کو بڑی سخت آزمائش کا سامنا ہوا۔ مالوی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر ایک بہت بڑے جلوس کو لے کر نکلے۔ پولیس نے ان کا راستہ روک دیا مگر وہ رات بھر اس کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

بمبئی سے واپس آنے کے بعد ۳۰ جون کو والد اور ان کے ساتھ سید محمود گرفتار کر لئے گئے اس لئے کہ ورکنگ کمیٹی خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی اور والد اس کے قائم مقام پریزیڈنٹ اور سید محمود اس کے سکرٹری تھے۔ دونوں کو چھ چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ میرے والد کی گرفتاری کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھوں نے ایک بیان شائع کیا تھا جسمیں یہ بتایا گیا تھا کہ جب فوج بالکل قانون کے مطابق تھا اور اس میں صرف اس بات کی تصریح کی گئی تھی کہ ہندوستان کا موجودہ برطانوی قانون اس معاملے کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس کے باوجود یہ بیان اشتعال انگیز اور خطرناک قرار دیا

گیا۔

بمبئی جانے کی وجہ سے میرے والد کی صحت پر بہت بار پڑا۔ وہ صبح تڑکے سے لے کر رات گئے تک ہر وقت مصروف رہتے تھے اور ہر اہم معاملے کے فیصلے کی ذمہ داری انھیں پر تھی۔ یوں تو ان کی طبیعت ایک عرصے سے ناساز تھی مگر بمبئی سے لوٹنے کے بعد بہت ہی مضمحل ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹروں کی سخت تاکید سے انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کامل آرام کریں گے۔ انھوں نے مسوری جانے کا انتظام کیا اور سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ مگر جس روز انکی روانگی تھی اس سے ایک دن پہلے وہ یکا یک نینی سنٹرل جیل میں ہماری بارک میں پہنچ گئے۔

نینی جیل میں

اب میں کوئی سات برس کے بعد قید ہوا تھا اور جیل کی زندگی کی یاد میرے دل سے کچھ مٹ گئی تھی۔ اس بار میں نینی سنٹرل جیل میں بھیجا گیا تھا جو اس صوبے کے بڑے جیل خانوں میں سے ہے، اور سب قیدیوں سے الگ رکھا گیا، جو میرے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ میرا احاطہ جیل کے بڑے احاطے سے، جس میں سب ملا کر بائیں تیس سو آدمی رہتے تھے، الگ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گول احاطہ تھا جس کا قطر تقریباً سو فٹ ہوگا اور دیوار کوئی پندرہ فٹ اونچی ہوگی۔ اس کے بیچ میں ایک بھدی بدنما عمارت تھی اور اسمیں چار کوٹھریاں تھیں، مجھے ان میں سے دو کوٹھریاں جن کے بیچ میں دروازہ تھا دی گئیں، ایک رہنے کے لئے اور دوسری غسل خانے اور پاخانے کے طور پر استعمال کرنے کے لئے۔ باقی دو کوٹھریاں کچھ عرصے تک خالی رہیں۔

اس مصروفیت اور ہل چل کی زندگی کے بعد جو میں نے پچھلے دنوں گذاری تھی میں تنہائی اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور دو تین دن تک نیند بھر سوتا رہا۔ گرمی شروع ہوگئی تھی اس لئے مجھے رات کو صحن میں جو مکان کے اور احاطے کی دیوار کے بیچ میں تھا سونے کی اجازت تھی۔ میرا پلنگ زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا کہ کہیں میں اس کو لیکر بھاگ نہ جاؤں یا شاید اس لئے کہ اس سے سیڑھی کا کام لیکر دیوار پر نہ چڑھ سکوں۔ رات کو عجیب عجیب آوازیں آیا کرتی تھیں۔ قیدی چوکیدار جو رات بھر بڑے احاطے کے گرد پہرا دیتے تھے اکثر ایک دوسرے کو طرح طرح کے سروں میں پکارتے تھے اور کبھی کبھی ایسی تان لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا دور سے آندھی چلنے کی آواز آرہی ہے۔ بارکوں کے پہرے والے زور زور سے قیدیوں کو گنتے رہتے تھے اور چیخ چیخ کر خیریت کی اطلاع دیتے تھے۔ رات میں کئی بار جیل کا کوئی افسر رونڈ پھرتا ہوا ہمارے احاطے کے پاس سے گذرتا تھا اور پہرے والے کو پکارتا تھا۔ چونکہ میرا احاطہ اور احاطوں سے کسی قدر فاصلے پر تھا اس لئے

اکثر آوازیں صاف طور پر سنائی نہیں دیتی تھیں اور ابتدا میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسا شور برپا ہے۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ کوئی جنگل قریب ہے اور کسان جنگلی جانوروں کو کھیتوں سے ہنکار رہے ہیں، اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود جنگل کی صدا درندوں کی آواز میں ملی جلی آرہی ہے۔

معلوم نہیں یہ صرف میرا وہم ہے یا واقعہ ہے کہ گول دیوار چوکور دیوار سے زیادہ قید کا احساس پیدا کرتی ہے۔ کونوں اور زاویوں کے نہ ہونے سے آدمی اور بھی دم گھٹتا ہے۔ دن کو یہ دیوار آسمان تک کو چھپا لیتی تھی۔ بس اس ایک ذرا سے ٹکڑے کی جھلک نظر آتی تھی اور میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

"اس چھوٹے سے نیلے خیمے کو
جسے قیدی آسمان کہتے ہیں،
اور بادل کے ہر تیرتے ہوئے ٹکڑے کو
جو روپہلے بادبان لگائے اڑا چلا جاتا ہے"

رات کو یہ دیوار مجھے اور زیادہ سختی سے گھیر لیتی تھی اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں کنوئیں میں پڑا ہوا ہوں۔تاروں بھرے آسمان کا وہ حصہ جو مجھے دکھائی دیتا تھا سچ مچ کا آسمان نہیں بلکہ اس کا ایک مصنوعی نقشہ معلوم ہوتا تھا۔

میری بارک سارے جیل میں "کتا گھر" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ نام میری وجہ سے نہیں ہوا بلکہ پہلے سے تھا۔ابتدا میں یہ ان خطرناک مجرموں کے لئے بنائی گئی تھی۔ جنھیں قید تنہائی کی سزا ملتی تھی مگر آگے چل کر اس میں سیاسی قیدی اور نظر بند رکھے جانے لگے تاکہ وہ جیل کے اور حصوں سے الگ رہیں۔ اس احاطے کے سامنے کچھ دور پر ایک عجیب قسم کی چیز تھی۔ جب میں نے پہلی بار اپنی بارک سے اس کی جھلک دیکھی تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑا سا پنجرا ہے جس میں آدمی کولھو کے بیل کی طرح پھر رہے ہیں۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ

پانی کا پمپ ہے جو انسانوں کی قوت سے چلایا جاتا ہے اور اس میں ایک وقت میں سولہ آدمی لگتے ہیں۔ انسانوں کو ہر چیز کی عادت ہو جاتی ہے۔ میں کچھ دن میں اس منظر کا عادی ہو گیا مگر میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ یہ انسانی قوت کے استعمال کا نہایت احمقانہ اور وحشیانہ طریقہ ہے۔ جب کبھی میں ادھر سے گذرتا ہوں مجھے چڑیا خانے کا دھیان آتا ہے۔

چند روز تک مجھے ورزش وغیرہ کے لئے بھی اپنے احاطے سے باہر نکلنے کی ممانعت رہی مگر بعد میں اجازت ہو گئی کہ صبح تڑکے جھٹپٹے وقت آدھ گھنٹے کے لئے باہر جا سکتا ہوں اور بڑی دیوار کے نیچے نیچے ٹہل یا دوڑ سکتے ہو۔ اتنے سویرے کا وقت اس لئے مقرر کیا گیا کہ اور قیدی مجھ سے نہ مل سکیں بلکہ مجھے دیکھ بھی نہ سکیں۔ مجھے یہ سر بہت پسند تھی اور اس سے بڑی تفریح ہوتی تھی۔ میں اس تھوڑے سے وقت کے اندر کھلی ہوا میں زیادہ سے زیادہ ورزش کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے دوڑنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ روزانہ دو میل سے اوپر دوڑنے لگا۔

میں صبح بہت تڑکے کوئی ساڑھے تین بجے اٹھتا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں سویرے سو جاتا تھا اس لئے کو جو روشنی مجھے ملتی تھی وہ پڑھنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ میں بڑے شوق سے تاروں کو دیکھا کرتا تھا اور ان کی جانی بوجھی صورتوں سے مجھے وقت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ جہاں میں لیٹا تھا وہاں سے قطب تارا دیوار سے ملا ہوا نظر آتا تھا اور اسکے ہر وقت سامنے رہنےسے مجھے بڑی تسکینہوتی تھی۔ گھومتے ہوئے آسمان کے بیچ میں یہ ثبات واستقلال کا نمونہ کھڑا مسکراتا رہتا تھا۔

ایک مہینے تک میرا کوئی ساتھی نہیں تھا مگر میں بالکل اکیلا بھی نہ تھا اس لئے کہ میرے احاطے میں ایک وارڈر، ایک قیدی باورچی اور چند قیدی نگراں رہتے تھے۔ کبھی کبھی دوسرے قیدی بھی کسی کام سے آ جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ قیدی تھے جو لمبی سزائیں بھگت رہے تھے اور دوسروں کے نگراں بنا دئے گئے تھے۔ بہت

سے عمر قیدی بھی تھے۔ عام طور پر عمر قید کے میعاد بیس سال سمجھی جاتی ہے مگر وہاں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ان میں مجھے ایک عجیب مثال نظر آئی۔ قیدیوں کے کرتوں میں کندھے پر ایک تختی لگی رہتی ہے جس میں سزا کی کیفیت اور رہائی کی تاریخ درج ہوتی ہے، ایک قیدی کی تختی میں میں نے رہائی کی تاریخ ۱۹۹۶ء لکھی ہوئی دیکھی! ۱۹۳۰ء میں اس میں سے کئی سال ختم ہو چکے تھے اور وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ غالباً اسے کئی سزائیں ملی تھیں اور ان سب کی معیاد جوڑ دی گئی تھی۔ میرے خیال میں ان کا مجموعہ پچھتر برس تھا۔

ان عمر قیدیوں کو برسوں تک عورت یا بچوں کی صورت بلکہ جانور کی شکل تک دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ باہر کی دنیا سے الگ اور نوع انسانی سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت دل میں کڑھا کرتے ہیں اور خوف، انتقام اور نفرت کے خیالات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ انھیں یاد نہیں رہتا کہ دنیا میں نیکی، سلوک اور خوشی بھی ہوتی ہے اور ان کی طبیعت میں بدی سما جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ نفرت کا جوش بھی کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ زندگی ایک بے روح مشین بن جاتی ہے۔ وہ بے جان پتلوں کی طرح حرکت کرتے ہیں بس ایک ہی چیز کا احساس رہ جاتا ہے۔ یعنی خوف کا۔ وقتاً فوقتاً قیدیوں کا جسم تولا جاتا ہے مگر ان کے نفس اور ان کی روح کو کیونکہ تول سکتے ہیں جو اس جبر و تشدد کی فضا میں سوکھتی اور مرجھاتی چلی جاتی ہے؟ لوگ موت کی سزا کی مخالفت میں بحث کرتے ہیں اور ان کی دلیلیں میرے دل کو لگتی ہیں۔ مگر جب میں قیدیوں کی عمر بھر کی مصیبت کو دیکھتا ہوں تو یہ خیال ہوتا کہ اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنے سے تو موت کی سزا ہی اچھی ہے۔ ایک بار ایک عمر قیدی نے مجھ سے پوچھا ”ہمارے جیسے قیدیوں کا کیا ہوتا ہے کیا سوراج ہمیں اس جہنم سے چھڑا دے گا؟“

آخر یہ عمر قیدی ہیں کون؟ ان میں سے بہت سے ڈکیتی کے الزام میں جیل

بھیجے جاتے ہیں اکثر پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کے گروہ اکٹھے سزا پاتے ہیں۔ ان میں سے بعض مجرم ہوں گے مگر عجب نہیں کہ بہت سے بے گناہ بھی ہوں۔ ایسے مقدموں میں لوگوں کو پھانسی دینا آسان ہے۔ ایک سرکاری گواہ کی شہادت اور دو ایک آدمیوں کی سرسری شناخت بہت کافی ہے۔ آج کل ڈکیتوں کا زور ہے اور قیدیوں کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے۔ آخر جب لوگ بھوکوں مریں تو پھر اور کیا کریں؟ جج اور مجسٹریٹ جرائم کے بڑھنے کا راگ تو گاتے رہتے ہیں مگر اس کے کھلے ہوئے معاشی اسباب انھیں نہیں سوجھتے۔

پھر وہ کاشتکار ہیں جن میں زمین کے بارے میں معمولی سے جھگڑے پر لاٹھی چلی جاتی ہے اور ایک آدھ آدمی مارا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ عمر بھر کو یا ایک لمبی میعاد کے لئے جیل بھیج دئے جاتے ہیں۔ اکثر ایک خاندان کے سارے مرد اس طرح سے قید ہو جاتے ہیں اور عورتیں رہ جاتی ہیں جو کسی نہ کسی طرح گھر بار کو چلاتی ہیں۔ ان میں سے ایک شخص بھی مجرموں کی سی طبیعت کا نہیں اکثر گبھرو جوان ہیں جو جسم اور دماغ کے لحاظ سے گاؤں والوں کی عام سطح سے بہت اونچے ہیں۔ اگر ان کی تھوڑی سی تربیت ہو اور ان کی توجہ دوسرے کاموں کی طرف پھیر دی جائے تو اپنے ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے جیل خانوں میں بعض عادی مجرم بھی پائے جاتے ہیں جو غیر معاشرت پسند اور سماج کے لئے خطرناک ہوتے ہیں مگر میں نے تعجب اور خوشی کے ساتھ دیکھا کہ بہت بڑی تعداد میں اچھی قسم کے لڑکے اور بڑی عمر کے لوگ ہیں جن پر میں بے تکلف بھروسہ کر سکتا ہوں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ مجرمانہ طبیعت اور غیر مجرمانہ طبیعت کے لوگوں میں تعداد کا تناسب کیا ہے۔ شاید جیل کے محکمے والوں نے تو کبھی اس طرف پر غور ہی نہیں کیا ہوگا۔ نیویارک کے سنگ سنگ جیل کے وارڈن لیوئس۔ ا۔ لائس نے اس کے متعلق دلچسپ اعداد شمار شائع کئے ہیں وہ

اپنے قیدیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ جہاں تک انھیں معلوم ہوا۔ ۵۰ فیصدی مجرمانہ رجحان طبع سے بالکل پاک ہیں ۲۵ فیصدی گردوپیش کے حالات کی بدولت مجرم بن گئے ہیں اور بقیہ ۲۵ میں سے شائد آدھے یعنی ساڑھے ۱۲ فیصدی پکے غیر معاشرت پسند ہوں گے۔ سب جانتے ہیں کہ اصلی مجرم بڑے شہروں اور جدید تمدن کے مرکزوں میں غیر ترقی یافتہ ملکوں سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ امریکا کے ڈاکو مشہور ہیں اور سنگ سنگ کے جیل میں خاص طور پر بدترین مجرم بھیجے جاتے ہیں۔ اس پر بھی خود اس کے وارڈن کے قول کے مطابق ساڑھے ۱۲ فیصدی قیدی ایسے ہیں جو واقعی بری طبیعت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان کے جیلوں میں ایسے قیدیوں کا تناسب اور بھی کم ہوگا۔ اگر ہمارا معاشی نظام معقول ہو تعلیم پھیل جائے اور روزگار بڑھ جائے تو تھوڑے دن میں ہمارے جیل خانے بالکل خالی ہو جائیں گی۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہماری معاشرت کا سارا نظام ایک سرے سے بدل جائے۔ دوسری صورت وہی ہے جو برطانوی حکومت نے اختیار کی ہے کہ پولیس کے تعداد اور جیل خانوں کی عمارت بڑھاتی جاتی ہے۔ ہندوستان کے جیلوں میں قیدیوں کی تعداد دن کر دل ہلتا ہے۔ قیدیوں کی امداد کے لئے جو انجمن قائم ہوئی ہے اس کے سکرٹری نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں صرف بمبئی پریزیڈنسی میں ایک لاکھ اٹھائیس ہزار اور بنگال میں ایک لاکھ چوبیس (۱) ہزار آدمی بھیجے گئے۔ مجھے سب صوبوں کے قیدیوں کی تعداد نہیں معلوم ہو سکی لیکن جب دو صوبوں میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ قیدی ہیں تو سارے ہندوستان میں کوئی دس لاکھ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد مستقل طور پر جیل میں رہنے والوں کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے بہت کم سہی مگر پھر بھی بہت ہوگی۔ ہندوستان کے بعض بڑے صوبوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے جیل کے محکمے اس قدر وسیع ہیں کہ دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوں گے۔ صوبہ متحدہ کو

بھی یہ عزت، جس کا عزت ہونا مشتبہ ہے، حاصل ہے اور غالباً اس کا جیل کا محکمہ سب سے پیچھے اور سب سے زیادہ رجعت پسند بھی ہے۔ یہاں قیدی انسان نہیں سمجھا جاتا اور اس کی طبیعت کو پہچاننے یا اس کی اصلاح کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی جاتی۔ البتہ ایک چیز میں یہ صوبہ سب سے آگے ہے کہ اپنے قیدیوں کی نگرانی بڑی سختی سے کرتا ہے۔ فرار کی کوشش بہت ہی کم ہوتی ہے اور مشکل سے دس ہزار میں ایک قیدی جیل سے بھاگتا ہوگا۔

جیل خانوں میں ایک افسوس ناک بات یہ نظر آتی ہے کہ قیدیوں میں پندرہ برس یا اس سے زیادہ عمر کے لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہونہار معلوم ہوتے ہیں اور اگر انھیں موقع دیا جائے تو کام کے آدمی بن سکتے ہیں۔ کچھ دن سے انھیں لکھنے پڑھنے کی ابتدائی تعلیم دینے کی کوشش شروع ہوئی ہے۔ مگر اس کا انتظام بھی بہت ناقص ہے کھیل تفریح کا موقع انھیں بہت ہی کم ملتا ہے۔ اخبار پڑھنے نہیں پاتے اور کتابوں کی اجازت بھی مشکل سے دی جاتی ہے۔ بارہ گھنٹے بلکہ اس سے بھی زیادہ قیدی اپنی بارکوں یا کوٹھریوں میں بند رہتے ہیں اور شام سے صبح تک ان کے لئے کوئی شغل نہیں ہوتا۔

عزیزوں وغیرہ سے ملنے کی اور انہیں خط لکھنے کی اجازت تین مہینے میں ایک بار ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وقفہ حد سے زیادہ بڑھے ہوں، جیسے کہ ان میں سے اکثر ہوتے ہیں تو انہیں جیل کے عہدیداروں سے خط لکھوانا پڑتا ہے اور یہ لوگ اسے بیگار سمجھ کر ٹالتے رہتے ہیں۔ یا اگر خط لکھوا بھی لیا تو پتہ ٹھیک نہیں ہوتا اور وہ پہنچتا نہیں۔ ملاقات کا معاملہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ عام طور پر جب تک جیل کے کسی عہدے دار کی مٹھی نہ گرمائی جائے، کام نہیں چلتا۔ اکثر قیدی ایک جیل سے دوسرے جیل بھیج دئے جاتے ہیں اور ان کے عزیز ان کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ میں نے ایسے قیدیوں کو دیکھا ہے جنہیں برسوں سے گھر کی خیر خبر نہیں معلوم ہوئی۔

اور جب یہ ملاقاتیں تین مہینے یا اس سے زیادہ عرصے کے بعد ہوتی بھی ہیں تو عجیب طریقے سے ہوتی ہے۔ بہت سے قیدی اور ان کے ملاقاتی آمنے سامنے کھڑے کردئے جاتے ہیں اور بیچ میں کٹہرہ ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ ایک ساتھ بولتے ہیں اور ہر شخص کو چیخ چیخ کر باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ غرض اس ملاقات سے انسانی محبت کا جو تھوڑا بہت اثر پڑنا چاہئے تھا وہ غائب ہو جاتا ہے۔

چند ایک قیدیوں کے ساتھ خاص رعایت ہوتی ہے یعنی کھانا کچھ اچھا دیا جاتا ہے اور کم وقفے کے بعد ملاقات کرنے اور خط لکھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ ان کی تعداد (فرنگیوں کو چھوڑ کر) ہزار میں ایک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سول نافرمانی کی بڑی تحریکوں کے زمانے میں، جب جیل میں سینکڑوں سیاسی قیدی بھرے ہوتے ہیں ان رعایت پانے والے قیدیوں کی تعداد کچھ خفیف سی بڑھ جاتی ہے۔ مگر مجموعہ پھر بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ ان سیاسی قیدیوں (مردوں اور عورتوں) میں سے ۲۵ فیصدی کے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا ہے اور انہیں یہ سہولتیں بھی نہیں دی جاتیں۔

بعض اشخاص جنہیں انقلابی جدوجہد کے جرم میں عمر قید، یا لمبی میعاد کی سزائیں دی جایت ہیں مدتوں قید تنہائی میں پڑے رہتے ہیں۔میرے خیال میں صوبہ متحدہ میں تو بندھا ہوا قاعدہ ہے کہ ایسے مجرم کال کوٹھری میں رکھے جائیں۔ عام مجرموں کو قید تنہائی جیل کے اندر کوئی جرم کرنے کے بعد لے مزید سزا کے طور پر ہوتی ہے۔ مگر یہ سیاسی مجرم جو عموماً کم سن لڑکے ہوتے ہیں جیل میں انتہائی قابل تعریف رویہ رکھیں، تب بھی کال کوٹھری میں رکھے جاتے ہیں۔ جیل میں انتہائی قابل تعریف رویہ رکھیں، تب بھی کال کوٹھری میں رکھے جاتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جیل کا محکمہ بغیر کسی وجہ کے عدالت کی دی ہوئی سزا میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے۔یہ بات بڑی عجیب اور بالکل خلاف قانون معلوم ہوتی ہے۔ قید

تنہائی میں خواہ تھوڑے ہی دن کی کیوں نہ ہو، سخت اذیت ہوتی ہے اور جب یہ سزا برسوں تک کھنچ جائے تو نہایت ہی ہولناک چیز بن جاتی ہے یہاں تک کہ جنون کی نوبت آجاتی ہے اور چہرے سے کچھ عجیب وحشت برسنے لگتی ہے جیسے کوئی سہما ہوا جانور ہو۔ یہ جان کو ریت ریت کر مارنا، روح کو کند چھری سے حلال کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر آدمی اس سے بچ بھی نکلا تو ایک غیر طبعی مخلوق بن کر رہ جاتا ہے اور دنیا میں کہیں نہیں کھپ سکتا۔ یہ سوال ہمیشہ پیدا ہوتا ہے کہ دراصل اس کا کوئی قصور بھی نہ تھا؟ پولیس کے طور طریقے یوں بھی ہندوستان میں مدت سے مشتبہ ہیں اور پھر سیاسی معاملات میں تو اور بھی زیادہ۔

فرنگی یا کرانی قیدیوں کے لئے بندھا ہوا دستور ہے کہ وہ اونچے درجے میں شمار ہوتے ہیں۔ انہیں اچھا کھانا ملتا ہے، ہلکا کام کرنا پڑتا ہے اور ملاقات اور خط و کتابت میں سہولتیں دی جاتی ہیں۔ ہفتے میں ایک بار پادری آتا ہے اور اسکے ذریعے سے ان کا تعلق باہر کی دنیا سے قائم رہتا ہے۔ وہ ان کے لئے غیر ملکوں کے باتصویر اور ظریفانہ اخبار لاتا ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے ان کے عزیزوں سے ملاقات یا خط و کتابت بھی کرتا ہے۔

اس کی کوئی شکایت نہیں کہ فرنگی قیدیوں کو یہ سہولتیں حاصل ہیں اس لئے کہ اصل میں یہ کچھ زیادہ رعائتیں نہیں ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ دوسرے قیدیوں، مردوں اور عورتوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ انسانیت کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ یہ لوگ سرے سے انسان ہی نہیں سمجھے جاتے اس لئے ان کے ساتھ ویسا برتاؤ بھی نہیں ہوتا۔ جیل خانے میں حکومت کے انتظامی تشدد کا بدترین نمونہ نظر آتا ہے۔ یہ ایک مشین ہے جو بے دردی اور بے خیالی سے چلتی رہتی ہے اور جو اس کے داب میں آجائے اس کچل کر رکھ دیتی ہے۔ جیل کے قواعد خاص کر کے ایسے بنائے گئے ہیں جس سے اس کا مشین ہونا ظاہر ہو۔ زود حس مردوں اور عورتوں

کے لئے یہ بے روح ضابطہ سوہان روح ہو جاتا ہے۔ میں دیکھا ہے کہ لمبی میعاد کے قیدی بعض اوقات اس بے رنگ زندگی سے اس قدر عاجز آجاتے ہیں کہ ان کا جی چھوٹ جاتا ہے اور وہ بچوں کی طرح رونے لگتے ہیں۔ ایک ذراسی ہمدردی اور دلدہی سے جو اس فضا میں اس قدر کمیاب ہے، ان کا چہرہ خوشی اور احسان مندی سے چمک اٹھتا ہے۔

مگر خود ان قیدیوں میں اکثر دیا اور بھائی چارے کی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئیں جن سے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ایک بار ایک اندھا عادی قیدی تیرہ برس کے بعد رہا کیا گیا۔ اتنی مدت کے بعد وہ بالکل خالی ہاتھ اس دنیا میں جارہا تھا۔ جس میں اس کا کوئی نہ تھا۔ اس کے ساتھی قیدی اس کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر ان بیچاروں کے پاس کیا تھا۔ ایک نے اپنا کرتہ جو جیل کے دفتر میں امانت تھا اسے دے دیا۔ دوسرے نے کچھ اور کپڑا دیا۔ تیسرے کو اسی دن صبح نئی چپل ملی تھی جو اس نے مجھے بڑے فخر کیساتھ دکھائی تھی جیل میں یہ بڑی دولت تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کا اندھا ساتھی ننگے پاؤں جارہا ہے تو اس نے بڑی خوشی سے اپنی نئی چپل اسے دے دی۔ مجھے اس وقت یہ خیال آیا کہ جیل کے اندر جتنی دیا ہے اتنی باہر نہیں۔

اس سال یعنی ۱۹۳۰ء میں ملک کی آنکھوں نے بہت سے ٹانک کے سے منظر اور جوش دلانے والے واقعات دیکھے۔ مجھے سب سے بڑھ کر حیرت یہ تھی کہ گاندھی جی قوم کو ابھارنے اور جوش میں لانے کی کتنی بڑی قوت رکھتے ہیں۔ اس میں کچھ مسمریزم کی سی شان نظر آتی تھی اور ہم لوگوں کو گوکھلے کے وہ الفاظ یاد آگئے جو انہوں نے گاندھی جی کے بارے میں کہے تھے کہ ان میں وہ طاقت ہے جو مٹی کے پتلوں کو سورما بنادیتی ہے۔ یہ ثابت ہوگیا کہ باامن سول نافرمانی بڑے بڑے قومی مقصد حاصل کرنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے اور سارے ملک میں خاموشی کے ساتھ یہ خیال پھیل گیا جس میں دوست دشمن سب شریک تھے، کہ ہندوستان کی فتح

ہونے والی ہے۔ جو لوگ تحریک میں عملی حصہ لے رہے تھے ان کے دل میں ایک عجیب ولولہ تھا جس کا کچھ اثر جیل کے اندر بھی پہنچ گیا۔ معمولی قیدی تک یہ کہتے تھے کہ "سوراج آرہا ہے!" وہ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس خودغرضی کی امید میں کہ شاید انہیں بھی اس سے کچھ فائدہ پہنچے۔ پہرے والے بھی بازاری خبریں سن کر، یہ سمجھتے تھے کہ سوراج قریب ہے۔ جیل کے چھوٹے چھوٹے عہدیدار کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔

ہمیں جیل میں روزانہ اخبار پڑھنے کو نہیں ملتا تھے۔ صرف ایک ہندی کے ہفتہ وار اخبار سے تھوڑی بہت خبریں بھی ہمارے تخیل کو ایڑ لگانے کے لئے کافی تھیں۔ روزانہ لاٹھی چارج، کبھی کبھی گولی چلن۔ شولا پور کا مارشل لاء، قومی جھنڈا اٹھانے والوں کو دس دس سال کی سزا۔ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ہماری قوم خصوصاً عورتیں جو کچھ کر رہی تھیں اسے سن کر ہم ان پر فخر کرتے تھے۔ مجھے خاص طور پر خوشی تھی کہ میری والدہ، بیوی، سگی بہنیں اور ان کی سہیلیاں بڑا کام کر رہی ہیں۔ اگرچہ میں ان سے جدا تھا اور قید میں تھا، لیکن ایک اعلیٰ مقصد کی خدمت نے ہمارے دلوں میں رفاقت کا ایک نیا رشتہ قائم کرکے دوری کے پردے اٹھا دئے تھے اور ہم ایک دوسرے سے بہت قریب ہوگئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ خاندان قوم میں گھل مل گیا ہے مگر آپس کی محبت کو وہی مزا ہے جو پہلا تھا۔ مجھے کملا پر تعجب آتا تھا۔ اس کو جوش عمل بیماری پر غالب آگیا اور کم سے کم کچھ دن تک سخت محنت اور مصروفیت کے باوجود وہ بالکل اچھی رہی۔

مجھے یہ فکر ستارہی تھی کہ میں ایک حد تک آرام سے بیٹھا ہوں اور جو لوگ باہر ہیں وہ اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں اور تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ میرا دل بے چین تھا کہ کس طرح میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔ مگر یہ تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے جیل میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا شروع کیا کہ کچھ تو سختی کا مزا آئے۔

کوئی تین گھنٹے روز چرخا کاتتا تھا اور تین گھنٹے نواڑ بننے کا کام کرتا تھا۔ یہ شغل مجھے پسند تھا ان میں کچھ زیادہ محنت اور توجہ کی ضرورت نہیں تھی اور ان کی وجہ سے جی بہل جاتا تھا اور دل کی بے چینی کچھ کم ہو جاتی تھی۔ کتب بینی بھی بہت کرتا تھا اور اس کے علاوہ جھاڑے پوچھنے، اپنے کپڑے دھونے اور اس قسم کے اور کاموں میں مصروف رہا کرتا تھا۔ یہ ساری مشقت میں اپنی خوشی سے کرتا تھا ورنہ میری قید اصل میں "قید محض" تھی۔

غرض باہر کے واقعات کے خیال میں، اور جیل کے کاموں کے شغل میں، میری زندگی نینی میں کٹتی رہی۔ ہندوستان کے جیل کے طریقوں کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس میں اور ہمارے ملک کی برطانوی حکومت میں بہت مشابہت ہے۔ حکومت کا نظام بہت پکا اور گٹھا ہوا ہے جس کی وجہ سے ملک اس کی مٹھی میں ہے مگر ملک کے باشندوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ جیل کا انتظام بھی دیکھنے میں بہت باقاعدہ معلوم ہوتا ہے اور ایک حد تک ہے بھی، مگر کسی کو اس کا احساس نہیں کہ جیل کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو بے چارے اس میں آتے ہیں ان کی مدد اور اصلاح کرے۔ وہاں تو بس ایک ہی خیال ہے کہ انہیں کوٹ پیٹ کر سارا کس بل نکال دو تاکہ جب وہ باہر جائیں تو ان میں ذرا بھی جان نہ باقی رہے۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ جیل کا انتظام اور قیدیوں کی روک تھام اور تنبیہہ کس طرح ہوتی ہے؟

زیادہ تر خود انہیں قیدیوں کی مدد سے جن میں قیدی پہریدار اور قیدی جمعدار بنائے جاتے ہیں اور سزا کے خوف سے یا انعام اور تخفیف میعاد کے لالچ میں جیل کے عہدیداروں سے اتحاد عمل پر آمادہ کئے جاتے ہیں انکے مقابلے میں تنخواہ پانے والے پہرے دار بہت کم ہیں۔ جیل کے اندر نگرانی کا کام زیادہ تر یہی قیدی پہریدار اور قیدی جمعدار کرتے ہیں۔ ان کو ایک جگہ جمع ہونے یا مل کر کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے جب تک وہ الگ نہ رکھے جائیں ان

پر قابو نہیں رہ سکتا۔

جیل کے باہر ملک کی حکومت میں یہی طریقے ایک بڑے پیمانے پر نظر آتا ہے۔ اگرچہ اتنا کھلا ہوا نہیں ہے۔ وہاں قیدی پہریداروں اور قیدی جمعداروں کے نام دوسرے ہیں۔ ان کے القاب اور خطاب زیادہ شاندار، اور وردیاں زیادہ بھڑکدار ہوتی ہیں اور ان کے پیچھے (اسی طرح جیسے جیل میں) مسلح گارڈ سنگینیں لئے کھڑا رہتا ہے کہ وہ حکم سے سرتابی نہ کرنے پائیں۔

اس زمانے کی سلطنت میں جیل خانے کس قدر اہم چیزیں ہیں! کم سے کم قیدی یہی سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں حکومت کے اور سب شعبے، جیل، پولیس اور فوج کے سامنے بالکل حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ جیل ہی میں مارکس کا یہ نظریہ سمجھ میں آتا ہے کہ سلطنت یا ریاست وہ جبر و تشدد کا آلہ ہے جس کے ذریعے سب لوگ حکومت کرنے والے طبقے کی مرضی کے آگے سر جھکانے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔

ایک مہینے تک میں اپنی بارک میں اکیلا رہا۔ اس کے بعد ایک ساتھ نربدا پرشاد سنگھ آ گئے اور ان کے آنے سے بڑی تسکین ہوئی۔ ڈھائی مہینے بعد جون ۱۹۳۰ء کی آخری تاریک کو ہمارے چھوٹے سے احاطے میں غیر معمولی ہلچل مچ گئی۔ صبح تڑکے کیا دیکھتے ہیں کہ میرے والد اور ڈاکٹر سید محمود چلے آ رہے ہیں۔ یہ دونوں کو آنند بھون میں سو رہے تھے کہ ایک دم سے گرفتار کر کے یہاں بھیج دئے گئے۔

---

(۱) اخبار اسٹیٹسمین ۱۱ دسمبر ۱۹۳۴ء

یرودا میں صلح کی بات چیت

میرے والد کے گرفتار ہوتے ہی یا شاید اس کے کچھ دن پہلے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی خلاف قانون جماعت قرار دے دی گئی۔ اس سے ایک نئی صورت یہ پیدا ہوئی کہ جب کبھی کمیٹی کا اجلاس ہوتا تھا اس کے سب ممبر ایک ساتھ گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ قائمقام ممبروں کو جو اختیارات حاصل تھے ان کی رو سے ان ممبروں کی جگہ دوسرے ممبر منتخب کئے جاتے تھے اور اس طرح کئی عورتیں بھی ممبر مقرر ہوئیں جن میں سے ایک کملا بھی تھی۔

جس وقت میرے والد جیل میں آئے ان کی صحت بہت خراب تھی اور جس طریقے سے وہ وہاں رکھے گئے اس سے انہیں سخت تکلیف پہنچی۔ حکومت نے خاص کر کے ایسا نہیں کیا اس لئے کہ جہاں تک ممکن نہ تھا۔بارک کی تنگ چار دیواری کے اندر ہم چار آدمی ٹھونس دئے گئے تھے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے یہ تجویز کیا کہ والد جیل کے کسی اور حصے میں رکھے جائیں، جہاں ذرا زیادہ جگہ ہو مگر ہم نے ساتھ ہی رہنا پسند کیا تا کہ ہم لوگ خود ان کی خدمت کر سکیں۔

برسات شروع ہو گئی تھی اور کوٹھری کے اندر بھی پانی سے محفوظ رہنا مشکل تھا اس لئے کہ چھت جگہ جگہ سے ٹپکتی تھی۔ رات کو یہ فکر ہوتی تھی کہ دس فٹ لمبے اور پانچ فٹ چوڑے برآمدے میں جو ہماری کوٹھری کے آگے تھا والد کا پلنگ کہاں بچھایا جائے کہ وہ بھیگنے سے محفوظ رہیں۔ ان کی طبیعت بہت مضمحل تھی، اور کبھی کبھی بخار بھی آجاتا تھا۔آخر میں جیل کے حکام نے یہ یہ فیصلہ کیا کہ ہماری کوٹھری کے متصل ایک اور برآمدہ جو کافی وسیع ہو بنوا دیا جائے۔ چنانچہ یہ برآمدہ بن گیا اور اس سے گنجائش بہت بڑھ گئی مگر والد کو اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ اس لئے کہ اس کے تیار ہونے کے چند ہی روز بعد وہ رہا کر دئے گئے۔البتہ ہم لوگوں نے جو وہاں رہ گئے تھے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

جولائی کے آخر میں ہر طرف یہ چرچا ہو رہا تھا کہ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکار صاحب حکومت اور کانگریس میں صلح کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں اس کی اطلاع ایک روزانہ اخبار سے ہوئی جو والد کے لئے خاص رعایت کے طور پر آتا تھا۔ اسی میں ہم نے وہ خطوط پڑھے جو لارڈ ارون اور سپرو اور جیکار صاحبان نے ایک دوسرے کو لکھے تھے اور اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں جو "صلح کے پیامبر" کہلاتے تھے گاندھی جی سے ملنے گئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان حضرات نے یہ پیش قدمی کس وجہ سے کی ہے اور کیا چاہتے ہیں۔ آگے چل کر انہوں نے ہمیں بتایا کہ انہیں اس کاروائی کی جرات اس مختصر بیان کی وجہ سے ہوئی تھی جس کے شائع کرنے پر میرے والد نے بمبئی میں اپنی گرفتاری سے چند روز پہلے رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس بیان کا مسودہ مسٹر سولوکوسب (لندن کے ڈیلی ہیرلڈ کے نامہ نگار جوان دونوں ہندوستان میں تھے) نے والد سے گفتگو کرنے کے بعد تیار کیا تھا اور والد نے اسے پسند کیا تھا۔ اس بیان (۱) میں اس کا امکان ظاہر کیا گیا تھا کہ اگر حکومت چند شرائط کا مان لے تو کانگریس سول نافرمانی کی تحریک کو روک دے گی۔ یہ ایک مبہم اور مشروط بیان تھا مگر اس میں یہ بات بالکل صاف کردی گئی تھی کہ ان شرائط پر اس وقت تک غور نہیں کیا جا سکتا جب تک والد کو گاندھی جی سے اور مجھ سے مشورہ کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ میرا نام اس وجہ سے لیا گیا تھا کہ میں اس سال کانگریس کا صدر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ والد نے اپنی گرفتاری کے بعد نینی میں مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا اور انہیں افسوس تھا کہ انہوں نے جلدی میں ایسا مبہم بیان دے دیا جس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ واقعی اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اور اسی پر کیا موقوف ہے ہر بیان سے خواہ وہ کتنا ہی صاف اور واضح کیوں نہ ہو ان لوگوں کو جن کا طرز خیال ہم سے بالکل مختلف ہے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

۲۷ جولائی کو یکا یک سر تیج بہادر سپرو اور جے کار صاحب گاندھی جی کا خط لے

کر نینی جیل میں ہمارے پاس آن پہنچے۔ اس روز اور دوسرے دن ہم میں اور ان میں طویل گفتگو ہوتی رہی جس سے والد کو بہت سخت تکان ہوئی۔ اس لئے کہ ان دنوں انہیں حرارت رہا کرتی تھی، ہم میں گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ مگر لوٹ پھیر کہ اسی جگہ آجاتے تھے جہاں سے ہمارے اور ان کے سیاسی خیالات میں اس قدر اختلاف تھا کہ ہم ایک دوسرے کے خیالات اور الفاظ کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہمارے خیال میں یہ کھلی ہوئی بات تھی۔ کہ موجودہ حالات میں کانگرس اور حکومت میں صلح کا مطلق امکان نہیں ہے۔ ہم نے صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیقوں خصوصاً گاندھی جی سے مشورہ نہ کرلیں کوئی تجویز پیش نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ہم نے گاندھی جی کو اس مضمون کا خط لکھ دیا۔

گیارہ دن کے بعد یعنی ۸ اگست کو ڈاکٹر سپرو وائسرے کا جواب لے کر ہم سے ملنے کے لئے دوبارہ تشریف لائے۔ معلوم ہوا۔ کہ وائسرائے کو ہمارے یرودا جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ اور ان کی کونسل ہمیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ ہم سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں سے ملیں جو جیل کے باہر ہیں اور حکومت کے خلاف عملی جدوجہد کررہے ہیں۔ ڈاکٹر سپرو نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگ اس صورت میں یرودا جانے پر تیار ہو یا نہیں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم گاندھی جی سے ملنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں مگر جب تک ہم اپنے دوسرے رفیقوں سے نہ ملیں ہمارے لئے کوئی قطعی فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ اس روز (یا شاید اس سے ایک دن پہلے) اخبار سے یہ خبر معلوم ہوئی تھی کہ بمبئی میں سخت لاٹھی چارج ہوا اور ولبھ بھائی پٹیل مالوی جی، تصدیق شیروانی اور دوسرے لوگ جو ورکنگ کمیٹی کے مستقل یا قائم مقام ممبر تھے گرفتار کرلئے گئے۔ ہم نے ڈاکٹر سپرو سے کہا کہ اس سے معاملہ اور زیادہ خراب ہوگیا ہے اور ان سے درخواست کی کہ وائسرائے کو صورت حال اچھی طرح سمجھا

دیں۔ مگر ڈاکٹر سپرو کو اس پر اصرار تھا کہ گاندھی جائیں تو ڈاکٹر سید محمود کو بھی جو نینی میں ہمارے ساتھ تھے کانگرس کے سیکرٹری کی حیثیت سے ضرور جانا چاہئے۔

اس کے تیسرے دن یعنی ۱۰ اگست کو ہم تینوں (والد محمود اور میں) اسپیشل ٹرین پر نینی سے پونا بھیجے گئے۔ ہماری گاڑی بڑے اسٹیشنوں پر ٹھرائی جاتی تھی۔ پھر بھی ہمارے جانے کی خبر پھیل گئی تھی اور جن اسٹیشنوں پر ہم ٹھہرے اور جن پر نہیں ٹھہرے سب پر لوگوں کے بڑے بڑے مجمعے اکٹھا ہو گئے تھے۔ ۱۱ کو رات گئے ہم کرکی اسٹیشن پر جو پونا کے قریب ہے پہنچ گئے۔

ہمیں یہ توقع تھی کہ ہم گاندھی جی کے ساتھ ٹھہرائے جائیں گے یا کم سے کم ان سے بہت جلد مل سکیں گ۔ یرودا جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے یہی انتظام کیا بھی تھا مگر عین وقت پر انہیں اس پولیس افسر کے ذریعے سے جو نینی سے ہمارے ساتھ آیا تھا کچھ ایسی ہدائتیں ملیں جن کی وجہ سے انہیں اپنا انتظام بدلنا پڑا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ لفٹنٹ کرنل مارٹن یہ راز ہم پر نہیں ظاہر کرنا چاہتے تھے مگر والد نے چپکے چپکے پوچھ گچھ کر کے معلوم کر لیا کہ اصل مدعا یہ ہے کہ ہم (کم سے کم پہلی بار) گاندھی جی سے اس وقت تک نہ ملنے پائیں جب تک سپرو اور جیکار صاحبان وہاں موجود نہ ہوں کیونکہ اندیشہ تھا کہ اگر ہم ان سے پہلے سے مل لئے تو ہمارا رویہ اور زیادہ سخت ہو جائے گا یا ہمارے خیالات میں اور زیادہ اتفاق ہو جائے گا۔ چنانچہ اس رات کو اور دوسرے دن اور دوسری رات کو ہم ایک الگ بارک میں رکھے گئے جس پر والد کو بہت غصہ آیا۔ ہمیں سخت تکلیف اور قلق تھا کہ ہم گاندھی جی سے ملنے نہیں پاتے۔ ۱۳ کی سہ پہر کو یہ اطلاع آئی کہ سر تیج بہادر سپرو اور جیکار صاحب آ گئے ہیں۔ گاندھی جی بھی ان کے ساتھ جیل کے دفتر میں ہیں اور ہم لوگوں کی وہیں طلبی ہے۔ والد نے جانے سے انکار کر دیا۔ جب بہت کچھ عذر معذرت کی گئی تو وہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ پہلے ہم لوگ تنہائی میں گاندھی جی سے ملیں گے۔ اس کے بعد ہم

سب کی متفقہ درخواست پر ولبھ بھائی پٹیل، جیرام داس دولت رام (جو یرودا جیل میں تھیں) کو بھی ہمارے مشورے میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اس دن شام کو والد، محمود اور مےں گاندھی جی کے احاطے میں منتقل کر دئے گئے اور یرودا کے مختصر دوران قیام میں یہیں رہے۔ ولبھ بھائی پٹیل اور جیرام داس دولت رام بھی اس عرصے میں ہمارے ساتھ ہی رکھے گئے تا کہ ہم آپس میں مشورہ کر سکیں۔

تین روز یعنی ۱۳، ۱۴، ۱۵ اگست کو ہماری سپرو اور جیکا ر صاحبان سے جیل کے دفتر میں گفتگو ہوتی رہی اور ہم نے انہیں چند خطوط کے ذریعے سے اپنے خیالات کی اطلاع دی اور وہ کم سے کم شرطیں بتائیں جن پر ہم سول نافرمانی اخباروں میں شائع ہو گئے۔

ان طویل مشوروں میں شریک ہونے کا میرے والد کی صحت پر اس قدر بوجھ پڑا کہ ۱۶ کو انہیں بہت تیز بخار ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ہماری واپسی میں کچھ دیر ہوئی۔ ۱۹ کو ہم پھر اسپیشل ٹرین سے نینی روانہ ہوئے۔ بمبئی کی حکومت نے ہر طرح سے کوشش کی کہ والد آرام سے سفر کر سکیں اور یرودا کے مختصر قیام کے زمانے میں بھی ان کے آرام کا خاص طور پر خیال رکھا گیا جس رات کو ہم یرودا پہنچے ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ کرنل مارٹن سپرنٹنڈنٹ جیل نے والد سے پوچھا کہ آپ کس قسم کا کھانا پسند کریں گے والد نے کہا کہ میں بہت سادہ اور ہلکی غذا کھاتا ہوں اور اس کی بعد صبح کی چائے سے لے کر رات کے کھانے تک اپنی کل ضروریات کی فہرست بتانی شروع کی (نینی میں ہمارے لئے روز گھر سے کھانا آیا کرتا تھا) یہ فہرست جو والد نے بہت ہی سادگی اور بھولے پن سے بتائی تھی، تھی تو ہلکی غذاؤں کی، مگر بڑی زبردست فہرست تھی۔ اس میں شک نہیں کہ رٹز ہوٹل ے اسوائے ہوٹل میں یہ بہت سادے اور معمولی کھانے سمجھے جاتے جیسا کہ والد انہیں سمجھتے تھے مگر کہاں یرودا

جیل اور کہاں یہ چیزیں۔ جب کرنل مارٹن والد کی مہنگی ضرورتوں کی لمبی چوڑی فہرست سن رہے تھے تو ان کے چہرے کی کیفیت کے قابل تھی اور میں اور محمود اسے دیکھ کر لطف اٹھا رہے تھے۔ایک مدت سے ہندوستان کا سب سے بڑا اور سب سے مشہور لیڈر ان کے جیل میں تھا اور اسے کھانے کے لئے صرف بکری کے دودھ کھجور یا کبھی کبھی ایک آدھ سنترے کی ضرورت ہوتی تھی ۔اب جس سے انہیں سابقہ پڑا یہ کچھ اور ہی قسم کا تھا۔

پونا سے نینی واپس جاتے ہوئے پھر ہماری گاڑی بڑے اسٹیشنوں کو چھوڑتی گئی اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹھہری۔مگر مجمع پہلے سے بھی زیادہ تھا۔ پلیٹ فارم کھچا کھچ بھر جاتے تھے بلکہ کہیں کہیں خصوصاً ہردا، اٹارسی اور سہاگ پور میں لوگ ریل کی پٹریوں پر پل پڑتے تھے۔ کئی بار حادثے ہوتے ہوتے رہ گئے۔

والد کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔ بہت سے ڈاکٹر خود ان کے بلائے ہوئے اور صوبے کی حکومت کے بھیجے ہوئے انہیں دیکھنے آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جیل میں رہنا ان کے لئے سخت مضر تھا اور وہاں ٹھیک طور پر علاج نہیں ہوسکتا تھا۔پھر بھی جب کسی دوست نے اخبار میں یہ تجویز پیش کی کہ وہ بیماری کی وجہ سے رہا کردئے جائیں تو انہیں بہت ناگوار ہوا اس لئے کہ انہیں اندیشہ تھا لوگ یہ سمجھیں گے کہ اس میں خود ان کا اشارہ ہے بلکہ انہوں نے لارڈ ارون کو اس مضمون کا تار بھی بھیجا کہ مجھے خاص رعایت کے طور پر رہا کیا جانا منظور نہیں۔ مگر ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی ۔وزن بہت تیزی سے گھٹ رہا تھا اور اس قدر دبلے ہوگئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ خود نہیں بلکہ ان کی پرچھائیں رہ گئی ہے۔ ۸ ستمبر کو وہ دس ہفتے جیل میں رہنے کے بعد رہا کردیئے گئے۔

ان کے جانے سے ہماری بارک سونی ہوگئی۔ جب تک وہ تھے ہمیں بہت سے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لئے کہا کرتے تھے اور ہم سب یعنی محمود، نربدا پرشاد

اور میں بڑی خوشی سے ان کی خدمت میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ میں نے نواڑ بننا چھوڑ دیا تھا اور چرخا بھی بہت کم کاتتا تھا۔ اب ہم نے بادل ناخواستہ پھر وہی پرانا ڈھرا اختیار کر لیا۔ والد کی رہائی کے بعد روزانہ اخبار تک بند ہو گیا چار پانچ روز کے بعد میرے بہنوئی رنجیت۔ س۔ پنڈت بھی گرفتار ہو کر ہماری بارک میں پہنچ گئے۔

ایک مہینے بعد یعنی ۱۱ اکتوبر کو میری چھ مہینے کی قید کی میعاد ختم ہو گئی اور میں رہا کر دیا گیا۔ میں جانتا تھا کہ زیادہ دن آزاد نہیں رہنے پاؤں گا، اس لئے کہ لڑائی جاری تھی اور اس کی شدت بڑھتی جاتی تھی۔ "صلح کے پیامبر" سپرو اور جیکار صاحب کی کوششیں ناکامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ میری رہائی کے دو تین دن بعد نئے آرڈیننس جاری کئے گئے۔ میں خوش تھا کہ آزادی کے مختصر زمانے میں کچھ مفید کام کر لوں گا۔

کملا ان دنوں الہ آبادی میں کانگرس کا کام کر رہی تھی۔ والد علاج کے لئے مسوری گئے ہوئے تھے اور والدہ اور انہیں ان کے ساتھ تھیں۔ کملا کے ساتھ مسوری روانہ ہونے سے پہلے میں ڈیڑھ دن الہ آباد میں بہت مصروف رہا۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کی جائے یا نہیں، لگان اور مالگذاری کی ادائیگی کا زمانہ قریب آ گیا تھا اور اس کی وصولی بہر حال مشکل تھی اس لئے کہ زراعتی پیداوار کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ عالمگیر کساد بازاری کا اثر اب ہندوستان میں صاف نظر آ رہا تھا۔

محصول نہ دینے کی تحریک شروع کرنے کے لئے یہ بہت اچھا موقع تھا یہ چیز سول نافرمانی کی عام تحریک کا ایک جز بن سکتی تھی اور بجائے خود بھی ضروری تھی۔ زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں کے لئے اس سال کی پیداوار میں سے پورا مطالبہ ادا کرنا صریحی طور پر ناممکن تھا۔ زمینداروں میں سے تو اکثر کے پاس تھوڑا بہت

سرمایہ بھی تھا اورانہیں قرض بھی آسانی سے مل سکتا تھا۔مگر کاشتکار عموماً اس قدر محتاج تھے کہ انہیں یوں بھی فاقے کا سامنا رہتا تھا اور ان کے لئے روپیہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کسی جمہوری ملک میں یا ایسی جگہ جہاں کاشتکاروں میں تنظیم ہوتی ہے اور ان کا کچھ اثر ہوتا ہے ان حالات میں لگان وصول کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ ہندوستان میں ان چند حصوں کے علاوہ جن میں کانگرس ان کی حمایت کرتی ہے، ان کا کوئی اثر نہیں۔البتہ اس کا اندیشہ ضرور رہتا ہے کہ جب ان کی حالت ناقابل برداشت ہوجائے گی تو وہ شورش پر آمادہ ہوجائیں گے۔ مگرانہیں پشت ہا پشت سے اس کے عادت ڈال دی گئی ہے کہ ہر طرح کی سختیاں چپ چاپ برداشت کریں۔

گجرات میں اور بعض اور حصوں میں اس وقت محصول نہ دینے کی تحریک جاری تھی مگر یہ سب تقریباً سیاسی تحریکیں تھیں جو سول نافرمانی کے سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ بعض میں علاقوں رعیت داری طریقہ رائج تھا اور کسانوں کو بلاواسطہ حکومت سے سابقہ تھا۔ ان کے محصول نہ دینے کا اثر براہ راست سلطنت پر پڑتا تھا مگر صوبہ متحدہ کی حالت دوسری تھی اس لئے کہ یہاں زمینداری اور تعلق داری کا رواج تھا اور کاشتکاروں اور سلطنت کے بیچ م یں درمیانی لوگ موجود تھے۔ اگر کاشتکار لگان دینا موقوف کردیں تو اس کا اثر براہ راست زمیندار پر پڑتا تھا اور اس طرح طبقوں کے مخالفت کا مسئلہ پیدا ہوجاتا تھا۔کانگرس مجموعی طور پر خالص قومی جماعت تھی اور اس میں بہت سے اوسط درجے کے اور بعض بڑے بڑے زمیندار بھی شامل تھے اس کے لیڈر اس بات سے بہت ڈرتے تھے کہ کہیں طبقوں کی مخالفت کا سوال نہ اٹھ کھڑا ہوا اور زمیندار نہ بگڑ جائیں۔ اس لئے سول نافرمانی کے پہلے چھ مہینے میں وہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کرنے سے بچتے رہے، حالانکہ موقع بہت اچھا تھا۔ مجھے اس صورت میں بلکہ کسی صورت میں بھی طبقوں کی مخالفت کا

مسئلہ چھیڑنے میں مطلق تامل نہ تھا مگر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کانگرس کی جو نوعیت ہے اس کی وجہ سے وہ اس وقت طبقوں کی جنگ کی سرپرستی نہیں کر سکتی۔ البتہ ہو سکتا تھا کہ وہ زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں کو لگان اور مالگذاری ادا نہ کرنے کی ہدایت کرے۔ یہ خیال ضرور تھا کہ غالباً اکثر زمیندار حکومت کو مالگذاری ادا کریں مگر ایسا کرتا تو خود انہیں کا قصور تھا۔

اکتوبر میں جب میں جیل سے چھوٹا تو مجھے یہ نظر آیا کہ سیاسی اور معاشی حالات کا شدید تقاضا ہے کہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کر دی جائے۔ کسانوں کی معاشی مشکلات تو ظاہر ہی تھیں اور سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو اگرچہ ہماری سکول نافرمانی کی تحریک اب بھی سارے ملک میں چل رہی تھی مگر ذرا پھیکی پڑتی جاتی تھی۔ شہروں میں اوسط طبقے کے لوگ ہڑتالوں اور جلوسوں سے کچھ اکتا سے گئے تھے۔ صریحی طور پر کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دے اور ان کی رگوں میں تازہ خون دوڑا دے۔ یہ نئی چیز صرف کاشتکاروں ہی سے حاصل ہو سکتی تھی۔ یہ ہماری محفوظ قوت کا زبردست خزانہ تھا جس سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس طرح یہ امید تھی کہ ہماری تحریے عام لوگوں کی اہم اغراض سے وابستہ ہو کر نئے سرے سے ایک عام تحریک بن جائے گی اور میرے نزدیک اس سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ اس کی وجہ سے سماجی مسائل چھڑ جائیں گی۔

میرے ڈیڑھ دن کے آلہ آباد کے قیام میں مجھ میں اور میرے رفیقوں میں انہیں معاملات پر بحث ہوتی رہی۔ فوری اطلاع کے ذریعے سے ہم نے اپنے صوبے کی کانگرس کمیٹی کا جلسہ کیا اور طویل بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ صرف لگان نہ دینے کی تحریک کی منظوری دے دی جائے اور ہر ضلعے کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ چاہے تو اس تحریک کو شروع کر دے۔ خود ہم نے صوبے کے کسی حصے میں اس

تحریک کا اعلان نہیں کیا۔ ہماری مجلس منتظمہ نے اس تجویز میں کاشتکاروں اور زمینداروں دونوں کو شامل کرلیا تا کہ جہاں تک ہو سکے طبقوں کی مخالفت کا مسئلہ نہ چھڑنے پائے۔ مگر یہ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ اصل میں اس پر صرف کاشتکار ہی عمل کریں گے۔

اس اجازت کے ملتے ہی ہمارا الہ آباد کا ضلع پہلا قدم اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ ایک ہفتے کے بعد ضلعے کے کسانوں کی ایک نمائندہ کانفرنس منعقد کی جائے تا کہ نئی تحریک شروع کی جا سکے۔ میں سمجھتا تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد ایک ہی روز میں میں کافی کام کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ اسی دن میں الہ آباد شہر کے ایک بہت بڑے عام جلسے میں شریک ہوا اور وہاں ایک طویل تقریر کی۔ اسی تقریر کی وجہ سے مجھے کچھ دن کے بعد دوبارہ قید کی سزا دی گئی۔

۱۴ اکتوبر کو کملا اور میں دونوں روانہ ہو گئے تا کہ تین دن والد کی خدمت میں رہیں۔ انہیں کسی قدر افاقہ معلوم ہوتا تھا اور میں یہ سمجھ کر بہت خوش ہوا کہ اب ان کی طبیعت سنبھل گئی اور اچھے ہو جائیں گے۔ مجھے وہ سکون اور مسرت کے دن اب تک یاد ہیں۔ اتنے عرصے کے بعد اپنے خاندان میں واپس آنا کیا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ میری لڑکی اندرا اور میری بہن بچیاں بھی وہاں موجود تھیں میں ان بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور کبھی کبھی ہم ایک شاندار جلوس بنا کر گھر کے آس پاس چکر لگاتے تھے۔ سب سے چھوٹی بچی جس کی عمر تین چار سال کی تھی ہاتھ میں جھنڈا لئے آگے آگے ہوتی تھی اور سب مل کر ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' گاتے جاتے تھے یہ آخری تین دن تھے جو میں نے اپنے والد کے ساتھ اطمینان سے گذارے۔ اس لئے کہ اس کے بعد ان پر اس مہلک بیماری کا حملہ ہوا جس نے انہیں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

چونکہ میرے والد کو یہ اندیشہ تھا کہ میں بہت جلد دوبارہ گرفتار ہو جاؤں گا اور وہ

چاہتے تھے کہ کچھ دن اور میرے ساتھ رہ لیں اس انہوں نے یکا یک یہ فیصلہ کیا کہ وہ بھی الہ آباد واپس چلیں گے۔ کملا اور میں ۱۷ کو مسوری سے جارہے تھے تاکہ ۱۹ کو الہ آباد میں کسانوں کی کانفرس میں شریک ہوسکیں۔ والد نے کہا کہ میں ۱۸ کو سب کو لے کر روانہ ہو جاؤں گا۔

واپسی میں میرا اور کملا کا سفر خاصہ ہنگامہ خیز رہا۔ وہرہ دون سے روانہ ہوتے وقت مجھے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا نوٹس دیا گیا۔ لکھنؤ میں ہمیں چند گھنٹے کی مہلت مل گئی۔ معلوم ہوا کہ وہاں بھی دفعہ ۱۴۴ کو نوٹس میرے لئے تیار تھا مگر اس کی تعمیل نہ ہوسکی۔ کیونکہ پولیس کا افسر مجمع کی زیادتی کی وجہ سے مجھ تک پہنچ نہیں پایا۔ وہاں میونسپلٹی نے مجھے ایڈریس دیا اور اس کے بعد ہم موٹر کار میں الہ آباد روانہ ہوگئے۔ راستے میں کئی جگہ ٹھہر کر کسانوں کے مجمعوں میں تقریریں کیں اور ۱۸ کو رات کے وقت الہ آباد پہنچ گئے۔

۱۹ کی صبح کو میرے لئے دفعہ ۱۴۴ کا ایک اور نوٹس آن پہنچا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور میں چند گھنٹے سے زیادہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ دوبارہ گرفتار ہونے سے پہلے کسانوں کی کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع مل جائے۔ ہم اسے پرائیویٹ کانفرنس کہتے تھے اور وہ واقعی پرائیویٹ کانفرنس تھی اس لئے کہ اس میں صرف کسانوں کے نمائندے شریک کئے گئے تھے۔ باہر والوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ کانفرنس الہ آباد کے ضلعے کی پوری نمائندگی کر رہی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس میں ۱۶۰۰ ڈیلی گیٹ موجود تھے۔ کانفرنس نے بہت جوش وخروش سے یہ فیصلہ کیا کہ ضلعے میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کردی جائے۔ ہمارے خاص خاص کارکنوں کو کسی قدر تامل تھا اور اس تحریک کی کامیابی میں شبہ تھا، کیونکہ بڑے زمیندار، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ حکومت ان کی پشت پناہ تھی، کسانوں کو دھمکانے اور ستانے کی بہت بڑی قوت

رکھتے تھے۔ اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کسان کس حد تک اس کا مقابلہ کر سکیں گے۔ مگر چھوٹے بڑے کسانوں کے ۱۶۰۰ نمائندوں کو جو وہاں موجود تھے مطلق تامل اور شبہ نہیں تھا یا کم سے کم وہ اسے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ میں نے بھی اس کانفرنس میں تقریر کی معلوم نہیں کہ یہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی تھی یا نہیں۔

وہاں سے میں والد اور دوسرے عزیزوں کو لینے اسٹیشن گیا۔ گاڑی دیر سے آئی اور ان لوگوں کے پہنچنے کے بعد ہی مجھے ایک جلسے میں شریک ہونے کی لئے جانا پڑا جو کسان اور شہر والے مل کر رہے تھے۔ کملا اور میں آٹھ بجے رات کے بعد جلسے سے تھکے تھکائے واپس آ رہے تھے۔ میں خوش تھا کہ گھر جا کر والد سے باتیں کروں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے اس لئے کہ ان کے واپس آنے کے بعد میری ان کی بات چیت نہیں ہونے پائی تھی۔ ہم گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے کہ ہماری موٹر روک لی گئی اور میں گرفتار کر کے جمنا پار اپنی پرانی بارک میں پہنچا دیا گیا۔ کملا اکیلی آنند بھون پہنچی۔ اس نے سارے خاندان کو جو ہمارا انتظار کر رہا تھا یہ نئی خبر سنائی۔ ادھر میں ٹھیک نو بجے نینی جیل کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوا۔

---

(۱) وہ بیان جو ۲۵ جون ۱۹۳۰ء کو بمبئی میں پنڈت موتی لال نہرو کی رضامندی سے مرتب کیا گیا۔ "گو یہ ظاہر ہے کہ حکومت ہند اور حکومت برطانیہ پہلے سے یہ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ گول میز کانفرنس جو اپنی رائے میں بالکل آزاد ہے، کیا تجاویز پیش کرے گی اور یہ کہ برطانوی پارلیمنٹ کا رویہ ان تجاویز کے متعلق کیا ہوگا۔ پھر بھی اگر کسی صورت سے یہ دونوں حکومتیں اپنی طرف سے یہ وعدہ کرلیں کہ وہ ہندوستان کو کامل خود اختیاری حکومت، دئے جانے کی حمایت انتقال اختیارات کی ان شرائط کے ماتحت کرنے پر تیار ہیں جو ہندوستان کے مخصوص خیالات اور ضروریات اور اس کے اور برطانیہ کے قدیم تعلقات کے لحاظ سے ان کے باہمی معاملات کے تصفیے کے لئے ضروری ہیں اور گول میز کانفرنس میں طے کی جائیں گی، تو پنڈت موتی لال نہرو حکومت کے اس وعدے کی (یا کسی ذمہ دار فریق ثالث کے اس بیان کی کہ حکومت ایسا وعدہ

کرنے والی ہے) اطلاع خود جا کر مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو دیں گے۔
اگر یہ وعدہ کیا جائے اور فریق ثانی اسے قبول کرلے تو آپس میں اس حد تک مصالحت ہوسکتی ہے کہ ایک ہی وقت میں سول نافرمانی موقوف کردی جائے۔ حکومت کی موجودہ تشدد کی پالیسی ختم ہوجائے اور سیاسی قیدیوں کو عام معافی مل جائے اور اس کے بعد کانگرس ان شرطوں کے ساتھ جنہیں فریقین منظور کرلیں گول میز کانفرنس میں شرکت کرے۔''

وہ خط جس میں یہ کم سے کم شرطیں بتائی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ (ب) میں درج ہیں۔

صوبہ متحدہ میں محصول نہ دینے کی تجویز

آٹھ روز کے بعد میں پھر نینی جیل میں پہنچ گیا اور اپنی اسی پرانی بارک میں سید محمود نربدا پرشاد اور رنجیت پنڈت سے آن ملا۔ چند روز کے بعد جیل ہی میں میرے مقدمے کی تحقیقات ہوئی۔ مجھ پر کئی الزام لگائے گئے تھے اور وہ سب اس تقریر کے مختلف حصوں پر مبنی تھے جو میں نے رہائی کے دوسرے دن الہ آباد میں کی تھی۔ جیسا کہ ہم لوگوں کا قاعدہ ہے میں نے جواب دہی نہیں کی بلکہ عدالت میں صرف ایک مختصر سا بیان دے دیا۔ مجھے دفعہ ۱۴۴ الف کے ماتحت چھ مہینے قید اور سو روپے جرمانے اور آرڈیننس نمبر ۱۹۳۰۶ء (مجھے یاد نہیں کہ اس آرڈیننس کا منشا کیا تھا) کہ ماتحت بھی چھ مہینے قید اور سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ چونکہ آخری دو سزائیں اتھ ساتھ چلنے ولی تھیں اس لئے مجموعی طور پر مجھے دو سال قید سخت اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں پانچ مہینے کی مزید قید کی سزا ہوئی۔ اب میں پانچویں بار گرفتار ہوا تھا۔

میرے دوبارہ گرفتار ہونے اور سزا پانے کا سول نافرمانی کی رفتار پر تھوڑے دن کے لئے کچھ اثر پڑا۔ اس کا زور اور سرگرمی کسی قدر بڑھ گئی۔ یہ زیادہ تر میرے والد کی وجہ سے ہوا۔ جب کملا نے انہیں میری گرفتاری کی خبر پہنچائی تو انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور میز پر جو ان کے سامنے رکھی تھی زور سے ہاتھ مار کر کہا کہ اب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بستر علالت پر پڑا رہوں۔ میں مردوں کا کام کروں گا اور بیماری کو نہیں مانوں گا۔ یہ ایک بہادرانہ عزم تھا مگر بدقسمتی سے بڑی سے بڑی قوت ارادی بھی اس روگ کو دور نہیں کر سکتی تھی جس نے ان کے جسم میں گھن لگا دیا تھا۔ پھر بھی کچھ دن کے لئے ان کے حالت میں اس قدر نمایاں تغیر ہو گیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے کئی مہینے سے یعنی جب سے وہ یرودا گئے تھے ان کے تھوک میں خون آنے لگا تھا۔ یہ ارادہ کرتے ہی خون بند ہو گیا۔ اور کئی روز تک نہیں آیا۔

وہ بہت خوش ہوئے اور جیل میں مجھ سے ملنے آئے تو یہ بات بڑے فخر سے بیان کی مگر بدقسمتی سے یہ افاقہ بہت مختصر تھا۔ کیونکہ چند ہی روز کے بعد خون اور زیادہ آنے لگا اور بیماری پھر زور پکڑ گئی۔ اس وقفے میں انہوں نے پرانے جوش عمل کے ساتھ کام لیا اور سارے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک کا زور بڑھا دیا۔ انہوں نے مختلف مقامات کے لوگوں سے مشورہ کرکے مفصل ہدایتیں جاری کیں اور نومبر کے مہینے میں ایک خاص دن مقرر کیا (جو میری سالگرہ کا دن تھا) جس میں سارے ہندوستان میں میری تقریر کے وہ حصے عام جلسوں میں پڑھے گئے جن کی وجہ سے مجھے سزا دی گئی تھی۔ اس روز بہت سے مقامات پر لاٹھی چارج ہوئے۔ جلسے اور جلوس زبردستی منتشر کئے گئے اور ایک دن کے اندر سارے ہندوستان میں پانچ ہزار آدمی گرفتار ہوگئے۔ یہ میری سال گرہ کے منانے کا انوکھا طریقہ تھا۔

اس بیماری کی حالت میں ذمہ داری کو بوجھ اٹھانا اور اس قدر قوت کرنا والد کے لئے بہت برا تھا اس لئے میں نے ان سے التجا کی کہ آپ کامل آرام کیجیے۔ میں جانتا تھا کہ ہندوستان میں ان کے لئے چین سے بیٹھنا ممکن نہیں کیونکہ وہ ہر وقت تحریک کے نشیب وہ فراز پر غور کرتے رہیں گے اور لوگ لامحالہ ان سے مشورہ لینے آئیں گے۔اس لئے میں نے یہ تجویز کی آپ رنگون، سنگاپور اور شرقی جزیروں کا ایک چھوٹا سے بحری سفر کر ڈالئے۔انہیں یہ بات پسند آئی۔ یہ انتظام کیا گیا کہ ان کے ایک دوست اس سفر میں ان کے ساتھ جائیں۔ اسی غرض سے وہ کلکتے گئے مگر ان کی حالت روز بروز بگڑتی گئی اور ان میں اتنے بڑے سفر کی طاقت نہیں رہی۔ وہ سات ہفتے تک کلکتے کے مضافات میں مقیم رہے اور سارا خاندان وہیں ان کے پاس پہنچ گیا۔ صرف کملا الہ آباد میں رہ گئی اور کانگرس کا کام کرتی رہی۔

غالباً میرے اس قدر جلد اور دوبارہ گرفتار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے محصول نہ دینے کی تحریک میں حصہ لیا تھا۔مگر سچ پوچھئے تو اس تحریک کے حق میں اس سے

اچھی کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی کہ میں کسانوں کی کانفرنس کے بعد ہی جبکہ ان کے نمائندے الہ آباد میں موجود تھے گرفتار کرلیا گیا۔ اس سے ان کا جوش بہت بڑھ گیا اورانہوں نے قریب قریب ضلعے کے ہر گاؤں میں کانفرنس کے فیصلے کی اطلاع پہنچا دی۔ دو دن کے اندر اندر سارے ضلعے کو خبر ہوگئی کہ محصول نہ دینے کی تحریک شروع ہوگئی ہے اور سب کہیں لوگ خوشی خوشی اس کی تعمیل کرنے لگے۔

اس زمانے میں ہمیں سب سے بڑی مشکل پیام رسانی کی تھی، سمجھ میں نہیں آتا تھا لوگوں کو کس طرح اطلاع دی جائے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ان سے کیا چاہتے ہیں۔ اخبار ہماری خبریں سزا اور ضبطی کے ڈر سے شائع نہیں کرتے تھے۔ پریس ہمارے اشتہار اور نوٹس چھاپنے پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ خطوں اور تاروں کی نگرانی ہوتی تھی۔ اور اکثر روک دیئے جاتے تھے۔ ہمارے لئے پیام رسانی کا قابل اعتماد طریقہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ قاصدوں کے ہاتھ خط بھیجیں مگر یہ کبھی کبھی گرفتار ہو جاتے تھے۔ اس طریقے میں بہت صوبوں کے مرکزوں، ضلعوں کے مرکزوں اور کانگرس کے صدر مقام کے درمیان خبر رسانی کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ شہروں میں خبر پھیلانے تو کچھ مشکل نہ تھا وہاں خلاف قانون خبر کے کی بڑی مانگ تھی۔ عام اعلان کرنے کے لئے شہر میں ڈھنڈوار بھی پیٹا جاتا تھا جس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ ڈھنڈورے والا گرفتار ہو جاتا تھا۔اس میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ اس لئے کہ لوگ گرفتاری سے ڈرتے نہیں تھے بلکہ خود چاہتے تھے کہ گرفتار کئے جائیں۔ یہ کے بعض بڑے بڑے مرکزوں سے قاصدوں اور اسکلو اسٹائل کے پرچوں کے ذریعے سے خبر رسانی کا تھوڑا بہت سلسلہ قائم تھا مگر یہ قابل اطمینان نہیں تھا اور ہماری ہدایتوں کو دور دراز گاؤں تک پہنچتے پہنچتے بہت دن لگ جاتے تھے۔

الہ آباد کی کسنا کانفرنس کے لئے یہ مشکل آسان ہوگئی۔ اس میں ضلعے کے قریب قریب ہر اہم گاؤں سے نمائندے آئے تھے اور جب یہ واپس گئے تو انہوں

نے کانفرنس کے فیصلے اور میری گرفتاری کی خبر سارے ضلعے میں پھیلا دی۔ یہ سولہ سو آدمی سب کے سب محصول نہ دینے کی تحریک کے پرجوش مبلغ بن گئے۔ اس طرح تحریک کی ابتدائی کامیابی کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس علاقے کے کسان شروع میں لگان ادا نہیں کریں گے اور اگر تخویف سے کام نہ لیا گیا تو آخر تک نہیں دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ زمینداروں نے یا حکومت نے تشدد اور تخویف شروع کر دی تو ان کی قوت برداشت کہاں تک کام دے گی۔

ہم نے کاشتکاروں اور زمینداروں دونوں سے محصول ادا نہ کرنے کا اپیل کیا تھا۔ اس لئے اصولی طور پر اس میں کسی طبقے کی طرف داری نہیں تھی مگر عملی صورت یہ ہوئی کہ اکثر زمینداروں نے جن میں بعض قوم پرست بھی شامل تھے مالگذاری ادا کر دی۔ ان پر زیادہ دباؤ پڑ رہا تھا اور انہیں زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مگر کاشتکار ثابت قدم رہے اور انہوں نے لگان ادا نہیں کیا۔ اس طرح ہماری تحریک اصل میں لگان نہ دینے کی تحریک بن گئی۔ الہ آباد کے ضلعے سے یہ تحریک صوبہ متحدہ کے چند اور ضلعوں میں بھی پھیل گئی۔ اکثر جگہ اس کا باقاعدہ اعلان نہیں ہوا مگر عملی طور پر کسانوں نے لگان نہیں دیا اور ان میں سے اکثر قیمتیں گر جانے کی وجہ سے واقعی دے بھی نہیں سکتے تھے۔ اتفاق سے کئی مہینے تک حکومت اور بڑے زمینداروں نے عام طور پر سرکش کسانوں کے خلاف کوئی تخویفی کاروائی بھی نہیں کی۔ انہیں اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ ایک طرف تو سیاسی تحریک اور سول نافرمانی کا زور تھا اور دوسری طرف عالمگیر کساد بازاری کی وجہ سے کسانوں کی حالت بہت ابتر تھی۔ یہ دونوں چیزیں مل گئی تھیں اور حکومت کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں کسانوں میں یہ شورش برپا نہ ہو جائے لندن میں گول میز کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا اور حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اور بے چینی

پھیلے اور اسے اور زیادہ استبداد سے کام لینا پڑے۔

صوبہ متحدہ میں محصول نہ دینے کی تحریک کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری جدوجہد کا مرکز شہروں سے دیہات میں منتقل ہوگیا جس کی وجہ سے تحریک میں نئے سرے سے جان پڑگئی اور اس کی بنیاد زیادہ وسیع اور پائدار ہوگئی۔ اگرچہ ہمارے شہر والے تھک گئے تھے اور ہمارے اوسط طبقے کے کارکن پست ہو چلے تھے مگر ہمارے صوبے میں تحریک کا زور کم نہیں ہونے پایا تھا بلکہ اور بڑھ گیا تھا۔ دوسرے صوبوں میں یہ تغیر یعنی شہر کے سیاسی مسائل کی جگہ دیہات کے معاشی مسائل پر زور دینا اس حد تک واقع نہیں ہوا تھا اس لئے وہاں جدوجہد کا مرکز بدستور شہروں میں تھا اور اوسط طبقے کے لوگوں کے تھک جانے کی وجہ سے تحریک کمزور ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ بمبئی بھی جس نے اس سارے عرصے میں سب سے نمایاں حصہ لیا تھا کسی قدر پست ہو چلا تھا۔ وہاں اور دوسرے مقامات پر قانون کی خلاف ورزی جاری تھی اور گرفتاریاں بھی ہو رہی تھیں مگر اب ان چیزوں میں کچھ بناوٹ سی معلوم ہوتی تھی۔ تحریک میں وہ روح نہیں رہی تھی۔ یہ قدرتی بات تھی اس لئے کہ عام لوگوں میں انقلابی جوش زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہ سکتا، عموماً یہ جوش چند دن تک رہتا ہے۔ مگر سول نافرمانی میں یہ غیر معمولی صفت تھی کہ اس نے اسے کئی مہینے تک باقی رکھا اور اس کے بعد بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ مدتوں چلتا رہا۔

حکومت نے اور زیادہ تشدد سے کام لینا شروع کیا۔ مقامی کانگرس کمیٹیاں جو اب تک حیرت انگیز طریقے سے کام کر رہی تھیں، خلاف قانون قرار دے کر توڑ دی گئیں۔ جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اور بھی برا برتاؤ ہونے لگا۔ حکومت کو زیادہ غصہ اس پر آتا تھا کہ لوگ جیل سے رہا ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد دوبارہ سزا پا کر جیل میں پہنچ جاتے تھے۔ اس بات سے کہ لوگ سزا پانے پر بھی حکومت کا دباؤ نہیں مانتے تھے، اس کا اخلاقی توازن بگڑ گیا۔ نومبر یا شروع دسمبر

۱۹۳۰ء میں صوبہ متحدہ کے کئی جیلوں میں سیاسی قیدیوں کو جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کے بہانے سے کوڑے لگائے گئے۔ ہمیں نینی جیل میں یہ خبر ملی اور اس سے سخت صدمہ پہنچا (اب تو ہم ہندوستان میں اس کے اور اس سے بدتر چیزوں کے عادی ہو گئے ہیں) میرے خیال میں کوڑے مارنے کے سزا بدترین عادی مجرموں کے لئے بھی جائز نہیں۔ نوعمر زود حس لڑکوں کو محض ضابطے کی خلاف ورزی کے بدلے یہ سزا دینا سخت وحشیانہ فعل تھا۔ ہم چاروں نے جو ایک ہی بارک میں رہتے تھے حکومت کو اس کے متعلق ایک خط لکھا۔ جب دو ہفتے تک کوئی جواب نہیں آیا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کوڑے کی سزا کے خلاف احتجاج کرنے اور ان مظلوموں سے جنہیں یہ وحشیانہ سزا دی گئی تھی اظہار ہمدردی کرنے کے لئے ہمیں کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہم نے تین دن یعنی بہتر گھنٹے کا پورا فاقہ شروع کر دیا۔ یہ کوئی بڑا فاقہ نہیں تھا مگر ہم میں سے کوئی بھی فاقے کرنے کا عادی نہیں تھا اور ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہم اسے کہاں تک برداشت کر سکیں گے۔ میں ے اس سے پہلے چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا فاقہ کبھی نہیں کیا تھا۔

ہمیں اس فاقے میں کوئی خاص مشکل نہیں پیش آئی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ اتنی سخت آزمائش نہیں ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔ میں بڑی حماقت کی کہ اس عرصے میں سخت ورزشیں (دوڑنا، کسرت کرنا، وغیرہ) جو میں کیا کرتا تھا بدستور جاری رکھیں۔ مجھے اس سے نقصان پہنچا خصوصاً اس وجہ سے کہ میری طبیعت پہلے ہی سے خراب تھی۔ ان تین دن میں ہم میں سے ہر شخص کا وزن سات آٹھ پونڈ گھٹ گیا۔ اس سے پہلے نینی جیل میں چند مہینے کے اندر ہم میں سے ہر ایک کا وزن پندرہ سے لے کر چھبیس پونڈ تک کم ہو گیا تھا۔

ہمارے فاقے کے علاوہ جیل کے باہر بھی لوگوں نے کوڑے کی سزا کے خلاف بہت کچھ احتجاج کیا اور غالباً صوبہ متحدہ کی حکومت نے جیل نے کے محکمے کو حکم دیا کہ

آئندہ یہ سزا نہ دی جائے مگر یہ حکم زیادہ دن قائم نہیں رہا اور کوئی سوا سال کے بعد صوبہ متحدہ اور دوسرے صوبوں کے جیلوں میں قیدیوں کو بار بار کوڑے کی سزائیں دی گئیں۔

اس قسم کے واقعات سے جو کبھی کبھی پیش آتے تھے قطع نظر کر کے ہماری زندگی جیل میں بہت سکون سے گزرتی تھی۔ موسم اچھا تھا اس لئے کہ الہ آباد کا جاڑا بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ رنجیت پنڈت ہماری بارک کے لئے ایک نعمت تھے اس لئے کہ انھیں باغبانی خوب آتی تھی اور تھوڑے دن میں ہمارے اجاڑ احاطے میں رنگ برنگ کے پھول لہلانے لگے۔ اور انھوں نے یہ کمال کیا کہ اتنی سی جگہ میں ایک چھوٹا سا گولف کورس بھی بنا لیا۔

نینی جیل کی زندگی میں ایک دلچسپی یہ تھی کہ ہمارے سر پر سے طیارے گزرا کرتے تھے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان جتنے بڑے ہوائی راستے ہیں وہ سب الہ آباد سے ہو کر جاتے ہیں اور آسٹریلیا، جاوا، فرانسیسی چینی ہند جانے والے بڑے بڑے طیارے ٹھیک ہمارے سر پر سے گزرتے تھے۔ سب سے زیادہ شاندار ڈچ ہوائی جہاز تھے جو بٹاویا آتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے ہمیں صبح تڑکے جب خوب اندھیرا ہوتا تھا اور آسمان پر تارے چھٹکے ہوتے تھے طیارے اڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ڈچ جہاز میں خوب روشنی ہوتی تھی اور دونوں سروں پر سرخ لیمپ دہکتے تھے۔ اس جہاز کو صبح کے جھٹپٹے میں گزرتے ہوئے دیکھنا بڑا خوش نما منظر تھا۔

پنڈت مدن موہن مالوی بھی کسی اور جیل سے نینی بھیج دیے گئے۔ وہ ہماری بارک میں نہیں بلکہ ہم سے الگ رکھے گئے مگر ان سے روز ملاقات ہوتی تھی۔ مجھے یہاں ان سے ملنے کا جتنا موقع ملا شاید جیل سے باہر کبھی نہیں ملا تھا۔ ان میں بڑی زندگی اور زندہ دلی تھی اور نوجوانوں کی طرح ہر چیز کا شوق تھا اس لئے ان کی صحبت

میں بہت لطف آتا تھا۔ انھوں نے رنجیت سے جرمن پڑھنا شروع کی اور حیرت انگیز قوت حافظہ کا ثبوت دیا۔ جب کوڑوں کی سزا کی خبر آئی تو وہ نینی ہی میں تھے۔ انھیں بھی سخت صدمہ ہوا اور انھوں نے صوبے کے قائم مقام گورنر کو خط لکھا۔ کچھ دن کے بعد وہ بیمار پڑ گئے۔ وہ سردی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ اور جیل میں سردی سے محفوظ رہنے کا کافی انتظام نہیں تھا۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس لئے وہ شہر کے ہسپتال میں بھیج دئے گئے اور اور کچھ دن کے بعد میعاد سے پہلے رہا کر دئے گئے خوش قسمتی سے ان کی طبیعت ہسپتال ہی میں سنبھل گئی۔

سال نو کے دن یعنی کیم جنوری ۱۹۳۱ء کو کملا کی گرفتاری کی خبر آئی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اس لئے کہ اس کی بہت سی سہیلیاں جو اس کے ساتھ کام کرتی تھیں جیل میں تھیں اور وہ خود بھی ان کی طرح جیل جانے کے لئے بے چین تھی۔ میری بیوی اور بہن جو کام کر رہی تھیں اگر مرد کرتے تو کب گرفتار ہو چکے ہوتے۔ مگر اس زمانے میں حکومت جہاں تک ہو سکتا تھا۔ عورتوں کو گرفتار نہیں کرتی تھی۔ اس لئے وہ اب تک بچی ہوئی تھیں مگر اب خدا خدا کر کے کملا کے دل کی آرزو پوری ہوئی۔ میں سوچتا تھا کہ وہ کسی قدر خوش ہو گی۔ مگر مجھے یہ تشویش تھی کہ اس کی صحت ہمیشہ سے کمزور ہے جیل میں اسے بڑی تکلیف ہو گی۔

جب وہ گرفتار ہوئی تو کسی اخبار کے نمائندے سے جو وہاں موجود تھا اس ایک پیام کی درخواست کی اور اس نے فوراً بے سوچے ہوئے ایک مختصر سا پیام اپنے خاص انداز میں لکھوا دیا۔ ''مجھے فخر ہے کہ میں اپنے شوہر کے نقش قدم پر چل رہی ہوں اور امید ہے کہ لوگ لڑائی جاری رکھیں گے۔'' شاید اگر اسے سوچنے کا موقع ملتا تو وہ یہ الفاظ نہ کہتی اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو عورتوں کے حقوق کا حامی اور مردوں کے استبداد کا مخالف سمجھتی ہے۔ مگر اس وقت تو وہ جذبہ جو ہر ہندو بیوی کے دل میں ہوتا ہے، اس پر غالب آ گیا اور اسے مردوں کے استبداد کا بھی خیال نہیں رہا۔

میرے والد کلکتے میں تھے اور ان کی طبیعت بہت خراب تھی مگر کملا کی گرفتاری اور سزایابی کی خبر کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ الہ آباد آنے کو تیار ہو گئے۔ میری بہن کرشنا کو انھوں نے فوراً الہ آباد بھیج دیا اور چند روز کے بعد خود بھی بقیہ خاندان کو لے کر روانہ ہو گئے۔ ۱۲ جنوری کو وہ مجھ سے ملنے نینی آئے۔ میں نے انھیں تقریباً دو مہینے کے بعد دیکھا تھا اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا، جسے میں مشکل سے چھپا سکا۔ بظاہر انھیں اس کا اندازہ نہیں ہونے پایا اور انھوں نے کہا کہ میری صحت کلکتے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے، ان کے سارے چہرے پر ورم تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ یہ کسی عارضی سبب سے ہو گیا۔

ان کے چہرے کی یہ ہیئت میرے دل میں کھٹکتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کی صورت نہیں کسی اور کی ہے۔ پہلی بار میرے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ ان کی حالت واقعی خطرناک ہے۔ میں انھیں صحت اور قوت کا مجسمہ سمجھا کرتا تھا، اور انکی موت کا تصور کرنا میرے لئے دشوار تھا۔ وہ موت کے ذکر پر ہنسا کرتے تھے اور ہمیں تسکین دیتے تھے کہ ابھی میں بہت دن تک زندہ رہوں گا۔ مگر کچھ عرصے سے میں دیکھتا تھا کہ جب ان کا کوئی بچپن کا دوست مر جاتا ہے تو انھیں تنہائی کا احساس رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجنبیوں کے مجمع میں بالکل اکیلے ہیں بلکہ اشارتاً اپنی موت کا ذکر بھی کر دیتے تھے۔ مگر عموماً یہ کیفیت کچھ دیر کے بعد جاتی رہتی تھی اور ان کی زندگی اور زندہ دلی کی قوت پھر ابھر آتی تھی ہمارا سارا خاندان کی جامع شخصیت کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ ہم ان کے بغیر دنیا کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر میں بہت پریشان ہو گیا اور میرے دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگے۔ پھر بھی میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خطرہ اس قدر قریب ہے۔ میری صحت تھی نہ معلوم کیوں اس زمانے میں بہت خراب رہتی تھی۔

پہلی گول میز کانفرنس ختم ہو رہی تھی اور اس کے فیصلوں کی بڑی دھوم دھام تھی۔ ہمیں اس پر ہنسی آتی تھی اور شاید اس ہنسی میں کسی قدر حقارت بھی شامل تھی۔ یہ ساری تقریریں اور بحثیں بالکل بیکار حقیقت سے خالی معلوم ہوتی تھیں، البتہ ایک حقیقت بالکل ظاہر تھی کہ اس وقت جب ہمارا ملک انتہائی مصیبت کے دور سے گزر رہا تھا اور ہماری عورتیں اور مرد حیرت انگیز بہادری کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمارے بعض وطن پرست ان سب چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ہمارے حریفوں کو اخلاقی مدد پہنچا رہے تھے۔ ہم پر یہ بات اور بھی واضح ہو گئی کہ قوم پرستی کے پردے میں متضاد معاشی اغراض کام کر رہے ہیں اور وہ لوگ جو مستقل حقوق کے مالک ہیں اسی قوم پرستی کے نام سے آئندہ کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت کا انتظام کر رہے ہیں۔ گول میز کانفرنس صریحی طور پر ان ہی لوگوں کی ایک جماعت تھی۔ ان میں سے اکثر نے ہماری تحریک کی مخالفت کی تھی اور بعض دور سے تماشا دیکھا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں جتا دیتے تھے کہ "ان لوگوں کی خدمت بھی کچھ کم نہیں جو موقع کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔" مگر یہ انتظار کا زمانہ لندن کی نگاہ ناز کے ایک اشارے میں ختم ہو گیا۔ اور یہ سب حضرات وہاں دوڑے گئے کہ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت کریں اور جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آ جائے اس میں حصہ بٹائیں۔ لندن میں یہ صف بندی کرنے میں اس خیال سے اور بھی عجلت کی گئی کہ کانگرس کی انتہا پسندی بڑھتی جاتی ہے اور اس پر عام لوگوں کا اثر غالب آتا جاتا ہے۔ مستقل حقوق کے مالکوں میں خود بخود یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اگر ہندوستان میں کوئی بنیادی سیاسی تبدیلی ہوئی تو عام لوگوں کا طبقہ حاوی ہو جائے گا یا کم سے کم اس کی اہمیت بڑھ جائے گی اور وہ یقیناً بنیادی سماجی تبدیلیوں پر زور دے گا جس سے ان کے مستقل حقوق خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس خطرے کو دیکھ کر یہ حضرات گھبرائے اور انھوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ کوئی اہم سیاسی تبدیلی نہ ہونے

پائے۔ وہ چاہتے تھے انگریز ہندوستان میں پنچ بنے بیٹھے رہیں۔ تاکہ وہ موجودہ سیاسی نظام کو قائم رکھیں اور ان کے مستقل حقوق کی حفاظت کرتے رہیں۔ نوآبادیات کے درجے پر زور دینے میں اصل مصلحت یہی تھی۔ایک بار ایک مشہور اعتدال پسند لیڈر مجھ سے اس بات پر خفا ہوگئے۔ کہ میں نے برطانوی حکومت سے معاملہ کرنے کے لئے یہ لازمی شرط قرار دی کہ برطانوی فوج ہندوستان سے فوراً ہٹالی جائے اور ہندوستانی فوج جمہور ہند کی نگرانی میں دے دیجائے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خود برطانوی حکومت بھی اسے منظور کرلے تب بھی میں اس کی انتہائی مخالفت کروں۔ وہ قومی آزادی کی اس لازمی شرط کے مخالف کچھ اس وجہ سے نہیں تھے کہ موجودہ حالات میں اس کا پورا ہونا ناممکن ہے، بلکہ وہ سرے سے اسے ناپسند کرتے تھے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ انھیں بیرونی حملے کا خوف تھا اور وہ چاہتے تھے کہ برطانوی فوج ہماری حفاظت کے لئے موجود رہے۔ قطع نظر اسے بحث کے کہ بیرونی حملے کا امکان ہے یا نہیں، یہ بات بجائے خود ہر غیرت مند ہندوستانی کے لئے باعث شرم ہے کہ اپنی حفاظت کی درخواست دوسروں سے کی جائے۔ مگر میرے خیال میں ہندوستان میں برطانوی قوت قائم رکھنے کی خواہش بیرونی حملے کے خوف پر مبنی نہیں بلکہ اس کی ضرورت اس وجہ سے محسوس کی جاتی ہے کہ وہ مستقل حقوق کے مالکوں کو خود ہندوستانیوں سے، یعنی خالص جمہوریت سے اور عام لوگوں کے غلبے سے بچائے۔

غرض گول میز کانفرنس کے ہندوستانی نمائندے یعنی نہ صرف وہ لوگ جو کھلے ہوئے رجعت پسند اور فرقہ پرست تھے بلکہ وہ بھی جو اپنے آپ کو ترقی پسند اور قوم پرست کہتے تھے، برطانوی حکومت کے ساتھ بہت سی مشترک اغراض رکھتے تھے۔ ہم حیران تھے کہ لفظ قوم پرستی کا مفہوم کس قدر وسیع ہے کہ اس کے دائرے میں ان لوگوں کے علاوہ وہ جو جنگ آزادی میں شریک ہو کر جیل بھیجے گئے وہ لوگ بھی

آ جاتے ہیں جو ہمارے قید کرنے والوں سے مصافحہ کر کے ان کی صف میں شامل ہو گئے اور ان کے ساتھ مل کر ایک متحدہ پالیسی پر غور کرنے لگے۔ ان کے علاوہ ہمارے ملک میں بہادر اور لسان قوم پرستوں کا ایک اور گروہ تھا جو دل و جان سے سودیشی کی حمایت میں مصروف تھے اور ہم سے کہتے تھے کہ یہی سوراج کی جان ہے اور اپنے ہم وطنوں سے درخواست کرتے تھے کہ وہ اس کی خاطر قربانی نہیں کرنی پڑی بلکہ ان کے کاروبار کو اور انھیں خوب منافع ہوا۔ دوسرے لوگ جیل جارہے تھے یا لاٹھیاں کھا رہے تھے اور وہ اپنی دکانوں میں بیٹھے روپے گن رہے تھے۔ آگے چل کی جب جارحانہ قوم پرستی ذرا خطرناک چیز ہوگئی تو انھوں نے اپنی تقریروں کی لی دھیمی کردی۔ "انتہا پسندوں" کو برا بھلا کہنے لگے اور حکومت سے معاہدے کرنے لگے۔

سچ پوچھئے تو ہمیں اس کی کچھ پروانہ تھی کہ گول میز کانفرنس کیا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ ہم سے بہت دور ایک بے اصل اور بے جان چیز تھی۔ اصل کش مکش ہمارے شہروں اور گاؤں میں ہوری تھی۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہماری کوشش جلد ختم ہونے والی نہیں اور ہمیں بہت سے خطروں کو سامنے ہے۔ پھر بھی ۱۹۳۰ء کے واقعات کو دیکھ کر ہمیں یہ بھروسا ہو گیا تھا کہ ہماری قوم میں بڑی قوت اور بڑا دم ہے اور یہ بھروسا دل میں لئے ہوئے ہم مستقبل کا مقابلہ کر رہے تھے۔

آخر دسمبر یا شروع جنوری میں ایک بات ایسی ہوئی جس سے ہمیں سخت صدمہ پہنچا۔ سری نواس شاستری صاحب نے اڈنبرا میں (جہاں انھیں غالباً اعزازی شہریت پیش کی گئی تھی) اپنی تقریر کے دوران میں کسی قدر حقارت کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر کیا جو ہندوستان میں سول نافرمانی کے سلسلے میں قید ہو رہے تھے۔ ان کی یہ تقریر خصوصاً اس موقع پر ہمارے دل میں نشتر کی طرح چبھ گئی اس لئے کہ سیاسی اختلافات کے باوجود ہم ان کی عزت کرتے تھے۔

مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے گول میز کانفرنس کو برخواست کرتے ہوئے حسب معمول ایک برادرانہ تقریر کی اور اس میں اشارتاً کانگریس سے اپیل کی کہ اپنی بدعنوانیوں کو چھوڑ کر اس مبارک برادری میں شامل ہو جائے۔ اس زمانے میں یعنی وسط جنوری ۱۹۳۱ء میں الہ آباد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور دوسرے مسائل کے سلسلے میں مسٹر میکڈانلڈ کی اس تقریر اور اس پر بھی غور کیا گیا۔ میں ان دنوں نینی جیل میں تھا اور رہا ہونے کے بعد مجھے اس جلسے کی کاروائی کا حال معلوم ہوا۔ والد ابھی کلکتے سے واپس آئے ہوئے تھے اور اگرچہ ان کی طبیعت بہت خراب تھی، لیکن ان کے اصرار سے بس ممبران کے بستر کے گرد جمع ہو کر اس مسئلے پر بحث کرر ہے تھے۔ کسی نے یہ رائے دی کہ مسٹر میکڈانلڈ کی دلجوئی کی لئے ہمیں سول نافرمانی کی تحریک دھیمی کر دینی چاہئے۔ اس سے والد کو غصہ آ گیا۔ وہ جوش میں اٹھ بیٹھے اور کہنے لے کہ جب تک ہمارا قومی مقصد حاصل نہ ہو جائے میں ہرگز صلح کے لئے تیار نہیں۔ اگر اور سب میدان سے ہٹ جائیں گے تو میں اکیلا لڑوں گا۔ یہ اشتعال ان کے لئے بہت مضر تھا اور ان کا بخار اور تیز ہو گیا۔ آخر ڈاکٹروں نے کسی نہ کسی طرح لوگوں کو ہٹایا کہ انھیں تنہائی میں کچھ سکون ہو۔

زیادہ تر ان کی وجہ سے ورکنگ کمیٹی نے ایک سخت رزولیوشن پاس کیا مگر اس کے شائع ہونے سے پہلے سر تیج بہادر سپرو اور سری نواس شاستری صاحب کا تار والد کے نام پہنچا جس میں ان کے ذریعہ سے کانگریس سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ ان دنوں حضرات سے گفتگو کرنے سے پہلے کوئی فیصلہ نہ کرے۔ وہ انگلستان سے روانہ ہو چکے تھے۔ اور عنقریب ہندوستان پہنچنے والے تھے۔ انھیں یہ جواب دیا گیا کہ کانگریس پہلے ہی ایک روزلیوشن (۱) پاس کر چکی ہے۔ مگر یہ اس وقت تک اخباروں میں شائع نہیں کیا جائے گا جب تک آپ آ کر ہم سے گفتگو نہ کر لیں۔

ہمیں جیل کے اندر خبر نہ تھی کہ باہر یہ کچھ ہو رہا ہے۔ البتہ اتنی سن گن مل گئی تھی

کہ کوئی نیا قصہ چھڑا ہوا ہے اور اس سے ہمیں کسی قدر تشویش تھی، مگر سب سے زیادہ فکر ہمیں اس کی تھی کہ ۲۶ جنوری یعنی یوم آزادی قریب ہے دیکھئے یہ کس طرح منایا جاتا ہے۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اس دن سارے ملک میں عام جلسے ہوئے جس میں آزادی کے رزولیوشن کی توثیق کی گئی اور اسی مضمون کی ایک تجویز "یادآوری کے روزولیوشن" کے نام سے پاس کی گئی۔ اس سال یوم آزادی کے منانے کا انتظام کرنا" ایک حیرت انگیز" کارنامہ تھا اس لئے کہ نہ تو اخباروں اور مطبعوں سے کوئی مدد مل سکتی تھی اور نہ ڈاک اور تارے سے کام لیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی سارے ملک میں بے شمار قصبوں اور دیہات میں قریب قریب ایک ہی وقت جلسے کئے گئے اور ان میں ایک ہی مضمون کا رزولیوشن پاس ہوا۔ ان میں سے اکثر جلسے قانونی ممانعت کے باوجود منعقد ہوئے اور پولیس نے انھیں زبردستی منتشر کر دیا۔

ہم ۲۶ جنوری کو بنی جیل میں بیٹھے، جانے والے سال کے واقعات اور آنے والے سال کی توقعات پر غور کر رہے تھے۔ دوپہر کے قریب یکایک اطلاع ملی کہ والد کی حالت نازک ہے اور مجھے فوراً گھر جانا چاہیے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میری رہائی کا حکم ہو گیا ہے۔ رنجیت بھی میرے ساتھ روانہ ہوئے۔

اسی روز شام کو سارے ہندوستان کے جیلوں سے اور بہت سے لوگ بھی رہا کئے جا رہے تھے۔ یہ سب ورکنگ کمیٹی کے اصل یا قائم مقام ممبر تھے۔ حکومت انھیں موقع دے رہی تھی کہ ایک جگہ جمع ہو کر صورت حال پر غور کریں۔ چنانچہ میں بھی شام کو بہر حال رہا ہو جاتا۔ مگر والد کی حالت کے خراب ہو جانے کی وجہ سے چند گھنٹے پہلے چھوڑ دیا گیا تھا۔ کملا بھی ۲۶ دن قید رہنے کے بعد اس روز لکھنؤ جیل سے رہا کر دی گئی۔ اس لئے کہ وہ بھی ورکنگ کمیٹی کی قائم مقام ممبر تھی۔

---

(۱) یہ روزلیشن کتاب کے آخر میں ضمیمہ (ج) میں درج ہے۔

میرے والد کی وفات

میں نے اپنے والد کو دو ہفتے کے بعد دیکھا، اس سے پہلے وہ ۱۲ جنوری کو مجھ سے ملنے نینی گئی تھے اور اس وقت میں ان کی صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اب ان کی حالت اور بھی خراب تھی، چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سوج گیا تھا۔ ان سے بات نہیں کی جاتی تھی اور ان کے حواس بھی بعض وقت ٹھیک نہیں رہتے تھے مگر ان کے ارادے کی مضبوطی کا وہی حال تھا اور اسی کی وجہ سے ان کا جسم اور دماغ کام کرتا رہا۔

وہ مجھے اور رنجیت کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ دو ایک روز کے بعد رنجیت (جو ورکنگ کمیٹی کے زمرے میں نہیں آئے تھے) پھر نینی جیل بھیج دئے گئے۔ اس کا والد کو بہت قلق ہوا وہ بار بار انھیں پوچھتے اور شکایت کرتے کہ لوگ دور دور سے انھیں دیکھنے آتے ہیں مگر ان کا داماد ان سے چھڑا لیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کو ان کی اس بے چینی سے تشویش تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے لئے اچھا نہیں ہے۔ تین چار روز کے بعد غالباً ڈاکٹروں کی تحریک سے صوبہ متحدہ کی حکومت نے رنجیت کو رہا کر دیا۔

۲۶ جنوری کو جس دن میری رہائی ہوئی گاندھی جی بھی یرودا جیل سے رہا کر دئے گئے۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ انہیں الہ آباد بلاؤں اور جب میں نے ان کی رہائی کا ذکر والد سے کیا تو انھوں نے بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دوسرے ہی دن گاندھی جی خیر مقدم کے ایک زبردست جلسے کے بعد، جیسا بمبئی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ وہ رات گئے الہ آباد پہنچے مگر والد انکے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کے آنے سے اور تسلی کے چند کلموں سے جو انھوں نے کہے والد کو بہت سکون ہوا اور میری والدہ کو بہت ہی تسکین ہوئی۔

اس زمانے میں ورکنگ کمیٹی کے اصلی اور قائم مقام ممبر جو قید سے رہا ہوئے تھے بیکار بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ جلسے کی کوئی اطلاع آئے۔ ان میں

سے بہت سے والد کی طرف سے فکرمند تھے اور فوراً الہ آباد آنا چاہتے تھے چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ جلسہ فوراً کیا جائے اور ان سب کو الہ آباد بلا لیا جائے۔ دو روز کے بعد ان میں سے تیس چالیس پہنچ گئے اور ان کا جلسہ سوراج بھون میں ہوا۔ جو ہمارے گھر سے ملا ہوا ہے۔ میں کبھی کبھی ان جلسوں میں جایا کرتا تھا مگر اس قدر بدحواس تھا کہ ان میں اچھی طرح حصہ نہیں لے سکتا تھا اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ ان میں کیا فیصلہ کیا گیا۔ غالباً یہی طے ہوا کہ سول نافرمانی جاری رکھی جائے۔

یہ سب پرانے دوست اور رفیق جو وہاں موجود تھے، جن میں سے اکثر سیدھے جیل سے چھوٹ کر آئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کوئی دن میں پھر قید کر دئے جائیں گے والد سے مل کر ان کو خدا حافظ کہنا چاہتے تھے۔ غالب خیال یہی تھا کہ اس کے بعد ان کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ وہ صبح اور شام کے وقت دو دو تین تین کر کے آتے تھے اور والد بڑے اصرار سے آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنے رفیقوں سے ملتے تھے۔ یوں تو وہ بت بنے بیٹھے رہتے تھے اس لئے کہ ان کے چہرے کو جو حالت تھی اس کی وجہ سے کوئی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی، مگر جب ان کے دوست اور رفیق ایک ایک کر کے آتے تو ان کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا کہ وہ انھیں پہچانتے ہیں۔ ان کا سر کسی قدر جھک جاتا اور ان کے ہاتھ پرنام کرنے کے لئے جڑ جاتے۔ انھیں بات کرنی مشکل تھی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے۔ ان کی طاقت جواب دے چکی تھی مگر ان کے چہرے سے شاہانہ جلال ٹپکتا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے ان کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہوں گے۔ خدا معلوم انھیں ہماری جدوجہد میں کوئی دلچسپی باقی ہے یا نہیں؟ ان کے چہرے سے اکثر ایک اندرونی کشمکش کے آثار ظاہر ہوتے تھے جیسے خیالات کا سلسلہ ان کے قابو سے نکلا جاتا ہو اور وہ اسے پکڑنا چاہتے ہوں۔ یہ کش مکش آخر وقت تک جاری رہی انھوں نے ہار نہیں مانی۔ کبھی کبھی وہ بالکل ہوش و حواس کی

باتیں کرنے لگتے تھے۔ اس وقت بھی جب ان کے گلے سے بالکل آواز نہیں نکلتی تھی وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے کاغذ کے پرچوں پر لکھ دیتے تھے۔

انھیں ورکنگ کمیٹی کے جلسوں سے جو برابر کے مکان ہو رہے تھے تقریباً کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ دو ہفتے پہلے انھیں ان چیزوں سے بہت جوش آتا مگر اب انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان سے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے ایک بار گاندھی جی سے کہا" مہاتما جی اب میرا اچل چلاؤ ہے۔ میں سوراج دیکھنے کے لئے نہیں رہوں گا۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ نے لڑائی جیت لی اور سورج آنے ہی والا ہے۔"

اکثر لوگ جو دوسرے شہروں اور صوبوں سے انھیں دیکھنے آئے تھے رخصت ہو گئے صرف گاندھی جی اور چند خاص دورت اور عزیز رہ گئے۔ تینوں مشہور ڈاکٹر یعنی مختار احمد انصاری، بدھان چندر رائے اور جیوراج مہتا جوان کے پرانے دوست تھے اور جن کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی جان ان کے سپرد کر دی ہے، آخر تک ساتھ رہے۔ چوتھی فروری کی صبح کو ان کی طبیعت بظاہر کچھ سنبھل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں لکھنؤ لے جائیں جہاں ایکسرے کے علاج کے لئے الہ آباد سے زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ اس دن ہم انھیں موٹر سے لکھنؤ لے گئے اور گاندھی جی مع اور بہت سے لوگوں کے ہمارے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر پھر بھی وہ بتہ مضمحل ہو گئے۔ دوسرے دن بظاہر کچھ سنبھل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں لکھنؤ لے جائیں جہاں ایکسرے کے علاج کے لئے الہ آباد سے زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ اس دن انھیں موٹر سے لکھنؤ لے گئے اور گاندھی جی مع اور بہت سے لوگوں کے ہمارے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر پھر بھی وہ مضمحل ہو گئے۔ دوسرے دن بظاہران کی تکان دور ہو گئی مگر اور آثار کچھ اچھے نہ تھے۔ اگلے دن یعنی

چھ فروری کو صبح تڑکے میں ان کی پٹی کے پاس بیٹھا تھا رات بھر انھیں بڑی تکلیف اور بے چینی رہی تھی۔ دفعتاً مجھے ان کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آئے اور بے چینی کی کیفیت دور ہوگئی۔ میں یہ سمجھ کر خوش ہوا کہ انھیں نیند آگئی ہے مگر میری والدہ حقیقت کو سمجھ گئیں اور چیخ کر رونے لگیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ خاموش رہئے۔ ان کو نیند ان کی آخری نیند تھی جس سے انھیں کوئی نہیں جگا سکتا تھا۔

ہم اسی دن انکی لاش موٹر سے الہ آباد لے گئے۔ میں اسی گاڑی میں بیٹھا تھا اور اسے چلا رہا تھا۔ والد کا معتمد خدمت گار ہری بھی ہمارے ساتھ تھا۔ دوسری گاڑی میں والدہ اور گاندھی جی تھے۔ اس کے پیچھے اور گاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ میری عقل خبط تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہوگیا۔ مسلسل واقعات اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ لکھنؤ میں لوگوں کا زبردست مجمع جو یہ خبر سنتے ہی اکٹھا ہوگیا تھا، لاش کو قومی جھنڈے میں لپیٹ کر موٹر میں جس پر ایک بڑا سا جھنڈا لگا ہوا تھا لکھنؤ سے الہ آباد لے جانا، الہ آباد پہنچنا تعزیت کرنے والوں کا ہجوم جو میلوں تک چلا گیا تھا، یہ سب باتیں مجھے خواب سی یاد ہیں۔ گھر پر کچھ رسمیں ادا کی گئیں اور اس کے بعد آرتھی بے شمار مجمع کے ساتھ گنگا کی طرف روانہ ہوئی۔ جاڑے کی شام تھی اندھیرا چھا رہا تھا، گنگا کے کنارے بڑے بڑے شعلے اٹھ رہے تھے اور اس جسم کو جلا کر خاک کر رہے تھے جو ہم خاندان والوں کو اور ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کو دل و جان سے عزیز تھا۔ گاندھی جی نے مجمع کو مخاطب کر کے ایک چھوٹی سے تقریر کی اور اس کے بعد ہم سب خاموشی سے اپنے اپنے گھر چلے آئے۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ہم انتہائی کا درد اور غم کا بوجھ دل پر لئے ہوئے واپس آ رہے تھے۔

میرے اور والدہ کے نام ہمدردی کے ہزاروں پیام آئے۔ لارڈ ارون اور لیڈی ارون نے بھی مناسب الفاظ میں ہمدردی کا اظہار کیا۔ لوگوں کی اس بے

پایاں دلسوزی اور ہمدردی سے ہمارے دل میں درد کی کھٹک کچھ کم ہوئی مگر سب سے بڑھ کر جس چیز نے میری والدہ کو اور ہم سب کو اس جانکاہ صدمے کے برداشت کرنے میں مدد دی وہ گاندھی جی کی موجودگی تھی۔ جن میں غمزدوں کو تسکین دینے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی عجیب وغریب قوت ہے۔

مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ والد ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ تین مہینے کے بعد میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ لنکا گیا ہوا تھا اور نوارا ایلیا میں چند روز کے لئے سکون واطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتۃً مجھے خیال آیا کہ والد کو یہاں کی آب وہوا راس آئے گی۔ لاؤ ان کو بلا بھیجیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں کچھ دن آرام کرلیں گے۔ میں ان کے نام الہ آباد تار بھیجتے بھیجتے رہ گیا۔

لنکا سے الہ آباد واپس آنے کے بعد دن ڈاک میں ایک عجیب خط آیا۔ لفافہ پر میرا پتہ والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور خدا جانے کن کن ڈاکخانوں کے بے شمار مہریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی حیرت سے اسے کھولا تو معلوم ہوا کہ واقعی والد کا خط ہے مگر ۲۸ فروری ۱۹۲۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مجھے ۱۹۳۱ء کے وسط میں، یعنی ساڑھے پانچ سال کے بعد ملا۔ والد نے یہ خط ۱۹۲۶ء میں میرے اور کملا کے یورپ روانہ ہونے سے ایک روز پہلے احمد آباد سے لکھا تھا اور اطالوی لائڈ کمپنی کے اس جہاز کے پتے سے، جس سے ہم روانہ ہونے والے تھے بمبئی بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاز کی روانگی کے بعد پہنچا اور پھر خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ کسی من چلے نے میرے پاس بھیج دیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ الوداعی خط تھا۔

دہلی کا معاہدہ

جس روز میرے والد کا انتقال ہوا اسی دن، بلکہ قریب قریب اسی وقت گول میز کانفرنس کے بہت سے ممبر بمبئی میں جہاز سے اترے۔ سری نواس شاستری صاحب، سرتیج بہادر سپرو اور شاید بعض حضرات جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا، سیدھے الہ آباد پہنچے۔ گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبر وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ہمارے گھر پر چند نجی جلسے ہوئے جن میں گول میز کانفرنس کے حالات بیان کئے گئے۔ سب سے پہلے ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ سری نواس شاستری صاحب نے خود بخود اپنے الفاظ پر، جو انھوں نے اڈنبرا میں کہے تھے افسوس ظاہر گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ''میں اپنے ماحول سے بہت متاثر ہو جاتا ہوں اور ''جوش خطابت'' کے سیلاب میں بہہ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہوں''

گول میز کانفرنس کے نمائندوں نے سوائے ان باتوں کے جو ہمیں پہلے سے معلوم تھیں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ البتہ انھوں نے یہ ضرور بتایا کہ پردے کے پیچھے کیا سازشیں ہو رہی تھیں، فلاں ''سر'' نے کیا فرمایا تھا۔ اور فلاں لارڈ نے کیا ارشاد کیا تھا۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ ہمارے دوست ہندوستانی اعتدال پسند، بڑے بڑے حکام کی ذاتی گفتگو اور گپ شپ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اصولی باتوں اور ہندوستانی کے واقعی حالات کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ اس بے ضابطہ گفت و شنید کا جو اعتدال پسند لیڈروں سے ہو رہی تھی، کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہوا کہ گول میز کانفرنس بالکل بیکار چیز ہے۔ کسی شخص نے یہ رائے دی کہ گاندھی جی وائسرائے کو خط لکھیں کہ میں آپ سے مل کر صاف صاف باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے۔ اگرچہ میرے خیال میں انھیں یہ امید نہیں تھی کہ اس سے کوئی نتیجہ نکلے گا مگر اصولاً وہ اپنے مخالفوں سے ملنے اور ان سے ہر مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ انھیں اپنے خیال کے صحیح

ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتے تھے میں حریف کو قائل کرلوں گا۔ مگر ان کا مقصود صرف قائل کرنا ہی نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ مخالفوں کے دل پر اثر پڑے، غصے اور بے اعتمادی کی دیواریں جو بیچ میں حائل ہیں، ہٹ جائیں اور انسانیت کے لطیف جذبات ابھر آئیں۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ بات حاصل ہوگئی تو لوگوں کو قائل کرنا آسان ہے اور اگر وہ قائل نہ بھی ہوں تو مخالفت کا جوش گھٹ جاتا ہے اور اس میں وہ تلخی نہیں رہتی۔ اپنے مخالفوں سے شخص طور پر معاملہ کرنے میں انھیں اکثر فتح حاصل ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ محض اپنی شخصیت کے اثر سے وہ دشمن کو دوست بنالیتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو ان پر نکتہ چینی کرتے تھے اور رہتے تھے ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے معترف بن گئے یا اگر مخالف بھی رہے تو ان کی مخالفت میں تضحیک کا رنگ مطلق نہیں رہا۔

گاندھی جی کو اپنی اس قوت کا احساس تھا اس لئے وہ اپنے مخالفوں سے ملنے کے لئے ہمیشہ خوشی سے تیار رہتے تھے۔ مگر افراد سے شخصی معاملات یا چھوٹے چھوٹے مسائل میں نبٹنا اور بات تھی اور برطانوی حکومت جیسی لاشخصی قوت سے جو شہنشاہی کے نشے میں سرشار تھی مقابلہ کرنا بالکل دوسری چیز تھی۔ اس لئے جب گاندھی لارڈ ارون سے ملنے گئے تو انھیں کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں تھی۔ سول نافرمانی کی تحریک ابھی تک جاری تھی۔ اگرچہ حکومت سے گفت وشنید کی خبریں مشہور ہونے کی وجہ سے اس کا زور کم ہوگیا تھا۔

ملاقات فوراً منظور کرلی گئی اور گاندھی جی دہلی روانہ ہوگئے۔ انھوں نے چلتے وقت ہم سے کہا کہ اگر وائسرائے سے ایسی گفتگو ہوئی جس سے واقعی کسی عارضی تصفیے کی امید ہوئی تو وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو بھی بلا بھیجیں گے۔ چند روز کے بعد ہم سب دہلی طلب کئے گئے تین ہفتے ہم وہاں رہے اور روزانہ طول طویل تھکا دینے

والی بحثیں ہوتی رہیں۔ گاندھی جی برابر لارڈ ارون سے ملتے رہے۔ مگر کبھی کبھی تین چار دن کا وقفہ بھی ہو جاتا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس عرصے میں حکومت ہند انڈیا آفس سے تبادلہ خیالات کرتی تھی بعض بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں یا الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے گاڑی رک جاتی تھی۔ ان میں سے ایک سول نافرمانی کے ''التوا'' کا لفظ بھی تھا۔ گاندھی جی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سول نافرمانی ہمیشہ کے لئے ترک نہیں کی جاسکتی اس لئے کے عام لوگوں کے ہاتھ میں یہی ایک ہتھیار ہے۔ البتہ یہ تحریک ملتوی ہوسکتی ہے۔ لارڈ ارون کو اس لفظ پر اعتراض تھا اور وہ چاہتے تھے۔ کہ ترک کا لفظ استعمال کیا جائے مگر اسے گاندھی جی نہیں مانتے تھے۔ آخر کار ''موقوف'' کے لفظ پر فیصلہ ہوا۔ بدیسی کپڑے اور شراب کی دکانوں کی پکٹنگ پر بڑی بحث رہی۔ ہمارا وقت زیادہ تر عارضی معاہدے کے شرطوں پر غور کرنے میں صرف ہوتا تھا، اور بنیادی مسائل پر بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ غالباً لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان بنیادی معاملات پر آگے چل کر بہتر فضا میں غور کیا جائے گا جو عارضی تصیفہ ہو جانے اور روزمرہ کی لڑائی موقوف ہونے کے بعد پیدا ہوگئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس وقت محض ایک عارضی صلح کی گفتگو ہو رہی ہے اور اس کے بعد اصل اختلافی مسائل پر بحث کرنے کی باری آئے گی۔

ان دنوں دلی میں طرح طرح کے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ بہت سے غیر ملکی خصوصاً امریکی اخباروں کے نامہ نگار تھے، جو ہم سے اس بات پر خفا تھے کہ ہم انھیں کچھ بتاتے نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ انھیں گاندھی جی اور لارڈ ارون کی گفتگو کی خبریں ہم سے زیادہ دہلی کے سیکریٹریٹ سے ملتی ہیں اور یہ بالکل صحیح تھا۔ ان کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے لوگ گاندھی جی کے سلام کے لئے آئے تھے کیونکہ آج کل مہاتما کا ستارہ عروج پر تھا۔ بڑے مزے کا تماشا تھا کہ جو لوگ کبھی گاندھی جی اور کانگرس کے پاس بھی نہیں بھٹکے اور اکثر انھیں برا بھلا کہتے رہے اور اس کی تلافی

کرنے کے لئے دوڑے آتے تھے۔ بظاہر کانگرس کی بن آئی تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔ مصلحت اسی میں تھی کہ کانگرس کے لیڈروں سے بھی بنائے رکھیں۔ ایک سال کے بعد ان حضرات کا رنگ پھر بدلا اور انھوں نے بڑے زور شور سے کانگرس سے نفرت اور بیزاری کا اظہار شروع کر دیا۔

فرقہ پرستوں میں بھی ان معاملات سے ایک اہل چل مچ گئی اور وہ گھبرائے کہ کہیں نہیں دور میں ان کی بات نہ بگڑ جائے چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگ مہاتما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں یقین دلایا کہمفر قہ وارانہ مسئلے تصفیہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ اگر آپ اس معاملے میں پیش قدمی کریں تو فوراً فیصلہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر انصاری کے مکان پر جہاں گاندھی جی اور ہم میں اکثر ٹھہرے ہوئے تھے، لوگوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا اور فرصت کے اوقات میں ہم انھیں دیکھ کر لطف اور فائدہ اٹھاتے تھے۔ چند سال سے ہمیں صرف شہروں اور گانوؤں کے غریبوں سے اور جیل کے قیدیوں سے سابقہ رہا تھا۔ ان ارباب دولت میں جو گاندھی جی سے ملنے آتے تھے، ہمیں انسانی فطرت کا ایکاور پہلو نظر آیا۔ یہ حضرت ہوا کے رخ پر چلتے تھے اور جہاں قوت اور اقتداری کی بو پاتے تھے، مسکراتے ہوئے جا پہنچتے تھے۔ ان میں سے اکثر ہندوستان کی برطانوی حکومت کے محکم ستون تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ اگر ہندوستان میں کوئی اور حکومت ہو گی تو یہ اسی طرح اس کے محکوم ستون بھی بن جائیں گے۔

گاندھی جی صبح تڑکے چہل قدمیکے لئے نئی دہلی جاتے تھے اور میں اکثر انکے ساتھ جایا کرتا تھا۔ ان سے گفتگو کرنے کا یہی ایک وقت تھا اس لئے کہ دن کے بقیہ حصے میں انکیاوقات چھوٹے چھوٹے حصوں میں سب بٹ جاتے تھے اور ہر لمحے کسی کام کے لئے یا کسی شخص کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ صبح کی چہل قدمی میں بھی کبھی

ملاقات کرنے والے خصوصاً غیر ملکی لوگ شریک ہو جاتے تھے یا کوئی دوست ذاتی
معاملات کرنے والے خصوصاً غیر ملکی لوگ شریک ہو جاتے تھے یا کوئی دوست ذاتی
معاملات میں مشورہ کرنے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ ہم دونوں ماضی، حال اور خصوصاً
مستقبل کے بہت سے امور کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار
کانگرس کے مستقبل کے بارے میں انکے ایک خیال کو سن کر میں حیرت میں رہ گیا۔
میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ جب آزادی مل جائے گی تو کانگرس خود بخود ختم ہو جائے گی مگر
ان کی رائے تھی کہ نہیں کانگرس کو باقی رہنا چاہئے مگر اس شرط پر، کہ وہ ایثار سے کام
لے کر خود ہی یہ ضابطہ بنا دے کہ اس کا کوئی ممبر تنخواہ دار سرکاری ملازمت قبول نہ
کرے گا اور اگر کوئی شخص عہدہ حاصل کرنا چاہے تو اسے کانگرس کی ممبری سے استفاد
دینا ہوگا۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ انھوں نے اس کے لئے کیا دلیلیں پیش کی تھیں مگر
اصل مفہوم یہ تھا کہ اپنی بے تعلقی اور بے غرضی کی وجہ سے کانگرس وزارتوں
اور حکومت کے دوسرے محکموں پر زبردست اخلاقی اثر ڈال سکے گی اور انھیں راہ
راست سے ہٹنے نہیں دے گی۔

یہ ایک عجیب و غریب خیال ہے اور میرے لئے اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔
مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ بہ فرض محال اگر اس قسم کی کوئی جماعت ہو بھی تو ارباب غرض
اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ مگر عملی پہلو سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو اس
گاندھی جی کے طرز خیال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جو چیز انھیں مدنظر ہے اس
کا تصور جدید سیاسی پارٹی کے بالکل برعکس ہے جو اس غرض سے قائم کی جاتی ہے کہ
حکومت پر قبضہ کر کے ملک کے سیاسی اور معاشی نظام کی تشکیل اپنے اصولوں کے
مطابق کرے اور اس قسم کے پارٹی سے بھی مختلف جو آج کل اکثر دیکھنے میں آتی ہے
اور (بہ قول مسٹر۔ہ ثانی کے) زیادہ سے زیادہ گدھوں کو زیادہ خشکہ کھلانے کے سوا
کوئی کام نہیں کرتی۔

گاندھی جی کے ذہن میں جمہوریت کا ایک مافوق الطبیعی تصور ہے۔ اسے اکثریت، یا نمائندگی کے رسمی طریقے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بنا خدمت اور ایثار پر ہے اور اس میں صرف اخلاقی اثر سے کام لیا جاتا ہے۔ اپنے ایک بیان میں جا حال (۷ ستمبر ۱۹۳۴ء) ہی میں شائع ہوا ہے، انھوں نے جمہوریت پسند کی نئی تعریف کی ہے۔ ان کا دعوی ہے کہ وہ پیدائشی جمہوریت پسند ہیں اور اس سلسلے میں فرماتے ہیں "غریب سے غریب آدمیوں کی دل و جان سے حمایت کرنا، ان کی سی زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھنا اور حتی الامکان انکے معیار تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔ اگر جمہوریت پسند ہوں۔" آگے چل کر وہ جمہوریت کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ کانگرس کی جمہوریت اور اس کے اثر کی بنا ان نمائندوں کی تعداد پر نہیں جو اسکے سالانہ اجلاس میں شریک ہوتے ہیں بھلکہ اس روز افزوں خدمت پر ہے جو وہ اب تک انجام دیتی رہی ہے۔ مغربی جمہوریت معرض امتحان میں ہے اور اس کی ناکامیابی ثابت ہوچکی ہے۔ خدا کرے ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہو کہ وہ جمہوریت کے ایک صحیح علم کی بنا ڈالے اور اس کی کامیابی آنکھوں سے دکھا دئے"

"بددیانتی اور ریاکری جمہوریت کا لازمی نتیجہ نہیں ہونا چاہیئے اگر چہ آج کل یقیناً ایسا ہی ہے۔ کثرت تعداد کو جمہوریت کا نفسی معیار قرار دینا غلطی ہے۔ یہ بات جمہوریت کے منافی نہیں کہ چند آدمی اپنی قوم کی روح اس کی امیدوں اور حوصلوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ میرا دعوی ہے کہ جمہوریت کا نفسی معیار قرار دینا غلطی ہے۔ یہ بات جمہوریت کے منافی نہیں کہ چند آدمی اپنی قوم کی روح اس کی امیدوں اور حوصلوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ میرا دعوی ہے کہ جمہوریت تشدد کے طریقوں سے نشوونما نہیں پا سکتی۔ جمہوریت کی روح کسی قوم میں باہر سے زبردستی

نہیں پھونکی جاسکتی بلکہ اندر سے خود بخود ابھرتی ہے۔"

جیسا کہ گاندھی جی خود تسلیم کرتے ہیں، ان کی جمہوریت مغربی جمہوریت نہیں ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہ کسی حد تک اشتمالیوں کے تصور جمہوریت سے مشابہت رکھتی ہے کیونکہ اس میں بھی مافوق الطبعی رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اشتمالیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بعض اوقات یہ دعوی کرتی ہے کہ وہ جمہور کی خواہشات اور ضروریات کی نمائندہ ہے خواہ جمہور کو خود ان خبروں کا احساس بھی نہ ہو۔ ان کے ذہن میں جمہور کا ایک مافوق الطبعی تصور ہے اور وہ اسی کی نمائندگی کا دعوی کرتے ہیں۔ مگر یہ مشابہت بہت خفیف ہے۔ دونوں کے اصول اور عمل میں خصوصاً طریق کار اور تشدد کے معاملے میں بڑا زبردست اختلاف ہے۔

خواہ گاندھی جی جمہوریت پسند ہوں یا نہ ہوں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے نمائندے ہیں اور محض نمائندے ہی نہیں بلکہ ان کی روح رجتماعی کے اوتار بن گئے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا ذہنی معیار کسانوں کے برابر ہے۔ وہ اعلی دماغ، لطیف جذبات، نفیس مذاق اور وسیع تخیل رکھتے ہیں۔ ان میں تمام انسانی صفات موجود ہیں، مگر اصل میں وہ ایک سادھو ہیں جس نے ضبط نفس کی بدولت اپنی خواہشات اور جذبات کو روحانیت کی بلند سطح دیا ہے۔ ان کی زبردست شخصیت مقناطیس کی سی کشش رکھتی ہے اور لوگوں کے دل میں محبت اور عقیدت کے شدید جذبات پیدا کرتی ہے۔ بھلا ایک کسان میں یہ باتیں کہاں سے آسکتی ہیں؟ مگر اس کے باوجود مہا کسان ہیں، دنیا کو ایک کسان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کسانوں ہی کا مالک ہے اور گاندھی جی اپنے ملک کے رگ وریشے سے واقف ہیں۔ ان کا ہاتھ ہندوستان کی نبض پر رہتا ہے اور وہ اس کی خفیف سی حرکت کو پہچانتے ہیں۔ وہ قریب قریب وجدانی طور پر صورت حال کا بالکل صحیح اندازہ کر لیتے ہیں۔ انھیں تنت کے وقت کام کرنے کا ڈھب

خوب آتا ہے۔

ان کی ذات نہ صرف برطانوی حکومت کے لئے بلکہ خود ان کے ہموطنوں اور ہمدموں کے لئے ایک معما ہے۔ غالباً موجودہ زمانے میں کسی اور ملک میں ان کا وجود بے محل ہوتا۔ مگر ہندوستان اب تک پاپ اور مکتی اور اہنسا کا نام لینے والے دھرماتماؤں کی بات سمجھتا ہے اور سمجھتا نہیں تو مانتا ضرور ہے۔ اس ملک کی دیو مالا ان سادھوؤں کی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے، جنھوں نے اپنے تیاگ اور تپسیا کے زور سے ''نیکی کا پہاڑ'' بنا کر کھڑا کر دیا ہے جس نے بعض چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور دنیا ن میں کایا پلٹ کر دی۔ جب میں گاندھی جی کی حیرت انگیز قوت عمل اور قوت نفس دیکھتا ہوں جو روحانیت کے کسی لازوال سرچشمہ سے ابلتی چلی آئی ہے تو مجھے اکثر ان کہانیوں کا دھیان آ جاتا ہے۔ وہ دنیا کی معمولی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ کسی اور ہی نایاب دھات کے بنے ہوئے ہیں اور اکثر ان کی آنکھوں میں ایک نامعلوم حقیقت کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

سارے ہندوستان پر، یہاں تک کہ اس کی شہری زندگی بلکہ اس کی نئی صنعتی زندگی پر بھی کسانوں کا رنگ غالب ہے۔ اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے اپنے اس سوت بیٹے کو جو اس سے اس قدر مشابہ ہے اور پھر بالکل الگ بھی ہے۔ اپنا محترم اور محبوب لیڈر بنا لیا۔ اس شخص نے ہندوستان کو پرانے بھولے ہوئے قصے یاد دلا دئے۔ اور اس کی آنکھوں کو خود اس کی روح کی جھلک دکھا دی۔ ہمارا ملک حال کی مصیبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا بے کسی کے عالم میں ماضی کے بے جان کہانیوں اور مستقبل کے دھندلے خوابوں سے دل بہلایا کرتا تھا، مگر اس نے آ کر اس کے نراس دل کو آس اور اس کے خستہ جسم کو طاقت بخشی اور اس کی نظروں میں مستقبل کا ایک دلکش نقشہ پھرنے لگا۔ دو چہروں والے دیوتا جنیں کی طرح وہ ادھر

ماضی اور ادھر مستقبل کا منظر دیکھ رہا ہے اور دونوں کو ملا کر ایک ہم آہنگ مرقع بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہم میں سے اکثر کسانوں کے طرز خیال اور قدیم مذہب و معاشرت سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم جدید زمانے کے لوگ ہیں اور ہمارے ذہن میں "ترقی" مشینوں کی صنعت، بہتر معیار زندگی اور اجتماعی تنظیم کے خیالات بسے ہوئے ہیں۔ ہم کسانوں کے نقطۂ نظر کو رجعت پسندانہ سمجھتے ہیں اور اشتراکیت اور اشتمالیت کی طرف مائل ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم سیاست میں گاندھی جی کے ساتھ شریک ہو گئے اور ہم میں سے بہت سے دل و جان سے ان کے پیرو بن گئے۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے اور جو شخص گاندھی جی کو نہیں جانتا اسے کسی جواب سے تسکین نہیں ہوگی، شخصیت ایک سربستہ راز اور ایک عجیب و غریب قوت ہے جو انسانوں کے دلوں کو تسخیر کر سکتی ہے۔ ان میں یہ قوت بدرجہ کمال موجود ہے اور جو لوگ ان سے ملتے ہیں وہ انھیں اور ہی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ پہلے تو ان کی ذاتی کشش اپنا کام کرتی ہے مگر آخر میں لوگ عقلی حیثیت سے قائل ہو کر ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کے فلسفہ زندگی بلکہ ان کے بعض مقاصد سے بھی متفق نہیں تھے اور اکثر ان کے خیالات کو سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ مگر جو عملی تجویز انھوں نے پیش کی وہ ایک محسوس چیز تھی اور عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی تھی۔ ہماری مریل سیاست نے بے عملی غنیمت معلوم ہوتا۔ گاندھی جی کے مردانہ اور موثر عمل نے جس کے ساتھ اخلاقیت اور روحانیت کی چمک دمک بھی تھی ہماری عقل اور جذبات دونوں کو مسخر کر لیا۔ انھوں نے ہمیں رفتہ رفتہ اپنی عملی تجویز کے صحیح ہونے کا قائل کر دیا۔ اور ہم ان کے فلسفے سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے ساتھ ہو گئے۔ شاید عمل اور اصول میں یہ تفریق جائز نہ تھی۔ اور اسی وجہ سے بعد میں ذہنی اختلافات اور جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں ایک مبہم سی امید تھی

کہ گاندھی جی عملی آدمی ہیں اور حالات کے تغیر سے بہت متاثر ہوتے ہےں اس لئے وہ اسی طریقے سے کام کریں گے۔ جو ہمیں صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کم سے کم اب تک وہ صحیح رستے پر چل رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ اگر آگے چل کر ہماری ان کی رائیں الگ ہوگئیں تو دیکھا جائے گا۔ ابھی اسے الگ ہو جانا حماقت ہے۔

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم لوگ معین اور واضح خیالات نہیں رکھتے تھے بلکہ کچھ مذبذب سے تھے۔ ہمیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ چاہے اصولی حیثیت سے ہماری رائے زیادہ صحیح ہو مگر گاندھی جی ہندوستان کو ہم سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ وہ شخص جس سے عام لوگوں کو اس درجہ عقیدت ہو یقیناً ان کی ضرورت جانتے ہیں۔ وہ شخص جس سے عام لوگوں کو اس درجہ عقیدت ہو یقیناً ان کی ضرورتوں اور آرزوؤں کا راز داں ہوگا۔ہم سمجھتے تھے کہ اگرم ان کو اپنا ہم خیال بنالیں تو عام لوگ خود بخود ہمارے ہم خیال بن جائیں گے اور گاندھی جی کو ہم خیال بنانا ممکن نظر آتا تھا اس لئے کہ کسانوں کا سا تصور حیات رکھنے کے باوجود وہ خلقی طور پر باغی اور انقلاب پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کی زندگی میں زبردست تغیرات پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے اور انجام کے دھڑکے سے ڈرنے والے نہ تھے۔

انھیں کی ذات تھی جس نے ہماری ست اور پست قوم کو منظم کر کے میدان عمل میں کھڑا کر دیا تھا اور پھر کس طرح؟ قوت کے دباؤ سے نہیں، مادی فائدے کی لالچ سے نہیں بلکہ ایک ہلکی سی نظر سے چند نرم لفظوں سے اور سب سے بڑھ کر اپنی ذاتی مثال سے۔ مجھے یاد ہ کہ ستیاگرہ کے ابتدائی زمانے میں یعنی ۱۹۱۹ء میں بمبئی کے عمر سوبانی انھیں ''غلاموں کے محبوب چابک زن'' کہا کرتے تھے۔ عمر کی زندگی نے وفا نہیں کی کہ وہ ہندوستان کی بدلی ہوئی حالت کو دیکھتے۔ہم لوگ زیادہ خوش قسمت تھے۔ ۱۹۳۱ء کے آغاز میں فخر و مسرت سے دیکھ رہے تھے کہ بارہ سال میں ملک

کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ۱۹۳۰ء ہمارے لئے ایک عجیب وغریب سال تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی نے کچھ ایسا جادو کر دیا ہے کہ ملک کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ہم اتنے بے وقوف نہ تھے جو یہ سمجھتے کہ ہم برطانوی حکومت کے مقابلے میں قطعی طور پر کامیاب ہوگئے۔ ہماری خوشی حکومت پر غالب آنے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ہمیں اپنی قوم پر، اپنی عورتوں اور نوجوانوں اور بچوں پر فخر تھا۔ جنھوں نے اس تحریک میں کمال کر دکھایا۔ ان کی یہ قوت عمل ایک روحانی دولت تھی جو ہر زمانے میں قوم کے لئے قابل قدر ہوتی اور ہماری جیسی محکوم اور مظلوم قوم کے لئے تو اور بھی زیادہ قدر قیمت رکھتی تھی ہمیں یہ فکر تھی کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے یہ دولت ہمارے ہاتھ سے چلی جائے۔

مجھ پر گاندھی جی ہمیشہ مہربان تھے اور میرا خیال کرتے تھے خصوصاً والد کی وفات کی بعد مجھے ان سے اور بھی زیادہ تعلق خاطر پیدا ہوگیا تھا۔ وہ ہمیشہ میری بات بہت غور سے سنتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا مانتے بھی تھے۔ اس سے مجھے یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ میں اور میرے رفیق انھیں اشتراکیت کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ اور انھوں نے خود کہہ دیا تھا کہ جوں جوں ان کا اطمینان ہوتا جائے گا وہ آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتے جائیں گے۔ مجھے قریب قریب یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اشتراکیت کے بنیادی اصول کو قبول کرلیں گے اس لئے کہ مجھے موجودہ نظام کے تشدد، ناانصافی، اسراف اور مصیبت سے نجات پانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ممکن ہے کہ انھیں ہمارے طریق کار سے اختلاف ہو لیکن ہمارے مقاصد سے اختلاف نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وقت میرا یہ خیال تھا مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ گاندھی جی کے نصب العین اور اشتراکیوں کے مقاصد میں بنیادی اختلافات ہیں۔

اب میں پھر فروری ۳۱ء کے واقعات کے طرف رجوع کرتا ہوں۔ گاندھی

جی اور لارڈ ارون میں وقتاً فوقتاً گفتگو ہوتی رہی مگر ایک دن یہ سلسلہ ایک دم سے موقوف ہو گیا۔ کئی روز سے وائسرائے نے گاندھی جی کو نہیں بلایا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ صلح کی بات چیت ختم ہو گئی۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر دہلی سے اپنے اپنے صوبوں کے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ روانگی سے پہلے ہم نے اپنے آئندہ منصوبوں او رسول نافرمانی کے متعلق (جو اصولاً اب تک جاری تھی) آپس میں مشورہ کیا۔ ہمیں یقین تھا کہ گفتگو ختم ہونے کا اعلان ہوتے ہی ہمیں آپس میں ملنے اور مشورہ کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ ہم سب گرفتار ہو جائیں گے اور ہم سے لوگوں نے یہ کہا تھا کہ غالباً حکومت کانگرس کے خلاف پہلے سے زیادہ سخت کاروائی شروع کر دے گی اس لئے ہم نے کمیٹی کا ایک جلسہ کیا جو ہمارے نزدیک آخری جلسہ تھا اور اپنی تحریک کو چلانے کے متعلق مختلف رزولیوشن پاس کئے ان میں سے ایک رزولیوشن کسی قدر اہم تھا۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ ہر قائم مقام صدر گرفتار ہونے پر اپنا جانشین نامزد کرتا تھا اور ورکنگ کمیٹی میں جو جگہیں خالی ہوتی تھیں وہ بھی اسی طرح پر کی جاتی تھیں۔ یہ قائم مقام ورکنگ کمیٹیاں بہت کم کام کرسکتی تھیں وہ بھی اسی طرح پر کی جاتی تھیں۔ یہ قائم مقام ورکنگ کمیٹی میں جو جگہیں خالی ہوتی تھیں وہ بھی اسی طرح پر کی جاتی تھیں۔ یہ قائم مقام ورکنگ کمیٹیاں بہت کم کام کرسکتی تھیں۔ اور ان کے اختیارات بھی بہت محدود تھے وہ بس جیل ہی جانے کے کام کے تھیں۔ اور پھر یہ خوف بھی تھا کہ اگر قائم مقاموں کے نامزد کرنے کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا تو کہیں کانگرس بدنام نہ ہو جائے۔ اس میں طرح طرح کے خطرے تھے اس لئے دہلی میں ورکنگ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ آئندہ قائم مقام صدر اور قائم مقام ممبر نامزد نہ کئے جائیں۔ جب تک اصلی ورکنگ کمیٹی کے چند ممبر (یا ایک ممبر بھی) جیل سے باہر ہوں اس وقت تک پوری کمیٹی کی حیثیت سے کام کرتے رہیں۔ جب وہ سب گرفتار ہو جائیں تو کمیٹی باقی نہیں رہے گی مگر

(ہم نے بڑے طمطراق سے کہا) کمیٹی کے اختیارات ملک کے ہر مرد اور ہر عورت کو حاصل ہوں گے اور وہ لڑائی کو آخر وقت تک جاری رکھیں گے۔

اس رزولیوشن میں بڑی بہادری سے لڑائی کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا اور مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس میں اس بات کا بھی اعتراف تھا کہ کانگرس کے صدر دفتر کے لئے یہ روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے کہ وہ ملک کے سب حصوں کی خبر رکھے اور باقاعدہ ہدایتیں جاری کر سکے۔ یہ مشکل اس وجہ سے پیش آتی تھی کہ ہمارے اکثر کارکن مشہور لوگ تھے اور کھلم کھلا کام کرتے تھے۔ انھیں حکومت جب چاہتی گرفتار کر لیتی۔ ۱۹۳۰ء میں خفیہ قاصدوں کے ذریعے سے ہدایات بھیجنے، رپورٹیں منگوانے اور معائنہ کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ہوا اور اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہم خفیہ پیام رسانی کا کام بہت اچھی طرح چلا سکتے ہیں مگر یہ بات ایک حد تک ہماری کھلی ہوئی تحریک کے لئے موزوں تھی اور گاندھی جی اس کو ناپسند کرتے تھے۔ جب مرکز سے ہدایتیں بھیجنا ناممکن تھا تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ ہم تحریک چلانے کی ذمہ داری مقامی لوگوں کے سپرد کر دیں، ورنہ وہ ہدایتوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے اور کچھ نہ کرتے ظاہر ہے کہ جب کبھی ممکن ہوتا تھا ہدایتیں بھی بھیج دی جاتی تھیں۔

غرض ہم نے یہ اور دوسرے روزلیوشن پاس کئے (جن میں سے کوئی ان واقعات کی وجہ سے جو بعد میں پیش آئے شائع یا نافذ نہیں ہوا) اور سفر کی تیاری کرنے لگے۔ عین اس وقت لارڈ ارون کے ہاں سے پھر طلبی ہوئی۔ اور گفت وشنید کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

۴ مارچ کو رات کے بارہ بجے تک ہم وائسرائے کے ہاں سے گاندھی جی کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ وہ دو بجے شب کو واپس آئے اور ہم لوگوں کو جگا کر کہا گیا کہ معاہدہ ہو گیا۔ ہم نے معاہدے کا مسودہ دیکھا۔ میں اس کی اکثر دفعات سے

واقف تھا اس لئے کہ ان پر بار بار بحث ہو چکی تھی مگر شروع ہی دفعہ نمبر ۲ (۱) کو پڑھ کر جس میں تحفظات وغیرہ کا ذکر تھا، مجھے سخت دھچکا لگا۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس وقت میں نے کچھ نہیں کہا اور ہم سب جا کر اپنے بستر پر لیٹ رہے۔

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ ہمارا لیڈر قول دے چکا تھا۔ اگر ہمیں اس کے رائے سے اختلاف بھی تھا تو ہم کیا کرتے؟ اس کا ساتھ چھوڑ دیتے؟ اس سے قطع تعلق کر لیتے؟ اختلاف رائے کا اعلان کر دیتے؟ اس سے شاید ذاتی طور پر کسی شخص کو تسکین ہو جاتی مگر آخری فیصلے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کم سے کم اس وقت ختم ہو چکی تھی اور اسے پھر سے اٹھانا خود اور ورکنگ کمیٹی کے بس کی بات نہ تھی اس لئے کہ حکومت یہ اعلان کر سکتی تھی کہ مسٹر گاندھی تصفیے پر راضی ہو گئے ہیں۔ مجھے اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو اس میں مطلق عذر نہ تھا کہ سول نافرمانی ملتوی کر دی جائے اور حکومت سے کوئی عارضی تصیفہ کر لیا جائے۔ ہمارے لئے یہ بات سہل نہ تھی کہ اپنے رفیقوں کو دوبارہ جیل بھیج دیں یا ان ہزاروں آدمیوں کی رہائی میں مانع ہوں جو اب تک قید میں تھے۔ جیل کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہم آرام سے رات دن گذار سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم میں سے بعض اپنے آپ کو اس کا عادی بنالیں اور یہ دعویٰ کریں کہ ہم اس جانفرسا زندگی کو کھیل سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تین ہفتے سے گاندھی جی اور لارڈ ارون میں گفتگو ہو رہی تھی اس کی وجہ سے ملک کو یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ تصیفہ ہونے والا ہے۔ اگر ہم صلح سے قطعاً انکار کر دیتے تو لوگوں کو سخت مایوسی ہوتی۔ غرض ہم سب ورکنگ کمیٹی کے ممبر یقیناً یہ چاہتے تھے کہ عارضی تصیفہ ہو جائے (کیونکہ ظاہر تھا کہ قطعی فیصلے کی صورت ہی نہیں) بشرطیکہ ہمیں اپنے کسی اہم مطالبے سے دست بردار نہ ہونا پڑے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اکثر مسائل سے جن پر بڑے زور شور سے بحث

ہوتی تھی، کچھ مطلب نہ تھا۔ مجھے تو سب سے زیادہ دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک یہ کہ ہم اپنے کامل آزادی کے مطالبے سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹیں۔ دوسرے یہ کہ اس تصفیے کا صوبہ متحدہ کے کسانوں کی حالت پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ ہماری محصول نہ دینے یا لگان نہ دینے کی تحریک اب تک بہت کامیاب رہی تھی اور بعض علاقوں میں ایک پیسہ بھی وصول نہیں ہوا تھا۔ کسان میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ دنیا کی زراعتی حالت اور بگڑ گئی تھی۔ قیمتیں اور گر گئی تھیں اس لئے انھیں لگان ادا کرنا پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ ہماری محصول نہ دینے کی تحریک معاشی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ میں یہ کہتا تھا کہ اگر حکومت سے عارضی تصفیہ ہو گیا تو سول نافرمانی بند ہو جائے گی اور محصول نہ دینے کی تحریک کی سیاسی بنا ختم ہو جائے گی۔ مگر اس کے معاشی پہلو میں کیا فرق پڑے گا؟ قیمتوں کے اس قدر گر جانے کی وجہ سے کسانوں کو مطالبہ ادا کرنے میں جو معذوری ہے وہ تو بدستور باقی رہے گی۔ گاندھی جی نے یہ بات لارڈ ارون کو بہت وضاحت کے ساتھ سمجھا دی تھی۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ محصول نہ دینے کی تحریک بند کر دی جائے گی مگر ہم کسانوں کو یہ مشورہ ہرگز نہیں دیں گے کہ اپنے مقدور سے زیادہ مطالبہ ادا کریں۔ اس معاملے میں حکومت ہند سے تفصیلی بحث نہیں کی سکتی تھی اس لئے کہ یہ صوبے کا معاملہ تھا۔ ہمیں یہ اطمینان دلایا گیا کہ صوبے کی حکومت بڑی خوشی سے ہم سے اس کے متعلق گفتگو کرے گی اور کسانوں کی مشکل کو حل کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔ یہ ایک مبہم سا وعدہ تھا مگر ان حالات میں کوئی قطعی فیصلہ ہونا مشکل تھا۔ غرض اس وقت تو یہ مسئلہ اس طرح سے طے کر دیا گیا۔

اب دوسری چیز باقی رہی یعنی ہمارا کامل آزادی کا مقصد، معاہدے کی دفعہ ۲ کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس کی بھی خیر نہیں۔ کیا اسی دن کے لئے ہماری قوم اس بہادری سے سال بھر لڑتی رہی؟ کیا ہمارے سارے کارناموں اور لمبے چوڑے

دعووں کا یہی انجام ہونا تھا؟ کانگرس کا کامل آزادی کا روزولیوشن کہاں گیا؟ ۲۶ جنوری کا عہد کیا ہوا؟ میں مارچ کی اس رات کو اپنے بستر پر پڑا یہ باتیں سوچ رہا تھا اور میرے دل پر اداسی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو اور اس کے ملنے سے قریب قریب مایوسی ہو۔

"دنیا کا انجام یہی ہوتا ہے
نہ دھماکہ نہ دھڑاکا بلکہ ٹائیں ٹائیں فش"

----

(۱) دفعہ ۲ معاہدہ دہلی (مورخہ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء) جہاں تک دستور اساسی کے مسائل کا تعلق ہے آئندہ بحث کا دائرہ حکومت برطانیہ کی منظوری کی شرط پر معین کیا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کی دستوری حکومت کی تجویز پر جو گول میز کانفرنس میں پیش ہو چکی ہے مزید غور کیا جا سکے۔ جس تجویز کا خاکہ وہاں تیار ہوا ہے اس کے اہم اجزا حسب ذیل ہیں:- وفاقی نظام۔ ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کا قیام ان تحفظات کے ساتھ جو ہندوستان کے مفاد کے لئے ضروری ہوں مثلاً فوج، امور خارجہ، اقلیتوں کے حقوق، ہندوستان کی مالی ساکھ اور قرضوں کی ادائیگی۔

کراچی کانگرس

گاندھی جی کو کسی اور سے میری پریشانی کا حال معلوم ہوا اور دوسرے دن صبح کو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ ٹہلنے چلو۔ ہم دونوں میں بڑی طول طویل گفتگو ہوتی رہی اور انھوں نے مجھے یقین دلانا چاہا کہ ہم نے اپنا کوئی اہم مطالبہ ترک نہیں کیا۔ کسی اصول سے قدم نہیں ہٹایا۔ انھوں نے معاہدے کی دفعہ ۲ کی ایک خاص تشریح کی اور اسے اس فقرے کی بنا پر "جو ہندوستان کے مفاد کے لئے ضروری ہوں" ہمارے کامل آزادی کے مطالبے سے مطابقت دینا چاہتی۔ مجھے یہ زبردستی کی تاویل معلوم ہوئی اور میں نے اسے تسلیم نہیں کیا مگر ان باتوں سے میرا غصہ کسی قدر دھیما ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ معاہدے کی اچھائی برائی ایک طرف، میں تو آپ کی اس عادت سے ڈرتا ہوں کہ آپ اچانک کوئی نئی بات کر کے ہمیں چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ آپ کی سیرت میں کوئی نامعلوم چیز ہے جسے چودہ برس کے گہرے تعلقات کے باوجود میں آج تک نہیں سمجھ سکا اور جس سے مجھے بہت اندیشہ ہے۔ انھوں نے اس نامعلوم عنصر کے وجود کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں خود پہلے سے اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ کیا گزرے گا اور اس کیا نتیجہ ہوگا۔

دو تین روز میں عجب کشمکش و پیچ میں رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اب معاہدے کے مخالفت کرنے یا اسے روکنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہا تھا۔ یہ منزل گذر چکی تھی اور میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ واقعے کی حیثیت سے تو اسے تسلیم کر لوں مگر اصولاً اپنے اختلاف رائے کا اظہار کر دوں۔ اس سے میری خود بینی کو تسکین ہو جاتی۔ مگر اصل معاملے پر کیا اثر پڑتا؟ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ جو کچھ ہو چکا ہے اسے ہنسی خوشی مان لوں اور گاندھی جی نے معاہدے کی اس تاویل پر زور دیا تھا اور یہ کہہ دیا تھا کہ ہم پوری طرح کامل آزادی کے مطالبے پر قائم ہیں۔ انھوں نے لارڈ ارون سے مل کر انھیں یہ بات اچھی طرح جتا دی تا کہ اس وقت یا

آئندہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ اگر کانگرس نے گول میز کانفرنس میں نمائندہ بھیجا تو وہ اسی بنا پر اور اسی دعوے کے پیش کرنے کے لئے بھیجا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ لارڈ ارون اس دعوے کو تسلیم کر نہیں سکتے تھے مگر انہوں نے کانگرس کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ وہ یہ دعوے پیش کر سکتی ہے۔

غرض میں نے سخت ذہنی کش مکش اور جسمانی تکلیف کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس معاہدے کو تسلیم کر لوں اور دل و جان سے اسے پورا کرنے کی کوشش کروں۔ کوئی درمیانی صورت مجھے نظر نہیں آتی تھی۔

معاہدے سے پہلے اور اس کے بعد گاندھی جی اور لارڈ ارون میں جو ملاقاتیں ہوئیں ان میں گاندھی جی نے بہت اصرار کیا تھا کہ علاوہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے جو اس معاہدے کے رو سے رہا ہونے والے تھے، دوسرے سیاسی قیدی بھی چھوڑ دیئے جائیں۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ان میں سے بعض کو تحقیقات کے بعد سزا دی گئی تھی اور بعض بغیر الزام، تحقیقات یا اثبات جرم کے یوں ہی نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ بہت سے لوگ سالہا سال سے نظر بند تھے اور اس طرح بغیر تحقیقات قید کر دینے کے طریقے کے خلاف سارے ہندوستان خصوصاً بنگال میں جہاں اس کا سب سے زیادہ زور تھا، بہت ناراضی پھیلی ہوئی تھی۔ "پینگوین آئی لینڈ" کے نائب سپہ سالار (یا ڈرائی فس کے مقدمے کے مدعیوں) کی طرح حکومت کا خیال تھا کہ یہ لوگ بالفعل یا بالقوت تشدد پسند قسم کے انقلابی ہیں۔ گاندھی جی نے بہت زور دیا کہ چاہیے یہ معاہدے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے مگر ان کی رہائی سیاسی کشیدگی کو دور کرنے اور بنگال میں طبعی فضا قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ مگر حکومت اس پر راضی نہیں ہوئی۔

اسی طرح بھگت سنگھ کی سزائے موت کو بدلوانے کے لئے گاندھی جی نے پورا زور لگایا مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسے بھی معاہدے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ

گاندھی جی سارے ہندوستان کی خواہش کے مطابق اس کے لئے علیحدہ کوشش کر رہے تھے مگر ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ اسی زمانے میں یعنی میرے والد کی وفات سے چند روز پہلے یا چند روز کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے مجھے ہندوستان کی تخویف پسند جماعت کی طبیعت کا اندازہ ہوا۔ ہمارے گھر ایک اجنبی شخص مجھ سے ملنے کے لئے آیا جس کا نام چندر شیکر آزاد تھا۔ میں پہلے اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔ البتہ دس برس ہوئے ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک کے زمانے میں جب وہ اسکول چھوڑ کر جیل خانے گیا تھا تو میں نے اس کا نام سنا تھا۔ ان دنوں وہ پندرہ برس کا لڑکا تھا اور اسے جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کے الزام میں کوڑے لگائے گئے تھے۔ آگے چل کر وہ تخویف پسندوں کی طرف ڈھل گیا اور شمالی ہند میں ان کا ممتاز لیڈر بن گیا۔ میں نے اس قسم کی افواہیں سنی تھیں۔ مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے اس کے آنے سے مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ وہ میرے پاس اس لئے آیا تھا کہ ہم لوگوں کی رہائی کی وجہ سے لوگوں کو عام طور پر یہ توقع تھی کہ حکومت اور کانگریس میں صلح کی بات ہونے والی ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اگر صلح ہوگئی تو اس کی جماعت کو بھی امن نصیب ہوگا یا نہیں۔ کیا وہ لوگ اب بھی اسی حال میں رہیں گے کہ راندہ قانون بنا کر کھدیڑے جائیں، ان کے سروں کی قیمت مقرر ہو اور انھیں ہر وقت موت کو خوف رہے؟ یا اس کا کچھ امکان ہے کہ انھیں امن و امان کی زندگی بسر کرنی نصیب ہو؟ اس نے کہا کہ وہ اور اس کے بہت سے ساتھی اس کے قائل ہوگئے ہیں کہ خالی تخویف کے طریقے بیکار ہیں اور ان سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ مگر وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ صرف پر امن جدوجہد کے ذریعہ سے ہندوستان کو آزادی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آگے چل کر تشدد سے کام لینا پڑے گا، مگر تخویف کی صورت میں نہیں۔ بہر حال وہ تخویف کو ہندوستان کی آزادی کے لئے مناسب سمجھتا تھا مگر وہ پوچھتا تھا

کہ جب اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے اور لوگ اس کی جان لینے کے درپے ہوں تو آخر وہ کیا کرے۔ اس کے قول کے مطابق حال میں جس قدر تخویف کی واردات ہندوستان میں ہوئیں وہ لوگوں نے صرف اپنی جان بچانے کے لئے کیں۔

میں آزاد سے یہ بات سن کر خوش ہوا اور آگے چل کر اس کی تصدیق بھی ہوگئی کہ تخویف پسندی کا عقیدہ اٹھتا جاتا ہے۔ اجتماعی حیثیت سے یہ چیز قریب قریب ختم ہوچکی تھی۔ انفرادی طور پر کہیں کہیں اس قسم کے واقعات پیش آتے تھے مگر ان کی کوئی خاص وجہ ہوتی تھی مثلاً ذاتی انتقام، یا افراد کی کج رائی۔ ان کی تہ میں کوئی عام اصول نہیں تھا۔ظاہر ہے اس کے یہ معنی نہ تھا کہ پرانے تخویف پسند یا ان کے نئے رفیق عدم تشدد کے قائل ہوگئے ہیں یا برطانوی حکومت کے قدردان بن گئے ہیں۔ البتہ تخویف پسند کا خیال انکے دل سے نکل گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے اکثر فاشتی ذہنیت رکھتے ہیں۔

میں نے چندر شیکر آزاد کو اپنا سیاسی جدوجہد کا نظریہ سمجھانے اور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ مگر اصل سوال یہ تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔کوئی ایسی صورت نہیں نظر آتی تھی کہ اسے یا اس جیسے اور لوگوں کو چین سے بیٹھنا نصیب ہو۔میں اسے بس اتنا ہی مشورہ دے سکا کہ اپنے اثر سے کام لے کر آئندہ تخویف کے واقعات کو روکے اس لئے کہ ان سے قومی مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا اور اس کی جماعت کو بھی۔

دو تین ہفتے کے بعد گاندھی ارون گفت وشنید کے دوران میں دہلی میں سنا کہ الہ آباد میں چندر شیکر آزاد کو پولیس نے گولی ماردی۔ وہ دن کے وقت ایک پارک میں پہچانا گیا اور پولیس کے ایک بہت بڑے دستے نے اسے گھیر لیا۔اس نے ایک درخت کی آڑ لے کر بچنا چاہا، دونوں طرف سے گولیاں چلیں، پولیس کے دو ایک سپاہی زخمی ہوئے اور چندر شیکر مارا گیا۔

عارضی تصفیہ ہونے کے چند روز بعد میں دہلی سے لکھنؤ آ گیا۔ ہم نے فوراً سول نافرمانی کو روکنے کی کاروائی شروع کر دی تھی اور کانگریس کی کل شاخوں نے قابل تعریف انضباط کے ساتھ ہماری نئی ہدایات کی پابندی کی تھی ہماری جماعت میں بہت سے جنگجو اشخاص اس تصفیے سے ناراض تھے اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے ہم انھیں جدوجہد کے روکنے پر مجبور کر سکتے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے بلا استثنا پوری جماعت نے عملاً نئی پالیسی کو قبول کر لیا اگرچہ بہت سے لوگ اصولاً اس کے مخالف تھے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ دیکھیں ہمارا صوبہ کیا کرتا ہے اس لئے کہ یہاں بعض علاقوں میں محصول نہ دینے کی تحریک زور شور سے چل رہی تھی۔ ہمارا پہلا کام یہ تھا کہ سول کے بعد بجز آدمیوں کے جن کے بارے میں کچھ جھگڑا تھا سب چھوٹ گئے۔ ظاہر ہے کہ ہزارہا نظر بند اور وہ لوگ جنھیں تشدد آمیز جدوجہد کے الزام میں سزا ہوئی تھی۔ اس زمرے میں شامل نہیں تھے۔

جب یہ رہا شدہ قیدی اپنے اپنے شہر یا گاؤں میں گئے تو قدرتی طور پر ان کے عزیزوں اور دوستوں نے بڑے جوش و خروش سے ان کا استقبال کیا۔ اکثر مقامات پر جھنڈیوں وغیرہ سے آرائش کی گئی، جلوس نکلے۔ جلسے ہوئے۔ تقریریں کی گئیں، خیر مقدم کے ایڈریس پڑھے گئے۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی اور ہونا ہی چاہئے تھی لین اس زمانے سے مقابلہ کیا جائے جب پولیس کی لاٹھی ہر جگہ دکھائی دیتی تھی اور جلسے اور جلوس زبردستی منتشر کر دئے جاتے تھے تو تعجب ہوتا تھا کہ ایک دم سے یہ کیسی کایا پلٹ ہو گئی۔ پولیس کچھ پریشان سی تھی اور غالباً ہمارے آدمیوں میں جو جیل سے چھوٹ کر آئے تھے ایک تفاخر کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ فخر کی کوئی بات نہ تھی مگر قید سے چھوٹنے کے بعد (اگر جیل میں بالکل کچل نہ گئی ہو) طبیعت میں ایک ترنگ ہوا ہی کرتی ہے اور جب ہزاروں آدمی ایک ساتھ چھوٹیں یہ

ترنگ اور بڑھ جاتی ہے۔

میں اس واقعے کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ چند مہینے کے بعد حکومت نے اس "فخر کے انداز پر" بہت اعتراض کیا اور اسے ہمارے خلاف ایک الزام قرار دیا۔ اس نے تحکم کی فضا میں نشو و نما پائی ہے اور اس کے ذہن میں فوجی حکومت کا تصور ہے۔ اس کی جڑیں لوگوں کے دلوں میں قائم نہیں ہیں اس لئے جس چیز کو وہ اپنا رعب سمجھتی ہے اس کے چوٹیوں سے لے کر نیچے کے میدانوں تک، لوگوں کی ان گستاخیوں پر غصے اور غیرت سے کھول رہے ہیں۔ وہ اخبار جو حکومت کی آواز کو دہراتے ہیں اس صدمے سے آخر تک نہیں سنبھلے، اور اب ساڑھے تین برس کے بعد بھی اس ابتری اور شورہ پشتی کے زمانے کا نام آتے ہی کانپ جاتے ہیں۔ جب بقول ان کے کانگرس والے فتح کی خوشی میں اکڑتے پھرتے تھے۔

حکومت اور اس کے اخباری دوستوں کا یہ غیظ و غضب دیکھ کر ہم حیرت میں رہ گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اعصاب کی کیا حالت تھی اور انھوں نے اپنے جذبات کو کتنا دبایا ہوگا جس سے ان کے نفس میں طرح طرح کی گرہیں پڑ گئیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ہمارے معمولی آدمیوں کے دو چار جلوسوں اور تقریروں نے انھیں اس قدر برہم کر دیا۔

سچ پوچھئے تو لیڈروں کا کیا ذکر ہے، کانگرس کے عام ممبروں کا بھی ان دنوں مطلق یہ خیال نہیں تھا کہ انھوں نے حکومت کو "شکست" دی ہے۔ البتہ ہمیں اپنی قوم کی قربانی اور اس کی بہادری پر ضرور فخر تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ہمارے ملک نے جو کر دکھایا اس سے ہماری عزت خود اپنی نظروں میں بڑھ گئی۔ ہمیں اپنے اوپر بھروسا ہو گیا اور ہمارا چھوٹے سے چھوٹا والنٹیر بھی تن کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگا۔ ہمیں یہ احساس بھی تھا کہ ہماری اس جدوجہد سے جس نے دنیا کو ہماری طرف متوجہ کر دیا، برطانوی حکومت پر دباؤ پڑا اور ہم منزل مقصود سے قریب تر ہو گئے۔ ان سب

باتوں میں حکومت کو شکست دینے کو کوئی ذکر نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو ہم میں سے اکثر اچھی طرح جانتے تھے کہ دہلی کے معاہدے میں حکومت نفع میں رہی۔ جب ہم میں سیکوئی یہ کہتا تھا کہ ہم اپنے مقصد سے بہت دور ہیں اور ابھی ہمیں بڑی کش مکش اور مشکلات کا سامنا کرنا ہے تو اس پر لڑائی کی ترغیب دینے کا' دہلی کے معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگایا جاتا تھا۔

صوبہ متحدہ میں ہمیں کاشتکاروں کے مسئلے سے نبٹنا تھا۔ اب ہماری پالیسی یہ تھی کہ جہاں تک ہو سکے حکومت سے اتحاد عمل کریں۔ اور ہم نے فوراً صوبہ متحدہ کی حکومت سے بات چیت شروع کردی۔ ایک مدت کے بعد (کوئی بارہ برس سے ہمیں ان لوگوں سے سرکاری طور پر سابقہ نہیں پڑا تھا) میں صوبے کے چند بڑے افسروں سے ملنے گیا تاکہ ان سے کاشتکاروں کے مسئلے پر گفتگو کروں۔ ہماری صوبے کی کمیٹی نے اپنے ایک ممتاز رکن گوند ولبھ پنتھ کو خاص طور پر اس کام کے لئے مقرر کیا کہ وہ صوبے کی حکومت سے تعلقات قائم رکھیں۔ کاشتکاروں کی نازک حالت، زرائتی پیداوار کی قیمت کا گر جانا، عام کاشتکاروں کا مطلوبہ لگان ادا نہ کرسکنا یہ سب باتیں مسلم تھیں۔ سوال یہ تھا کہ چھوٹ کتنی ہونی چاہئے اور اس معاملے میں پہلا قدم حکومت ہی اٹھا سکتی تھی۔ معمولاً حکومت کو صرف زمینداروں سے واسطہ ہوتا تھا۔ اسامیوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا اور لگان کو گھٹانا یا معاف کرنا زمینداروں کا کام تھا۔ مگر زمیندار کہتے تھے کہ جب تک حکومت مالگذاری میں رعایت نہیں کرے گی ہم چھوٹ نہیں دے سکتے۔ اور یوں بھی زمیدنار عموماً خوشی سے چھوٹ دینے پر تیار نہیں تھے۔ اس لئے فیصلہ حکومت کے ہاتھوں میں تھا۔

صوبہ کانگرس کمیٹی نے کاشتکاروں کو سمجھایا کہ محصول نہ دینے کی تحریک ختم ہوگئی اب تم جتنا لگان دے سکتے ہو دے دو۔ مگر ان کی طرف سے کمیٹی نے بہت سے چھوٹ کا مطالبہ کیا تھا۔ ایک مدت تک حکومت نے کوئی کاروائی نہیں کی۔ غالباً

ااسے یہ مشکل درپیش تھی کہ صوبے کے گورنر سر مالکم ہیلی موجود نہیں تھے بلکہ کار خاص پر انگلستان گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بڑی مستعدی اور دوررسی سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر قائم مقام گورنر اور ان کے رفیق اپنے اور کوئی گرمی کے موسم تک جب سر مالکم ہیل واپس آنے والے تھے ملتوی کر دی جائے۔ اس حیص بیص اور ڈھیل سے معاملہ اور بگڑ گیا اور اسامیوں کو بڑی تکلیف پہنچیں۔

معاہدہ دہلی کے بعد میں بیمار پڑ گیا۔ جیل ہی میں میری طبیعت اچھی نہیں رہتی تھی اس کے بعد والد کے وفات کے صدمے سے اور دلی کی طویل گفت وشنید کے بوجھ سے میری صحت نے جواب دے دیا۔ کراچی کانگرس کے زمانے میں کسی قدر طبیعت سنبھل گئی تھی۔

کراچی ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے اور اس کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اس کے اور بقیہ ہندوستان کے بیچ میں ریگستانی خطے حائل ہیں۔ پھر بھی ہزاروں آدمی دور دور سے آکر جمع ہو گئے۔ یہ مجمع صحیح معنی میں ہندوستان کی اس وقت کی مزاجی حالت کو ظاہر کرتا تھا۔ ایک تو قومی تحریک کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر ہمیں خاموش مگر گہری مسرت تھی، کانگرس کی تنظیم پر ناز تھا جس نے اپنے بھاری فرائض کو اس خوبی سے ادا کیا اور انضباط اور قربانی کا حق ادا کر دیا۔ ہمیں اپنی قوم پر بھروسا تھا اور ہمارے دل ایک دبے وہئے جوش سے معمور تھے۔ دوسرے طرف ہمیں اپنی ذمہ داری کا اور ان مسئلوں اور خطروں کی اہمیت کا جو ہمیں درپیش تھے پورا احساس تھا۔ اب ہمارے الفاظ اور ہماری تجویزیں قومی عمل کی تمہید تھیں اور ہم بے سوچے سمجھے نہ کوئی لفظ زبان سے نکال سکتے تھے اور نہ کوئی رزولیوشن پاس کرسکتے تھے۔ دہلی کا معاہدہ اکثریت نے منظورت کر لیا تھا مگر لوگ اس عام طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ اور انھیں خوف تھا کہ اس میں ایسی صورتیں پیدا ہو جائیں گی۔ جن میں کانگرس کی بدنامی ہوگی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی وجہ

سے وہ مسائل جو ملک کے سامنے درپیش ہیں الجھ کر رہ جائیں گے۔ کانگریس سے چند ہی روز پہلے ناراضی کی ایک نئی وجہ پیدا ہو گئی تھی اور وہ بھگت سنگھ کی سزائے موت تھی۔ یہ احساس شمالی ہندوستان میں بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔

کراچی کانگریس میں شخصی طور گاندھی جی کو اتنی بڑی فتح حاصل ہوئی کہ کسی اور کانگریس میں نہ کوئی ہو گی۔ اس اجلاس کے صدر سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے جو ہندوستان کے نہایت باا ثر اور ہر دلعزیز لیڈروں میں سے تھے مگر اصل میں گاندھی جی سب کہیں چھائے ہوئے تھے۔ پشاور کے سرخ پوشوں کی ایک جماعت بھی خان عبدالغفار خاں کی سرکردگی میں کانگریس میں شرکت کرنے کے لئے آئی تھی۔ یہ سرخ پوش بہت ہر دلعزیز تھے اور جہاں کہیں جاتے تھے لوگ آفرین کے نعرے بلند رکتے تھے۔ اس لئے کہ اپریل ۱۹۳۰ء کے بعد سے لوگ ان کے بعد سے لوگ انکی بے نظیر ہمت اور ان کی امن پسندی کو جس پر وہ باوجود سخت اشتعال کے قائم رہے، دیکھ کر بہت متاثر تھے۔ ''سرخ پوش'' کے نام سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ کوئی اشتمالیوں یا انتہا پسند مزدوروں کی جماعت ہے۔ اصل میں ان کا نام ''خدائی خدمتگار'' تھا اور ان کی جماعت کانگریس کی رفیق کار بن گئی تھی (۱۹۳۱ء میں اس جماعت کانگریس سے باضابطہ الحاق ہو گیا) سرخ پوش وہ محض اس وجہ سے کہلاتے تھے کہ ان کی قدیم وضع کی وردیاں سرخ کی تھیں۔ ان لائحہ عمل محض قومی آزادی اور معاشرتی اصلاح پر مبنی تھا اور وہ کوئی معاشی پالیسی نہیں رکھتے تھے۔

کراچی کانگریس کا سب سے اہم رزولیوشن معاہدہ دہلی اور گول میز کانفرنس سے متعلق تھا۔ جب یہ رزولیوشن ورکنگ کمیٹی میں منظور ہو گیا تو میں نے بھی اس قبول کر لیا۔ مگر جب گاندھی جی نے مجھ سے فرمائش کی کہ تم اسے کانگریس کے کھلے اجلاس میں پیش کرو تو میں ہچکچایا۔ یہ میری طبیعت کے خلاف تھا۔ اس لئے پہلے میں نے انکار کیا مگر پھر سوچا کہ یہ بڑی کمزوری ہے۔ یا تو مجھے اسکی موافقت کرنا چاہیے یا

مخالفت۔ بات کو ٹالنے سے اور لوگوں کو شبے میں ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ عین وقت پر یعنی رزولیوشن کے پیش ہونے سے چند منٹ پہلے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں خود اسے پیش کروں گا۔ اپنی تقریر میں میں نے یہ کوشش کی کہ اس عظیم الشان مجمعے کے سامنے اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کر دوں اور یہ بتا دوں کہ میں نے اس رزولیوشن کو کیوں قبولکر لیا ور لوگوں سے اس کی وکالت کیوں کر رہا ہوں۔ یہ تقریر جو میں نے وقت کے وقت کی تھی اور جس کا ہر لفظ میرے دل سے نکلا تھا بالکل کھری سیدھی سادی تقریر تھی مگر غالباً یہ میری اور تقریروں سے جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر کی تھیں، زیادہ کامیاب رہی۔

میں نے اور تجویزوں پر بھی تقریریں کیں خصوصاً اس روزولیوشن پر جو بھگت سنگھ کے متعلق تھا اور اس پر جس میں بنیادی حقوق اور معاشی پالیسی کی بحث تھی اس دوسرے رزولیوشن سے مجھے نہ صرف اس کے مضمون کے سبب سے بلکہ اس وجہ سے بھی خاص دلچسپی تھی کہ یہ کانگرس کے نئے طرز خیال کو ظاہر کرتا تھا۔ اب تک کانگرس خالص قومی خیالات رکھتی تھی اور معاشی مسائل سے بچتی تھی۔ کراچی کے رزولیوشن میں اس نے اشتراکیت کی طرف ایک چھوٹا سا قدم اٹھایا۔ یعنی بنیادی صنعتوں وغیرہ کے قومی ملکیت قرار دیئے جانے اور غریبوں کو بوجھ گھٹا کر امیروں کا بوجھ بڑھانے کے مختلف تدابیر کی وکالت کی۔ یہ ہرگز اشتراکیت نہیں اور ایک سرمایہ داری سلطنت کو بھی اس رزولیوشن کی تمام باتوں کے منظور کر لینے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔

ایک ہلکے سے پیش پا افتادہ رزولیوشن نے حکومت ہند کے اعلیٰ افسروں میں ہل چل ڈال دی۔ شاید انھیں اس قوت تخیل کے زور سے جوان کے حصے میں آئی ہے نظر آنے لگا کہ بالشویکوں کا سرخ سونا پوشیدہ طریقے سے کراچی پہنچ گیا اور اس نے کانگرس کو پھسلا لیا۔ یہ لوگ بیرونی دنیا سے الگ حریم سیاست کی چار دیواری

میں رہتے ہیں، جہاں رازداری کی فضا چھائی ہوئی ہے اور ان کی اثر پذیر طبیعتیں مزے لے لے کر پراسرار خیالی قصے سنا کرتی ہیں۔ اور پھر ان کہانیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بڑے پراسرار انداز میں اخباروں میں چھپتے ہیں، جنھیں حکومت کا تقرب حاصل ہے اور اشارتاً یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر حقیقت کے رخ سے پردہ اٹھا دیا جائے تو نہ جانے کیا کیا طلسمی منظر دکھائی دیں۔ اس منجھے ہوئے طریقے سے کراچی کے بنیادی حقوق وغیرہ کے رزولیوشن کا بارہا ذکر کیا گیا جس کے معنی میں تو یہ سمجھوں گا کہ یہ حکومت اس رزولیوشن کے متعلق یہ خیالات رکھتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی پراسرار شخص نے جو بالشویکوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس رزولیوشن یا اس کے بڑے حصے کا مسودہ بنایا اور اسے کراچی میں میرے سر منڈھ دیا۔ اس کے بعد میں نے مسٹر گاندھی کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر آپ نے یہ روزلیوشن قبول نہ کیا تو میں دہلی کے معاہدے کی مخالفت کروں گا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی میرے تالیف قلب کے لئے اسے مان گئے۔ اور آخری دن تھی ماندی سبجیکٹس کمیٹی اور کانگرس سے زبردستی یہ روزلیوشن پاس کرالیا۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس ''پراسرار شخص'' کا نام صاف صاف نہیں لیا گیا۔ مجھے پراسرار طریقوں اور اینچ پیچ کی باتوں کی عادت نہیں اس لئے میں صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ میرے خیال میں یہ اشارہ م۔ ن۔ رائے۔ کی طرف ہے۔ بڑا لطف آئے اور شملے اور دہلی کے اعلیٰ حکام کی آنکھیں کھل جائیں، اگر انھیں یہ معلوم ہو کہ م۔ن۔رائے یا کوئی اور اشتمالی خیالات رکھنے والا شخص کراچی کے اس بے ضرر رزولیوشن کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ انھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہاس خیال کے لوگ اس رزولیوشن کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں یہ متوسط طبقے کے شہروں کی اصلاح پسندانہ ذہنیت کا خاص نمونہ ہے۔ اب رہا گاندھی جی کا معاملہ تو مجھے ان سے سترہ برس سے بہت اچھی طرح سے نیاز

حاصل ہے اور یہ بات قیاس ہی میں نہیں آسکتی کہ میں ان کو الٹی میٹم دوں یا ان سے سودا چکاؤں۔ خواہ ہم میں اتفاق رائے ہو یا کسی خاص معاملے میں اختلاف ہو بہر صورت ہمارے تعلقات میں بازاری لین دین کے طریقے کو دخل نہیں ہو سکتا۔

کانگرس سے اس قسم کا رزولیوشن پاس کرانے کا خیال پہلے سے موجود تھا۔ کئی سال سے صوبہ متحدہ کی کانگرس کمیٹی یہ کوشش کر رہی تھی کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے ایک اشتراکی رنگ کا رزولیوشن پاس کرائے۔ ۱۹۲۹ء میں اسے اشتراکیت کا اصول منوا لینے میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سول نافرمانی کا قصہ چھڑ گیا۔ فروری اور مارچ ۳۱ء میں جب میں دلی میں صبح کی چہل قدمی کے وقت گاندھی جی سے گفتگو کیا کرتا تھا، میں نے ان سے معاملے کا ذکر کیا تھا اور انھوں نے بڑی خوشی سے اسے منظور کر لیا تھا کہ معاشی مسائل کے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ تم کراچی میں اس مسئلے کو پیش کرنا اور ایک رزولیوشن کا مشودہ بنا کر مجھے دکھانا۔ چنانچہ میں نے کراچی میں رزولیوشن ترتیب دیا اور انھوں نے اس میں کچھ تغیر و تبدل بھی کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ رزولیوشن کو کمیٹی میں پیش کرنے سے پہلے ان میں اور مجھ میں الفاظ کے متعلق اتفاق رائے ہو جائے۔ مجھے کئی مسودے بنانے پڑے جس کی وجہ سے کئی روز کی دیر ہوئی اور یوں بھی ہم اور کاموں میں الجھے رہے۔ آخر کار ایک ایسا مسودہ بن گیا جس پر گاندھی جی کا اور میرا اتفاق ہو گیا اور پہلے ورکنگ کمیٹی اور پھر سبجیکٹس کمیٹی میں پیش کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سبجکٹس کمیٹی کے لئے بالکل نئی چیز تھی اور بعض ممبروں کو اس پر حیرت ہوئی۔ بہر حال کمیٹی اور کانگرس میں یہ رزولیوشن بڑی آسانی سے پاس ہو گیا اور آل انڈیا کمیٹی کی سپرد کر دیا گیا کہ وہ ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر جو اس میں قائم کئے گئے ہیں، اس کی توضیح اور تفصیل کرے۔

جب میں اس رزولیوشن کو ترتیب دے رہا تھا تو مختلف لوگوں سے جو میرے

خیمے میں آتے تھے، اس کے بارے میں مشورہ بھی کرتا تھا۔مگر م۔ن۔ رائے کو اس سے مطلق کوئی تعلق نہ تھا اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کریں گے۔ اوراسی کی ہنسی اڑائیں گے۔

مجھے کراچی آنے سے چند دن پہلے الہ آباد میں م۔ن۔ رائے سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ایک روز شام کووہ اچانک ہمارے یہاں آپہنچے اوراگر چہ مجھے شان گمان بھی نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں ہیں مگر میں نے انھیں پہچان لیااس لئے کہ ۲۷ء میں انھیں ماسکو میں دیکھ چکا تھا۔ کراچی میں بھی ان میں سے ملاقات ہوئی مگر صرف پانچ منٹ کے لئے۔پچھلے چند سال کے عرصے میں رائے نے میرے سیاسی رویے کی مذمت میں بہت کچھ لکھا تھااور کبھی کبھی ''مجھے'' اس سے کسی قدر تکلیف بھی پہنچی تھی۔ ہم دونوں میں بہت کچھ اختلافات تھے مگراس کے باوجود مجھے ان سے ایک تعلق خاطر تھااور جب وہ گرفتار کئے گئے تو جہاں تک مجھ سے ممکن ہوسکا میں نے ان کی مدد کی۔ میں ان کی ذہنی قابلیت کی وجہ سےان کی قدر کرتا تھااور مجھے ان سے اس وجہ سے بھی ہمدردی ہوگئی تھی کہ انھیں سب سے چھوڑ دیا تھااور وہ بالکل بے یارو مددگار رہ گئے تھے۔ برطانوی حکومت ان کے پیچھے بڑی ہوئی تھی۔ ہندوستان کےقومیت پسندوں کوان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اوروہ لوگ جواپنے آپ کواشتمالی کہتے ہیں ان پر غداری کا الزام لگاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ برسوں روس میں رہنے اوراشتمالیوں کی بین الاقوامی مجلس سے اتحادعمل کرنے کے بعد وہ اس سے الگ ہوگئے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی کیا وجہ تھی اور نہ مجھے اب تک مبہم افواہوں کے سوا یہ معلوم ہے کہ ان کے موجودہ خیالات کیا ہیں اور انھیں اشتمالیوں سے کس بات میں اختلاف ہے۔ مگر مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوئی کہ ان جیسے شخص کا کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھااس لئے اپنی عادت کے خلاف میں ان کی طرف سے پیروی کرنے والی کمیٹی میں شریک ہوگیا۔ ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں

انھیں سزا ہو گئی۔ اب تین سال سے وہ قریب قریب قید تنہائی میں ہیں اور ان کی صحت اچھی نہیں رہتی۔

کراچی کانگرس کی آخری کاروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے آئندہ سال کے لئے نئی ورکنگ کمیٹی منتخب کی۔ اس کمیٹی کا انتخاب آل انڈیا کانگرس کمیٹی کرتی ہے مگر کچھ عرصے سے یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ جو شخص کانگرس کا صدر ہوتا ہے وہ (گاندھی جی اور کبھی کبھی بعض اور رفیقوں کے مشورے سے) ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے نام تجویز کرتا ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا۔ جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔آل انڈیا کانگرس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا۔ جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔آل انڈیا کانگرس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا۔جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بعض ممبروں کو اس انتخاب پر خصوصاً ایک (مسلمان کے) نام پر اعتراض تھا۔ شاید انھیں یہ شکایت بھی تھی کہ ان کے حلقے میں سے کوئی نہیں لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ آدمیوں کی آل انڈیا کمیٹی میں ہر گروہ کی نمائندگی ناممکن تھی اور اصل نزاع جس کا ہمیں کچھ علم نہیں تھا۔محض ذاتی اور مقامی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتراض کرنے وال اگروہ رفتہ رفتہ کانگرس سے علیحدہ ہو گیا۔اور اس نے ''مجلس حرار'' کے نام سے اپنی ایک انجمن بنالی۔ پنجاب کے بعض نہاتے سرگرم اور ہر دلعزیز مسلمان کانگرسی کارکن اس انجمن میں شریک ہو گئے اور انھوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ لوگ زیادہ تر نیچے اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عام مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔ یہ ایک

زبردست انجمن بن گئی جو اونچے طبقے کے فرقہ پرست مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔ یہ
ایک زبردست انجمن بن گئی جو اونچے طبقے کے فرقہ پرست مسلمانوں کی فرسودہ
جماعت سے کہیں زیادہ قوت رکھتی تھی۔ اس لئے کہ اس جماعت کی کاروائیاں محض
ہوائی تھیں یا یوں کہنا چاہئے کہ محض دیوان خانوں اور کمیٹی کے کمروں تک محدود تھیں
لازمی طور پر احرار کی انجمن رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کی طرف مائل ہوگئی مگر چونکہ ان کا تعلق
عام مسلمانوں سے تھا اس لئے وہ ایک زندہ جماعت تھی اور بعض مبہم معاشی خیالات
بھی رکھتی تھی۔ آگے چل کر دیسی ریاستوں، خصوصاً کشمیر کے مسلمانوں کی شورشوں
میں جہاں بد قسمتی سے معاشی شکایتیں فرقہ پرستی میں گڈمڈ ہوگئی تھیں احرار نے بہت
اہم حصہ لیا۔ احرار پارٹی کے بعض لیڈروں کے کانگرس سے الگ ہو جانے سے
پنجاب کی کانگرس کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر کراچی میں ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں
تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے الگ ہونے کی وجہ صرف وہ ناراضی ہی نہیں تھی جو ورکنگ
کمیٹی کے انتخاب سے پیدا ہوئی۔ یہ تو محض ایک علامت تھی جس سے صورت حال
کا اظہار ہوگیا۔ اصل اسباب کچھ اور تھے۔

کراچی میں ہمیں کانپور کے ہندو مسلمانوں کے فساد کی اطلاع پہنچی، اور اس
کے بعد ہی یہ خبر بھی آئی کہ گنیش شنکر ودیارتھی کو عوام کے غضب ناک مجمع نے جس کی
وہ مدد کرنا چاہتے تھے۔ قتل کر دیا۔ خوفناک اور وحشیانہ فسادیوں ہی کیا کم تھا مگر
ہمیں اس کے ہولناک نتائج کا اندازہ سب سے زیادہ گنیش جی کی موت سے ہوا۔
کانگرس کے کیمپ میں ہزاروں آدمی ان کے جاننے والے تھے اور ہم صوبہ متحدہ
والوں کے تو وہ عزیز ترین دوست اور رفیق تھے۔ یہ بہادر اور نڈر جوان دوراندیشی
اور اصابت رائے میں بوڑھوں کو مات کرتا تھا۔ وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا تھا اور چپ
چاپ اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ شہرت اور عزت، عہدے اور منصب کی اسے ذرا
بھی پرواہ نہ تھی۔ جوانی کی ترنگ میں اس نے جان بوجھ کر اس مقصد کے لئے جس

کی محبت اور خدمت کو وہ اپنا دھرم جانتا تھا اپنی جان جوکھم میں ڈال دی۔ نادانوں نے اسے مار کر گرا دیا اور کانپور کیا سارے صوبے کو اس گوہر تاباں سے محروم کر دیا جس کی جودت کا ان کے پاس اور کوئی ہیرا نہ تھا۔ اس خبر کے آتے ہی کراچی کے صوبہ متحدہ کے کیمپ میں اداسی چھا گئی اور اس کی ساری چمک دمک ماند پڑ گئی۔ مگر اسی کے ساتھ ہمیں اس پر ناز تھی کہ اس نے اس آن بان سے موت کا سامنا کیا اور اس شان سے جان دی۔

لنکا کی سیر

میرے معالج ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ تم کچھ دن آرام کرو اور تبدیل آب وہوا کے لئے کہیں چلے جاؤ۔ چنانچہ میں نے یہ طے کیا کہ ایک مہینہ سیلون میں گذاروں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے مگر اس میں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جہاں میرے مشاغل بدل سکیں یا میرے دماغ کو آرام مل سکے۔ اس لئے کہ میں جہاں کہیں جاتا وہاں میرے سیاسی رفیق کار موجود ہوتے اور یں ایک ہی قسم کے مسائل میں الجھا رہتا۔ سیلون چلے گئے۔ ۲۷ء میں یورپ سے واپس آنے کے بعد میں نے یہ پہلی چھٹی لی تھی اور بہت دن کے بعد موقع ملا تھا کہ میں ہر قسم کی فکروں سے محفوظ ہو کر اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دن امن اور سکون سے بسر کروں۔

مگر سچ پوچھئے تو ہمیں نوارا ایلیا کے دو ہفتے کے قیام کے سوا سیلون میں بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ وہاں ہر طبقے کے لوگوں نے ہماری اس قدر خاطر تواضع کی کہ ہم بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی ان عنایتوں سے جی بہت خوش ہوتا تھا مگر بعض وقت بڑی مشکل پڑ جاتی تھی۔ نوارا ایلیا میں روزانہ چائے کے باغ میں کام کرنے والوں اور دوسرے مزدوروں کی ٹولیاں میلوں چل کر ہم سے ملنے آتی تھیں اور ہمارے لئے جنگلی پھول، ترکاریاں، گھر کا بنا ہوا مکھن لاتی تھیں۔ عموماً ہم آپس میں گفتگو تک نہیں کر سکتے تھے۔ بس ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا مکان ان تحفوں سے بھر جاتا تھا جو وہ اپنی ذرا سی پونجی میں سے ہمیں دیتے تھے اور ہم انھیں مقامی ہسپتال اور یتیم خانوں میں بھیج دیا کرتے تھے۔

ہم جزیرے کی بہت سی قابل دید چیزیں، تاریخی عمارتیں، بودھ مذہب کی خانقاہیں اور گرم خطے کے ہرے بھرے جنگل دیکھنے جایا کرتے تھے۔ انورادھ پور میں مجھے بدھ کی ایک رات پرانی بیٹھی مورت بہت پسند آئی۔ ایک سال بعد جب میں دہرہ دون کے جیل میں تھا۔ سیلون سے ایک دوست نے مجھے اس مورت کی

تصویر بھیجی جو میں نے اپنی کوٹھری میں میز پر رکھ لیک۔ وہ ایک میرے لئے ایک قابل قدر رفیق ثابت ہوئی۔ بودھ کے باوقار اور پر سکون چہرے کو دیکھ کر مجھے تسکین اور تقویت ہوتی تھی اور بارہا مجھے اس سے اپنی افسردگی اور اداسی کو دور کرنے میں مدد ملی۔

بودھ کا مجھ پر ہمیشہ سے بہت اثر ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اثر کس کا ہے اسے مذہبی عقیدت نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ بودھ مذہب کے عقائد سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے جو چیز کھینچتی ہے وہ بودھ کی شخصیت ہے۔ اسی طرح مسیح کی شخصیت بھی میرے لئے بڑی کشش رکھتی ہے۔

میں نے خانقاہوں میں اور شاہراہوں پر بہت سے بودھ بھکشو (راہب) دیکھے۔ ان کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے۔ قریب قریب ان سب کے چہرے پر سکون اور اطمینان کا رنگ چھایا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی فکروں سے آزاد ہیں۔ عموماً ان کے بشرے سے ذہانت ظاہر نہیں ہوتی اور شدید ذہنی کش مکش کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے لئے زندگی ایک سب روندی ہے جو سرمدی سمندر کی طرف بہتی چلی جارہی ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے کسی قدر رشک آتا تھا اور میرے دل میں امن و عافیت کی ایک خفیف سی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ مگر میں خوب جانتا تھا کہ یہ زندگی میرے حصے میں نہیں آئی ہے۔ میری کشتی حیات طوفان و تلاطم کے لئے وقف ہے۔ میرے لئے امن کی کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے کہ میرے اندر ویسا ہی شدید طوفان برپا ہے جیسا باہر ہے۔ اور فرض کیجئے میں کسی پر امن بندرگاہ میں پہنچ جاؤں، جو تند و تیز ہواؤں سے محفوظ ہو، تو کیا میں وہاں خوش اور مطمئن رہ سکوں گا؟

کچھ دنوں کے لئے یہ گوشہ عافیت ضرور خوش گوار تھا۔ جہاں میں آرام سے لیٹا، خواب و خیال کا لطف اٹھاتا تھا اور میں نے اپنے آپ کو اس دلفریب پر سکون او

رطاقت ربا خطے کے آغوش میں دے دیا تھا۔ سیلون اس زمانے میں میری قلبی کیفیت سے مناسبت رکھتا تھا اور اس کے خوش نما مناظر میرے دل کو راحت و مسرت بخشتے تھے۔ ہمارا چھٹی کا مہینہ بہت جلد گذر گیا اور ہم حسرت و افسوس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے۔ مجھے سیلون اور اس کے باشندوں کی بہت سی باتیں اب تک یاد آتی ہیں۔ ان کی یاد قید کی لمبی کٹھن اور سنسان گھڑیوں میں میری مونس اور ہمدم رہی۔ ایک چھوٹا سا واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ شاید ہم جانتا کے قریب تھے کہ ایک مدرسے کے استادوں اور لڑکوں نے ہماری موٹر روکی اور خیر مقدم کے چند الفاظ کہے۔ لڑکوں کے چہرے جوش اور شوق سے چمک رہے تھے۔ یکایک ان میں سے ایک میرے پاس آیا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور آپ ہی آپ بغیر کسی تمہید کے کہا "میرا قدم نہیں ڈگمگائے گا" اس بچے کا ہونہار چہرہ جس کی آنکھوں سے عزم و استقلال ٹپک رہا تھا میرے دل پر نقش ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا۔ میں اس کا پتہ نہیں چلا سکا۔ مگر یہ جانے کیوں مجھے دل سے یقین ہے کہ وہ اپنے قول پر قائم رہے گا اور جب اسے زندگی کی مشکلات کا سامنا ہوگا تو اس کا قدم نہیں ڈگمگائے گا۔

سیلون سے چل کر ہم ہندوستان کے آخری جنوبی سرے راس کماری پر اترے۔ وہاں ایک حیرت انگیز سکون کا عالم تھا۔ اس کے بعد ٹراونکور، کوچین، ملابار میسور، حیدر آباد سے گذرے۔ ان میں سے اکثر دیسی ریاستیں ہیں۔ بعض بہت ترقی کر رہی ہیں اور بعض انتہائی پستی کی حالت میں ہیں۔ ٹرانکور اور کوچین تعلیم میں اور میسور غالباً صنعت و حرفت میں برطانوی ہند سے کہیں آگے ہیں۔ حیدر آباد جاگیرداری نظام کے زمانے کے قریب قریب مکمل نشانی ہے۔ ہمارا خیر مقدم ہر جگہ رعایا اور حکام دونوں کی طرف سے بڑے اخلاق اور تپاک سے کیا گیا مگر حکام کے اس تپاک میں یہ بات صاف جھلک رہی تھی کہ وہ بہت پریشان ہیں کہ کہیں ہمارے

آنے کی وجہ سے لوگوں میں خطرناک خیالات نہ پیدا ہو جائیں۔ میسور اور ٹراونکور میں ان دنوں رعایا کو کسی قدر قانونی آزادی اور سیاسی کام کے مواقع حاصل تھے۔ حیدرآباد میں یہ بھی نہ تھا۔ بعد میں میسور اور ٹرانکور کی حکومتوں نے وہ تھوڑی بہت قانونی آزادی اور سیاسی جدوجہد کی اجازت بھی واپس لے لی جو انھوں نے پہلے دے رکھی تھی۔

میسور کی ریاست میں بنگلور کے مقام پر میں نے ایک عظیم الشان جلسے میں لوہے کے ایک بہت بڑے کھمبے پر قومی جھنڈا اچڑھا دیا تھا۔ میرے وہاں سے آنے کے تھوڑے ہی دن بعد یہ کھمبا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا۔ اور قومی جھنڈے کا لگانا اور لے چلنا جرم قرار دے دیا گیا۔ مجھے اس جھنڈے کی توہین سے جو میں نے نصب کیا تھا سخت تکلیف ہوئی۔

ٹرانکور میں آج بھی کانگرس خلاف قانون جماعت ہے اور کوئی شخص لوگوں کو اس کا ممبر نہیں بنا سکتا حالانکہ برطانوی ہند میں سول نافرمانی کے موقوف ہو جانے کے بعد کانگرس مطابق قانون قرار دے دی گئی ہے۔ غرض میسور اور ٹرانکور دونوں ریاستیں پرامن سیاسی جدوجہد کو کچل رہی ہیں اور انھوں نے وہ رعایتیں جو پہلے دے رکھی تھیں واپس لے لی ہیں۔ حیدرآباد کو پیچھے ہٹنے یا رعاتیوں کو واپس لینے کی ضرورت ہی نہ تھی اس لئے کہ وہ نہ ہیں۔ حیدرآباد کو پیچھے ہٹنے یا رعاتیوں کو واپس لینے کی ضرورت ہی نہ تھی اس لئے کہ وہ نہ کبھی آگے بڑھا تھا اور نہ اس نے کوئی رعایتیں دی تھیں۔ سیاسی جلسوں کا تو حیدرآباد میں کوئی نام تک نہیں جانتا تھا۔ بلکہ سماجی اور مذہبی جلسے بھی شبہے کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کے لئے خاص طور پر اجازت لینی پڑتی ہے۔ خود وہاں سے کوئی معقول اخبار نہیں نکلتا اور باہر کے زہر کو روکنے کے لئے بہت سے اخباروں کا جو ہندوستان کے مختلف حصوں سے شائع ہوتے ہیں داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس میں یہاں تک سختی کی جاتی ہے کہ اعتدال

پسند اخبار بھی نہیں آنے پاتے۔

کوچین میں ہم ''گورے یہودیوں'' کے محلے میں گئے اور انھیں ان کے قدیم ''خیمہ عبادت'' میں عبادت کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک بہت پرانا اور عجیب و غریب چھوٹا سا فرقہ ہے اور اب اس کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ کوچین کا وہ حصہ جس میں یہ لوگ رہتے ہیں قدیم یروشلم سے مشابہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دیکھنے میں بہت قدیم معلوم ہوتا ہے۔ ہم ان قصبوں میں بھی گئے جو ملابار کی اندرونی کھاڑیوں کے کنارے آباد ہیں۔ ان میں زیادہ تر شامی کلیسا کے پیرو عیسائی رہتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ عیسائی مذہب ہندوستان میں پہلی صدی عیسوی ہی میں پہنچ گیا تھا اور اس نے جنوبی ہند میں مضبوطی سے قدم جما لیا تھا۔ اگرچہ ان عیسائیوں کا مذہبی پیشوا انطاکیہ یا شام کے کسی شہر میں رہتا ہے لیکن ان کا مذہب قریب قریب دیسی ہے اور اسے باہر کے لوگوں سے بہت کم واسطہ ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جنوب میں نسطوریوں کی بھی ایک آبادی ہے ان کے بشپ نے کہا کہ ان لوگوں کی تعداد دس ہزار ہے۔ میں یہی سمجھا کرتا تھا کہ نسطوری مدت میں بھی فروغ پایا تھا۔ مگر مجھے یہ بتایا گیا کہ کسی زمانے میں ہندوستان میں بھی اس کے بہت پیرو تھے اور شمال میں بنارس تک پھیلے ہوئے تھے۔

ہم حیدرآباد خاص طور پر سروجنی نائڈو اور ان کی لڑکیوں پدمجا اور لیلا منی سے ملنے کے لئے گئے تھے اور انھیں کے یہاں ٹھہرے تھے۔ ہمارے قیام کے زمانے میں وہاں پردہ نشین خواتین کا ایک چھوٹا سا جلسہ میری بیوی سے ملنے کے لیے منعقد ہوا۔ معلوم ہوا کہ کملا نے ان کے سامنے ایک تقریر بھی کی اور شاید اس میں عورتوں کی جنگ آزادی کا ذکر کیا جو وہ مردوں کے بنائے ہوئے رسوم وقوانین سے کر رہی ہیں (یہ موضوع اسے بہت پسند تھا) اس سلسلے میں اس نے ان سے کہا کہ تمہیں

اپنے مردوں کے حد سے زیادہ اطاعت نہیں کرنی چاہئے۔ اس کا ایک دلچسپ نتیجہ ہوا۔ دو تین ہفتے کے بعد حیدر آباد سے کسی شخص نے بڑی پریشانی کی حالت میں کملا کو خط لکھا کہ آپ کے یہاں آنے کے بعد سے میری بیوی کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے وہ خلاف معمول اب میری کوئی بات نہیں مانتی۔ ہر کام میری مرضی کے خلاف کرتی ہے۔ ہر وقت بحث کرتی رہتی ہے بلکہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

جس دن ہم بمبئی سے سیلون روانہ ہوئے تھے اس کے ساتھ ہفتے بعد وہاں واپس پہنچ گئے اور میں پھر کانگرس کی سیاست کے بھنور میں پڑ گیا۔ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا اور اس میں بعض نہایت اہم مسائل پر غور کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان کی بدلتی ہوئی حالت، صوبہ متحدہ کے کسانوں کی حیرت انگیز ترقی، بنگال کی برہمی، دبا ہوا غصہ بے چینی، سدا بہار فرقہ وارانہ مسئلہ، چھوٹی چھوٹی مقامی نزاعیں، کانگرس اور ملازمان سرکار کے بہت سے جھگڑے جن میں ایک دوسرے پر معاہدہ دہلی کی خلاف ورزی کا الزام لگاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سوال تھا جو ایک مدت سے بار بار اٹھ رہا تھا:۔ کیا کانگرس کی نمائندگی گول میز کانفرنس میں ہونی چاہئے؟ کیا مہاتما گاندھی کو اس میں شرکت کرنی چاہئے؟

صلح کے زمانے میں حکومت اور کانگریس کے جھگڑے

گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن جائیں یا نہ جائیں؟ یہ سوال بار بار اٹھتا تھا اور اس کو کوئی صاف جواب نہیں ملتا تھا۔ آخر وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا فیصلہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ورکنگ کمیٹی اور خود گاندھی جی کو بھی خبر نہ تھی۔ فیصلہ بہت سی باتوں پر موقوف تھا اور نئے واقعات کی وجہ سے صورت حال روز بدلتی رہتی تھی۔ اس سوال اور اس کے جواب کی تہ میں بہت سے مشکل سوال پوشیدہ تھے۔

برطانوی حکومت اور اس کے دوستوں کی طرف سے ہم سے بار بار کہا جاتا تھا کہ گول میز کانفرنس پہلے ہی دستور اساسی کا ڈھانچا بنا چکی ہے۔ تصور کا خاکہ تیار ہے۔ صرف رنگ بھرنے کی کسر ہے۔ مگر کانگریس کا یہ خیال نہیں تھا۔ اس کی طرف سے تو تصویر کورے پردے پر نئے سرے سے بنائی جانے والی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ دہلی کے معاہدے میں وفاق کو تو ہم میں سے اکثر بہت پہلے سے ہندوستان کے دستور اساسی کا بہترین حل سمجھتے تھے اور اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ اس خاص وفاقی نظام کو تسلیم کرلیا ہے جو پہلی گول میز کانفرنس نے تجویز کیا تھا۔ وفاقی حکومت میں سیاسی آزادی اور سماجی تبدیلیوں کی پوری طرح گنجائش بھی تھی مگر تحفظات کا اس کے ساتھ کھپنا بہت مشکل تھا۔ معمولی صورت میں تحفظات کو وجود ملک سے اقتدار اعلیٰ میں بہت کچھ کمی کردیتا مگر چونکہ ان کے ساتھ ''ہندوستان کے فائدے'' کی شرط لگی ہوئی تھی اس لئے یہ مشکل کسی قدر آسان ہوگئی تھی مگر پھر بھی پوری طرح حل نہیں ہوئی تھی اس لئے یہ مشکل کسی قدر آسان ہوگئی تھی مگر پھر بھی پوری طرح حل ہوئی تھی۔ بہرحال کراچی کانگریس نے اس بات کو صاف کردیا تھا کہ وہی دستور قابل قبول ہوگا جس کی رو سے ہندوستان کو فوج، امور خارجہ، مالی اور معاشی پالیسی پر پورے پورے اختیارات دئے جائیں اور وعدہ کیا جائے کہ بیرونی قرضوں کی ذمہ

داری ہندوستان پر ڈالنے سے پہلے اس کی اچھی طرح چھان بین کر لی جائے گی کہ اس پر دوسرے ملکوں (خصوصاً انگلستان) کا واقعی قرضہ کتنا ہے۔ اس کے علاوہ بنیادی حقوق کے رزولیوشن میں بھی بعض معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کو جو ہمیں مطلوب تھیں ذکر کر دیا گیا تھا۔ یہ سب چیزیں گول میز کانفرنس کے بہت سے فیصلوں اور ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

کانگرس اور برطانوی حکومت کے نقطہ نظر میں زمین آسمان کا فرق تھا اور یہ بات قیاس میں نہیں آتی تھی کہ موجودہ صورت میں یہ فرق دور ہو سکتا ہے۔ بہت کم کانگریسیوں کو یہ توقع تھی کہ گول میز کانفرنس میں حکومت اور کانگرس کے درمیان کسی قسم کی مفاہمت ممکن ہے اور گاندھی جی کو بھی باوجود اپنی امید پروری کے کچھ زیادہ امید نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھے اور انھوں نے ٹھان لی تھی کہ آخر تک کوشش کرتے رہیں گے۔

ہم سب کی رائے تھی کہ خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو دہلی کے معاہدے کے مطابق ایک بار کوشش ضرور کرنے چاہئے مگر دو اہم مسئلے تھے جن سے اندیشہ تھا کہ ہمارے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے میں حائل ہوں گے۔ ہم اسی صورت میں جا سکتے تھے کہ ہمیں گول میز کانفرنس میں اپنے پورے مطابقات پیش کرنے کی آزادی دی جائے اور یہ کہہ کر کہ معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے یا کسی اور بہانے سے ہماری زبان بند نہ کی جائے۔ پھر اس کا بھی امکان تھا کہ ہندوستان کے حالات ہمیں گول میز کانفرنس میں نہ جانے دیں۔ شاید یہاں ایسی صورت پیش آتی کہ حکومت سے جنگ چھڑ جاتی اور ہم پر سختیاں شروع ہو جاتیں۔ اگر ہندوستان میں ایسا واقعہ ہو جاتا اور ہمارے گھر میں آگ لگ جاتی تو یہ کتنی نامناسب بات ہوتی کہ ہمارا کوئی نمائندہ گھر جلتا چھوڑ کر لندن میں بیٹھا دستور اساسی وغیرہ کے متعلق نظری بحثیں کرتا رہے۔

ہندوستان میں صورت حال روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی۔ اس کے آثار ہر جگہ نظر آتے تھے مگر بنگال، صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد میں خاص طور پر نمایاں تھے۔ بنگال میں دہلی کے معاہدے کا کوئی اثر نہیں ہوا، جو حالت تھی وہی رہی۔ بلکہ اور بدتر ہوگئی۔ سول نافرمانی کے کچھ قیدی چھوڑ دئے گئے تھے مگر ہزارہا سیاسی کارکن جو اصطلاحی طور پر سول نافرمانی کے قیدی نہیں تھے، اب تک جیل میں تھے ان کے علاوہ بہت سے نظر بند قید خانوں میں یا نظر بندوں کے کیمپ میں قید تھے۔ لوگ اب تک "باغیانہ" تقریریں کرنے یا کسی اور قسم کی سیاسی جدوجہد کے الزام میں برابر گرفتار ہورہے تھے۔ غرض عام طور پر یہ محسوس ہورہا تھا کہ حکومت کے سختیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کانگرس کے لئے بنگال کا مسئلہ غیر معمولی طور پر مشکل تھا اس لئے کہ وہاں تخویف پسندی اب تک موجود تھی۔ سچ پوچھئے تو کانگرس کی معمول کی جدوجہد اور سول نافرمانی کے مقابلے میں تخویف پسندوں کی سرگرمیاں وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے بہت کم تھیں مگر ان کا شور بہت تھا اور اس لئے لوگوں کی ان کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ پھر ان کی وجہ سے کانگرس کے کام میں بھی دشواریاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس لئے کہ تخویف پسندی کی فضا با امن عملی جدوجہد کے لئے سازگار نہیں تھی۔ حکومت کو ان کی وجہ سے انتہائی تشدد کا موقع مل گیا اور اس نے بلا تفریق تخویف پسندوں اور غیر تخویف پسندوں سب پر سختی شروع کردی۔

بہت مشکل تھا کہ پولیس اور مقامی انتظامی افسر، ان خاص قوانین اور ضوابط سے جو تخویف پسندوں کے لئے بنائے گئے تھے، کانگریسیوں، کسان اور مزدور کارکنوں اور دوسرے لوگوں کے خلاف، جن کی سرگرمیاں انھیں ناپسند تھیں، کام نہ لیں۔ ممکن ہے کہ بہت سے نظر بندوں کا جو بغیر کسی الزام یا تحقیقات یا سزا کے برسوں سے قید تھا، اصل جرم تخویف پسندانہ جدوجہد نہیں بلکہ کسی اور قسم کی موثر سیاسی جدوجہد ہو۔ انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ کبھی نہیں بتایا گیا

کہ انھوں نے کون سا گناہ کیا ہے۔ ان پر مقدمہ اسی لئے نہیں چلایا جاتا ہوگا کہ پولیس کے پاس انھیں سزا دلانے کے لئے کافی شہادت نہ ہوگی حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ برطانوی ہند میں جرائم خلاف سرکار کے متعلق بہت مکمل اور جامع قوانین موجود ہیں۔ جن کے جال سے نکلنا مشکل ہے اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص عدالت سے رہا ہو جاتا ہے مگر فوراً ہی دوبارہ گرفتار کر کے نظر بند کر دیا جاتا ہے۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی بنگال کے اس پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے سے معذور تھی۔ وہ ہمیشہ اسی الجھن میں رہتی تھی اور آئے دن بنگال کو کوئی نہ کوئی معاملہ کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے رہا کرتا تھا۔ اس سے جو کچھ ہو سکتا تھا کرتی تھی مگر اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اصل میں اس جھگڑے کو نبٹانا اس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اس نے واقعات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس سے اس کی کمزوری ضرور ہوتی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ موجودہ صورت میں وہ اور کیا کر سکتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے اس رویے سے بنگال میں ناراضی پھیل گئی اور لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ کانگرس کی مجلس عاملہ اور دوسرے صوبے بنگال سے بے پروائی برت رہے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نازک وقت میں سب بنگال کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ یہ خیال بالکل غلط تھا اس لئے کہ سارے ہندوستان کو بنگال سے انتہائی ہمدردی تھی مگر اس ہمدردی کو عملی صورت میں لانے کی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر صوبے کے لوگ خود اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔

صوبہ متحدہ کے کاشتکاروں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ صوبے کی حکومت ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی اور لگان اور مالگذاری کی تخفیف کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرتی تھی اس نے جبریہ وصولی شروع کر دی تھی۔ ہر جگہ بیدخلیاں اور قرقیاں ہو رہی تھیں۔ جن دنوں ہم سیلون میں تھے یہاں دو تین جگہ جبریہ وصولی کی وجہ سے بلوے بھی ہو گئے۔ یہ بلوے یوں تو بہت معمولی تھے مگر بدقسمتی سے ان

میں کوئی زمیندار یا اس کا کارندہ مار ڈالا گیا تھا۔ گاندھی جی اسی زمانے میں نینی تال گئے اور انھوں نے صوبہ متحدہ کے گورنر سر مالکم ہیلی سے کاشتکاروں کے معاملے میں گفتگو کی۔ مگر اس گفتگو کا خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ جب حکومت نے تخفیف کا اعلان کیا تو وہ لوگوں کی توقعات سے بہت کم تھی۔ دیہات میں ہل چل مچی ہوئی تھی اور روز بروز بڑھتی جاتی تھی کاشتکاروں پر حکومت اور زمینداروں کا متفقہ دباؤ پڑ رہا تھا، ان کے کھیت چھینے جا رہے تھے، اور ان کے برتن بھانڈے قرق ہو رہے تھے۔ یہ صورت اگر کسی اور ملک میں ہوتی تو کاشتکاروں میں عام شورش پھیل جاتی۔ میرے خیال میں یہ زیادہ تر کانگرس کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ کسان تشدد سے باز رہے مگر ان پر دل کھول کر تشدد کیا جا رہا تھا۔

کاشتکاروں کی بے چینی اور مصیبت کا ایک روشن پہلو بھی تھا۔ زراعتی پیداوار کی ارزانی کی وجہ سے غریبوں کو پیٹ بھر کھانے کو مل جاتا تھا، جو انھیں مدت سے نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس سے کاشتکار بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ سوا ان بیچاروں کے جن کی ساری پونجی ضبط ہو گئی تھی۔

بنگال کی طرح صوبہ سرحد کو بھی دہلی کے معاہدے سے امن نصیب نہیں ہوا۔ وہاں ہر وقت ایک کشاکش کی حالت رہتی تھی۔ حکومت فوجی طریقے کی تھی، جس میں خاص قوانین اور ضوابط سے کام لیا جاتا تھا اور ذرا ذرا سے قصور پر بہت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس استبداد کا مقابلہ کرنے کے لیے عبدالغفار خاں نے ایک زبردست تحریک اٹھائی اور تھوڑے دن میں حکومت انھیں ہوا سمجھنے لگی۔ چھ فٹ تین انچ کا یہ شاندار پٹھان گاؤں گاؤں پیدل پھرتا تھا اور سرخ پوشوں کا ایک سلسلہ بنتا جاتا تھا اور تھوڑے دن میں خدائی خدمتگاروں کی انجمن کی شاخیں سارے صوبے میں پھیل گئیں۔ یہ لوگ بالکل با امن تھے اور باوجودیکہ ان پر بہت سے مبہم الزامات لگائے گئے لیکن کسی طرح یہ ثابت نہ ہو سکا کہ انھوں نے ایک بار بھی تشدد

سے کام لیا۔ مگر وہ امن ہوں یہ نہ ہوں یہی کیا کم تھا کہ وہ جنگ و جدل کی روایات کے وارث ہیں اور سرحد کے قریب رہتے ہیں ان کی منضبط تحریک کو، جو ہندوستان کی قومی تحریک سے وابستہ تھی۔ اس تیزی سے بڑھتے دیکھ کر حکومت بدحواس ہوگئی۔ شاید اسے یقین نہ آتا تھا کہ ان کا امن اور عدم تشدد کا دعوی سچا ہے۔ لیکن اگر وہ اسے یقین بھی کر لیتی تب بھی اسے خوف اور پریشانی ضرور ہوتی۔ ان کی تحریک کی واقعی اور امکانی قوت اتنی بڑی تھی کہ حکومت اسے سکون قلب کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس عظیم الشان تحریک کے مسلمہ رہنما عبدالغفار خاں تھے جو "فخر افغان" اور "سرحدی گاندھی" کہلاتے تھے۔ انھیں صرف اس وجہ سے صوبہ سرحد میں حیرت انگیز ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی تھی کہ وہ خاموشی اور استقلال سے کام کرتے تھے اور کسی قسم کی مشکلات اور حکومت کی سختیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آج کل کی سیاست کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں ان کے لحاظ سے وہ کوئی سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ انھیں سیاست کے داؤں پیچ اور چالیں نہیں آتیں وہ ایک راست قامت راستباز آدمی ہیں۔ شور مچانا اور باتیں بنانا نہیں جانتے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ اپنے صوبہ سرحد کی آزادی چاہتے ہیں مگر دستور اساسی کے مسائل اور قانونی موشگافیوں میں نہ انھیں کچھ دخل ہے اور نہ ان چیزوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ کامیابی کے لئے عمل کی ضرورت ہے اور مہاتما گاندھی نے باامن عمل کی جو عجیب و غریب مثال قائم کی تھی وہ انھیں پسند آ گئی اس لئے بحث مباحثے اور قواعد و ضوابط کے بغیر انھوں نے اپنی قوم کی تنظیم شروع کر دی اور اس میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

انھیں گاندھی جی سے ایک خاص انس ہے مگر ان کی طبیعت میں حجاب بہت ہے اور وہ اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرنا چاہتے اس لئے ابتدا میں وہ ان سے الگ الگ

رہے۔ آگے چل کر دونوں کو مختلف معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت پیش آئی اور پھر تعلقات کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح اس پٹھان نے عدم تشدد کو نہ صرف عملی طور پر اختیار کیا بلکہ اس کے اصول کو بھی تسلیم کر لیا جو ہم میں سے اکثر نے پورے طور پر نہیں کیا تھا۔ اسی خلوص کی وجہ سے انھیں اس میں کامیابی ہوئی کہ انہوں نے صوبہ سرحد کے لوگوں کو سخت اشتعال کے باوجود تشدد سے باز رکھا۔ یہ کہنا تو بالکل فضول ہے کہ صوبہ سرحد کے باشندوں نے تشدد کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔ ایک اسی پر کیا موقوف ہے کسی صوبے کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ عوام جذبات کے جوش میں کام کرتے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ جوش میں آ کر کیا کچھ نہ کر گذریں گے۔ مگر جس ضبط نفس سے صوبہ سرحد کے باشندوں نے ۱۹۳۰ء میں اور اس کے بعد کام لیا وہ ایک حیرت انگیز چیز ہے۔

سرکاری ملازم اور ہمارے بعض ڈرپوک ہم وطن "سرحد گاندھی" کو شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھیں یقین نہیں آتا کہ وہ اپنے قول پر عمل کریں گے۔ اور سمجھتے ہیں کہ اس میں ضرور کوئی گہری سازش ہے۔ مگر پچھلے چند سال میں ہندوستان کے اور حصوں کے کانگریسی کارکنوں کو عبدالغفور خاں اور سرحد کے دوسرے رفیقوں سے بہت کچھ سابقہ رہا ہے۔ ان میں آپس میں گہر دوستی ہوگئی ہے اور ایک دوسرے کی بڑی قدر اور عزت کرنے لگے ہیں۔ یوں تو عبدالغفار خاں کو کانگریس والے برسوں سے جانتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں مگر اب ان کی حیثیت محض انفرادی نہیں رہی بلکہ وہ سارے ہندوستان کی نظر میں اس بہادر اور جرار قوم کی شجاعت اور قربانی کے مظہر بن گئے ہیں جو ملک کی جنگ آزادی میں ہمارے دوش بدوش رہی۔

ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میں نے عبدالغفار خاں کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ جن دنوں میں کیمبرج میں پڑھتا تھا

وہ لندن کے سینٹ ٹامس اسپتال میں طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بعد جب میں لندن میں آیا اور بیرسٹری کے لئے انر ٹیمپل میں داخل ہوا تو ہم دونوں میں بڑی دوستی ہو گئی اور کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ میں لندن میں موجود ہوں اور ان سے ملاقات نہ ہو۔ میں انھیں انگلستان میں چھوڑ کر ہندوستان آ گیا اور وہ بہت عرصے تک وہاں رہے اور جنگ کے زمانے میں ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد پھر ان سے نینی جیل میں ملاقات ہوئی۔

صوبہ سرحد کے سرخ پوش کانگریس کے ساتھ کام کرتے تھے مگر ان کی انجمن اب تک علیحدہ تھی۔ یہ ایک انوکھے قسم کا تعلق تھا جس میں عبدالغفار خاں کی ذات واسطے کا کام دیتی تھی۔ ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں ورکنگ کمیٹی نے صوبہ سرحد کے لیڈروں کے ساتھ مل کر اس مسئلے پر اچھی طرح غور کیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ "سرخ پوش" کانگریس میں ضم کر لئے جائیں۔ اس طرح "سرخ پوش" کی تحریک کانگریس کے نظام کا ایک جزو بن گئی۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ کراچی کانگریس کے بعد سیدھے صوبہ سرحد جائیں۔ مگر حکومت نے اس پسند نہیں کیا۔ آئندہ مہینوں میں جب سرکاری ملازم "سرخ پوشوں" کی جدوجہد سے نالاں تھے انھوں نے بار بار اصرار کیا کہ مجھے صوبہ سرحد جانے کی اجازت دی جائے تاکہ میں خود وہاں کی حالت کو دیکھوں مگر حکومت نے ایک نہیں سنی۔ میرا وہاں جانا بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ معاہدہ دہلی کی وجہ سے ہم یہ مناسب نہیں سمجھتے تھے، کہ حکومت کی ممانعت کے باوجود صوبہ سرحد میں داخل ہوں۔

ایک اور مسئلہ جو ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش تھا، فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا جو نئے بھیس بدل کر آتا تھا۔ گول میز کانفرنس کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ برطانوی حکومت اسے سب پر مقدم رکھے گی اور رہر

چیز کو اسی پر منحصر کر دے گی۔ کانفرنس کے ممبر جو سب کے سب حکومت کے نامزد کئے ہوئے تھے۔ اسی نظریے سے منتخب کئے گئے تھے کہ فرقہ وارانہ مسائل کی اہمیت بڑھ جائے۔ اور مشترک اغراض کے بجائے اختلافات پر زور دیا جائے۔ یہاں تک کہ حکومت نے بڑی دیدہ دلیری سے قوم پرور مسلمانوں کے کسی لیڈر کو مزدر کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اگر کانفرنس برطانوی حکومت کے اشارے سے سب سے فرقہ وارانہ مسئلے میں الجھ گئی تو اصل سیاسی اور معاشی مسائل پر خاطر خواہ غور نہیں کیا جا سکے گا۔ ان حالات میں انکا کانفرنس میں شریک ہونا بے کار ثابت ہوگا۔ اس لئے انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے کہا کہ انہیں لندن اسی صورت میں جانا چاہئے۔ جب فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ سب فریقوں کی رضامندی سے ہو جائے۔ ان کا یہ خیال آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ مگر اس وقت کمیٹی نے ان کی رائے کو نہیں مانا اور یہ فیصلہ کیا۔ انہیں محض اس بناء پر لندن جانے سے انکار نہیں کرنا چاہئے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل نہیں کر پائے۔ کمیٹی نے یہ کوشش کی کہ مختلف فرقوں کے نمائندوں سے مشورہ کر کے کوئی متفقہ تجویز پیش کی جائے۔ مگر اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

یہ ان بڑے مسئلوں میں سے چند مسئلے تھے جو ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں ہمارے سامنے پیش تھے۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، ملک کے ہر حصے سے مقامی کانگریس کمیٹیوں کی شکائتیں آ رہی تھیں کہ سرکاری ملازموں نے فلاں فلاں موقع پر دہلی کے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ ان میں سے جو زیادہ اہم تھیں وہ ہم حکومت کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ادھر سے کانگرس والوں پر معاہدے کی خلاف ورزی کے الزام لگائے جاتے تھے۔ غرض دونوں طرف سے شکائتیں ہو رہی تھیں جو آگے چل کر اخباروں میں شائع کر دی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا کانگرس اور حکومت کے تعلقات پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ

چھوٹے چھوٹے جھگڑے بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اہمیت یہ تھی کہ ان سے ایک بنیادی کش مکش کا پتہ چلتا تھا۔ کش مکش افراد پر منحصر نہ تھی بلکہ اس کی بناء ہماری قومی تحریک کی نوعیت اور ہماری زرعی معیشت کی خرابی تھی اور اس کو دور کرنے کے لئے ادھوری کاروائیاں کافی نہیں تھیں بلکہ پورے نظام کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ ہماری تحریک کی ابتداء اس طرح ہوئی تھی کہ ہندوستان کا اونچا اوسط طبقہ اظہار خودی اور نشو و نما کے ذریعے ڈھونڈھتا تھا اور اس کہ تہہ میں سیاسی اور معاشی محرکات پوشیدہ تھے۔ پھر اس تحریک میں نیچا اوسط طبقہ بھی شامل ہو گیا اور اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔ اس کے بعد یہ لہر دیہات کے عام طبقے میں پہنچی جو بحیثیت مجموعی انتہائی پستی کی حالت میں تھا اور اب اس کے لئے اس پست ترین معیار زندگی کو قائم رکھنا بھی روز بروز دشوار ہوتا جاتا تھا۔ پرانی دیہی معیشت جس میں ہر گاؤں اپنی کل ضرورتیں خود پوری کر لیتا تھا کب کی ختم ہو چکی تھی۔

گھریلو صنعتیں جو زراعت کی معاون تھیں اور کسی حد تک زمین کا بوجھ بٹاتی تھیں مٹ چکی تھیں۔ اس میں کچھ تو حکومت کی پالیسی کو دخل تھا مگر بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ صنعتیں مشین کی بڑھتی ہوئی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ غرض زمین کا بوجھ بڑھتا جاتا تھا اور ہندوستان کی صنعتی ترقی کی رفتار اس قدر سست تھی کہ اس سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی تھی۔ ہمارے بے ساز و سامان گاؤں کو یکا یک دنیا کے بازار سے سابقہ پڑا اور وہ تنکے کی طرح اس سمندر میں جھکولے کھانے لگا۔ وہ حریفوں سے برابر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پیداوار کے ذرائع ناقص تھے اور اس نظام آراضی نے کھیتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر ڈالے تھے جس کی وجہ سے کسی بنیادی اصلاح گرتی جاتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی چند روز کی گرم بازاری کے زمانے میں کچھ سنبھل جایا کرتی تھی۔ بڑے زمیندار بڑھتے ہوئے افلاس سے تنگ آ کر قومی تحریک کی طرف ڈھل گئے تھے دیہات کے بے مایہ طبقے یعنی بے شمار زرعی مزدور

بھی ادھر کھنچ رہے تھے۔ ان سب دیہاتی طبقوں کے نزدیک ''قومیت'' یا ''سوراج'' کے معنی یہ تھے کہ نظام اراضی میں کوئی بنیادی تبدیلی ہو جس سے ان کا بوجھ ہلکا ہو اور ان لوگوں کو جو زمین سے محروم ہیں، زمینیں مل جائیں۔ مگر ان خواہشات کا اظہار واضح طور پر نہ تو خود کاشتکاروں کی طرف سے ہوا تھا اور نہ قومی تحریک کے لیڈروں کی طرف سے جو اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اتفاق سے ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک اور عالمگیر کساد بازاری کا ساتھ ہو گیا جس کا احساس ابتداء میں خود اس کے لیڈروں کو بھی نہ تھا۔ دیہات کے باشندوں پر اس کساد بازاری کا بہت شدید اثر پڑا اور وہ کانگرس اور سول نافرمانی کی طرف دوڑے۔ ان کے لئے اس کا سوال نہ تھا کہ لندن میں یا کسی اور جگہ ایک عمدہ سا دستور اساسی مرتب کیا جائے بلکہ اس کا نظام اراضی میں بنیادی تبدیلی ہو خصوصاً ان صوبوں میں جہاں زمینداری طریقہ رائج ہے۔ سچ پوچھئے تو زمینداری نظام اپنا وقت پورا کر چکا ہے اور اب اس میں کچھ جان نہیں رہی ہے مگر برطانوی حکومت اپنی مصلحتوں کے لحاظ سے نظام اراضی میں اس بنیادی تبدیلی کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے شاہی زرعی کمیشن مقرر کیا تو ملکیت اراضی یا طریق لگان داری کا سوال اس کے موضوع بحث سے خارج کر دیا گیا۔

غرض ہندوستان میں اس وقت جو کش مکش تھی وہ ایک بنیادی چیز تھی اور الفاظ کے منتر یا سمجھوتے کے جادو سے دور نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ مشکل تبھی آسان ہو سکتی تھی جب (علاوہ اور اہم قومی مسائل کے) زمین کا بنیادی مسئلہ حل کیا جائے اور برطانوی حکومت کی مدد سے اس مسئلے کے حل ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ عارضی تدبیروں سے لوگوں کے کچھ آنسو پچھ جائیں یا انتہائی سختی کر کے ان کی زبانیں بند کر دی جائیں مگر اس سے مسئلہ تو حل ہونے سے رہا۔

برطانوی حکومت کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سارا جھگڑا چند شورش برپا

کرنے والوں کی وجہ سے ہے۔ شاید اکثر حکومتوں کی سمجھ ایسی ہی ہوتی ہے یہ خیال بالکل بے سر دپا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کو پندرہ برس سے ایک بہت بڑا لیڈر مل گیا ہے جس سے اس کے کروڑوں باشندوں کو محبت اور عقیدت ہوگئی ہے اور وہ بہت سے امور میں اس کی مرضی پر چلتے ہیں۔ اسے ہماری موجودہ تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے مگر اس سے بھی زیادہ اہم وہ قوم ہے جو بظاہر آنکھ بند کر کے اس کا حکم مانتی ہے۔ کام جو کچھ کیا وہ قوم ہی نے کیا ہے اور اس کے عمل کی محرک تاریخی قوتیں ہیں جنھوں نے اس میں یہ صلاحیت پیدا کردی کہ اپنے لیڈر کی بات سنیں اور سمجھیں۔ لیڈر کی حیثیت سے گاندھی جی کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ لوگوں کی نبض پہچانتے ہیں اور یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ کام کس وقت شروع کرنا چاہئے۔

۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی قومی تحریک کچھ دنوں کے لئے ابھرتی ہوئی سماجی قوتوں سے مل گئی تھی، اس وجہ سے اس کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور اس میں اصلیت کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ تاریخ کے ساتھ قدم ملا کر چل رہی ہے۔ کانگرس اس قومی تحریک کی حامل تھی اور اس کے قوت نے کانگرس کے اثر کو بہت بڑھا دیا تھا۔ یہ ایک مبہم اور غیر متعین چیز تھی مگر اس کے وجود میں کوئی شبہ نہ تھا کسانوں کے شریک ہو جانے سے کانگرس کو بڑی تقویت پہنچی تھی اور نیچا اوسط طبقہ تو اس کے لئے قلب لشکر کا کام دیتا تھا۔ شہر کا اونچا اوسط طبقہ بھی زمانے کے رنگ کو دیکھ کر اپنی سلامتی اس میں سمجھتا تھا کہ کانگرس سے کے مجوزہ اقرارنامے پر دستخط کر دئے تھے اور کوئی ایسی بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے جس میں کانگرس کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ادھر لندن میں لوگ گول میز کانفرنس میں قانونی باریکیاں چھانٹ رہے تھے اور ادھر اصل قوت کا دھارا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر کانگرس کی طرف بہتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ فریب نظر معاہدہ دہلی کے بعد اور بھی بڑھ گیا۔ دھواں

دھار تقریروں کی وجہ سے نہیں بلکہ ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کے واقعات کی وجہ سے۔ سچ پوچھئے تو آنے والی مشکلوں اور خطروں کا اندازہ صرف کانگرس کے لیڈروں کو تھا اور وہی ان کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے تھے۔

لوگوں کے ذہن میں ایک مبہم سا احساس تھا کہ ملک میں دو برابر کی قوتیں کار فرما ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات حکومت کو بہت ناگوار تھی۔ واقعی حیثیت سے یہ خیال بالکل بے بنیاد تھا۔ اس لئے کہ ظاہری قوت سراسر حکام کے ہاتھ میں تھی مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دلوں پر کانگرس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک تحکم پسند غیر ذمہ دار حکومت کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی اور یہی چیز تھی مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دلوں پر کانگرس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک تحکم پسند غیر ذمہ دار حکومت کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی اور یہی چیز تھی جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ دیہات میں چند تقریریں ہونے یا دو چار جلوس نکلنے کی شکایت جو اس کی طرف سے کی گئی محض ایک بہانہ تھا۔ غرض یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ لڑائی ہو کر رہے گئی۔ اس لئے کہ نہ تو کانگرس خودکشی کی مرتکب ہو سکتی تھی اور نہ حکومت اس دو عملی کو برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ کانگرس کو کچل کر رکھ دے گی۔ دوسری گول میز کانفرنس کی وجہ سے یہ لڑائی کچھ دن کے لئے مل گئی۔ خدا جانے کیوں برطانوی حکومت گاندھی جی کو لندن بلانے کے لئے بے چین تھی اور جہاں تک ممکن تھا کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ان کا جانا رک جائے۔

پھر بھی لڑائی کے آثار بڑھتے جاتے تھے اور ہمیں حکومت کی کشیدگی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ معاہدہ دہلی کے تھوڑے ہی دن بعد لارڈ ارون ہندوستان سے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ پر لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہو کر آئے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ نئے وائسرائے بہت سخت آدمی اور اپنے پیشرو کی طرح مصالحت کو پسند نہیں کرتے۔ ہمارے اکثر لیڈروں نے لبرل پارٹی کی یہ عادت سیکھ لی ہے کہ سیاسی

معاملات کو اصول کے لحاظ سے نہیں بلکہ اشخاص کے لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ برطانوی حکومت کی عام پالیسی وائسراؤں کے شخصی خیالات پر منحصر نہیں ہوتی۔ اس لئے وائسرائے کے بدل جانے کا نہ کوئی اثر ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ اتفاقی بات تھی کہ واقعات کی رفتار کے لحاظ سے حکومت نے رفتہ رفتہ اپنی پالیسی بدل دی۔ سول سروس والوں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ حکومت کانگرس سے معاہدہ کر لے۔ ان کی ساری تربیت اور تحکم پسندانہ خیالات اس کے مخالف تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی سے برابری کا برتاؤ کر کے حکومت نے ان کا رعب اور کانگرس کا اثر بہت بڑھا دیا اور اب اس کی ضرورت ہے کہ ذرا ان کا دماغ درست کر دیا جائے۔ یہ ایک احمقانہ خیال تھا مگر ہندوستان کی سول سروس کی پرواز فکر کچھ بہت اونچی نہیں ہوا کرتی۔ بہر حال کسی نہ کسی وجہ سے حکومت تن کر بیٹھ گئی اور اس نے سختی سے کام لینا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ توریت کے الفاظ میں ہم سے کہہ رہی ہے ”میری چھنگلی میرے باپ کی رانوں سے زیادہ موٹی ہے، اس نے تو تمہیں کوڑے ہی لگائے تھے میں بچھوؤں سے کٹواؤں گا۔“

مگر ابھی سزا کا وقت نہیں آیا تھا۔ یہ کوشش ہو رہی تھی کہ کانگرس کا نمائندہ گول میز کانفرنس میں بھیجا جائے۔ گاندھی جی نے دوبارہ شملے جا کر وائسرائے اور دوسرے حکام سے مختلف مسائل پر خصوصاً صوبہ سرحد کی سرخ پوشوں کی تحریک اور صوبہ متحدہ کے کاشتکاروں کی حالت پر گفتگو کی، سرخ پوشوں کی تحریک اور صوبہ متحدہ کے کاشتکاروں کی حالت پر گفتگو کی۔ بنگال کے مسئلے کے علاوہ یہی دو مسائل حکومت کو سب سے زیادہ پریشان کر رہے تھے۔

گاندھی جی نے مجھے شملہ بلوا لیا اور میں بھی حکومت ہند کے بعض اراکین سے ملا۔ میری ان کی گفتگو صرف صوبہ متحدہ تک رہی، ان سے صاف صاف باتیں ہوئیں اور ان اصل نزاعی معاملات پر بحث ہوئی جو چھوٹی چھوٹی شکایتوں کی تہ میں

پوشیدہ تھے۔ ہم سے یہ کہا گیا کہ فروری ۱۹۳۱ء میں حکومت چاہتی تو سول نافرمانی کی تحریک کو تین مہینے میں کچل کر رکھ دیتی۔ سیاست کی مشین کیل کانٹے سے درست تیار کھڑی تھی صرف ایک بٹن دبانے کی دیر تھی مگر یہ سمجھ کر کہ باہمی رضامندی سے تصفیہ ہو جائے تو اچھا ہے اس نے تجربے کے طور پر گفت وشنید کا سلسلہ چھیڑا، جس سے دہلی کے معاہدے کی صورت نکل آئی۔ اگر معاہدے میں کامیابی نہ ہوتی تو وہ بٹن تو موجود ہی تھا، دبایا جاتا۔ اس میں اشارہ بھی تھا کہ اگر تم نے شرارت کی تو بہت جلد اس بٹن کو دبانے کی ضرورت پڑے گی۔ یہ سب باتیں بڑے شائستہ الفاظ میں کہی گئیں۔ مگر دونوں فریق اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کچھ بھی کہیں، اور کچھ بھی کریں لڑائی تو ہو کر رہے گی۔

ایک اور اعلےٰ حاکم نے کانگرس کی بڑی تعریف کی۔ ہم اس وقت وسیع تر غیر سیاسی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ سیاست سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو کانگرس نے ہندوستان کی بڑی خدمت کی ہے۔ ہندوستانیوں پر عموماً یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان میں تنظیم کا مادہ نہیں مگر ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے سخت مشکلات اور مخالفت کے باوجود تنظیم کا حیرت انگیز نمونہ دکھا دیا۔

جب گاندھی جی پہلی بار شملے گئے تو ان کے گول میز کانفرنس میں جانے کا مسئلہ طے نہیں ہو سکا تھا۔ اگست کے دوسرے ہفتے میں وہ دوبارہ وہاں تشریف لے گئے۔ اب ادھر یا ادھر فیصلہ کرنا تھا۔ مگر وہ اب بھی ہندوستان کو اس حالت میں چھوڑ کر جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ بنگال، صوبہ سرحد، صوبہ متحدہ میں آثار اچھے نظر نہیں آتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ ہندوستان میں امن قائم رہے گا اس وقت تک نہ جائیں۔ آخر حکومت سے کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو گیا جو ایک اعلان یا چند خطوط کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ بہت تنگ وقت میں ہوا جب گول میز کانفرنس کے نمائندوں کا آخری جہاز روانہ ہونے ہی کو تھا۔ ایک اسپشل

ٹرین شملے سے کالکا روانہ ہوئی اور دوسری گاڑیاں روک دی گئیں تاکہ گاندھی جی کو ہر جگہ گاڑی ملتی جائے۔

میں ان کے ساتھ شملے سے بمبئی گیا اور وہاں اگست کے آخر کی ایک روشن صبح کو انھیں خدا حافظ کہا اور ان کے جہاز کو بحر عرف میں مغرب کے سمت جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد دو برس تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

گول میز کانفرنس

حال ہی میں ایک انگریز اخبار نویس نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بھی، اور لندن میں گول میز کانفرنس کے وقت بھی انہیں گاندھی جی سے خوب ملنے جلنے کا موقع ملا۔اس کتاب میں یہ لکھتے ہیں: ملتان جہاز پر جو لیڈر سفر کر رہے تھے، وہ سب جانتے تھے کہ خود کانگریس کی مجلس عاملہ میں مسٹر گاندھی کے خلاف ایک سازش ہے۔

یہ جانتے تھے کہ جب وقت آئے گا تو کانگریس مسٹر گاندھی کو نکال باہر کرے گی۔لیکن کانگریس نے انہیں نکالا تو ساتھ ہی غالباً اپنے آدھے ممبروں کو نکالنا ہو گا۔اور یہی وہ نصف تھا، جسے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر اپنے لبرل مسلک کا ساتھی بنانا چاہتے تھے۔یہ لوگ اس بات کو بھی نہیں چھپاتے کہ مسٹر گاندھی (خود ان کے الفاظ) میں ذرا الجھے دماغ کے آدمی ہیں۔لیکن جو الجھی کوپڑی والا لیڈر اپنے ساتھ کوئی دس لاکھ الجھی کھوپڑی کے پیرو بھی لا سکے۔اس کو اپنی طرف ملانے کی کوشش تو بہر حال کرنے کی چیز (۱) ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس اقتباس سے مسٹر سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کے خیالات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے، یا نہیں یا گول میز کے ان ارکین کے خیالات کی جو 1931 میں لندن تشریف لے جا رہے تھے۔البتہ مجھے اس بات پر حیرت ضرور ہے کہ کوئی شخص بھی، اخبار نویس ہو کہ ’’لیڈر‘‘ جو ہندوستانی سیاست سے ذرا بھی واقف ہو۔وہ اس قسم کی بات کیسے کہہ سکتا ہے؟ میں تو اسے پڑھ کر ششدر رہ گیا۔پہلے کبھی اس کا ذکر بھی میں نے نہ سنا تھا۔مگر اس لاعلمی کو سمجھنا تو یوں مشکل نہیں، کہ اس وقت کے بعد سے میں زیادہ تر قید میں رہا ہوں۔

یہ سازش کرنے والے آخر تھے کون اور ان کا ارادہ کیا تھا؟ کبھی کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ صدر ولبھ بھائی پٹیل اور میں مجلس عاملہ کے انتہا پسندوں میں سے

تھے۔اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہونہ ہوضرورہم ہی کواس سازش کے سرغنوں میں گنا گیا ہوگا۔حالانکہ شاید ہی سارے ہندوستان بھر میں گاندھی جی کا کوئی اور ساتھی ولبھ بھائی پٹیل جیساوفادار ہو۔ولبھ بھائی اپنے کام میں مضبوط اور نہ دبنے والے آدمی ہیں۔مگر شخصی طور پر وہ گاندھی جی کے اور ان کے خیالات اور طریقہ کار کے دلدادہ بھی ہیں۔میں اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے بھی گاندھی جی کے خیالات کواُنھی کی طرح قبول کیا ہے،لیکن گاندھی جی کے ساتھ نہایت قریبی طور پر مل جل کرکام کرنے کا شرف مجھے بھی حاصل رہا ہے۔اوران کے خلاف سازش کرنے کا خیال بھی میرے لئے ہر حال میں ناممکن اورلغو ہے۔اور میں کیا ساری مجلس عاملہ کا یہی حال ہے۔یہ مجلس عملاً انھی کی بنائی ہوئی ہے۔انھی نے چند ساتھیوں کے مشورے سے اسے نامزد کیا تھا۔انتخاب تو بس ایک ضابطہ کی کاروائی تھی۔اس مجلس کا بڑا اور بااثر حصہ تو ان اراکین پر مشتمل تھا۔جواس میں برسوں سے کام کررہے تھے۔اوراب مستقل سے ممبر سمجھے جانے لگے تھے۔بے شک ان میں بھی سیاسی اختلافات تھے،نقطہ نظر کے اختلاف تھے۔لیکن انہوں نے برسوں ایک ساتھ کام کیا تھا۔مل کر بوجھ اٹھائے تھے۔مل کرخطروں کوانگیزا تھا۔اوران باتوں نے انہیں باہم جوڑ سا دیا تھا۔ان میں دوستی رفاقت،اورایک دوسرے کی عزت کے رشتے پیدا ہو گئے تھے۔اب یہ مجلس مختلف الخیال لوگوں کا محض ایک مجموعہ نہ تھی،بلکہ ایک نامی وحدت بن گئی تھی۔اور یہ بات وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی،کہ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف سازش کرے گا۔گاندھی جی اس مجلس پر پوری طرح حاوی تھے۔اور ہر شخص ہدایات کے لئے بس ان ہی کی طرف دیکھتا تھا،یہ صورت حال کئی سال سے یونہی تھی۔اور ۱۹۳۰ء کی عظیم الشان کامیابی کے بعد ۱۹۳۱ء میں تو یہ بات اور بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔

اچھا،گاندھی جی کونکال باہر کرنے کی کوشش سے مجلس عاملہ کے ان انتہا

پسندوں کی غرض کیا ہوسکتی تھی۔؟ شاید یہ سمجھا جاتا ہو کہ گاندھی جی چونکہ سمجھوتہ کرنے والے آدمی ہیں۔اس لئے یہ لوگ انہیں راہ میں حائل جانتے ہوں گے۔لیکن گاندھی جی کے بغیر یہ تحریک ہی کہاں ہوتی۔سول نافرمانی کا پتہ کہاں ہوتا اور ستیا گرہ کا نشان کہاں ملتا؟۔وہ تو خود اس زندہ تحریک کے ایک جزو تھے۔نہیں سچ تو یہ ہے۔تحریک ہی وہ تھے۔جہاں تک اس تحریک کا تعلق تھا، سب کچھ ان پر منحصر تھا۔یہ ضرور ہے کہ قومی تحریک ان کی آفریدہ نہیں تھی، نہ وہ کسی ایک شخص پر منحصر ہوسکتی ہے۔اس کی جڑیں تو اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔مگر تحریک کی یہ خاص شکل جس کا علم سول نافرمانی ہے۔خصوصیت کے ساتھ ان سے وابستہ تھی، ان سے جدا ہونے کے معنی یہ تھے، کہ اس تحریک کی ساری بساط ہی تہہ کردی جائے۔اور نئے سرے سے نئی بنیادوں پر کوئی نئی عمارت کھڑی کی جائے۔یہ تجویز کسی وقت بھی کی جائے تو خاصی دشوار ہے۔۱۹۳۱ء میں تو اس کا خیال بھی کسی کو نہیں آسکتا تھا۔

یہ خیال کر کے بھی ہنسی آتی ہے، کہ بعض لوگوں کے نزدیک ہم میں سے چند ۱۹۳۰ء گاندھی جی کو کانگرس سے باہر نکالنے کی سازش کررہے تھے: بھلا ہمیں اس سازش کی ضرورت ہی کیا تھی۔جب ایک ذرا سا اشارہ ہی کافی ہوتا؟ گاندھی جی کی طرف سے جب بھی یہ ظاہر ہوا ہے، کہ وہ سیاست سے کنارا کش ہونا چاہتے ہیں تو مجلس عاملہ اور سارے ملک میں تہلکہ سا مچ گیا ہے۔وہ تو ہمارے جہاد آزادی کا ایسا جزو بن گئے ہیں۔کہ یہ خیال تک برداشت نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ہم تو انہیں لندن بھیجتے بھی جھجکتے تھے، کہ ان کی غیر حاضری میں سارا بوجھ ہم پر آن پڑے گا۔اور اس کا خیال بھی ہمیں بھلا نہ لگتا تھا۔ہم لوگ تو اپنے بوجھ کو ان کے کاندھوں پر منتقل کردینے کے ایسے عادی ہوگئے تھے۔ہم میں سے بہتوں کے لئے مجلس عاملہ کے اندر اور اس کے باہر گاندھی جی سے وابستگی کے رشتے کچھ ایسے تھے، کہ ہم اسے ترجیح دیتے تھے کہ ان کے ساتھ رہ کر ہار جائیں۔بہ نسبت اس کے

کہ ان سے الگ ہو کر کوئی عارضی کامیابی حاصل کر لیں۔

اس بات کا فیصلہ کہ گاندھی جی الجھے دماغ کے آدمی ہیں یا نہیں، ہم اپنے لبرل دوستوں ہی پر چھوڑتے ہیں، بے شک یہ سچ ہے کہ ان کی سیاست کبھی کبھی بہت ہی فلسفیانہ اور حقائق سے دور ہو جاتی ہے۔اور اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔مگر انہوں نے اپنے کو ایک نہایت ہی عملی آدمی ثابت کیا ہے۔غیر معمولی ہمت اور جرات کا آدمی اور ایسا آدمی کہ جو کچھ کہتا ہے، اسے کر بھی دکھاتا ہے۔پھر اگر الجھے ہوئے دماغ کے ایسے عملی نتائج نکل سکتے ہیں، تو یہ الجھاؤ اس عمل، سیاست سے کیا برا ہے؟ جو مطالعہ کے کمروں اور خواص کے حلقوں میں شروع ہوتی ہے۔اور وہیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔یہ بھی سچ ہے کہ ان کے پیرو بھی الجھے دماغ کے لوگ ہیں۔وہ نہ سیاست کو سمجھتے ہیں۔نہ قانون دستوری سے آشنا ہیں، وہ سوچتے ہیں تو بس اپنی انسانی ضرورتوں کے اعتبار سے، یعنی کھانے پینے، گھر، ور، کپڑے لتے اور زمین کے اعتبار سے۔

مجھے ہمیشہ اس پر تعجب ہوتا ہے، کہ ممتاز پردیسی اخبار نویس، جنھیں فطرت انسانی کے مشاہدہ کی خوب مشق ہوتی ہے، یہاں ہندوستان میں آ کر کیوں غلطی کر جاتے ہیں۔اس کی وجہ کہیں ان کے بچپن کا یہ انمٹ خیال تو نہیں۔کہ مشرق میں دنیا ہی نرالی ہے۔اسے معمولی معیار سے جانچا ہی نہیں جا سکتا، یا انگریزوں کے معاملے میں یہ بات تو نہیں ہے کہ سامراج سے ان کی نظر میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔اور نظارہ کو مسخ کر دیتی ہے۔کوئی بات ہو کیسی ہی بعید از قیاس ہو، وہ اسے بلا تعجب کے یقین کر لیتے ہیں۔اس لئے کہ مشرق کے اسرارستان میں ہر چیز ممکن ہے۔وہ کتابیں شائع کرتے ہیں، جن میں نہایت اچھے تبصرے اور نہایت گہرے مشاہدے بھی ملتے ہیں۔لیکن بیچ، بیچ میں ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں، کہ بس حیرت ہو جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی یورپ جا رہے تھے، تو میں نے

لندن کے ایک اخبار میں اس کے پیرس کے نامہ نگار کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ یہ مضمون ہندوستان کے متعلق تھا۔ اس میں نامہ نگار نے ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا، جو اس کے نزدیک ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اس وقت جب شہزادہ ویلز ہندوستان آئے تھے۔ لکھا تھا کہ کسی مقام پر (غالباً دہلی میں) مہاتما گاندھی ایک مرتبہ بلا اطلاع شہزادے کے سامنے جا پہنچے، گھٹنوں پر گر پڑے، شہزادے کے پیر پکڑ لیے، دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اور ان سے التجا کی کہ اس ناشاد ملک کو امن وسکون ارزانی فرمائیں! ہم میں سے کسی نے خود غریب گاندھی جی سے یہ قصہ نہ سنا تھا۔ میں نے ان نامہ نگار صاحب کو ایک خط لکھا۔ اور انہیں یہ بھی بتایا کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ انھوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ انھیں یہ قصہ ایک معتبر ذریعہ سے پہنچا تھا۔ مجھے جس بات پر تعجب ہوا۔ وہ یہ کہ اس نامہ نگار نے ایسے قصے کو باور کرلیا، اور حقیقت دریافت کرنے کی ذرا کوشش نہ کی۔ حالانکہ یہ قصہ بادی النظر میں ہی اس قدر بعید از قیاس ہے۔ کہ کوئی شخص جو گاندھی جی کو یا کانگرس کو، یا ہندوستان کو ذرا بھی جانتا ہو، اسے یقین نہ کرتا، بدقسمتی سے بہت سے انگریز جو ہندوستان ہی میں عرصہ سے رہتے ہیں۔ وہ بھی اس ملک کے متعلق یا کانگرس کے متعلق یا گاندھی جی کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ بہر حال یہ قصہ بالکل ہی ناقابل یقین اور مضحکہ خیز تھا۔ جس کے مقابلے میں بس اس فرضی قصے کی روداد پیش کی جاسکتی ہے۔ جب کہ کنٹربری کے لاٹ پادری صاحب یکا یک مسولینی کے سامنے جا پہنچے، سر نیچا کیا اور ٹانگیں اوپر، اور سلام اور دعا کی جگہ لگے فضا میں اپنی دونوں ٹانگوں کو حرکت دینے۔

حال ہی میں ایک اور اخبار میں ایک اطلاع شائع ہوئی ہے، جس میں ایک اور ہی قسم کا قصہ پیش کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ گاندھی جی کے پاس بے حساب رقمیں ہیں۔ جن کا شمار لاکھوں پونڈ تک پہنچتا ہے۔ یہ رقمیں خفیہ طور پر دوستوں کے پاس

رکھی ہیں۔ اور کانگرس کی نظر اس روپے پر ہے۔ اگر گاندھی جی کانگرس سے ہٹے تو ڈر ہے کہ یہ خزانے ہاتھ سے جائیں گے۔ یہ افسانہ بھی سرتاپا لغو ہے۔ اس لئے کہ گاندھی جی کبھی بھی کسی قسم کا فنڈ اپنی تحویل میں نہیں رکھتے۔ نہ کو اپنے پاس۔ نہ چھپا کر دوستوں کے پاس، جو کچھ جمع کرتے ہیں، کسی پبلک ادارے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ حساب کتاب ٹھیک رکھنے کے باب میں ان کی جبلت ایک بنئیے کی سی ہے۔ اور ان کی جمع کی ہوئی رقموں کی ہمیشہ باضابطہ جانچ ہوتی رہتی ہے۔

یہ افواہ غالباً اس مشہور ایک کروڑ روپیہ والے قصہ پر مبنی ہے۔ جو کانگرس نے ۱۹۲۱ ءمیں جمع کئے تھے۔ یہ رقم جو یوں خاصی بڑی معلوم ہوتی ہے، مگر سارے ہندوستان پر پھیلائی جائے تو کچھ ایسی بڑی نہیں۔ قومی یونیورسٹیوں، مدرسوں کے لئے استعمال ہوئی، اور دیہی صنعتوں خصوصاً کھدر کو فروغ دینے میں یا اچھوتوں کے کام اور دوسری تعمیری تجاویز کے سلسلہ میں۔ اس میں سے بہت تو پہلے ہی سے مختلف کاموں کے لئے مخصوص تھیں۔ اور یہ فنڈ اب تک موجود ہیں۔ اور ان مخصوص اغراض میں کام آرہے ہیں۔ باقی حصہ مقامی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اور کانگرس کے تنظیمی اور سیاسی کاموں میں صرف ہوا۔ ترک موالات کی تحریک کے مصارف، اس سے پہلے اور اس سے چند سال بعد تک کانگرس کا کام بھی اسی روپیہ سے چلا۔ گاندھی جی نے اور پبلک کے افلاس نے ہمیں یہ سکھا دیا تھا کہ اپنی سیاسی تحریک کو بہت ہی محدود وسائل سے چلائیں۔

ہمارے کام کا بڑا حصہ تو بلا معاوضہ رہا ہے۔ اور جب کبھی کوئی رقم بقدر معاوضہ دی گئی تو بس مشکل سے پیٹ بھرنے کے قابل، ہمارے بہترین کام کرنے والوں کو، یونیورسٹی کے فارغ التحصیل لوگوں کو، جن کے ذمہ پورے خاندان کے مصارف بھی تھے۔ ہم نے اس سے کم دیا ہے جتنا کہ انگلستان میں ایک بے روزگار مزدور کو بطور الاونس دیا جاتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی سیاسی یا مزدوروں کی

تحریک بڑے پیانے پر کہیں بھی اس قدر کم خرچ پر چلی ہے۔ جیسے کہ پچھلے پندرہ برس میں کانگریس کی تحریک۔ سال بہ سال کانگریس کے تمام حسابات کی باضابطہ علی اعلان جانچ ہوتی ہے، ان کا کوئی حصہ خفیہ نہیں رہا ہے۔ سوائے سول نافرمانی کے زمانہ میں۔ جب کہ کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دیا تھا۔

گاندھی جی لندن کی گول میز کانفرنس میں کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے۔

بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا، کہ کوئی اور نمائندہ نہ بھیجا جائے۔ کچھ تو اس کی وجہ یہ تھی، کہ ہم اپنے بہترین آدمیوں کو اس کٹھن زمانے میں ہندوستان ہی میں رکھنا چاہتے تھے۔ کہ اس زمانہ میں بہت ہوشیاری سے ساری تحریک کو ہاتھ میں رکھنا تھا۔ ہم محسوس کرتے تھے، کہ گول میز کانفرنس کے باوجود اصل مرکز ثقل ہندوستان ہی میں ہے۔ اور ہندوستان میں جو صورت حال پیدا ہوگی اس کا اثر لازمی طور پر لندن میں پڑے گا۔ ہم چاہتے تھے کہ ناموافق حالات کو پیدا ہونے سے روکیں۔ اور اپنی تنظیم کو درست حالت میں برقرار رکھیں۔ لیکن سرف ایک نمائندہ بھیجنے کی اصل وجہ یہ نہ تھی۔ اگر ہم ضرورت سمجھتے اور غایت جانتے تو ضرور اور نمائندے بھی بھیجتے۔ مگر ہم نے قصداً ایسا نہیں کیا۔

ہم گول میز کانفرنس میں کچھ اس لئے تو شرکت کر نہیں رہے تھے، کہ جا کر دستور ملکی کی ضمنی تفصیلات سے متعلق وہ بحثیں چھیڑیں، جو کبھی ختم ہی ہونے میں نہ آئیں۔ اس وقت ان تفصیلات میں ہمیں ذرا دل چسپی نہ تھی۔ ان پر تو غور اسی وقت ہو سکتا تھا۔ کہ برطانوی حکومت سے بنیادی معاملات پر کوئی سمجھوتہ ہو جاتا۔ اصل سوال یہ تھا کہ جمہوری ہند کو کتنی طاقت منتقل کرنی ہے۔ تفصیلات ک و طے کرنے اور انہیں قلم بند کرنے کا کام تو کوئی بھی قانون دان بعد کو کر سکتا تھا۔ ان بنیادی امور میں کانگریس کا مقصد صاف اور سادہ تھا۔ اور اس مین بحث اور دلیل کی

زیادہ گنجائش نہ تھی۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے لئے باوقار طریقہ یہی ہے کہ ہمارا بس ایک نمائندہ اور وہ خود ہمارا قائد جائے۔ اور ہمارے مسلک کو پیش کر کے بتادے کہ وہ کس قدر معقول ہے۔ اور کس قدر اٹل اور ہو سکے تو اس مسلک کے لئے برطانوی حکومت کی حمایت حاصل کرے۔ کام مشکل تھا، یہ ہم خوب جانتے تھے، اور معاملات کی جو صورت اس وقت تھی، اس میں مشکل ہی سے اس کے کرنے کا امکان تھا۔ مگر کیا کرتے۔ کوئی دوسری صورت بھی ہمارے سامنے نہ تھی، ہم اپنے مسلک کو اپنے اصولوں کو، اور اپنے مطمع نظر کو چھوڑ نہیں سکتے تھے، ہم ان کے پابند تھے، اور ان پر پکا یقین رکھتے تھے۔ اگر حسن اتفاق سیان بنیادی اصولوں پر سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آتی تو پھر باقی کام بہت آسان ہو جاتا۔ بلکہ ہم میں یہ طے ہو چکا تھا، کہ اگر سمجھوتہ ہو گیا تو گاندھی جی فوراً مجلس عاملہ کے چند یا سب اراکین کو لندن بلا لیں گے۔ تا کہ تفصیلات پر بات چیت میں سب شریک ہو سکیں۔ ہمیں ہدایت تھی کہ ہم تیار رہیں۔ اور ضرورت ہو تو ہوائی جہاز سے سفر کریں۔ یوں گویا بلاوے کے دس دن کے اندر ہم لوگ گاندھی جی کے پاس پہنچ سکتے تھے۔

لیکن اگر بنیادی باتوں پر سمجھوتہ نہ ہو تو پھر مزید گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہو تا۔ نہ کانگرس کو ضرورت ہوتی کہ گول میز کانفرنس میں مزید نمائندے بھیجے۔ لہذا فیصلہ یہ ہوا کہ اکیلے گاندھی جی کو بھیجیں مجلس عاملہ کے ایک اور رکن مسٹر سروجنی نائڈو نے بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ مگر کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں، انھیں ہندوستان کی عورتوں کی نمائندے کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی، اور مجلس عاملہ نے انہیں جانے کی اجازت دیدی تھی۔

مگر برطانوی حکومت اس معاملے میں ہماری خواہشوں کو پورا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنیادی امور پر غور و بحث کو برابر ٹالیں تا کہ کانفرنس کم و بیش ضمنی اور غیر اہم باتوں پر بحث کر کر کے تھک جائے۔ کہیں کوئی اہم معاملہ سامنے

آہی گیا تو حکومت رکی رکی رہی اپنے کو کسی بات پر قطعی طور سے پابند نہ کیا او ور بس یہی وعدہ کر دیا کہ مزد غور وخوض کر کے بعد کو اپنی رائے ظاہر کرے گی۔ان کا ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انھوں نے خوب کھیلا۔ساری کانفرنس پر ایک یہی مسئلہ حاوی رہا۔

کانفرنس کے ہندستانی ممبروں میں سے بڑی اکثریت، زیادہ تر ارادہ، اس سرکاری چال کا ساتھ دے رہی تھی۔اور یہ مجمع تھا بھی نرالا ان میں کون تھا جو اپنی ذات کے سوا اور کسی کا نمائندہ ہو۔بعض ان میں سے ضرور قابل اور معزز لوگ تھے، اور بہت سے ایسے تھے جن کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے یہ لوگ بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کے سب سے زیادہ ترقی دشمن عناصر کے نمائندے تھے، اور ایسے رجعت پسند اور تغیر دشمن کہ ہمارے ہندوستانی لبرل تک، جو یہاں اس درجہ محتاط اور معتدل لوگ سمجھے جاتے ہیں، وہاں ان کے مقابلہ میں ترقی خواہ حیثیت سے چمکتے رہے۔ یہ لوگ ہمارے ملک کے ان اہل گرض گروہوں کی نمائندگی کررہے تھے جن کا مفاد برطانوی سامراج سے وابستہ ہے اور اپنی غرضوں کی تکمیل اور تحفظ کے لئے یہ اسی سامراج کا منہ تکتے ہیں۔سب سے ممتاز نمائندگی مختلف اقلیتوں، اور اکثریتوں کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق تھی، ان میں اونچے طبقہ کے کچھ لوگ تھے جو کسی کی بات نہیں مانتے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ آپس میں بھی متفق نہیں ہوسکتے تھے۔سیاسی لحاظ سے یہ سب کٹر ترقی دشمن تھے اور ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کچھ فرقہ واری فائدہ حاصل کرلیں، چاہے اس میں ملک کی سیاسی ترقی کو یکسر ہاتھ سے دینا ہی کیوں نہ پڑے۔ چنانچہ انھوں صاف اعلان ہی کر دیا تھا کہ کسی ایسی کارروائی پر جس سے ملک کو کچھ اور سیاسی آزادی ملے یہ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ان کے فرقہ وارانہ مطالبات پورے نہ ہو جائیں۔کیسا نرالا نظارہ تھا! اور کیسی تکلیف دہ وضاحت سے

یہ بات روشن ہوتی تھی کہ ایک محکوم قوم کس قدر نیچے جاسکتی ہے اور کس طرح اسے سامراجی بساط کا مہرا بنایا جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ راجوں مہاراجوں، لاٹ صاحبوں، سروں اور رباالقابہم کا یہ انبوہ ہندوستانی قوم کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ گول میز کانفرنس کے اراکین کو برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا اور اپنے نقطہ نظر سے واقعی خوب انتخاب کیا تھا۔ یہ سب صحیح، مگر پھر بھی اس بات سے کہ برطانوی حکام ہمیں یوں برت سکتے اور اپنے کام میں لاسکتے ہیں، ہماری قوم کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔ اور پتہ چلتا تھا کہ ہمیں کس آسانی سے بہکایا جاسکتا ہے اور ایک سے دوسروں کی کوششوں کا کیسے کاٹ کرایا جاسکتا ہے۔ ہمارے اونچے طبقہ کے لوگ ابھی تک سامراجی حکمرانوں کی ذہنیت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انھیں کا کام کرتے ہیں۔ کیا انھیں اس کی حقیقت نہیں دکھائی دیتی؟ یا یہ بات ہے کہ اس کی حقیقت کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر اس لئے اسے قبول کرتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت اور آزادی کے قیام سے انھیں ڈر لگتا ہے۔

بہت ہی ٹھیک بات تھی کہ اغراض کے اس ہجوم میں، سامراجی، منصب داری مالیاتی، صنعتی، مذہبی، فرقہ واری اغراض کے اس جھمگٹ میں، برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغاخان کے حصہ میں آئی تھی۔ اس لئے کہ اغراض کچھ نہ کچھ سب ہی ان کی ذات میں یکجا جمع ہیں۔ ایک نسل سے زیادہ عرصہ سے یہ برطانوی سامراج اور حکمران طبقہ کے ساتھ وابستہ رہے ہیں، رہتے سہتے بھی زیادہ تر انگلستان ہی میں ہیں۔ یہ ہمارے حکمرانوں کے مفاد اور ان کے نقطہ نظر کو واقعی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اگر گول میز کانفرنس میں سامراجی انگلستان کی طرف سے یہ آتے تو اس کے نہایت ہی قابل نمائندہ ثابت ہوتے۔ مگر ستم ظریفی یہ کہ ہندوستان کی نمائندگی فرما رہے تھے۔

کانفرنس میں ہمارا مقابل پلہ بہت بھاری تھا، اور ہمیں اس سے کوئی زیادہ توقع

بھی نہ تھی۔ پھر بھی اس کی کارروائی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور گھن آتی تھی۔ ہم قومی اور معاشی مسائل کی بھی سطح کو کھرچنے کی لغو اور جھوٹ موٹ کی کوششوں کو دیکھتے تھے، معاہدوں اور سازشوں اور چالوں کو دیکھتے تھے۔ برطانوی کنزرویٹو پارٹی کے ترقی دشمن حصہ سے اپنے بعض اہل وطن کا ساز باز دیکھتے تھے چھوٹے چھوٹے معاملات پر لامتناہی بک بک سنتے تھے، دیکھتے کہ اصلی معاملات کو کیس جان بوجھ کر ٹالا جارہا ہے اور ہمارے ہی آدمی برابر کس طرح اہل غرض اور خصوصاً برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، آپس کی جھک جھک دیکھتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ جشن اور دعوتیں اور باہمی مدح وثنا کا طوفان! شروع سے آخر تک خدمتوں اور نشستیں، مسلمانوں کے لئے خدمتیں ہوں اور نشستیں، سکھوں کے لئے بھی ہوں، اینگلو انڈین جماعت کے لئے بھی اور یورپین گروہ کے لئے بھی۔ مگر ہوں خدمتیں سب اعلی طبقہ کے لئے۔ بچارے عوام کو ان میں ذرا دخل نہ ہو۔ ابن الوقتی کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح شکار کی گھات میں تھے، بس یہی فکر تھی جبہ نئے دستور اساسی میں کچھ لے مریں۔ خود آزادی کے تصور نے بڑے پیمانہ پر خدمت طلبی کی شکل اختیار کرلی تھی جسے (Indianization) یا ہندیانا، کہتے تھے، یعنی فوج میں ہندوستانیوں کو زیادہ خدمتیں ملیں، سول سروس میں بھی زیادہ ملیں، وغیرہ وغیرہ۔ خود مختاری، حقیقی آزادی، جمہوری ہند کو طاقت اور اختیار کی منتقلی، یا ہندوستانی قوم کے کسی اہم اور ضروری معاشی مسئلہ کے حل کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ کیا اسی کے لئے ہندوستان نے یوں مردانہ وار جدوجہد کی تھی؟ اور کیا ایثار قربانی کی اس لطیف فضا کو کانفرنس کی کثیف ہوا سے بدلنا ضروری تھا؟

اس سنہرے اور بھرے ہوئے ہال میں گاندھی جی بیٹھے تھے، یکہ وتنہا ان کا لباس یا بے لباسی، انھیں اوروں سے ممتاز کرتی تھی مگر ان کے خوش لباس ہم نشینوں میں افکار اور نقطہ نظر کا فرق اس سے بھی زیادہ تھا۔ اس کانفرنس میں ان کی

حیثیت بڑی ہی مشکل کی تھی اور ہم یہاں دور سے بیٹھے حیرت کرتے تھے۔ کہ اسے کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ حیرت انگیز صبر کے ساتھ اپنا کام کئے گئے اور پیہم کوشش کرتے رہے کہ سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا۔ ہو انھوں نے ایک خاص بات کی جس نے ایک مرتبہ یہ راز فاش کردیا کہ فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے۔ کانفرنس کے مسلمان نمائندوں نے جو فرقہ وارانہ مطالبات پیش کئے تھے گاندھی جی ان میں سے بہتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور ان کے مسلمان قوم پرور ساتھیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ان مطلابات میں سے بعض آزادی اور جمہوریت کی راہ میں حائل ہوں گے پھر بھی انھوں نے کہہ دیا کہ میں بلا پوچھے گچھے اور بے دلیل و بحث ان سب مطالبوں کو مان لوں گا۔ اگر مسلمان نمائندے سیاسی مطالبہ یعنی خود مختاری کے مطالبہ میں میرے ساتھ اور کانگریس کے ساتھ مل جائیں۔

یہ بات انھوں نے بالکل شخصی طور پر کہی تھی اس لئے کہ وہ اس وقت تو کانگریس کو اس کا پابند نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے وعدہ کیا کہ میں کانگریس کو اس کے تسلیم کرنے پر آمادہ کروں گا اور کوئی شخص جو کانگریس میں ان کی حیثیت کو جانتا ہو شبہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کانگریس سے اس بات کو منوانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے لیکن ان کی بات کسی نے نہ مانی اور سچ بھی ہے آغا خان کو آزادی ہند کی حمایت میں کمر بستہ تصور کرنا بھی ذرا مشکل ہے۔ غرض اس سے ظاہر ہوگیا کہ چاہے فرقہ وارانہ مسائل ہی کانفرنس پر چھائے ہوئے معلوم ہوں مگر اصل وقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کرتی تھی۔ کانفرنس کے اراکین کو نہایت احتیاط سے نامزد کر کے برطانوی حکومت نے یہ سارے ترقی دشمن عناصر ایک جگہ جمع کر دئے تھے۔ اور ضابطہ کارروائی چونکہ خود ان کے ہاتھ میں تھا اس لئے اس فرقہ وارانہ مسئلہ کو کانفرنس کا اہم

مسئلہ بنا دیا تھا اور ایسا مسئلہ کہ جس پر وہ لوگ جو وہاں جمع تھے کبھی متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

برطانوی حکومت کو اپنی اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ اس کے پاس اپنی سلطنت کے قائم رکھنے کے لئے صرف قوت ہی نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ تک سامراجی روایات کے برقرار رکھنے کے لئے ابھی کافی چالاکی اور تدبیر بھی باقی ہے۔ ہندوستانی قوم ناکام ہوئی۔ ہر چند کہ گول میز کانفرنس نہ ان کی نمائندہ تھی نہ اس سے ان کی قوت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ مگر قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اپنی کوشش کے مقصود کو متعین کرنے کے لئے جس ذہنی پس منظر کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس نہ تھا اس لئے انھیں بہکا کر غلط راستہ پر ڈال دینا آسان تھا۔ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اس نے اپنے میں اتنی قوت نہیں پائی کہ جو اہل غرض اس کی ترقی میں حائل ہیں انہیں راہ سے ہٹا پھینکے۔ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اس میں غلط مذہبیت کی زیادتی ہے اور اس میں فرقہ وارانہ جذبات کو نہایت آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ وہ ابھی اتنی آگے نہ بڑھی تھی اور ابھی اتنی مضبوط نہ تھی کہ کامیاب ہوتی۔

خود اس گول میز کانفرنس میں کامیابی اور ناکامی کا کوئی سوال نہ تھا اس سے ایسی زیادہ امید ہی کسے تھی۔ مگر پھر بھی اس سے ایک فرق ضرور پیدا ہوا اس سے پہلے جو کانفرنس ہوئی تھی۔ اپنی قسم کی پہلی کانفرنس، اس کی طرف نہ ہندوستان میں زیادہ توجہ کی گئی نہ اور کہیں۔ اس لئے کہ اس وقت سب کا دھیان سول نافرمانی کی تحریک میں لگا تھا۔ برطانوی حکومت کے نامزد کئے ہوئے لوگ جب ۱۹۳۱ء کی کانفرنس کو جا رہے تھے تو کالی جھنڈیوں کے جلوسوں اور مزمت کی آوازوں کے ساتھ انھیں رخصت کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں بات ہی کچھ اور تھی اور یہ فرق اس لئے تھا کہ اس مرتبہ گاندھی جی کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے، ایک قائد کی حیثیت

سے جن کی پیروی لاکھوں آدمی کر رہے تھے۔ اسوجہ سے کانفرنس کا رتبہ بڑھا اور ہندوستان کے لوگوں کو اس کی کارروائی سے بہت زیادہ دلچسپی ہوگئی۔ اس کی ناکامی‘ چاہے اس کا سبب کچھ ہو ہندوستان کی مخالف پڑتی تھی۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ برطانوی حکومت کو گاندھی جی کی شرکت پر اتنا اصرار کیوں تھا۔

کانفرنس خود تو اپنے سارے سازباز ابن الوقتی اور بے سود بے راہ روی کے باوجود، ہندوستان کے لئے ناکامی نہ تھی۔ یہ تو بنائی ہی اس طرح گئی تھی کہ ناکام ہو اور اس کی ناکامی کی ذمہ داری ہندوستانی قوم پر نہیں ڈالی جاسکتی ہاں اسے یہ کامیابی ضرور ہوئی کہ اس نے ہندوستان کے اصل مسائل کی طرف سے دنیا کی توجہ ہٹادی‘ اور خود ہندوستان کے اندر اس سے مایوسی ہراس‘ اور ذلت کا احساس پیدا ہوا۔ اس سے ترقی دشمن قوتوں کو ایک سہارا ملا اور وہ اس قابل ہوئیں کہ پھر ذرا اٹھائیں۔

ہندوستان کے لوگوں کو کامیابی یا ناکامی تو ہندوستان کے واقعات سے حاصل ہوسکتی تھی۔ دور دراز لندن کے سازباز سے قومی تحریک کچھ کمھلا تو سکتی نہ تھی۔ ہندوستانی قومی تحریک یہاں کے متوسط طبقے اور یہاں کے کسانوں کی ایک حقیقی ار فوری ضرورت ہے اور یہ اس کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل تلاش کر رہے ہیں، اس لئے یا تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ تحریک کامیاب ہوکر اپنا مقصد پورا کردے اور اس کی جگہ کوئی دوسری ایسی تحریک لے لے جو قوم کو ترقی اور آزادی کی شاہراہ پر اور آگے لے جاسکے یا پھر اسے کچھ دنوں کے لئے دبایا جاسکتا ہے۔ یہ کشمکش ہندوستان میں فوراً ہی شروع ہونے کو تھی اور اس کا نتیجہ عارضی طور پر ہماری شکست ہونے کو تھا مگر دوسری گول میز کانفرنس کا اس کشمکش کے نتیجہ پر چنداں اثر نہیں ہوسکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے ہمارے ناموافق ایک فضا پیدا کردی۔

---

(۱) گلوربی بولٹن کی کتاب The Trgedy of Gandhi سے اقتباس۔
میں نے یہ اقتباس اس کتاب کی ایک تنقید سے لیا ہے۔ اصل کتاب پڑھنے کا مجھے موقع

نہیں ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس اقتباس کو پیش کر کے میں مصنف کے ساتھ اور ان اصحاب کے ساتھ جن کا نام اس میں آیا ہے کوئی ان انصافی نہ کرتا ہوں گا یہ لکھ چکنے کے بعد میں نے اصل کتاب بھی پڑھ لی۔ بہت سی باتیں جو مسٹر بولٹن نے لکھی ہیں اور بہت سے نتیجے جو انہوں نے نکالے ہیں' میری رائے میں ناواجب ہیں بیان واقعات میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں' خصوصاً اس سلسلہ میں کہ دلی کے معاہدہ کی بات چیت کے زمانہ میں اور اس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا ان کا ایک عجیب سا مفروضہ یہ بھی کہ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو ۱۹۳۱ء میں کانگریس کی صدارت اور یوں اس کی قیادت جو ملی تو وہ گاندھی جی کے مدمقابل کی حیثیت سے: حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں گاندھی جی حیثیت کانگریس میں اور ظاہر ہے کہ ملک میں بھی اس سے کہیں بلند رہی ہے جتنی کانگریس کے کسی صدر کی ہونی ممکن ہے وہ صدر گر رہے ہیں اور ان کا کہنا ہمیشہ مانا گیا ہے بارہا انہوں نے خود صدارت کرنے سے انکار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے کہ ان کا کوئی دوسرا ساتھی یا چیلا صدر ہو جائے۔ میں جو کانگریس کا صدر ہوا تو تمام تر ان کی ہی وجہ سے۔ دراصل انتخاب گاندھی جی کا ہوا تھا۔ مگر انہوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور میرے انتخاب کو مجبور کیا۔ ولبھ بھائی پٹیل کا انتخاب ذرا معمول تھا۔ اس لئے کہ ہم لوگ اس وقت قید سے چھوٹے تھے اور کانگریس کمیٹیاں اس وقت تک خلاف قانون جماعتیں تھیں اور معمول کے مطابق کام نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وجہ سے مجلس عاملہ نے کراچی کانگریس کے صدر کا انتخاب اپنے ذمہ لے لیا۔ ساری مجلس نے جس میں ولبھ بھائی پٹیل بھی تھے۔ گاندھی جی سے التجا کی کہ وہ صدارت قبول فرمالیں۔ کہ واقعی طور پر وہ سردار تھے ہی اس مشکل کے سال میں نام کے لحاظ سے بھی کانگریس کے سردار وہی ہوں۔ لیکن وہ نہ مانے اور اصرار سے کہا تھا کہ آپ خود ہمیشہ مسولینی کی طرح رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو عارضی طور پر بادشاہ اور دکھاوے کا سردار بناتے رہتے ہیں۔

یوں مسٹر بولٹن کی بہتری اور غلط فہمیوں سے اس حاشیہ میں بحث کرنی ممکن نہیں لیکن ایک ذراشخصی معاملہ ہے اس کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ میرے والد صاحب کی سیاسی زندگی میں جو تغیر ہوا تھا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک یورپین کلب میں ان کا انتخاب نہ ہو سکا تھا۔ اور اس وجہ سے وہ سیاست ہی میں انتہا پسند نہیں ہو گئے تھے بلکہ انگریزوں کی صحبت سے بھی پرہیز کرنے لگے تھے۔ یہ قصہ بارہا بیان ہو چکا ہے مگر ہے سراسر غلط۔ اصلی واقعات کی چنداں اہمیت نہیں لیکن میں یہاں ان کا ذکر اس لئے کئے دیتا ہوں کی بات صاف ہو جائے۔ بیرسٹری کے ابتدائی زمانہ میں سرجان اج' جو اس وقت ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے

والد صاحب کو بہت چاہنے لگے تھے۔ ایک دفعہ سر جان نے والد سے کہا کہ الہ آباد (یورپین) کلب میں شریک ہو جاؤ میں خود تمہارا نام رکنیت کیلئے پیش کروں گا۔ والد صاحب نے ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن بتلا دیا کہ اس میں لازمی طر پر بڑی دقت ہوگی بہت سے انگریز ان کے ہندوستانی ہونے کی وجہ سے اعتراض کریں گے اور ممکن ہے مخالف میں رائے دیں۔ فوج کا کوئی بھی چھوٹا موٹا افسر رائے دینے کے وقت ان کی مخالفت کر سکتا ہے۔ ان حالات میں بہتر یہی ہوگا کہ وہ اپنا نام انتخاب کے لئے پیش نہ کرائیں سر جان نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ والد کے نام کی تائید الہ آباد کے فوجی حلقہ کے بریگیڈیر جنرل سے کرائیں گے۔ مگر آخر کار میں یہ معاملہ چھوڑ دیا گیا اور نام اس لئے پیش نہیں ہو کہ والد نے صاف کہہ دیا کہ میں اس سلسلہ میں اپنی کوئی ہتک کرانے کو تیار نہیں ہوں۔ اس واقعہ سے ان کے دل میں انگریزوں کی طرف سے تلخی تو کیا پیدا ہوتی۔ ہوا یہ کہ سر جان سے ان کے تعلقات اور گہرے ہو گئے۔ اور اس کے بعد کے زمانہ ہی میں اکثر انگریزوں سیا ان کی دوستی ہوئی اور تعلقات بڑھے۔ یہ کوئی ۱۸۹۰ء کے قریاب کی بات تھی اور وہ انتہاپسند سیاسی اور تارک موالات ہوئے کوئی چوتھائی صدی گزرنے کے بعد جا کر۔ یہ ضرور ہے کہ یہ تبدیلی یکایک پیدا نہیں ہوئی تھی' البتہ پنجاب کے مارشل لا نے اس میں ذرا جلدی کرادی اور ٹھیک وقت پر گاندھی جی کے اثر نے بھی فرق پیدا کیا۔ مگر پھر بھی ان کا یہ ارادہ کبھی نہ تھا کہ وہ انگریزوں سے ملنا چھوڑ دیں۔ البتہ جہاں انگریز زیادہ تر سرکاری عہدہ دار ہی ہوں وہاں ترک موالات اور سول نافرمانی سے لازمی طور پر ان تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔

صوبجات متحدہ کے کسانوں کی پریشانیاں

کانگریس کے جنرل سیکرٹری اور مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے مجھے عام ہندوستانی سیاست سے تعلق تھا۔ کبھی کبھی دورے بھی کرنے پڑتے تھے، مگر جہاں تک بن پڑتا میں ان سے بچتا تھا۔ ذمہ داریاں بڑھیں تو مجلس عاملہ کے جلسے بھی بڑے لمبے لمبے ہونے لگے، اور آخر میں تو باضابطہ دو دو ہفتے کے اجلاس کی نوبت آ گئی۔ بات یہ تھی کہ اب محض تنقیدی قراردادیں منظور کرنے کا معاملہ تو تھا نہیں ایک وسیع اور متنوع نظام کے مختلف تعمیری کاموں کو چلانا تھا اور روز ایسے مشکل مسائل سے سابقہ تھا جن پر یہ بات منحصر تھی کہ قومی پیمانہ پر کشمکش شروع ہو کہ نہ ہو۔

مگر میرا خاص کام صوبہ متحدہ میں تھا۔ یہاں کسانوں کی پریشانیوں نے کانگریس کی تمام تر توجہ جذب کر رکھا تھا۔ صوبہ کی کانگریس کمیٹی میں کوئی ۱۵۰ سے اوپر رکن تھے اور ہر دوسرے تیسرے مہینہ ان کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی مجلس انتظامیہ میں کوئی ۱۵ ارکن تھے ان کے جلسے بھی جلد جلد ہوتے تھے اور کانگیرس کا دیہی شعبہ انہیں کے ہاتھ میں تھا۔

۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں اس مجلس انتظامیہ اور دیہاتی کمیٹی سے برابر بہت سے زمیندار خاص طور پر وابستہ تھے چنانچہ جو کچھ کہا گیا ان کی منظوری سے کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس سال ہماری صوبہ کانگیرس کمیٹی کے صدر (اور اس عہدہ کی وجہ سے اس کی مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے صدر) مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی تھے، جو ایک مشہور زمینداری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے جنرل سکرٹری، سری پر کاش جی، اور مجلس انتظامیہ کے بہت سی ممتاز رکن خود زمیندار تھے یا زمینداری کاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی ممبر متوسط طبقہ کے پیشہ ور لوگ تھے۔ صوبہ کی مجلس انتظامیہ میں ایک بھی اسامی یا غریب کسان نمائندہ نہ تھا۔ کسان ہماری ضلع کمیٹیوں میں ضرور ہوتے تھے، لیکن صوبہ کی مجلس انتظامیہ تک پہنچنے کے لئے جو کئی

انتخابات ہوتے ہیں یہ غریب ان سے نکل کر آگے نہیں بڑھ پاتے تھے۔ چنانچہ ہماری مجلس انتظامیہ میں تمام متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا غلبہ تھا اور اس میں زمینداروں کی بھی خاصی آمیزش تھی۔ اس لئے کسی معنی میں بھی یہ انتہا پسند جماعت نہ تھی' اور کسانوں کے مسئلہ پر تو ہر گز نہیں۔

صوبہ میں میری حیثیت بس مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے رکن کی تھی' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ باہمی مشوروں اور مجلس کے دوسرے کامون میں خوب حصہ لیتا تھا۔ مگر میرے کام کو رہنمائی کا کام کسی طرح نہیں کہہ سکتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے صوبہ میں تو کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رہنمائی کی اس لئے کہ ہم لوگوں نے عرصہ سے اپنے کو مل جل کر کام کرنے کا خوگر بنالیا تھا' اور ہمارے یہاں زور ہمیشہ نظام پر دیا جاتا ہے فرد پر نہیں۔ سال بھر کے لئے جو صدر ہوتا وہ عارضی طور پر ہمارا سردار ہوتا اور ہماری نمائندگی کرتا تھا مگر خود اس کو بھی کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا۔

میں مقامی طور پر الہ آباد ضلع کی کانگریس کمیٹی کا رکن بھی تھا۔ دیہی مسئلہ کے نشو ونما میں اس کمیٹی نے اپنے صدر پر۔شو۔تم داس ٹنڈن کی قیادت میں بڑا اہم حصہ لیا تھا ۱۹۳۰ء میں اسی نے ٹیکس نہ دینے کی تحریک شروع کی تھی۔ وجہ یہ نہ تھی کہ الہ آبدا میں ضلع میں زرعی کساد بازاری کا اثر کچھ اور جگہ سے زادہ تھا یوں تو اودھ کے تعلقداری اضلاع کی حالت کہیں ابتر تھی۔ بات اصل یہ تھی کہ الہ آباد کا ضلع زیادہ منظم تھا اور یہاں سیاسی احساس زیادہ تھا اس لئے کہ الہ آباد شہر سیاسی کامون کا مرکز تھا اور ممتاز کام کرنے والے اکثر آس پاس کے گاؤں میں جاتے رہتے تھے۔

مارچ ۱۹۳۲ء میں' دہلی کے سمجھوتہ کے فوراً ہی بعد ہم انے دیہات میں چھپے ہوئے اعلان بھیجے اور اپنے کام کرنے والے بھی کہ کسانوں کو بتا دیان کہ سول نافرمانی اور سیاسی تحریک روک دی گئی ہے لہٰذا سیاسی وجہ سے لگان ادا کرنے میں اب

کوئی چیز مانع نہیں ہے، اور انہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ لگان ادا کر دیں ہاں یہ ضرور ساتھ کہہ دیا تھا کہ چونکہ قیمتوں میں بے حساب کمی ہو گئی ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ انہیں بہت کچھ چھوٹ ملنی چاہیے اور یہ تجویز کی تھی کہ ہم سب مل کر اس چھوٹ کے حاصل کرنے کی کوشش کریں عام حالات میں بی لگان کا بوجھ اکثر نا قابل برداشت ہوتا تھا لیکن اب تو قیمتوں کے یوں گرنے سے بالکل ناممکنا ہو گیا تھا کہ پورا لگان یا اس کے کچھ بھی لگ بھگ ادا کیا جا سکے ہم نے کسانوں کے نمائندوں سے مل کر مشورے کیئے اور آزمائشی طور پر یہ تجویز کی کہ پچاس فیصدی اور بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ کی چھوٹ لگان میں دیجائے۔

ہماری کوشش تھی کہ کسانوں کے مسئلہ کو عام سول نافرمانی کے مسئلہ سے بالکل الگ کر دیں۔ کم سے کم ۱۹۳۱ء میں ہماری خواہش یہ تھی کہ اس مسئلہ کو سیاست سے جدا کر کے خالص معاشی نقطہ نظر سے دیکھا جائے یہ بات تھی مشکل، اس لئے کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور پہلے بھی یہ دونون پہلو باہم وابستہ رہ چکے تھے۔ ہم لوگ خود بہ حیثیت کانگریس کے بالکل سیاسی جماعت تھے۔ وقتی طور پر ہم ضرور یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسانوں کی یونین کا کام کریں (جس پر قابو غیر کسانوں بلکہ زمینداروں تک کا تھا!) مگر ہم نہ اپنے سیاسی رنگ کو چھوڑ سکتے تھے نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ ادھر حکومت تھی کہ ہمارے نہ اپنے سیاسی رنگ کو چھوڑ سکتے تھے نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ ادھر حکومت تھی کہ ہمارے نہ اپنے سیاسی کام گر دانتی تھی۔ آنے والی سول نافرمانی کا سایہ آگے آگے چلتا دکھائی دیتا تھا اور اگر نوبت آتی تو اس میں کیا شک تھا کہ سیاست اور معیشت دست درست آگے بڑھیں۔

ان تمام کھلے ہوئے موانع کے باوجود دہلی کے سمجھوتہ کے بعد سے برابر ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم کسانوں کے مسئلہ کو طے نہیں کیا تھا اور ہم اس بات کو حکومت اور قوم دونوں پر پوری طرح واضع کر دینا چاہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دہلی کی بات

چیت کے بھی کانفرنس کے دوران میں ول نافرمانی شروع نہ کروں گا۔ اور کانگریس سے درخواست کروں گا کہ کانفرنس کو پورا پورا موقع دے اور اس کے نیتجہ کا انتظار کرے۔ لیکن اس وقت بھی گاندھی جی نے یہ بات صاف کردی تھی کہ اس وعدہ کا اطلاق کسی ایسی مقامی کشمکش پر نہ ہوگا جس پر کہ ہم بعد کو مجبور ہوں۔صوبجات متحدہ کے کسانوں کا مسئلہ تو اس وقت ہم سب کے سامنے ہی تھا، اس لئے کہ یہاں منظم کارروائی ہوچکی تھی۔ورنہ واقعہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں کسانوں کی حالت یہی تھی۔شملہ کی گفتگو میں گاندھی جی نے اس بات کو پھر دہرایا تھا اور اس کا ذکر شائع شدہ خط وکتابت میں بھی آچکا ہے۔(۱) عین اس وقت کہ وہ یورپ جارہے تھے۔ گاندھی جی نے یہ بات گول میز کانفرنس سے اور سیاسی مسائل سے قطع نظر، کانفرنس کو اس بات کی ضرورت ہوسکتی ہے کہ معاشی کشاکش میں وہ قوم کے اور خصوصاً کسانوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔انھیں اس کشاکش میں پڑنے کی خواہش نہ تھی، بلکہ وہ تو اس سے بچنا چاہتے تھے لیکن اگر یہ ناگزیر ہوجائے تو پھر تو کرنا ہی چاہئے کہ ہم قوم کے عوام کو نہیں چھوڑ سکتے ان کا کہنا تھا کہ دہلی کا سمجھوتہ جو عام اور سول نافرمانی سے متعلق ہے ہمیں اس   سے نہیں روک سکتا۔
میں اس بات کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی اور اس کے رہنماؤں کے خلاف برابر الزام لگا گیا کہ ٹیکس روکنے کی مہم شروع کر کے انھوں نے دہلی کے سمجھوتہ کو توڑ دیا۔الزام لگانے والوں کو الزام لگانے میں یہ سہولت تھی کہ جس کے خلاف الزام تھا اور جو اس کا جواب دے سکتے تھے وہ سب قید خانوں میں بند پڑے تھے اور ہر اخبار اور ہر مطبع پر سخت سرکاری نگرانی تھی۔اس واقعہ سے بالکل قطع نظر کہ ۱۹۳۱ء میں صوبہ متحدہ کی کانگریس نے ٹیکس نہ دینے کی کوئی مہم سرے سے شروع ہی نہیں کی، میں جس بات کو صاف کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر معاشی غرض کے لئے سول نافرمانی سے الگ ایسی کوئی تحریک شروع بھی کی جاتی تو اس سے دہلی

کے سمجھوتہ کی خلاف ورزی نہ ہوتی۔ خود حالات کی بناپر ایسا کرنا حق بجانب ہوتا یا نہ ہوتا، یہ دوسری بات ہے۔ مگر کسانوں کو اس تحریک کے شروع کرنے کا ایسا ہی حق تھا جیسا کہ اپنی معاشی شکایات رفع کرنے کے لئے کسی کارخانہ کے مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا ہوتا ہے دہلی سے لے کر شملہ تک ہمارا کہنا یہی تھا اور حکومت اسے سمجھتی ہی نہ تھی ٹھیک بھی مانتی تھی۔

۱۹۲۹ء میں اور اس کے بعد زرعی قیمتوں میں جو سخت اتار رہا وہ دراصل بگڑتے ہوئے حالات کی آخری منزل تھی۔ پہلے کئی سال تک تو زرعی پیداوار کی قیمت بڑھی اور ہندوستانی زراعت چونکہ دنیا کی منڈی سے وابستہ ہے اس لئے اس چڑھاؤ میں شریک رہی۔ ساری دنیا میں صنعت اور زراعت کے درمیان نشو ونما کا جو تفاوت تھا اس نے ہر جگہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کو چڑھا دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی جب قیمتیں چڑھیں تو سرکاری مال گزاری اور زمینداری لگان بھی بڑھا اور اصل بونے اور جوتنے والوں کو قیمتوں کے اس بڑھنے سے بہ مشکل ہی کوئی فائدہ پہنچا بلکہ بعض خوش قسمت علاقوں کو چھوڑ کر عام طور سے تو کسانوں کی حالت کچھ ابتر ہوئی۔ صوبجات متحدہ میں لگان مالگزاری سے کہیں زیادہ تیزی سے بڑھا۔ ان دونوں میں اضافہ کی امتیازی نسبت اس صدی کے پہلے ۳۰ برس میں (میں حافظہ سے لکھتا ہوں) پانچ اور ایک کی نسبت ہے۔ یوں اگر زمین سے حکومت کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوا تو زمیندار کی آمدنی میں اس سے بہت زیادہ ہوا، اور بے چارہ کسان ہمیشہ کی طرح، اسی مربھکوں والی سطح پر رہا۔ کہیں قیمتیں کم بھی ہوئیں یا مقامی قدرتی مصیبتوں کا سامنا رہا جیسے خشک سالی، طغیانی، ٹیڑھی، اولے وغیرہ، تو بھی لگان اور مالگزاری وہی رہی، کہیں کچھ چھوٹ دی بھی گئی تو بہت رک رک کر اسی ایک فصل کے لئے۔

یوں تو اچھے سے اچھے زمانہ میں بھی لگان ضرورت سے زیادہ تھا۔ پھر وقت جو ذرا بگڑا تو مہاجن کی مدد کے بغیر یہ مطالبہ نا قابل برداشت ہوگیا اور دیہاتی قرض خوب

بڑھا۔

سارے زرعی طبقے، زمیندار مالک آراضی کسان، اور اسامی سب کے سب مہاجن کا شکار بنے، اس لئے کہ مہاجن ان حالات میں گاؤں کی ابتدائی معیشت میں ایک لازمی فرض انجام دے رہا تھا۔ چنانچہ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے خوب بیجا فائدے اٹھائے اور زمین سے تعلق رکھنے والوں پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوگئی۔ روک ٹوک اس پر کچھ تھی نہیں، قانون تھا سو اس کا مددگار یہ بس اپنے معاہدہ کے لفظوں پر اڑتا (اور شائلاک یہودی کی طرح) بس اپنے پونڈ بھر گوشت کا مطالبہ کرتا اور پاتا تھا! رفتہ رفتہ زمین بھی اس کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسان مالکان آراضی کی زمین کی حیثیت سے نمودار ہوئے! کسان مالک آراضی جو اب تک خود اپنی زمین جوتتا بوتا تھا۔ اب اس بنئے زمیندار یا ساہوکار کا غلام بن گیا۔ اسامیوں کا حال کچھ اس سے بھی برا تھا یہ بھی یا تو ساہوکار کے غلام تھے یا بے زمین پرولی تاریات کی بڑھتی ہوئی فوج میں شامل تھے۔ اس مہاجن یا ساہوکار کو جو اب زمیندار بن بیٹھا تھا، زمین سے یا اسامیوں سے کوئی زندہ تعلق نہ تھا یہ عموماً شہر کا رہنے والا ہوتا تھا وہیں اپنا لین دین کا کاروبار کرتا، لگان جمع کرنے کا کام اپنے کارندوں پر چھوڑ دیتا اور یہ کام کو مشینوں کی سی بے دردی اور بے رحمی سے انجام دیتے۔

دیہی قرض کا اس کا بڑھنا خود اپنی جگہ پر نظام زرعی کے غلط اور ناپائدار ہونے کا ثبوت ہے۔ آبادی کی بڑی اکثریت کے پاس کسی قسم کا پس انداز نہیں نہ جسمانی نہ مادی نہ اس میں مقابلہ کی طاقت، بس فاقہ اور بھوک کے کنارے زندگی ہے۔ ناموافق قسم کا کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا تو یہ اس کی تاب کیسے لائیں کوئی وبا آجائے تو لاکھوں کو ختم کر جائے۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں خود سرکار کی مقرر کی ہوئی صوبجاتی ساہوکارہ کی تحقیقاتی کمیٹی نے تخمینہ کیا تاھ کہ ہندوستان بھر کا (جس میں برما بھی

شامل ہے) دیہی قرضہ ۸۶۰ کروڑ روپیہ ہے۔ اس میں زمینداروں، کسان مالکان آراضی، اور اسامیوں سب کے قرضے شامل ہیں مگر زیادہ تر قرض انہی پر ہے جو جوتتے بوتے ہیں۔ ذرائع سے متعلق حکومت کی جو سیاست ہے وہ تمام تر قرض خواہوں کے موافق ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرض کا بوجھ اور بڑھ گیا ہے مثلاً سخت ہندوستانی مخالفت کے باوجود روپیہ کی قیمت ۱۶ فی پنس کی جگہ ۱۸ پنس مقرر کرنے کے معنی کیا تھے؟ یہی نا کہ ایک اشارہ میں دیہی قرض میں ۵.۱۲ فی صد یا تقریباً ۱۰۷ کروڑ کا اضافہ ہو گیا۔ (۲)

جنگ کے بعد پہلے تو قیمتیں بڑھی تھیں مگر پھر رفتہ رفتہ برابر گرتی گئیں اور دیہات کا حال بگڑتا گیا۔ مصیبت پر مصیبت ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کے حالات سے آئی۔

۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ کی بابت ہمارا کہنا یہ تھا کہ لگان قیمتوں کے مطابق ہونا چاہیے یعنی لگان کو گھٹا کر اتنا کر دینا چاہے جتنا اس زمانہ میں تھا۔ جب قیمتیں ۱۹۳۱ء کی سی کم تھیں۔ اور یہ صورت کوئی ۳۰ سال پہلے ۱۹۰۱ء میں تھی۔ یہ ایک موٹا سا معیار تھا اور اس سے جانچنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ اسامیوں کی بہت سی قسمیں تھیں، موروثی غیر موروثی شکمی وغیرہ اور سب سے زیادہ مصیبت میں وہ تھے جو سب سے نیچے درجہ میں تھے۔ اس کے علاوہ بس ایک معیار اور تھا اور بلا شبہ وہی سب سے زیادہ منصفانہ معیار یونی یہ کہ کسان کے مصارف پیدائش اور اس کی اجرت کو منہا کر دینے کے بعد اس کی لگان ادا کرنے کی صلاحیت کو دیکھا جائے۔ لیکن اس دوسرے معیار سے تو ہندوستان کا بہت کچھ زرعی کاروبار بالکل غیر معاشی ہو جاتا ہے چاہے آپ کسان کی زندگی گزارنے کے مصارف کو کتنا ہی کم کیوں نہ مانئے۔ اور جیسا کہ ہم نے ۱۹۳۰ء میں صوبجات متحدہ کی چند مثالوں سے ظاہر کیا تھا، بہت سے کسان لگان ادا کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اپنی املاک نہ بیچیں (اگر کچھ بیچنے کو ہو)

یا بہت زیادہ شرح سود پر روپیہ ادھار نہ لیں۔

ہمارے صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے پہلی اور گویا آزمائشی تجویز جو کی وہ یہ کہ موروثی اسامیون کو عام طور پر ۵۰ فیصدی کی چھوٹ ملے اور دوسرے اسامیون کے لئے جن کا حال ان سے بھی گیا گزرا تھا اس سے بھی زیادہ۔ جب گاندھی جی مئی ۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ میں آئے اور گورنر، سر میلکم ہیلی سے ملے تو اس وقت اس وقت ان میں کچھ اختلاف رائے تھا۔ اور وہ دونوں کسی ایک بات پر متفق نہ ہو پائے تھے اس کے جلد ہی بعد گاندھی جی نے صوبہ کے زمینداروں اور اسامیوں کے نام اپیلیں شائع کیں۔ اسامیوں والی اپیل میں انہوں نے کہا تاھ کہ جس قدر ادا کر سکتے ہو ادا کر دو کچھ حساب بھی بتایا تھا جو اس عدد سے جو ہم پہلے پیش کر چکے تھے۔ کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ ہماری صوبہ کی کمیٹی نے گاندھی جی والے حساب کو منظور کر لیا۔ مگر اس سے بھی کچھ زیادہ کام نہ چلا' اس لئے کہ حکومت نے تو اسے بھی نہ مانا۔

اس میں شک نہیں کہ صوبہ کی حکومت بڑی مشکل میں تھی۔ مال گزاری اس کی آمدنی کا خاص جزو تھا' اسے غائب ہو جانے دے یا بہت گھٹا دے تو دیوانے کا سامنا دوسری طرف اسے دیہی بے چینی کا ڈر بھی تھا اور جہان تک ہو سکتا تھا لگان میں چھوٹ دے کر یہ کسانون کو مطمئن بھی کرنا چاہتی تھی۔ دونوں باتوں کا ایک ساتھ کرنا سہل نہ تھا۔ حکومت اور کسان کے بیچ میں تھا زمیندار معاشی لحاظ سے بالکل بے سود اور غیر ضروری اضافہ۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس سے کچھ لیکر حکومت اور کسان دونوں کا کام چل جائے۔ لیکن برطانوی حکومت' جیسی کچھ کہ ہے اس کے ساتھ ہیں ہی کتنے طبقے' وہ اپنے سیاسی مفاد کی خاطر' ان کو کہ ابھی اس سے لپٹے ہوئے ہیں کس طرح دھتکار سکتی تھی۔

آخر کار صوبہ کی حکومت نے زمینداروں اور اسامیوں دونوں کے لئے چھوٹ کا اعلان کیا اس چھوٹ کا حساب ایک پیچیدہ سے قاعدہ پر مبنی تھا' اور پہلے پہل تو یہ

سمجھنا بھی دشوار تھا کہ کتنی چھوٹ ملی۔ یہ بات البتہ صاف تھی کہ جتنی چھوٹ ملنی چاہئے تھی اس سے بہت کم تھی۔ اسکے علاوہ اس چھوٹ کا تعلق بس اس وقت کے مطالبہ سے تھا' اور کسان پر جو بقایا تھا جو قرض تھا اس کا ذکر ہی نہ تھا۔ بات بالکل صاف تھی کہ اگر اسامی اس ایک ششماہی کا لگان ادا نہیں کر سکتا تو پچھلے برسوں کا بقایا اور قرضہ تو اور بھی نہ دے پائے گا۔ اور زمینداروں کا طریقہ یہی تھا کہ جو کچھ وصول ہوتا اسے پچھلے بقایا کی وصولی میں ڈال دیتے تھے۔ اسامی کے نقطہ نظر سے اس میں بڑا خطرہ تھا۔ اس لئے کہ اس غریب پر ہر وقت مقدمہ چل سکتا تھا اور واجب الادا رقم کا کوئی حصہ بھی اگر ادا ہونے سے رہ گیا ہے تو اسے بے دخل کرایا جا سکتا تھا۔

صوبہ کانگریس مجلس انتظامیہ سخت مشکل میں پڑ گئی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اسامیوں سے جو سلوک ہو رہا ہے نا روا ہے لیکن ہم بے بس تھے اور اپنے اوپر یہ ذمہ داری نہ لینا چاہتے تھے کہ کسانوں سے کہہ دیں کہ جاؤ کچھ ادا نہ کرو۔ ہم تو بس یہی کہتے رہے کہ جس قدر بھی ادا کر سکتے ہو کر دو' ہاں ان کی مصیبت میں عام طور سے ہمدردی کرتے اور ان کی ڈھارس ضرور بندھاتے رہے۔ ہم ان کے اس خیال سے بالکل متفق تھے کہ چھوٹ کے بعد بھی مطالبہ زیادہ ہے۔

اب وہ وقت آیا کہ جبر کی مشین نے' قانونی اور غیر قانونی شکل میں: اپنا کام شروع کا ی ہزاروں کے خلاف بے دخلی کے مقدمات دائر ہوئے' گائے بیل شخصی پونجی سب کی قرقی ہونے لگی' زمیندار کے آدمیوں نے ٹھکائی شروع کی۔ بہتیرے اسامیوں نے مطالبہ کا ایک حصہ ادا بھی کر دیا اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جتنا دے سکتے تھے سب دے دیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگ اس سے زیادہ بھی ادا کر سکتے ہوں مگر یہ بات بالکل صاف تھی کہ بڑی اکثریت کے لئے بہت زیادہ تھا۔ اور یوں تھوڑا تھوڑا لگان ادا کر کے بھی انہیں نجات نہ ملی۔ قانون کا بھاری بھرکم رولر تھا کہ بڑھا جاتا تھا اور جو راہ میں آتا اسے بے رحمی سے کچلتا چلتا تھا۔ بے دخلی کے مقدمہ ڈگری ہو رہے

تھے۔ چاہے لگان کا ایک حصہ لیا بھی جا چکا ہو۔ شخصی املاک اور مویشی کی قرقیاں اور نیلام جاری تھے۔ اسامی اگر کچھ ادا نہ کرتے تو بھی اس سے برے حال میں تو نہ ہوتے کچھ اچھے ہی رہتے' اس لئے کہ کم سے کم وہ روپیہ تو پاس بچ رہتا جو لگان میں ادا کر دیا۔

ہمارے پاس کسان جوق جوق آتے تھے' سخت شاکی کہ آپ کا کہا مانا جو دے سکتے تھے دے دیا' نتیجہ یہ ہوا۔ اکیلے الہ آباد کے ضلع میں ہزاروں کسان بے دخل کئے گئے تھے اور ان کے علاوہ اور ہزاروں پر کسی نہ کسی قسم کی قانونی کارروائی کی گئی تھی۔ ضلع کی کانگریس کمیٹی کا دفتر دن بھر ایک پریشان حال انبوہ سے گھرا رہتا تھا۔ کو دمیرا گھر بھی گھرا رہتا اور اکثر یہ جی چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں اور جہاں بن پڑے اپنے کو چھپالوں اور اس دردانگیز صورت حال سے بچ نکلوں۔ جو کسان ہمارے پاس آتے ان میں سے بہتوں کے جسم پر چوٹوں کے نشان ہوتے تھے' وہ ہمیں بتاتے تھے کہ زمیندار کے آدمیوں نے مارا ہے۔ ہم ہسپتال میں ان کا علاج کراتے تھے۔ یہ غریب کیا کر سکتے تھے؟ ہم ہی کیا کر سکتے تھے؟ ہم صوبہ کی حکومت کو لمبے لمبے خط لکھتے تھے۔ ہماری کمیٹی نے گووند بلبھ کو نینی تال اور لکھنو میں صوبہ کی حکومت سے تعلق قائم رکھنے کے لئے درمیانی افسر مقرر کر رکھا تھا۔ یہ بھی برابر حکومت کو لکھتے رہے تھے۔ ہمارے صوبہ کے صدر تصدق احمد خاں شیروانی بھی وقتاً فوقتاً لکھتے تھے اور میں بھی۔

جون جولائی میں بارش شروع ہوئی تو ایک اور دشواری پیدا ہوئی یہ جوتنے بونے کا زمانہ ہوتا ہے۔ جو کسان بے دخل کر دیئے گئے تھے وہ کای کرتے؟ کای بیٹھے منہ تکا کرتے اور اپنے کھیتوں کو بنجر پڑا رہنے دیتے؟ کسان کے لئے تو یہ بڑی مشکل بات تھی' اسے الٹی چھری سے کاٹنا تھا۔ اکثر صورتوں میں بے دخلی بس قانون اور ضابطہ کی بات تھی یہ کچھ زمین سے واقع طور پر تو ہٹ نہیں گئے تھے' بس عدالت کی

ڈگری ہوگئی تھی اس کے بعد اور اکچھ نہ ہوا تھا کیا یہ لوگ اپنی زمین جوت لیتے؟ اس میں مداخلت بیجا کا جرم سرزد ہو جاتا اور چھوٹ موٹے بلوہ کا ڈر تھا۔ مگر بیٹھے بیٹھے یہ دیکھنا بھی تو دشوار تھا کہ دوسرے اس کی پرانی زمین کو جوتیں۔ کسان بھلا اسے کیسے برداشت کرے؟ بیچارے ہمارے پاس مشورہ کو دوڑے آتے تھے ہم کیا مشورہ دیتے؟

گرمی میں جب میں گاندھی جی کے ساتھ شملہ گیا تو حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدہ دار سے مین نے یہ دشواری بیان کی اور ان سے پوچھا کہ آپ ہماری جگہ ہوتے تو ان کسانوں کو کای مشورہ دیتے؟ ان کے جواب سے معاملہ پر خوب روشنی پڑتی ہے۔فرمایا کہ اگر کوئی کسان جسے بے دخل کر دیا گیا ہے مجھ سے یہ سوال کرے تو میں جواب دینے سے احتراز کروں گا۔ لیعنی یہ اعلیٰ عہدہ دار صاحب تک اس کے لئے تارنہ تھے کہ کسان سے بس یہ کہہ دین کہ کھیت نہ ہوتو' ہر چند کہ قانوناً کسان کھیت سے بے دخل کی جا چکا ہے وہ چملہ کی بلندیوں پر تھے ان کے لئے آسان تھا کہ مسلوں پر اس طرح احکام جاری کیا کریں گویا ریاضی کے کسی مجرد مسئلہ کے متعلق کچھ تحریر فرمارہے ہیں' مسئلہ کے انسانی پہلو سے نہ انہیں واسطہ تھا نہ نینی تال کے اعلیٰ حکام کو نہ ان کی آنکھوں کے سامنے انسانی تکلیف وفلاکت کی وہ تصویر آتی تھی جو اس معاملہ کے ساتھ وابستہ تھی۔

شملہ میں ہم سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ تم کسانون کو بس ایک مشورہ دو لیعنی یہ کہ کل مطالبہ ادا کر دو یا جتنا بھی ادا کرنا ممکن ہو۔گویا ہمیں زمینداروں کے کارندوں کا کام کرنا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے جب ان سے کہا تھا کہ جتنا دے سکتے ہو دے دو تو ہم اس فرمائش کی تعمیل پہلے ہی کر چکے تھے ہاں' ہم نے ساتھ میں اتنا اور ضرور کہا تھا کہ اپنے مویشی نہ بیچنا اور قرض نہ لینا۔ اس کا نتیجہ جو ہوا تھا ہم دیکھ چکے تھے۔

ہم سب کے لئے یہ گرمی کا موسم بڑھا ہی سخت تھا۔ اور سر پر وہ بوجھ تھا کہ اال

ماں۔

ہندوستانی کسان میں مصیبت جھیلنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے' اور اس کے حصہ میں مصیبت آتی بھی بہت رہتی ہے قحط' طغیانی بیماری اور مسلسل افلاس اور فلاکت۔ اور جب یہ انہیں انہیں جھیل پاتا تو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چپ چپاتے حرف شکایت زبان پر لائے بغیر پڑ رہتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اس کا مصیبت سے بچنے کا طریقہ بس یہ ہے۔ ان وقتی مصیبتوں کے مقابلہ میں تو ۱۹۳۱ء کے یہ واقعات قدرت کے بن بوجھے ارادوں کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتے تھے کہ اس وجہ سے انہیں صبر کے ساتھ جھیل لیتا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ تو سب آدمیوں کی کارستانی ہے اور اس وجہ سے ان پر بگڑتا تھا۔ اس کی نئی سیاسی تعلیم کا پودا پھل لا رہا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے یہ ذمہ دارا جانتے تھے۔ کای یہ بات نہ تھی کہ کسانون نے اکثر ہماری نصیحت مانی تھی؟ لیکن پھر بھی مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہم برابر مدد نہ کرتے تو کانون کی حالت اور بھی ابتر ہوتی۔

ہم ان کا جتھا بنائے رہے اور اس لئے وہ ایک قوت بنے رہے جس کا نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ اور اس وجہ سے انہیں اس سے زیادہ چھوٹ مل گئی تھی جتنی کہ دوسرے حالات میں ملتی۔ وہ جبر اور بدسلوگی جوان غریبوں کے حصہ میں آتی ہر چند کہ بہت بری تھی' پر ان ناشاد لوگوں کے لئے کوئی غیر معمولی بات ہ تھی۔ فرق تھا تو کچھ تو درجہ کا کہ اس زمانہ میں بہت زیادہ سختی ہوئی اور کچھ اس بدلوکی کی تشہر کا۔ معمول تو یہ ہے کہ اگر زمیندار کے آدمی نے کسان سے بدسلوکی کی یا اسے ایزا بھی پہنچائی تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا تو ہوتا ہی ہے اور اگر اس مار توڑ میں وہ بیچارہ مر ہی نہ جائے تو اس علاقہ کے بارہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ لیکن اب ہمارے نظام کی وجہ سے معاملہ اور ہو گیا تھا' کسانوں میں ایک نیا احساس تھا' جس کی وجہ سے یہ متحد بھی تھے اور ہر واردات کی خبر کانگریس کے دفتر کو دیتے رہتے تھے۔

گرمیوں کا موسم ذرا اور گذرا تو جبریہ تحصیل وصول میں کمی ہوئی اور ظالمانہ کارروائیاں بھی کچھ گھٹیں۔ اب جو سوال ہمیں پریشان کر رہا تھا وہ یہ کہ جو کسان بے دخل ہوئے ہیں ان کا کیا ہو؟ ان کے لئے کیا کیا جائے؟ ہم حکومت پر زور ڈال رہے تھے کہ ان کے کھیت انہیں واپس مل جائیں کہ یہ کھیت اکثریوں ہی خالی پڑے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم سوال مستقبل کا تھا۔ اکتوبر سے اگلی تحصیل وصول کا زمانہ شروع ہونے اکو تھا اس وقت کا ی ہوگا؟ اس پر غور کرنے کے لئے صوبہ کی حکومت نے ایک چھوٹی سی کمیٹی مقرر کی جس میں کچھ تو خود اس کے عہدہ دار تھے اور کچھ سرکاری کونسل کے زمیندار ممبر۔ اس کمیٹی میں کسانوں کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔ بالکل آخر وقت میں جب کہ کمیٹی اپنا کام بھی شروع کر چکی تھی حکومت نے گووند بلبھ پنتھ سے کہا کہ ہماری طرف سے کمیٹی میں شریک ہو جائیں۔ اتنی دیر کے بعد جبکہ اہم معاملات پر فیصلے بھی ہو چکے تھے انہوں نے شرکت کو بے سود سمجھا۔

صوبجات متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے بھی ایک چھوٹی سی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ اس وقت کے اور پچھلے زمانہ کے دیہاتی امور پر معلومات جمع کرے اور موجود صورت حال پر رپورٹ دے۔ اس کمیٹی نے ایک لمبی رپورٹ پیش کی جس میں صوبہ کی زرعی حالت پر نہایت اچھا تبصرہ ہے اور قیمتوں کے گرنے سے جو مصیبت نازل ہوئی تھی اسے نہایت خوبی سے کھول کر بتایا ہے ان کی سفارشیں بھی بڑی دور رس تھیں۔ اس رپورٹ پر جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے، گووند بلبھ پنتھ، رفیع احمد قدوائی اور وینکٹش نرائن تواری کے دستخط ہیں۔

اس رپورٹ کے نکلنے سے بہت پہلے گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جا چکے تھے۔ وہ بہت ہی پس و پیش کے بعد گئے تھے اور اس پس و پیش کی ایک وجہ صوبجات متحدہ کے دیہاتی حالات بھی تھے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر گول میز کانفرنس کے لئے ولایت جانا نہ ہوتا تو وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ صوبجات متحدہ

میں جاؤں گا اور پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے میں لگ جاؤں گا۔ شملہ میں حکومت سے جو آخری گفتگو ہوئی ان میں منجملہ اور امور کے صوبجات متحدہ کا معاملہ بھی بحث میں آیا تھا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد ہم لوگ انھیں سب باتوں سے برابر مطلع کرتے رہے۔ پہلے مہینہ دو مہینہ تک تو میں انھیں ہر ہفتہ خط لکھتا تھا، ہوائی ڈاک سے بھی اور معمولی ڈاک سے بھی۔ ان کے قیام لندن کے آخری زمانہ میں میں اتنا پابند نہ رہا تھا، اس لئے کہ اس کے جلد لوٹنے کی امید تھی۔ انھوں نے ہمیں توقع دلائی تھی کہ اگر بہت دیر بھی ہوئی تو بھی وہ تین مہینہ کے اندر اندر لوٹ آئیں گے یعنی نومبر کی کسی تاریخ کو اور ہمیں امید تھی کہ اس وقت تک ہندوستان میں کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا نہ ہوگی۔ ان کی غیر موجودگی میں ہم حکومت سے خاص طور پر کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی اور دیہات کے معاملات نے تیزی سے بڑھنا شروع کیا، تو ہم نے انھیں ایک لمبا تار بھیجا جس میں سب باتوں سے انھیں باخبر کر دیا اور یہ بتا دیا کہ ہمیں کس کس طرح مجبور کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے تار ہی سے جواب دیا کہ میں اس معاملہ بے بس ہوں اور یہاں سے تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا تم اپنی سمجھ سے کام لے کر آگے بڑھو۔

صوبہ کی مجلس انتظامیہ بڑی مجلس عاملہ کو بھی برابر اطلاع دیتی رہی۔ میں خود اس مجلس میں سب باتیں بتانے کے لئے موجود تھا۔ لیکن معاملہ چونکہ ذرا بڑھتا جاتا تھا اس لئے مجلس عاملہ نے ہمارے صوبہ کے صدر تصدق احمد خان شیروانی اور الہ آباد ضلع کے صدر پرشوتم داس ٹنڈن سے بھی مشورہ کیا۔

اسی اثناء میں حکومت کی دیہاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی۔ اس میں کمیٹی نے بہت سی سفارشیں کیں، جو پیچیدہ بھی تھیں اور مبہم بھی، اور جن سے معاملہ بہت کچھ مقامی حکام میں رہتا تھا۔ مجموعی طور پر جو چھوٹ تجویز کی گئی تھی وہ پچھلی فصل کے مقابلہ میں ضرور زیادہ تھی مگر ہمارے خیال میں اب بھی کافی نہ تھی، ہمیں ان

سفارشوں کے اصول پر بھی اعتراض تھا اور ان کے عمل پر بھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس رپورٹ میں صرف مستقبل کا ذکر تھا، پچھلے بقایا، قرض، اور بے دخل کئے ہوئے کسانوں کا نام نہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ہم کیا کریں؟ بس یہی جیسے پچھلے موسم بہار اور گرمیوں میں کیا تھا۔ کہ کسان کو مشورہ دیا جائے کہ جتنا ادا کر سکتے ہو کرو، اور پھر انھیں نتائج سے دو چار ہوں جن سے پہلے ہوئے تھے؟ مگر ہم اب یہ سمجھ گئے تھے کہ یہ مشورہ تو سراسر حماقت کا مشورہ ہے اور اسے دہرانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اب تو صورت بس یہ تھی کہ یا تو کسان بڑی کوشش کر کے نئے مطالبہ کو پورا پورا چکا دے یا یہ نہو سکے تو فی الحال کچھ ادا نہ کرے اور دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔ مطالبہ میں سے کچھ تھوڑا سا ادا کر دینا تو کچھ بات نہ ہوئی، نہ ادھر نہ ادھر۔ کسان بیچارہ کے ہاتھ سے جو کچھ روپیہ تھا وہ بھی نکل گیا اور پھر زمین بھی چھن گئی۔

صوبہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ نے خوب اچھی طرح اور توجہ سے اس معاملہ پر غور کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ اگرچہ حکومت کی نئی تجویزیں پچھلی گرمی والی چھوٹ کے مقابلہ میں بہتر ہیں مگر پھر بھی ایسی نہیں کہ انھیں اسی صورت میں قبول کر لیا جائے۔ ان میں اب بھی ایسی تبدیلیوں کا امکان تھا جن سے کسانوں کو فائدہ ہوتا۔ چنانچہ ہم نے حکومت کے یہاں اسی پر زور دیا۔ لیکن وہاں محسوس ہوا کہ اب امید نہیں رکھنی چاہئے اور ہم جس جھگڑے کو ٹالنے کی کوشش میں ہیں وہ تیزی سے سامنے بڑھا آرہا ہے۔ صوبہ کی حکومت اور حکومت ہند دونوں کا رویہ کانگریس کی طرف سے برابر بدلتا جا رہا تھا۔ اور روز روز اس میں سرد مہری ظاہر ہو رہی تھی۔ ہم لمبے لمبے خط لکھتے تھے، وہاں سے نہایت مختصر جواب آتے تھے جن میں مقامی عہدہ داروں سے رجوع کرنے کو کہہ دیا جاتا تھا۔ یہ بات صاف دکھائی دیتی تھی کہ حکومت کسی طرح ہماری ہمت بڑھانا نہیں چاہتی۔ حکومت کی ایک شکایت اور ایک مشکل یہ تھی کہ کسانوں کو چھوٹ ملنے سے کانگریس کا اقتدار بڑھ جائے گا۔ حکومت عادت سے مجبور، اقتدار

اور اثر کے نقطہ نظر ہی سے سوچ سکتی تھی اور اس خیال سے کہ عوام کو چھوٹ ملنے کی وجہ کانگریس کو قرار دیں گے اسے الجھن تھی وہی چاہتی تھی کہ جہاں تک بن پڑے ایسا نہ ہو۔

اسی زمانہ میں دہلی سے اور دوسرے مقامات سے ہمیں خبریں مل رہی تھیں کہ حکومت ہند کل کانگریس کی تحریک کے خلاف بڑے پیمانہ پر یلغار شروع کرنے والی ہے۔ خبریں گرم تھیں کہ بی چھنگلیا اب ذرا زور دکھائیں گی اور بچھوؤں کے ڈنک ہمیں سزا دیں گے۔ نومبر کے مہینہ میں ڈاکٹر انصاری نے مجھے (اور علیحدہ ولبھ بھائی پٹیل، صدر کانگریس کو بھی) ایک پیام بھیجا جس میں ان بہت سی خبروں کی تصدیق تھی جو ہمیں ملتی رہتی تھیں اور خاص کر کے ان آرڈی نینسوں کی تفصیل دی تھی جو صوبہ سرحد اور صوبجات متحدہ میں نافذ ہونے والے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بنگال کو تو اس وقت ایک نئے آرڈیننس کا تحفہ مل ہی چکا تھا یا شاید عنقریب ملنے والا تھا۔ کئی ہفتہ بعد جب اس شان سے کہ گویا کوئی نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے نئے آرڈیننس نکلے تو ڈاکٹر انصاری کے پیام کی پوری تصدیق تفصیلات تک میں ہو گئی۔ عام خیال یہ تھا کہ گول میز کانفرنس میں جو خلاف توقع طوالت ہوئی اس کی وجہ سے حکومت نے اپنی کارروائی شروع کرنے میں ذرا دیر کی۔ حکومت چاہتی تھی کہ جب تک گول میز کانفرنس کے لوگ میٹ میٹھی مگر لایعنی کانا پھوسیوں میں مبتلا ہیں بس اس وقت تک ہندوستان میں کھلم کھلا تشدد کو ٹالے۔

چنانچہ کھینچ تان بڑھی، اور ہم سب کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ہماری ننھی ننھی بے حقیقت ہستیوں کے باوجود واقعات اپنی راہ پر تیزی سے گامزن ہیں اور ان کی مقدار رفتار کو کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ ہامرے بس میں بس یہ تھا کہ ان سے دوچار ہونے کے لئے اپنے کو تیار کریں اور زندگی کے اس ڈرامہ میں غالباً المناک ڈرامہ میں الگ الگ اور مل کر اپنا اپنا حصہ لیں۔ مگر ہمیں یہ امید ضرور تھی کہ قوتوں کے

تصادم کے اس ڈرامہ کا پردہ اٹھنے سے پہلے گاندھی جی لوٹ آئیں گے اور اپنے کندھوں پر ذمہ داری لے لیں گے چاہے جنگ کی۔ ان کی غیر حاضری میں اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے ہم من سے کوئی تیار نہ تھا۔

صوبجات متحدہ میں حکومت نے ایک قدم اور اٹھایا' جس سے سارے دیہات میں ہل چل مچھ گئی۔ کسانوں چھوٹ کے متعلق پرچیاں نانٹ گئیں جن میں لکھا تھا کہ کتنی جھوٹ دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی تھی کہ اس چھوٹ کے بعد جو رقم واجب الادا نہ ہے وہ اگر مہینہ بھر کے اندر (اور بعض حالتوں میں یہ مدت اس سے بھی کم رکھی گئی تھی) ادا نہ ہوگئی تو چھوٹ منسوخ' پھر پورا مطالبہ قانونی طور پر وصول کیا جائے گا یعنی وہی بے دخلی تھے۔ اور اب تو اتنی مہلت بھی انہیں نہ دی گئی۔ سارے دیہات میں ایک سخت مصیبت کا سامنا تھا اور غریب اسامی ہاتھ میں پرچی لئے ادھر سے اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ کہیں بگڑتے کہیں شکایت کرتے' کہیں صلاح مشورہ کرتے۔ حکومت اور مقامی افسروں کی طرف سے یہ دھمکی بڑی حماقت کی بات تھی اور بعد میں تو ہمیں یہ بتایا گیا کہ اس پر عمل کرنا مقصود نہ تھا بس یونہی دھمکی دے دی تھی! لیکن اس نے پرامن تصفیہ کے امکانات کو بہت دور کرکے رفتہ رفتہ مقابلہ اور کشمکش کو ناگزیر بنادیا۔

اب موقع وہ آگیا تھا کہ کسانوں کو اور کانگریس کو فیصلہ کرنا تھا' یا ادھر یا ادھر اور گاندھی جی کی واپسی تک معاملہ کو ٹالا نہ جاسکتا تھا۔ ہاں' تو کرنا کیا چاہیے تھا؟ کیا مشورہ دینا چاہئے تھا؟ کای ہم بجا طور پر کسانوں سے یہ کہہ سکتے تھے کہ جو تھوڑا سا وقت تمہیں دیا گیا ہے اس میں مطلوبہ رقم ادا کردو' اور یہ ایسی حالت میں کہ ہم خوب جانتے تھے کہ ان میں سے بہت سوں کے لئے ایسا کرنا ممکن ہی نہیں اور پھر جو بقایا ہے اس کا کای کیا جاتا؟ کیا اس کا اندیشہ نہ تھا کہ اگر رقم مطلوبہ کا بڑا حصہ بھی ادا کر دای۔ یا اس ایک فصل کا پورا مطالبہ بھی ادا کردیا تب بھی اسے بقایا کے حساب میں

ڈال کر بے دخل نہ کرا دیا جائے گا۔

الہ آباد ضلع کی کانگریس کمیٹی نے جس میں کسان بھی خاصی تعداد میں شریک تھے مقابلہ کی ٹھانی۔ اس نے طرے کیا کہ وہ کسی حال میں کسانوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ مطالبہ ادا کر دو۔ لیکن اسے بتایا گیا کہ صوبہ کی مجلس انتظامیہ اور کانگریس کی مجلس عاملہ کی باضابطہ اجازت کے بغیر اسے کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کا حق نہیں لے۔ چنانچہ معاملہ مجلس عاملہ کے سامنے گیا تصدق شیروانی اور پرشوتم داس ٹنڈن دونوں صوبہ اور ضلع کی طرف سے معاملہ سمجھانے کے لئے وہاں موجود تھے ہمارے سامنے سوال بس ایک الہ آبد ضلع کا تھا اور معاملہ تھا خالص معاشی۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اس وقت ملک مین جو عام سیاسی ہیجان ہے اس میں ہماری کاروائی کے نتائج بہت دور تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں الہ آباد ضلع کی کمیٹی کو یہ اجازت دینے میں کچھ مضائقہ تھا کہ تم کسانون کو مشورہ دو کہ فی الحال اس وقت تک لگان اور لگذاری روک دیں جب تک کہ بات چیت ہو کر بہت شرائط طے نہ ہو جائیں۔ اصلی معاملہ بس اتنا ہی تھا ارہم چاہتے بھی تھے کہ بس اسی تک رہیں آگے نہ بڑھیں۔ مگر ایسا ممکن بھی تھا؟ مجلس عاملہ اس بات کی ہر ممکن کوش کرنا چاہتی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی سے پہلے حکومت سے ان بن نہ ہو اور خاص کی ایک معاشی معاملہ پر۔ وہ اس ان بن کو اس لئے اور بھی ٹالنا چاہتی تھی کہ یہ پھر مختلف طبقات معاشی کا معاملہ بن سکتا ہے۔مجلس عاملہ سیاسی اعتبار سے بہت آگے ہو مگر معاشی اعتبار سے اتنی آگے نہ تھی اور اسے یہ پسند نہ تھا کہ اسامی اور زمیندار کا سوال اٹھا جائے۔

میری طبیعت کا رجحان چونکہ اشتراکیت کی طرف ہے اس لئے معاشی اور معاشرتی امور پر صلاح مشورہ کے لئے مجھے کچھ بہت مناسب آدمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ادھر میں خود بھی چاہتا تھا کہ مجلس عاملہ سمجھ لے کہ صوبہ متحدہ کا ماملہ ایسا ہے کہ

ہمارے معتدل مزاج اراکین خود باوجود مخالف میلان طبع کے واقعات کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور رہیں۔

چنانچہ میں بہت خوش تھا کہ مجلس عاملہ کے جلسہ میں ہمارے صوبہ سے شیروانی (ہمارے صوبہ کے صدر) اور دوسرے لوگ موجود ہیں' اس لئے کہ شیروانی کوئی شعلہ مزاج انتہا پسند نہ تھے سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے وہ کانگریس کے اعتدال پسندوں میں تھے اور سال کے شروع شروع میں صوبہ کانگریس کمیٹی کی دیہاتی سیاست کے خلاف رائے رکھتے تھے۔ لیکن جب یہ خود کمیٹی کے صدر ہوئے اور ذمہ داری کا بوجھ خود ان پر پڑا تو انہوں نے سمجھا کہ ہامرے لئے تو کوئی اور راہ ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد سے صوبہ کی کمیٹ نے جو چکھ بھی کیا اس میں ان کی پوری پوری مدشاملہ تھی اور اکثر کارروائیاں تو بحثیت صدر انہیں کی وساطت سے ہوئیں۔

چنانچہ تصدق شیروانی نے جب مجلس عاملہ کے سامنے ہماری وکالت کی تو اس کا ممبروں پر ابڑا اثر ہوا' اس سے کہیں زیادہ جتنا کہ میری وکالت سے ہوتا۔ بہت کچھ رک رک کر لیکن یہ جان کر کہ انکار کیا نہیں جا سکتا' مجلس عاملہ نے صوبہ کی کمیٹی کو یہ اختیار دیدیا کہ جس علاقہ میں چاہے لگان اور مالگذاری کا ادا کرنا کوادے' مگر ساتھ ہی اس پر بھی زور دیا کہ صوبہ والے جہاں تک ہو سکے اس بات سے بچیں اور صوبہ کی حکومت سے بات چیت جاری رکھیں۔

یہ نامہ و پیام کچھ دنوں ہوتا رہا مگر بے نتیجہ۔ میرا خیال ہے کہ اس سے الہ آباد ضلع مس چھوٹ کی تعین کچھ بہتر ہوگئی۔ حالات معمولی ہوتے تو ممکن تھا کہ کوئی تصفیہ بھی ہو جاتا یا کم سے کم لڑائی تو ٹل ہی جاتی۔ اس لئے کہ اختلاف خیال کی خلیج تنگ ہو رہی تھی۔ لیکن حالات بہت غیر معمولی تھے اور دونوں طرف' حکومت کی طرف بھی اور کانگریس کی طرف بھی یہ گمان تھا کہ جو مقابلہ سمنے آرہا ہے وہ ٹالے نہیں ٹل سکتا۔ اور یہ نامہ و پیاسب بے حقیقت ہے۔ جو قدم بھی اٹھنا تھا' ادھر سے ہو

یا ادھر سے‘ تو سمجھا یہ جاتا تھا کہ فریق مخالف اپنے مورچہ کی مضبوطی کی تدبیریں کر رہا ہے۔ حکومت کی تیاریاں تو چھپے چھپے راز میں پوری ہو سکتی تھیں اور اور چنانچہ ہوئیں بھی۔ ہماری ساری قوت عام لوگوں کے حوصلوں اور امنگوں کی بلندی پر منحصر تھی اور اسے خفیہ کارروائیوں سے پیدا کرنا یا ابھارنا معلوم۔ ہم میں سے بعض (اور ان مجرموں میں میں بھی تھا) اپنی تقریروں میں بار بار کہہ چکے تھے کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ جلد ہی بہت سی آزمائشوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہم اپنی قوم سے کہتے تھے کہ ان مصیبتوں کے لئے تیار رہے اور اس وجہ سے لوگ ہمیں جو بتاتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے متوسط طبقہ کے کانگریسی کام کرنے والے حقیقی واقعات کا سامنا کرنے سے بچتے ہیں اور امید رکھتے تھے کہ جیسے بھی ہو پھر مقابلہ کی نوبت نہ آئے گی۔ جو لوگ اخبار پڑھتے ہیں اور ان کی توجہ گاندھی جی کے لندن میں ہونے کی وجہ سے ادھر بٹ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کی اس بے عملی کے باوجود واقعات تھے کہ بڑھے چلے آتے تھے، خصوصاً بنگال میں صوبہ سرحد میں اور صوبہ متحدہ میں چنانچہ نومبر میں تو بہتوں کو دکھائی دینے لگا تھا کہ توڑ کا وقت آن پہنچا۔

صوبہ کی کانگریس کمیٹی اس ڈر سے کہ کہیں واقعات متوقع وقت سے پہلے سامنے نہ آجائیں اور جنگ شروع نہ ہو جائے اپنے کچھ نجی انتظامات بھی کر لئے تھے۔ الہ آباد کی کمیٹی نے ایک کسان سبھا بھی کی جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ اگر بہتر شرائط نہ حاصل ہو پائیں تو کسانوں کو یہ مشورہ دینا چاہئے کہ لگان اور مالگزاری ادا کرنا بند کر دو۔ اس قرارداد سے صوبہ کی حکومت بہت بگڑی اور اسے وجہ جنگ قرار دے کر انھوں نے کہہ دیا کہ بس اب ہم تم سے کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس طرز عمل کا اثر ادھر صوبہ کی کانگریس پر بھی ہوا۔ انھوں نے اسے آنے والے طوفان کا پیش خیمہ جانا اور جلدی جلدی اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔ الہ آباد میں ایک کسان

سبھا اور منعقد ہوئی اور اس میں پہلے سے زیادہ سخت اور واضع قرارداد منظور کی گئی۔ اس میں کسانوں سے کہا گیا تھا کہ مزید گفتگو کے ختم ہونے اور بہتر شرطوں کے طے پانے تک سب ادائیگیاں روک دو۔ اس وقت بھی ہم نے جو رویہ اختیار کیا، اور اس وقت کیا بالکل آخر تک، وہ یہ نہیں تھا کہ لگان ادا ہی نہ کیا جائے۔ بلکہ یہ تھا کہ مناسب لگان ادا کیا جائے۔ ہم برابر نامہ و پیام کی درخواست بھی کرتے رہے، ہر چند کہ دوسرا فریق تو نہایت طظنہ کے ساتھ ہمیں چھوڑ کر الگ جا چکا تھا۔ الہ آباد والی قرارداد زمینداروں اور اسامیوں کے لئے یکساں تھی۔ مگر ہم جانتے تھے کہ دراصل اس کا اطلاق صرف اسامیوں اور کچھ چھوٹے زمینداروں ہی پر ہوگا۔

نومبر کے آخر اور دسمبر ۱۹۳۱ء کے شروع میں صوبجات حال یہ تھی ادھر بنگال اور صوبہ سرحد میں بھی معاملات دگرگوں تھے۔ بنگال میں تو ایک نیا اور سخت ہمہ گیر آرڈیننس نافذ ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ سب نشانیاں امن کی نہ تھیں، جنگ کی تھیں۔ اور سوال بس یہ تھا کہ گاندھی جی کب واپس آئیں گے؟ حکومت نے اتنے دنوں سے جس یلغار کی تیاری کی تھی کیا اس کے شروع ہونے سے پہلے گاندھی جی ہندوستان پہنچ جائیں گے؟ یا اس وقت آئیں گے کہ ان ساتھی قید میں پہنچ چکے ہوں گے اور معرکہ چل رہا ہوگا؟ معلوم ہوا کہ وہ واپس آرہے ہیں اور سال کے آخری ہفتہ میں بمبئی پہنچ جائیں گے۔ ہم میں سے ایک ایک، کیا صدر مقام پر، کیا صوبوں میں، کانگریس کا ایک ایک رکن چاہتا تھا کہ ان کی واپسی تک معرکہ کو ٹالے۔ خود اس معرکہ کے خیال یہ بہتر تھا کہ ہم ان سے مل لیتے ان سے ہدایت اور مشورہ لے لیتے لیکن یہ ایک دوڑ تھی جس میں ہم بے بس تھے کہ چال برطانوی حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

(ا) ذیل کے خطوط ۲۷ اگست والے شملہ کے مفاہمت نامہ کا جزو تھے

مسٹر گاندھی بنام مسٹر ایمرسن' سکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ' حکومت ہند شملہ ۲۷ اگست

ڈی مسٹر ایمرسن!

آپ کا آج والا خط ملا جس کے ساتھ آپ نے ایک نیا مسودہ بھیجا ہے۔ اس کا شکریہ۔ سر کاؤس جی نے بھی مجھے ان ترمیموں کی اطلاع دی تھی جو آپ نے تجویز کی ہیں میرے ساتھیوں نے اور میں نے اس ترمیم کیے ہوئے مسودہ پر غور کرلیا ہے اور مندرجہ ذیل ملاحظات کے ساتھ ہم اسے قبول کرنے کو تیار ہیں۔

پیراگراف نمبر ۱۱ میں میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کانگریس کی طرف سے اس بات کو قبول کرلوں جو حکومت نے پیش کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں اگر سمجھوتہ پر کاربند ہونے کے سلسلہ میں کانگریس کی رائے میں کوئی شکایت پیدا ہو تو اس کی تحقیقات تو لازم ہی ہے' اس لئے کہ جب تک دہلی کا سمجھوتہ نافذ ہے سول نافرمانی بند رہے گی لیکن اگر حکومت ہند یا صوبجاتی حکومتیں تحقیقات کو منظور نہ کریں تو میرے ساتھی اور میں اس دفعہ کے رکھنے پر اعتراض نہ کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس ان دوسرے معاملات کے متعلق جو اس کی طرف سے اس قدر شدت سے پیدا ہوئی کہ تحقیقات نہ ہونیکی صورت میں کانگریس نے اپنا فرج جانا کہ تلافی کی کوئی فوری تدبیر براہ راست مد انعانہ عمل کی قسم سے تلاش کرے تو اس وقت کانگریس اس تدبیر کے اختیار کرنے کے لئے آزاد سمجھی جائے گی ہر چند سول نافرمانی بند کی جا چکی ہے۔

میں حکومت کو اس بات کا یقین دلانے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ کانگریس برابر یہ کوشش کرے گی کہ براہ راست کارروائی سے بچے اور باہمی بحث و گفتگو ترغیب وغیرہ سے کام نکالے۔ یہاں جو کانگریس کے نقطہ نظر کا اظہار کر دیا گیا وہ اس لئے کہ آئندہ غلط فہمی نہ ہو اور کانگریس پر عہد شکنی کا الزام نہ لگایا جائے۔ اگر اس وقت کی گفتگو ئیں کامیابی کے ساتھ ختم ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ سرکاری بیان' یہ خط اور آپ کا جواب سب ایک ساتھ شائع کر دیے جائیں گے۔ آپ کا مخلص

م۔ک۔گاندھی

مسٹر ایمرسن بنام مسٹر گاندھی!

شملہ

۲۷ اگست ۱۹۳۱ء

ڈیر مسٹر گاندھی! آپ کے آج والے خط کا شکریہ' جس میں آپ نے سرکاری بیان کے مسودوں کو قبول فرمالیا ہے ان ملاحظات کے ساتھ جو اُس کے خط میں درج ہیں' گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل نے نوٹ فرمالیا ہے ک کانگریس کا ارادہ ان معاملات کی تحقیقات پر اصرار کرنے کا نہیں ہے جو اب تک اس کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں۔

جہاں آپ یہ یقین دلاتے ہیں کہ کانگریس برابر اس بات کی کوشش کرے گی کہ براہ راست کاروائی سے احتراز کرے اور باہمی بحث و مباحثہ ترغیب اور اسی قسم کی تدابیر سے مداوا چاہے اس کے ساتھ آپ ان آئندہ کارروائیوں کے متعلق کانگریس کی حیثیت کو واضع کردینا چاہتے ہیں۔ جن کے اختیار کرنے کی کبھی آگے جا کر ضرورت ہوسکتی ہے۔ مجھے عرض کرنا ہے کہ گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل اس امید میں آپ کے ہمنوا ہیں کہ کوئی براہ راست کاروائی نہ کی جائے گی۔حکومت کے عام رویہ سے متعلق ہیں حضور وائسرائے بہادر کے اس خط کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ۱۹ اگست کو آپ کے نام ارقام فرمایا تھا۔مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ سرکاری بیان، آپکا آج والا خط اور اس کا یہ جواب حکومت کی طرف سے ساتھ ساتھ شائع کردیئے جائیں گے۔

آپ کا مخلص

ہ۔و۔ایمرسن

(۲) سارے ہندوستان کے دیہی قرض کے لئے ۸۶۰ کروڑ کا تخمینہ غالباً بہت کم ہے اور بہر حال پچھلے ۴۔۵ سال میں اس میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔اس قرض میں پنجاب کے حصہ کا تخمینہ پنجاب کی ساہوکارہ کمیٹی نے ۱۹۲۹ء میں پیش ہوا تھا اس پر مجلس قانون ساز کی منتخبہ کمیٹی نے جو رپورٹ دی ہے اس میں لکھا ہے کہ اہل زراعت پر قرض کا بوجھ اتنا ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔کم کم تخمینہ سے بھی کوئی ۲۰۰ کروڑ، یہ نیا عدد ساہوکارہ کمیٹی کے تخمینہ سے کوئی ۵۰ فیصدی زیادہ ہے۔اگر قرض میں اضافہ کی رفتار دوسرے صوبوں میں بھی یہی ہے تو اس وقت ۱۹۳۴ء سارے ہندوستان کے دیہی قرض کا تخمینہ کوئی ۱۲۰۰ کروڑ روپیہ سے اوپر ہوگا۔

عارضی صلح کا خاتمہ

صوبجات متحدہ میں اپنی مشغولیت کے باجود مجھے عرصہ سے یہ فکر تھی کہ طوفان کے جو، دو مرکز اور ہیں، صوبہ سرحد اور بنگال، کسی طرح وہاں پہنچوں۔ جی چاہتا تھا کہ موقع پر جا کر حالات کا مطالعہ کروں اور پرانے ساتھیوں سے بھی ملوں، کہ ان میں سے بہتوں سے تو اب کوئی دو سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس سب زیادہ میری خواہش یہ تھی کہ ان صوبوں کے لوگوں نیجو ہمتاور شجاعت دکھائی ہے اور قومی جنگ میں جو قربانیاں کی ہیں ان پر خود جا کر اپنا خراج عقیدت پیش کروں۔ اس زمانہ میں صوبہ سرحد تو میری پہنچ سے باہر تھا، اس لئے کہ حکومت ہند اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی ممتاز کانگریسی وہاں جائے، اور حکومت کی اس نا پسندیدگی کے باوجود ہم جانا چاہتے تھے کہ کہیں خواہ مخواہ کوئی گتھی نہ پڑ جائے۔

بنگال میں معاملات بد سے بدتر ہوتے جاتے تھے اور اگر چہ دل اس صوبہ کی طرف بہت کھنچتا تھا مگر جانے سے پہلے میں بہت کچھ جھجکا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں بے بس ہوں گا اور کچھ زیادہ فائدہ نہ پہنچا سکوں گا۔ اس صوبہ میں دو کانگریسی جماعتوں میں مدت سے ایک افسوسناک جھگڑا چلا آتا تھا۔ باہر کے کانگریس والے اس سے ڈرتے تھے اور الگ الگ رہتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں خود ایک طرف سے یا دوسری طرف سے اس جھگڑے میں الجھ نہ جائیں۔ یہ طریقہ تھا کمزوری کا اور وہی شترمرغ کا سا۔ اس سے نہ بنگال میں سکون پیدا ہو سکتا تھا نہ وہاں کے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ گاندھی جی کے لندن جانے کے کچھ عرصہ بعد دو واقعات ایسے پیش آئے کہ سارے ہندوستان کی توجہ بنگال کے معاملات کی طرف ہو گئی یہ حادثے ہجلی اور چاٹ گام میں ہوئے تھے۔

ہجلی میں نظر بندوں کے رکھنے کے لئے ایک خاص جیل تھا۔ سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ اس جیل میں بلوہ ہوا تھا، نظر بندوں نے جیل کے اسٹاف پر حملہ کیا اور

اسٹاف والے گولی چلانے پر مجبور ہوئے۔ ایک نظر بند گولی سے مارا گیا اور زخمی تو بہتیرے ہوئے۔ واقعہ کے فوراً ہی بعد مقامی طور پر ایک سرکاری تحقیقات ہوئی جس میں اسٹاف والوں کو گولی چلانے اور اس کے نتائج سے بالکل بری الذمہ کردیا گیا۔ لیکن اس واقعہ میں بہت سی نرالی باتیں تھیں، بعض واقعات جو رفتہ رفتہ ظاہر ہوئے تو وہ سرکاری بیان سے مطابقت نہ کھاتے تھے، لہذا تفصیلی تحقیقات کے لئے بڑا سخت مطالبہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں جو عام سرکاری رسم ہے اس سے بالکل خلاف حکومت بنگال نے اعلی عدالتی عہدہ داروں کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کردی۔ یہ کمیٹی بالکل سرکاری تھی۔ مگر اس نے جو شہادتیں لیں اور معاملہ پر پوری طرح غور کیا تو معاملہ کو جیل کے اسٹاف کے خلاف پایا۔ انھوں نے قرار دیا کہ غلطی زیادہ تر اسٹاف کی تھی اور گولی کا چلانا ناواجب تھا۔ یوں گویا اس باب میں حکومت کے جملہ سابقہ بیانات سراسر جھوٹے پڑے۔

یوں تو ہگلی کے حادثہ میں کوئی بہت غیر معمولی بات نہ تھی۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات یا حادثات ہندوستان میں کوئی نادر چیز نہیں ہیں۔ جیل کے بلووں کا ذکر اکثر پڑھنے میں آتا ہے جن میں نہتے اور بے بس قیدیوں کو مسلح نگران اور دوسرے لوگ بہادری سے دبا دیتے ہیں۔ ہگلی میں جو غیر معمولی بات تھی وہ یہ کہ اس واقعہ نے اس قسم کے حادثات کے متعلق سرکاری بیانات کے یکطرفہ ہونے بلکہ جھوٹا ہونے کو کھول کر ظاہر کردیا اور لطف یہ کہ سرکاری طور پر ظاہر کردیا۔ پہلے بھی لوگ ان سرکاری بیانات کو کچھ بہت باور نہ کرتے تھے۔ لیکن اب تو بالکل پول ہی کھل گیا۔

ہگلی کے واقعہ کے بعد سے ہندوستان بھر میں بہت سے ایسے جیل کے حادثات کے ہوئے ہیں، کبھی اور قسم کا تشدد کیا گیا ہے۔ اور کچھ عجیب بات ہے کہ ان بلووں میں ہمیشہ بس قیدی ہی ضرر اٹھاتے ہیں۔ تقریباً ہمیشہ ایک سرکاری بیان شائع ہوتا ہے کہ قیدی طرح طرح کی بدکرداریوں کے مرتکب تھے اور اسٹاف سراسر بے قصور

تھا۔ شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ اسٹاف والوں کو محکمہ کی طرف سے کوئی سزا دی گئی ہو۔ تفصیلی تحقیقات کے سب مطالبوں کا جواب بس نکا سا نفی میں ملا۔ صرف محکمہ کی طرف سے دریافت حال کو کافی سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہگلی کا سبق حکومت نے خوب اچھی طرح سیکھا تھا یعنی یہ کہ باضابطہ اور غیر جانبدار تحقیقاتیں کرانا ٹھیک نہیں اور یہ کہ الزام لگانے والا ہی بہترین فیصلہ کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ لوگ بھی ہگلی کے واقعہ سے یہ سبق سیکھیں کہ سرکاری بیانات میں بس وہ ہوتا ہے جو حکومت منوانا چاہتی ہے اصلی واقعات سے انھیں کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

چاٹ گام کا معاملہ اس سے بہت سخت تھا کسی تشدد پسند نے ایک مسلمان پولیس کے انسپکٹر کو گولی سے مار ڈالا تھا۔ اس پر ہندو مسلم فساد ہوا یا کم سے کم اسے ہندو مسلم فساد بتایا گیا۔ یہ بات واضح تھی کہ معاملہ اس سے بہت کچھ زیادہ تھا۔ اور معمولی فرقہ وارانہ فسادات سے ذرا مختلف تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ تشدد پسند کے فعل کو فرقہ واریت سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ تو بس ایک پولیس کے افسر کے خلاف تھا۔ بالکل اس سے قطع نظر کہ وہ افسر ہندو تھا یا مسلمان۔ پھر بھی اس قتل کے بعد کچھ ہندو مسلم فساد ضرور ہوا تھا۔ فساد کیسے شروع ہوا اور فساد کا یہ موقع کیا تھا یہ بات صاف نہ ہوئی ہر چند کہ اس باب میں ذمہ دار لوگوں نے سخت سخت الزامات لگائے۔ اس فساد میں ایک اور خاص بات یہ تھی کہ بعض بعض خاص گروہوں نے مثلاً اینگلو انڈین ملازمین ریلوے نے اور دوسرے سرکاری ملازموں نے اس میں بڑا حصہ لیا اور کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے نہایت وسیع پیمانہ پر انتقامی کارروائیاں کیں۔ ج۔م۔ سین گپتا اور بنگال کے دوسرے رہنماؤں نے چاٹ گام کے واقعات کے متعلق معین الزامات لگائے اور مطالبہ کیا کہ ان کی تحقیقات کرلی جائے، یا ہمارے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلایا جائے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور یہی مناسب سمجھا کہ کچھ نہ کرے۔

چاٹ گام کے ان ذرا غیر معمولی واقعات نے دو خطرناک امکانات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ تشدد پسندی کو یوں تو مختلف پہلوؤں سے برا بتایا جا چکا ہے حتی کہ جدید انقلابی طریقہ کار کے نزدیک بھی یہ بری قرار پا چکی ہے لیکن اس کے امکانی نتائج میں سے ایک نے مجھے ہمیشہ بہت متوحش رکھا ہے یعنی ہندوستان میں غیر منظم اور فرقہ وارانہ تشدد کے پھیل جانے کے خطرے نے۔ میں کچھ ایسا بودا ہندو نہیں ہوں کہ تشدد سے اس لئے خائف ہوں کہ وہ تشدد ہے، مگر یہ تشدد مجھے پسند نہیں۔ لیکن میں محوس کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ابھی انتشار کی قوتیں بہت ہیں اور بے ضابطہ تشدد سے انھیں تقویت پہنچے گی اور ایک متحدہ اور منظم قوم کی تعمیر کا کام جتنا دشوار ہے اس سے دشوار تر ہو جائے گا۔ جب لوگ مذہب کے نام پر قتل کریں یا بہشت میں اپنے لئے جگہ محفوظ کرانے کے لئے تو انہیں سیاسی تشدد پسندی کا عادی بنانا ذرا خطرہ کی بات ہے۔ سیاسی قتل بھی بری چیز ہے۔ مگر پھر بھی سیاسی تشدد پسند کے ساتھ دلیل و بحث ممکن ہے اور اسے دوسری راہ پر ڈالا جا سکتا ہے اس لئے کہ گمان یہ ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے کوشاں ہے وہ دنیاوی مقصد ہے شخصی نہیں بلکہ قومی مقصد ہے۔ مگر مذہبی قتل اس سے بھی بری چیز ہے، اس لئے کہ اس کا تعلق دوسری دنیا سے ہے اور اس کے متعلق بحث و دلیل کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی بعض وقت ان دونوں قسموں کا فرق بہت باریک ہو جاتا ہے بلکہ تقریباً کچھ نہیں رہتا اور سیاسی قتل بھی کسی فوق الطبعی عمل سے نیم مذہبی قتل بن جاتا ہے۔

چاٹ گام میں ایک پولیس افسر کے قتل اور اس کے نتائج سے صاف صاف سامنے آ گیا کہ ایسی تشدد کی کاروائیوں کے کیسے خطرناک امکانات ہیں اور اس سے ہندوستانی اتحاد اور آزادی کو کیسا سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس قتل کے بعد جو انتقامی کاروائیاں ہوئیں اس سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں بھی فاشٹی طریقے پہنچ گئے ہیں اس کے بعد سے خصوصاً بنگال میں اس قسم کی انتقامی کاروائیوں کی بہت سی

مثالیں پیش آچکی ہیں اور یہاں کے یورپین اور اینگلو انڈین باشندوں میں فاشٹی روح پھیل چکی ہے۔ برطانوی سامراج کے بعض ہندوستانی دم چھلوں نے بھی اس روح کو اپنایا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ خود سیاسی تشدد پسندوں میں یا ان میں سے بہتوں میں یہی فاشٹی روح کارفرما ہے' لیکن اس کا رخ دوسری طرف ہے ان کا فاشزم کا مد مقابل ہے۔

میں نومبر ۱۹۳۱ء میں چند روز کے لئے کلکتہ گیا۔ ان دنون مصروفیت بہت رہی' نجی طور پر بہت سے افراد اور جماعتوں سے ملنے کے علاوہ کئی عام جلسوں میں تقریریں بھی کیں۔ ان سب جلسوں میں میں نے سیاسی تشدد پسندی پر بحث کی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ تشدد پسندوں کو برا بھلا نہیں کہا نہ انہیں نامرد اور بزدل بتایا جس طرح ہمارے بعض وہ ہم وطن کہا کرتے ہیں جس سے شاید ہی کبھی کوئی ایسا کام اتفاق سے بھی سرزد ہوا ہو جس مین ایسے مرد یا عورت کو جو ہر دم جان جوکھوں میں ڈالتا ہو کوئی بزدل کہے۔ اس شخص پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بودے نکتہ چینیوں کو جو دور سے پڑے چلاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرسکتے ذرا اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

کلکتہ کے قیام کے آخری دن شام کو رخصت ہو کر اسٹیشن جانے سے پہلے دو نوجوان مجھ سے ملنے آئے۔ یہ دونوں بہت کم عمر تھے، کوئی بیس بیس سال عمر ہوگی ذرا گھبرائے گھبرائے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ مجھے خبر بھی نہ تھی کہ یہ کون تھے، مگر ان کے آنے کا مقصد میری سمجھ میں آگیا۔ یہ مجھ سے بہت خفا تھے کہ میں نے سیاسی تشدد کے خلاف تلقین کی۔ انھوں نے بتایا کہ نوجوانوں پر اس کا بہت برا اثر ہو رہا ہے اور وہ اس قسم کی مداخلت کو گوارا نہیں کرسکتے۔ ان سے کچھ بحث ہوئی بہت جلدی جلدی میں اس لئے کہ میری روانگی کا وقت قریب تھا۔ شاید دوران بحث میں ہمارا

لجہ سخت ہو گیا تھا اور مزاج میں کچھ گرمی پیدا ہو گئی تھی اور میں نے شاید کچھ سخت باتیں بھی ان سے کہیں۔ جب ان سے رخصت ہوا تو چلتے چلتے انھوں نے تنبیہ کی،، اب آگے ذرا خیال رہے ایسی باتیں نہ ہوں ورنہ تمھارے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو اوروں کے ساتھ کیا گیا ہے۔،،

میں یوں کلکتہ سے رخصت ہوا۔ رات کو جب ریل گاڑی میں لیٹا تو دیر تک ان دو لڑکوں کے گھبرائے گھبرائے چہرے نظر کے سامنے رہے۔ یہ زندگی سے لبریز اور عصبی قوت سے بھرے ہوئے تھے، کیا ہی اچھا سامان تھا اگر انھیں کوئی ٹھیک راہ پر لگا دے! مجھے افسوس تھا کہ میں نے ان سے اس قدر عجلت میں اور ذرا درشتی سے برتاؤ کیا اور جی چاہتا تھا کہ ان سے ذرا دیر تک بات چیت کا موقع ملا ہوتا۔ شاید میں انھیں سمجھا سکتا کہ اپنی ہونہار زندگیوں کو کسی اور راہ پر ڈالیں۔ ہندوستان اور آزادی کی خدمت کی کسی راہ پر کہ ان راہوں میں جرات اور قربانی کے مواقع کی کیا کمی ہے۔ پچھلے برسوں میں مجھے اکثر ان نوجوانوں کا خیال آیا ہے مجھے کبھی ان کے ناموں کا علم نہ ہوا نہ پھر کہیں ان کا کوئی اور پتہ چلا، اور کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ کیا معلوم وہ مر گئے کہ کالے پانی میں جیل کی کسی کوٹھری میں جیتے ہیں۔

دسمبر کا مہینہ تھا، لالہ اباد میں دوسری کسان سبھا کا جلسہ ہوا اور میں جلدی جلدی جنوب میں کرناٹک پہنچا۔ اپنے پرانے ساتھی ہندوستانی سیوادل والے ڈاکٹر ن۔ س ہرڈیکر سے ایک پرانا وعدہ تھا اسے پورا کرنا تھا۔ سیوادل قومی تحریک کے رضا کاروں والا حصہ ہے۔ اس کا انتظام بالکل الگ تھا مگر یہ برابر کانگریس کے ساتھ رہا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے موسم گرما میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے اسے کانگریس کے نظام میں بالکل ملانے اور کانگریس کا شعبہ رضا کاران بنا لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ یہ ہو گیا اور ہرڈیکر نے مجھے آمادہ کیا کہ وہ جا کر دل مختلف تقریبوں میں شریک ہوں۔ پھر وہ مجھے کچھ سن کے لئے کرناٹک کے دورہ پر لے گئے اور مجھے ہر جگہ لوگوں کا جوش دیکھ کر

بڑی حیرت ہوئی۔ واپسی میں شولا پور گیا جو مارشل لا کے نفاذ کی وجہ سے مشہور ہو چکا تھا۔

کرناٹک کے اس دورہ کی حیثیت ایک الوداعی رسم کی سی ہو گئی۔ میری تقریریں گویا ہنس کا آخری گیت تھیں۔ اگرچہ تھیں ذرا تیز و تند اور میں تو سمجھتا ہوں کہاں میں ایسی موسیقی بھی نہ تھی۔ صوبہ متحدہ سے جو خبریں آئی تھیں وہ بالکل قطعی اور واضع تھیں۔ حکومت نے وار کر دیا تھا اور روا رہی کاری۔ الہ آباد سے کرناٹک جاتے ہوئے میں کملا کے ساتھ بمبئی بھی گیا تھا۔ وہ پھر بیمار تھی۔ میں نے بمبئی میں ان کے علاج کا انتظام کیا۔ الہ آباد سے بمبئی پہنچنے کے بعد ہی ہمیں خبر ملی تھی کہ حکومت ہند نے صوبجات متحدہ کے لئے ایک خاص آرڈیننس جاری کر دیا ہے۔ گاندھی جی جہاز میں تھے اور عنقریب بمبئی پہنچنے والے تھے، مگر حکومت نے یہی فیصلہ کیا کہ ان کی واپسی کا انتظار نہ کرے۔ آرڈیننس کی غرض تو دیہی شورش کو دبانا بتائی گئی تھی مگر اس کا جال اتنی دور تک پھینکا گیا تھا کہ ہر قسم کی سیاسی زندگی ناممکن ہو گئی تھی حد یہ کہ قدیم انجیل والی رسم کو پلٹ کر اس نے اولاد کے گناہوں پر والدین اور سرپرستوں کو سزا دینے کا اہتمام تک کیا تھا!

اسی زمانہ میں گاندھی جی کے اس انٹرویو کی خبر پڑھنے میں آئی جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انھوں نے روما کے اخبار ژرنال اطالیا کو دیا ہے۔ اس پر بڑی حیرت یوں ہوئی کہ یوں سرسری طور پر روما میں کوئی انٹرویو دے گاندھی جی کی عادت کے بالکل خلاف بات تھی۔ پھر جو اس بیان کو ذرا غور سے پڑھا تو اس میں بہت سے لفظ اور فقرے ایسے ملے جو گاندھی جی کے ہو ہی نہ سکتے تھے چنانچہ قبل اس کے کہ ان کی طرف سے انکار ہوتا ہم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ انٹرویو جس شکل میں شائع ہوا ہے اس میں تو ہرگز نہیں دیا گیا ہوگا۔ ہم سمجھتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہوگا اس بہت توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا ہے اتنے میں گاندھی جی کی طرف سے اس کی قطعی تردید نکلی اور

ان کا یہ بیان شائع ہوا کہ انھوں نے روما میں سرے سے کوئی انٹرویو دیا ہی نہیں، اس وقت یہ بات صاف ہوگئی کہ کسی نے گاندھی جی کے ساتھ چال چلی ہے، لیکن حیرت تو اس پر ہوئی کہ برطانوی اخباروں اور سیاسی کارکنوں نے گاندھی جی کی تردید کو باور نہیں کیا اور حقارت کے ساتھ انھیں جھوٹا کہہ کر پکارا اس سے بڑا ہی دکھ ہوا اور بہت غصہ آیا۔

میرا جی بہت چاہتا تھا کہ کرناٹک کا دورہ چھوڑ دوں اور الہ آباد پہنچوں۔ دل کہتا تھا کہ میری جگہ صوبہ متحدہ میں اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش ہے۔ جب گھر میں یہ کچھ ہو رہا ہو تو خود دور رہنا بڑی ہی تکلیف دہ آزمائش تھی۔ لیکن میں نے فیصلہ یہی کیا کہ کرناٹک کے پروگرام کی پابندی کروں۔ بمبئی واپس آیا تو بعض دوستوں نے صلاح سی کہ گاندھی جی ٹھیک ہفتہ بھر میں آجائیں گے ان کے پہنچنے تک بمبئی ہی میں ٹھیروں۔ لیکن یہ تو ناممکن تھا۔ الہ اباد سے پرشوتم داس ٹنڈن اور دوسرے لوگوں کی گرفتاریوں کی خبر آئی تھی۔ اس کے علاوہ ہماری صوبہ کی کانفرنس کا اجلاس اسی ہفتہ میں اٹاوہ میں ہونا قرار پایا تھا۔ چنانچہ میں نے الہ آباد کی واپسی کا فیصلہ کیا اگر آزاد رہا تو چھ روز بعد بمبئی لوٹ آوں گا، گاندھی جی سے بھی مل لوں گا اور مجلس عاملہ کے جلسہ میں شریک ہو جاؤں گا۔ کملا کو وہیں بمبئی میں بستر علالت پر چھوڑا۔

ابھی الہ آباد پہنچا بھی نہ تھا کہ چیوکی اسٹیشن پر نئے آرڈیننس کے ماتحت ایک حکم کی تعمیل مجھ پر کی گئی۔ الہ آباد کے اسٹیشن پر پھر اسی حکم کے مثنیٰ کی تعمیل کی کوشش کی گئی اور گھر پہنچا تو ایک تیسرے صاحب نے تیسری مرتبہ کوشش فرمائی۔ بات صاف تھی کہ بھول چوک کا احتمال بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ اس حکم نے مجھے الہ آباد میونسپل کے حدود میں نظر بند کر دیا تھا اور مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں کسی عام جلسہ یا تقریب میں شریک نہ ہوں نہ کسی جلسہ میں تقریر کروں نہ کسی اخبار یا پرچہ میں کچھ لکھوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی پابندیاں تھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ایسا ہی حکم بہت سے

ساتھیوں کو ملا تھا جس میں تصدق شیروانی بھی تھے۔ دوسرے دن صبح میں نے مجسٹریت ضلع کو جس نے یہ حکم جاری کیا تھا خط لکھا جس میں ان کے حکم رسید دی اور ان کو اطلاع دی کہ میں ان سے اس بات کی ہدایات لینے کا قصد نہیں رکھتا کہ کروں اور کیا نہ کروں، میں اپنے معمولی طریق پر اپنا معمولی کام کرتا رہوں گا اور اسی کام کے سلسلہ میں میرا ارادہ ہے کہ جلد بمبئی واپس جاؤں کہ وہاں گاندھی جی سے ملوں اور مجلس عاملہ کے جلسہ میں شریک ہوں جس کا میں سکرٹر ہوں۔

اب ایک نئے مسئلہ کا سامنا تھا۔ صوبہ کی کانفرنس کا جلسہ اسی ہفتہ اٹاوہ میں ہونا مقرر تھا۔ میں بمبئی سے اس ارادہ سے آیا تھا کہ جلسہ کو ملتوی کرنے کی رائے دوں گا اس لئے کہ اس کی تاریخیں گاندھی جی کے پہنچنے کی تاریخوں سے ٹکرتی تھیں اور اس لئے بھی کہ میں حکومت سے مقابلہ کو بچانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے الہ آباد واپس آنے سے پہلے ہمارے صدر شیروانی کے نام صوبہ کی حکومت کا ایک تاکیدی پیام پہنچ چکا تھا۔ ان سے دریافت کیا گیا تھا کانفرنس میں دیہی مسئلہ پر بحث ہوگی یا اس لئے کہ اگر بحث ہونے والی ہو تو حکومت کانفرنس ہی کو روک دے۔ یہ بات تو سب جانتے تھے کہ کانفرنس کا خاص مقصد ہی دیہی مسئلہ پر بحث نہ کرنا تو حماقت اور اپنے کو معطل کر دینے کی انتہا ہوتی۔ اور بہر حال ہمارے صدر کو یا اور کسی شخص کو یوں یہ اختیار تھا ہی نہیں کہ کانفرنس کو یوں پہلے سے پابند کر دے۔ حکومت کی دھمکی سے بالکل قطع نظر ہم میں سے بعض کا ارادہ خود کانفرنس کو ملتوی کرا دینے کا تھا۔ مگر اب جو دھمکی ملی تو بات اور ہو گئی۔ ایسے معاملوں میں ہم میں سے اکثر ذرا ضدی واقع ہوئے تھے اور یہ خیال کہ حکومت یوں جو چاہتی ہے کرواتی ہے کچھ خوش آئند نہ تھا۔ مگر بہت کچھ دلیل و بحث کے بعد ہم نے فیصلہ یہی کیا کہ اپنے غرور کو دبا جائیں اور کڑوا گھونٹ پی ہی لیں، کانفرنس کو ملتوی کر دیں۔ یہ اس لئے کیا کہ ہم سب جانتے تھے، کہ جن داموں بھی ممکن ہو گاندھی جی آنے تک اس جھگڑے کو جو شروع تو ہو ہی گیا تھا بڑھنے نہ

دیں۔ ہم یہ نہ چاہتے تھے کہ وہ جب آئیں تو انھیں ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہو جس میں وہ رہنمائی کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لے سکیں۔ ہماری طرف سے کانفرنس کے ملتوی کر دیئے جانے کے باوجود اٹاوہ میں پولیس اور فوج کا بڑا مظاہرہ ہوا، کچھ اکے دکے نمائندے بھی گرفتار کیئے گئے اور فوج بے سودیشی نمائش پر قبضہ کر لیا۔

شیروانی نے اور میں نے ۲۶ دسمبر کی صبح کو الہ آباد سے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ شیروانی کو مجلس عاملہ نے خاص طور پر بلایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے حالات پر مشورہ کرے۔ ہم دونوں کو آرڈیننس کے ماتحت حکم مل چکا تھا کہ الہ آباد شہر سے باہر نہ جائیں۔ کہا یہ جاتا تھا کہ آرڈیننس الہ آباد اور صوبہ متحدہ کے بعض اور ضلعوں کے دیہات میں لگان روکنے کے کام کے خلاف نافذ کیا گیا ہے، اس لئے یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آسکتی تھی کہ حکومت ہمیں ان دیہی علاقوں میں نہ جانے دے لیکن یہ بات تو صاف تھی کہ ہم بمبئی شہر میں یہ دیہی شورش برپا نہ کر سکتے اور اگر آرڈیننس کا مقصد واقعی دیہات کی شورش سے متعلق تھا تو ہمارے صوبہ سے باہر جانے پر تو اور خوش ہونا چاہئے تھا۔ جب سے آرڈیننس نافذ ہوا تھا ہم لوگوں کا طرز عمل برابر مدافعت کا تھا اور اگر چہ کہیں کہیں انفرادی طور پر احکام کی نافرمانی ہوئی تھی مگر فی الجملہ ہم نے اس نئے قانون سے قوت آزمائی کو ٹالا تھا۔ جہاں تک صوبہ کی کانگریس کا تعلق تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ یہ کم سے کم اس وقت حکومت سے لڑائی کرنے سے بچنا یا اس کو ملتوی کرنا چاہتی تھی۔ شیروانی اور میں بمبئی اس لئے جا رہے تھے کہ وہاں گاندھی جی اور مجلس عاملہ ان معاملات پر غور کریں گے اور کسی کو خبر نہ تھی، کم سے کم مجھے تو ہرگز یقین نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا ہوگا؟

ان سب باتوں سے تو یہ خیال ہوتا تھا کہ ہمیں بمبئی جانے دیا جائے گا اور نظر بندی کے حکم کی محض ضابطہ کی نافرمانی کو کم سے کم اس وقت حکومت گوارا کر لے گی۔ مگر دل کچھ اور ہی گواہی دیتا تھا۔

ریل گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ صبح کے اخبارات میں صوبہ سرحد کے نئے آرڈیننس کا ذکر اور عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کی گرفتاری کی خبر پڑھی۔ تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑی بمبئی میل، یکا یک بیچ کے ایک اسٹیشن ارادت گنج پر کھڑی ہوگئی، جہاں عموماً یہ گاڑی نہیں ٹھہرا کرتی تھی اور پولیس کے افسر ہمیں گرفتار کرنے کے لئے گاڑی میں چڑھ آئے۔ جیل خانے کی ایک گاڑی لائن کے پاس کھڑی تھی، شیروانی اور میں قیدیوں کی اس بند گاڑی میں سوار ہوئے اور ہچکولے کھاتے نینی پہنچے۔ انگریز پولیس کپتان جس نے ہمیں ۲۶ دسمبر کی صبح کو کہ تحفہ تحائف دینے کا دن ہوتا ہے گرفتار کیا تھا کچھ گم سم اور افسردہ سا تھا۔ شاید ہم نے اس غریب کا بڑا دن خراب کیا۔

غرض ہم یوں قید خانہ کو چلے۔ بقول شاعر،

"راحت وشادمانی سے اب ذرا منہ موڑو
اور کچھ دن کرب والم کے سانس کھینچو،"

گرفتاریاں۔ تعزیری قوانین اور ضبطیاں

ہماری گرفتاری کے بعد گاندھی جی یورپ سے بمبئی پہنچے۔ اس وقت انھیں تازہ واقعات کا علم ہوا۔ لندن میں انھوں نے یہ سن لیا تھا کہ بنگال میں تعزیری قانون نافذ ہوگیا ہے اور اس سے انھیں سخت تشویش تھی، لیکن یہاں پہنچ کر انھیں علم ہوا کہ صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد کے تعزیری قوانین کی شکل میں ان کے لئے بڑے دن کے چند تحفے اور موجود ہیں اور دونوں صوبوں میں ان کے عزیز ترین رفقاء گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ معاملہ حد سے گذر چکا تھا اور صلح کی تمام امیدیں ختم ہوگئی تھیں۔ پھر بھی انھوں نے اس گتھی کو سلجھانے کی آخری کوشش کی اور لارڈ ولنگڈن وائسرائے سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کا موقع دیا جائے۔ نئی دہلی سے ان کے پاس یہ جواب پہنچا کہ چند شرائط کے ماتحت ملاقات ممکن ہے۔ میرے پاس وائسرائے کے جواب کی نقل موجود نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے شرائط یہ تھیں کہ بنگال صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد کے تازہ واقعات، تعزیری قوانین اور ان کے ماتحت گرفتاریوں کا اگر آپ کوئی ذکر نہ کریں تو تشریف لا سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی یا کسی کانگریسی رہنما کے لئے ان ممنوعہ مسائل کو چھوڑ کر جن سے سارے ملک میں ایک ہیجان برپا تھا وائسرائے سے باضابطہ گفتگو کرنے کا اور کون سا موضع باقی رہ جاتا تھا۔ اب یہ صاف ظاہر تھا کہ حکومت ہند کانگریس کو کچل ڈالنے پر تلی ہوئی ہے اور اس سے کوئی معاملہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ورکنگ کمیٹی کو اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سول نافرمانی پھر شروع کر دے۔ اس کے ممبر جانتے تھے کہ ان کے لئے ہر وقت گرفتاری کا خطرہ ہے اس لئے فطرتاً ان کی خواہش تھی کہ جیل میں جانے سے پہلے قوم کے سامنے ایک صحیح راہ عمل پیش کر دیں۔ پھر بھی سول نافرمانی کی قرارداد محض عارضی طور پر منظور کی گئی اور گاندھی جی نے وائسرائے سے ملنے کی ایک اور کوشش کی۔ انھوں نے وائسرائے کو دوسرا تار بھیجا کہ مجھے غیر مشروط

ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ اس کے جواب میں حکومت نے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر دونوں کو گرفتار کر لیا اور وہ بٹن دبا دیا جس سے سارے ملک میں تشدد کی مشین کام کرنے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چاہے اور کوئی لڑائی کا خواہش مند ہو یا نہ ہو لیکن حکومت لڑنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔

ہم جیل میں تھے اور یہ تمام خبریں مبہم اور بے ربط شکل میں ہمارے پاس پہنچی تھیں۔ ہمارا مقدمہ نیا سال شروع ہونے تک ملتوی ہو گیا تھا۔ اس لئے زیر سماعت حوالاتی کی حیثیت سے ہم عام قیدیوں کے مقابلہ میں باہر والوں سے زیادہ مل سکتے تھے۔ ہم نے سنا کہ ملک میں یہ اہم بحث چھڑ یہوئی ہے' کہ آیا وائسرائے نے ملاقات سے انکار کر کے غلطی کی یا نہیں؟ گویا ان کے ملاقات کرنے یا نہ کرنے پر ہر بات کا دارومدار تھا۔ اس وقت ملاقات کا یہ مسئلہ تمام دوسرے معاملوں پر چھا گیا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اگر لارڈ ارون یہاں موجود ہوتے تو ہرگز انکار نہ کرتے اور اگر وہ گاندھی جی مل بیٹھتے تو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستانی اخبارات کتنی سطحی نظر سے اس مسئلہ کو دیکھ رہے ہیں اور اصل حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ہندوستانی قوم پرستی اور برطانوی سامراج دراصل دو متضاد چیزیں ہیں اس لئے ان دونوں کا ٹکرانا ضروری ہے۔ تو کیا یہ جنگ چند افراد کے ذاتی رویہ پر منحصر ہے؟ کیا ان دونوں تاریخی قوتوں کی ٹکر باہمی اخلاق اوور دل آویز مسکراہٹ سے رک سکتی ہے؟ گاندھی جی نے ایک خاص طرز عمل اس وجہ سے اختیار کیا کہ ہندوستان کی قومی تحریک خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ یعنی زندگی اور موت کے معاملہ میں بدیشیوں کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھی۔ اسی طرح ہندستان کے برطانوی وائسرائے نے ایک دوسرا رویہ اس لئے اختیار کیا کہ قومی تحریک کا مقابلہ اور برطانوی مفاد کی حفاظت کی کوشش کرے۔ پھر اس کا کیا سوال ہے کہ اس وقت کون وائسرائے تھا کون نہیں تھا۔ اگر لارڈ ارون وائسرائے

ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے جو لارڈ ولنگڈن نے کیا۔ کیونکہ دونوں برطانوی سامراج کے آلہ کار تھے اور ذاتی طور پر مقررہ پالیسی میں محض جزوی ترمیم کر سکتے تھے قدیم لارڈ ارون خود اس وقت حکومت برطانیہ کے ایک رکن تھے اس لئے ہندوستان میں حکومت نے جو قدم اٹھایا اس میں وہ بھی شریک تھے۔ ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کے معاملہ میں کسی وائسرائے کو ذاتی حیثیت سے اچھا یا برا کہنا بالکل لغو بات ہے۔ اور ہمارا ان فضولیات کو اہمیت دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو ہم حقیقت حال کو سمجھتے ہی نہیں یا جان بوجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔

۴ جنوری ۱۹۳۲ء ایک یادگار تاریخ تھی۔ اس روز دلیل اور بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ صبح تڑکے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر ولبھ بھائی پٹیل گرفتار کر لئے گئے اور شاہی قیدی کی حیثیت سے بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دئے گئے۔ چار نئے تعزیری قانون نافذ ہوئے جن کی رو سے مجسٹریٹوں اور پولیس افسروں کو نہایت وسیع اختیارات مل گئے۔ شہری آزادی کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ حکام اپنی مرضی سے افراد کو قید اور املاک کو ضبط کر سکتے تھے۔ گویا سارے ہندستان میں ایک طرح فوجی محاصرے کا اعلان ہو گیا۔ رہی اس محاصرے کی وسعت و شدت' مقامی حکام کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی تھی۔ (۱)

اسی روز صوبہ متحدہ کے ضابطہ اختیارات ہنگامی کے ماتحت نینی جیل میں ہمارے مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ شیروانی کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور ڈیڑھ سو روپے جرمانہ کی سزا ملی اور مجھے دو سال کی قید بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانہ (بصورت عدم ادائیگی مزید چھ ماہ) کی سزا ہوئی۔

ہم دونوں کا جرم ایک تھا۔ دونوں کو حکم دیا گیا تھا کہ الہ آباد شہر سے باہر نہ نکلیں۔ ایک ساتھ بمبئی جانے کی کوشش کر کے دونوں نے یکساں ان کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں سزائیں مختلف ملیں۔ البتہ ایک فرق ضرور تھا۔

میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ تحریری اطلاع دے دی تھا کہ میں اس حکم کے باوجود بمبئی جانے والا ہوں۔ شیروانی نے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ لیکن ان کی روانگی کا بھی سب کو علم تھا اور اخباروں میں بھی خبر شائع ہوگئی تھی۔ سزا کا حکم سننے کے بعد ہی شیروانی نے مجسٹریٹ سے ایک نہایت ہی دلچسپ سوال کیا جس سے سارا مجمع کھل کھلا ہنس پڑا اور بیچارہ مجسٹریٹ گھبرا گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کای مجھے کم سزا دینے میں فرق وارانہ تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے؟

اسی تاریخی دن یعنی ۴ جنوری کو سارے ملک میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے م سے تھوڑی دور پر یعنی الہ آباد شہر میں بہت بڑے مجمع کا پولیس اور فوج سے مقابلہ ہوگیا۔حسب معمول لاٹھی چارج ہوا جس سے بہت سے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ سول نافرمانی کے قیدیوں سے جیل پھر بھرنے شروع ہوگئے پہلے یہ ڈسٹرکٹ جیلوں میں نینی کے سنٹرل جیل مین بھیجے گئے اور جب وہاں گنجائش نہیں رہی تو دوسری سنٹرل جیلوں کی باری آئی آخر جیل بھر گئے اور بڑے بڑے جیل کیمپ کھولنا پڑے۔

نینی میں ہمارے چھوٹے سے احاطے میں بہت کم لوگ آئے' یعنی صرف میرے پرانے ساتھی نربدار پرشاد' رنجیت پنڈت ارو میرے رشتہ کے بھائی موہن لال نہرو۔چند روز کے بعد بارک نمبر ۶ کی اس چھوٹی سی برادری میں ایک اور مہمان کا اضافہ ہوجن کے آنے سے ہم سب کو بہت تعجب ہوا۔ یہ ہمارے سیلون کے نوجواب دوست برنز ڈلیوہارے تھے جو حال ہی میں انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے۔میری بہن نے انہیں خوب سمجھا دیا تھا کہ تم مظاہروں میں نہ پڑنا لیکن جوش میں آکر وہ کانگریس کے جلوس میں شریک ہوگئے اور قیدیوں کی گاڑی نے انہیں جیل خانہ پہنچا دیا۔کانگریس کلاف قانون قرار دے دی گئی۔فہرست میں سب سے اوپر ورکنگ کمیٹی کا نام تھا۔ اس کے بعد صوبوں کی کمیٹیاں اور بے شمار

مقامی کمیٹیاں تھیں۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ وہ تمام ادارے بھی خلاف قانون ٹھیرائے گئے جو اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے یا محض اس کے ہمدرد تھے یا انتہا پسند سمجھے جاتے تھے۔ کسان سبھائیں، کاشتکاروں کی انجمنیں، نوجوانوں کی انجمنیں، طلبا کے ایسوسی ایشن، انتہا پسند سیاسی ادارے، قومی یونیورسٹیاں اور اسکول، قومی اسپتال، سودیشی ادارے کتب خانے سبھی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ فہرست بہت طویل تھی اور ہر بڑے صوبہ کے ذی میں سینکڑوں نام درج تھے۔ سارے ہندوستان کی میزان لگائی جاتی تو یقیناً ہزاروں تک پہنچتی۔ خلاف قانون اداروں کی اتنی زبردست تعداد خود کانگریس اور قومی تحریک کی کامیابی کی ایک روشن دلیل تھی۔

میری بیوی بمبئی میں بیمار پڑی تھیں اور سول نافرمانی میں حصہ لینے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ میری والدہ اور دونوں بہنیں بہت جلد ایک ایک سال کی سزا پا کر جیل پہنچ گئیں۔ ہمیں نئے آنے والوں کے ذریعہ سے باہر کی تھوڑی بہت خبریں مل جاتی تھیں یا کچھ حال ایک مقامی ہفتہ وار پرچہ سے جو ہمیں پڑھنے کو ملتا تھا معلوم ہو جاتا تھا۔ لیکن باہر کے واقعات کا پورا پرچہ سے جو ہمیں پڑھنے کو ملتا تھا معلوم ہو جاتا تھا۔ لیکن باہر کے واقعات کا پورا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں قیاس سے کام لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ خبروں کا احتساب بڑی سکٹ وے ہوتا ہے اور اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو ہمیشہ بھاری سزاؤں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ بعض صوبوں میں تو گرفتار ہونے والوں یا سزا پانے والوں کا نام لکھنا بھی جرم تھا۔

غرض ہم نینی جیل میں باہر کی جنگ سے دور تھے پھر بھی ہمارا دل اسی میں پڑا تھا۔ ہم وقت گزارنے کے لے چرخہ کاتتے، کتابیں پڑھتے، دوسرے مشاغل میں مصروف رہتے۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے لیکن دل میں ہر وقت یہی سوچتے رہتے کہ جیل خانے کی دیواروں کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ غرض ہم اس تحریک سے

جدا ہونے کے باوجود اس میں شریک تھے۔ کبھی انتظار کی خلش دل کو بے چین کرتی کسی غلطی پر غصہ آجاتا' کمزوری یا کمینہ پن کی حرکت سے نفرت ہوتی اور کبھی ہم جذبات سے الگ ہو کر نہایت سکون اور غیر جانبداری سے تمام حالات پر غور کرتے اور یہ سمجھ لیتے کہ جب بڑی بڑی قوتیں کام کر رہی ہوں اور قہر و غضب کی چکیاں چل رہی ہوں تو چھوٹی چھوٹی انفرادی غلطیاں اور کمزوریاں لازمی ہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ دیکھیں اس جنگ و جسدل' اس شور و شغب' اس دلیرانہ جوش و خروش' اس ظالمانہ جبر و تشدد اور نفرت انگیز بزدلی کا کیا رنگ رہتا ہے اور ان سب چیزوں کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ مستقبل ہم سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا اور یہی اچھا تھا' بلکہ ہم قیدیوں کو تو حال کی بھی خبر نہ تھی۔ لیکن اتنا ہم ضرور جانتے تھے کہ ہمیں جنگ و مصیبت اور قربانی کا آج بھی سامنا ہے اور کل بھی رہے گا۔

میتھو آرنلڈ نے کیا خوب کہا ہے۔

"لوگ کل میدان میں نکل کھڑے ہوں گے اور جنگ از سر نو شروع ہو جائے گی۔"

زنے تھس (۲) کا سارا میدان خون سے سرخ نظر آئے گا۔

ھکڑ (۲) اور اجکس (۲) پھر میدان میں اتریں گے۔

اور ہیلن (۲) پھر دیوار پر کھڑے ہو کر اس خوں چکاں جنگ میں چمکیں گے۔ کبھی اندھی امیدوں سے ابھریں گے کبھی اندھی مایوسی میں ڈوبیں گے۔

دل و جان سے سعی و عمل میں مصروف ہو جائیں گے مگر یہ پتہ نہ چلے گا کہ ہامرے روح کا کاکی حشر ہوتا ہے۔

---

(۱) وزیر ہند سر سیمول ہور نے ۲۴ مارچ ۱۹۳۲ء کو دار العلوم میں یہ اقرار کیا تھا مجھے تسلیم ہے کہ ہم نے جو تعزیری قانون نافذ کیے ہیں وہ نہایت سخت ہیں اور ہندوستانیوں

کی زندگی کے قریب قریب ہر شعبہ پر حاوی ہیں۔"

(۲) یونان کے شاعر ہومر نے لیتھنس اور ٹرائے کا جنگ نامہ لکھا ہے۔ اس میں زنے تھس میدان جنگ کا نام ہے ہکڑ اور آجکس فریقین کے سورما ہیں اور ہیلن وہ عورت ہے جس کی خاطر جنگ ہوئی تھی۔

بازی پروپیگنڈا

۱۹۳۲ء کے ابتدائی مہینوں میں۔اور بہت سی عجیف باتوں کے ساتھا یک یہ بھی تھی کہ برطانوی حکومت دل کھول کر بازاری طرز کے پروپیگنڈے سے کام لے رہی تھی۔چھوٹے بڑے تمام افسر بڑی بلند آہنگی سے دعوے کرتے تھے کہ ہم بڑے نیک ارامن پسند ہیں اورکانگریس بڑی پاپی اور جھگڑالو ہے۔ہم جمہوریت کے حامی ہیں اورکانگریس ڈکٹیٹری کی موید ہے۔اس تقدس کے جوش میں شاید انہین اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں یادنہیں رہیں' جیسے تعزیری قوانین کا نفاذ' ہرطرح کی آزادی کا سلب کرلینا' اخباروں اور مطبعوں کا گلا گھونٹنا' بلا مقدمہ چلائے لوگوں کو قید میں ڈال دینا' جائداداور روپۓ کی ضبطی یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جو اُۓ دن دیکھنے میں آتی تھیں اور شاید وہ یہ بھی بھول گئے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کن اصولون پر قائم ہے۔سرکاری وراء جو ہمارے ہی ہم وطن تھے' جوش خطابت میں یہ فرماتے تھے کہ کانگریس والے تو اپنے ذاتی اغراض حاصل کرتے ہیں (جیل میں!) اور ہم چند ہزار روپیہ ماہوار کی حقیر تنخواہ پر دن رات قوم کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ ماتحت عدالتیں نہ صرف ہمیں بھاری بھاری سزائیں دیتی تھین بلکہ اس موقع پر وعظ و نصیحت بھی فرماتی تھیں اور کبھی کبھی کانگریس اوراس کے کارکنوں کو جی بھر کے گالیں بھی دیتی تھیں۔سر سیموئل ہور نے بھی وزارت ہند کی کرسی پر بیٹھ کر یہ گل افشانی فرمائی تھی کہ کتے بھونکا کرتے ہیں۔ اور قافلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔شاید وہ اس وقت یہ بھول گئے تھے کہ سب کتے تو جیل میں بند تھے اور وہاں آسانی سے بھونک نہیں سکتے تھےاور جو باہر تھے ان کے منہ پر کس کر چھینکا چڑھا دیا گیا تھا۔

سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ کانپور کے فساد کا الزما کانگریس کے سر تھوپا گیا۔ اس خوفناک فساد کی تباہ کاریوں کو بیان کر کے بار بار یہ کہا گیا کہ کانگریس اس کی ذمہ داری ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر صرف کانگریس ہی نے

شرافت اور ہمدردی سے کام لیا۔ اس کے ایک لائق ترین فرزند نے امن قائم کرنے کی کوشش میں اپنی جان دے دی اور کانپور کی ہر جماعت اور فرقہ نے اس کا ماتم کیا۔ کانگریس کے کراچی کے اجلاس میں جب یہ خبر پہنچی تو فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے بہت تفصیلی تحقیقات کی مہینوں کی محنت کے بعد اس نے ایک ضخیم رپورٹ تیار کی جسے حکومت نے فوراً ممنوع قرار دیا اس کے تمام مطبوعہ نسخے ضبط کر لئے اور شاید انہیں ضائع کر دیا۔ ہمارے تحقیقات کے نتائج کو اس طرح دبا دینے کے باوجود سرکاری معترفین اور انگریزوں کے اخبارات برابر یہی رٹ لگائے گئے کہ یہ فساد کا کانگریس کی وجہ سے ہوا۔

ایک دن اس معاملہ اور دوسرے معاملات کی حقیقت آشکارا ہو کر رہے گی۔
لیکن بعض اوقات جھوٹ بہت دن تک سچ سے آگے آگے رہتا ہے۔

جھوٹ اپنا کام اور اسی کا بول بالا ہو گا۔

مگر اس وقت جب اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

اس وقت جنگ کی سی حالت تھی اس لئے شاید جذبات کا یہ ہیجان ایک قدرتی چیز تھی اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ حکومت سچائی یا ضبط سے کام لے گی مگر پھر بھی ہیجان کی یہ شدت حیرت انگیز تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کی حکمران جماعت کے اعصاب کی کیا حالت تھی اور اس نے کس طرح اپنے جذبات کو ایک مدت سے دبا رکھا تھا۔ غالباً اس کے اس غیظ و غضب کا سبب ہمارا کوئی قول یا فعل نہیں تھا۔ بلکہ خود اس کا یہ خوف کہ سلطنت ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ جن حکمرانوں کو اپنی قوت پر اعتماد ہوتا ہے وہ اس طرح بدحواس نہیں ہو جایا کرتے، تصویر کا دوسرا رخ اس رخ سے بہت مختلف تھا دوسری طرف خاموشی طاری تھی یہ کوئی اختیاری اور پروقار خاموشی نہیں تھی بلکہ قید خانہ کی' خوف کی' اور عالمگیر احتساب کی خاموشی تھی۔ اگر اس طرح جبر و تشدد نہ کیا جاتا تو ممکن ہے دوسری طرف بھی یہی

ہیجان نظر آتا اور اسی طرح مبالغے اور بدزبانی سے کام لیا جاتا۔ البتہ شہروں سے کبھی کبھی شائع ہوتے تھے۔

انگریزوں کے جو اخبار ہندوستان میں ہیں، وہ بھی اس بازاری پروپیگندے میں بڑے شوق سے شریک ہوگئے اور ان خیالات کو علی الاعلان ظاہر کرنا شروع کردیا جو شاید مدت سے وہ اپنے سینوں میں دبائے بیٹھے تھے۔ عموماً انھیں اپنی تحریر میں ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ ان کے ناظرین میں ہندوستانیوں کی تعداد بہت کافی ہے لیکن اس طوفان میں یہ احتیاط بھی بہہ گئی۔ اور ہمیں انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے دلوں کی گہرائی کی ایک جھلک نظر آگئی۔ ہندوستان میں ایک ایک کرکے بیشتر اینگلو انڈین اخبار ختم ہوچکے ہیں۔ صرف تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن جو باقی ہیں وہ نہایت اعلیٰ معیار کے اخبار ہیں۔ ان کا خبروں کا انتظام بھی نہایت معقول ہے اور ترتیب اور طباعت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ دنیا کی سیاست کے متعلق ان میں جو افتتاحیہ مقالے شائع ہوتے ہیں گو انکا نقطہ نظر رجعت پسندانہ ہوتا ہے لیکن بڑی قابلیت سے لکھے جاتے ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والے کو اپنے موضوع پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخباری حیثیت سے وہ ہندوستان میں سب سے ممتاز ہیں۔ لیکن ہندوستان کے سیاسی مسائل میں وہ اپنی سطح سے بہت نیچے گر جاتے ہیں اور ایسی یک طرفہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور جب قومی تحریک کا زور ہوتا ہے تو یہ جانبداری وحشت اور سوقیانہ پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ حکومت ہند کی آواز کو دہرانے لگتے ہیں اور اس مسلسل پروپیگنڈے میں ضبط اور احتیاط کے تمام پردے اٹھا دیتے ہیں۔

ان چند منتخب اینگلو انڈین اخباروں کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار عموماً ادنیٰ قسم کے ہیں، ان کی مالی حالت خراب ہے اور ان کے مالک اسے سنبھالنے کی کوشش

بھی نہیں کرتے۔ ان کا روز کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے اور بیچارے ادارتی عملے کو بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کی طباعت وغیرہ خراب ہوتی ہے اور اشتہارات بھی نا مناسب قسم کے ہوتے ہیں، زندگی کے عام مسائل اور سیاسیات میں یہ والہانہ روش رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہماری قوم جذبات پرست واقع ہوئی ہے کچھ یہ کہ (جہاں تک انگریزی اخباروں کا تعلق ہے) انگریزی ان کے لئے بدیسی زبان ہے اور اس میں ایسا طرز بیان اختیار کرنا کہ سادگی کے ساتھ زور بھی ہو، آسان نہیں ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ ایک عرصہ تک محکوم رہتے رہتے اور جبر و تشدد سہتے سہتے ہمارے جذبات گھٹ کر اور دب کر رہ گئے ہیں اور جب ذرا سا موقع ملتا ہے ابل پڑتے ہیں۔

ہندوستانیوں کے انگریزی اخباروں میں طباعت ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے مدراس کا ہندو سب سے بہتر ہے۔ اس کی وہ شان ہے جو ایک ثقہ اور تقدس ماب بوڑھی بن بیاہی عورت کی ہوتی ہے کہ جہاں کسی نے کوئی ایسا ویسا لفظ زبان سے نکالا اور وہ حیا اور غصہ کے مارے آپے سے باہر ہوگئی۔ ہندو خاص طور پر اوسط طبقے کے شہریوں کا پرچہ ہے اور اس کا کاروبار خوب جما ہوا ہے۔ زندگی کے تاریک پہلو، حیات کی کش مکش اور نشیب و فراز سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ بہت سے اعتدال پسند اخباروں کا معیار بھی یہی ثقاہت اور تقدس مابی ہے۔ یہ رنگ تو وہ پیدا کر لیتے ہیں لیکن ہندو کی اور خصوصیات نہیں پیدا کر سکتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے روکھے پھیکے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت نے اس حملہ کے لئے عرصہ سے تیاری کی تھی اور چاہتی تھی کہ پہلی ہی ضرب نہایت شدید اور موثر ہو۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ نئے نئے تعزیری ضابطوں سے تحریک کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکے۔ گویا اس وقت پیش قدمی کانگریس کی طرف سے ہوئی تھی اور حکومت مدافعت کرتی تھی۔ ۱۹۳۲ء کا

طریقہ اس کے بالکل برعکس تھا یعنی اب حکومت نے چاروں طرف سے حملہ شروع کردیا۔ سارے ملک کے لئے اور اس کے علاوہ علیحدہ علیحدہ تمام صوبوں کے لئے طرح طرح کے تعزیری ضابطے نافذ کئے اور ان کی رو سے حکام کو دنیا بھر کے اختیارات دیدیئے۔ ادارے خلاف قانون قرار دیئے گئے۔ عماتیں' جائداد' موٹریں اور بنک کی رقمیں ضبط کرلی گئیں۔ جلسہ اور جلوس کی ممانعت کردی گئی اور اخبار اور مطبعے پوری طرح جکڑ دیئے گئے۔ دوسری طرف بہ خلاف ۱۹۳۰ء کے گاندھی جی قطعی رائے تھی کہ سول نافرمانی فی الحال شروع نہ کی جائے۔ اور ورکنگ کمیٹی کے اراکین بھی زیادہ تر ان کے ہم خیال تھے۔ بعض لوگوں کا اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ چاہے ہم جنگ کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں مگر جنگ یقینی ہے اس لئے ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہئے' صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد میں کشمکش برابر بڑھ رہی تھی اس لئے لوگوں کا ذہن آنے والی جنگ کی طرف خودبخود منتقل ہونے لگا تھا۔ لیکن بحیثیت مجموعی تعلم یافتہ اور اوسط طبقہ اس وقت جنگ کے خیال میں نہ تھا۔ گووہ اس کو بالکل ناممکن نہیں سمجھتا تھا۔ نہ جانے کیوں لوگوں کو یہ امید بندھ گئی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی پر جنگ ٹل جائے گی ظاہر ہے کہ خواہش نے خیال کی صورت اختیار کرلی تھی۔

غرض ۱۹۳۲ء کے شروع میں حکومت نے سراسر پیش قدمی کی اور کانگریس اول سے آخر تک مدافعت کرتی رہی' تعزیری ضوابط کے یکا یک نافذ ہوجانے اور سول نافرمانی کے شروع ہوجانے سے اکثر مقامی کارکن ہکا بکا رہ گئے۔ پھر بھی کانگریس کی دعوت پر چاروں طرف سے لبیک کی آواز بلند ہوگئی اور ہر طرف سے سول نافرمانی کرنے والے اُمڈ آئے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ۱۹۳۲ء حکومت برطانیہ کا ۱۹۳۰ء سے کہیں زیادہ مضبوطی سے مقابلہ کیا گیا کیونکہ ۱۹۳۰ء میں عموماً سب کہیں اور خصوصا بڑے بڑے شہروں میں نمود و نمائش زیادہ تھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اگرچہ ۱۹۳۲ء میں لوگوں نے پہلے سے زیادہ استقلال کا ثبوت دیا اور غیر معمولی طور پر

پرامن رہے لیکن ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں جوش بہت کم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کو مجبوراً جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ ۱۹۳۰ء کی جنگ میں ایک خاص شان تھی جواب باقی نہیں رہی تھی۔ حکومت نے اپنی پوری طاقت سے کانگریس کو آزادی عمل یا پیش قدمی کا کوئی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی وار نے اسے اور اس کے اوسط طبقہ کے حامیوں کو جو اس کے خاص ہمدرد تھے بیکار کر دیا۔ اسکی چوٹ ان کی جیبوں پر پڑی اور انھیں یقین ہو گیا کہ جو کوئی سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہو گا یا کسی طرح اس کی مدد کرے گا اسے نہ صرف اپنی آزادی سے بلکہ شاید تمام املاک سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ صوبہ متحدہ میں ہم پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا کیونکہ یہاں تو کانگریس غریبوں کی جماعت ہے البتہ بمبئی جیسے بڑے بڑے شہروں میں املاک کی ضبطی کے خوف نے بڑا اثر ڈالا کیونکہ اس سے تاجروں کا طبقہ تو بالکل برباد ہو جاتا اور اونچے پیشوں کے لوگوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا۔ محض اس دھمکی نے (جو کبھی عمل میں بھی لائی گئی) شہر کے تمام کھاتے پیتے لوگوں کو سن کر دیا چنانچہ بعد میں مجھے ایک سیدھے سادے لیکن خوش حال تاجر کا ایک عجیب واقعہ معلوم ہوا۔ اس بچارے کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا بجز اس کے کہ شاید وہ کبھی کچھ چندہ دے دیتا تھا مگر پولیس نے اسے دھمکی دی کہ تم پر پانچ لاکھ روپیہ جرمانہ کیا جائے گا اور لمبی سزا الگ ہو گی۔ اس قسم کی دھمکیاں بہت عام تھیں۔ اور یہ خالی خولی دھمکیاں نہ تھیں کیونکہ اس وقت پولیس کا راج تھا اور آئے دن دیکھنے میں آتا تھا کہ وہ گرجتی نہیں بلکہ برستی بھی ہے۔

میرے نزدیک حکومت کے اس رویہ پر کسی کانگریسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے گو اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے اس انتہائی پرامن تحریک کے خلاف جو جبر و تشدد اختیار کیا وہ تہذیب کے ہر معیار سے گرا ہوا اور سخت قابل اعتراض تھا۔ اگر ہم عملی جدوجہد اور انقلابی طریقے اختیار کریں گے تو چاہے وہ کتنے ہی پرامن کیوں نہ ہوں ان کا مقابلہ ضرور ہو گا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انقلاب کا

کھیل نہیں کھیلا جاسکتا۔ لیکن بعض حضرات انقلاب بھی چاہتے ہیں اور مقابلہ سے بھی بچتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ جو شخص انقلابی جدوجہد کی راہ میں قدم رکھنا چاہتے ہے اسے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ کھاتے پیتے خوش حال لوگ بہت کم انقلاب پسند ہوتے ہیں گو ان میں سے ایک آدھ ایسے بھی نکل آتے ہیں، وہ حضرات جو دنیاوی عقل رکھتے ہیں، انھیں بیوقوف سمجھتے ہیں اوران پر اپنے سے غداری کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔

عام لوگوں کو جن پر قومی تحریک اصل میں منحصر تھی دبانے کے لئے حکومت کو اور تدبیروں سے کام لینا پڑا۔ اس لئے کہ ان کے پاس نہ موٹریں تھیں نہ بینکوں میں رقم تھی نہ کوئی اور ایسی املاک تھیں جن پر قبضہ کیا جاسکتا۔ تحریک کو دبانے کے لئے حکومت نے طرح طرح سختیاں شروع کیں اوران کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حضرات بھی جو (بقول ایک مصنف کے جس کی کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے) ''سرکاری آدمی'' کہلاتے ہیں، خوب جھنجوڑے گئے۔ ان میں سے بعض نے یہ سمجھ کر نہ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے کچھ دن سے کانگریس سے لگاوٹ کی باتیں شروع کردی تھیں۔ بھلا حکومت اسے کب برداشت کرنے والی تھی۔ اس کے لئے مجہول وفاداری کافی نہیں تھی۔ بقول فریڈرک کوپر کے جو ۱۹۵۷ء کی شورش کے سلسلہ میں مشہور ہیں، حکومت ''کامل عملی اور ثبوتی وفاداری چاہتی تھی۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ رعایا کی رواداری کے برتے پر قائم رہنے'' ایک سال پہلے مسٹر لائڈ جارج نے اپنے پرانے رفقاءکار یعنی برطانوی لبرل پارٹی کے لیڈروں کے متعلق جو ''نیشنل گورنمنٹ'' میں شامل ہوگئے تھے یہ فرمایا تھا کہ وہ '' گرگٹ کی طرح جیسا موقع دیکھتے ہیں ویسا ہی رنگ بدل لیتے ہیں'' ہندوستان کے نئے حالات میں اب غیر جانبداری کا رنگ نہیں چل سکتا تھا (اس لئے ہمارے بعض ہم وطن وفاداری کے گہرے اور شوخ رنگوں میں جو حکومت کو مرغوب تھے، ڈوب گئے اور بڑی دھوم

دھام سے ہمارے حکمرانوں سے اظہار محبت کرنے لگے۔ انھیں تعزیری ضوابط، فوجی قواعد، مغرب کے بعد گھر سے نہ نکلنے کے احکام اور دوسری بے شمار مخالفتوں اور دوسری بے شمار مخالفتوں اور مزاحمتوں کا تو کوئی خوف تھا نہیں، کیونکہ سرکاری طور پر اعلان ہو چکا تھا کہ یہ سب کچھ باغیوں اور مخالفوں کے لئے ہے، وفاداروں کے خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ مزے سے بیٹھے اس شورش اور ہنگامے کا تماشہ دیکھتے تھے، جو چاروں طرف برپا تھا۔ اور اس خوف و ہراس سے ذرا بھی متاثر نہ تھے جو ان کے بہت سے ہم وطنوں پر طاری تھا۔ گویا وہ ''وفادار چرواہے'' کی ہیروئن ''گلو'' کے ہم زبان ہو کر کہتے تھے۔

ایک چیز کا تو مجھے خوف ہی نہیں
یعنی مجھ پر دست درازی کرنا ناممکن ہے
کیونکہ میں تو پہلے سے راضی ہوں۔

نہ جانے کیوں حکومت کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ کانگریس خاص کر کے عورتوں کو جیل بھیجنا چاہتی ہے اس امید میں کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے گا اور انھیں معمولی سزائیں ملیں گی۔ یہ محض احمقانہ خیال تھا۔ دنیا میں کوئی بھی اپنی عورتوں کو جیل میں جھونکنا نہیں چاہتا۔ عموماً عورتوں نے اپنے والد، خاوند یا بھائیوں کی مرضی کے خلاف، یا کم سے کم بغیر ان کی خوشی کے اس تحریک میں حصہ لیا۔ بہر حل حکومت نے عورتوں کو لمبی لمبی سزائیں دے کر اور جیل خانہ میں ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کر کے اس کی انتہائی کوشش کی کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ میری بہنوں کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد ہی چند پندرہ سولہ برس کی لڑکیاں الہ آباد میں غور کرنے کے لئے جمع ہوئیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ انھیں دنیا کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن وہ جوش سے سرشار تھیں اور انھیں مشورہ کی ضرورت تھی۔ وہ ایک نجی مکان میں جمع تھیں کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ہر ایک کو دو سال قید سخت کی سزا دے دی گئی۔ یہ تو بہت معمولی

سا واقعہ تھا اسی قسم کے متعدد واقعات ہندوستان کے کونے کونے میں آئے دن ہو رہے تھے۔ جن عورتوں اور لڑکیوں کو تحریک کے سلسلہ میں سزا ہو گئی انہیں جیل خانہ میں مردوں سے زیادہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ میں نے بہت سے تکلیف دہ واقعات سنے ہیں لیکن سب سے عجیب سرگزشت جو میری نظر سے گزری میری بہن (میڈلین سلیڈ) کی ترتیب دی ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے اور سول نافرمانی کی دوسری قیدی عورتوں کے بمبئی جیل کے تجربے درج کئے تھے۔

صوبہ متحدہ میں ہماری تحریک کا زیادہ زور دیہاتی علاقہ میں تھا۔ کسانوں کی طرف سے کانگریس حکومت پر برابر دباؤ ڈالتی رہی تھی۔ اس لئے حکومت نے خاص رقم کی چھوٹ کا وعدہ کرلیا تھا اگرچہ ہمارے نزدیک وہ کافی نہ تھی۔ ہماری گرفتاری کے بعد ہی اور چھوٹ کا اعلان کیا گیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی اعلان ذرا پہلے نہ کیا گیا ورنہ حالات میں بہت بڑا فرق پڑ جاتا۔ ہم ہرگز بے سوچے سمجھے اس کی مدد نہ کرسکتے لیکن دراصل حکومت کو تو یہ فکر تھی کہ اس چھوٹ کا سہرا کانگریس کے سر نہ ہو۔ اس لئے کہ ایک طرف تو اس نے کانگریس کو کچلنے کی کوشش کی اور دوسری طرف کسانون کو خاموش کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چھوٹ دی۔ ہمارا یہ بھی اندازہ ہے کہ جہاں کہیں کانگریس کا سب سے زیادہ زور پڑا تھا وہیں سب سے زیادہ چھوٹ ملی۔

اگرچہ بہت معقول چھوٹ دی گئی تھی لیکن اس سے کسانوں کی مشکلات کا حل نہیں ہوا البتہ انہیں کچھ سہولت ضرور ہوگئی۔ گویا حکومت نے کسانوں کی مخالفت کی شدت میں کمی کردی جس سے ملک کی عام تحریک وقتی طور پر کچھ کمزور پڑ گئی۔ اس تحریک کی وجہ سے یوپی کے ہزاروں کسانون پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہوئی تھین جن سے بہت سے غریب بالکل تباہ ہوگئے تھے۔ اسی تحریک کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو اس وقت جو زیادہ سے زیادہ چھوٹ مل سکتی تھی مل گئی اور (سول

نافرمانی کے شدائد سے قطع نظر) وہ زبردست پریشانیوں سے بچ گئے۔ ان چھوٹے چھوٹے وقتی فائدوں سے کسانون کا کچھ زیادہ کام نہیں چلا، لیکن اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ جو کچھ بھی ملا وہ ان کوششوں کا نتیجہ تھا جو کسانون کی حمایت میں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی برابر کرتی رہی تھی۔ عارضی طور پر تمام کسانوں کو اس سے فائدہ پہنچا لیکن ان میں جو سب سے بہادر تھے وہ اس جنگ میں کام آ گئے۔

دسمبر ۱۹۳۱ء میں جب صوبہ متحدہ میں خاص تعزیری ضابطہ نافذ ہوا تو اس کے ساتھ ایک تو جیہی بیان بھی شائع ہوا۔ اس بیان میں، اس کے علاوہ اور بیونوں میں بھی جو دوسرے تعزیری ضوابط کے ساتھ شائع ہوئے بہت کچھ جھوٹ سچ درج تھا۔ جس سے پروپیگنڈے کا کام لینا مقصود تھا یہ بھی اس ابتدائی بازاری پروپیگنڈے کا ایک جزو تھا اور ہمیں اس کا موقع بھی حاصل نہ تھا کہ ہم اس کا جواب دیں یا اس سفید جھوٹ کی تردید کر سکیں۔ البتہ ایک مرتبہ شیروانی پر اس طرح کا جھوٹ تراشا گیا تھا تو انہوں نے اپنی گرفتاری سے پہلے اس کی تردید کر دی تھی۔ حکومت کے ان مختلف بیانوں اور معذوروں کا مطالعہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت کتنی بوکھلائی ہوئی تھی اور اس کے حواس کس حد تک جواب دے ہو چکے تھے۔ کل اتفاق سے میں شاہ اسپین چارلس سوم کا ایک فرمان پڑھ رہا تھا جس کی رو سے انہوں نے یسوعی فرقے کو اپنی سلطنت سے نکالنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے خواہ مخواہ حکومت ہند کے تعزیری ضوابط اور ان وجوہ کا خیال آ گیا جو ان کی تائید میں پیش کی گئی تھیں۔ شاہ چارلس نے فروری ۱۷۶۷ء میں یہ فرمان جاری کیا تھا اور اس میں اپنے فعل کو اس طرح حق بجانب ٹھیرایا تھا کہ ”رعایا میں فرمانبرداری، امن و امان اور عدل و انصاف برقرار رکھنے کے سلسلے میں میری جانب پر جو فرض عاید ہوتا ہے اس کی وجہ سے، نیز اور دوسری فوری جائز اور ضروری وجوہ کی بنا پر جو ایں جانب کے سینہ میں محفوظ رہیں۔ ایں جانب یہ فرمان نافذ کرنے پر مجبور ہوئے

ہیں۔

اسی طرح تعزیری ضوابط کی اصل وجوہ وائسرائے کے سینہ میں یا ان مشیروں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اگرچہ ہر شخص انہیں جانتا تھا۔ سرکاری طور پر جو وجوہ بیان کی گئیں ان سے ہمیں پروپیگنڈے کی اس نوعیت کا پتہ چلا جو حکومت برطانیہ ہندوستان میں شروع کرنے والی تھی۔ چند ماہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ نیم سرکاری رسائل واشتہارات بہت بڑی تعدادی میں تمام دیہاتی علاقوں میں تقسیم کئے گئے۔ ان میں طرح طرح کی بے سروپا باتیں درج تھیں خصوصاً کانگریس پر یہ اتہام لگایا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے زرعی پیداوار کا بھاؤ گر گیا جس سے کسانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ تو کانگریس کی انتہائی تعریف تھی۔ کیونکہ اگر وہ ساری دنیا میں کساد بازاری پیدا کرسکتی ہے تو اس کی قوتوں کا کیا ٹھکانا ہے۔ لیکن اس جھوٹ کی بڑے اہتمام کے ساتھ متواتر اشاعت کی گئی تا کہ کانگریس کے وقار کو صدمہ پہنچے،

ان سب باتوں کے باوجود' صوبہ متحدہ کے خاص خاص اضلاع کے کسانوں نے سول نافرمانی کی دعوت کا جو بعض جگہ لازمی طور پر چھوٹ وغیرہ کے مقامی جھگڑوں کے ساتھ گڈمڈ ہوگئی تھی بڑا پرجوش خیر مقدم کا ی ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں اس مرتبہ کسان زیادہ منظم طریقہ سے اور زیادہ بڑی تعداد مین تحریک میں شریک ہوئے۔ شروع شروع میں تو اس میں خاصا خوش دلی کا رنگ تھا۔ میں نے اس قسم کا ایک بہت دلچسپ قصہ سنا ہے۔ ضلع رائے بریلی کے موضع بکولیہ میں پولیس کے کچھ لوگ عدم ادائی لگان کی وجہ سے قرقی لے کر گئے۔ یہ گاؤں بہت خوش حال تھا اور اس کے باشندے ذرا دل والے تھے۔ وہ پولیس اور مال کے افسروں سے بڑے اخلاق سے پیش آئے اور اپنے گھروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر خندہ پیشانی سے ان سے کہا کہ جہاں آپ کا جی چاہے تشریف لے جائیے۔ ان لوگوں نے چند مویشی وغیرہ قرق کرلئے۔ اس کے بعد گاؤں والون نے ان افسروں کی پان تمباکو سے

خاطر کی اور یہ بیچارے بہت خفیف اور شرمندہ ہو کر واپس گئے۔ لیکن یہ تو ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ رفتہ رفتہ رواداری کوش دلی اور انسانی شرافت کا یہ جذبہ بہت کم ہو گیا۔ بیچارہ موضع بکولیہ اپنی خوش دلی کی وجہ سے سزا سے نہ بچ سکا اور اسے اپنی دلیری کی سزا بھگتنی پڑی۔

ان اضلاع میں مہینوں لوگوں نے لگان ادا نہیں کیا۔ اور غالباً گرمیوں کے شروع میں تھوڑا بہت لگان پہنچنا شروع ہوا۔ یہاں بڑی بڑی تعداد میں گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ لیکن یہ حکومت کی عام پالیسی کے خلاف تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ عموماً خاص خاص کارکنوں اور دیہات کے لیڈروں کو گرفتار کرتی تھی۔ باقی لوگ صرف مار پیٹ کر چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ جیل بھیجنے اور گولی چلانے سے مار پیٹ زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کا حسب ضرورت بار بار اعادہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ دور دراز دیہاتی علاقوں میں ہوتی تھی۔ اس لئے باہر والون کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس طرح جیل خانوں میں قیدیوں کی تعداد بھی زیادہ بڑھنے نہیں پاتی تھی۔ مار پیٹ کے علاوہ لاتعداد بے دخلیاں اور قرقیاں بھی ہوئیں اور املاک و مویشی بھی کثرت سے فروخت کئے گئے۔ کسان اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ کر یہ دیکھتے تھے کہ ان کے پاس جو تھوڑا بہت اساسہ ہے وہ بھی ان سے چھن رہا ہے اور ان کی آنکھ کے سامنے کوڑیوں کے مول بک رہا ہے۔

حکومت نے ہندوستان بھر کی بے شمار عمارتوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی سلسلہ میں اس نے سوراج بھون بھی ضبط کر لیا۔ اس عمارت میں کانگریس کا اسپتال قائم تھا چنانچہ اس کے تمام قیمتی ساز و سامان پر بھی حکومت کا قبضہ ہو گیا۔ چند روز تک تو یہ اسپتال بالکل بند رہا۔ پھر قریب ہی کے ایک چمن میں کھلے میدان میں دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ چند روز بعد وہ سوراج بھون کے متصل ایک چھوٹی سی عمارت میں منتقل ہو گیا اور یہاں کوئی دو ڈھائی سال تک جاری رہا۔

یہ افواہ بھی تھی کہ ہمارا سکونتی انند بھون بھی ضبط ہو جائے گا کیونکہ میں نے انکم ٹیکس کا معتد بہ حصہ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ رقم ۱۹۳۰ء میں والد کی آمدنی پر تشخیص ہوئی تھی۔ لیکن انہوں نے سول نافرمانی کی وجہ سے ادا نہیں کی تھی ۱۹۳۱ء میں دہلی کے صلح نامہ کے بعد انکم ٹیکس افسروں سے میری کچھ بحث ہوئی۔ آخر کار میں اسے ادا کرنے کو تیار ہو گیا۔ بلکہ ایک قسط ادا بھی کر دی تھی۔ اس کے بعد ہی تعزیری ضوابط نافذ ہوئے اور میں نے طے کیا کہ اب کوئی رقم ادا نہیں کروں گا۔ مجھے یہ قطعاً نامناسب بلکہ ناجائز معلوم ہوتا تھا کہ کسانوں کو تو میں لگان ادا نہ کرنے کی تلقین کروں اور خود انکم ٹیکس سے میرا دل دکھتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح میری والدہ کو گھر چھوڑنا پڑے گا' ہماری کتابیں' کاغذات اور وہ سازو سامان جو ہمیں بعض ذاتی وجوہ کی بنا پر بہت عزیز تھا' غیروں کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور ممکن ہے سب برباد ہو جائے۔ نیز قومی جھنڈا اتار کر یونین جیک لہرا دیا جائے گا بخلاف اس کے گھر ہاتھ سے نکل جانے میں مجھے ایک خوبی بھی معلوم ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ اس طرح میں کسانوں سے جو بیچارے اپنے گھر بار سے محروم کیے جا رہے ہیں نزدیک تر ہو جاؤں گا۔ اور ان کے دل بڑھ جائیں گے۔ تحریک پر یقیناً اس کا بہت اچھا اثر پڑتا لیکن حکومت نے یہ مناسب نہ سمجھا اور ہمارے گھر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ شاید اس نے میری ماں کا کچھ خیال کیا ہو۔ یا شاید یہ صحیح اندازہ کر لیا ہو کہ اس سے سول نافرمانی کو تقویت پہنچے گی۔ کئی مہینہ بعد حکومت کو میرے ریلوے کے چند حصوں کا پتہ چلا اور وہ اس نے انکم ٹیکس کے حساب میں قرق کر لئے میری اور میرے بہنوئی کی موٹریں تو پہلے ہی قرق کر کے فروخت ہو چکی تھیں۔

اس زمانہ میں ایک چیز سے مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ یعنی مختلف مونسپل کمیٹیوں اور پبلک اداروں نے خصوصاً کلکتہ کارپوریشن نے جس میں کانگریس ارکین کی اکثریت بیان کی جاتی تھی اپنی عمارتوں پر سے قومی جھنڈا اتار دیا۔ انہوں نے یہ

حرکت حکومت اور پولیس کے دباؤ سے کی تھی کیونکہ انہیں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو سخت تدارک کیا جائے گا۔ عدول حکمی کا زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ ہوتا کہ مونسپلٹی کو معطل کر دیا جاتا یا ممبروں کو سزا ہوتی لیکن ادارے جو مستقل حقوق رکھتے ہیں عموماً بزدل ہوتے ہیں اس لئے انہین وہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا۔ پھر بھی مجھے اس سے سخت تکلیف ہوئی یہ جھنڈا ہمارے لئے ان چیزوں کا نشان بن گیا ہے جو ہمیں بہت عزیز ہیں اور اس کے سایہ کے نیچے ہم نے بارہا اس کی عزت وقار کو برقرار رکھنے کی قسمین کھائی ہیں۔ اس لئے اسے اپنے ہاتھ سے اتارنا یا اپنی رضامندی سے اتروانا نہ صرف عہد شکنی بلکہ ہتک حرمت ہے۔ یہ گویا روح کی ذلت اور حق کا انکار یا زبردست کے ڈر سے باطل کا اقرار ہے جن لوگوں نے اس طرح حکومت کے آگے سر جھکا دیا۔ انہوں نے قوم کو ذلیل کیا اور اس کی کودداری کو صدمہ پہنچایا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انہیں سورما بن کر آگ میں کود پڑنا چاہیے تھا۔ دوسروں کو اس بنا پر الزام دینا بالکل غلط بلکہ حماقت ہے ک وہ صف اول میں کیوں نہیں آئے جیل کیون نہیں گئے مصیبتیں اور نقصان کیوں نہیں اٹھائے۔ ہر شخص پر بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا بار ہوتا ہے اور ہر ایک اپنے حالات کو خود بہتر سمجھ سکتا ہے اس لئے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ حکم بن کر اس کا فیصلہ کرے لیکن میدان میں نہ آنا اور چیز ہے۔ اور حق سے یا اس چیز سے جسے انسان حق سمجھتا ہو منہ موڑنا اور بات ہے۔ میونسپلٹی کے ممبروں کو اگر قومی عزت کے خلاف کوئی حکم دیا جاتا اور اس کی خلاف ورزی کی ان میں جرات نہ ہوتی تو انہیں رکنیت سے استعفے دے دینا چاہیے تھا۔ لیکن عام طور پر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی نشستوں سے لپٹے رہے۔

تھامس مور نے کہا ہے " جس طرح شہد کی مکھیاں پھولوں پر بیٹھ کر بھنبھنانا بند

کر دیتی ہیں۔

اسی طرح دھگ جماعت والے جب وزارت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں"۔

بہر حال ایسے ناگہانی نازک موقع پر جہاں انسان بدحواس ہو جاتا ہے کسی کے رویہ راعتراض کرنا بے انصافی ہے کبھی کبھی بڑے بڑے بہادروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں جیسا کہ گذشتہ جنگ عظیم میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جب ٹھانک جہاز تباہ ہوا تو بڑے بڑے مشہور لوگوں نے جن کے متعلق خواب میں بھی بزدلی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا جہازرانوں کو رشوت دے دے کر بچنے کی کوشش کی۔ اور دوسروں کو ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا۔ حال ہی میں جب مورو کاسل جہاز میں آگ لگی اس وقت بھی بڑے شرمناک حالات دیکھنے میں آئے۔ کون جانتا ہے کہ ایسے ناگہانی موقع پر جب ضبط وعقل پر حیوانی جبلت غالب آجاتی ہے خود ہمارا کا ی عمل ہو۔ اس لئے ہمیں دوسروں کو برا نہیں کہنا چاہئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم صحیح راستہ سے بھٹکنے پر خاموش رہیں اور آئندہ اس کی احتیاط نہ کریں کہ قوم کی کشتی کو کھینچنے کا کام ایسے ہاتھوں میں نہ دیا جائے جو تھرتھراتے ہوں اور ضرورت کے وقت جواب دے دیں۔ اپنی ناکامی کی تاویلیں کرنا اور اسے صحیح قرار دینا اس سے بھی برا ہے۔ عزر گناہ بدتر از گناہ۔

دو قوتوں کی جنگ زیادہ تر اخلاقی نظم اور ہمت پر مبنی ہوتی ہے۔ سخت سے سخت لڑائی کا دارومدار انہیں چیزوں پر ہے۔ مارشل فوش فرماتے ہیں۔ آخر کار جنگ میں اسی کو فتح ہوتی ہے جس کی ہمت بندھی رہے" پر امن جنگ میں تو اخلاقی نظم اور ہمت کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے عمل سے اس اخلاقی نظم کو نقصان پہنچاتا ہے یا قوم کی ہمت کو پست کرتا ہے وہ اپنے ملک کے ساتھ غداری کرتا ہے۔

مہینے گزرتے گئے اور روز کی اچھی بری خبریں ہمارے پاس پہنچتی رہیں یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی جیلوں میں وہاں کی کندا روبے مزہ زندگی کے عادی ہو گئے۔ اس کے بعد قومی ہفتہ کا زمانہ (۶ اپریل تا ۱۳ اپریل) آیا۔ ہم جانتے تھے کہ اس زمانہ میں بہت سے غیر معمولی واقعات ہوں گے۔ اور یہی ہوا۔ لیکن میرے لئے تو ایک حادثہ کے سامنے سب کچھ ماند پڑ گیا۔ الہ آباد میں میری والدہ ایک جلوس میں شامل تھیں۔ پولیس نے اس جلوس کو راستے میں روکا اور لاٹھی چارج کیا۔ جس وقت جلوس روکا گیا تو کسی نے میری والدہ کے لئے ایک کرسی لا کر ڈال دی۔ وہ سڑک پر جلوس کے آگے بیٹھی تھیں۔ چند لوگ خاص طور پر ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے جن میں میرا اسکرٹری بھی شامل تھا۔ ان سب کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ اس کے بعد حملہ شروع ہوا۔ میری والدہ کرسی پر سے گر پڑیں اور پے در پے ان کے سر پر کئی بید پڑے ان کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ جس کی وجہ سے وہ بیہوش ہو گئیں۔ اس حالت میں وہ سڑک پر پڑی ہوئی تھیں جو اب پبلک اور جلوس والوں سے صاف ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ایک پولیس افسر نے انہیں وہاں سے اٹھایا اور اپنی موٹر میں آنند بھون پہنچا دیا۔

اسی رات کو الہ آباد میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کا انتقال ہو گیا' چنانچہ فوراً غصہ سے بھرے ہوئے لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے امن اور عدم تشدد کو پس پشت ڈال کر پولیس پر حملہ کر دیا پولیس نے گولی چلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔

ہمیں صرف ایک ہفتہ وار اخبار پڑھنے کو ملتا ہے۔ جب اس حادثہ کے چند روز بعد ہمیں یہ خبر ملی تو میرے دل پر یہ قصور کر کے ایک چوٹ سی لگی کہ میر نحیف بوڑھی ماں سڑک کے گرد و غبار میں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو نہ جانے خود میرا کیا رویہ ہوتا معلوم نہیں خود میں عدم تشدد پر کہاں تک قائم رہتا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ پچھلے بارہ برس میں میں نے جو سبق سیکھنے کی کوشش کی تھی، یہ دردناک منظر دیکھ کر میں وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اور شاید مجھے ذاتی یا قومی مصالح کا بھی کوئی خیال نہ رہتا۔

رفتہ رفتہ وہ اچھی ہو گئیں۔ لیکن اگلے مہینہ میں جب وہ مجھ سے بریلی جیل میں ملنے آئی ہیں اس وقت تک ان کے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بہرحال وہ بہت خوش تھیں اور اس پر فخر کرتی تھیں کہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ انہیں بھی بید اور لاٹھیاں کھانے کا موقع ملا۔ لیکن ان کی یہ صحت یابی حقیقی نہیں بلکہ محض ظاہری تھی۔ اور اس ضعیف العمری میں انہیں جو شدید صدمہ پہنچا تھا اس نے ان کے سارے نظام کو ہلا ڈالا۔ اور ان پرانی شکایات کو ابھار دیا جنہوں نے ایک سال بعد بڑی خطرناک صورت اختیار کر لی۔

بریلی اور دہرہ دون کے جیلوں میں

چھ ہفتے نینی جیل میں رہنے کے بعد میں بریلی کے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا۔ میری صحت پھر خراب ہو گئی تھی اور روز حرارت ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے طبیعت پریشان تھی۔ چار مہینے کے بعد جب کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی میں بریلی جیل سے منتقل کر دیا گیا اور اب کی بار ایک ٹھنڈی جگہ بھیجا گیا۔ یعنی دہرہ دون کی جیل میں جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں میں مسلسل ساڑھے چودہ مہینے یعنی قریب قریب اپنی دو سال کی میعاد کے ختم ہونے تک رہا۔ ملاقاتوں' خطوں اور منتخب اخباروں کے ذریعہ سے مجھے باہر کی تھوڑی بہت خبریں تو پہنچ جاتی تھیں مگر پھر بھی مجھے بہت سی باتوں کی مطلق خبر نہ تھی صرف خاص خاص واقعات کا ایک دھندلا سا تصور ذہن میں تھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں اپنے ذاتی معاملات اور اس وقت کے سیاسی حالات میں الجھا رہا۔ کوئی ساڑھے پانچ مہینے کے بعد پھر قید خانے میں پہنچ گیا اور اب بھی یہیں ہوں۔ اس طرح پچھلے ساڑھے تین برس میں میرا وقت زیادہ تر جیل میں گذرا اور میں واقعات سے بے خبر رہا۔ مجھ کو اس کا موقع ہی کب ملا کہ جو کچھ ملک میں ہو رہا تھا اس سے تفصیلی واقفیت حاصل کرتا۔ مجھے ابھی تک اچھی طرح سے نہیں معلوم ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں' جس میں گاندھی جی نے شرکت کی تھی پردے کے پیچھے کیا کیا ہوا۔ میں نہ ان سے اس مسئلہ پر گفتگو کر سکا نہ اور واقعات پر جو اس عرصے میں پیش آئے۔

مجھے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے حالات کا اتنا علم نہیں ہے کہ اس زمانہ میں قومی تحریک کی نشو و نما دکھا سکوں مگر چونکہ میں اس کی بنیاد سے واقف تھا اور کام کرنے والوں کو بھی جانتا تھا اس لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات کی حقیقی اہمیت کو سمجھ سکتا تھا۔ اس طرح مجھے تحریک کی عام رفتار کا خاصا اندازہ تھا۔ پہلے چار پانچ مہینے

سول نافرمانی بڑے زور و شور سے چلتی رہی اس کے بعد رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی۔ البتہ بیچ میں کبھی کبھی پھر بھڑک اٹھتی تھی عملی جدوجہد کی انقلابی شدت تھوڑے ہی دن رہ سکتی ہے۔ اس کا ایک حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے یا بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے۔ چنانچہ سول نافرمانی بھی، پہلی ہلے کے بعد آہستہ آہستہ گھٹنے لگی مگر اس دھیمی رفتار سے وہ بہت مدت تک جاری رہ سکتی تھی۔ خلاف قانون قرار دئے جانے کے باوجود کانگریس کا نظام خاصی کامیابی سے چلتا رہا۔ وہ صوبوں کے کارکنوں کے کام سے باخبر رہتی تھی، انھیں ہدایتیں بھیجتی تھی، ان سے رپورٹیں منگاتی تھی اور کبھی کبھی انھیں مالی امداد بھی دیتی تھی۔

صوبوں کی کانگریس کمیٹیاں بھی کم و بیش کامیابی سے چلتی رہیں۔ اس سارے عرصے میں جب میں جیل میں تھا مجھے دوسرے صوبوں کے کچھ زیادہ حالات معلوم نہیں ہوسکے مگر رہائی کے دنوں میں صوبہ متحدہ کی جدوجہد کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ اس صوبہ کی کانگریس ۳۲ء کے وسط تک باقاعدہ کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کانگریس کے قائم مقام پریذیڈنٹ نے گاندھی جی کے مشورہ سے سول نافرمانی ملتوی کردی۔ اس عرصے میں اکثر اضلاع کو ہدایتیں بھیجی جاتی تھیں چھپے ہوئے یا سائکلو اسٹائل کئے ہوئے خبرنامے باقاعدہ شائع کئے جاتے تھے، اضلاع کے کام کا وقتاً فوقتاً معائنہ کیا جاتا تھا اور قومی کارکنوں کو الاؤنس تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ کام زیادہ تر خفیہ طور پر کرنا پڑتا تھا مگر صوبہ کی کانگریس کمیٹی کا ہر سیکرٹری جو دفتر وغیرہ کا نگران ہوتا تھا کھلم کھلا کام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گرفتار ہو جاتا تھا اور اس کی جگہ دوسرا شخص آ جاتا تھا۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے تجربہ سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہم تمام ہندوستان میں خفیہ خبر رسائی کا سلسلہ آسانی سے قائم کرسکتے ہیں اگرچہ کچھ زیادہ کوشش نہیں کی گئی اور برابر مزاحمت ہوتی رہی پھر بھی ہمیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی مگر ہم میں سے

بہت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خفیہ طور پر کام کرنا سول نافرمانی کے اصول کے ساتھ نہیں کھپتا اور اس سے عام لوگوں میں بیداری پیدا نہیں ہوتی بلکہ افسردگی سی چھا جاتی ہے۔ اگر عام تحریک بڑے پیمانے پر جاری ہو تو اس کے ساتھ تھوڑی بہت خفیہ کارروائی بھی مفید ہو سکتی ہے مگر اس میں ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے۔ (خصوصاً اس وقت جب تحریک کا زور گھٹ رہا ہو کہ کہیں یہ کم و بیش بے اثر خفیہ کارروائیاں عام تحریک کی جگہ نہ لے لیں۔ گاندھی جی نے جولائی ۱۹۳۳ء میں خفیہ کارروائیوں کو ناپسندیدہ قرار دیا)

صوبہ متحدہ کے علاوہ گجرات اور کرناٹک میں بھی کچھ دن تک کسانوں کی محصول نہ دینے کی تحریک چلتی رہی۔ گجرات اور کرناٹک دونوں جگہ کاشتکار اپنی زمین کے مالک ہیں۔ انھوں نے حکومت کو مالگزاری ادا کرنے سے انکار کیا اور اس کی وجہ سے انھیں بہت سخت نقصان پہنچا۔ کانگریس کی طرف سے تھوڑی بہت کوشش کی گئی کہ مصیبت زدوں کی مدد کی جائے اور بے دخلیوں اور املاک کی ضبطیوں سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی کی جائے ظاہر ہے کہ کوشش بہت محدود تھی۔ صوبہ متحدہ میں کانگریس کمیٹی نے بے دخل کسانوں کی مدد کی کوئی کوشش نہیں کی یہاں مسئلہ بہت بڑا تھا۔ اس صوبے میں اسامیوں کی تعداد زمیندار کاشتکاروں سے بہت زیادہ ہے' اور رقبہ بھی بہت وسیع تھا اور کانگریس کمیٹی کے پاس روپیہ بہت کم تھا۔ یہاں بیسیوں ہزاروں آدمیوں کو اس تحریک کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا۔ ان سب کی مدد کرنا ناممکن تھا اور ان میں اور دوسرے کاشتکاروں میں جو خردی تے کر رہے تھے تفریق کرنا بھی مشکل تھا اگر دو چار ہزار آدمیوں کی مدد بھی کی جاتی تو اس سے جھگڑے پڑ جاتے اور بددلی پھیل جاتی اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کوئی مالی امداد نہیں دیں گے۔ یہ بات کاشتکاروں کو پہلے ہی سے سمجھا دی گئی تھی اور انھوں نے ہماری مشکلات کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ انھوں نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں اور اف

تک نہ کی۔ البتہ جہاں تک ممکن تھا ہم نے بعض افراد کی خصوصاً جیل جانے والے کارکنوں کے بال بچوں کی مدد کی۔ اس بدنصیب ملک کے افلاس کا یہ حال ہے کہ ایک روپیہ مہینہ بھی ان کے لئے بڑی نعمت تھی۔

اس سارے عرصہ میں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی (جو خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی) اپنے اجرت پر کام والے کارکنون کو قلیل مقررہ الاؤنس دیتی رہی اور جب وہ باری باری سے جیل جاتے تھے تو ان کے خاندان کی خبر گیری کیا جاتی تھی۔ یہ بجٹ کی سب سے بڑی مد تھی۔ اس کے بعد اشتہاروں وغیرہ کی چھپائی کا نمبر تھا۔ یہ بھی خاصی رقم ہو جاتی تھی۔ ایک اور بڑی مد سفر خرچ کی تھی اور اس کے علاوہ جن اضلاع کی کمیٹیوں کی مالی حالت اچھی نہ تھی انھیں کچھ امداد دی جاتی تھی۔ ان سب مصارف کے باوجود صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے بیس مہینے میں جنوری ۳۲ء سے آخر گست ۳۳ء تک جبط وہ ایک طاقتور حکومت کے ساتھ زبردست لڑائی لڑ رہی تھی کل تریسٹھ ہزار روپیہ یعنی تقریباً تین ہزار ایک سو چالیس روپیہ ماہوار خرچ کیا۔ (اس رقم میں الہ آباد' آگرہ' کانپور لکھنو وغیرہ کی خوش حال ضلع کمیٹیوں کے علیحدہ مصارف شامل نہیں ہیں) صوبہ متحدہ ۳۲ء اور ۳۳ء میں سارے وقت تحریک میں پیش پیش رہا اور میرے خیال میں جتنا کام اس نے کیا اس کے مقابلہ میں یہ خرچ بہت ہی کم ہے۔ اس چھوٹی سی رقم کا بھلا ان خاص اخراجات سے کیا مقابلہ ہے جو صوبہ کی حکومت نے سول نافرمانی کو دبانے کے کئے برداشت کئے۔ میرا قیاس ہے (اگرچہ مجھے ٹھیک معلوم نہیں) کہ کانگریس کے بعض اور بڑے بڑے صوبوں نے اس سے بہت زیادہ خرچ کیا بہار کانگریس کے نقطہ نظر سے اپنے ہمسائے صوبہ متحدہ سے بھی غریب ہے پھر بھی اس کا کام اس تحریک میں نہایت شاندار تھا۔

غرض سول نافرمانی رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی حد تک جاری رہی۔ البتہ اس میں عام تحریک کا رنگ کم ہوتا گیا۔ حکومت کی سختیوں سے قطع نظر

کر کے اسے پہلا سخت دھچکا ستمبر ۱۹۳۲ء میں پہنچا جب کہ گاندھی جی نے ہریجنوں کے معاملے کی وجہ سے پہلی بار برت رکھا۔ اس برت عام لوگوں میں جوش اور بیداری پیدا ہوئی مگر اس نے دوسرا رخ اختیار کرلیا۔ مئی ۱۹۳۳ء میں سول نافرمانی کے التوا کا اعلان کر دیا گیا اور وہ عملی طور پر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد بھی وہ اصولی طور پر باقی تھی مگر اس پر عمل بہت کم ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر التوا نہ کیا جاتا تب بھی وہ رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑ جاتی۔ حکومت کے جبر و تشدد نے سارے ہندوستان کو سن کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر قوم کی اعصابی قوت ختم ہو چکی تھی اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اسے ابھارے۔ انفرادی طور پر بہت سے لوگ تھے جو سول نافرمانی کر سکتے تھے مگر وہ ایک مصنوعی فضا میں کام کر رہے تھے۔

جیل میں اس عظیم الشان تحریک کے رفتہ رفتہ گھٹنے کی خبر سن کر ہم کو بڑی تکلیف ہوئی حالانکہ ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جنہیں فوری کامیابی کی امید ہو ایک خفیف سا احتمال ضرور تھا کہ اگر عام لوگ پورے جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو شاید کوئی فوری نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے مگر اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے ہم لوگوں کو یہی توقع تھی کہ لڑائی بہت طول کھینچے گی۔ بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنے پڑیں گے' صدہا مشکلات کا سامنا ہوگا تب کہیں آہستہ آہستہ عام لوگوں میں انضباط' اتحاد عمل اور اتحاد خیال پیدا ہوگا۔ ۱۹۳۲ء کے شروع میں کبھی کبھی اس خیال سے ایک خوف سا ہوتا تھا کہ کہیں ہمیں بہت جلد ظاہری کامیابی نہ حاصل ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا کہ کانگریس مصالحت کرتی اور اس سے گورنمنٹ کے آدمیوں اور مطلب پرستوں کی بن آتی۔ ۱۹۳۱ء کے تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں۔ کامیابی اسی حالت میں مفید ہو سکتی ہے۔ جب عام لوگوں میں اتنی قوت اور ان کے خیالات میں اتنی وضاحت ہو کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ورنہ یہی ہوگا کہ عام لوگ تو لڑیں گے اور قربانیاں کریں گے اور عین وقت پر دوسرے لوگ آ کر

مزے میں مال غنیمت پر قبضہ کرلیں گے۔ اس کا بہت سخت اندیشہ تھا اس لئے کہ خود کانگریس کے اندر لوگوں کے خیالات بہت الجھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے کوئی واضح تصور نہ تھا کہ وہ کس قسم کی حکومت یا سماج چاہتے ہیں۔ بعض کانگریسی تو اس خیال کے تھے کہ موجودہ نظام حکومت میں کچھ زیادہ تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس برطانوی حکام کو ہٹا کر ان کی جگہ سودیشی چھاپ کے لوگوں کو مقرر کردینا کافی ہے۔

خالص قسم کے حکومت پرستوں سے کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا کیونکہ ان کا ایمان تو یہ ہے کہ جو حکومت بھی ہو اس کی اطاعت کی جاوے۔ ان کے علاوہ لبرل پارٹی اور تعاون پارٹی بھی تقریباً پورے طور پر برطانوی حکومت کی ہم خیال تھی' اور ان کی طرف سے جو نکتہ چینی ہوتی رہتی تھی اس کا نہ کوئی اثر تھا نہ کوئی قدروقیمت۔ سب جانتے تھے کہ یہ لوگ تو ہر حال میں قانون کے بندے ہیں اور اس لئے ان سے یہ توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ سول نافرمانی کو پسند کریں گے مگر انھوں نے صرف ناپسندیدگی کے اظہار پر اکتفا نہیں کی بلکہ کم و بیش حکومت کے دست و بازو بن گئے۔ ہر قسم کی قانونی آزادی چھینی جارہی تھی اور وہ سہمے ہوئے چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ حکومت صرف سول نافرمانی کو توڑنا اور دبانا نہیں چاہتی تھی بلکہ ہر قسم کی سیاسی زندگی اور پبلک جدوجہد کو روکنا چاہتی تھی مگر اسکی مخالفت میں ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ جو لوگ قانونی آزادی کی حمایت کیا کرتے تھے وہ سب لڑائی میں شریک تھے اور حکومت کے جبر و تشدد کے آگے سر نہ جھکانے کی سزا بھگت رہے تھے۔ دوسرے لوگوں نے ڈر کے مارے ذلت سے سر تسلیم خم کردیا اور نکتہ چینی کی جرات نہیں کی۔ اگر کبھی کچھ ہلکی سی نکتہ چینی ہوتی بھی تھی تو بہت نیازمندانہ لہجے میں اور اس کے ساتھ کانگریس کو اور تحریک میں شریک ہونے والوں کو دل کھول کر برا بھلا بھی کہا جاتا تھا۔

مغربی ملکوں میں رائے عامہ پوری قوت سے قانونی آزادی کی حمایت کرتی

ہے اور اگر اس میں مداخلت کی جائے تو بیزاری اور مخالفت کا طوفان برپا ہو جاتا ہے (شاید اب یہ بات ایک قصہ پارینہ ہو گئی ہے) بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ خود عملی جدوجہد میں شریک ہونا نہیں چاہتے مگر وہ تقریر کی آزادی جلسوں اور انجمنوں کی آزادی، اشخاص اور اخبارات کی آزادی کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ ہمیشہ اس کے لئے احتجاج کرتے رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کو روکنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہندوستان کی لبرل جماعت کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ کسی حد تک انگلستان کی لبرل پارٹی کے روایات کی حامل ہے (حالانکہ اصل میں ان دونوں میں نام کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں) اور اس سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ قانونی آزادی کی ما نالی کی کم سے کم اصولی مخالفت کرے گی کیونکہ خود اسے بھی اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ مگر اس نے نہیں کیا۔ اس کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ والٹیر میں کی ہم زبان ہو کر کہتی۔ " تم جو کچھ کہتے ہو اس کا میں قطعاً مخالف ہوں مگر میں مرتے دم تک تمہارے اس حق کیحمائت کروں گا کہ جو کہنا چاہتے ہو وہ کہہ سکو۔"

شاید انھیں الزام دینا بے انصافی ہے، کیونکہ انھوں نے کبھی آزادی اور جمہوریت کا حامی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور موقع ایسا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ان کی زبان سے نکل جاتی تو 'بیچارے مصیبت میں پڑ جاتے۔ البتہ یہ دیکھنا چاہیے کہ آزادی کے قدیم علمبردار برطانوی لبرل' اور لیبر پارٹی کے نئے اشتراکی ہندوستان میں حکومت کے جبر و تشدد سے کس حد تک متاثر ہوئے۔ وہ اس دردناک منظر کو خاصے اطمینان اور سکون سے دیکھتے رہے اور کبھی کبھی اس پالیسی کے متعلق جسے مانچسٹر گارجین کیا نامہ نگار "جبر و تشدد کا سائنٹفک" استعمال کہتا ہے، پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے رہے۔ حال میں انگلستان کی نیشنل گورنمنٹ نے " قانون بغاوت" کا مسودہ پاس کرانے کی کوشش کی تھی اور اس پر لبرل پارٹی اور لیبر پارٹی کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی تھی، اس پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ

بھی تھا کہ یہ تقریر کی آزادی میں مداخلت کرتا ہے اور مجسٹریٹوں کو تلاشی کا وارنٹ جاری کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ میں جب ان اعتراضات کو پڑھتا تھا تو دل سے ان کی تائید کرتا تھا اور اس کے ساتھ میری آنکھوں میں ہندوستان کی تصویر پھرنے لگتی تھی جہاں برطانیہ کے مجوزہ قانون بغاوت سے ہزار درجہ بدتر قانون نافذ ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ اہل برطانیہ انگلستان ہیں اور ان کی تیوری پر بل تک نہیں آتا۔ میں تو ان کے اس کمال کا قائل ہوں کہ وہ اپنے اخلاقی اصول کو اپنے مادی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور ہر چیز جو ان کے سیاسی منصوبوں میں مدد دے انھیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ سچے دل سے اخلاقی جوش کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کو برا کہتے ہیں کہ وہ آزادی اور جمہوریت کے دشمن ہیں اور اسی سچے دل سے ہندوستان میں آزادی اور جمہوریت کی پامالی کی حمایت کرتے ہیں اور اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے اخلاقی دلائل سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا یہ فعل خالص بے غرضی پر مبنی ہے۔

ادھر ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی اور ہمارے مرد اور عورتوں کی جان پر بیت رہی تھی اور ادھر لندن میں خاصان حکومت ہندوستان کے لئے دستور اساسی بنا رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس۔ اور اس کی نہ جانے کتنی کمیٹیاں ہو رہی تھیں اور اسمبلی کے ممبران کی کوشش کر رہے تھے تاکہ قوم کی خدمت بھی کریں اور سیر و سفر کا لطف بھی اٹھائیں۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں پارلیمنٹ کی جوائنٹ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا اور اس میں ہندستانی اسیر بلائے گئے۔ پھر ہماری فیاض حکومت کی طرف سے ان لوگوں کو جو شہادت دینے جا رہے تھے جہاز کے ٹکٹ مفت دئے گئے۔ بہت سے لوگ دوبارہ ہندوستان کی خدمت کے جوش میں پبلک کے خرچ پر سمندر پار گئے اور سنا ہے بعض نے روکرائے کی رقم پر حجت بھی کی۔

کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ ارباب غرض کے یہ نمائندے ہندوستان کی عام

تحریک سے خوف زدہ ہو کر برطانوی شہنشاہی کے زیر سایہ لندن میں جمع ہوئے مگر ہمارے جذبہ قومیت کو یہ دیکھ کر صدمہ پہنچا کہ ہمارے ہندوستانی بھائیوں نے یہ حرکت عین اس وقت کی جب مادر وطن موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھی۔ مگر ہم میں سے بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا کیونکہ ہمارا یہ خیال تھا۔ (جو آگے چل کر غلط ثابت ہوا) کہ اس سے صاف صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان میں کون لوگ رجعت پسند ہیں اور کون ترقی پسند۔ اس تفریق سے عام لوگوں کی سیاسی تربیت میں مدد ملے گی اور سب پر ظاہر ہو جائے گا کہ بغیر کامل آزادی کے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور عام لوگوں کی مصیبت دور نہیں ہو سکتی۔

یہ حضرات نہ صرف روزمرہ کی زندگی کے لحاظ سے بلکہ اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے بھی عام ہندوستانیوں سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ ان کے اور عام ہندوستان کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ انھیں مطلق احساس نہیں کہ عام لوگوں کے کیا خیالات ہیں اور وہ کون سا جذبہ ہے جو انھیں قربانیاں کرنے اور تکلیفیں سہنے پر ابھار رہا ہے۔ ان نامور مدبروں کو صرف ایک ہی حقیقت نظر آتی ہے یعنی برطانوی شہنشاہی۔ ان کے نزدیک اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے اس لئے چار و ناچار اس کی اطاعت کرنی چاہئے۔ وہ اتنا بھی نہ سمجھے کہ عام لوگوں کی مرضی کے بغیر ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور کوئی حقیقی اور عملی دستور نہیں بنایا جا سکتا۔ مسٹر۔ ج اسپنڈر نے اپنی نئی کتاب "ہمارے زمانہ کی مختصر تاریخ" میں آئرلینڈ کی مشترکہ کانفرنس کی ناکامیابی کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۱۰ء میں دستور بنانے کی فکر میں ہے ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مکان کا بیمہ اس وقت کرے جب اس میں آگ لگی ہو۔ آئرلینڈ میں ۱۹۱۰ء میں جو آگ لگی تھی اس سے بہت بڑی آگ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ اس کے بجھ گئے ہیں مگر اس کے انگارے جن

میں ہندوستان کے جوشِ آزادی کی حرارت ہے۔مدت تک دہکتے رہیں گے۔

ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں تشدد کا جذبہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔یہ روایات پہلے سے چلی آتی تھیں اور برطانوی حکومت ابتدا سے ہندوستان میں زیادہ تر پولیس کا کام کرتی تھی۔ملکی حکام کے طرزِ خیال پر بھی فوجی رنگ غالب تھا۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں کی فوج مفتوحہ علاقے میں پڑاؤ ڈالے پڑی ہے۔جب موجودہ نظام کی مخالفت شروع ہوئی تو یہ رنگ اور بھی گہرا ہو گیا۔ان لغو حرکتوں نے یعنی جو بنگال وغیرہ میں کبھی کبھی ہوتی تھیں حکومت کے تشدد کو اور اوسے سختی کرنے لئے ایک عذر بھی مل گیا۔حکومت کی پالیسی اور اس کے تعزیری ضابطوں کی وجہ سے عاملہ اور پولیس کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہو گئے کہ گویا ہندوستان میں پولیس کا راج قائم ہو گیا اور کوئی اس کی روک ٹوک کرنے والا نہ رہا۔

اس جبر و تشدد کی زد میں کم و بیش ہندوستان کے سب ہی صوبے آئے مگر صوبہ سرحد اور بنگال کو سب سے زیادہ مصیبت اٹھانی پڑی صوبہ سرحد ہمیشہ سے بڑی حد تک ایک فوجی علاقہ تھا اور اس میں نیم فوجی انتظام رائج تھا۔اس کا محل وقوع جنگی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا اور وہاں سرخ پوشوں کی تحریک پھیلنےسے حکومت بالکل بد حواس ہو گئی تھی۔سارے صوبے میں ہر طرف فوجی دستے نظر آتے تھے جو ''امن قائم کرنے میں'' اور ''سرکش دیہات'' کو قابو میں لانے میں مصروف تھے۔سارے ہندوستان مٰں پورے پورے گاؤں پر اور کبھی کبھی ،(خصوصاً بنگال میں) شہروں پر بھاری جرمانے کئے جاتے تھے۔اکثر تعزیری پولیس بھی تعینات کی جاتی تھی۔ظاہر ہے کہ جب پولیس کو اتنے اختیارات دے دیئے گئے تھے اور کسی قسم کی روک ٹوک نہیں تھی تو اس کا زیادتی کرنا ایک لازمی امر تھا۔قانون انصاف کی بدنظمی اور بے انصافی کی عجیب عجیب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

بنگال کے بعض حصوں میں بہت افسوس ناک منظر آتا تھا۔حکومت وہاں کی

ساری آبادی کو (یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ساری ہندو آبادی کو) دشمن سمجھتی تھی اور بارہ اور پچیس سال کے درمیان عمر رکھنے والے ہر مرد' عورت' لڑکے' لڑکی کو ایک کاغذ رکھنا پڑتا تھا جس میں اس کا نام ونشان درج ہوتا تھا۔ جتھے جتھے بند کر دیئے جاتے تھے یا انھیں کسی علاقے میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ لباس پر بندشیں عائد کی گئی تھیں۔ مدرسوں کی نگرانی ہوتی تھی یا وہ بند کر دیئے جاتے تھے۔ لوگوں کو بائیسکل کی اجازت نہیں تھی انھیں اپنی نقل وحرکت کی اطلاع پولیس کو دینی پڑتی تھی۔ غروب آفتاب کے بعد گھر سے نکلنے کی ممانعت' فوجوں کا گشت' تعزیری پولیس' مجموعی جرمانے' غرض دنیا بھر کے قاعدوں اور ضابطوں کی زنجیروں نے لوگوں کو جکڑ رکھا تھا۔ علاقے کے علاقے فوجی محاصرے کی حالت میں تھے اور ان کے سارے باشندوں کی حیثیت ان قیدیوں کی سی تھی جو عارضی طور پر رہا کیے جاتے ہیں اور ہر وقت پولیس کی شدید نگرانی میں رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ برطانوی حکومت کے نقطہ' نظر سے یہ عجیب وغریب قاعدے یا ضابطے ضروری تھے یا نہیں تھے۔ اگر ان کی ضرورت نہیں تھی تو حکومت پر بہت سخت الزام آتا ہے کہ اس نے پورے پورے علاقوں کے باشندوں کو خواہ مخواہ ستایا' ذلیل کیا اور شدید نقصان پہنچایا۔ اور اگر ان کی ضرورت تھی تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

اس جبر وتشدد نے جیل میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا' قیدیوں کی تقسیم مختلف درجوں میں کرنا ایک لغو فعل تھا اور اس سے اکثر ان لوگوں کو جو اونچے درجے میں رکھے جاتے تھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ بہت کم لوگوں کو اونچے درجے ملتے تھے اور بہت سے زور حس مردوں اور عورتوں کو ایسی شرائط کی پابندی کرنی پڑتی تھی جو ان کے لئے سوہان روح تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت جان بوجھ کر ایسی پالیسی اختیار کرتی ہے جس سے سیاسی قیدیوں کی حالت عام قیدیوں سے بدتر ہو جائے۔ جیل

کے ایک انسپکٹر جنرل نے تو یہاں تک کیا کہ تمام جیل خانوں میں ایک خفیہ گشتی چھٹی (۱) بھیج دی۔ جس میں یہ ہدایت کی کہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے ساتھ "انتہائی سختی کا برتاؤ کرنا چاہیے" "کوڑے لگانے کی سزا جیل میں عام ہوگی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۳۳ء کو نائب وزیر ہند نے دارالعوم میں بیان کیا" "سر سیموئل ہور کو اطلاع ملی ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان میں پانچ سو قیدیوں کو سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں کوڑے لگائے گئے" معلوم نہیں اس تعداد میں وہ لوگ بھی شامل ہیں یا نہیں جنھیں جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کی سزا میں کوڑے لگائے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں جب ہمیں جیل میں یہ خبریں پہنچیں کی بہت سے لوگوں کو کوڑے کی سزائیں دی گئی ہیں تو مجھے یاد آیا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہم نے اس قسم کے دو ایک واقعات کے خلاف احتجاج کیا تھا اور تین روز کا فاقہ کیا تھا۔ اس وقت مجھے اس وحشیانہ سزا سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اب بھی مجھے صدمہ ہوتا تھا اور دل دکھتا تھا مگر اس کا کبھی خیال بھی نہ آیا کہ مجھے پھر احتجاج اور فاقہ کرنا چاہئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب میں بالکل بے بس ہوں۔ انسان کا احساس وحشت اور بہمیت کا منظر دیکھتے دیکھتے کند ہو جاتا ہے۔ کتنی ہی بری چیز کیوں نہ ہو ایک مدت کے بعد دنیا کو اس کی عادت ہو جاتی ہے۔

ہمارے آدمیوں سے جیل میں سخت ترین مشقت کے کم لئے جاتے تھے مثلاً چکی پیسنا' کولھو چلانا وغیرہ اور انھیں ہر قسم کی تکلیفیں دی جاتی تھیں تا کہ وہ عاجز آ کر معفی مانگ لیں اور اقرار نامے پر دستخط کر کے رہا ہو جائیں یہ جیل کے افسروں کی بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔

جیل کی اکثر سزائیں لڑکوں اور نوجوانوں کے حصہ میں آتی تھیں اس لئے کہ وہ بے جا سختیوں پر بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ یہ بڑے اچھے بہادر لڑکے تھے جن میں خودداری' تیزی طراری' من چلاپن کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اگر یہ انگلستان کے پبلک اسکولوں اور یونیورسیٹوں میں ہوتے تو ان کی بڑی قدر اور ہمت افزائی کی جاتی۔

مگر ہندوستان میں ان کی نوجوانانہ تصقر پرست اوور خودداری کا صلہ یہ ملتا تھا کہ ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاتی تھیں، کال کوٹھری میں بند کئے جاتے تھے' اور کوڑوں پٹتے تھے۔

ہماری عورتوں کی حالت جیل میں اور بھی زیادہ افسوس ناک تھی۔ یہ عموماً اوسط طبقے کی عورتیں تھیں جو گھروں کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں' اور اس سماج نے جس میں مردوں کی خود غرضانہ حکومت ہے انھیں طرح طرح کی بندشوں اور رسموں میں جکڑ رکھا تھا۔ آزادی کی تحریک ان کے لئے دہری اہمیت رکھتی تھی۔ جس جوش وخروش سے یہ اس تحریک میں شریک ہوئیں اس کی تہ میں یقیناً یہ خواہش تھی کہ انھیں گھر کی غلامی سے بھی نجات مل جائے۔ یہ خواہش مبہم اور غیر محسوس سہی مگر شدت سے ان کے دلوں میں موجود تھی۔ جیل میں معدودے چند کے سوا ان خواتین کے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا تھا۔ وہ بدترین قسم کی عورتوں کے ساتھ رکھی جاتی تھیں اور اکثر انھیں سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ایک بار میں اس بارک میں رکھا گیا جو عورتوں کے احاطہ سے متصل تھی۔ صرف ایک دیوار بیچ میں تھی اس احاطے میں اور عورتوں کے ساتھ چند سیاسی قیدی عورتیں بھی تھیں جن میں سے ایک خاتون کے گھر میں ایک زمانہ میں مہمان رہ چکا تھا ایک اونچی دیوار کے حائل ہونے کے باوجود نگران قیدی عورتوں کی ڈانٹ ڈپٹ کی آواز صاف دیتی تھی اور مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا کہ میری دوستوں کو ایسی بیہودہ اور نا معقول باتیں سننی پڑتی ہیں۔

یہ بات صریحی طور پر نظر آتی تھی کہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں دو برس پہلے یعنی ۱۹۳۰ء کے مقابلے میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اور بھی برا برتاؤ ہوتا تھا یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ چند افسر اپنی مرضی سے ایسا کرتے ہوں سوا اس کے اور کوئی وجہ عقل میں نہیں آ سکتی تھی کہ حکومت نے قصداً یہ پالیسی مقرر کی ہے۔ کچھ سیاسی قیدیوں پر

موقوف نہیں بلکہ یوں بھی صوبہ متحدہ کا جیل کا محکمہ اس زمانہ میں اس کے لیے بدنام تھا کہ وہ ہر قسم کی ہمدردی اور انسانیت سے محروم ہے۔ ہمیں نہایت معتبر ذریعے سے اس کی ایک دلچسپ مثال معلوم ہوئی۔ ایک بار جیل کے ایک معزز وزیر، جو ہماری طرح باغی یا مفسد نہیں، بلکہ حکومت کے مقربین میں سے تھے اور سر کا خطاب رکھتے تھے، ہم سے ملنے کے لیے آئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ چند مہینے پہلے وہ ایک اور جیل کے معائنہ کے لیے گئے تھے اور انھوں نے اس رپورٹ میں جیلر کے متعلق یہ الفاظ لکھے تھے کہ وہ "ہمدردی کے ساتھ ضابطے کی پابندی کراتے ہیں" جیلر نے ان سے درخواست کی کہ آپ میری ہمدردی کا ذکر نہ کیجئے اس لیے کہ سرکاری حلقوں میں یہ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ مگر وزیر صاحب نہیں مانے اور انھیں یقین نہ آیا کہ اس رپورٹ سے جیلر کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد جیلر کو وہاں سے دور کسی اور مقام پر بدل دیا گیا جو اس کے لیے ایک قسم کی سزا تھی۔

بعض جیلروں کو جو خاص طور پر سخت اور بے باک سمجھے جاتے تھے۔ ترقیاں ملیں اور خطاب دیئے گئے۔ رشوت کی جیل میں اس قدر گرم بازاری ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اس سے بچتا ہو۔ مگر میرا اور میرے بہت سے دوستوں کا یہ تجربہ ہے کہ جیل کے افسروں میں وہی لوگ سب سے زیادہ رشوت لیتے ہیں جو بڑے سخت گیر بنتے ہیں۔

خوش قسمتی سے میرے ساتھ جیل میں اور جیل کے باہر بھی لوگوں کا برتاؤ بہت اچھا رہا اور ہر شخص جس سے مجھے سابقہ پڑا میرے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا۔ ان موقعوں پر بھی جب میں اس سلوک کا مستحق نہیں تھا البتہ جیل میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے مجھے اور میرے عزیزوں کو بڑا دکھ پہنچا۔ ایک بار میری والدہ، کملا اور میری بیٹی اندرا الہ آباد کے ڈسٹرکٹ جیل میں میرے بہنوئی رنجیت پنڈت سے ملنے کے لیے گئیں۔ جیلر نے انھوں بے قصور برا بھلا کہا اور باہر نکال دیا۔ مجھے اس

سے بہت رنج ہوا۔ اور صوبے کی حکومت نے اس معاملے میں جو طریقہ اختیار کیا اس سے بھی اور زیادہ صدمہ پہنچا۔ اس خیال سے کہیں پھر جیل کے ملازموں کے ہاتھ سے میری والدہ کی توہین نہ ہو میں نے سب سے ملاقات کرنا ترک کر دیا۔ دہرہ دون کے جیل میں سات مہینے تک ایک شخص سے بھی ملاقات نہیں کی۔

ایک قیدی کی نفسی کیفیتیں

میں اور گووند پنتھ بریلی ڈسٹرکٹ جیل سے دہرہ دون جیل منتقل کردیئے گئے۔
اس خیال سے کہ کوئی مظاہرہ نہ ہونے پائے ہمیں بریلی اسٹیشن سے ریل پر سوار نہیں
کیا بلکہ وہاں سے پچاس میل آگے جا کر ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی پر بٹھا دیا
اور وہ بھی خفیہ طور پر رات کے وقت۔ مہینوں تنہائی میں بند رہنے کے بعد رات کی خنکی
میں موٹر کار کا یہ سفر بڑا خوش گوار معلوم ہوا۔

بریلی جیل سے روانگی سے پہلے ایک بات ایسی ہوئی جس نے میرے دل پر بڑا
اثر کیا اور جس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ بریلی کا انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی وہاں
موجود تھا جب میں موٹر میں بیٹھنے لگا تو اس نے کچھ شرماتے ہوئے ایک بنڈل میری
طرف بڑھایا اور کہا کہ اس میں جرمنی کے چند پرانے باتصویر رسالے ہیں۔ میں
نے سنا تھا کہ آپ نے جرمن زبان سیکھنا شروع کی ہے اس لیے میں یہ رسالے آپ
کے لیے لیتا آیا۔ میں نہ ان صاحب سے پہلے کبھی ملا تھا اور نہ اس کے بعد ملنے کا
اتفاق ہوا۔ مجھے ان کا نام تک معلوم نہیں، ان کے اس بے ساختہ اخلاق۔ اور اس
جذبہ ہمدردی نے جو اس کا محرک ہوا۔ مجھے بہت متاثر کیا اور میں ان کا یہ احسان کبھی
نہ بھولوں گا۔

آدھی رات کے سناٹے میں موٹر کے اس طویل سفر میں، میں انگریزوں اور
ہندوستانیوں حاکموں اور محکموں، سرکاری عہدے داروں اور غیر سرکاری لوگوں کے
تعلقات پر غور کرتا رہا۔ ان دونوں کے درمیان کتنی بڑی زبردست خلیج حائل ہے۔
اور یہ ایک دوسرے سے کس قدر بد دل اور بدظن ہیں۔ لیکن اس بددلی اور بدگمانی
کے علاوہ اجنبیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہیں اس
لیے ہر فریق دوسرے سے کھٹکتا ہے اور کھچا کھچا رہتا ہے ایک دوسرے کو ترش رو اور
روکھا نظر آتا ہے اور دونوں میں سے کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس پردے کے پیچھے

شرافت اور انسانیت بھی ہے، انگریز ملک کے حکام ہیں اور جاہ و منصب عطا کرنا ان کے اختیار میں ہے اس لیے بہت سے خوشامدی ابن الوقت اور عہدوں کے خواہاں انہیں گھیرے رہتے ہیں اور انہی ناپاک نمونوں سے انہوں نے ہندوستانیوں کی سیرت کا انداہ لگایا ہے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں نے انگریزوں کو صرف افسروں کی حیثیت سے دیکھا، جو انسانیت سے خالی، مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے مستقل حقوق کو محفوظ رکھنے کی دھن میں رہتے ہیں۔ کسی شخص کے انفرادی رویہ میں جب وہ اپنے انسانی جذبات کے ماتحت کام کرتا ہے اور اس کے منصبی طرز عمل میں جب وہ ایک فوج کا سپاہی ہوتا ہے، زمین آسمان کا فرق ہے۔ سپاہی جب ڈیوٹی پر ہوتا ہے تو اس کی انسانیت رخصت ہو جاتی ہے وہ ایک کل کے پتلے کی طرح حرکت کرتا ہے اور ان بے ضرر انسانوں پر گولی چلاتا ہے جنہوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ یہی حال اس پولیس کے افسر کا ہے جسے آج کسی شخص سے ذرا سی بدسلوکی کرنا بھی گوارا نہیں تو کل بے گناہوں پر بے تکلف لاٹھی چارج کرتا ہے۔ اس وقت نہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے نہ مجمع کے ان افراد کو جن پر وہ لاٹھیاں اور گولیاں برساتا ہے۔

جب کوئی شخص دوسرے فریق کو جماعت یا مجمع کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو انسانی رشتہ غائب ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جماعت بھی افراد سے مردوں، عورتوں اور بچوں سے بنتی ہے جن کے سینے میں دل ہے اور اس میں محبت نفرت اور تکلیف کا احساس موجود ہے۔ انگریز اگر صاف گوئی سے کام لیں تو یہ کہیں گے کہ ہندوستانیوں میں بعض معقول آدمی بھی دیکھے ہیں مگر وہ استثنا کا حکم رکھتے ہیں۔ ورنہ عموماً ہندوستانی سخت قابل نفرت ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی بھی یہی کہیں گے کہ وہ چند ایسے انگریزوں کو جانتے ہیں جو قابل تعریف ہیں لیکن انہیں چھوڑ کر باقی سب کے سب مغرور، ظالم اور بد ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہر شخص دوسری قوم کا

اندازہ ان افراد سے نہیں لگاتا جن سے اسے انسان کی حیثیت سے سابقہ پڑا ہے بلکہ دوسرے لوگوں سے جن سے وہ بالکل ناواقف ہوتا ہے یا بہت کم واقفیت رکھتا ہے۔

میں ذاتی طور پر اس معاملے میں بڑا خوش نصیب ہوں کیونکہ میرے ہم وطن اور انگریز دونوں بلا استثنا ہمیشہ مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آئے یہاں تک کہ وہ پولیس والے جنھوں نے مجھے گرفتار کیا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے اور جیلر وغیرہ بھی مجھ سے بڑی مہربانی سے پیش آتے رہے اور ان کی اس انسانیت کی وجہ سے لڑائی کی تلخیوں اور جیل زندگی کی سختیوں میں بہت کچھ کمی ہوگئی۔ میرے ہم وطنوں کا مجھ سے اچھا سلوک کرنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ ان میں تو مجھے کچھ نہ کچھ شہرت اور مقبولیت حاصل تھی لیکن انگریز بھی مجھے محض ایک جماعت کے رکن نہیں بلکہ ایک فرد کی حیثیت دیتے رہے۔ میں نے انگلستان میں تعلیم پائی ہے اور وہاں سے ایک پبلک اسکول میں رہا ہوں۔ شاید اس وجہ سے وہ مجھے اپنے سے قریب تر سمجھتے ہیں اور چاہے میری قومی سرگرمیاں انہیں کتنی ہی نامعقول معلوم ہوتی ہوں لیکن وہ اپنے معیار کے مطابق مجھے کم و بیش مہذب ضرور مانتے ہیں۔ میرے ساتھ جو خاص مراعات کی جاتی تھیں جب میں اس کا مقابلہ اپنے ساتھیوں کی حالت سے کرتا تھا تو اکثر مجھے تکلیف ہوتی تھی اور شرم آتی تھی۔

لیکن ان تمام رعایتوں کے باوجود جیل پھر جیل ہے اور وہاں تکلیف دہ ماحول کبھی کبھی ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ وہاں کی ساری فضا تشدد، کمینے پن اور رشوت اور جھوٹ سے ناپاک تھی۔ جیل کے ملازم یا تو انتہائی خوشامد کرتے تھے یا گالی سے بات کرتے تھے۔ جو شخص حساس طبیعت رکھتا ہو وہ ہمیشہ بے چین رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر طبیعت جھنجھلاتی تھی۔ کسی خط یا اخبار میں کوئی بری خبر دیکھ کر کچھ دیر کے لیے پریشانی یا غصے سے دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ باہر تو کام میں لگے رہنے سے

تسکین رہتی تھی اور مختلف دلچسپیاں اور سرگرمیاں دماغ اور جسم کا توازن قائم رکھتی تھیں لیکن جیل میں گھٹے ہوئے جذبات کے نکاس کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا اور آدمی اندر ہی اندر کھولتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی رائے ہر معاملے کے متعلق یک طرفہ اور غلط ہوتی تھی۔ اور بیماری تو جیل میں بڑی مصیبت تھی۔

پھر بھی میں نے جیل کے معمولات کا اپنے آپ کو عادی بنا لیا اور کافی جسمانی ورزش اور دماغی محنت کے ذریعے سے اپنی صحت کو قائم رکھا۔ ورزش اور محنت کی باہر کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن جیل میں یہ نہایت ضروری چیز ہے، کیونکہ اس کے بغیر صحت بالکل برباد ہو جاتی ہے۔ میں اوقات کی نہایت سختی سے پابندی کرتا تھا اور جہاں تک ممکن تھا اپنے پرانے معمولات کو قائم رکھتا تھا تاکہ طبیعت سست نہ ہونے پائے۔ میں پابندی سے داڑھی مونڈتا تھا۔ (جیل میں مجھے سیفٹی ریزر رکھنے کی اجازت تھی) میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر اس لیے کر دیا ہے کہ لوگ عموماً ان کی پرواہ نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور کاموں میں بھی سست پڑ جاتے ہیں۔ دن بھر سخت محنت کرنے کے بعد شام کی تکان بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اور رات کو بڑے مزے کی نیند آتی تھی۔

اس طرح دن، ہفتے اور مہینے گزرتے گئے لیکن کبھی کبھی کوئی مہینہ ایسا بھاری ہو جاتا تھا کہ کاٹے نہ کٹتا تھا اور بعض اوقات میں دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص سے بیزار ہو جاتا تھا۔ اپنے جیل کے ساتھیوں سے جیل کے عملہ سے، باہر والوں سے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا یا ایسا کیوں نہ کیا سلطنت برطانیہ سے (مگر اس سے تو میں ہمیشہ بیزار تھا) اور سب سے زیادہ اپنے آپ سے۔ میں سخت اعصابی بے چینی میں مبتلا رہتا تھا اور نفسی کیفیتیں جو ایک قیدی پر گزرتی ہیں، مجھ پر بڑی شدت سے طاری ہوتی تھیں۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے اس قسم کے دردوں سے بہت جلد افاقہ ہو جاتا تھا۔

جیل میں ملاقات کا دن ہمارے لیے عید کا دن ہوتا تھا ہر شخص اس کے انتظار

میں دن گنا کرتا تھا۔ لیکن ملاقات کا جوش ختم ہونے کے بعد فطرتاً اس کا ردعمل شروع ہوتا تھا۔ یعنی ہمیں بڑی تنہائی اور اداسی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ملاقاتیں خوش گوار ثابت نہیں ہوتی تھیں یعنی کوئی پریشان کن خبر سننے میں آتی تھی یا کوئی اور بات ایسی ہوتی تھی جس کی وجہ سے میں رنجیدہ ہو جاتا تھا۔ ملاقات کے موقعوں پر جیل کے افسر تو موجود رہتے ہی تھے لیکن بریلی میں دو تین مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ خفیہ پولیس والے بھی کاغذ پنسل لیے بیٹھے تھے اور جو لفظ ہماری زبان سے نکلتا تھا اسے بڑے شوق سے لکھتے جاتے تھے۔ مجھے اس پر بڑا غصہ آتا تھا اور ان ملاقاتوں کا سارا لطف جاتا رہتا تھا۔

اس کے بعد جب الہٰ آباد جیل میں ایک ملاقات کے موقع پر میری ماں اور بیوی کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا گیا اور حکومت نے بھی اس کا کوئی تدارک نہیں کیا تو میں نے احتجاج کے طور پر ان ملاقاتوں کو جو میرے لیے اس قدر قیمتی تھیں ترک کر دیا۔ قریب قریب سات مہینے تک میں کسی شخص سے نہیں ملا۔ میرے لیے یہ بڑے سخت دن تھے۔ اس کے جب میں دوبارہ ملاقات کا سلسلہ شروع کیا اور میرے عزیز پہلے پہل مجھ سے ملنے آئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ کس قدر خوشی ہوئی۔ میری بہن کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں سے ایک ننھا سا بچہ حسب عادت میرے کاندھے پر چڑھ گیا تو مجھے اپنے جذبات کا ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اتنے دن تک انسانوں کی صحبت کے لیے ترسنے کے بعد گھر کی زندگی کے لطف نے مجھے بے چین کر دیا۔

جس زمانے میں ملاقات کا سلسلہ بند تھا مجھے گھر کے یا دوسرے جیلوں کے خطوں کا (کیونکہ میری دونوں بہنیں جیل میں تھی) اور زیادہ بے چینی سے انتظار رہنے لگا۔ اور یہ چیز میرے لیے اور بھی قیمتی ہو گئی۔ اگر مقررہ وقت پر خط نہ پہنچتا تو مجھے سخت پریشانی ہوتی لیکن جب آ جاتا تو مجھے اس کے کھولنے میں ایک قسم کی

ہچکچاہٹ سی ہوتی میں اس سے اس طرح کھیلتا رہتا جیسے کوئی اپنی محبوب چیز سے کھیلتا ہے جو اپنے قابو میں ہو اور میرے دل کی تہہ میں یہ خیال بھی کھٹکتا رہتا کہ کہیں اس میں کوئی ایسی خبر یا بات نہ ہو جس سے مجھے تکلیف پہنچے۔ خط بھیجنے اور خط پانے دونوں سے پرسکون زندگی میں بڑا خلل واقع ہوتا ہے۔ ان سے جذبات میں ایک ہیجان تکلیف ہوتی ہے ایک دو روز خیالات پریشان رہتے ہیں اور روزمرہ کے کام پر پوری توجہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

نینی اور بریلی کے جیلوں میں سے ہمارے ساتھ بہت سے لوگ تھے لیکن دہرہ دون میں شروع شروع میں صرف ہم تین آدمی تھے یعنی گووند بلبھ پنتھ۔ کاشی پور کے کنور آنند سنگھ اور میں۔ دو ایک مہینے بعد پنتھ جی اپنے چھ مہینے کی میعاد کاٹ کر چلے گئے لیکن دو صاحب اور تشریف لے آئے۔ جنوری ۱۹۳۳ء تک سب ساتھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ آخر اگست میں مجھے رہائی ملی۔ اس عرصے میں یعنی پورے آٹھ مہینے دہرہ دون جیل میں، میں نے بالکل تنہائی کی زندگی گزاری یہاں تک کہ کوئی بات کرنے کو بھی نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی جیل کا کوئی اہلکار چند منٹ کے لیے آنکلتا تھا۔ اگرچہ اصطلاحی طور پر مجھے قید تنہائی کی سزا نہیں دی گئی تھی لیکن یہ صورت صورت قریب قریب وہی تھی۔ میرے لیے یہ بڑا صبر آزما زمانہ تھا۔ اچھا ہوا کہ میں نے ملاقات کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا کیونکہ اس سے مجھے کچھ نہ کچھ سکون حاصل ہو جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایک خاص رعایت یہ تھی کہ مجھے باہر سے تازہ پھول منگوانے اور چند فوٹو رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ان سے میرا جی بہت کچھ بہل جاتا تھا۔ عموماً جیل میں پھولوں اور تصویروں کے رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اکثر لوگوں نے میرے لیے پھول بھیجے۔ لیکن مجھے ان کے لینے کی اجازت نہیں ملی۔ بات یہ ہے کہ جیل کی کوٹھڑی میں خوشنمائی پیدا کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے میرے ایک ساتھی کو جو میرے برابر کی کوٹھڑی میں

رہتے تھے، اس بات پر تنبیہ کی انہوں نے اپنے منہ ہاتھ دھونے کا سامان سلیقے سے سجا کر رکھا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ''اپنی کوٹھڑی کو اس طرح مت سجاؤ کہ اس سے آرائش اور عیش پسندی ظاہر ہو'' اب ذرا اس سامان عیش کی فہرست بھی ملاحظہ کیجئے۔ ایک دانت صاف کرنے کا برش، منجن کی شیشی، فاؤنٹین پن کی روشنائی، سر میں ڈالنے کی تیل کی ایک بوتل، ایک برش، ایک کنگھا اور شاید دو ایک اور چھوٹی چھوٹی چیزیں۔

جیل میں انسان کو روزمرہ کی معمولی معمولی چیزوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ وہاں اپنا ذاتی سامان بہت کم ہوتا ہے۔ اس میں آسانی سے اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی چیز کھو جائے تو دوبارہ منگوانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے ہر شخص انہیں بہت عزیز رکھتا ہے وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں جمع کرتا تھا جو باہر عموماً ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہیں۔ ملکیت کا جذبہ وہاں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جہاں کوئی چیز رکھنے کے قابل ہو میسر نہیں آتی۔

کبھی کبھی زندگی کی خوش گوار چیزوں کے لیے دل تڑپتا ہے مثلاً جسمانی آرام و آسائش، خوش گوار ماحول، دوستوں کی صحبت، دلچسپ گفتگو، بچوں کے ساتھ کھیلنا ...... کبھی اخبار میں کوئی تصویر یا فوٹو دیکھ کر پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جوانی کی بے فکریوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے گھر کی یاد کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتی ہے اور سارا دن بے چینی میں کٹتا ہے۔

میں روز تھوڑی دیر چرخہ کاتتا تھا کیونکہ ذہنی کام کرنے کے بعد جسمانی محنت سے سکون حاصل ہوتا تھا۔ لیکن میرا خاص شغل لکھنا پڑھنا تھا۔ جو کتابیں میں چاہتا تھا وہ سب مجھے نہیں مل سکتی تھیں کیونکہ اس معاملے میں بڑی پابندیاں تھیں اور سختی سے احتساب ہوتا تھا۔ احتساب کرنے والے بعض اوقات نا اہل لوگ ہوتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ اسپنگلر کی کتاب ''زوال مغرب'' اس لیے روک دی گئی کہ کتاب کا نام

خطرناک اور باغیانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھے شکایت کا موقع نہیں ہے۔ اس لیے کہ پھر بھی مجھے بہت سی مختلف قسم کی کتابیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ اس معاملے میں بھی میرے ساتھ خاص رعایت تھی کیونکہ میرے بہت سے ساتھیوں کو (جو درجہ اول کے قیدی تھے) مسائل حاضرہ کے متعلق کتابیں ملنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ بنارس جیل میں وائٹ پیپر تک (جس میں حکومت برطانیہ کی دستوری تجاویز درج تھیں) منگانے کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ اس میں سیاسی معاملات کی بحث تھی۔ برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی سے ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

جب ہندوستان میں معمولی سے معمولی مدنی حقوق بھی حاصل نہیں ہیں تو قیدیوں کے حقوق کا تذکرہ کرنا فضول ہے۔ پھر بھی یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ اگر ایک عدالت کسی شخص کو قید کی سزا دیتی ہے تو اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جسم کے ساتھ دماغ کو بھی سزا دی جائے۔ قیدی کا جسم پابند سہی لیکن دماغ کیوں نہ آزاد ہو؟ ہندوستان کے جیلوں کے ارباب حل وعقد یقیناً اس سوال پر برافروختہ ہوں گے۔ کیونکہ ان میں جدید خیالات کو سمجھنے کی صلاحیت اور غور وفکر کی عادت عموماً بہت کم ہوتی ہے۔ احتساب یوں بھی بے انصافی اور حماقت کا فعل ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کی بدولت بہت سی جدید مطبوعات اور ترقی پذیر رسائل اور اخبارات سے محروم رہتے ہیں۔ ممنوعہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ قیدیوں کو وہ کتابیں نہیں ملتیں جن کی جیل کے باہر خریدنے اور پڑھنے کی قانوناً اجازت ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا تھا۔ وہاں نیو یارک کے مشہور ومعروف سنگ سنگ جیل میں چند اشتمالی رسائل کی ممانعت تھی۔

امریکہ کے حکمران طبقہ کو اشتمالیوں سے خاص قد ہے۔ لیکن اس کے باوجود جیل کے حکام نے یہ تسلیم کیا کہ قیدیوں کو ہر طرح کی مطبوعات حتی کہ اشتمالی رسائل و اخبارات بھی منگانے کا حق ہے۔ جیل کے وارڈن نے اس میں صرف ایک استثنا کیا تھا یعنی ان کارٹونوں کی اجازت نہیں دی تھی جنہیں وہ اشتعال انگیز سمجھتا تھا۔

ہندوستان کی جیلوں کے متعلق ذہنی آزادی کے مسئلہ پر بحث کرنا بالکل فضول ہے کیونکہ یہاں تو عام قیدیوں کو نہ کوئی اخبار ملتا ہے اور نہ لکھنے کا سامان۔ احتساب کا کیا ذکر ہے۔ یہاں تو ان سب چیزوں کی ایک سرے سے ممانعت ہے صرف درجہ اول کے قیدیوں کو لکھنے کا سامان ملتا ہے لیکن روزانہ اخباران میں سے بھی سب کو نہیں دیئے جاتے اور جنہیں ملتے بھی ہیں تو وہی اخبار جنہیں حکومت پسند کرتی ہے۔ رہے دوسرے اور تیسرے درجے کے سیاسی اور غیر سیاسی قیدی ان کے لیے اصولاً لکھنے کا سامان ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بعض سیاسی قیدیوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ انہیں لکھنے کا سامان دے دیا جاتا ہے لیکن اکثر یہ رعایت منسوخ ہوتی رہتی ہے۔ درجہ اول کے قیدی ہزار میں سے ایک سے زیادہ نہ ہوتے ہوں گے اس لیے ہندوستانی قیدیوں کی عام حالت پر غور کرتے وقت ہم انہیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مگر یاد رہے جہاں تک کتابوں اور اخباروں کا تعلق ہے، درجہ اول کے ان خوش نصیب، قیدیوں کو بھی وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو اکثر مہذب ممالک کے عام قیدیوں کو حاصل ہیں۔

بقیہ قیدیوں یعنی ہزار میں نو سو ننانوے کو ایک وقت میں دو تین کتابیں منگانے کی اجازت ہے لیکن پابندیاں اتنی سخت ہیں کہ عام طور پر وہ اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لکھنا یا کتابوں کے نوٹ لینا بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے اور اس کی سخت ممانعت ہے۔ ذہنی تربیت کو جان بوجھ کر اس طرح روکنا بہت عجیب اور معنی خیز ہے۔ قیدیوں کی اصلاح کے نقطہ نظر سے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان کے دماغ کی

تربیت کی جائے اور اس کا رخ بدلا جائے۔ انہیں لکھنا پڑھنا سکھانے کی کوشش شروع ہوئی ہے لیکن وہ بالکل ناکافی ہے اور جن لوگوں کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے وہ قطعاً نااہل ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیدی پڑھنے لکھنے کو پسند نہیں کرتے لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے پاس بہت سے قیدی اسی غرض سے آتے تھے اور میں نے دیکھا کہ انہیں لکھنے پڑھنے کا دل سے شوق تھا۔ جن قیدیوں سے ملنے کا ہمیں موقع ملا تھا ہم انہیں پڑھاتے تھے اور وہ بڑی محنت سے کام کرتے تھے۔ اکثر جب آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ دو ایک قیدی بارک کے اندر دھندلی سی لالٹین کے پاس بیٹھے اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔

غرض میں کتب بینی میں مصروف رہتا تھا۔ میں اپنے مطالعے کے موضوع بدلتا رہتا تھا مگر عموماً ٹھوس کتابیں پڑھتا تھا۔ ناولوں سے ذہن سست ہو جاتا ہے اس لیے میں نے زیادہ ناولیں نہیں پڑھیں۔ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو لکھنے لگتا تھا۔ تاریخ عالم کے موضوع پر میں نے اپنی لڑکی کے نام خطوں کا جو سلسلہ لکھا ہے اس میں میں اپنی سزا کے پورے دو سال مصروف رہا اور اس سے میرے ذہن کی چستی اور مستعدی قائم رہی۔ ایک حد تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں اسی دور ماضی میں رہتا ہوں جس کی تاریخ میں لکھ رہا ہوں اس لیے میں اپنے جیل کے ماحول کو قریب قریب بھول گیا تھا۔

سفرنامے پڑھنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ مثلاً ہیون سانگ، مارکو پولو، ابن بطوطہ وغیرہ پرانے سیاحوں کے تذکرے اور زمانہ حال کے لوگوں مثلاً ہیڈن (جس نے وسطی ایشیا کے ریگستانوں میں سفر کیا ہے) اور روچ (جس نے تبت کے بڑے دلچسپ واقعات لکھے ہیں) وغیرہ کی کتابیں، تصویروں کی کتابیں خصوصاً پہاڑوں پر برف کے تودوں، اور ریگستانوں کی تصویریں دیکھنے میں بڑا لطف آتا تھا کیونکہ جیل

میں ہر شخص وسیع فضاؤں، سمندروں اور پہاڑوں کے لیے ترستا ہے۔ میرے پاس
موں بلاں، کوہ آلپس، اور ہمالیہ کی تصویروں کی چند خوبصورت کتابیں تھیں میں اکثر
انہیں دیکھا کرتا تھا اور جب میری کوٹھڑی یا بارک کا درجہ حرارت ۱۱۵ ڈگری یا اس
سے بھی زیادہ ہوتا تھا تو میں برف کے ان تودوں کو حسرت سے تکا کرتا تھا۔ اٹلس کو
دیکھ کر طبیعت میں بڑا ہیجان پیدا ہوتا تھا۔ اس سے ان جگہوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی
جنہیں ہم دیکھ چکے تھے اور ان مقامات کا تصور بندھ جاتا تھا جنہیں دیکھنے کا ارمان
تھا۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان پرانے منظروں کا لطف اٹھائیں۔ ان لفظوں اور
نشانوں کی سیر کریں جو بڑے بڑے شہروں کو ظاہر کرتے ہیں، ان موٹی گہری
لکیروں پر سے گذریں جو پہاڑوں کی علامت ہیں اور ان نیلے دھبوں کو عبور کریں
جو سمندر کی نشانی ہیں۔ غرض دنیا کے تمام دلکش مناظر دیکھیں اور بدلتی ہوئی انسانی
زندگی کی کش مکش کا مطالعہ کریں۔ یہ آرزوئیں ہمیں بے چین کر دیتی تھیں اور جلدی
سے ہم حسرت وافسوس کے ساتھ اٹلس کو اٹھا کر رکھ دیتے تھے اور پھر اسی چاردیواری
میں لوٹ آتے تھے جو ہمیں گھیرے ہوئے تھی اور انہی بے کیف معمولات میں
مصروف ہو جاتے تھے جو ہماری قسمت میں لکھے تھے۔

قید خانے کے جانور

ایک سال اور ڈھائی مہینے میں نے دہرہ دون جیل میں اپنی چھوٹی سی کوٹھڑی یا کمرے میں گزارے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا میں اس کا ایک جزو بن گیا ہوں۔ میں اس کے ہر حصہ سے آشنا تھا۔ سفیدی سے پٹی ہوئی دیواروں، ناہموار فرش اور کرم خوردہ چھت کی کڑیوں کے ایک ایک نشان اور ایک ایک داغ سے واقف تھا۔ باہر مختصر سے صحن میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے گچھے میرے پرانے دوست بن گئے تھے۔ میں اپنی کوٹھڑی میں تنہا نہیں تھا اس لیے کہ یہاں ہر قسم کے زہریلے کیڑے مکوڑوں اور بھڑوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ کڑیوں کے پیچھے چھپکلیوں کا ڈیرہ تھا جو ہر شام کو اپنے شکار کی تلاش میں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کے خیالات و جذبات کا کوئی نقش اس کے گرد و پیش میں باقی رہ جاتا ہے تو یقین ہے کہ اس کوٹھڑی کی تنگ فضا بھی طرح طرح کے خیالت سے معمور ہوگی اور وہ ہر چیز میں بسے ہوئے ہوں گے۔

دوسرے قید خانوں میں، میں اچھی اچھی کوٹھڑیوں میں رہا ہوں لیکن دہرہ دون جیل میں مجھے ایک ایسی رعایت حاصل تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ یہاں کا اصل جیل خانہ نہایت مختصر ہے اور ہم جیل کے احاطہ ہی میں مگر اس کی دیواروں سے باہر ایک پرانی حوالات میں رہتے تھے۔ یہ جگہ بہت چھوٹی تھی اس قدر چھوٹی کہ اس میں ٹہلنے کی مطلق گنجائش نہ تھی لہذا ہمیں اجازت تھی کہ اپنی کوٹھڑی سے باہر جیل کے پھاٹک کے سامنے جو تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا صبح و شام ٹہل سکیں۔ گویا احاطہ جیل میں رہنے کے باوجود ہم اس کی دیواروں سے باہر نکل کر پہاڑ اور کھیتوں کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ پاس ہی آمد و رفت کے لیے ایک سڑک تھی لیکن اس رعایت سے جس کا میں نے ذکر کیا ہے صرف میں ہی بلکہ درجہ الف اور ب کے تمام قیدی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جیل کی دیواروں سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر

ہی ایک اور چھوٹی سی حوالات بھی تھی جو یورپین حوالات کہلاتی تھی۔اس کے اردگرد کوئی دیوار نہ تھی لہذا اس میں بیٹھے ہی بیٹھے کوہستان کے دلفریب منظر اور بیرونی زندگی کا نظارہ ممکن تھا۔یورپین مجرم اور دوسرے قیدی جو یہاں رکھے گئے تھے انہیں بھی صبح وشام جیل خانے کے پھاٹک کے سامنے چہل قدمی کرنے کی اجازت حاصل تھی۔

صرف وہی قیدی جو ایک مدت تک جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر بند ہیں اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی حدود سے باہر ٹہل لینا یا بیرونی دنیا کے وسیع اور کشادہ منظر سے لطف اندوز ہونا نفسیاتی اعتبار سے کیسی عجیب وغریب نعمت ہے۔ مجھے جیل سے باہر نکلنے کا اس قدر شوق تھا کہ برسات کے موسم میں بھی جب موسلا دھار بارش کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہتا اور مجھے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں چلنا پڑتا میں نے نکل کر ٹہلنا ترک نہیں کیا۔اس قسم کی چہل قدمی یوں تو ہر جگہ اچھی معلوم ہوتی مگر قریب ہی سربفلک ہمالیہ کا منظر میرے لیے مزید خوشی کا باعث ہوتا تھا جس سے دم بھر کے لیے قید خانہ کی پریشانی اور کلفت بڑی حد تک رفع ہو جاتی۔یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس طویل عرصہ میں جب ملاقاتوں کا سلسلہ بالکل مسدود ہو جاتا اور مجھے کئی مہینے لگاتار تنہا رہنا پڑتا یہ محبوب پہاڑ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔کوٹھڑی کے اندر سے اگرچہ میرے لیے ان کا لطف اٹھانا ناممکن تھا مگر ان کا تصور میرے دل میں اس طرح سما گیا تھا کہ مجھے ان کے قرب کا ہر وقت احساس رہتا۔معلوم ہوتا تھا میرے اور ان کے درمیان ایک پراسرار ربط قائم ہو گیا۔

پرندوں کے جھنڈ اڑتے اڑتے نظر سے غائب ہو گئے اور وہ
بادل کا اکیلا ٹکڑا بھی تیرتا ہوا دور چلا گیا۔میں تنہا بیٹھا ہوں اور میرے
آگے بہت دور چنگ ٹنگ کی بلند چوٹی کھڑی ہے۔ہم ایک دوسرے
سے کبھی نہیں اکتاتے۔پہاڑ اور میں

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ شاعر لی ٹے پو کی طرح مجھے پہاڑوں سے کبھی وحشت نہیں ہوئی لیکن یہ بہت کم ہوتا تھا۔ عموماً مجھے ان کے قرب سے ایک طرح کی تسکین محسوس ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پہاڑوں کا وقار اور اثبات، لاکھوں کروڑوں برس کی حکمت و دانائی سے مالا مال مجھے چشم نمائی کرتا ہے، میرے تلون پر ہنستا ہے اور میرے بے چین دل کو سکون اور تقویت بخشتا ہے۔

ہندوستان کے نشیبی میدانوں کی نسبت دہرہ دون میں بہار کا موسم طویل بھی ہوتا ہے اور خوش گوار بھی، جاڑے میں درختوں کے پتے گر گئے تھے اور وہ ننگے ہو کر رہ گئے تھے۔ تعجب تو یہ ہے کہ پیپل کے وہ چار بڑے بڑے درخت جو پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے پتوں سے قریب قریب خالی ہو گئے تھے اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی۔ مگر پہاڑ کی ہواؤں نے انہیں پھر گرما دیا اور ان کے رگ و ریشہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دفعتاً ان پیپل کے پیڑوں اور تمام درختوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور ایک طلسمات کا عالم نظر آنے لگا، جیسے پردے کے پیچھے پر اسرار قوتیں کام کر رہی ہوں۔ میں ان کی شاخوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹتے دیکھ کو چونک پڑتا تھا۔ یہ منظر نہایت ہی خوشگوار اور مسرت خیز تھا، دفعتاً لاکھوں کروڑوں پتے بڑی سرعت کے ساتھ شاخوں پر نمودار ہو کر آفتاب کی روشنی میں چمک اٹھے اور پھر ہوا کی تال پر رقص کرنے لگے۔ کونپلوں کا دیکھتے ہی دیکھتے پتے بن جانا کس قدر عجیب و غریب منظر ہے۔

اس سے پہلے میں یہ کبھی نہیں دیکھا تھا کہ آم کے نئے پتوں کا رنگ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے موسم خزاں میں کشمیر کے پہاڑوں پر ہلکا گلابی رنگ چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ آم کے پتے بہت جلد اپنا رنگ بدل کر پھر سبز ہو جاتے ہیں۔

برسات کی بارشیں ہمیشہ خوش گوار ہوتی ہیں اس لیے کہ وہ گرمی کی تپش بجھا دیتی

ہیں مگر کبھی نعمت کی فراوانی زحمت بھی بن جاتی ہے اور دہرہ دون تو بارش کے دیوتا کا استھان ہے۔ برسات کی ابتدا میں شروع ہی کے پانچ چھ ہفتوں میں یہاں تقریباً پچاس ساٹھ انچ بارش ہو جاتی ہے۔ اس وقت جیل کے ایک تنگ گوشے میں دبک کر بیٹھ جانا اور یہ کوشش کرنا کہ آدمی ٹپکتی ہوئی چھت کے پانی یا کھڑکیوں میں سے آنے والی بوچھاڑ سے بچا رہے کچھ اچھا نہیں لگتا۔

برسات کے بعد خزاں کا موسم نہایت خوش گوار ہوتا تھا اور جاڑا بھی بشرطیکہ بارش نہ ہو۔ پانی کی بوچھاڑ، بجلی کی کڑک، تیز و تند ہواؤں کے چلنے سے دم الجھتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ایک اچھا مکان، کسی قدر آسائش اور گرمی میسر ہو۔ بعض اوقات اولے گرتے تھے اور ایک ایک اولا کھیلنے کی گولی سے بڑا ہوتا تھا۔ جب یہ اولے نالی دار آہنی چھت پر گرتے تو ان سے کچھ اس قسم کا زبردست شور پیدا ہوتا تھا جیسے توپیں چل رہی ہوں۔

ایک دن مجھے خاص طور سے یاد ہے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کی چوبیسویں تاریخ تھی۔ دن بھر رعد و باراں کا زور رہا۔ سردی نہایت سخت تھی۔ جسمانی تکلیف کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا دن تھا جو میں نے جیل میں گزارا۔ لیکن شام کو دفعتاً مطلع صاف ہو گیا۔ اردگرد کے تمام پہاڑ اور پہاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں یہ دیکھ کر میری تمام افسردگی اور کلفت دور ہو گئی۔ اگلے روز بڑا دن تھا، صاف اور خوش گوار، اور برف آلود پہاڑوں کا منظر نہایت دلفریب معلوم ہوتا تھا۔

روزمرہ کے مشاغل سے محروم ہونے کی وجہ سے ہمیں فطرت کے مشاہدے کا شوق ہو گیا۔ مختلف قسم کے جانوروں اور کیڑوں کو جو وہاں موجود تھے ہم بہت غور سے دیکھنے لگے۔ جب میری مشاہدے کی قوت بڑھ گئی تو میں نے دیکھا کہ میری کوٹھڑی اور باہر صحن میں ہر قسم کے کیڑے مکوڑے موجود ہیں۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں تنہائی کی شکایت کرتا تھا اور یہ خبر نہ تھی کہ وہ احاطہ جو بظاہر خالی اور

ویران معلوم ہوتا تھا زندگی سے معمور ہے۔ان رینگنے اور اڑنے والے کیڑوں نے مجھے کبھی نہیں ستایا اس لیے میں نے بھی انہیں نہیں چھیڑا البتہ کھٹملوں اور مچھروں اور ایک حد تک مکھیوں سے میری لڑائی مسلسل جاری رہی۔بھڑوں اور زہریلے کیڑوں سے جو سینکڑوں کی تعداد میں میری کوٹھڑی میں موجود تھے میں نے کبھی تعرض نہیں کیا۔مجھ میں اور ان میں صرف ایک دفعہ ذرا سا جھگڑا ہوا تھا۔شاید ایک بھڑ نے نادانستہ طور پر مجھے کاٹا اور مجھے اس قدر طیش آیا کہ میں نے ان کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی۔لیکن انہوں نے اپنے چھتوں کو بچانے کے لیے جن میں غالباً ان کے انڈے تھے بڑی بہادری سے میرا مقابلہ کیا۔مجبوراً مجھے اپنا ہاتھ روکنا پڑا اور میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر آئندہ انہوں نے مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی تو میں بھی ان کو اپنے حال پر چھوڑ دوں گا۔اس واقعہ کے بعد میں ایک سال سے کچھ اوپر ہی اس کوٹھڑی میں رہا ہوں لیکن ان بھڑوں یا زہریلے کیڑوں نے کبھی مجھے تنگ نہیں کیا اور ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔

چمگادڑوں سے مجھے نفرت تھی لیکن مجبوراً انہیں بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔شام کے دھندلے میں وہ نہایت خاموشی سے پرواز کرتے اور ایک لحظہ کے لیے آسمان کی تاریک فضا کے مقابل نظر آ جاتے۔ان بھیانک جانوروں سے مجھے ڈر لگتا تھا۔معلوم ہوتا تھا کہ میرے چہرے کے برابر سے گزر جاتے ہیں اور یہ خوف تھا کہ کہیں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں۔بڑے بڑے چمگادڑ فضا میں بہت اوپر پرواز کرتے تھے۔

میں گھنٹوں، چیونٹی، دیمک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا اور چھپکلیوں کا جب وہ شام کو رینگتی ہوئی، چپکے چپکے اپنے شکار کو تاکتی رہتیں یا کبھی نہایت مضحک انداز سے دم ہلا ہلا کر ایک دوسرے کا پیچھا کرتیں۔عام طور پر یہ بھڑوں کی طرف سے بچتی تھیں۔لیکن دو مرتبہ میں نے دیکھا کہ انہوں نے نہایت

احتیاط سے بھڑوں کا پیچھا کیا اور پھر دفعتاً سر سے انہیں دبوچ لیا۔ میں نہیں جانتا کہ انہوں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو ڈنک سے بچایا یہ محض اتفاقی بات تھی۔

ان کے علاوہ گلہریاں قریب کے درختوں پر بے شمار تھیں۔ کبھی کبھی انہیں یہاں تک جرأت ہوتی کہ ہمارے پاس چلی آتی۔ لکھنؤ جیل میں کئی کئی گھنٹے قریب قریب بے حس وحرکت بیٹھا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس اثنا میں اکثر ایسا ہوتا کہ ایک گلہری میری ٹانگ سے ہوتی ہوئی گھٹنے پر آ بیٹھی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دفعتاً میری آنکھیں اس سے چار ہوتیں اور وہ محسوس کرتی کہ میں کوئی درخت وغیرہ نہیں ہوں جو اس نے سمجھ رکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ خوف سے ٹھٹکتی اور پھر نہایت تیزی کے ساتھ بھاگ جاتی۔ بعض اوقات گلہریوں کے چھوٹے چھوٹے بچے درختوں سے سے گر پڑتے۔ ان کی ماں گلہری بھی ان کے پیچھے ہی آجاتی اور ایک چھوٹی سی گیند کی طرح ان کا گچھا سا بنا کر انہیں کسی محفوظ گوشہ میں لے جاتی۔ کبھی یہ بچے گم بھی ہو جاتے تھے۔ ایک بار ایک رفیق کو اسی قسم کی تین گلہریاں مل گئیں جن کی ہم بہت دیر تک دیکھ بھال کرتے رہے۔ یہ گلہریاں اس قدر چھوٹی تھیں کہ ان کو کھلانا پلانا ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ آخر یہ مسئلہ ایک نئی ترکیب سے حل کیا گیا یعنی میں نے فونٹین پین میں روشنائی ڈالنے کی نلکی کی نوک پر ذرا سی روئی لگا دی اور اس سے دودھ پلانے کی بوتل کا کام لیا۔

کبوتروں سے میں نے کوئی جیل خالی نہیں پایا۔ سوائے المورہ کے کوہستانی قید خانہ کے۔ دہرہ دون جیل میں سینکڑوں ہزاروں کبوتر تھے۔ شام کو ان کے جھنڈ کے جھنڈ سطح آسمان پر چھا جاتے بعض اوقات جیل کے عہدہ داران کا شکار کرتے اور کھا جاتے۔ یہاں مینائیں بھی تھیں جو ہر جگہ ہوتی ہیں ان کے ایک جوڑے نے میری کوٹھری کے دروازہ کے بالکل اوپر گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اور ان کی خوراک کا انتظام میرے ذمہ تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہوگئیں کہ اگر صبح یا شام ان کے

کھانے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ میرے پاس چلی آتیں اور شور مچا مچا کر اپنی غذا طلب کرتیں ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ دیکھ کر اور بے صبری کی چیخوں کو سن کر مجھے بے حد لطف آتا تھا۔

نینی میں بہت سے طوطوں نے میری بارک کی دیواروں میں درزوں کے اندر اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ان کا ایک دوسرے سے اختلاط اور اظہار محبت کرنا نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دو نر طوطوں میں کسی مادہ کی بدولت جنگ بھی ہو جاتی تھی۔ ان موقعوں پر مادہ نہایت اطمینان سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہتی اور جس کی فتح ہوتی اسے اپنا مورد عنایت بناتی۔

دہرہ دون میں طرح طرح کے پرند موجود تھے۔ ان کے چہچہوں سے ایک شور برپا ہو جاتا تھا مگر کوئل کی دردناک کوک ان سب پر غالب آجاتی تھی۔ برسات اور برسات سے کچھ پہلے "دماغی بخار" کا پرند آجاتا اور مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کا یہ نام کیوں رکھا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ دن ہو یا رات، دھوپ ہو یا بارش یہ پرند لگاتار ایک ہی نغمہ الاپتا رہتا ہے۔ ہمیں اکثر پرندے نظر نہیں آتے تھے ہم صرف ان کی آواز سنتے تھے۔ ہمارے مختصر سے صحن میں کوئی درخت نہیں تھا البتہ میں عقابوں اور چیلوں کو دیکھا کرتا تھا جو بہت اوپر ہوا میں نہایت خوبصورتی سے منڈلایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ تیر کی طرح نیچے گرتیں اور پھر ہوا کے جھونکے میں اوپر اٹھ جاتیں۔ مرغابیوں کا جھنڈ البتہ ہمارے سروں پر سے گزر جاتا تھا۔

بریلی جیل میں بندروں نے ایک بہت بڑی نوآبادی قائم کر رکھی تھی۔ ان کی حرکتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ایک بندر کا بچہ کسی طرح ہماری بارک کے احاطہ میں آگیا اور باوجود کوشش کے دیوار کو نہیں پھاند سکا۔ یہ دیکھ کر جیل کے محافظوں، قیدیوں اور قیدی نگرانوں نے پکڑ کر اس کی گردن میں رسی ڈال دی۔ اس کے ماں باپ ایک اونچی سی دیوار پر بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ

رہے تھے اور ان کا غصہ لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ دفعتاً ان میں سے ایک جغاوری بندر نیچے کود پڑا اور اس ہجوم پر جس نے بندر کے بچہ کو گھیر رکھا تھا حملہ کر دیا۔ یہ فعل غیر معمولی جرأت اور دلیری کا کام تھا اس لیے کہ محافظ اور قیدی نگران ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے لیے اس کو دھمکا رہے تھے اور ان کی تعداد بھی بڑی تھی آخر بے دریغ جرأت کو فتح ہوئی اور انسانوں کا ہجوم لاٹھیاں اور ڈنڈے سب کچھ چھوڑ کر ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ یوں بندروں نے اپنے بچہ کو انسانوں کے ہاتھ سے بچا لیا۔

بعض اوقات جیل میں ایسے جانور بھی چلے آتے تھے جن کا آنا کچھ بہت زیادہ خوش گوار نہ تھا۔ بچھوؤں کو میں اکثر اپنی کوٹھڑی میں دیکھتا تھا۔ خصوصاً رعد و باراں کے طوفان کے بعد۔ عجیب بات یہ ہے کہ مجھے کبھی کسی بچھو نے نہیں کاٹا حالانکہ مجھے ان سے ایسی ایسی جگہوں پر سابقہ پڑا جہاں ان کی موجودگی کا وہم بھی نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً بستر پر۔ اکثر ایسا بھی ہو کہ میں نے کوئی کتاب پڑھنے کے لیے اٹھائی اور اس میں بچھو موجود تھا۔ میں نے ایک نہایت سیاہ بچھو کر جو شکل سے بہت زیادہ زہریلا معلوم ہوتا تھا بوتل میں بند کر رکھا تھا اور اسے مکھیاں وغیرہ کھلایا کرتا۔ ایک دن میں نے اس کو ڈوری میں باندھ کر دیوار پر چھوڑا تو وہ میرے ہاتھ سے بھاگ نکلا۔ اس کی آزادی کو میں خطرناک سمجھتا تھا اس لیے میں اپنی کوٹھڑی کا کونا کونا چھان مارا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

جیل میں میری کوٹھڑی میں یا اس کے قریب ہی تین چار سانپ بھی پائے گئے۔ ان میں سے ایک کی خبر کسی نہ کسی طرح باہر جا پہنچی اور اخباروں نے اسے موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی بلکہ لطف آیا۔ قید خانہ کی زندگی بڑی بے کیف ہوتی ہے اور اس کی یکسانی کو جو چیز بھی توڑ دے وہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے سانپ اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر مجھے ان سے وحشت نہیں ہوتی جتنی بعض اور لوگوں کو۔ ان کے ڈسنے سے

بے شک ڈر معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی اس کا سامنا ہو جائے یقیناً اس سے اپنی حفاظت کی فکر کرتا ہوں میرے دل میں کراہیت یا غیر معمولی خوف کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ البتہ کنکھجوروں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ بلکہ ڈر سے زیادہ گھن آتی ہے۔ ایک مرتبہ علی پور جیل کلکتہ میں آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی چیز میرے پاؤں پر رینگ رہی ہے۔ میں نے چور مشعل کو جلایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کنکھجورا بستر پر موجود ہے۔ میں گھبرا کر بستر سے کودا اور کوٹھڑی کی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا یہ موقعہ تھا جب میں نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ پاولاف کی اضطراری حرکات کیا ہوں گی۔

دہرہ دون میں میں ایک نیا جانور دیکھا یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ جانور میرے لیے نیا تھا۔ میں جیل کے پھاٹک میں کھڑا جیلر سے باتیں کر رہا تھا کہ ہمیں ایک شخص نظر آیا جو ایک عجیب و غریب جانور کو اٹھائے لیے جا رہا تھا۔ جیلر نے اسے بلوا بھیجا تو نے دیکھا کہ یہ جانور چھپکلی اور مگرمچھ کے بین بین ہے۔ یہ تقریباً دو فٹ لانبا تھا اس کے پنجے اور کھال سفنہ دار تھی۔ اس بے ہنگم جانور کو جو ابھی زندہ تھا ایک عجیب و غریب طریق سے مروڑ کر جیسے گرہ لگائی جاتی ہے شکاری اسے بانس میں لٹکائے خوش خوش گھر لیے جا رہا تھا۔ ہم نے دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ اس جانور کو بو کہتے ہیں۔ جیلر کے اس سوال سے کہ وہ اسے کیا کرے گا اس شخص کی باچھیں کھل گئیں اور وہ کہنے لگا کہ میں اس کی بھجیا بناؤں گا۔ یہ شخص جنگل کا رہنے والا تھا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد جب میں ایف، ڈبلیو، چمپین کی کتاب ''جنگل اندھیرے اور روشنی میں'' کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس جانور کو پنگولین کہتے ہیں۔

قیدیوں اور بالخصوص ان مجرموں کے لیے جن کی سزا بہت طویل ہو سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ان کے جذبات افسردہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ جانوروں کو پال کر اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ عام قیدیوں کو اس کی اجازت نہیں

ہوتی مگر قیدی نگراں جن کو تھوڑی بہت آزادی حاصل ہوتی ہے ایسا کریں تو حکام جیل کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ عام طور پر گلہریاں اور عجیب بات یہ ہے کہ نیولے پالے جاتے ہیں۔ کتوں کو تو جیل میں آنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی البتہ بلیوں پر کوئی قید نہیں۔ ایک دفعہ بلی کا ایک چھوٹا سا بچہ مجھ سے مانوس ہو گیا جس کو دراصل جیل کے افسر نے پالا تھا۔ جب اس کی تبدیلی ہو گئی تو مجھے اس بچہ کی جدائی کا واقعی افسوس ہوا۔ کتے اگر چہ جیل میں نہیں آسکتے لیکن دہرہ دون میں بالکل اتفاقی طور پر ان سے سابقہ پڑ دیا۔ ہمارے جیل کے افسروں میں سے ایک صاحب اپنے ساتھ ایک کتیا لے آئے لیکن جن ان کی تبدیلی ہو گئی تو انہوں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ اس پر یہ کتیا ادھر اُدھر ماری ماری پھرنے لگی۔ کبھی موریوں میں پڑی رہتی اور کبھی محافظین جیل کے یہاں سے اسے چند ٹکڑے مل جاتے۔ لیکن زیادہ تر اسے بھوکا ہی رہنا پڑتا۔ چونکہ میں قید خانے کے باہر حوالات میں رہتا تھا اس لیے کبھی کبھی خوراک کی تلاش میں یہ کتیا میرے پاس بھی آنکلتی تو میں نے اسے باقاعدہ کھانا پلانا شروع کیا۔ کچھ دن گزر گئے تو اس نے ایک نالی میں بہت سے بچے دیئے جن میں اکثر لوگ اٹھا لے گئے مگر تین بچ گئے۔ ان کی خوراک کا اہتمام میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک مرتبہ جب ان میں ایک پلا بہت زیادہ بیمار ہو گیا تو مجھے اس کی وجہ سے بے حد تکلیف اٹھانا پڑی۔

بعض اوقات مجھے رات کو بار بار اٹھنا پڑتا تا کہ اس کی نگہداشت کرسکوں جب یہ پلا بچ گیا تو میں بہت خوش ہوا کہ میری تیمارداری رائیگاں نہیں گئی۔

جیل سے باہر مجھے کبھی جانوروں سے اتنا سابقہ نہیں پڑا جتنا جیل کے اندر، یہ صحیح ہے کہ کتوں کا مجھے ہمیشہ شوق رہا ہے۔ اور میں نے کئی بار ان کو پالا بھی لیکن اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے کبھی پوری طرح ان کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا۔ قید خانہ میں، میں کتوں کی رفاقت سے خوش تھا۔ عام طور سے ہم ہندوستانی جانوروں سے

پیار نہیں پالتے اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اہنسا کے عام فلسفہ کے ان سے اکثر لاپروائی بلکہ سختی کا سلوک کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے ہی کو لے لیجئے۔ ہندوؤں کا یہ جانور کس قدر محبوب ہے وہ اس کی دیکھ کیا پرستش کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے لیے بلوے بھی ہو جاتے ہیں۔ بایں ہمہ گائے سے کچھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے عبادت کے ساتھ شفقت کا ہونا ضروری نہیں۔

مختلف ممالک نے مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے مقاصد یا سیرت کے اظہار کے لیے علامت کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ اور جرمنی نے عقاب، انگلستان نے شیر اور بل ڈاگ اور فرانس نے لڑتا ہوا مرغ قدیم، روس کا نشان ریچھ تھا۔ کیا جانوروں کو قومی نشان بنانے سے قوموں کی سیرت پر کچھ اثر پڑتا ہے؟ ان میں سے اکثر......لڑنے والے جانور بلکہ درندے ہیں۔ لہذا یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جن قوموں نے اس قسم کی مثالوں کو سامنے رکھ کر نشو ونما پائی ہے انہوں نے خود بھی قصداً اس قسم کے عادات و خصائل اختیار کر لیے ہیں۔ وہ دوسروں پر جھپٹتے ہیں غراتے ہیں اور موقع پا کر دبوچ لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہندوؤں کے دل میں حلم اور عدم تشدد کا غلبہ ہے تو اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان کا قومی نشان گائے ہے۔

جدوجہد

جیل سے باہر جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور ہمارے بہادر مرد اور عورتیں پرامن طریقہ سے ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کا مقابلہ کر رہی تھیں گو انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اس وقت یا مستقبل قریب میں ان کی کامیابی ناممکن ہے۔ دوسری جانب حکومت کے مسلسل اور ہر لحظہ بڑھتے ہوئے تشدد سے یہ حقیقت آشکارا ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں اس کی بنا کس چیز پر قائم ہے۔ ہمیں کم سے کم اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ اس کا پردہ چاک ہو گیا۔ بالآخر سنگینوں کو فتح ہوئی لیکن ایک بہت بڑے جنگجو کا قول ہے کہ "سنگینوں سے اور کام لے سکتے ہیں مگر ان پر بیٹھ نہیں سکتے" ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا اس طرح محکوم رہنا اچھا ہے بجائے اس کے ہم اپنے ضمیر بیچ ڈالیں اور روحانی اعتبار سے فنا ہو جائیں۔ قید خانوں میں اگرچہ ہمارے جسم بالکل بالکل بے بس تھے مرگ ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم یہاں بھی اپنا کام کر رہے ہیں بلکہ شاید ان لوگوں سے بہتر کر رہے ہیں جو جیل سے باہر ہیں۔ مانا کہ ہم کمزور ہیں لیکن یہ بات کہاں ٹھیک ہے کہ ہم اپنے آپ کو بچانے کے ہندوستان کا مستقبل قربان کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی قوتیں اور اس کی طاقت محدود ہے اور ہمارے بہت سے ساتھی معذور ہو گئے یا مر گئے، بعض نے علیحدگی اختیار کر لی اور بعض نے ہمارے ساتھ غداری کی۔ پھر بھی ہماری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے مقصد کو فراموش نہ کرے اور اپنی ہمت کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھے تو اس کی ناکامی کا کوئی امکان نہیں۔ حقیقی ناکامی یہ ہے کہ ہم اپنے اصولوں کو ترک کر دیں۔ یعنی اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں اور ظلم کے آگے ذلت سے سر جھکا دیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اپنوں کے لگائے ہوئے زخم دشمن کے لگائے ہوئے زخموں سے دیر میں بھرتے ہیں۔

اسی کمزوری اور حالات کی نامساعدت کو دیکھ کر اکثر طبیعت افسردہ ہو جاتی تھی

مگراس کے باوجود ہمیں اپنی کامیابیوں پر فخر تھا کیونکہ ہماری قوم نے واقعی بڑی بہادری سے کام لیا تھا اور ہمیں یہ محسوس کر کے خوشی ہوتی تھی کہ ہم ایک شجاع اور باہمت جماعت کے فرد ہیں۔سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں دو مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کا عام اجلاس منعقد کیا جائے، ایک مرتبہ دہلی میں اور دوسری مرتبہ کلکتہ میں۔ظاہر تھا کہ ایک خلاف قانون جماعت امن و امان سے اپنا اجلاس کس طرح منعقد کر سکتی ہے۔جب کبھی ایسا ہوتا پولیس سے اس کا تصادم ضروری تھا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان جلسوں کو پولیس ہمیشہ لاٹھی کے زور سے منتشر کرتی رہی۔اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار بھی کیا لیکن یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان غیر قانونی اجتماعات میں سینکڑوں نمائندے ہندوستان کے ہر حصہ سے آئے اور مجھے یہ سن کر حیرت ہوتی تھی کہ صوبجات متحدہ کا حصہ ان میں بہت نمایاں تھا۔مارچ ۱۹۳۳ء کے آخر میں جب اجلاس کلکتہ کی نوبت آئی ہے تو میری ماتا جی نے بھی اس میں شرکت پر اصرار کیا، لیکن پنڈت مالویہ اور ان کے رفقاء کی طرح وہ بھی گرفتار ہو گئیں اور انھیں کلکتہ جاتے ہوئے چند دن اسنسول کی جیل میں گزارنا پڑے۔اس موقع پر انہوں نے جس ہمت اور قوت کا اظہار کیا اس سے مجھے بے حد تعجب ہوا۔وہ کمزور تھیں اور بیمار بھی لیکن وہ قید خانے سے نہیں ڈرتی تھیں اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ سخت مصیبتیں برداشت کر چکی تھیں۔جس ماں کا بیٹا، دونوں بیٹیاں اور بہت سے عزیز جن کو وہ دل سے چاہتی تھیں، زیادہ تر جیل میں رہتے اسے خالی گھر سے وحشت نہ ہوتی اور کیا ہوتا۔

جب ہماری جدوجہد دھیمی پڑ گئی اور اس نے ایک خاص رفتار اختیار کر لی تو اس میں وہ جوش و خروش بھی نہیں رہا، البتہ بیچ میں کبھی کبھی لوگ بھڑک اٹھتے تھے۔اس زمانہ میں میرے خیالات زیادہ تر دوسرے ملکوں کی سیر کیا کرتے تھے جہاں تک ممکن تھا میں نے جیل کے اندر اپنا وقت کساد بازاری کے مطالعہ میں گزارا جو دنیا پر چھائی

ہوئی تھی۔اس مبحث کے متعلق مجھے کو کتاب بھی ملی میں نے اسے پڑھ ڈالا۔اور جوں جوں مجھے زیادہ کتابیں دستیاب ہوتی گئیں میری دلچسپی بڑھتی گئی۔معلوم ہوتا تھا ہندوستان اور اس کے تمام مسائل اور جدوجہد اس زبردست ناٹک کا ایک سین ہے جو سیاسی اور معاشی قوتوں کی کشمکش کی شکل میں دنیا بھر میں قومی اور بین الاقوامی اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے۔اس جدوجہد میں میری ہمدردی کا رخ روز بروز اشتمالیت کی طرف ہوتا گیا۔

اشتراکیت اور اشتمالیت بہت دنوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور روس کا میرے دل پر خاص اثر تھا۔یہ صحیح ہے کہ میں اس ملک کی اکثر باتوں کو ناپسند کرتا تھا۔مثلاً مخالف رائے کا بے رحمی سے دبا دینا، مزدوروں کی جبری تنظیم اور مختلف کارروائیوں میں تشدد سے کام لینا جو میرے نزدیک غیر ضروری تھا۔لیکن سرمایہ داروں کی دنیا میں بھی تو جبر و تشدد کی کمی نہیں غرض مجھے روز بروز یقین ہوتا گیا کہ ہماری حریص سماج اور ہماری ملکیت کی بنیاد ہی تشدد پر قائم ہے اور بغیر تشدد کے اس کا زیادہ دن چلنا محال ہے۔اگر عام لوگوں کی یہی حالت رہی کہ بھوک اور فاقے کا ڈر انہیں چند آدمیوں کا حکم ماننے پر مجبور کرے اور ان کی فلاح و عظمت کا باعث ہو تو تھوڑی سی سیاسی آزادی لے کر کیا کرنا ہے۔

تشدد سے دراصل کوئی بھی خالی نہیں، لیکن سرمایہ داری نظام کا تو خمیر ہی تشدد سے بنا ہے۔بہ خلاف اس کے روس کا تشدد اگرچہ بجائے خود کچھ بہت اچھی چیز نہیں پھر بھی اس کا مقصد ایک جدید نظام قائم کرنا ہے جو صلح و اشتراک اور جمہور کی حقیقی آزادی پر مبنی ہے۔باوجود اپنی غلطیوں کے سوویت روس نے غیر معمولی مشکلات پر غلبہ حاصل کیا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس جدید نظام کی تاسیس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔جب تمام عالم میں کسادی بازاری کا زور تھا اور کسی نہ کسی طرح ہر شخص کا قدم پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا، سوویٹ روس میں ہمارے دیکھتے ہی

دیکھتے ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کی نظر لینن اعظم! جیسے بلند انسان کی قیادت میں مستقبل پر تھی اور صرف یہی دیکھتا تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ برعکس اس کے دوسرے ممالک ماضی کے از کار رفتہ ہاتھوں میں دب کر اپنی قوتیں زائل کر چکے تھے اور ان کی ساری کوشش یہ تھی، کہ گزرے ہوئے عہد کے نکلے آثار کو محفوظ رکھیں۔ وسط ایشیاء کے پس ماندہ ممالک نے سوویٹ حکومت کے ماتحت جو زبردست ترقی کی ہے۔ اس کی روداد نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ لہٰذا ان دونوں مظاہر کا مقابلہ کرتے ہوئے بالآخر مجھے روس کے ساتھ اتفاق کرنا پڑا اس تاریک اور سنسان عالم میں میرے سامنے ایک روشن اور حوصلہ افزا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

لیکن اگرچہ سوویٹ روس کی کامیابی یا ناکامی ایک اشتمالی ریاست قائم کرنے کے عملی تجربے کی حیثیت سے بے حد اہم ہے، مگر نظریہ اشتمالیت کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ممکن ہے بالشویک اپنی غلطیوں یا بعض قومی یا بین الاقوامی وجوہ کی بنا پر ناکام رہیں اور پھر بھی اشتمالیت کا نظریہ بالکل صحیح ہو۔ خود اس نظریہ کی رو سے دوسروں کے لیے ہر بات میں اندھا دھند روس کی تقلید کرنا حماقت ہے اس لیے کہ روس نے اشتمالیت کو جس طریق پر استعمال کیا ہے اس کا انحصار اس ملک کے مخصوص حالات اور تاریخی نشو و نما پر ہے اور پھر ہندوستان اور دوسرے ممالک کو یہ موقع حاصل ہے کہ بالشویک روس کی غلطیوں سے بھی اتنا ہی فائدہ اٹھائیں جتنا اس کی کامیابیوں سے۔ غالباً بالشویکوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ اپنا قدم نہایت تیزی کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ ان کے ارد گرد دشمنوں کا نرغہ تھا اور وہ بیرونی حملہ آوروں سے ڈرتے تھے۔ اگر ان کی رفتار اس قدر تیز نہ ہوتی تو شاید وہ اس مصیبت سے جو دیہاتی علاقوں کو اٹھانی پڑی بچ سکتے تھے۔ لیکن اب سوال یہ ہے تبدیلی کی رفتار کم رکھنے سے انقلاب ممکن بھی تھا یا نہیں۔ ایسی نازک صورت حال میں جب ایک نظام میں بنیادی تبدیلی کرنی تھی جزوی اصلاحات سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ چاہے آگے

چل کر ترقی کی رفتار کتنی ہی سست کیوں نہ ہو پہلا قدم یہی ہونا چاہیے تھا کہ موجودہ نظام کا خاتمہ کر دیا جائے جو اپنا کام پورا کر چکا تھا اور آئندہ ترقی کی راہ میں حائل تھا۔

ہندوستان میں زمین اور صنعت کے مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، بلکہ تمام کا حل صرف اسی ممکن ہے کہ ایک انقلابی لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ مسٹر لائیڈ جارج اپنی تصنیف "جنگ کی یادداشت" میں لکھتے ہیں "اس سے بڑی غلطی اور کیا ہوگی کہ ہم ایک کھائی کو دو جستوں میں عبور کرنے کی کوشش کریں۔"

مجھے روس سے بحث نہیں مگر مارکسیت کے نظریئے اور اس کے فلسفے نے میرے ذہن کے بہت سے تاریک گوشوں کو منور کر دیا۔ اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکسی تغیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ ایک ڈرامہ ہے جو گویا بتدریج کھیلا جا رہا ہے اور اس کی تہہ میں ایک مقصد اور نظام موجود ہے، خواہ وہ غیر شعوری کیوں نہ ہو۔ ماضی اور حال کی دل ہلا دینے والی تباہی اور بربادی کے باوجود مستقبل میں ہزار ہا خطروں کے ساتھ امید کی روشنی جلوہ گر ہے۔ مارکسیت کا جو پہلو مجھے خاص طور پر پسند آیا وہ اس کا علمی طرز خیال اور راذعانی عقیدے سے قطعاً آزاد ہونا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ روس اور بعض دوسرے مقامات میں سرکاری اشتمالیت میں اذعانیت کا زور ہے اور جو لوگ اشتمالیت کے منکر ہیں ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ امر بلاشبہ افسوس ناک ہے مگر سوویٹ ممالک میں جہاں زبردست تغیرات نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے تھے اور اندرونی مخالفت کے قوی ہو جانے سے ہولناک ناکامی کا اندیشہ تھا، اس تشدد کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی عظیم الشان کساد بازاری اور نازک حالات سے اس نظریئے کی تائید ہوتی ہے جو مارکسیت نے تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے پیش کیا

ہے۔ جب اور تمام نظام اور نظریئے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے یہی ایک اصول تھا جس نے کم و بیش صحت کے ساتھ ان مشکلات کی توضیح کی اور ان کا حقیقی حل پیش کیا۔

جوں جوں مجھے اس بات کا یقین ہوتا گیا میں نے اپنے دل میں ایک نیا جوش محسوس کرنا شروع کیا۔ قانون شکنی کی تحریک کے ناکام رہنے سے جو افسردگی پیدا ہو رہی تھی لحظہ بہ لحظہ کم ہوتی گئی۔ مجھے یہ نظر آنے لگا کہ دنیا نہایت تیزی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا راستہ جنگ کے زبردست خطرات اور مصائب و آفات سے پر ہے لیکن بہر حال ہم اس راستے کو طے کر رہے ہیں ہم میں جمود ہرگز نہیں ہے۔ قومی تحریک نے میری نظر میں اس دور دراز سفر کے ایک مرحلے کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے اسے بہت غنیمت سمجھا کہ جبر و تشدد نے ہماری قوم کو آنے والی کشاکش کے لیے تیار کر دیا اور اس پر مجبور کر دیا کہ جو نئے خیالات اس وقت دنیا کو ہلا رہے ہیں ان پر غور کرے۔ جوں جوں ہمارے کمزور عناصر ہم سے دور ہوں گے ہم زیادہ مضبوط، زیادہ منضبط اور زیادہ پختہ ہوتے جائیں گے۔ وقت ہماری مدد کر رہا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے روس، جرمنی، انگلستان، جاپان، امریکہ، فرانس، چین، اسپین، اٹلی اور روس یورپ کے واقعات کا زیادہ احتیاط سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور کوشش کرتا رہا کہ موجودہ حالات کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکوں۔ مجھے ان کوششوں سے بے حد دلچسپی تھی جو آنے والے طوفان کو روکنے کے لیے ملک فرداً فرداً یا دوسروں کے ساتھ مل کر رہا تھا۔ بین الاقوامی کانفرنسوں کی ان مسلسل ناکامیوں سے جو سیاسی اور معاشی خرابیوں کی اصلاح کے لیے اور مختلف اسلحہ جات کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے منعقد کی جا رہی تھیں، مجھے وہ تکلیف دہ مسئلہ یاد آ جاتا تھا جو ہمیں اپنے ملک میں درپیش ہے یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ۔ باوجود انتہائی خلوص اور نیک نیتی

کے ہم اس مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کر سکے اسی طرح جیسے عالمگیر یقین کے باوجود کہ ان کی ناکامی تمام دنیا کے لیے ایک خوفناک حادثے کا باعث ہوگی یورپ اور امریکہ کے مدبرین ایک دوسرے سے اتفاق رائے نہیں کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں جس طریقے سے معاملے کو طے کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ غلط ہے اور صحیح طریقہ اختیار کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔

دنیا کے مصائب اور نزاعات پر اس طرح غور کرتے کرتے میں اپنی ذاتی اور قومی مصیبتوں کو بھول گیا۔ بعض اوقات مجھے بڑی مسرت ہوتی تھی کہ تاریخ عالم کے اس نہایت ہی اہم انقلابی دور کا میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ دنیا کے اس گوشے میں آنے والے زبردست تغیرات میں میرا بھی کچھ حصہ ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جنگ اور تشدد کی فضا کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ جاتا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک اور یاس انگیز منظر یہ تھا کہ بعض اچھے خاصے ذہین اور سمجھدار آدمی محکومیت و غلامی اور پستی اخلاق کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ ان کے دل انسان کے افلاس، اس کا دکھ درد اور مظلومیت سے بیزار کا جذبہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس دم گھٹنے والی فضا میں ہر طرف سوقیانہ شوروغل اور منظم فریب کا زور ہے اور نیک لوگ خاموش ہیں۔ ہٹلر اور ہٹلر کے بعد "بھورے خط" کی کامیابیوں سے مجھے بے حد قلق ہوا لیکن اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ یہ زیادہ دیر چلنے والی چیز نہیں۔ بعض دفعہ یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ انسان کی سعی و کوشش بالکل بے سود ہے اس لیے کہ قدرت کی مشین اندھا دھند اپنا کام کر رہی ہے اور اس میں ایک چھوٹے سے پرزے کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بایں ہمہ زندگی اشتمالی فلسفہ میرے لیے تسکین خاطر اور اطمینان کا باعث تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں اس پر کیوں عمل کیا جائے ابھی تو ہم نے سیاسی آزادی کا مسئلہ ہی حل نہیں کیا۔ ہمارے دلوں پر قوم پرستانہ نصب العین کا تسلط

ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم معاشی آزادی کی کوشش بھی اسی وقت شروع کریں یا سیاسی آزادی کے بعد اس کی طرف توجہ دیں۔لیکن ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جو واقعات رونما ہو رہے ہیں ان سے قدرتاً سماجی مسئلہ روز بروز ہمارے سامنے آتا گی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ ہم اپنی سیاسی آزادی کے مسئلے کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتے۔

بین الاقوامی صورت حال نے لوگوں کے ذہن کو بڑی حد تک ان نئے خیالات کی طرف متوجہ کر دیا اور دنیا کی نازک صورت حالات نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اس بحث پر غور کریں۔اس طرح تحقیق اور تنقید اور موجودہ نظام کی مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی۔اس سے پتہ چلتا تھا کہ اب ہوا کا رخ کس طرح ہے تاہم یہ تحریک نہایت کمزور اور ڈانواں ڈول تھی۔بعض لوگ فاشسٹ خیالات کی حمایت کر رہے تھے۔ غرض اشتراکیت کا کوئی صاف اور واضح تصور لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا اور وہ ابھی تک قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

میں اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی ہمارے لیے قومیت کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا۔اگر کانگریس اب تک ہندوستان کی سب سے زیادہ مضبوط اور ترقی پسند جماعت ہے (بعض مزدور جماعتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔پچھلے تیرہ برس سے اس نے گاندھی جی کے زیر قیادت اسی اوسط طبقے کے شہریوں کی ذہنیت کے باوجود ایک غیر معمولی بیداری پیدا کر دی ہے جس سے انقلابی مقاصد کو بڑی مدد ملی۔اس کا وجود ابھی تک کارآمد ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قومیت کے جذبہ کی جگہ سماجی انقلاب کا جذبہ پیدا ہو جائے اس لیے ہماری آئندہ ترقی اصول اور عمل دونوں کے لحاظ سے کانگریس سے وابستہ ہے۔اگرچہ ہم دوسرے ذرائع سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

چنانچہ میرے نزدیک کانگریس سے قطع تعلق کرنا گویا قومی زندگی کی رو سے

الگ ہونا اور اپنے سب سے قومی حربے کو کھو دینا ہے۔ غالباً اس کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ہم اپنی قوتوں کو بے کار تجربات میں ضائع کر دیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کانگریس اپنی موجودہ شکل میں کبھی ایسا کر سکے گی کہ ہمارے سماجی نظام کو بنیادی طور پر بدل ڈالے۔ اگر اس قسم کا کوئی مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا تو یقین ہے کہ اس کے دو یا دو سے زیادہ ٹکڑے ہو جاتے اور اگر یہ نہ ہوتا تو اس کے بہت سے اجزاء اس سے الگ ہو جاتے۔ اگر اس سے ہر جماعت کے مقاصد بالکل صاف ہو جاتے اور ایک اچھی منظم پارٹی خواہ اسے کانگریس میں اکثریت حاصل ہوتی یا اقلیت، انقلابی سماجی پروگرام کی حمایت کرتی تو یہ صورت کچھ ایسی بری نہ تھی۔

لیکن اس وقت کانگریس اور گاندھی جی ایک چیز تھے۔ سوال یہ تھا کہ گاندھی جی کیا کریں گے۔ اصولوں و نظریات کے لحاظ سے وہ بعض اوقات اس قدر پیچھے رہ جاتے ہیں کہ انسان کو تعجب ہوتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے وہ بحالت موجودہ ہندوستان کے سب سے بڑے انقلاب پسند ہیں۔ انہوں نے ایک عجیب و غریب شخصیت پائی ہے اس لیے انہیں عام پیمانوں سے ناپنا یا معمولی منطقی اصول سے جانچنا ناممکن ہے۔ مگر چونکہ وہ فطرتاً انقلاب پسند ہیں، اور ہندوستان کی سیاسی آزادی کے حصول کا بیڑا اٹھا چکے ہیں اس لیے جب یہ آزادی حاصل نہ ہو جائے وہ یقیناً انتہا پسندانہ طرز عمل اختیار کریں گے۔ اس دوران میں وہ عام لوگوں میں زبردست قوتوں کو بیدار کر دیں گے اور مجھے تو تھوڑی سی امید ہے کہ وہ خود بھی رفتہ رفتہ اشتراکیت کی منزل کی طرف بڑھیں گے۔

ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اکثر اشتمالی سالہا سال سے گاندھی جی اور کانگریس پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کر رہے ہیں اور کانگریس کے لیڈروں پر بدترین الزامات لگاتے ہیں۔ نظری اعتبار سے دیکھئے تو کانگریس کی ذہنیت کے متعلق ان کی بہت سی تنقیدیں نہایت صحیح اور برمحل تھیں جن کی آئندہ واقعات نے ایک حد تک

تائید بھی کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے عام سیاسی حالات کا تجربہ جو بعض اشتمالی اس سے پہلے کر چکے تھے غیر معمولی طور پر صحیح ثابت ہوا لیکن اصول اور کلیات کی بحث سے قطع نظر کر کے جب تفصیلات کا اور کانگریس کی سرگرمیوں کا سوال آتا ہے تو اس میں بڑا دھوکا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اشتمالیوں کی قلیل تعداد اور بے اثری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اشتمالیت کی اشاعت و تبلیغ اور لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کے بجائے ان کا مشغلہ زیادہ تر دوسروں کی مذمت کرنا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس کاردعمل ان کے لیے کس قدر مضرت رساں ثابت ہو رہا ہے۔ انہوں نے زیادہ تر مزدور حلقوں کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ جہاں دو چار چلتے فقرے مزدوروں کو ان کی طرف کھینچ لاتے ہیں، لیکن پڑھے لکھے لوگوں کے لیے محض چلتے ہوئے فقرے کافی نہیں۔ اشتمالی اس بات سے بے خبر ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اوسط طبقہ سب سے بڑی انقلابی قوت کا مالک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کٹر اشتمالیوں کے اس طرزعمل کے باوجود بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اشتمالیت کی طرف کھینچ آئے ہیں مگر ان دونوں کے درمیان ابھی تک ایک خلیج حائل ہے۔

اشتمالیوں کی رائے میں کانگریس کے لیڈروں کا مقصد یہ رہا ہے کہ حکومت پر عام لوگوں کا دباؤ ڈال کر ہندوستانی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے لیے صنعتی اور تجارتی فوائد حاصل کریں۔ کانگریس کا کام یہ ہے کہ ''کسانوں'' نیچے اوسط طبقے کے لوگوں اور صنعتی مزدوروں کی سیاسی اور معاشی بے چینی کی قوت سے بمبئی، احمد آباد اور کلکتہ کے مالکان کارخانہ اور ساہوکاروں کی گاڑی چلائے، گویا ہندوستانی سرمایہ دار پس پردہ بیٹھے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے نام حکم جاری کر دیتے ہیں کہ اول جمہور میں ایک تحریک اٹھائے اور جب وہ بہت بڑھ جائے یا بہت خطرناک ہو جائے تو اسے دفعتاً ملتوی کر دیا جائے یا اصل راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دے۔ کانگریسی رہنما یہ نہیں چاہتے کہ انگریز سچ مچ ہندوستان سے چلے جائیں کیونکہ انہی

کی مدد سے یہاں کی فاقہ مست آبادی قابو میں رکھی جا سکتی ہے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور ہندوستان کا اوسط طبقہ اسے اپنے بس کی بات نہیں سمجھتا۔

یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ کانگریس کی سرگرمیوں کا جو عجیب وغریب تجزیہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے اس کا بعض سمجھدار اشتمالیوں کو دل سے یقین ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان کے خیالات اس قسم کے ہوں تو انہیں ہندوستان میں کیوں کر کامیابی ہو سکتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی قومی تحریک کا اندازہ یورپ کی لیبر تحریک کے معیار سے کرتے ہیں۔ چونکہ مغرب میں مزدوروں کے لیڈر اکثر ان سے غداری کرتے ہیں لہذا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں بھی یہی حال ہوگا۔ انہوں نے اس بات کو فراموش کر رکھا ہے کہ ہندوستان کی قومی تحریک غریبوں یا مزدوروں کی تحریک نہیں یہ اوسط طبقے یعنی بورژوا کی تحریک ہے جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کا مقصد محض سیاسی آزادی ہے نہ کہ سماجی نظام کی تبدیلی۔ یہ اعتراض کی جا سکتا ہے کہ یہ مقصد بہت محدود ہے اور قومی تحریک ایک فرسودہ چیز ہے۔ اس تحریک کی بنیاد سمجھ لینے کے بعد یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ اس کے رہنما عوام سے غداری کرتے ہیں کیونکہ وہ طریق زمینداری یا نظام سرمایہ داری کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ انہوں نے تو کبھی یہ دعوٰی ہی نہیں کیا البتہ کانگریس میں بعض لوگ اس قسم کے ضرور موجود ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا ہے جو سرمائے اور زمین کے موجودہ نظام کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں مگر وہ ابھی تک اپنے آپ کو کانگریس کا ترجمان نہیں کہہ سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی سرمایہ دار جماعتوں کو (جن میں زمیندار اور تعلقہ دار شامل نہیں ہیں) برطانوی اور بدیسی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی کی ترویج سے بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کہ ہر قومی تحریک ملکی صنعتوں کی حمایت اور بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ کا سبق دیتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ

سول نافرمانی اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے دوران میں بمبئی کے مالکان کارخانہ نے بطور ایک جماعت کے یہ جسارت کی یہ لنکا شائر کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ کانگریس کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ہمارے قومی مقاصد کے ساتھ بہت بڑی غداری تھی اور اسے بجا طور پر غداری ہی سے تعبیر کیا گیا۔ بمبئی کے مالکانہ کارخانہ کے نمائندوں نے بھی جب ہم میں سے اکثر جیل میں تھے اسمبلی میں ہمیشہ کانگریسیوں اور "انتہا پسندوں" کا مضحکہ اڑایا۔

پچھلے سال سے سرمایہ دار طبقوں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ کانگریس اور قومیت کے نقطہ نظر سے بھی شرمناک ہے۔ اٹاوا کے معاہدے سے ممکن ہے کسی چھوٹی سی جماعت کو عارضی فائدہ پہنچا ہو۔ مگر بحیثیت مجموعی اس نے ہندوستان کی صنعت کو نقصان پہنچایا اور اسے برطانوی سرمائے اور صنعت کا اور بھی محتاج کر دیا۔ یہ معاہدہ جو عام لوگوں کے لیے بے حد مضر تھا اس وقت کیا گیا، جب ہماری جدوجہد جاری تھی اور ہزارہا ہندوستانی جیل خانوں میں بند تھے۔ نوآبادیوں نے جہاں تک ہو سکا۔ انگلستان سے بہتر سے بہتر شرائط حاصل کیں لیکن ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سب کچھ انگلستان کو بخش دیا۔ بعض من چلے ساہوکاروں نے بھی چاندی سونے کے کاروبار میں ہندوستان کے مفاد کو قربان کر کے خوب نفع کمایا۔

گول میز کانفرنس میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار آپس میں مل کر کانگریس کی مخالفت کرتے تھے۔ سول نافرمانی کے زمانے میں انہوں نے کھلم کھلا جارحانہ حیثیت سے حکومت کا ساتھ دیا۔ انہی کی امداد سے حکومت نے تعزیری ضابطوں کی شکل میں جابرانہ قوانین منظور کیے اور یو پی کونسل کے زمیندار اراکین کی بہت بڑی اکثریت نے ان لوگوں کی رہائی کی مخالفت کی جو سول نافرمانی کی تحریک میں قید ہوئے تھے۔

یہ خیال کہ گاندھی جی نے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۰ء میں محض جمہور کے دباؤ سے وہ

تحریکیں جو بظاہر جارحانہ معلوم ہوتی تھیں شروع کیں سراسر غلط ہے۔ یہ سچ ہے کہ جمہور میں اکثر حرکت پیدا ہوتی رہی لیکن موقعوں پر خود گاندھی جی نے اسے ایک بڑی تحریک کی شکل دی۔ ۱۹۲۱ء میں تو انہوں نے تن تنہا کانگریس میں ترک موالات کی تحریک منظور کرائی اور ۱۹۳۰ء میں اگر وہ ذراسی بھی مخالفت کرتے تو ہم ہرگز حکومت کے خلاف کوئی موثر اور جارحانہ طرز عمل اختیار نہ کرسکتے۔

یہ امر نہاتی افسوس ناک ہے کہ بعض اوقات محض حماقت یا ناواقفیت کی وجہ سے ذاتیات پر حملہ کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے ہوتا کہ اصل مسئلے کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ گاندھی جی کے خلوص نیت پر حملہ کرنا خود اپنی ذات اور اپنے مقصد کو نقصان پہنچانا ہے۔ ہندوستان کے کروڑہا باشندوں کے نزدیک وہ حق وصداقت کا مجسمہ ہیں اور جو شخص ان سے ذرا بھی واقف ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس جوش اور خلوص سے ہر موقع پر صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اشتمالیوں نے اپنے آپ کو بڑے بڑے شہروں کے مزدوروں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ دیہاتی علاقوں سے نہ انہیں واقفیت ہے اور نہ ان سے کوئی تعلق ہے مگر ہندوستان کا مسئلہ اس وقت کسانوں کا مسئلہ ہے۔ اس لیے صنعتی مزدوروں کو اگرچہ وہ بجائے خود بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور مستقبل میں ان کی اہمیت برابر بڑھتی جائے گی وہ درجہ حاصل نہیں ہوسکتا جو کسانوں کو حاصل ہے۔ کانگریسی کارکن اس وقت ہر جگہ دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ کانگریس کسانوں ہی کی ایک جماعت بن جائے گی لیکن کسان جب اپنا فوری مقصد حاصل کرلیتا ہے تو بہت کم انقلاب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی کچھ دنوں کے بعد شہر اور دیہات اور مزدور اور کسان کے مقابلہ کا مسئلہ چھڑ جائے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ کانگریس کے لیڈروں اور کارکنوں کی ایک

بہت بڑی تعداد سے میرے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ان سے بہتر انسان نہیں مل سکتے۔ پھر بھی میں نے ہر اہم معاملہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور بعض دفعہ مجھے اس بات پر کوفت بھی ہوئی ہے کہ بعض ایسی باتیں جو میری نظر میں بالکل عیاں اور واضح ہیں ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اتنی عقل نہیں رکھتے بلکہ یہ ہے کہ ہم نے فکر و نظر کی دنیا میں الگ الگ راہیں اختیار کر لی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سے نکلنا کس قدر مشکل اور دیر طلب ہے۔ یہ مختلف فلسفہ زندگی کے دائرے ہیں جن میں انسان بتدریج غیر شعوری طور پر نشوونما پاتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو جو ہم سے اختلاف خیال رکھتے ہیں۔ الزام دینا بیکار ہے۔ اشتراکیت نام ہے زندگی اور اس کے مسائل کے ایک خاص نفسیاتی نظریئے کا جس کا انحصار محض منطق پر نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے نظریئے بھی وارثت، تربیت، ماضی کی روایات اور موجودہ ماحول کے اثرات پر مبنی ہیں۔ یہ قوت صرف زندگی اور اس کے تلخ تجربات میں ہی ہے کہ وہ ہمیں نئی راہوں پر چلائیں اور رفتہ رفتہ ہمارے خیالات کو بدل دیں، جو اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ شاید ''انسان جو راہیں اپنے مقدر سے بچنے کے لیے اختیار کرے وہی اسے مقدر کی منزل پر پہنچا دیں۔''

مذہب کیا ہے؟

ستمبر ۱۹۳۲ء کے وسط میں ہمارا جیل کا پرسکون اور یکساں روزمرہ معمول یکا یک درہم برہم ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گولا آ کر پھٹا ہو۔ خبر آئی، کہ گاندھی جی نے، ان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر اظہار ناپسندیدگی کرنے کے لیے جو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اپنے فرقہ وارانہ فیصلہ میں نیچ ذاتوں کے لیے تجویز کیے تھے، اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ روزہ رکھ کر جان دے دیں گے۔ اس شخص میں بھی لوگوں کو جھنجھوڑنے کی کیسی کچھ صلاحیت ہے؟ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ ہر قسم کے اتفاقات و احتمالات سامنے آئے، اور میرا ذہنی توازن بالکل بگڑ گیا۔ دو دن تک بالکل تاریکی میں رہا، کوئی روشنی نہ تھی جو راہ دکھاتی۔ گاندھی جی کے فعل کے بعض نتائج کا خیال آتا تو دل بیٹھا جاتا تھا۔ معاملہ کا ذاتی پہلو بھی خاصا قوی تھا اور دل میں کس کس دکھ کے ساتھ یہ خیال آتا تھا کہ شاید اب انھیں نہ دیکھ سکوں گا۔ کوئی سال بھر ہوا تھا کہ انگلستان جاتے وقت انھیں جہاز پر دیکھا تھا کیا یہی آخری دیدار ثابت ہونے کو تھا؟

پھر سخت الجھن ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنی آخری قربانی کے لیے ایک ضمنی مسئلہ کو کیوں چنا؟ محض حلقہ ہائے انتخاب کے معاملہ کو! اس کا اثر ہماری تحریک آزادی پر کیا ہوگا؟

کیا یہ نہ ہوگا کہ کم سے کم تھوڑے دن کے لیے اہم تر مسائل پس پشت جا پڑیں گے اور اگر ان کا یہ مقصد حاصل ہو بھی گیا اور نیچ ذاتوں کے حلقہ ہائے انتخاب اور ہندوؤں کے ساتھ مخلوط ہو بھی گئے تو کیا اس کا ردعمل یہ نہ ہوگا کہ لوگ سمجھنے لگیں گے کہ اچھا کچھ تو مل ہی گیا اور اب تھوڑے دنوں کچھ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا ان کا یہ فعل فرقہ وارانہ فیصلہ کو اور اس کل تجویز کو جسے حکومت نے آگے بڑھایا ہے ماننے اور جزوی طور پر قبول کرنے کے مترادف نہیں؟

اور کیا یہ بات ترک موالات اور سول نافرمانی کے اصولوں کے مطابق ہے؟ اتنی قربانی، اتنی شجاعانہ سعی کے بعد ہماری تحریک ایک حقیری سی چیز ہو کر رہ جانے والی ہے؟

مجھے ان پر غصہ بھی آتا تھا کہ ایک سیاسی مسئلہ کو یوں مذہبی اور جذباتی طریق پر حل کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں بار بار خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ ان کے خیال میں خدا جانے روزہ کی تاریخ تک ان کے لیے مقرر کی ہے۔ لوگوں کے لیے یہ کیسی بری مثال قائم کرنا ہے؟

اور اگر باپو کہیں مر گئے؟ پھر ہندوستان کا کیا حال ہوگا؟ اس کی سیاست کس راہ پر چلے گی؟ سامنے تیرہ و تار مستقبل دکھائی دیتا تھا، اور جب اس کا خیال آتا تو دل پر یاس و حرماں کا تسلط ہو جاتا۔

غرض یونہی سوچتا تھا اور سوچے جاتا تھا۔ دماغ میں انتشار تھا اور غصہ و یاس اور اس شخص کے لیے محبت جو اس ساری پریشانی کا باعث تھا۔ سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں، طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی ہر ایک سے جھگڑتا تھا اور سب سے زیادہ خود اپنے سے۔

پھر ایک عجیب کیفیت گزری۔ یوں سمجھئے کہ ایک جذباتی بحران سا ہوا اور جب وہ ختم ہوا تو طبیعت میں کچھ سکون محسوس ہوا اور مستقبل پھر اتنا تاریک نہ رہا، باپو میں ہمیشہ سے ایک عجیب صفت ہے کہ ٹھیک نفسیاتی موقع پر صحیح بات کر گزرتے ہیں، اس لیے خیال ہوا کہ شاید ان کا یہ فعل بھی، جسے بہت سے اعتبارات سے حق بجانب ثابت کرنا ممکن نہ تھا، بڑے نتائج کا باعث بن جائے اور صرف اس تنگ میدان ہی میں نہیں جس سے اس کو واسطہ ہے بلکہ قومی جدوجہد کے وسیع تر میدان میں بھی۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ اگر باپو مر گئے تو ہماری آزادی کی سعی تو بہر حال جاری رہے گی۔ اس لیے ہر چہ بادا باد ہمیں تیار رہنا چاہیے اور اپنے کو اس کام کا اہل بنانا چاہیے۔ اپنے ذہن کو یوں بے جھجک گاندھی جی کی موت تک کے مقابلہ کے لیے تیار

کرلیا تب کہیں سکون اور جمعیت خاطر نصیب ہوئی اور میں پھر دنیا اور اس کے ممکنات سے نبٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔

اس کے بعد اس حیرت خیز بیداری کی خبریں آئیں جو سارے ملک میں پیدا ہوئی، اس جادو اثر جوش کی لہر جو ساری ہندو سماج میں دوڑ گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ چھوت چھات بس اب ختم ہوئی۔دل نے کہا کیسا کیسا جادوگر ہے۔یہ چھوٹا سا آدمی جو یرودا کے قید خانہ میں بیٹھا ہے۔یہ ان تاروں کو کتنی اچھی طرح پہچانتا ہے جن سے دلوں کو جنبش دی جاتی ہے۔

ان کا ایک تار مجھے ملا۔سزایابی کے بعد ان کا پہلا پیام تھا۔اتنے عرصہ کے بعد پیام پانے پر دل بہت خوش ہوا۔اس تار میں انہوں نے لکھا تھا ''کرب کے ان تمام دنوں میں تم میرے ذہن کی آنکھ کے سامنے رہے ہو۔تمہاری رائے جاننے کا بڑا فکر ہے۔تم جانتے ہو کہ میں تمہاری کی کتنی قدر کرتا ہوں۔اندو سے اور سرپ کے بچوں سے ملا تھا۔اندو خوش و خرم تھی، ذرا گوشت بھی آگیا ہے۔میری حالت بہت اچھی ہے۔تار سے جواب دو۔پیار''۔

بڑی نرالی بات تھی پر ٹھیٹھ گاندھی جی کی سی بات تھی کہ برت کی کلفت میں اور اپنی بے مشغولیتوں میں بھی انہیں اس کا خیال رہا کہ میری بچی اور میری بہن کے بچوں کے آنے کا ذکر کردیا، اور اندرا کے موٹے ہوجانے تک کا! (میری بہن بھی اس زمانہ میں قید میں تھیں اور یہ سب بچے پونا کے ایک مدرسہ میں پڑھتے تھے) زندگی میں جو چیزیں یوں ذرا سی معلوم ہوتی ہیں، پر دراصل بہت کچھ ہوتی ہیں، یہ انہیں کبھی نہیں بھولتے۔

اسی زمانہ میں خبر ملی کہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق کچھ تصفیہ ہوگیا۔جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مہربانی سے مجھے گاندھی جی کے تار کا جواب دینے کی اجازت دے دی اور میں نے یہ تار بھیجا۔''آپ کے تار اور اس مختصر سی اطلاع نے کہ تصفیہ ہوگیا

دل کو خوشی اور اطمینان سے بھر دیا۔ برت کی خبر سے پہلے تو سخت ذہنی کوفت اور انتشار پیدا ہوا، لیکن آخر میں آس مشربی نے فتح پائی اور مجھے اپنا گم شدہ اطمینان قلب پھر مل گیا۔ دبے ہوئے مظلوم طبقوں کی خاطر جو قربانی بھی کی جائے کم ہے۔ آزادی کا معیار سب سے ادنی گروہ کی مذہبی نقطہ نظر سے تو کوئی حکم میں لگا نہیں سکتا۔ ڈر ہے کہ آپ کے طریقوں کو دوسرے بے جا طور پر استعمال نہ کریں۔ لیکن آپ جیسے جادوگر کو میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ پریم"۔

پونا میں جو ہر قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے انہوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے اور برطانوی وزیر اعظم نے غیر معمولی عجلت کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔ اور اپنے سابقہ فیصلہ میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی، اور برت ٹوٹ گیا۔ مجھے ایسے میثاق اور معاہدے بہت ناپسند ہیں، مگر پونا کے معاہدے کا اس کے مفاد سے قطع نظر، میں نے دل سے خیر مقدم کیا۔

آخر یہ ہماہمی ختم ہوئی اور پھر وہی جیل کا روزمرہ معمول شروع ہوا۔ ہریجن کی تحریک اور گاندھی جی جیل خانے جو کام کر رہے تھے، اس کی اطلاعیں پہنچتی تھیں اور میرا دل ان سے کچھ بہت خوش نہ ہوتا تھا۔ اس میں تو شک نہیں کہ چھوت چھات کو ختم کرنے اور نیچ ذاتوں کو ابھارنے کی تحریک کو بڑی مدد پہنچی، لیکن اس عہدنامہ سے اس قدر نہیں جتنی کہ اس مجاہدانہ جوش سے جو تمام ملک کے اندر پیدا ہو گیا۔ اور یہ ایسی چیز تھی جس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

مگر اس میں شک نہیں کہ سول نافرمانی کو نقصان پہنچا۔ ملک کا دھیان دوسرے معاملوں کی طرف مڑ گیا اور کانگریس کے بہت سے کام کرنے والے ہریجن تحریک کی طرف چلے گئے۔ غالباً ان میں سے بہتیرے اس بات کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہے تھے کہ کوئی ذرا زیادہ محفوظ کام مل جائے جس میں جیل جانے کا ڈر نہ ہو اور اس سے زیادہ لاٹھی کی مار اور املاک کی ضبطی کا خطرہ نہ ہو۔ یہ بات ہے بھی فطری اور اپنے

ہزار کارکنوں سے یہ توقع رکھنا بھی بے جا ہے کہ وہ ہر وقت انتہائی تکلیف اٹھانے اور اپنے گھر بار کو تباہ و برباد کر دینے کے لیے آمادہ رہیں گے۔ پھر بھی اس عظیم الشان تحریک کے اس تدریجی انحطاط کو دیکھ دیکھ کر جی بہت کڑھتا تھا، مگر باوجود اس کے سول نافرمانی ابھی جاری تھی اور کبھی کبھی تو بڑے پیمانہ پر مظاہرے بھی ہوتے رہتے تھے جیسے مارچ اپریل ۱۹۳۳ء میں کلکتہ کانگریس کا مظاہرہ۔ گاندھی جی یروادا جیل میں تھے مگر ان کے ساتھ خاص رعایت یہ کر دی گئی تھی کہ یہ لوگوں سے مل جل سکتے تھے اور ہریجن تحریک کے لیے ہدایات دے سکتے تھے۔ کچھ ہوا اس سے ناگواری میں کمی ہو گئی جو ان کے قید میں ہونے کی وجہ سے قوم میں تھی اس لیے ان سب باتوں سے طبیعت پست ہوتی تھی۔

کئی مہینہ بعد مئی ۳۳ء کے شروع میں گاندھی نے اپنا ۲۱ دن والا برت شروع کیا۔ اس کی اطلاع آئی تو بھی پہلے پہلے تو صدمہ سا ہوا۔ مگر میں نے اسے ایک ناگریز حادثہ جان کر قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ اپنے کو اس کا عادی بنا لیا۔ بلکہ مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ جب وہ برت رکھنا ہی طے کر چکے اور اس اعلان بھی کر چکے تو لوگ کیوں خواہ مخواہ اس کے ترک کرانے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ برت میری سمجھ میں تو آتا نہ تھا، اور اگر فیصلہ سے پہلے مجھ سے رائے لی جاتی تو میں سختی سے اس کی مخالفت کرتا مگر میں گاندھی جی کے قول کی بڑی قدر کرتا ہوں اور مجھے یہ بات غلط معلوم ہوتی تھی کہ ایک خالص شخصی معاملہ میں جو ان کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا کوئی بھی ان سے اس قول کے تڑوانے کی کوشش کرے۔ اس لیے اس برت پر ہر چند کہ بہت ناشاد تھا مگر راضی تھا۔

برت شروع کرنے سے پہلے انہوں نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں ایک خط لکھا جس سے مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے جواب چاہا تھا اس لیے میں یہ تار بھیجا! ”

آپ کا خط ملا جن باتوں کو میں سمجھتا ہی نہیں ان کی بابت کہہ کیا سکتا ہوں۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ پردیس میں بھٹک گیا ہوں! نشانِ راہ اگر کوئی ہے تو بس ایک آپ کی ذات۔ اندھیرے میں راہ ٹٹولتا ہوں اور ٹھوکریں کھاتا ہوں۔ جو بھی ہو، میرا دھیان اور میری محبت آپ کے ساتھ ہے۔"

ایک طرف میں ان کے فعل کو ناپسند کرتا تھا، دوسری طرف یہ فکر تھا کہ انہیں دکھ نہ دوں، اور ان دونوں میں کشمکش تھی۔ میں نے سوچا کہ میں نے انہیں دل دہی کا کوئی پیام نہیں بھیجا اور اب کے وہ اس تکلیف کی آزمائش میں اپنے کو ڈالنے پر تلے ہی ہوئے ہیں، جس میں ممکن ہے کہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، میرا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کا دل بڑھاؤں۔ ذہن کی زندگی میں ذرا ذرا سی باتوں میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ اور اس مصیبت سے جانبر ہونے کے لیے انہیں اپنی اعصابی قوت کا شمہ شمہ درکار ہوگا۔ یہ بھی مجھے محسوس ہوا کہ اب جو کچھ بھی ہو، چاہے بدقسمتی سے ان کی موت ہی کیوں نہ واقع ہو، سب کو مضبوطی سے جھیلنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے انہیں یہ تار بھیجا: "اب کے آپ نے اپنی عظیم الشان مہم شروع ہی فرما دی ہے میں اپنی محبت اور تبریک کا ہدیہ پھر پیش کرتا ہوں، اور یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اب بہت صاف محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ اچھا ہوگا اور جو بھی ہو جیت آپ کی ہے"۔

وہ اس برت سے جانبر ہو گئے۔ برت کے پہلے ہی دن انہیں جیل سے چھوڑ دیا گیا اور ان کے مشورہ سے چھ ہفتے کے لیے سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی۔

اس برت کے زمانہ میں پھر میں نے اس جذباتی جوش کا نظارہ کیا اور بار بار سوچا کہ کیا آیا سیاست میں یہ بھی کوئی صحیح طریقہ ہے۔ یہ تو مری ہوئی چیزوں کو زندہ کرنا ہے اور اس کے مقابلہ میں وضاحت سے سوچنے سمجھنے کے لیے ذرا بھی تو موقع نہیں۔ سارا ہندوستان، یا اس کا بہت بڑا حصہ، ادب اور احترام سے مہاتما کا منہ تکتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ وہ معجزہ کے بعد معجزہ دکھائیں، چھوت چھات کو ختم کرا دیں، سوراج حاصل کرا دیں وغیرہ وغیرہ اور خود کوئی کچھ نہیں کرتا اور گاندھی جی ہیں

کہ دوسروں کو سوچنے سمجھنے کی ہمت نہیں دلاتے، ان کا اصرار ہے بس خلوص اور قربانی پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جذباتی وابستگی کے باوجود میں برابر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر سیاسی کاموں میں ان کی جبلت سلیم ان کی صحیح رہنمائی کرتی ہے، عمل کا ولولہ بھی ہے، لیکن کیا عقیدت مندی کا راستہ ایک قوم کو تربیت دینے کا صحیح راستہ ہے؟ ممکن ہے کہ کچھ دن تو اس سے کام چلے، مگر پھر آگے؟

پھر ایک بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ موجودہ نظام معاشرت کو کہ تشدد اور کشاکش پر مبنی ہے کس طرح قبول کرتے ہیں اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ قبول کرتے ہیں۔ میرے سینہ میں بھی کشاکش تھی، اور میری وفاداریاں مجھے مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں۔ جانتا تھا کہ قیدی کی غیر اختیاری آڑھٹی اور بہت سی دقتوں کا سامنا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بالکل یکہ و تنہا ہوں اور یکسر غریب الوطن، ہندوستان جسے اپنا دل دیا اور جس کے لیے جان لڑائی، ایک عجیب سا وحشت کدہ معلوم ہوتا تھا۔ سوچتا تھا کہ کہیں مرا ہی قصور تو نہیں کہ میں اپنے ہم وطنوں کی ذہنیت اور طریق کار کو نہیں اپنا سکتا؟ نہایت قریب کے ساتھیوں کے متعلق بھی معلوم ہوتا تھا کہ ان کے میرے درمیان ایک غیر مرئی روک ہے، جب اسے دور کرنے میں ناکام رہتا تو ناشاد ہوتا اور پھر اپنے ہی خول میں سمٹ رہتا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ انہیں چاروں طرف سے پرانی دنیا گھیرے ہوئے ہے، یعنی ماضی کے افکار، اور امیدوں اور آرزوؤں کی دنیا اور نئی دنیا ابھی بہت دور ہے۔ بقول شاعر "دو دنیاؤں کے درمیان سرگرداں، ایک مردہ، دوسری میں پیدا ہونے کی ہنوز قدرت نہیں، غرض کہیں بھی سر دھرنے کا ٹھکانہ نہ تھا۔"

کہتے ہیں کہ اور سب باتوں سے زیادہ ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب اپنے اپنے مذاہب پر فخر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر اس فخر کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے

ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے، میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ تقریباً ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بجا فائدہ اٹھانے کا قدیم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حمایتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے میں جانتا ہوں کہ اس میں اور کچھ بھی ہے۔ کوئی ایسی بات، جس سے انسانوں کی ایک گہری احتیاج پوری ہوتی ہے ورنہ یہ ایک ایسی زبردست قوت کیسے ہوتا جیسی کہ رہ چکا ہے اور بے شمار، بے تاب روحوں کی تسکین و راحت کا سامان کیسے کرتا؟ اس کا بخشا ہوا امن کیا محض اندھے یقین اور بے سوالی کی پناہ ہے؟ وہ سکون ہے جو چین سے بندرگاہ میں پہنچ جانے اور کھلے سمندر کے طوفان سے بچ جانے پر حاصل ہوتا ہے؟ یا اس سے زیادہ کچھ اور؟ بعض صورتوں میں تو یقیناً یہ کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

لیکن منظم مذہب کا ماضی کچھ بھی رہا ہو آج تو وہ زیادہ تر ایک خالی شکل ہے جس میں حقیقت نام کو نہیں۔ مسٹر جی کے چسٹرٹن نے اس کی مثال (اپنے خاص مذہب کی نہیں، بلکہ اوروں کے مذہب کی!) ایک متحجر جسم سے دی ہے جس کی شکل تو کسی جانور یا دوسری زندہ چیز کی ہے، جس کا نامی مغز سب غائب ہوگیا ہے بس خول اس لیے باقی ہے کہ اس میں کوئی بالکل ہی دوسری بھر گئی ہے۔ اگر مذہب میں کوئی قابل قدر چیز باقی بھی ہے تو وہ بہت کچھ دوسری چیزوں میں لپٹی ہوئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ حال مغربی مذہبوں کی طرح ہمارے مشرقی مذاہب پر بھی گزرا ہے۔ انگریزی کلیسا شاید اس مذہب کی سب سے واضح مثال ہے جو کسی حقیقی معنی میں مذہب نہیں۔ ایک حد تک تو یہ حال تمام منظم پروٹسٹنٹ مذاہب کا ہے، لیکن کلیسا انگلستان اس میں بہت آگے اس لیے نکل گیا ہے کہ یہ مدت سے ریاست کا ایک سیاسی شعبہ ہے(۱)۔

اس میں شک نہیں کہ اس کے معتقدوں میں بہت سے لوگ نہایت اعلیٰ سیرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کلیسا نے کس کس طرح برطانوی سامراج کی خدمات انجام دی ہیں۔ اور سرمایہ داری اور سامراج دونوں کو ایک اخلاقی اور مسیحی لباس پہنایا ہے۔ اس نے اعلیٰ ترین اخلاقی معیاروں سے ایشیاء اور افریقہ میں برطانیہ کی غاصبانہ سیاست کو حق بجانب ثابت کیا ہے اور انگریزوں کے اندر اس غیر معمولی اور قابل رشک احساس کے پیدا ہونے کا سامان کیا ہے کہ وہ ہمیشہ حق بجانب ہی ہوتے ہیں۔ میں ٹھیک نہیں جانتا کہ برابر حق بجانب ہونے کا یہ آرام دہ خیال کلیسا نے پیدا کرایا ہے۔ خود کلیسا اس کی پیداوار ہے۔ براعظم یورپ اور امریکہ کی دوسری قومیں جو ذرا کم خوش حال ہیں، انگریز ان پر ریا کاری کا الزام لگاتے ہیں اور "البیون (انگریز) کی دغابازی" کا طعن بہت پرانا ہے۔ مگر یہ الزام غالبًا برطانوی کامیابی پر حسد کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے کہ بھلا کوئی اور سامراجی طاقت پر برطانیہ کیا پتھر پھینکے گی، خود اس کا اپنا نامہ اعمال بھی تو اتنا ہی سیاہ ہوگا۔ جو قوم جان بوجھ کر ریا کاری کر رہی ہو وہ قوت کے ایسے محفوظ ذخیرے بروئے کار نہیں لاسکتی جیسے کہ انگریز بار ہا لائے ہیں اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ مذہب کا جو خاکہ انہوں نے اختیار کی ہے اس نے ان کی بڑی مدد کی ہے یوں کہ جہاں خود ان کی اغراض کا معاملہ ہے وہاں اس نے ان کے اخلاقی حسن کو کند کر دیا ہے۔ لیکن اس میں انہیں کبھی اس قدر کامیابی نہیں ہوئی کہ اپنے فائدہ کی بات تو خیر اور نیکی بھی مان لیں۔ یوں ہم سب کو اس میں بڑی آسانی ہے کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھیں اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر انداز کردیں۔ لیکن شاید انگریز اور سب سے بازی لے گیا ہے۔

(۲)

پروٹسٹنٹ مذہب نے نئے حالات سے مطابقت کی کوشش کی اور اس کی تدبیر کی کہ دونوں دنیاؤں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے

اسے بڑی کامیابی ہوئی لیکن دینی نقطۂ نظر سے بہ حیثیت ایک منظّم مذہب کے وہ نہ ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مذہب کی جگہ محض جذبات اور کاروبار نے لے لی۔ کلیسا روما کے مذہب کا یہ حشر نہیں ہوا اس لیے کہ وہ یکسوئی سے اپنی پرانی جگہ پر جما رہا اور جب تک وہ جگہ مستحکم ہے یہ بھی پھلتا پھولتا رہے گا۔ اگر لفظ مذہب کے محدود معنی لیے جائیں تو آج مغربی دنیا میں کلیسا روما کا مذہب ہی ایک زندہ مذہب ہے۔ قید خانہ میں رومن کیتھولک دوست نے مجھے اپنے مذہب کی بہت سی کتابیں اور پاپائے روم کے گشتی اعلانات بھیج دیئے تھے اور میں نے انہیں بڑے شوق سے پڑھا۔ اور ان کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوا کہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد پر اس مذہب کا کتنا تسلط ہے۔ اسلام اور عام ہندومت کی طرح یہ بھی شک و شبہ اور ذہنی انتشار کے طوفانی سمندر میں ایک محفوظ لنگر کا کام دیتا ہے۔ اور آنے والی زندگی کا یقین دلاتا ہے جس میں اس زندگی کی خامیوں کی تلافی ہو جائے گی۔

مگر کیا کروں میرے لیے اس طرح پناہ ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ میں کھلے سمندر کو ترجیح دیتا ہوں اور اس کے طوفان و طغیانی کو۔ نہ مجھے بعد والی زندگی میں، اور موت کے بعد جو ہوگا اس میں کچھ بہت دلچسپی ہے۔ میرے ذہن کو مشغول رکھنے کے لیے تو اسی زندگی کے مسائل کافی ہیں۔ چینیوں کا روائتی نقطۂ نظر جو اصولاً اخلاقی ہے مگر غیر مذہبی یا یوں کہیے کہ مذہبی تشکیک سے متاثر۔ وہ مجھے بہت بھاتا ہے، اگرچہ چینیوں نے جس اسے زندگی پر نافذ کیا ہے اس سے میں متفق نہیں۔ مجھے دلچسپی ہے ان کے ''تاؤ سے''ان کے طریق حیات سے، اس راستہ سے جس پر کہ ان کے نزدیک چلنا چاہیے زندگی کو سمجھنا چاہیے اسے رد نہ کرنا چاہیے بلکہ قبول، اس سے مطابقت پیدا کرنا چاہیے اور اس کو بہتر بنانا چاہیے۔ لیکن معمولاً مذہبی رجحانکو اس دنیا سے کچھ سروکار ہی نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک یہ وضاحت فکر کا دشمن ہوتا ہے۔ اس لیے ہی نہیں کہ بعض مقررہ اور نا قابل تعزیز نظریوں اور عقیدوں کے بے چون و چرا تسلیم

کرنے پر اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ یہ جذبات جلی وخفی پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ اس چیز سے بہت دور ہوتا ہے جسے میں روحانیت اور روح کی باتیں جانتا ہوں اور یہ یا تو جان بوجھ کر یا نادانستہ حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اس لیے کہ کہیں حقیقت اس کے تعصّبات سے مطابقت کرنے سے معذور نہ ہو۔ یہ تنگ نظر ہوتا ہے اور دوسرے خیالات اور آراء کے سات رواداری نہیں برتتا۔ یہ خودغرض اور برخود غلط ہوتا ہے اور اکثر مطلبی لوگوں، موقع شناسوں کو اپنے سے بے جا فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل دین کبھی بھی اعلی ترین اخلاقی اور روحانی زندگی کانمونہ نہ تھے یا اب بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ضرور ہیں کہ مذہبی نقطہ نظر کسی قوم کی اخلاقی اور روحانی ترقی میں مدد نہیں دیتا بلکہ اس میں حائل ہی ہوتا ہے، اگر اخلاق اور روحانیت کو اس دنیا کے معیاروں سے جانچا جائے نہ کہ آخرت سے۔ عموماً تو مذہب خدا یا ذات مطلق کی غیر معاشرتی جستجو بن کر رہ جاتا ہے اور مذہبی آدمی کو سماج کی بھلائی سے کہیں زیادہ اپنی شخصی نجات کی فکر رہتی ہے۔ صوفی اپنے کو نفس سے رہا کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں اکثر نفس اس پر چھا جاتا ہے۔ اخلاقی معیاروں کو جماعتی ضروریات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا، بلکہ ان کی بنیاد معصیت کے مافوق الطبیعت مسلک پر ہوتی ہے اور منظّم مذہب تو بلا استثناء مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تبدیلی اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ مسیحی کلیسا نے شروع میں غلاموں کو اپنی معاشرتی حالت بہتر کرنے میں مدد نہیں دی۔ غلام لوگوں کو جو قرون وسطیٰ کے منصب داری نظام میں زرعی چاکر کی حیثیت ملی تو وہ معاشرتی اسباب سے۔ کلیسا کا نقطہ نظر تو ابھی دو سو سال پہلے تک (۱۷۲۷ء تک) جو تھا اس کا پتہ ایک خط سے چلتا ہے جو لندن

کے بڑے پادری نے امریکہ کی جنوبی نوآبادیوں کے غلاموں کے مالکوں کو لکھا تھا۔

پادری صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ " مسیحیت سے کتاب مقدس کے قبول کرنے سے شہرہ حقوق ملکیت میں یا شہر تعلقات سے متعلق جو فرائض ہیں ان میں مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سب حیثیتوں سے تو آدمی اسی حال میں رہتے ہیں جس میں وہ پہلے تھے۔ مسیحیت جو آزادی بخشتی ہے وہ تو گناہ سے، شیطان سے، اور انسان کے شہوات وجذبات اور بے جا خواہشات سے آزادی ہے۔ لیکن جہاں تک ان کی خارجی حالت کا تعلق ہے، وہ پہلے جو کچھ تھے، چاہے وہ آزاد تھے یا غلام، تو اس میں عیسائی ہو جانے یا بپتسمہ لینے سے یعنی کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔"

آج تو کوئی منظم مذہب اس صفائی سے اپنا یہ خیال ظاہر نہ کرے گا، لیکن سچ پوچھئے تو تہہ میں حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ الفاظ بجائے خود خیالات کے منتقل کرنے کا بہت ناقص ذریعہ ہیں اور مختلف لوگ ان کے مختلف معنی سمجھ سکتے ہیں۔ اور شاید کسی زبان کے کسی اور لفظ کی مختلف لوگا تنی مختلف تعبیریں نہ کرتے ہوں جتنی کہ لفظ مذہب، (یا دوسری زبانوں میں اس کے مرادف لفظ) کی۔ اس لفظ کو پڑھ کر یا سن کر شاید دو آدمیوں کے ذہن میں بھی خیالات وتصورات کا ایک سا مجموعہ سامنے نہ آتا ہوگا۔ جو خیالات و تصورات اس لفظ سے ابھرتے ہیں وہ کہیں رسم ورواج کے ہیں، کہیں مقدس کتابوں کے، کہیں آدمیوں کی جمعیت کے، تو کہیں چند قطعی عقائد کے، کہیں اخلاق، احترام، محبت کے، کہیں خوف ونفرت کے، خیرات، قربانی، رہبانیت کے، روزہ رکھنے کے اور خوب کھانے پینے کے جشنوں کے، دعاوعبادت کے، قدیم تاریخ کے، شادی کے، موت کے، آنے والی دنیا کی، بلووں کے، سر پھوٹنے کے، غرض طرح طرح کے۔ تعبیروں اور تصوروں کی اس بے حساب رنگا رنگی سے جو سخت انتشار پیدا

ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً ہمیشہ ایک تیز جذباتی تحریک بھی شامل ہوتی ہے جس میں ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے کا امکان نہیں رہتا۔ لفظ مذہب کے کوئی واضح معنی اب باقی نہیں رہے ہیں (اگر کبھی تھے) چنانچہ اس سے سخت انتشار پیدا ہوتا ہے اور دلیل و بحث کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کہیں ختم ہونے پر نہیں آتا۔ اس لیے کہ مختلف لوگ اس کے بالکل ہی جدا جدا معنی لیتے ہیں۔ بہت بہتر ہوتا اگر اس لفظ کا استعمال ہی ترک کر دیا جاتا اور اس کی جگہ دوسرے لفظ استعمال کئے جاتے جن کے معنی زیادہ محدود و معین ہوتے مثلاً دینیات، فلسفہ اخلاق، اخلاقیات، روحانیت، مابعد الطبیعات، فرض، رسم وغیرہ۔ خود یہ الفاظ بھی خاصے مبہم ہیں لیکن ان کا مفہوم مذہب، سے کہیں محدود ہے اور ایک بڑا فائدہ یوں ہو گا کہ ان لفظوں کے ساتھ وہ جذبات اس طرح وابستہ نہیں ہیں جن میں کہ لفظ مذہب چاروں طرف سے لپٹا ہوا ہے۔

پھر آخر مذہب ہے کیا؟ (اگر باوجود اس کے عیوب کے اسی لفظ کو استعمال کیا ہی جائے) غالباً اس سے مراد فرد کی اندرونی نشوونما ہے، یعنی اس کے شعور کا ارتقا کسی ایسی سمت میں جسے اچھا سمجھا جاتا ہے۔ پھر خود یہ بات موضوع بحث بن جاتی ہے کہ وہ سمت کیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں مذہب اس اندرونی تبدیلی پر زور دیتا ہے۔ اور خارجی تبدیلی کو اس داخلی نشوونما کا پرتو جانتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندرونی تبدیلی خارجی ماحول پر زبردست اثر ڈالتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اتنی ہی صاف ہے کہ خارجی ماحول بھی اس اندرونی تبدیلی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مغرب کی جدید تہذیب میں خارجی ترقی اندرونی نشوونما کی نسبت بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا جیسا کہ مشرق کے بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ ہم صنعت میں پیچھے اور ہماری

ترقی سست ہے اس لیے ہمارا اندرونی ارتقاء کچھ زیادہ ہوگیا ہے۔ یہ بھی ان دھوکوں میں سے ایک دھوکہ ہے جن سے ہم اپنے کو تسلی دے لیا کرتے ہیں اور اپنے ہیٹے پن کے احساس پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ افراد حالات اور ماحول سے بالاتر ہو کر اندرونی بلندیاں حاصل کرلیں۔ لیکن انسان کے بڑے گروہوں اور قوموں کے لیے تو اندرونی ارتقاء شروع ہونے سے پہلے لازم ہے کہ خارجی نشوونما ایک خاص درجہ تک پہنچ چکا ہو۔ جو شخص معاشی حالات کا شکار ہو اور زندہ رہنے کی کشاکش اسے ہر طرف گھیرے ہوئے ہو وہ مشکل ہی سے شعور داخلی کے کسی بلند مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے۔ جو طبقہ دوسروں کے قدموں تلے پس رہا ہو اور دوسرے جس سے بے جا فائدے اٹھا رہے ہوں وہ کبھی اندرونی ترقی نہیں کرسکتا۔ جو قوم سیاسی اور معاشی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی محکوم ہو اور ہر طرف سے گھری ہو، جس پر طرح طرح کی حد بندیاں ہوں، جس سے دوسرے فائدہ اٹھا رہے ہوں، اسے کبھی اندرونی ترقی نصیب نہیں ہوسکتی۔ غرض خود اندرونی نشوونما کے لیے باہر کی آزادی اور مناسب ماحول لازم ہو جاتا ہے۔ اس میں جو رکاوٹیں ہیں وہ ہٹ جائیں، پسندیدہ بات یہ ہے کہ جو وسائل اختیار کئے جائیں وہ ایسے ہوں کہ یہ مقصد فوت نہ ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب گاندھی جی فرماتے ہیں کہ وسائل مقصد سے زیادہ اہم ہیں تو ان کے خیال میں اسی قسم کی کوئی بات ہوتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وسائل ایسے ہوں جو اس مقصد تک لے جاسکیں، ورنہ ساری کوشش ضائع ہوگی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اندرونی اور بیرونی دونوں اعتبار سے حالت پہلے سے پست تر ہو جائے۔

گاندھی جی نے کسی جگہ لکھا ہے ''کوئی آدمی مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا بعض لوگ جو اپنی عقل کے غرور میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انہیں مذہب سے سروکار نہیں، مگر اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو کہے کہ میں سانس لیتا ہوں مگر میرے ناک

نہیں" پھر کہیں کہتے ہیں "حق و صداقت کے ساتھ میری شیفتگی مجھے سیاست میں گھسیٹ لائی ہے اور میں ذرا سے تامل کے بغیر اگرچہ بڑے عجز کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب ہے کیا" زیادہ صحیح ہوتا اگر وہ یہ فرماتے کہ جو لوگ زندگی اور سیاست سے مذہب کو خارج کرنا چاہتے ہیں وہ لفظ مذہب کے معنی اس سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ یہ بات تو صاف ہے کہ گاندھی جی اس لفظ کو ایسے معنی میں استعمال کرتے ہیں (غالباً اور کسی معنی سے زیادہ اخلاقی معنی ہیں) جو مذہب کے نکتہ چینوں کے معنی سے مختلف ہے، ایک لفظ کو یوں مختلف معنوں میں استعمال کرنے سے ایک دوسرے کا مطلب سمجھنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

مذہب کی ایک بالکل نئی تعریف، جس سے اہل مذہب اتفاق نہ کریں گے۔ پروفیسر جان، دیوی کی تعریف ہے۔ ان کے خیال میں "مذہب سب کچھ ہے جس سے وجود کے منفرد اور متغیر حوادث و واقعات میں حقیقی توحید منظر پیدا ہو۔" یا پھر ایک جگہ کہتے ہیں کہ "ہر وہ عمل جو کسی غیبی مقصد کے لیے موانع کے مقابلے میں اور شخصی نقصان کے ڈر کے باوجود کیا جائے اس لیے کہ اس کی عام اور مستقل قدر کا یقین ہے اپنی کیفیت میں مذہبی ہوتا ہے" اگر مذہب یہ ہے تو پھر یقیناً کسی کو اس پر ذرا سا بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

رومین رولان نے بھی مذہب کے تصور کو پھیلا کر اسے وہ معنی دیئے ہیں جس سے شاید منظم مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھریں۔ سوانح رام کرشن میں کہتے ہیں، "بہت سی روحیں ہیں جو مذہبی عقیدہ سے آزاد ہیں یا سمجھتی ہیں کہ آزاد ہیں لیکن جو درحقیقت ہر لمحہ ایک فوق العقل شعور میں ڈوبی رہتی ہیں جس کا نام اشتراکیت رکھ لیتی ہیں یا اشتمالیت، انسان دوستی یا قوم پرستی یا عقلیت تک۔ خیال کی کیفیت سے اس کا منبع معین ہوتا ہے نہ کہ اس کے موضوع سے اور ایسی کیفیت کی

بنا پر ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب سے نکلا ہے یا نہیں۔ اگر وہ تلاش حق کی طرف بے خوف وخطر بڑھتا ہے، پھر چاہے جو بھی ہو اور یکسوئی اور خلوص کے ساتھ ہر قربانی کے لیے تیار ہے تو میں اسے ضرور مذہبی کہوں گا، اس لیے کہ وہ ضرور انسانی سعی کے لیے ایک ایسے مقصد پر یقین رکھتا ہے جو موجودہ معاشرہ کی زندگی سے بالا ہے بلکہ کل انسانیت کی زندگی سے بھی ارفع۔ خود تشکیک تک روح مذہبی کے لشکر بزرگ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے بشرطیکہ یہ تشکیک قومی اور کھری فطرتوں سے پیدا ہو اور کمزوری کا مظہر نہ ہو بلکہ قوت کا"۔

نہ جانے میں ان شرائط کو پورا بھی کرتا ہوں یا نہیں جو رومان رولان نے لگائی ہیں مگر ان حالات میں تو میں اس لشکر بزرگ کا ایک ناچیز پیادہ پیرو بننے کے لیے ضرور تیار ہوں۔

---

(۱) ہندوستان میں تو انگریزی کلیسا اور انگریزی حکومت میں تمیز کرنا بھی دشوار ہے، ہندوستان کی سرکاری آمدنی سے باضابطہ تنخواہ پانے والے پجاری اور پادری اسی طرح سامراجی قوت کے علمبردار ہیں جیسے کہ دوسری اعلیٰ خدمات والے۔ ہندوستانی ریاست میں بہ حیثیت مجموعی یہی کلیسا جمود اور ترقی دشمنی کی ایک قوت رہا ہے اور عام طور سے اس نے ہر ترقی اور اصلاح کی مخالفت کی ہے۔ مشن کے معمولی کام کرنے والے عام طور پر ہندوستان کے ماضی اور اس کے تمدن سے یکسر ناواقف ہوتے ہیں اور اس بات کے معلوم کرنے کی ذرا زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ تمدن کیا تھا اور کیا ہے۔ اسے تو فکر بس زیادہ اس کا ہوتا ہے کہ کفارہ کے عیبوں اور گناہوں کو ظاہر کرے اس کلیہ کے بہت سے مستثنیات بھی ضرور ہیں مثلاً چارلی انڈریوز سے زیادہ سچا دوست ہندوستان کا اور کون ہے۔ ان کی ہمہ گیر محبت، ان کا جذبہ خدمت، ان کی بے حساب دوست داری، سے جی خوش ہو جاتا ہے۔ پونا کے کرسٹا سیوا نگ میں بھی چند اچھے انگریز ہیں جن کے مذہب نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ دوسروں کو سمجھیں اور ان کی سیوا نہ کریں نہ کہ خواہ مخواہ مشیخت جتائیں اور جنہوں نے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو ہندوستان کی بے غرض خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے اور بھی بہت سے انگریز اہل کلیسا ہیں جن کی یاد ہندوستان میں زندہ رہے گی۔

کنٹربری کے لاٹ پادری نے ۱۲ دسمبر ۳۳ء کو دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے ۱۲ء کے مانٹیگو چمسفورڈ والی اصلاحات کے تمہیدی کلمات کا ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ بڑا اعلان ذرا عجلت میں کر دیا گیا ہو اور گمان ہوتا ہے کہ یہ بھی منجملہ ان دریا دلی کی عاجلانہ حرکتوں سے ہے جو جنگ کے بعد کی گئیں۔ لیکن اب جو منزل مقرر ہوگئی اسے واپس لینا تو ممکن نہیں'' دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی کلیسا کا سردار ہندوستانی سیاست کے متعلق ایسا انتہائی قدامت پسندوں والا رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ قدم جسے ہندوستانی رائے عامہ نے بالکل ناکافی جانا تھا اور جس نے اسی وجہ سے عدم تعاون اور اس کے جملہ عواقب کے لیے راہ کھولی تھی۔ اسے یہ لاٹ پادری صاحب عجلاب اور دریا دلی پر مبنی خیال فرماتے ہیں۔ انگریز حکمراں طبقہ کے نقطہ نظر سے بیشک یہ تسکین دہ خیال ہے اور اپنی ایسی دریا دلی کے یقین سے جو عاجلانہ بے احتیاطی کی حد تک پہنچتی ہو ضرور ان لوگوں میں اطمینان قلب کی ایک روحانی رو دوڑ جاتی ہوگی!

(۲) ہندوستانی سیاست پر کلیسا، انگلستان کے بالواسطہ اثر کی ایک مثال حال میں میرے علم میں آئی۔ صوبہ متحدہ کے عیسائیوں کی ایک کانفرنس، نومبر ۱۹۳۴ء کو کانپور میں ہوئی تھی۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مسٹر ای وی ڈیوڈ نے فرمایا ''عیسائی ہونے کی حیثیت سے ہم مذہباً ملک معظم کی وفاداری پر مامور ہیں کہ وہ ہمارے دین کے محافظ ہیں'' اس کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مدد دی جائے۔ آگے چل کر مسٹر ای وی ڈیوڈ نے سول سروس، پولیس اور کل مجوزہ دستور سیاسی کے متعلق انگلستان کے شدید قدامت پسند گروہ کے خیالات سے ہمدردی کا اظہار فرمایا کہ ان لوگوں کے نزدیک بھی اس جدید دستور سے احتمال ہے کہ ہندوستان میں مشن کا سارا کاروبار خطرہ میں پڑ جائے۔

برطانوی حکومت کی دورخی پالیسی

ہریجن تحریک جاری تھی۔گاندھی جی پہلے یرودا جیل سے اس کی رہنمائی کرتے رہے اور اب باہر سے کر رہے تھے۔اس بات کے لیے سخت جدوجہد ہو رہی تھی کہ مندروں کے داخلے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور کر دی جائیں اور اس کا ایک مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کیا گیا۔اس وقت یہ حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا کہ کانگریس کے ایک ممتاز لیڈر دہلی میں گھر گھر پھر رہے تھے اور اسمبلی کے ممبروں کو اس مسودہ قانون کی تائید پر راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو خود گاندھی جی نے ان کے ذریعہ سے اسمبلی کے ممبروں سے اپیل کیا تھا۔مگر لطف یہ ہے کہ سول نافرمانی اب بھی جاری تھی اور لوگ جیل میں جا رہے تھے۔اور کانگریس نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا تھا اور ہمارے سب ممبر استعفے دے کر چلے آئے تھے۔بچے کچھے ممبروں نے اور ان لوگوں نے جو کانگریسی ممبروں کی جگہ منتخب ہوئے تھے اس نازک زمانے میں ہمیشہ کانگریس کی مخالفت اور حکومت کی موافقت کی تھی۔ان کی اکثریت نے حکومت کو اس جابرانہ قانون کے پاس کرنے میں مدد دی تھی۔جس کے ذریعہ سے تعزیری ضابطوں کو ایک مستقل شکل دے دی تھی۔انہوں نے اٹاوے کے معاہدے کو چپ چاپ قبول کر لیا تھا، شملہ اور لندن میں بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ دوتیں اڑائیں تھیں، ہندوستان کی برطانوی حکومت کی شکرگزاری کے گیت گائے تھے اور اس کی ''دورخی پالیسی'' کی کامیابی کے لیے دست بدعا تھی۔

مجھے ان حالات میں گاندھی جی کے اپیل پر حیرت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ اس پر کہ راج گوپال اچاریہ جو چند ہفتے پہلے کانگریس کے قائم مقام پریذیڈنٹ تھے ان حضرات کی تائید حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ظاہر ہے کہ اس سے سول نافرمانی کی جدوجہد کو نقصان پہنچا۔میرے لیے اس کا اخلاقی پہلو اور زیادہ تکلیف دہ تھا۔میرے خیال میں گاندھی جی یا کسی کانگریسی لیڈر کا یہ طرز عمل اخلاقاً

ناجائز تھا اور ایک قسم کی بدعہدی تھی ان ہزارہا آدمیوں سے جو جیل میں تھے یا اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ گاندھی جی کا نقطہ نظر دوسرا ہے۔

حکومت نے اس وقت اور اس کے بعد داخلہ مندر کے مسودہ قانون کے متعلق جو رویہ اختیار کیا اس سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے اس کے حامیوں کی راہ میں ہر طرح کے روڑے اٹکائے، اس کو بار بار ملتوی کرتی رہی اور اس کے مخالفوں کو شہ دیتی رہی یہاں تک کہ آخر میں اس نے کھلم کھلا مخالفت کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ کم وبیش یہی رویہ وہ ہندوستان کی ہر سماجی اصلاح کے معاملے میں رکھتی ہے اور مذہب میں مداخلت نہ کرنے کے بہانہ سے وہ معاشرتی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ ہماری سماجی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتی ہے اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتی ہے۔ اتفاق سے سارد ابل جو بچپن کی شادی کو روکنے کے لیے پیش کیا گیا تھا منظور ہو گیا مگر اس بدنصیب ایکٹ کا جو حشر ہوا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حکومت کو اس قسم کی تجویزوں پر عمل کرنا کس قدر ناگوار ہوتا ہے۔ وہی حکومت جو راتوں رات تعزیری ضابطے بنا ڈالتی ہے۔ جن میں نئے نئے جرم تراشے جاتے ہیں اور ایک شخص کے جرم کی سزا دوسروں کو دی جاتی ہے، جو بیسیوں ہزار آدمیوں کو ان ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے پر جیل بھیج دیتی ہے وہ سارد ا ایکٹ جیسے باقاعدہ قانون کو نافذ کرنے سے ڈرتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس ایکٹ کا اثر بالکل الٹا ہوا۔ اس لیے کہ اس میں ازراہ حماقت لوگوں کو چھ مہینے کی مہلت دی گئی تھی جس سے بے شمار آدمیوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ ایکٹ محض ایک مذاق ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ سرکاری طور پر اس کی اشاعت کی مطلق کوشش نہیں کی گئی اور بہت سے گاؤں والوں کو آج تک معلوم نہیں ہوا کہ اس ایکٹ کا کیا منشاء ہے۔ اس کے سامنے ہندو مسلمان مذہبی واعظ اس کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے جنہیں خود بھی صحیح

واقعات کا علم نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ حکومت ہندوستان کی معاشرتی خرابیوں کے معاملے میں جو رواداری کا برتاؤ کرتی ہے اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ ان کی موید ہے۔ بلکہ اس میں شک نہیں کہ اسے ان خرابیوں کے دور کرنے کی فکر نہیں کیونکہ ان سے اس کے کام میں یعنی ہندوستان پر حکومت کرنے میں اور اس کی دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں خلل پڑتا ہے۔ پھر یہ خطرہ بھی ہے کہ سماجی اصلاح کی تجاویز سے بعض لوگ ناراض ہو جائیں گے اور چونکہ حکومت کو ملک کی سیاسی مخالفت سے نبٹنا دشوار ہے اس لیے وہ نہیں چاہتی کہ اپنے لیے اور مشکلات پیدا کر لے مگر کچھ دنوں سے سماجی مصلحوں کے کام میں اور بھی سخت دشواری پیدا پیدا ہو گئی ہے اس لیے کہ حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں میں رہتا ہے۔ جوں جوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب قسم کے حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں مگر سناتن دھرمی رجعت پسندی میں اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ جو مذہب کے معاملے میں ہر قسم کی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں اور اسی کے ساتھ برطانوی حکومت کے پکے وفادار ہیں یا کم سے کم زور شور سے وفاداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر حکومت خاموش رہی اور اس نے ساردا ایکٹ کو ہر دلعزیز بنانے اور نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی تو کانگریس یا دوسری غیر سرکاری جماعتوں نے اس کے لیے پروپیگنڈہ کیوں نہیں کیا؟ یہ سوال برطانیہ کے اور دوسرے ملکوں کے نکتہ چینیوں

کی طرف سے اکثر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ پچھلے پندرہ سال سے خصوصاً ۱۹۲۰ء سے برطانوی حکومت سے قومی آزادی کی شدید جنگ میں مصروف ہے جس پر اس کی موت اور زندگی کا دارومدار ہے۔ رہیں دوسری انجمنیں تو ان میں حقیقی قوت ہے اور نہ عام لوگوں سے تعلق ہے۔ وہ عورتیں اور مرد جو اعلیٰ مقاصد اور اخلاقی قوت رکھتے ہیں اور عوام میں ہر دلعزیز ہیں سب کے سب کھنچ کر کانگریس میں چلے آئے ہیں اور زیادہ تر اپنا وقت قید فرنگ میں گزارتے ہیں۔

دوسری انجمنیں اس سے آگے نہیں بڑھتیں کہ چند منتخب لوگوں کو جمع کر کے رزولیوشن پاس کر دیں۔ عام لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کی ان میں جرأت نہیں۔ مردوں کی انجمنیں جنٹلمینوں کی طرح اور انجمن خواتین ہند لیڈیوں کی شان سے کام کرتی ہیں اور جارحانہ پروپیگنڈا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ تعزیری ضابطوں، اور قانونوں نے جو ہر قسم کی پبلک جدوجہد کو دبانے کے لیے بنائے گئے تھے ان انجمنوں کو بھی معطل کر دیا تھا، ممکن ہے کہ مارشل لا انقلابی جدوجہد کو کچل دے مگر اسی کے ساتھ وہ تمدن اور تمدنی جدوجہد کو بھی معطل کر دیتا ہے۔

مگر کانگریس اور دوسری غیر سرکاری انجمنوں کا سماجی اصلاح میں زیادہ حصہ نہ لینے کا اصلی سبب اس سے زیادہ گہرا ہے۔ ہم لوگ قوم پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہمارے دل و دماغ پر اسی کا خیال چھایا ہوا ہے اور اس وقت تک چھایا رہے گا جب تک ہمیں سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔ برنارڈ شاہ کا یہ قول ہمارے حسب حال ہے ''محکوم قوم کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سرطان کے مرض میں مبتلا ہو۔ وہ دن رات اسی کی فکر میں رہتا ہے.......... سچ پوچھئے تو کسی قوم کے لیے قومی تحریک سب سے بڑی مصیبت ہے۔ یہ ایک طبعی عمل کے روک دیئے جانے کی تکلیف دہ علامت ہے۔ محکوم قومیں دنیا کی رفتار ترقی میں پیچھے رہ جاتی ہیں اس لیے کہ ان کی ساری توجہ

اس کوشش میں صرف ہوتی ہے کہ کس طرح قومی آزادی حاصل ہو اور قومی تحریک سے پیچھا چھوٹے۔"

پچھلے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہم موجودہ حالات میں سماجی ترقی نہیں کر سکتے اگرچہ بظاہر حکومت کے بعض منتخب شدہ وزیروں کی طرف منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ حکومت کے انتہائی جمود سے ہمیشہ قدامت پسندوں کو مدد ملتی ہے اور برٹش گورنمنٹ مدتوں سے ہماری روح عمل کو کچلتی رہی ہے اور ہم پر استبدادی بالقول خود بزرگانہ حکومت کرتی رہی ہے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ غیر سرکاری لوگ کوئی غیر منظم تحریک شروع کریں اور اسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کی نیت کچھ اور ہے۔ ہریجن تحریک اپنے چلانے والوں کی انتہائی احتیاط کے باوجود کبھی کبھی سرکاری ملازموں سے ٹکرا جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کانگریس سارے ملک میں یہ پروپیگنڈا کرے کہ صابون زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے تو بہت سے مقامات پر اس سے اور حکومت سے ٹکر ہو جائے گی۔

میرے خیال میں اگر ریاست سماجی اصلاح کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو عام لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے میں کوئی زیادہ دقت نہیں ہو گی مگر غیر ملکی حکمرانوں کی طرف سے لوگوں کو ہمیشہ شبہ رہتا ہے اور ان کو خیالات کے بدلنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہو سکتی اگر غیر ملکی حکومت ہٹ جائے اور معاشی تبدیلیاں مقدم رکھی جائیں تو قابل اور مستعد حکام آسانی سے بڑی بڑی اصلاحیں کر سکتے ہیں۔

مگر جیل میں ہمیں سماجی اصلاح اور ساردا ایکٹ اور ہریجن تحریک کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی بلکہ مجھے تو یہ بات ناگوار تھی کہ ہریجن تحریک نے سول نافرمانی میں رکاوٹ ڈال دی، شروع مئی ۳۳ء میں ہریجن تحریک چھ ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی اور ہم کو یہ فکر تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ التوا کی وجہ سے تحریک کا رہا سہا زور ختم ہو گیا کیونکہ قومی لڑائی کوئی کھیل نہیں کہ جب چاہا شروع کر دیا اور جب چاہا بند کر

دیا۔ التوا سے پہلے بھی تحریک کے لیڈر بڑی کمزوری اور بودے پن کا ثبوت دے رہے تھے۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی کانفرنسیں ہو رہی تھیں اور طرح طرح کی افواہیں مشہور کی جاتی تھیں جن سے عملی کام میں خلل پڑتا تھا۔ کانگریس کے بعض قائم مقام پریذیڈنٹ بہت قابل قدر لوگ تھے مگر انہیں جنگ کا سپہ سالار بنانا ان پر بڑا ظلم تھا۔ وہ کچھ تھکے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس مشکل سے کسی طرح پیچھا چھڑائیں۔ بڑے لیڈروں کی اس ہچکچاہٹ اور لیت و لعل سے کچھ لوگ بیزار تھے مگر وہ اپنی بیزاری کا اظہار منظم طریقے سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ تمام کانگریس کمیٹیاں خلاف قانون دے دی گئیں تھیں۔

اسی حالت میں گاندھی جی کا اکیس دن کا برت شروع ہوا۔ وہ جیل سے رہا کر دیئے گئے اور سول نافرمانی چھ ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ برت ختم ہو گیا اور گاندھی جی کو رفتہ رفتہ افاقہ ہونے لگا۔ وسط جون میں سول نافرمانی کے التوا کی معیاد چھ ہفتے اور بڑھا دی گئی اس اثناء میں حکومت کے جبر و تشدد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ جزیرہ انڈمن میں سیاسی قیدی (بنگال کے انقلابی مجرم وہاں بھیجے گئے تھے) بدسلوکی کی وجہ سے بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ ان میں دو ایک فاقے کرتے کرتے مر گئے اور بہت سے قریب المرگ تھے۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں انڈمن کے واقعات کے خلاف احتجاج کے جلسے کیے انہیں بھی گرفتار کر کے سزا دے دی گئی۔ حکومت کی مرضی یہ تھی کہ ہم تکلیف اٹھائیں اور اف تک نہیں کریں۔ چاہے سیاسی قیدی جن کے پاس بھوک ہڑتال کے سوا احتجاج کا کوئی ذریعہ نہ تھا ایڑیاں رگڑ کر مر جائیں۔ چند مہینے بعد ستمبر ۳۳ء میں (جب میں جیل سے رہا ہو چکا تھا) ایک اپیل شائع کیا گیا جس پر رابندر ناتھ ٹیگور، سی ایف اینڈریوز اور بہت سے اور مشہور لوگوں کے دستخط تھے۔ جن میں سے اکثر کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ انڈمن کے قیدیوں سے زیادہ انسانیت کا سلوک کیا جائے

بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی جیلوں میں منتقل کر دیئے جائیں۔ حکومت ہندو
کے ہوم ممبر اس اپیل پر بہت خفا ہوئے اور جن لوگوں نے اس پر دستخط کئے تھے ان کو
برا بھلا کہا کہ وہ قیدیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آگے چل کر جہاں تک مجھے یاد
ہے ان قیدیوں سے ہمدردی کرنا بنگال میں قابل سزا جرم قرار دے دیا گیا۔

سول نافرمانی کے التوا کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہمیں دہرہ دون جیل میں یہ
خبر ملی کہ گاندھی جی پونا میں ایک بے ضابطہ کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ دو تین
سو آدمی وہاں جمع ہوئے اور گاندھی جی کے مشورے سے عام سول نافرمانی ملتوی کر
دی گئی تھی مگر انفرادی نافرمانی کی اجازت رہی اور ہر قسم کے خفیہ طریقوں کی ممانعت
کر دی گئی۔ یہ فیصلے حوصلہ افزا نہیں تھے مگر مجھے ان پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سول
نافرمانی کو روکنے کے معنی صرف یہ تھے کہ موجودہ حالت کا اعتراف کیا جائے اور اس
کو قائم رکھا جائے کیونکہ سچ پوچھئے تو عام تحریک پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ خفیہ کام کرنا
محض ایک بہانہ تھا کہ تحریک اب بھی جاری ہے اور ہماری تحریک کی نوعیت دیکھتے
ہوئے اس سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ اس کی ضرورت صرف اس
حد تک تھی کہ لوگوں کو ہدایتیں بھیجی جا سکیں اور ان سے تعلق قائم رکھا جا سکے مگر خود سول
نافرمانی کو پوشیدہ رکھنا ناممکن تھا۔

مجھے جس بات سے تعجب اور افسوس ہوا وہ یہ تھی کہ پونا میں ہماری موجودہ
حالت اور مقاصد کے متعلق صحیح معنوں میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔ کانگریس والے
تقریباً دو سال کی شدید جنگ کے بعد جمع ہوئے تھے اور اس عرصہ میں ساری دنیا
میں اور ہندوستان میں بڑے بڑے اہم واقعات رونما ہو چکے تھے جن میں سے ایک
یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت وہائٹ پیپر میں دستور اساسی کی اصلاح کی تجاویز شائع
کی گئی تھیں۔ ہم اس عرصے میں مجبوراً خاموش رہے تھے اور دوسری طرف سے مسلسل
جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ اصل مسئلہ لوگوں کی نظر سے چھپ جائے۔ نہ صرف

حکومت کے حامیوں بلکہ لبرل پارٹی اور دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی بار بار یہ کہا جا چکا تھا کہ کانگریس نے اپنا کامل آزادی کا مقصد ترک کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس موقع پر اور کچھ نہیں تو کم سے کم یہ ضرور کرنا چاہیے تھا کہ ہمارا سیاسی مقصد دوبارہ واضح کر دیا جائے اور ممکن ہو تو اس کے ساتھ سماجی اور معاشی مقاصد کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے بجائے ساری بحث اس بات تک محدود رہی کہ عام سول نافرمانی بہتر ہے یا انفرادی نافرمانی اور خفیہ طریقوں سے کام لینا مناسب ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حکومت سے ''صلح'' کرنے کا چرچا ہو رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک تار بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی۔ مگر وائسرائے نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے ایک اور تار بھیجا جس میں ''باعزت صلح'' کا ذکر تھا۔ بھلا اس وقت اس پر اسرار صلح کی تلاش کا کیا موقع تھا جب کہ حکومت بڑے زور شور سے قوم کو ہر طرح کچلنے کی کوشش کر رہی تھی اور انڈمن میں لوگ فاقے کر کے جان دے رہے تھے؟ مگر میں جانتا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو گا گاندھی جی کا اصول یہی ہے کہ وہ صلح کی درخواست ضرور کرتے ہیں۔

حکومت کا جبر و تشدد زور و شور سے جاری تھا اور پبلک جدوجہد کو روکنے کے لیے تمام خاص قوانین نافذ تھے۔ فروری ۳۳ء میں میرے والد کے یوم وفات کا جلسہ ہونے والا تھا۔ مگر پولیس نے اس کو بھی روک دیا حالانکہ اسے کانگریس سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے صدر سر تیج بہادر سپرو جیسے اعتدال پسند تجویز کیے گئے تھے۔ آئندہ جو عنایات ہمارے حال پر ہونے والی تھیں ان کی جھلک ہمیں وہائٹ پیپر میں دکھائی گئی تھی۔

یہ ایک عجیب و غریب تحریر تھی جسے پڑھ کر انسان دم بخود رہ جاتا تھا۔ اس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستان موجودہ ہندوستانی ریاستوں کا ایک شاندار نمونہ بنا دیا جائے

اوراس کی وفاقی حکومت میں ان ریاستوں کے قدامت پسند نمائندوں کا اثر غالب ہو مگر خود ریاستوں میں باہر آنے والوں کا کوئی اثر نہ ہو، وہاں بدستور خالص استبداد کا دور دورہ رہے۔ شہنشاہی کی اصل کڑیوں یعنی قرض کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہم پیشہ لندن کے صرافے کے غلام رہیں اور ہماری سکے اور زر کی پالیسی، ریز رو بینک کے توسط سے بینک آف انگلینڈ کے ہاتھ میں رہے۔ تمام مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی حفاظت اس طرح کی جائے کہ اس میں کوئی دست اندازی نہ ہو سکے بلکہ نئے مستقل حقوق رکھنے والے طبقے پیدا کئے جائیں۔ عظیم الشان امپریل سروسیں جن سے ہمیں دلی محبت ہے، بدستور آزاد اور خود مختار رہیں تا کہ وہ ہمیں رفتہ رفتہ حکومت خود حکومت خود اختیاری کی تربیت دیں۔ صوبوں میں خود اختیاری حکومت ہو مگر گورنر ایک شفقی مختار کل کی حیثیت سے ہماری تادیب کرتا رہے اور سب کے اوپر حاکموں کا حاکم، مختاروں کا مختار، وائسرائے ہو جسے سفید و سیاہ کا اختیار حاصل ہو۔ سچ پوچھئے تو برطانیہ کے حکمرن طبقے کو نو آبادیوں پر حکومت کرنے کا جو ملکہ حاصل ہے اس کا کمال اس وہائٹ پیپر میں نظر آتا ہے اور اگر ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگ ہندوستان کے وائسرائے پر رشک کریں تو کچھ بیجا نہیں۔

ہندوستان کو اس دستور کی زنجیروں میں جکڑنے کے بعد اوپر سے ''خاص ذمہ داریوں'' اور تحفظات کی بیڑیاں اس کے پیروں میں ڈال دی گئیں تا کہ یہ بدنصیب قیدی ہل جل بھی نہ سکے۔ بہ قول مسٹر نویل چمبرلین کے ''حکومت کے برطانیہ نے انتہائی کوشش سے ان تجویزوں کے ساتھ ان تمام تحفظات کو نتھی کر دیا ہے جو انسان کی عقل سوچ سکتی تھی۔''

پھر ہمیں یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ان عنایات کے بدلے میں ہمیں ایک بھاری رقم ادا کرنی پڑے گی، چند کروڑ یکمشت اور پھر سالانہ قسطیں۔ ظاہر ہے کہ سوراج کی برکتیں بغیر معقول قیمت دیئے ہوئے کیوں کر حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہم اس ڈھونگ کے

میں تھے کہ ہندوستان غریب ملک ہے اور بھاری بوجھ میں دبا ہوا ہے اور ہمیں امید تھی کہ جب آزادی ملے گی تو بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر اب معلوم ہوا کہ نہیں۔ یہ تو اور بڑھ جائے گا۔

ہندوستان کے مسئلے کا یہ مضحک حل اس متانت کے ساتھ پیش کیا گی جو برطانوی قوم کے حصے میں آئی ہے اور ہم سے کہا گیا کہ دیکھو تمہارے حکمراں کس قدر فیاض ہیں۔ آج تک کسی شہنشاہی حکومت نے کسی محکوم قوم کو اتنے اختیارات اور حقوق اپنی خوشی سے نہ دیئے ہوں گے۔ انگلستان میں ان سخی داتاؤں میں اور ان لوگوں میں جو اس سخاوت کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے اور اس کی مخالفت کر رہے تھے بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ اس آمد و رفت کا جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تین سال سے ہو رہی تھی، تین گول میز کانفرنسوں اور بے شمار کمیٹیوں کا یہ نتیجہ تھا۔

مگر انگلستان جانے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی وہائٹ پیپر کا فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھی تھی اور ہندوستانی اسیروں اور گواہوں کی حیثیت سے بلائے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور کمیٹیوں کا اجلاس لندن میں ہو رہا تھا اور ہمارے ملک میں پس پردہ لوگ ان کمیٹیوں کی ممبری کے لیے لڑ رہے تھے تا کہ لندن کا ٹکٹ مفت میں مل جائے اور مرکز سلطنت کی زیارت کا موقع نصیب ہو۔ وہائٹ پیپر کی دل شکن تجویزیں ان سورماؤں کی ہمت کو پست نہیں کر سکیں اور وہ سمندر اور ہوا کے سفر کی جوکھم اٹھانے اور لندن کے قیام کے شدید خطروں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئے تا کہ اپنی خطابت اور جادو بیانی کے زور سے ان تجویزوں کو بدلوانے کی کوشش کریں۔ وہ یہ جانتے تھے اور کہتے بھی تھے کہ کام بڑا دشوار اور مایوس کن ہے مگر وہ میدان سے ہٹنے والے نہ تھے اور اس پر تلے ہوئے تھے کہ کوئی سنے یا نہ سنے ہم اپنی کہے جائیں گے۔ ان میں سے ایک صاحب جو تعاونی پارٹی کے لیڈر تھے اور سب لوگوں کے واپس آنے کے بعد

بھی جمے رہے اور لندن کے ارباب اقتدار سے ملاقات پر ملاقات کرتے رہے اور ان کے ساتھ ڈنر پر ڈنر کھاتے رہے تاکہ خوب اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیں کہ وہ کیا سیاسی تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ جب وہ خدا خدا کر کے وطن لوٹے تو انہوں نے پبلک سے جو ان کے انتظار میں بے چین تھی، یہ فرمایا کہ وہ مرہٹوں کی شہرہ آفاقی پارٹی کے ساتھ لندن میں ڈٹے رہے اور آخر وقت تک اپنے مطالبات کو دہراتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے تعاونی دوست ظرافت کی حس مطلق نہیں رکھتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے مذاق میں کوئی بات کہی جس سے یہ حضرات محفوظ ہونے کے بجائے بگڑ بیٹھے اور والد کو اپنا مطلب سمجھانا پڑا اور ان کی تالیف قلوب کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس سے انہیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ مجھے یہ شکایت سن کر مرہٹوں کے قابل قدر سیاہیانہ جوش کا دھیان آتا تھا جس کا اظہار نہ صرف پچھلے زمانہ میں ہوا بلکہ آج بھی ہماری قومی جنگ میں ہو رہا ہے اور تلک کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جو دنیا کی کسی قوت سے نہیں ڈرتا تھا۔ جس کا سر کٹ جائے مگر جھکتا نہ تھا۔

لبرل وہائٹ پیپر کے دل سے مخالف تھے اور انہیں وہ جبر و تشدد بھی پسند نہ تھا۔ جو آئے دن ہندوستان میں ہوتا رہتا تھا بلکہ ایک آدھ بار انہوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ وہ کانگریس اور اس کی جدوجہد کو برا سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ حکومت کو کسی بڑے کانگریسی لیڈر کی رہائی کا مشورہ دیتے تھے۔ ان کی ہمدردی صرف چند افراد تک محدود تھی جن سے ان کی ملاقات تھی۔ لبرل اور تعاونی دونوں جو دلیل پیش کرتے تھے وہ یہ تھی کہ فلاں شخص رہا کر دیا جائے کیونکہ اب امن عامہ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور پھر حکومت کو ہر وقت اختیار ہے کہ اگر وہ اور کوئی شرارت کریں تو انہیں دوبارہ گرفتار کر لے۔ اس وقت حکومت یہ فعل

زیادہ قرین انصاف ہوگا۔ انگلستان کے بعض حضرات بھی ازراہ عنایت ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں اور چند خاص افراد کی رہائی کی تحریک کرتے تھے اور یہی تاویلیں پیش کرتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہم ان حضرات کے شکر گزار نہ ہوں جو اسیری میں ہمارے پرسان حال تھے مگر بعض وقت یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے یہ مہربان ع ہم پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساس ہوتا۔ ہمیں ان کے خلوص نیت میں مطلق شبہ نہ تھا۔ مگر صاف ظاہر تھا کہ یہ سراسر برطانوی حکومت کے خیالات سے متاثر ہیں اور ہمارے اوران کے درمیان بہت بڑا خلیج حائل ہے۔

لبرل حکومت کی بہت سی کارروائیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اور انہیں بہت رنج ہوتا تھا مگر بے چارے کر ہی کیا سکتے تھے۔ حکومت کے خلاف کوئی موثر جدوجہد کرنا تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اپنی جداگاہ حیثیت قائم رکھنے کے لیے انہیں عام لوگوں سے اور عملی جدوجہد کرنے والوں سے دور ہٹنا پڑا اور اپنی پالیسی زیادہ معتدل کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ان کے اور حکومت کے خیالت میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ان کی تعداد بہت کم تھی اور عام لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہیں ت جا اس لیے ان کے الگ رہنے سے قومی تحریک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ مگر ان میں بعض مشہور اور ممتاز اشخاص تھے جن کی ذاتی شخصیت سے بڑی قدر ومنزلت تھی۔ ان بزرگوں نے اور بہ حیثیت مجموعی لبرل اور تعاونی پارٹی نے اس نازک وقت میں سرکاری پالیسی کی اخلاقی مدد کر کے برطانوی حکومت کی زبردست خدمت کی۔ حکومت کے جبر وتشدد اور بے آئینی کو بھی اس سے بڑی شہ ملی کہ ان لوگوں نے اس کی کوئی موثر مخالفت نہیں کی بلکہ لبرل پارٹی نے تو کبھی کبھی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ غرض لبرل اور تعاونی جماعت نے اس شدید جبر واستبداد کی جو ملک میں ہو رہا تھا اخلاقی تائید کی جبکہ خود حکومت کے لیے اس جائز ثابت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

لبرل لیڈر یہ فرماتے تھے کہ وہائٹ پیپر برا ہے، بہت برا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے

کہ وہ کرتے کیا ہیں۔لبرل فیڈریشن کا جو سلسلہ اپریل ۳۳ء میں کلکتہ میں ہوا اس میں سب سے ممتاز لبرل لیڈر سری نواس شاستری صاحب نے اس پر زور دیا کہ دستور اساسی کی تبدیلیاں خواہ کتنی ہی نا قابل اطمینان کیوں نہ ہوں ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ ہم ان کو عمل میں لائیں۔انہوں نے کہا 'یہ اس کا وقت نہیں ہے کہ ہم چپ چاپ کھڑے رہیں اور کچھ نہ کریں۔'' ان کے ذہن میں عمل کا صرف ایک ہی تصور تھا اور وہ یہ تھا کہ جو کچھ ملے اسے قبول کرلیں اور اس پر عمل درآمد کریں۔ان کے خیال میں دوسری صورت یہی ہوسکتی تھی کہ کچھ نہ کیا جائے۔آگے چل کر انہوں نے فرمایا'' اگر ہم عقل، تجربہ، اعتدال رکھتے ہیں، اگر ہم میں خاموشی سے دوسروں پر اثر ڈالنے کی صلاحیت، ان کی رائے بدلنے کی قوت اور حقیقی قابلیت ہے تو یہی موقع ہے جب ہمیں اپنی خدمات کا پورا پورا ثبوت دینا چاہیے۔''

''بقول کلکتے کے اخبار اسٹیٹمین کے'' یہ پرزور اور دلکش الفاظ کا ایک طلسم تھا۔''

خطابت مسٹر شاستری کا شوق ہے۔سب خطیبوں کی طرح انہیں بھی عمدہ عمدہ الفاظ کو خوش الحانی سے ادا کرنے کا شوق ہے۔مگر وہ اکثر اپنے جوش کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور جن الفاظ کا طلسم وہ باندھتے ہیں ان میں معنی اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ نہ انہیں پتہ چلتا ہے اور نہ دوسروں کو۔اگر ہم ان کے اس اپیل پر جو انہوں نے ۳۳ء میں سول نافرمانی کے دوران میں، کلکتہ میں کیا تھا، تنقیدی نظر ڈالیں تو فائدے سے خالی نہ ہوگا۔بنیادی اصول و مقاصد سے قطع نظر کر کے مجھے دو باتیں قابل غور معلوم ہوتی ہیں۔اول یہ کہ ان کے خیال میں خواہ برطانوی حکومت ہمیں کتنا ہی ذلیل کرے، کچلے، لوٹے ہمیں اس کی اطاعت سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔کوئی ایسی حد نہیں مقرر کی جاسکتی جس کے آگے ہمیں نہ بڑھنا چاہیے۔کمزور سے کمزور مظلوم بھی ایک وقت تنگ آکر ظالم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔مگر مسٹر شاستری کے مشورے کے مطابق ہندوستانیوں کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے

گویا ان کے نزدیک برطانوی حکومت کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل ایک دینی فریضہ ہے (یہ لفظ یہاں موزوں نہیں مگر مجبوراً استعمال کرنا پڑا) یہ نوشتہ تقدیر ہے جو ہمیں چاروناچار پورا کرنا ہے۔ یہ یاد رہے کہ وہ یہ مشورہ کیس خاص صورت حال کے متعلق نہیں دے رہے تھے۔ ''دستور اساسی کی تبدیلیاں'' ابھی تک زیر غور تھیں اگرچہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بہت ناقص ہوں گی۔ وہ یہ کہتے تو ایک بات بھی تھی کہ گو وہائٹ پیپر کی تجاویز ناقص ہیں لیکن میں تمام حالات کے لحاظ سے یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر وہ قانون کی شکل اختیار کر لیں تو ہمیں چاروناچار ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس صورت میں خواہ ان کا مشورہ اچھا سمجھا جاتا یا برا مگر وہ واقعات کے مطابق ہوتا۔ مگر شاستری صاحب تو اس سے کہیں آگے بڑھ گئے۔ ان کا ارشاد تھا کہ خواہ یہ تبدیلیاں کتنی ہی بری کیوں نہ ہوں ہمیں بہر حال قبول کر لینی چاہئیں۔ وہ اس معاملے میں جو قومی نقطہ نظر سے انتہائی اہمیت رکھتا تھا اور برطانوی حکومت کو سیاہ و سفید کا اختیار دینے کو تیار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کوئی شخص یا جماعت نامعلوم مستقبل کے متعلق دوسروں کے فیصلہ کو پہلے سے قبول کر سکتی ہے۔ یہ تو تب ہی ہو سکتا ہے۔ جب وہ مطلق کوئی اصول یا اخلاقی اور سیاسی معیار نہ رکھتی ہو اور اس کا دین وایمان یہی ہو کہ حاکم کے حکم پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اس وقت مصلحت کا متضاد کیا تھا۔ وہائٹ پیپر صرف پہلا مرحلہ تھا اور ابھی ان تجویزوں کے قانون بننے میں بہت سے مرحلے باقی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کے نقطہ نظر سے وہائٹ پیپر کی منزل بہت اہم تھی مگر بہر حال ابھی اسے بہت سی منزلوں سے گزرنا تھا اور یہ ممکن تھا کہ اس دوران میں اس میں اچھی یا بری تبدیلیاں ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلیاں اس بات پر منحصر تھیں کہ برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ پر مختلف فریقوں کی طرف سے کس حد تک دباؤ پڑتا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ حکومت اس کشمکش میں ہندوستانی لبرل پارٹی

کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے ان تجاویز کو کچھ بہتر بنا دے یا کم سے کم بدتر بنانے سے
باز رہے۔ مگر ابھی اصلاحات کے قبول کرنے یا رد کرنے کا سوال اٹھنے بھی نہ پایا تھا
کہ مسٹر شاستری نے زور و شور سے اعلان کر دیا کہ حکومت پر ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی
لبرل پارٹی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں اپنی طرف کھینچنے کا سوال ہی نہ تھا۔
وہ خود بخود کھچے چلے آتے تھے اور اگر حکومت انہیں دھکے دے کر نکالنا چاہتی تب بھی
نہ نکلتے۔ جہاں تک میں اس معاملے پر خود لبرل پارٹی کے نقطہ نظر سے غور کر سکتا ہوں
مجھے یہی نظر آتا ہے کہ مسٹر شاستری کی کلکتہ کی تقریر بالکل خلاف مصلحت اور لبرل
جماعت کے مقاصد کے لیے مضر تھی۔

میں نے مسٹر شاستری کی پرانی تقریر پر یہ تفصیلی بحث اس وجہ سے نہیں کی کہ
بجائے خود یہ تقریر یا لبرل فیڈریشن کا جلسہ کوئی اہمیت رکھتا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ میں
لبرل لیڈروں کی ذہنیت کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ یہ لائق اور قابل قدر لوگ ہیں۔ مگر
انتہائی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے یہ طرز عمل کیوں اختیار
کیا ہے۔ مسٹر شاستری کی اور تقریر کا بھی جو میں نے جیل میں پڑھی تھی، مجھ پر بہت
اثر ہوا۔ جون ۳۳ء میں وہ پونا میں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے جلسے میں صدر کی
حیثیت سے تقریر کر رہے تھے۔ اس میں انہوں نے یہ دکھایا کہ اگر برطانوی
عملداری ہندوستان سے یکایک اٹھ جائے تو کس قدر خطرے پیدا ہو جائیں گے
اور سیاسی تحریکیں باہمی نفرت اور ایک دوسرے پر جبر و تشدد کر کے کیا آفت برپا کر
دیں گے۔ بقول ان کے برطانیہ کی سیاسی زندگی ہمیشہ رواداری پر مبنی رہی ہے اس
لیے اگر ہندوستان کی آئندہ نشو و نما برطانیہ کے اتحاد عمل سے ہو تو یہاں رواداری پیدا
ہونے کی زیادہ امید ہو سکتی ہے۔ جیل میں ہونے کی وجہ سے میرے پاس اس تقریر کا
ماخذ صرف اس کا وہ خلاصہ تھا جو کلکتے کے اسٹیٹسمین میں شائع ہوا۔ اس پر اسٹیٹسمین نے
یہ لکھا کہ ”یہ بڑا دل خوش کن نظریہ ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر مونجے نے بھی

حال ہی میں اسی قسم کی تقریریں کی ہیں'' اپنی تقریر کے آخر میں مسٹر شاستری نے اس کا ذکر کیا کہ روس، اٹلی اور جرمنی میں رعایا کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور ان پر وحشیانہ مظالم ہو رہے ہیں۔

اس کو پڑھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں مسٹر شاستری کا خیال برطانیہ کی انتہائی قدامت پرست جماعت سے کس قدر حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے۔ دونوں میں کچھ جزوی اختلافات ضرور ہیں، مگر بنیادی خیال ایک ہی ہے۔ اگر مسٹر ونسٹن چرچل بھی بالکل انہیں الفاظ میں تقریر کرتے تو کوئی بات ان کے اصول کے خلاف نہ ہوتی۔ مسٹر شاستری ہماری لبرل پارٹی کے ترقی پسند فریق سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے سب سے قابل لیڈر ہیں۔

افسوس ہے کہ میں شاستری کے تاریخی نظریئے اور ان خیالات سے جو وہ ممالک عالم خصوصاً برطانیہ اور ہندوستان کے متعلق رکھتے ہیں مطلق اتفاق نہیں کر سکتا۔ غالباً انگریزوں کے سوا کوئی شخص بھی ان کی تائید نہیں کرے گا بلکہ بعض روشن خیال انگریز بھی ان سے متفق نہ ہوں گے۔ شاستری صاحب میں یہ کمال ہے کہ وہ دنیا کو اور خود اپنے ملک کو برطانوی حکمرانوں کی متعصبانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے اپنی تقریر میں ان غیر معمولی واقعات کا کوئی ذکر نہیں کیا جو پچھلے اٹھارہ مہینے میں ہندوستان میں پیش آ چکے تھے اور عین اس تقریر کے وقت پیش آ رہے تھے۔ انہوں نے روس، اٹلی اور جرمنی کے مظالم بیان کر ڈالے مگر خود اپنے ملک کے خوفناک جبر و تشدد اور ہر قسم کی قانونی آزادی کی پامالی کا نام تک نہ لیا۔ ممکن ہے کہ انہیں صوبہ سرحد کے ہولناک واقعات اور بنگال کے حالات (جنہیں بابو راجندر پرشاد نے حال میں کانگریس کے خطبہ صدارت میں ''قیامت بنگال'' سے تعبیر کیا تھا) نہ معلوم ہوں، اس لیے کہ ان پر احتساب کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ مگر کیا انہیں یہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کہ ہندوستان سخت مصیبت میں ہے اور

ان کے ہم قوم ایک زبردست دشمن ہے سے شدید جنگ میں مصروف ہیں جن پر ان کی موت اور زندگی کا انحصار ہے؟ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ملک کے بڑے بازاری ہے، لوگ جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں؟ کیا انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ جس آزادی اور رواداری کے لیے وہ برطانیہ کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے اسے خود برطانیہ ہندوستان میں کچل رہا ہے؟

اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کانگریس سے متفق تھے یا نہیں تھے۔ انہیں اس کا پورا حق تھا کہ وہ کانگریس کی پالیسی پر تنقید کریں اور اسے برا کہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایک ہندوستانی، ایک محبّ آزادی، ایک ذی حس انسان کی حیثیت سے ان پر اپنے ملک کے مردوں اور عورتوں کی حیرت انگیز بہادری اور قربانی کا کچھ اثر نہیں ہوا؟ کیا انہیں یہ دیکھ کر مطلق تکلیف نہیں ہوئی کہ ہمارے حکمران ہندوستان کے دل پر آرے چلا رہے ہیں؟ کیا انہیں اس پر کوئی جوش نہیں آیا کہ بیسیوں ہزار آدمی ایک زبردست سلطنت کی قوت کے آگے جھکنے اور اپنی روح کو ہلاک کرنے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کے جسم روند ڈالے جائیں، ان کے گھر برباد ہو جائیں اور ان کے پیارے دنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کریں؟ ہم لوگ جیل میں اور جیل سے باہر صبر کا اظہار کرتے تھے، ہنستے تھے اور مسکراتے تھے مگر اکثر تبسم کے ساتھ ہماری آنکھوں میں آنسو جھلک آتے تھے اور کبھی کبھی ہمارا ہنسنا رونے سے مشابہ ہوتا تھا۔

ایک بہادر اور فراخ دل انگریز مسٹر ویریرایلون نے ان تاثرات کا ذکر کیا ہے۔ جو اس منظر سے اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۳۰ء کے متعلق لکھتے ہیں" ایک قوم کی قوم کو اپنی غلامی زنجیریں توڑتے ہوئے اور عزم و استقلال کی بلندی پر چڑھتے ہوئے دیکھنا ایک عجیب وغریب تجربہ تھا" اور ایک موقع پر "ستیا گرہ کی تحریک میں کانگریس کے اکثر والنٹیروں کا وہ حیرت انگیز انضباط جس کا ایک صوبے کے گورنر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے......"

مسٹر سری نواس شاستری ایک قابل اور زود حس آدمی ہیں۔ اور ان کے ہم وطن ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہوا اور انہیں اس تحریک میں اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی نہ تھی۔ ان سے یہ توقع تھی کہ ان کی آواز جبر وتشدد کے خلاف اٹھے گی جس کے ذریعہ حکومت تمام قانونی حقوق کو پامال کر رہی تھی اور ہر قسم کی پبلک جدوجہد کو روک رہی تھی۔ یہ امید تھی کہ وہ اور ان کے رفیق خود مصیبت زدہ علاقوں، یعنی صوبہ سرحد، اور بنگال میں جائیں گے اس لیے نہیں کہ کانگریس یا سول نافرمانی کو مدد دیں بلکہ اس لیے کہ حکام اور پولیس کی زیادتیوں کا پردہ فاش کر کے انہیں روکیں۔ دوسرے ملکوں میں سیاسی اور مدنی آزادی کے حامی عموماً یہ کرتے ہیں مگر بجائے اس کے کہ وہ عاملہ کے استبداد کو روکتے جو ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو کچل رہا تھا اور جس نے انہیں معمولی حقوق سے بھی محروم کر دیا تھا یا کم سے کم حقیقت حال سے واقفیت حاصل کرتے، انہوں نے برطانوی قوم کو حمایت، آزادی اور رواداری کی سند دیدی۔ عین سی وقت جب یہ خوبیاں ہندوستان کی برطانوی حکومت میں نام کو بھی نہ تھی۔ اپنی اخلاقی تائید سے انہوں نے حکومت کی ہمت افزائی کی اور اس کے استبداد کو تقویت پہنچائی۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی نیت یہ نہ ہو گی اور انہیں اپنے طرز عمل کے نتائج کا اندازہ نہیں ہوا ہو گا۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان کی تقریر کا یہی اثر ہوا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان کے یہ خیالات اور یہ عمل کیوں ہے؟

مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا سوا اس کے کہ لبرل پارٹی نے اپنے ہم وطنوں سے اور جدید خیالات سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے۔ جو فرسودہ کتابیں انہوں نے پڑھی ہیں ان کی بدولت ہندوستانیوں کے حالات اور خیالات ان کی نظر سے چھپ گئے ہیں اور وہ خود پرستی میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم جیل میں گئے اور ہمارے جسم کال کوٹھڑی میں بند رہے مگر ہمارے ذہن قید سے آزاد، ہماری روحیں

ہیبت اور دہشت سے بری ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے ایک ذہنی قید خانہ بنالیا جس میں وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ مگر نجات کی کوئی صورت نہیں پاتے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز جیسی اب ہے ویسی ہی رہنی چاہیے۔ مگر جب حالات بدلے جیسا کہ اس بدلنے والی دنیا کا دستور ہے، تو ان کی بے پتوار کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ وہ جسمانی اور ذہنی حیثیت سے بے بس ہو کر رہ گئے۔ نہ ان کا کوئی نصب العین رہا اور نہ اخلاقی معیار۔ ہم میں سے ہر شخص کو دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرنی ہے یا خود قدم بڑھائے یا دھکے دے کر آگے بڑھایا جائے۔ اس حرکت پذیر دنیا میں کوئی ساکن نہیں رہ سکتا۔ ہمارے لبرل حرکت اور تغیر سے ڈرتے تھے۔ اس لیے وہ اس طوفان کو دیکھ کر، جو چاروں طرف سے اٹھ رہا تھا بدحواس ہو گئے ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ موجوں کو چیر کر آگے بڑھیں اس لیے ڈبکیاں کھانے لگے اور جو تنکا سامنے آ گیا اس کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ ہندوستان کی سیاست میں ان کی حیثیت شیکسپیئر کے ہملٹ کی سی ہو گئی "جس کے چہرے پر فکر کی زردی چھائی رہتی تھی" اور شک، ہچکچاہٹ اور تذبذب کا شکار ہو کر رہ گئے۔

"زمانے کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ برا ہو تقدیر کی ستم ظریفی کا جس نے مجھے اسے سمیٹنے کے لیے پیدا کیا۔"

سرونٹ آف انڈیا نے، جو لبرل جماعت کا ہفتہ وار اخبار ہے، سول نافرمانی کے آخری دنوں میں کانگریس والوں پر الزام لگایا کہ وہ خود ہی جیل جاتے ہیں، اور پھر چاہتے ہیں کہ رہا کر دیئے جائیں۔ وہ اس پر خفا تھا کہ کانگریس کی لے دیکے یہی ایک پالیسی رہ گئی ہے اور لبرل جماعت کی پالیسی کیا تھی؟ برطانوی وزیروں کی خدمت میں ڈپوٹیشن بھیجنا اور دعائیں مانگتے رہنا کہ انگلستان کو میں حکومت بدل جائے۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ کانگریس کی پالیسی ان دنوں زیادہ تر یہی تھی، کہ لوگ

تعزیری ضابطوں کی خلاف ورزی کر کے جیل جائیں اور صحیح ہے کہ قوم ایک مدت تک لڑتے لڑتے پست ہوگئی تھی۔اور حکومت پر کچھ زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی۔مگر یہ پالیسی اخلاقی اور عملی مصلحتوں پر مبنی تھی۔

کھلا ہوا استبداد، جو ان دنوں ہندوستان میں ہو رہا تھا، حکومت کو بہت مہنگا پڑتا تھا، خود اس کے لیے بھی یہ بڑی تکلیف دہ اور پریشان کن آزمائش تھی اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ پالیسی آخر میں اس کی قوت کی بنیادوں کو کمزور کر دے گی۔اس سے نہ صرف ہندوستانی قوم بلکہ ساری دنیا کے سامنے اس طرز حکومت کا پردہ فاش ہو رہا تھا۔وہ اسے بدرجہا بہتر سمجھتی تھی کہ اس کا آہنہ پنجہ مخمل کے دستانے میں چھپا رہے۔حکومت کے لیے اس سے زیادہ ناگوار اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں کہ اسے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے جو کسی حال میں بھی اس کی مرضی کے آگے سر نہ جھکائیں۔اس لیے استبدادی قوانین کی خلاف ورزی کی متفرق اور منتشر کوششیں بھی فائدے سے خالی نہ تھیں۔ان سے قوم کو تقویت پہنچتی تھی اور حکومت کی ہمت پست ہوتی تھی۔

اخلاقی مصلحت اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔تھورو کا مشہور مقولہ ہے ''جب مرد اور عورتیں بے انصافی سے قید کی جا رہی ہوں تو ہر انصاف پسند مرد اور عورت کو قید خانے جانا چاہیے'' ممکن ہے کہ مشہور لبرل حضرات اور دوسرے بزرگوں کو پسند نہ آئے لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ موجودہ حالات میں ''اخلاقی زندگی'' ناقابل برداشت ہے، جبکہ سول نافرمانی کے علاوہ یوں بھی ہمارے اکثر رفیق قید فرنگ میں گرفتار رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کا نظام ہمیں ہر وقت دباتا اور ذلیل کرتا رہتا ہے اور ہماری قوم کو ڈستا رہتا ہے۔ہم اپنے ملک میں مشتبہ لوگوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ہر وقت ہماری نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہتی ہے، ہر لفظ جو ہماری زبان سے نکلتا ہے قلم بند کر لیا جاتا ہے کہ کہیں اس میں ہمہ گیر قانون

بغاوت کی خلاف ورزی نہ ہو، ہمارے خطوط کھول لیے جاتے ہیں اور ہمیں ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ عاملانہ حکم امتناعی یا گرفتاری کا پروانہ نہ آرہا ہو، ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو حکومت کی قوت کے آگے سر جھکا دیں، روحانی ذلت اختیار کرلیں، اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیں، اپنی اخلاقی دولت کو ادنیٰ اغراض کے بدلے بیچ ڈالیں یا مخالفت کریں اور اس کی سزا بھگتیں۔ کوئی شخص خوشی سے جیل جانا یا تکلیف اٹھانا نہیں چاہتا۔ مگر اکثر جیل جانا ذلت کی زندگی بسر کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ بہ قول برنارڈ شاہ کے ''زندگی کی حقیقی مصیبت یہ ہے کہ انسان موقع پرستوں کے ہاتھوں میں اغراض کا آلہ بن کر رہے جن کو وہ ادنیٰ اور ذلیل جانتا ہے۔ اور جتنی مصیبتیں وہ زیادہ سے زیادہ بدقسمتی اور تقدیری حوادث کا حکم رکھتی ہیں۔ یہی ایک چیز ہے جو شامت، غلامی اور دنیا کا دوزخ ہے۔''

-----------اختتام --حصہ دوئم---------

طویل سزا کا خاتمہ

میری رہائی کا وقت قریب آرہا تھا۔ "نیک چلنی" کی بناء پر مجھے حسب معمول چھوٹ ملی تھی اس لیے میری دو سال کی سزا میں ساڑھے تین مہینے کی تخفیف ہو گئی تھی۔ رہائی کی توقع نے میرے سکون قلب میں خلل ڈال دیا تھا یا یوں کہیے کہ وہ عام بے حسی جو جیل میں پیدا ہو جاتی ہے دور ہو گئی تھی۔ باہر نکل کر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ بڑا مشکل سوال تھا اور چونکہ اس کا کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس لیے رہائی کا سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا۔ مگر یہ عارضی کیفیت تھی جو بہت جلد گزر گئی، میرا مدتوں کا دبا ہوا جوش عمل ابھر آیا اور میں بے چینی سے رہائی کا انتظار کرنے لگا۔

جولائی ۳۳ء کے آخر میں دردناک خبر آئی کہ ج۔ م سین گپتا کا یکا یک انتقال ہو گیا، ہم دونوں نہ صرف کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں برسوں سے ساتھ ساتھ کام کرتے رہے تھے بلکہ میرے اور ان کے اس زمانے کے تعلقات تھے جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا۔ وہیں پہلے پہل میری ان کی ملاقات ہوئی تھی جب میں وہاں داخل ہوا تو وہ سند حاصل کر کے فارغ ہو چکے تھے۔

سین گپتا کا انتقال نظر بندی کے دوران ہوا۔ ۳۲ء کے آغاز میں وہ یورپ سے واپس آئے تو ابھی انہوں نے ساحل بمبئی پر قدم بھی نہ رکھا تھا کہ شاہی قیدی کی حیثیت سے گرفتار کر لیے گئے۔ اس وقت سے وہ برابر قید یا نظر بند رہے اور ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ حکومت نے انہیں بہت کچھ سہولتیں بہم پہنچائیں لیکن مرض برابر بڑھتا گیا۔ ان کی آرتھی کے موقع پر کلکتہ میں ایک عظیم الشان مظاہرہ اور بے شمار آدمیوں نے نذر عقیدت پیش کی۔ گویا مظلوم بنگال کے گھٹے ہوئے جذبات کو کم سے کم عارضی طور پر نکاس کا ایک راستہ مل گیا۔

غرض سین گپتا ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے سوبھاش بوس بھی شاہی قیدی تھے ان کی صحت بھی مدتوں قید اور نظر بند رہنے سے خراب ہو گئی تھی، خدا خدا

کر کے حکومت نے انہیں علاج کی غرض سے یورپ جانے کی اجازت دی۔ ہمارے پرانے اور آزمودہ کار لیڈر وٹھل بھائی پٹیل بھی یورپ میں بیمار پڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے جیل کی مصیبتوں اور باہر کی پیہم مصروفیتوں کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے سدھار گئے، یا اپنی صحت کھو بیٹھے۔ پھر کتنے ایسے تھے جنہیں اگر چہ بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن اس غیر طبعی زندگی کی وجہ سے ان کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا اور ان کے نفس میں طرح طرح کی گرہیں پڑ گئیں۔

سین گپتا کی موت نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں نے دیکھا کہ سارا ملک خاموشی سے انتہائی مصیبتیں اٹھا رہا ہے۔ مجھ پر افسردگی اور اداسی چھا گئی اور میں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سب کس لیے؟

صحت کے معاملہ میں، میں بڑا خوش قسمت ہوں۔ اگر چہ کانگریس کے کام میں مجھے سخت محنت کرنا پڑی اور میں نے نہایت بے ترتیب زندگی گزاردی لیکن میری صحت ہمیشہ اچھی رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ میرے قویٰ خلقی طور پر بہت اچھے تھے۔ دوسرے یہ کہ میں اپنے جسم کی بڑی نگہداشت کرتا تھا۔ جس طرح بیمار اور کمزوری کو برا سمجھتا تھا اسی طرح موٹاپے کو بھی سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس لیے کافی ورزش، تازہ ہوا اور سادہ غذا کے ذریعے سے میں ان دونوں سے محفوظ رہا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اوسط طبقے کی بہت سے بیماریوں کی وجہ غلط قسم کی غذا ہے۔ اس میں چکنائی اور ثقیل اجزا بہت ہوتے ہیں اور مقدار میں بھی زیادہ ہوتی ہے (یہ صرف ان لوگوں کو ذکر ہے جو اسراف کی مقدرت رکھتے ہیں) لاڈ کرنے والی ماں اپنے بچوں کو مٹھائیاں اور طرح طرح کی چیزیں' ٹھونس ٹھونس کر کھلاتی ہے اور ابتدا سے سوہضمی کا بیج بو دیتی ہے جو پھر تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس کے علاوہ بچوں پر بہت سے کپڑے بھی لاد دیئے جاتے ہیں۔ ہندوستان آ کر انگریزوں کی خوراک بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اگر چہ ان کی غذا میں چکنائی اور ثقیل چیزوں کی اتنی

بھرمار نہیں ہوتی، غالباً اب وہ اپنے اجداد کے مقابلہ میں کچھ سنبھل گئے ہیں جو بہت بڑی مقدار میں گرم اور ثقیل غذا کھایا کرتے تھے۔

میں کبھی غذا کی اصلاح کے وہم میں نہیں پڑا صرف ثقیل غذاؤں اور زیادہ کھانے سے پرہیز کرتا رہا۔قریب قریب تمام کشمیری برہمنوں کی طرح ہمارا خاندان بھی گوشت کھایا کرتا تھا اور اس لیے بچپن سے میں بھی گوشت کھاتا رہا اگرچہ مجھے اس کا شوق نہ تھا۔۱۹۲۰ء میں جب عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو میں نے گوشت کھانا ترک کردیا اور نباتی غذا کا پابند ہوگیا۔ چھ برس تک میں نے گوشت نہیں کھایا لیکن یورپ جا کر کھانے لگا۔ ہندوستان آ کر پھر چھوڑ دیا اور اس وقت سے اب تک میں کم و بیش نباتی غذا کا پابند رہا ہوں۔گوشت مجھے موافق آتا ہے لیکن اب مجھے اس سے رغبت نہیں رہی ہے بلکہ کراہت معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۳۲ء میں جیل خانے میں کئی مہینہ تک مجھے روزانہ حرارت رہتی تھی، اس قسم کی خفیف علالتیں مجھے بہت ناگوار ہوتی تھیں کیونکہ مجھے اپنی صحت پر جو گھمنڈ تھا اسے صدمہ پہنچتا تھا،قوت حیات اور جوش عمل کا جو تصور میرے پیش نظر رہا کرتا تھا وہ اب قائم نہیں رہا اور ضعف اور انحطاط کا خیال مجھے ستانے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے موت سے کچھ زیادہ خوف نہیں ہے لیکن دماغ اور جسم کا آہستہ آہستہ گھلنا بالکل دوسری چیز تھی۔لیکن میرا وہم غلط ثابت ہوا۔میری طبیعت سنبھل گئی اور میں نے اپنی صحت پر پھر قابو پالیا۔جاڑوں میں دیر تک ''دھوپ کا غسل'' کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔اور مجھے پھر تندرستی کا احساس ہونے لگا۔جس زمانے میں میرے جیل کے ساتھی کوٹ پہنے اور شال اوڑھے سردی سے کانپتے رہتے تھے میں ننگا دھوپ میں بیٹھا رہتا تھا اور سورج کی خوشگوار گرمی کا لطف اٹھاتا تھا۔ یہ چیز صرف جاڑے کے موسم اور وہ بھی شمال ہند میں ممکن ہے۔کیونکہ اور جگہ تو بہت سخت دھوپ پڑتی ہے۔

ورزشوں میں شرش آسن میں مجھے خاص لطف آتا تھا۔اس کی ترکیب یہ ہے کہ

سر کے بل کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں گونتھ کر ان سے گردن کو سہارا دیا جائے اور کہنیاں زمین پر ٹکی رہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ورزش جسمانی صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ لیکن میں اس لیے اسے زیادہ پسند کرتا تھا کہ مجھ پر اس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا پڑتا تھا۔ اس کرتب سے جو کسی قدر مضحک تھا، تفریح ہوتی تھی اور زندگی کی خفیف الحرکاتی سے طبیعت زیادہ مانوس ہو جاتی تھی۔

افسردگی اور اداسی کے دوروں میں جو جیل میں لازمی طور پر ہوتے ہیں، صحت اور تندرستی کا یہ احساس بہت کم آتا تھا اور اسی کی بدولت میں جیل کے اندر اور جیل کے باہر نت نئے حالات کے ساتھ نبھاتا رہا۔ مجھے بہت سے دھچکے پہنچے، جو اس وقت نا قابل برداشت معلوم ہوتے تھے، لیکن مجھے خود حیرت ہے کہ میں خلاف توقع ان سے بہت جلد سنبھل گیا۔ میرے دل و دماغ کی صحت اور اعتدال کا ایک ثبوت یہ ہے کہ نہ تو آج تک میرے سر میں درد ہوا اور نہ کبھی بے خوابی کی شکایت ہوئی۔ تہذیب جدید کی ان عام بیماریوں سے اور ضعف بصارت سے بھی محفوظ رہا۔ گرچہ میں کثرت سے پڑھتا لکھتا رہا ہوں اور وہ بھی بعض اوقات جیل کی دھندلی سی روشنی میں، مگر میری نظر اب تک کمزور نہیں ہوئی۔ پچھلے سال ایک امراض چشم کے ماہر کو اس پر سخت تعجب ہوا۔ آٹھ سال پہلے انہوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ دو ایک سال کے اندر ہی تمہیں عینک کی ضرورت پڑ جائے گی۔ لیکن ان کی رائے غلط نکلی اور آج بھی میں بغیر عینک کے اچھی طرح سب کام کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان باتوں سے لوگ مجھے نہایت معتدل اور محتاط سمجھنے لگیں اس لیے میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ان لوگوں سے سخت وحشت ہوتی ہے جو کسی وقت اعتدال اور احتیاط کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

ادھر میں جیل میں اپنی رہائی کا منتظر تھا اور ادھر ملک میں سول نافرمانی کی نئی صورت یعنی انفرادی نافرمانی شروع ہو رہی تھی۔ گاندھی جی نے خود اس کی ابتدا کی

اور حکام کو پہلے سے اطلاع دینے کے بعد یکم اگست کو گجرات کے کسانوں کو سول نافرمانی کی تلقین کرنے کے ارادہ سے روانہ ہو گئے۔ انہیں فوراً گرفتار کر کے ایک سال کی سزا کر دی گئی اور پھر یروادا جیل بھیج دیئے گئے تھے۔ مجھے ان کے دوبارہ جیل جانے سے خوشی ہوئی۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ گاندھی جی نے اصرار کیا کہ مجھے جیل میں بھی ہریجن سدھار کا کام کرنے کی وہی سہولتیں ملنا چاہئیں جو باہر حاصل تھیں لیکن حکومت نے صاف انکار کر دیا۔ یکایک ہمیں اطلاع ملی کہ گاندھی جی نے پھر اس سلسلے میں برت شروع کر دیا ہے۔ ہمیں تو یہ بات عجیب و غریب معلوم ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھایا جائے۔ چاہے حکومت کے مقابلے میں ان کی دلیلیں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں پھر بھی ان کا یہ فیصلہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ لیکن ہم بالکل بے بس تھے اور حیرت کے عالم میں حالات کی رفتار کو دیکھ رہے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد ان کی حالت بڑی تیزی سے خراب ہونا شروع ہوئی۔ اس لیے وہ جیل سے اسپتال پہنچا دیئے گئے لیکن یہاں بھی وہ قیدی کی حیثیت سے تھے اور حکومت انہیں ہریجن سدھار کے کام میں کوئی سہولتیں بہم پہنچانے کو تیار نہ تھی۔ پچھلے برتوں میں انہوں نے عزم حیات کو نہیں چھوڑا تھا مگر اب کی بار انہوں نے بالکل کندھا ڈال دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بس چند دن کے مہمان ہیں۔ انہیں سب کو الوداع کہا اور ان چند چیزوں کے متعلق جو اسپتال میں ان کے پاس تھیں وصیت بھی کر دی۔ ان میں سے بعض چیزیں نرسوں کو دیں لیکن حکومت کب چاہتی تھی کہ ان کی موت کا الزام اس کے سر آئے اس لیے اسی روز شام کو یکایک وہ رہا کر دیئے گئے۔ یہ رہائی عین وقت پر ہوئی اگر ایک دن بھی دیر ہو جاتی تو بس کام تمام تھا۔ ان کی جان بچانے کا سہرا اصل میں سی۔ ف اینڈریوز کے سر ہے جو گاندھی جی کے حکم کے خلاف ہندوستان بھاگے ہوئے آئے۔

اسی عرصہ میں میں ۲۳ اگست کو دہرہ دون جیل سے نینی جیل تبدیل کیا گیا۔کوئی ڈیڑھ برس دوسری جیلوں میں رہنے کے بعد میں یہاں واپس آیا تھا۔ اسی مجھے اطلاع ملی کہ میری ماں سخت بیمار ہیں اور اسپتال پہنچا دی گئی ہیں۔ چونکہ ان کی حالت نازک تھی اس لیے میں ۳۰ اگست کو رہا کر دیا گیا۔ویسے میری میعاد ۱۲ ستمبر کو ختم ہوتی تھی۔غیر معمولی حالات کی وجہ سے صوبے کی حکومت نے میرے ساتھ ۱۳ دن کی اور رعایت کر دی۔

گاندھی جی سے ملاقات

رہائی کے بعد میں سیدھا اپنی بیمار کے ماں کے پاس لکھنو گیا اور چند روز ان کے پاس رہا۔ میں بہت عرصے کے بعد جیل سے باہر نکلا تھا اس لیے اپنے ماحول سے بیگانگی سی محسوس کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ صدمہ سا ہوا کہ دنیا رنگ بدلتی ہوئی بہت آگے بڑھ گئی تھی اور میں جیل میں پڑا سڑتا رہا۔ جیل سے باہر نکل کر سب پر یہی کیفیت گزرتی ہے۔ ہم باہر آ کر دیکھتے ہیں کہ وہ ننھے بچے، لڑکے اور لڑکیاں جنہیں ہم بہت چھوٹا چھوڑ گئے تھے اب ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہیں۔ بہت سی شادیاں، ولادتیں اور موتیں ہو چکی ہیں۔ دنیا محبت اور نفرت، کام اور کھیل الم و راحت کے بہت سے منظر دیکھ چکی ہے۔ زندگی کی نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہو گئی ہیں بحث کے نئے نئے موضوع اٹھ کھڑے ہوئے ہیں غرض میں جو کچھ سنتا یا دیکھتا تھا اس میں میرے لیے حیرت کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا تھا، جیسے زندگی مجھے جہالت کے گڑھے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ کوئی خوش گوار خیال نہ تھا یہ ممکن تھا کہ میں بہت جلد اپنے ماحول سے ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر لیتا لیکن میں نے اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں نے خیال کیا کہ مجھے صرف چند روز جیل سے باہر رہنا ہے اس کے بعد پھر وہیں جانا پڑے گا اس لیے میں ان چیزوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کیوں کروں، جو مجھ سے بہت جلد چھوٹ جائیں گی۔ حکومت دبا رہی تھی اور کبھی کبھی گرفتاریاں بھی ہو جاتی تھیں لیکن اس وقت ہندوستان کی یہ خاموشی بڑی معنی خیز تھی۔ یہ وہ منحوس خاموشی تھی جو خوفناک تشدد کے بعد چھا جاتی ہے وہ خاموشی جو زبان حال سے بہت کچھ کہتی، لیکن تشدد کرنے والی حکومتیں اسے سن نہیں سکتیں۔ اس وقت ہندوستان میں اس ریاست کا مکمل نمونہ تھا جو محض پولیس کا کام کرتی ہے۔ پولیس کی ذہنیت حکومت کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرح کی مخالف آواز دبا دی جاتی تھی خفیہ پولیس والوں، جاسوسوں اور مخبروں کا سارے

ملک میں ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ عام طور پر لوگوں پر خوف و ہراس طاری تھا۔ اور ساری فضا میں اخلاقی پستی کے آثار نمایاں تھے۔ حکومت ہر طرح کی سیاسی جدوجہد کو فوراً دبا دیتی تھی خصوصاً دیہاتی علاقوں میں۔ مختلف صوبوں کی حکومتیں اس کی کوشش کر رہی تھیں کہ میونسپلٹی اور لوکل بورڈ کی ملازمت سے کانگریس والوں کو نکال باہر کیا جائے۔ ان کی نظر میں وہ شخص جو سول نافرمانی کے سلسلے میں جیل ہو آیا ہو، میونسپل مدارس میں تعلیم دینے یا میونسپلٹی میں اور کوئی کام کرنے کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ میونسپلٹیوں پر بہت دباؤ ڈالا گیا اور انھیں دھمکی دی گئی کہ اگر کانگریس والوں کو برخاست نہیں کیا تو سرکاری امداد بند کر دی جائے گی۔ اس جبر اور زیادتی کی سب سے نمایاں مثال کلکتہ کارپوریشن میں دیکھنے میں آئی۔ میرا خیال ہے کہ آخر حکومت بنگال نے ایسا قانون بنا دیا کہ جو شخص کسی سیاسی جرم میں سزایاب ہو چکا ہو وہ کارپوریشن میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔

جرمنی میں نازی جو زیادتیاں کر رہے تھے، ہندوستان کے برطانوی افسروں اور ان کے اخباروں پر اس کا عجیب و غریب اثر پڑتا تھا۔ اسے وہ اپنے طرز عمل کے جواز میں پیش کرتے تھے اور اپنی نیکی پر ناز کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اگر نازی تمہارے حاکم ہوتے تو تمہاری کیا گت بنتی؟ نازیوں نے تشدد کے عجیب و غریب طریقے ایجاد کئے تھے اور جبر کی حد کر دی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ ممکن ہے ان کی حکومت میں ہماری حالت اس سے بدتر ہوتی لیکن میں اس کا صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ گزشتہ پانچ سالوں میں خود ہندوستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس سے میں پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ حکومت ہند اس نیک اصول کی قائل ہے کہ سیدھا ہاتھ جو کچھ کرے الٹے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ غیر جانب دارانہ تحقیقات کی تجویز کو رد کر دیتی ہے۔ حالانکہ اس قسم کی تحقیقات میں ہمیشہ اسی کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام انگریز

وحشیانہ مظالم سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نازیوں کی
طرح کھلم کھلا ''بہمیت'' پر فخر کریں اور اس کا وظیفہ پڑھیں۔ اگر وہ کبھی بہمیت سے
کام بھی لیتے ہیں تو انھیں خود اس پر شرم آتی ہے۔ لیکن چاہے جرمن ہو یا انگریز یا
ہندوستانی، سبھی تہذیب کا ملمع اتنا ہلکا ہے کہ جذبات کی رگڑ سے فوراً اتر جاتا ہے اور
پھر اندر سے وہ چیز نکل آتی ہے جسے دیکھ کر کراہت آتی ہے۔ جنگ عظیم نے انسانوں
میں خوفناک بہمیت پیدا کر دی ہے۔ اس کے اثرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے
ہیں۔ یعنی صلح کے بعد بھی جرمنی کا بحری محاصرہ جاری رہا اور اشیائے خوردنی کے
دستیاب نہ ہونے سے لوگوں کو فاقے کرنے پڑے۔ اس کے متعلق ایک انگریز
مصنف لکھتا ہے کہ ''دنیا کی کسی قوم نے ایسا احمقانہ، خوفناک اور وحشیانہ ظلم نہ کیا ہو
گا۔'' ہندوستان میں بھی ۵۷ء اور ۵۸ء کی یاد دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ جب کبھی
کسی کے مفاد اور حقوق خطرے میں ہوتے ہیں تو پھر شرافت اور تہذیب کو بالائے
طاق رکھ دیا جاتا ہے جھوٹ کا نام پروپیگنڈہ پڑ جاتا ہے۔ بہمیت کو ''سائنٹفک تشدد''
اور امن و انصاف کا تحفظ کہنے لگتے ہیں۔ اس میں افراد یا کسی خاص قوم کا کوئی قصور
نہیں ہے۔ ان حالات میں ہر شخص کا کم و بیش یہی طرز عمل ہوتا ہے۔ ہر محکوم ملک کی
طرح ہندوستان میں بھی ہمیشہ حکمراں قوت کی مخالفت کا ایک دبا ہوا جذبہ موجود رہتا
ہے۔ کبھی کبھی یہ بھڑک اٹھتا ہے اور خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس مخالفت
سے حکمراں قوم میں اچھی بری ہر طرح کی فوجی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ گزشتہ چند
سال میں ہمیں ہندوستان میں ان فوجی صفات کا بہت اچھی طرح تجربہ ہوا کیونکہ
ہمیشہ سے اس فوجی ذہنیت سے (جو حقیقی سپاہیانہ روح سے خالی ہے) سابقہ رہا
ہے۔ یہ شہنشاہی کا لازمی نتیجہ ہے اور اس میں حاکم اور محکوم دونوں کی ذلت ہے
ہندوستانیوں کی ذلت تو کھلی ہوئی ہے لیکن انگریزوں کی ذلت اس قدر آسانی سے
محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ جب نازک وقت آتا ہے تو یہ صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان

کے علاوہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جس کے حصہ میں بدقسمتی سے دونوں قسم کی ذلتیں آتی ہیں۔

جیل میں مجھے اتنی کافی فرصت تھی کہ میں نے اعلیٰ افسروں کی تقریریں، ان کے اسمبلی اور کونسلوں کے سوالات کے جواب اور حکومت کے اعلانات سب تفصیل سے پڑھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ گزشتہ تین برس میں ان میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے اور یہ تبدیلی رفتہ رفتہ زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ ان کا لہجہ زیادہ درشت اور تحکمانہ ہوگیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک سرجنٹ میجر اپنے سپاہیوں کو حکم دے رہا ہو۔ اس کی ایک دلچسپ مثال وہ تقریر ہے جو مدناپور (بنگال) کے کمشنر نے نومبر یا دسمبر ۳۳ء میں کی تھی۔ یہ چنگیز خانی شان تمام سرکاری تقریروں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ غیر سرکاری یورپی خصوصاً بنگال میں سرکاری افسروں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ ان کی تقریر اور عمل دونوں میں بالکل فاشسٹی ذہنیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

بہمیت کی ایک دوسری بین مثال سندھ میں دیکھنے میں آئی۔ حال ہی میں وہاں چند مجرموں کو منظر عام پر پھانسی دی گئی، چونکہ سندھ میں جرائم بڑھ رہے تھے اس لیے افسروں نے طے کیا کہ ان مجرموں کو سب کے سامنے پھانسی دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ یہ وحشیانہ منظر دیکھنے کے لیے عام لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ سنا ہے کہ اس وقت ہزاروں آدمی جمع ہوگئے تھے۔

غرض رہائی کے بعد میں نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ لیا۔ ان کو میں نے کچھ خوشگوار نہیں پایا۔ میرے بہت سے ساتھی جیل میں تھے اور گرفتاریاں ابھی جاری تھیں۔ تمام تعزیری ضابطے ابھی تک نافذ تھے۔ احتساب اخباروں کا گلا گھونٹ رہا تھا اور اس نے ہماری خط وکتابت میں ابتری ڈال رکھی تھی۔ میرے ایک رفیق کار، رفیع احمد قدوائی، سنسر کی زیادتیوں سے نالاں تھے۔ ان کے

خط روک لیے جاتے تھے۔ دیر سے ملتے تھے یا غائب ہو جاتے تھے جس سے ان کے کاموں میں گڑبڑ ہوتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ سنسر سے درخواست کریں کہ اپنا فرض ذرا معقولیت سے انجام دے، لیکن مشکل یہ تھی کہ لکھیں کسے کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ سنسر کون ہے۔ غالباً وہ کوئی خفیہ پولیس افسر ہوتا ہے جو پوشیدہ طور پر اپنی خدمات انجام دیتا ہے اور اس کا وجود اور کام تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ لیکن رفیع احمد نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ سنسر کے نام خط لکھا اور لفافے پر اپنا پتہ لکھ دیا۔ چنانچہ واقعی یہ خط منزل مقصود پر پہنچ گیا اور اس کے بعد سے رفیع احمد کے خطوں کے معاملے میں زیادہ احتیاط برتی جانے لگی۔

مجھے جیل جانے کی آرزو نہ تھی۔ کیونکہ اتنے دن قید میں رہتے رہتے میرا جی بھر گیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس سے بچ نہیں سکتا بجز اس کے کہ سیاست سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اس کے لیے میں ہرگز تیار نہیں تھا اور حکومت سے ٹکراہونا ناگزیر تھا۔ وہ جب چاہتی حکم نامہ بھیج دیتی کہ فلاں کام کرو یا فلاں کام نہ کروں اور میری طبیعت اس قسم کی ہے کہ زبردستی کو برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ سارے ملک میں ہندوستانیوں کو ڈرانے اور دبانے کی کوشش کی جا رہی تھیں۔ میں اس معاملے میں بے بس تھا اور وسیع پیمانے پر کوئی جدوجہد کرنا میرے امکان سے باہر تھا بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ خود نہ ڈروں اور دب کر اطاعت نہ کروں۔

جیل جانے سے پہلے مجھے کئی کام نبٹانے تھے۔ میری ماں بیمار تھیں اور سب سے پہلے مجھے ان کی خدمت کرنی تھی۔ انہیں رفتہ رفتہ صحت ہو رہی تھی مگر اس میں اتنی دیر لگ گئی کہ تقریباً ایک سال تک وہ صاحب فراش رہیں۔ پھر میں گاندھی جی سے ملنا چاہتا تھا جو پونا میں اپنے نئے برت کے ختم ہونے کے بعد آہستہ آہستہ طاقت حاصل کر رہے تھے۔ مجھے ان سے ملے دو برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ میں چاہتا تھا کہ اپنے صوبے کے زیادہ سے زیادہ رفیقوں سے ملوں اور نہ

صرف ہندوستانیوں کی سیاسی حالت بلکہ دنیا کی عام حالت اور ان خیالات کے متعلق گفتگو کروں جو میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اس وقت میرا خیال تھا کہ دنیا سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑی تیزی کے ساتھ ہلاکت کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اور اپنا قومی پروگرام بناتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

میرے خانگی معاملات بھی میری توجہ کے محتاج تھے۔ اب تک میں ان سے انتہائی بے پروائی برتتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ والد کے انتقال کے بعد میں نے ان کے کاغذات بھی نہیں دیکھے تھے۔ ہم نے اپنے اخراجات بہت گھٹا دیئے تھے مگر اب بھی وہ ہماری موجودہ حیثیت سے زیادہ تھے تاہم جب تک ہم اپنے پرانے گھر میں رہتے ان کا اور گھٹانا مشکل تھا۔ موٹر اب ہمارے پاس نہیں تھی کیونکہ ہم اس کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ حکومت جب چاہے گی اس پر قبضہ کرلے گی۔ ایک طرف تو یہ مالی مشکلات درپیش تھیں اور دوسری طرف سینکڑوں خط آتے تھے جن میں لوگ مجھ سے مالی امداد طلب کرتے تھے (سنسر ان خطوں کو نہیں روکتا تھا) سارے ملک میں خصوصاً جنوبی ہند میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ میں بڑا مالدار آدمی ہوں۔

میری رہائی کے بعد میری چھوٹی بہن کرشنا کی منگنی ہوگئی اور میں چاہتا تھا کہ جیل بھیجے جانے سے پہلے اس کی شادی کردوں۔ کرشنا خود بھی ایک سال کی سزا بھگتنے کے بعد ابھی چند مہینے ہوئے جیل سے آئی تھی۔

جوں ہی میری ماں کی طبیعت سنبھلی میں فوراً گاندھی جی سے ملنے کے پونا روانہ ہوگیا۔ مجھے ان سے مل کر اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ گو وہ ابھی تک کمزور تھے مگر ان کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی تھی۔ ہم دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ یہ ظاہر ہے کہ سیاست، معاشیات اور زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق ہمارے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن میں ان کی شفقت کا ممنون ہوں کہ حتی

الامکان انہوں نے میرے خیالات کی رعایت مدنظر رکھی۔ میری ان کی خط و کتابت میں (جو بعد میں شائع ہو گئی) بہت سے وسیع مسائل پر جن پر میں ان دنوں غور کر رہا تھا، بحث کی گئی تھی اور اگرچہ ان کا ذکر مبہم الفاظ میں تھا۔ لیکن منشاء بالکل واضح تھا۔ میں گاندھی جی کا یہ اعلان سن کر بہت خوش ہوا کہ مستقل حقوق کو منسوخ کر دینا چاہیے۔ اگر وہ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ ہمیں جبر سے نہیں بلکہ سمجھا بجھا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہیے۔ چونکہ میرے نزدیک ان کے بعض طریقے مہذب اور معقول قسم کے جبر کے مترادف ہیں اس لیے میں دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔ مجھے پہلے کی طرح اب بھی ان سے یہ توقع تھی کہ اگرچہ وہ مبہم نظریوں پر غور کرنے کی مخالف ہیں۔ لیکن واقعات کی منطق انہیں رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دے گی کہ بنیادی سماجی ناگزیر ہے۔ وہ بھی عجیب و غریب شخص ہیں ایک طرف وہ (بہ قول مسٹر ویریر ایلون) قرون وسطیٰ کے کیتھولک اولیا کی طرح ہیں اور دوسری طرف وہ عملی رہنما ہیں اور ان کا ہاتھ ہمیشہ ہندوستانی کسانوں کی نبض پر رہتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وقت آنے پر وہ کدھر جھکیں گے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ جدھر بھی وہ جھکیں گے وہی پلہ بھاری ہو جائے گا۔ ممکن ہے وہ ہمارے نزدیک غلط راستہ اختیار کریں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کھلا ہوا راستہ ہو گا۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرنا سب سے بہتر ہے۔ لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو پھر دوسری راہ اختیار کرنی پڑے گی۔

میرے خیال میں اس وقت تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ہم اپنی قومی جدوجہد میں مصروف تھے اور اصولاً کانگریس کا پروگرام اب تک سول نافرمانی تھا اگرچہ وہ افراد تک محدود کر دی گئی تھی۔ میں نے ہی فیصلہ کیا کہ اس وقت ہمیں موجودہ صورت پر قناعت کرنی چاہیے اور اشتراکی خیالات عام لوگوں میں خصوصاً کانگریس کے ان کارکنوں میں جو سیاسیات میں کچھ دخل رکھتے ہیں پھیلانے چاہئیں۔ تاکہ آئندہ

جب کبھی ہماری پالیسی کے تعین کا موقع آئے تو ہم کافی پیش قدمی کر سکنے کے لیے تیار رہیں۔ اس وقت تو کانگریس خلاف قانون جماعت تھی اور حکومت برطانیہ اسے کچل ڈالنا چاہتی تھی اس لیے ہمیں اس کے حملے کی مدافعت کرنی تھی۔

گاندھی جی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ خود انہیں کیا کرنا چاہیے؟ وہ عجیب شش و پنج میں تھے۔ اگر وہ جیل جاتے تو پھر ہریجن سدھار کی سہولتوں کا سوال درپیش ہوتا اور غالباً حکومت اپنی پہلی رائے سے نہ ہٹتی اس لیے انہیں پھر برت رکھنا پڑتا۔ کیا یہ چکر اسی طرح چلتا رہے؟ وہ اس بلی چوہے کے کھیل کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر اب ان سہولتوں کے لیے میں نے برت رکھا تو چاہے میں رہا بھی کر دیا جاؤں برت جاری رہے گا اس کے معنی یہ تھے کہ وہ برت رکھ کر جان دے دیں گے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اپنی سزا کی باقی میعاد میں (جس میں ابھی ڈھائی مہینے باقی تھے) جیل جانے کی کوشش نہ کریں۔ صرف ہریجن سدھار کا کام کرتے رہیں البتہ کانگریس کے کارکنوں سے ملتے رہیں اور جب ضرورت ہو انہیں مشورہ دیتے رہیں۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ عارضی طور پر کانگریس سے کنارہ کش ہو جائیں اور سارا کام (بقول خود) ''نئی پود'' کے ہاتھ میں دے دیں۔

پہلی صورت کی ہم میں سے کوئی بھی تائید نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس میں بظاہر ان کی موت یقینی تھی۔ تیسری صورت میں اس وقت جبکہ کانگریس ہنوز خلاف قانون جماعت تھی بہت نامناسب بات تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یا تو سول نافرمانی اور ہر قسم کی عملی جدوجہد فوراً ملتوی ہو جاتی اور آئینی کارروائی شروع ہو جاتی یا کانگریس بے یار و مددگار رہ جاتی اور حکومت اسے اور زیادہ کچل ڈالتی۔ اس کے علاوہ اس خلاف قانون ادارے پر جس کا نہ جلسہ ہو سکتا تھا اور نہ اس کی پالیسی پر بحث، کوئی

جماعت قبضہ کیوں کرتی۔غرض پہلی اور تیسری شکل رد کر کے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ دوسری شکل مناسب ہے۔ہم میں سے اکثر کو یہ صورت بھی پسند نہیں تھی اور ہم جانتے تھے کہ سول نافرمانی کا رہا سہا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔اگر لیڈر خود جنگ سے کنارہ کش ہو جائے تو پھر کیا توقع ہو سکتی تھی کہ کانگریسی کارکنوں میں سے ایسے باہمت لوگوں زیادہ تعدا میں کل آویں گے، جو اس آگ میں کودنا گوارا کریں گے۔ لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔چنانچہ گاندھی جی نے اس مضمون کا بیان شائع کر دیا۔

گاندھی جی اور میں اس معاملے میں متفق تھے (اگر چہ ہمارے وجوہ مختلف تھے) کہ سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے اور چاہے کمزور حالت میں سہی لیکن اسے جاری رکھنا چاہیے۔اپنے لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں کو اشتراکی اصولوں اور واقعات عالم کی طرف توجہ دلاؤں۔

واپسی پر میں چند روز بمبئی ٹھہرا۔میری خوش قسمتی کہ اس زمانے میں اودے شنکر وہاں موجود تھے۔اس لیے مجھے ان کا ناچ دیکھنے کا موقع مل گیا۔میرے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی جس سے میں بہت ہی محظوظ ہوا۔برسوں سے میں تھیٹر، موسیقی، سینما، ناطق اور فلم، ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ وغیرہ سے محروم تھا۔کیونکہ میں عموماً جیل رہتا تھا اور جب تھوڑے عرصے کے لیے باہر آتا بھی تھا تو دوسرے مشاغل میں منہمک رہتا تھا۔شاید ایک مرتبہ میں نے ناطق فلم دیکھا ہے اور سینما کے بڑے بڑے ایکٹروں کے صرف نام ہی سنے تھے۔تھیٹر دیکھنے کو خاص طور پر میرا بہت دل چاہتا ہے اور میں بڑی حسرت کے ساتھ ان بڑے بڑے ناٹکوں کی خبریں پڑھا کرتا ہوں جو دوسرے ملکوں میں کھیلے جاتے ہیں۔شمالی ہند میں تو اعلیٰ معیار کے ناٹک ہوتے ہی نہیں اس لیے جب میں جیل سے باہر بھی ہوتا تب بھی اچھے ناٹک دیکھنے کا موقع نہ ملتا۔میرا خیال ہے کہ بنگالی، مرہٹی اور گجراتی ناٹک نے خاصی ترقی کر لی

ہے۔لیکن ہندوستانی زبان کا تھیٹر ابھی بہت پیچھے ہے۔مجھے تازہ ترین حالات تو معلوم نہیں لیکن پہلے تو ہندوستان کے ناٹک بڑے بھدے اور بھونڈے ہوتے تھے۔میں نے سنا ہے کہ ناطق اور خاموش دونوں قسم کے ہندوستانی فلم فنی لطافتوں سے کورے ہوتے ہیں،عموماً ہلکی قسم کی غنائی یا جذبات پرستانہ فلم دکھائے جاتے ہیں اوران کا قصہ عموماً ہندوستان کی قدیم تاریخ یا دیو مالا سے ماخوذ ہوتا ہے،

میرا خیال ہے کہ ان میں وہ چیز پیش کی جاتی ہے جو شہر والے پسند کرتے ہیں ان بھدے اور تکلیف دہ تماشوں سے گاؤں کے گیت اور ناچ بلکہ پرانے سوانگ بھی جو کہیں کہیں اب تک ہیں بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔بنگال، گجرات اور جنوبی ہند میں کبھی کبھی اچانک یہ دیکھ کر بڑی حیرت اور مسرت ہوتی ہے کہ گاؤں والے غیر شعوری طور پر کتنا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔اوسط طبقے کے لوگوں میں یہ بات نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی جڑوں سے الگ ہو گئے ہیں۔اور فنی روایات سے بالکل کورے ہیں۔وہ ادنی قسم کی نا معقول تصویروں سے لطف اٹھاتے ہیں جو جرمنی اور آسٹریلیا میں ڈھیروں میں چھپتی ہیں۔ان کی زیادہ سے زیادہ پرواز داری ورما کی تصویروں تک ہے۔ہارمونیم ان کا محبوب ساز ہے میں اسی امید میں بسر کرتا ہوں کہ سوراج کی حکومت پہلا کام یہی کرے گی کہ اس نامعقول باجے کی ممانعت کر دے۔لیکن شاید اس تکلیف دہ بے تکے پن اور بدمذاقی کی انتہا لکھنؤ یا دوسری جگہ کے بڑے بڑے تعلقہ داروں کے یہاں نظر آتی ہے۔ان کے پاس خرچ کرنے کو روپیہ ہے اور انہیں نمود و نمائش کا شوق ہے۔وہ دل کھول کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔اور جو کوئی ان کے یہاں جائے اسے یہ تکلیف دہ منظر دیکھنے پڑتے ہیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے ٹیگور کے نامور خاندان کی سرکردگی میں آرٹ کے صحیح مذاق کو بیدار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ان کا اثر سارے ملک میں صاف نظر آ رہا ہے لیکن جس ملک کے لوگ ہر قدم پر دبائے اور کچلے جا رہے ہوں اور دہشت کی فضا میں

زندگی بسر کرتے ہوں وہاں کوئی آرٹ کیسے پنپ سکتا ہے۔

بمبئی میں، میں بہت سے دوستوں اور ساتھیوں سے ملا جن میں سے بعض ابھی قید سے چھوٹ کر آئے تھے۔ وہاں اشتراکیت کا عنصر قوی ہے اس لیے کانگریس کے اونچے حلقہ میں جو تازہ ترین واقعات ہوئے تھے ان پر وہاں بہت کچھ ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ گاندھی جی پر سخت نکتہ چینی ہو رہی تھی، کہ وہ سیاست کو الہیات کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے بہت سے اعتراضوں سے اتفاق تھا۔ لیکن یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم اسی طرح کام چلنے دیں۔ سول نافرمانی ملتوی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ حکومت کا تشدد برابر جاری رہتا اور اگر کوئی موثر جدوجہد کی جاتی تو پھر وہی جیل کی منزل سامنے تھی۔ ہماری قومی تحریک اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ یا تو حکومت اسے دباتی ورنہ حکومت کو اس کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا۔ یعنی وہ اتنی قوی ہو گئی تھی کہ حال میں اس کا خلاف قانون قرار دیا جانا لازمی تھا اور اگر سول نافرمانی ملتوی بھی کر دی جاتی تب بھی تحریک کا پیچھے قدم ہٹانا ناممکن تھا۔ غرض سول نافرمانی کے جاری رہنے یا نہ رہنے سے عملاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اصولاً یہ حکومت کے مقابلے کے لیے ایک اخلاقی حربے کی حیثیت رکھتی تھی اور اس لحاظ سے قابل قدر تھی۔ جنگ کے زمانے میں نئے خیالات کی اشاعت کرنا آسان تھا بمقابلہ اس زمانے کے جب کہ جنگ عارضی طور پر روک دی گئی ہو اور پستی کا دور شروع ہو گیا ہو۔ جنگ کے علاوہ دوسری صورت یہی تھی کہ حکومت سے مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے اور کونسلوں میں آئینی جدوجہد شروع کی جائے۔

معاملہ پیچیدہ تھا اور دونوں صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کی ذہنی کشمکش کو خوب سمجھتا تھا۔ کیونکہ مجھے خود اس سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ لیکن بمبئی میں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی میں یہ دیکھا

ہے کہ بعض لوگ جو کچھ کرنا نہیں چاہتے اشتراکی اصولوں کی آڑ لیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر غصہ آتا تھا کہ یہ لوگ خود تو کچھ کرتے نہیں اور دوسروں کو جنھوں نے جنگ کی مصیبتیں جھیلیں، رجعت پسند کہتے ہیں۔ یہ شیر قالین اشتراکی سب سے زیادہ گاندھی جی کے مخالف ہیں اور انھیں رجعت پسندوں کا قبلہ گاہ کہتے ہیں۔ ان کی دلیلیں منطق کے لحاظ سے تو بالکل درست ہیں لیکن وہ ایک چھوٹی سی بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ "یہ رجعت پسند" ہندوستان کو جانتا ہے سمجھتا ہے، بلکہ بذات خود ہندوستان کے کسانوں کا مجسمہ ہے اور اس نے سارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ جو آج تک کسی نام نہاد انقلابی سے نہ ہو سکا۔ اس کی نئی ہریجن سدھار کی سرگرمیوں نے بھی بڑی نرمی سے، مگر اس زبردست قوت کے ساتھ جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ کٹر ہندو دھرم کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ کٹر پنتھیوں کی ساری جماعت اس کی مخالف ہو گئی ہے اور اسے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتی ہے حالانکہ وہ ہمیشہ ان سے بڑی نرمی اور شرافت سے پیش آتا ہے۔ وہ اپنے خاص انداز میں بے اندازہ قوتوں کا خزانہ کھول دیتا ہے جو سطح سمندر کی ہلکی ہلکی موجوں کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہیں اور کروڑوں آدمیوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں، وہ رجعت پسند ہو یا انقلابی مگر اسی کی ذات تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ ایک پست اور دبو قوم کو عزم و وقار بخشا، عام لوگوں میں بیداری اور قوت پیدا کر دی اور ہندوستان کے مسئلے کو دنیا کا مسئلہ بنا دیا۔ پرامن عدم تعاون یا سول نافرمانی کے مقصد اور فلسفیانہ نتائج سے قطع نظر اس کا طریق ایک عجیب و غریب قوی اور موثر حربہ ہے جو اس شخص نے ہندوستان کے اور ساری دنیا کے ہاتھوں میں دے دیا ہے اور ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندوتان کے حالات کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایمانداری کے ساتھ جو نکتہ چینی کی جائے ہمیں اس کی قدر اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور جہاں تک ہو سکے لوگوں کو موقع دینا چاہیے کہ وہ

ہمارے معاملات پر دل کھول کر بحث کریں۔ یہ بات ضرور قابل افسوس ہے کہ
گاندھی جی کے اقتدار نے ایک حد تک بحث مباحثے میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔
لوگ ہر معاملے میں ان کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور ہر بات کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیتے
ہیں۔ یہ طریقہ صریحی طور پر غلط ہے قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب وہ مقصد اور
طریق کار کو سمجھ بوجھ کر قبول کرے اور اس کا عمل اور انضباط کورانہ اطاعت پر نہیں
بلکہ فرض شناسی پر مبنی ہو۔ کوئی شخصیت بھی خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو تنقید سے بالا
تر نہ ہونی چاہیے لیکن اگر تنقید اپنی بے عملی کو چھپانے کے لیے کی جائے تو وہ یقیناً
ناجائز ہے۔ اشتراکی اگر اس قسم کی حرکتیں کریں تو وہ بدنام ہو جائیں گے کیونکہ لوگ
تو ہر شخص کو عمل کی کسوٹی پر کستے ہیں لینن نے لکھا ہے ''جو شخص مستقبل کے سہل کاموں
کے خواب دیکھتا ہے اور حال کے مشکل کاموں کو قابل توجہ نہیں سمجھتا وہ ابن الوقت ہو
کر رہ جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے عمل کی بنا پر ان واقعات پر نہیں رکھتا
جو اس وقت حقیقی زندگی میں پیش آ رہے ہیں بلکہ اس سے بچنے کے لیے خواب و
خیال کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔''

ہندوستان کے اشتراکیوں اور اشتمالیوں کا ذہنی سرمایہ لے دے کر وہ کتابیں
ہیں جو صنعتی مزدوروں کے متعلق لکھی گئی ہیں بعض مخصوص علاقوں مثلاً بمبئی یا کلکتے
کے قرب و جوار میں کارخانے کے مزدوروں کی کثرت ہے۔ مگر اصل میں ہندوستان
ایک زرعی ملک ہے اس لیے ہمارے مسائل صنعتی مزدوروں کے نقطہ نظر نہ پوری
طرح سمجھے جا سکتے ہیں اور نہ حل کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں قوم پرستی اور دیہی
معیشت دو زبردست عنصر ہیں اور یورپی اشتراکیت اس سے بہت کم بحث کرتی
ہے۔ روس کی جنگ سے پہلے کے حالات ہندوستان سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے
لیکن وہاں غیر معمولی حادثات پیش آئے اور یہ توقع رکھنا کہ دوسری جگہ بھی ایسا ہی ہو
گا حماقت ہے میں یہ مانتا ہوں کہ اشتمالیت کی فلسفہ ہمیں ہر ایک ملک کے موجودہ

حالات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور آئندہ کے لیے ترقی کی راہ دکھاتا ہے لیکن یہ اس فلسفے کے ساتھ بڑی زبردستی اور بے انصافی ہوگی کہ حالات اور واقعات کا لحاظ کیئے بغیر آنکھ بند کرکے اس سے کام لیا جائے۔

بہر حال زندگی بڑی پیچیدہ چیز ہے۔ اور اس کے اختلاف اور تضاد کو دیکھ کر بعض اوقات انسان ہمت ہارنے لگتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لوگوں میں اختلاف رائے ہو بلکہ ایک ہی جماعت کے لوگ جو اکثر مسائل کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں مختلف نتیجوں پر پہنچیں۔ لیکن وہ شخص جو اپنی کمزوری کو رعب دار فقروں اور شاندار اصولوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرے شبہہ سے کیسے بچ سکتا ہے۔ جو لوگ اقرارنامے لکھ کر یا حکومت سے وعدے کرکے یا اور مشتبہ طریقوں سے خود جیل سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت کرتے ہیں اس مقصد کو نقصان پہنچاتے ہیں جس کے وہ علم بردار بنتے ہیں۔

بمبئی ایک بہت بڑا آفاقی شہر ہے۔ اور اس میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں لیکن وہاں کے ایک ممتاز بزرگ اپنے سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی خیالات کے اعتبار سے عجیب معجون مرکب واقع ہوئے ہیں۔ مزدوروں کے لیڈر کی حیثیت سے تو وہ اشتراکی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اپنے آپ کو جمہوریت پسند کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہندو مہاسبھا کے پٹھو بھی ہیں اور اس سے انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ قدیم مذہبی اور سماجی رسم و رواج کی حفاظت کریں گے اور مجلس قانون ساز کو ان میں مداخلت کرنے سے باز رکھیں گے۔ انتخاب کے موقع پر وہ سناتنی طبقے کے نمائندے بن گئے جو قدیم رسوم کے مندر کا پجاری ہے۔ جب یہ پچ رنگی اور دلچسپ زندگی بھی کافی نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی فالتو قوت کو کانگریس پر نکتہ چینی کرنے اور گاندھی جی کو رجعت پسند کہہ کر بدنام کرنے میں صرف کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد چند اور شخصوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ڈیموکریٹک کانگریس پارٹی قائم کی جسے حقیقت

میں جمہوریت سے دور کا رشتہ بھی نہ تھا، اور کانگریس سے صرف اتنا تعلق تھا کہ یہ اس پر حملے کیا کرتی تھی۔ اب انہیں اپنی تگ وتاز کے لیے نئے میدانوں کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ وہ مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے جنیوا کی لیبر کانفرنس میں جا پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی حکومت کے وزیراعظم بننے کی تربیت حاصل کر رہے تھے جو انگلستان میں "قومی حکومت" کہلاتی ہے۔

اس قسم کے رنگ برنگے خیالات اور سرگرمیاں بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ پھر بھی کانگریس کے معترضین میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو مختلف میدانوں میں گھوڑے دوڑا چکے تھے اور اب بھی ہر طرح کی تحریکوں میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض لوگ اپنے آپ کو اشتراکی بھی کہتے ہیں۔ انہیں کی وجہ سے اشتراکیت بدنام ہوتی ہے۔

لبرل ذہنیت

جب میں گاندھی جی سے ملنے پونا گیا تو ایک روزان کے ساتھ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے مرکز میں بھی گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک سوسائٹی کے بعض اراکین ان سے سیاسی مسائل پر سوالات پوچھتے رہے اور وہ جواب دیتے رہے، اتفاق سے اس وقت وہاں نہ سری نواس شاستری صاحب تھے جو اس سوسائٹی کے صدر ہیں اور پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جو صدر کے بعد اس انجمن کے سب سے لائق رکن ہیں۔ مگر بعض پرانے اراکین موجود تھے۔ ہمارے خیال کے تھوڑے سے آدمی جو گفتگو کو سن رہے تھے ان کی حیرت ہر بات کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی اس لیے کہ سوالات اس وقت کے نہایت ادنیٰ واقعات کے متعلق تھے اور ان موضوع بیشتر وہ درخواست تھی جو گاندھی جی نے بہت دنوں پہلے وائسرائے سے ملاقات کے لیے کی تھی اور جسے وائسرائے نے منظور نہیں کیا تھا۔ کیا بس یہی ایک اہم سوال رہ گیا تھا جو ان لوگوں کے ذہنوں میں آسکتا تھا جب کہ دنیا میں جدھر دیکھئے اہم سے اہم مسائل درپیش تھے۔ جب ان کا اپنا ملک آزادی کے لیے ایک ہمت آزما جنگ میں جٹا ہوا تھا اور سینکڑوں ادارے خلاف قانون قرار دئے جا چکے تھے؟ اس وقت کاشتکاروں کے مسئلہ کی حالت نازک ہوگئی تھی صنعتی کساد بازاری کے سبب سے ہر طرف بے روزگاری پھیل رہی تھی۔ بنگال اور سرحد میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا خیال کر کے کلیجہ دھڑکنے لگتا تھا خیالات کی، تقریر کی تحریر کی اور اجتماع کی آزادی کا سر کچلا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کیا جانے کتنے قومی اور بین الاقوامی مسائل تھے۔ مگر لبرل حضرات نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق سوالات کر رہے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ اگر گاندھی جی نے پہل کی تو اس کا وائسرائے اور حکومت ہند پر کیا اثر ہوگا۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں ایک خانقاہ میں پہنچ گیا ہوں جس کے رہنے والوں کا مدتیں گزریں کہ بیرونی دنیا سے کوئی ربط ضبط نہیں رہا ہے اور یہ خیال میرے دل میں

جاگزیں ہوگیا۔ لطف یہ کہ ہمارے یہ دوست عملی سیاسیات میں حصہ لے رہے تھے۔ ہوشیار لوگ تھے اور ان کی قومی خدمت اور ایثار کی کارگزاریاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ یہ اور ان کے چند ساتھی لبرل پارٹی کے روح رواں تھے باقی پارٹی ایک مبہم اور بے شکل سی جماعت تھی جس کے رکن کبھی کبھی بس اس احساس کا لطف اٹھانا چاہتے تھے کہ ہم بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصاً بمبئی اور مدراس والے تو ایسے تھے کہ ان میں اور سرکاری ملازموں میں بس نام کا فرق تھا۔

کسی ملک کے لوگ جس طرح کے سوالات کرتے ہیں وہ ان کی سیاسی نشوونما کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ اکثر ان کی ناکامی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے ایسے سوالات نہیں پوچھتے جو اصل اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری سیاسی پستی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ہم نشستوں کی فرقہ وارانہ تقسیم پر اپنا وقت اور قوت ضائع کرتے ہیں اور جی برا کیا کرتے ہیں یا فرقہ وارانہ فیصلے کی مخالفت یا موافقت میں پارٹیاں بناتے ہیں اور ان مسائل کو نظر انداز کرکے جن پر ہماری زندگی اور موت کا دارومدار ہے اس کے متعلق لاحاصل بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ سوالات جو اس روز سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے مرکز میں پوچھے گئے اس سوسائٹی اور لبرل پارٹی کی عجیب دماغی حالت کا آئینہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے کوئی سیاسی اور معاشی عقائد ہی نہیں ہیں۔ ان کی نظر میں وسعت نہیں، ان کی سیاست بس اسی قسم کی ہے جس کا ڈرائنگ روم یا دربار میں چرچا رہتا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں بڑے عہدہ دار کیا کریں گے اور کیا نہ کریں گے؟

لبرل پارٹی کا نام غلط فہمی پیدا کرسکتا ہے اور جگہ خصوصاً انگلستان میں اس جماعت کی ایک خاص سیاست تھی یعنی آزاد تجارت اور کاروبار کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا اصول اور شخصی آزادی اور شہری حقوق کا ایک خاص فلسفہ۔ انگلستان کی لبرل پارٹی کی تعلیم اور عقائد کی بنیاد معاشیات پر تھی اور تجارتی آزادی حاصل کرنے اور

شاہی اجاروں اور بے ضابطوں، محصولوں سے چھٹکارا پانے کی خواہش نے سیاسی آزادی کا حوصلہ پید کیا تھا۔ ہندوستان کی لبرل پارٹی کے عقائد ایسا کوئی پس منظر نہیں رکھتے ۔ ہندوستانی لبرل آزاد تجارت کے قائل نہیں۔ حال کے واقعات نے اچھی روشن کر دیا ہے کہ وہ سیاسی آزادی اور شہری حقوق کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ دیسی ریاستوں میں قریب قریب منصب داری نظام رائج ہے، ان کی حکومت مطلق العنانی پر مبنی ہے۔اور وہاں جمہوریت اور شخصی آزادی کا ابھی تک ذکر بھی نہیں ہے۔اس کے باوجود یہ لبرل ان سے گہرے تعلقات رکھتے ہیں اور عموماً ان کی حمایت کرتے ہیں، یہ بھی ایک صفت ہے جو انہیں یورپ کے لبرلوں سے ایک جدا قسم بنا دیتی ہے۔لبرل کے معنی ہیں حریت پسند۔بہر حال اس لفظ کے جو معنی بھی لیجیے ہندوستانی لبرل حریت پسند نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حریت پسند ان کے کہیں کہیں چھو گئی ہے۔یہ ٹھیک ٹھیک بتانا کہ وہ ہیں کیا، بہت مشکل ہے۔اس لیے کہ ان کے خیالات کی کوئی مضبوط اثباتی بنیاد نہیں اور اگر چہ وہ تعداد میں کم ہیں، پھر بھی ایک دوسرے سے متفق نہیں۔ان کی طاقت صرف نفی میں ہے۔انہیں ہر طرف غلطیاں ہی دکھائی دیتی ہیں اور وہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اس طرح حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔سچ پوچھیے تو ان کے لیے حقیقت ہمیشہ دو انتہائی مسلکوں کے بیچ میں کہیں پر ہوتی ہے۔وہ ہر چیز پر جس میں انہیں انتہائی پسندی نظر آتی ہے اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح وہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ ہم نیک، اعتدال پسند اور اچھے ہیں۔یہ طرز عمل انہیں غور و فکر کے تکلیف دہ اور دشوار سلسلوں میں الجھنے سے بچائے رہتا ہے اور وہ اس پر بھی مجبور نہیں ہوتے کہ اپنی طرف سے کوئی تعمیری خیال پیش کریں۔

بعض کو ایک طرح سے خیال ہوتا ہے کہ یورپ میں سرمایہ داری پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئی ہے اور اب مصیبت میں پڑی ہے لیکن دوسری طرف ان کے

نزدیک یہ بات بھی کھلی ہوئی ہے۔ کہ اشتراکیت بری چیز ہے، اس لیے کہ وہ مستقل حقوق اور اغراض پر حملہ کرتی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر کوئی پر اسرار تدبیر سمجھ میں آ جائے کوئی بیچ کی منزل، اس لیے کہ اس درمیان میں تو مستقل شخصی حقوق املاک وغیرہ کا تحفظ کرنا چاہیے۔ اگر کبھی یہ بحث چھڑے کہ دنیا گول ہے، تو غالباً یہ لوگ ان دونوں خیالات کو جن سے انتہا پسندی ظاہر ہوتی ہے رد کر کے کام چلانے کے لیے یہ کہہ دیں کہ وہ شاید چوکور یا بیضاوی ہے۔

یہ لوگ فضول اور غیر اہم باتوں پر خاصے برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور ایسی چیخ و پکار مچاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ جان بوجھ کر اور اس لیے بھی کہ یہ خصوصیت ان کے شعور کی تہہ میں بیٹھ گئی ہے۔ وہ بنیادی مسائل سے پہلو بچاتے ہیں کیونکہ ایسے مسائل بنادی اصلاح اور مردانہ مصلحت اندیشی اور عمل کے طالب ہوتے ہیں۔ اس لیے لبرلوں کی ہار جیب دونوں یکساں بے اثر ہوتی ہے۔ ان کا کسی اصول سے تعلق بھی ہوتا۔ گویا اس پارٹی کی سب سے بڑی خصوصیت (اور اگر ایسے ہیولے میں یہ بات ممکن ہو تو اس کی خاص علامت) ہر بری اور اچھی چیز میں اعتدال ہے۔ یہ ایک فلسفہ حیات ہے اور پارٹی کا پرانا نام ہے یعنی موڈریٹ ہی شاید اس کے لیے سب سے زیادہ مناسب تھا۔

میں میانہ روی میں اپنی خاص شان سمجھتا ہوں، رگ جھے ٹوری سمجھتے ہیں اور ٹوری رگ خیال کرتے ہیں (۱)

(ایلکسینڈر ریوپ)

لیکن میانہ روی چاہے جتنی قابل تعریف چیز ہو، وہ ایک روشن یا درخشاں صفت نہیں ہے۔ وہ مزاج میں خشکی پیدا کرتی ہے اور اس طرح بد قسمتی سے ہندوستانی لبرل رونی صورت والوں کی فوج بن گئے ہیں، ان کے چہرے افسردہ اور روکھے، ان کی تحریر اور بات چیت بے رس ہوتی ہے اور وہ زندہ دلی سے بالکل نا آشنا ہیں۔ ظاہر

ہے ان میں سبھی ایسے نہیں، اور ان لوگوں میں جنہیں مستثنیٰ کرنا ضروری ہے سرتیج بہادر سپرو سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ شخصی طور پر سرتیج بہادر ہرگز غیر دلچسپ آدمی نہیں ہیں۔ ان میں ظرافت کی کمی نہیں اور خود ان پر کوئی فقرہ چست کیا جائے تو اس کا بھی لطف اٹھا سکتا ہیں لیکن مجموعی طور پر لبرل جماعت کا فلسفہ تن پروری اور دولت پرستی کے ٹھس پن اور ٹھوس پن کا معراج ہے۔ الہ آباد کے اخبار "لیڈر" نے جو لبرل اخباروں میں سب سے ممتاز ہے، پارسال ایک اڈیٹوریل لکھا تھا جس سے اصل صورت حال ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں بیان کیا تھا کہ بڑے اور غیر معمولی صفات کے لوگ ہمیشہ دنیا کے سر بلائیں لائے ہیں او اس لیے معمولی اوسط قابلیت کے آدمیوں کو ان پر ترجیح دینا چاہیے۔ کسی دیدہ دلیری سے یہاں کند ذہنی اور سست روی کا جھنڈا لہرایا گیا ہے!

میانہ روی، قدامت پسند، خطرے اور اچانک تبدیلی سے بچنے کی خواہش ایسی خصوصیتیں ہیں جو بڑھاپے کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں اور اکثر کے لیے ان میں مبتلا ہو جانا لازمی ہے۔ نوجوانوں میں ان کا ہونا اتنا مناسب نہیں لیکن ہمارا ملک پرانا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں بچے تک تھکے ماندے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے چہروں پر پھیکا پن اور بڑھاپے کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن اس پرانے ملک کو بھی وہ قوتیں جو زندگی کو بدلتی ہیں، متھے دے رہی ہیں اور میانہ روی کا فلسفہ حیات درہم برہم ہو گیا ہے۔ پرانی دنیا دم توڑ رہی ہے اور لبرل لوگوں کی ساری میٹھی میٹھی معقول پسندی سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، طوفان، سیلاب اور زلزلے کسی کی دلیلیں نہیں سنتے۔ لبرلوں نے اب تک جن تصورات پر اپنے عقیدے اور عمل کو مبنی کیا تھا وہ سب جواب دے رہے ہیں اور ان میں اب اتنی ہمت نہیں ہے کہ غور و فکر اور عمل کے لیے نئی راہیں نکالیں۔ ڈاکٹر اے ان وائٹ ہیڈ یورپ کی تہذیبی روایات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "ان تمام روایات کو اس مضر

مفروضے نے ناقص کر دیا ہے کہ ہر نسل کم و بیش اسی ماحول میں اپنی زندگی گزارے گی جس میں کہ پچھلی نسلوں نے گزاری تھی اور اس ماحول کی اسی قوت تشکیل کے ساتھ اپنی اولاد کی زندگی پرانے سانچے میں ڈھالنے کے لئے چھوڑ جائے گی۔ ہم انسانی تاریخ کے اس دور میں رہتے ہیں جب کہ پہلی بار یہ فریضہ غلط ثابت ہوا ہے۔ ڈاکٹر وائٹ ہیڈ نے اپنی تشریح میں بہت زیادہ نرمی سے کام لیا ہے، اس لئے کہ یہ فرضیہ ایک ہمارے زمانے کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ غلط رہا ہے۔ اگر یورپی روایات میں قدامت پسندی ہے تو ہماری روایات میں قدامت پسندی سے بھی اور کچھ زیادہ ہے۔ لیکن جب تغیرات کا وقت آتا ہے تو زندگی کی تشکیل قوتیں ان روایات کا ذرا بھی خیال نہیں کرتی ہیں۔ ہم بے بس کھڑے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے منصوبوں کی ناکامی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں اور یہ کیفیت کہ مسٹر جرلڈ ہرڈ نے دکھایا ہے۔ خود فریبی کی سب سے تباہ کن صورت ہے یہ تدبیروں کا قصور نہیں بلکہ دوسرے کا جان بوجھ کر ہمارے کام کو بگاڑنے کا نتیجہ ہے۔

ہم سب اس افسوسناک خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ گاندھی جی بھی اس سے بالکل بچے ہوئے نہیں ہیں لیکن ہم کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کی حقیقتوں سے غافل نہ ہو جائیں، ہمارے تجربے اور ہماری غلطیاں کبھی بھی اس خود فریبی کے زور کو کم کر دیتی ہیں اور ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن لبرلوں میں یہ مرض ہمارے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید ہے۔ وہ غلطی کرنے کے ڈر سے کچھ کرتے ہیں نہیں، گرنے کے ڈر سے جگہ ہی سے نہیں ہلتے، عوام کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہیں کرتے جو دماغ اور حوصلے کی درستی کے لئے ضروری ہے اور اپنے تصورات کی کوٹھریوں میں اس طرح بیٹھے رہتے ہیں گویا ان پر کسی نے جادو کیا ہے یا خود انہوں نے اپنے آپ کو ملنے جلنے کی قوت سے محروم کر دیا ہے۔ کوئی ڈیڑھ سال ہوا سری نواس شاستری

صاحب نے اپنے لبرل بھائیوں کو خبردار کرنے کے لیے کہا تھا کہ یہ نہ ہو کہ آپ الگ کھڑے رہیں اور بس جو کچھ ہوتا ہو اسے ہونے دیں۔ اس آگاہی کا پورا مطلب شاید سری نواس شاستری صاحب خود بھی نہیں سمجھے۔ ان کا غوروفکر حکومت کی کاروائیوں تک محدود ہے اور وہ دراصل ان دستوری تغیرات کی طرف اشارہ کر رہے تھے جنھیں مختلف سرکاری کمیٹیاں عمل میں لانے کی تدبیریں کر رہی تھیں۔ لیکن لبرلوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ جب ان کی اپنی قوم کے لوگ قدم بڑھائے آگے چلے جا رہے تھے تب بھی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ملک کے عوام سے ڈرتے تھے، انہوں نے اپنے عوام کے درمیان غیریت کا ہونا گوارا کیا مگر حاکموں سے نہیں بگاڑی۔ پھر کیا تعجب ہے کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی بن گئے، زندگی کا قافلہ گزر گیا اور انہیں الگ کھڑے چھوڑ گیا۔ اس وقت جب ان کے ملک والے جان اور آزادی کے لئے جی توڑ کر لڑ رہے تھے تو اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ لبرل دمدمے کے کس طرف ہیں۔ دمدمے کی دوسری طرف سے وہ ہمیں اچھے اچھے مشورے دے رہے تھے اور بڑی سنجیدگی سے ایسے اخلاقی اصول بیان کر رہے تھے جنھیں ہر کوئی جانتا ہے اور جنھیں سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گاڑھا لیسدار روغن ہمارے منہ پر لیس رہا ہے۔ گول میز کانفرنسوں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ان کے اتحادِ عمل سے انکار کرتے تو اس سے ضرور فرق پڑتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کانفرنسوں میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ان کے اتحادِ عمل نے حکومت کو جو اخلاقی تقویت پہنچائی اس کا خاصہ اثر ہوا۔ اگر وہ اتحادِ عمل سے انکار کرتے تو اس سے ضرور فرق پڑتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کانفرنسوں میں سے ایک میں برطانیہ کی لیبر پارٹی شریک نہیں ہوئی، مگر ہمارے لبرلوں کو بھلا کون چیز روک سکتی تھی۔ ان سے بعض انگریزوں نے بھی درخواست کہ کہ آپ شریک نہ ہوں، پر وہ نہ مانے۔ ہم سب میانہ رو یا انتہا پسند ہوتے ہیں، کوئی کم کوئی زیادہ، کبھی کسی غرض کے

لئے کبھی کسی کے لئے۔ اگر ہمارا دل کسی بات میں لگا ہے تو اس کا ہمارے جذبات پر اثر ہوگا۔ ہر معاملہ میں جہاں اس سے بحث ہوگی ہم نرمی کی بہ نسبت گرمی طرف مائل ہوں گے۔ جب ایسا نہ ہو تو ہمارا اس میں کوئی نقصان نہیں اگر ہم خوشی کے ساتھ رواداری برتیں اور ایک فلسفیانہ میانہ روی اختیار کریں جس کا اصل مقصد بے تعلقی پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نرم سے نرم موڈریٹ نہایت انتہا پسند اور لڑنے پر بالکل آمادہ ہو گئے ہیں۔ جب یہ تجویز پیش ہوئی ہے کہ ملک کے کوئی مستقل حقوق املاک وغیرہ مٹا دیے جائیں، ہمارے لبرل دوست ایک حد تک خوش حال اور دولت مند لوگوں کے نمائندے ہیں۔ ان کا سوراج کے لئے انتظار کرنے میں کوئی ہرج نہیں، اس لئے وہ سوراج کے معاملے میں برانگیختہ نہیں ہوتے۔ لیکن بنیادی معاشرتی اصلاح کی ہر تجویز انہیں بہت ہی گڑبڑا دیتی ہے، وہ اپنی میانہ روی بھول جاتے ہیں اور دوسرے کی بات ماننے پر خوشی سے آمادہ بھی نہیں ہوتے۔ یعنی ان کی میانہ روی دراصل اس رویہ تک محدود ہے جس کا تعلق برطانوی حکومت ہند سے ہے اور وہ اپنے دل میں اس امید کی پرورش کر رہے ہیں کہ اگر وہ ادب سے بات کرتے اور سمجھوتہ پر آسانی سے راضی ہوتے رہے تو شاید انہیں اس نیک چلنی کے بدلے میں شنوائی کا شرف بخشا جائے۔ ان کے لئے انگریزوں کی رائے تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ وہ نیلی کتابوں (۲) کا شوق اور انہماک سے مطالعہ کرتے ہیں، ارسکن مے کی تصنیف "پارلیمنٹ کے رواج" اور اسی قسم کی دوسری کتابیں ہر وقت ان کے پاس رہتی ہیں۔ اور کوئی نئی سرکاری رپورٹ شائع ہوتی ہے تو ان کے یہاں بڑی چہل پہل ہوتی ہے اور خیالی گھوڑے دوڑائے جانے لگتے ہیں۔ لبرل لیڈر جب انگلستان سے واپس آتے ہیں تو ایک عجیب پراسرار انداز سے وائٹ ہال کے بڑے آدمیوں کی کاروائیوں کا حال بیان کرتے ہیں، کیونکہ وائٹ ہال لبرلوں جوابی تعاونیوں اور ایسی جماعتوں کا بیکنٹھ ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ جب

نیک امریکن مرتے ہیں تو ان کی روحیں پیرس پہنچتی ہیں اوراب ممکن ہے اچھے لبرلوں کی روحیں وائٹ ہال کے گردونواح میں گشت لگاتی رہتی ہوں۔

میں لکھ تو رہا ہوں لبرلوں کے متعلق، لیکن یہ سب ہم لوگوں کے متعلق بھی ہے جو کانگریس میں ہیں کہا جاسکتا ہے۔ جوابی تعاون والوں کی نسبت یہ اور بھی زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ میانہ روی میں لبرلوں سے بھی دوقدم آگے ہیں۔ معمولی لبرل اور معمولی کانگریسی میں بہت بڑا فرق ہے لیکن دونوں کی ایسی حد بندی نہیں کی جاسکتی جو صاف ہو اور مغالطے کی گنجائش نہ چھوڑے، کیونکہ خیالات اور تصورات کو دیکھئے تو ان لبرلوں میں جو اپنی جماعت میں سب سے زیادہ آزاد خیال ہیں اور میانہ رو کانگریسیوں میں ایک کو دوسرے سے بہتر ثابت کرنا مشکل ہے۔ لیکن گاندھی جی کی بدولت یہ تو ہو گیا ہے کہ ہر کانگریسی کا اپنی سرزمین اور ملک کے رہنے والوں سے تھوڑا بہت تعلق ہو گیا ہے، اس نے سیاسیات کے میدان عمل میں ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی ہے اور طرح وہ مبہم اور ناقص تصورات کے چند برے نتیجوں سے بچ گیا ہے۔ لبرلوں کا حال کچھ اور ہے ان کا رشتہ پرانی دنیا سے بھی ٹوٹ گیا ہے اور نئی دنیا سے بھی۔ مجموعی حیثیت سے وہ انسان کی ان قسموں میں سے ہیں جو اب ناپید ہو رہی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں ہم میں سے اکثر ان احساسات کو کھو چکے ہیں جو مذہبوں کے عروج سے پہلے انسانی کی رہبری کرتے تھے اور بصیرت کی نئی شکل ہمیں حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہماری قسمت میں نہ " پروٹنس" (۳) کو سمندر سے نکلتے ہوئے دیکھنا ہے" نہ" بوڑھے ٹرئین (۴) کو اپنا پیچدار سنگھ بجاتے سننا" اور بس تھوڑے ہی ایسے خوش قسمت ہیں کہ

" ریت کے ذرے میں ایک دنیا دیکھ سکیں

اور ایک جنگلی پھول میں فردوس کا سماں

فضائے لامحدود کو ہتھیلی پر رکھ سکیں
اور ایک گھڑی میں ابدیت محسوس کر لیں"

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں سے اکثر فطرت کی رگوں میں خون کو دوڑتے پھرتے نہیں محسوس کرتے، نہ اپنے کان کے پاس اس کے دھیمے بول سن سکتے ہیں، نہ اس کے چھوٹے سے ہمارے جسم میں مسرت کا لرزہ آتا ہے۔ وہ دن تو گئے لیکن اگر ہم پہلے کی طرح فطرت میں عظمت کے آثار نہیں دیکھ سکتے تو ہم نے نوع انسانی کی فتح اور شکست میں، اس کے زبردست خوابوں اور اندرونی طوفانوں میں، اس کے تڑپا دینے والے درد اور اس کی ناکامیوں میں، اس کی کش مکش اور اس کی مصیبتوں میں اور اس یقین میں، جو اور سب کیفیتوں پر چھایا رہتا ہے اور اس کا عظیم الشان مقصد اور اس کی آرزوئیں پوری ہوں گی۔ وہی چیز دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک طرح سے معاوضہ ہے ان تمام دل شکنیوں کا جو ایسی کوشش اور جستجو کے ساتھ لگی ہوتی ہیں اور اس نے ہمیں اکثر حقیر حوصلوں کو بھلا کر بلندی کی طرف مائل کیا ہے۔ لیکن بہتیرے ایسے ہیں جنہوں نے انسانی سرگزشت میں حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور چونکہ انہوں نے پرانی وضع کو چھوڑ دیا ہے۔ انہیں اب کسی طرف کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ وہ نہ بہتر زندگی کے خواب دیکھتے ہیں نہ ان میں عمل کی صلاحیت ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ فرانس کے بڑے انقلاب میں اور روسی انقلاب میں نوع انسانی نے کس طرح بیتاب ہو کر پلٹے کھائے، نوع انسانی کی وہ خواہشیں جو مدتوں سے دبی ہوتی ہیں جب اپنی تمام پیچیدگیوں سمیت کوہ آتش کی طرح اچانک بے دردی کے ساتھ آگ برسانے لگتی ہیں تو وہ ڈر جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوع انسانی نے اپنے قید خانے کی ایک دیوار بھی نہیں گرائی ہے۔

لوگ خود پسندی کے غصے میں اکثر کہتے ہیں کہ وطن پرستی کانگریسیوں کا اجارہ نہیں ہے۔ یہی فقرہ اس طرح بار بار دہرایا جاتا ہے کہ آدمی نئی بات سننے سے مایوس

ہو کر پریشان ہو جاتا ہے، مجھے امید ہے کہ کسی کانگریسی نے اس جذبہ میں اکنی دوانی کا حصہ دار ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہوگا۔ بہر حال میں اسے ہرگز کانگریس کا اجارہ نہیں سمجھتا اور جو کوئی بھی چاہتا ہو میں خوشی سے اسے اس کے حوالے کردوں گا۔ وطن پرستی اکثر ان لوگوں کی جائے پناہ ہوتی ہے جو موقع سے فائدہ اٹھانا یا اپنی حیثیت بنانا چاہتے ہیں اور ہر مذاق اور غرض اور طبقے کے لوگوں کے لئے اس کی ایک مناسب قسم مل جاتی ہے۔ اگر عیسیٰ کا وہ چیلا جس نے انہیں دغا دی تھی آج کل ہوتا تو وہ بھی وطن پرستی کی آڑ لیتا۔ وطن پرستی اب کافی نہیں رہی ہے ہمیں اب اس سے برتر، اس سے وسیع تر اور بلند تر مسلک درکار ہے۔

میانہ روی بذات خود بھی کافی نہیں، ضبط اچھی چیز ہے اور ہماری شائستگی کا اسی سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ضبط کے ساتھ وہ بھی تو چاہئے کہ جسے روکئے اور قابو میں رکھیئے۔ انسان کی قسمت میں ازل سے مقرر ہے کہ وہ عناصر قدرت کو قابو میں لائے۔ بجلی پر سوار ہو، آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں اور پانی کے تیز اور اُبلتے دھاروں کو اپنے کام میں لائے۔ لیکن اس کے لئے سب سے زیادہ مشکل ان جذبات کی روک تھام کرنا اور انہیں قابو میں لانا ہے۔ جو اس کے اندر امنڈتے اور اسے جلاتے رہتے ہیں۔ جب تک وہ انہیں اپنے قبضے میں نہ کرلے وہ انسانیت کے پورے ورثہ کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ٹانگوں کو آگے نہ بڑھائیں جو خود ملنے سے معذور رہیں، ان ہاتھوں سے کام نہ لیں جن پر فالج گرا ہے؟

اس موقع پر رائے کیمپل کے چار مصرے لکھے بغیر نہیں رہا جاتا جو اس نے جنوبی افریقہ کے چند ناول نویسوں سے کہتے تھے۔ یہ ہندوستان کی بعض سیاسی جماعتوں پر بھی اسی طرح پورے اُترتے ہیں۔

لوگ اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ تمہارے ضبط پر کوئی جذبہ غالب نہیں آسکتا اس معاملہ میں مجھے تم سے پورا اتفاق ہے۔

تم لگام دبانے کو تو خوب استعمال کرتے ہو

مگر یہ بتاؤ کہ گھوڑا کم بخت کہاں ہے؟

ہمارے لبرل دوست کہتے ہیں کہ وہ اعتدال کے تنگ راستے پر چلتے ہیں اور کانگریس اور حکومت ہند کے دونوں کناروں کے بیچ میں اپنی کشتی کو چلاتے ہیں۔ انہوں نے اس کا فیصلہ کرنا اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اس میں یا اس میں کون سی خامی ہے، اور اس بات پر اپنی پیٹھ ٹھونکتے ہیں کہ ان میں نہ اس کے عیب ہیں نہ اس کے۔ وہ ترازو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور انصاف کی دیوی کی طرح وہ شاید اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں یا ان پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ کیا یہ میرا خیال ہی ہے جو مجھے صدیوں پیچھے لے جاتا ہے اور مجھے یہ مشہور کلمے سناتا ہے۔

عالمو اور خود پسند عابدو!۔۔۔ تم اندھے رہبر ہو کہ ایسے گناہ سے جو اونٹ کے برابر ہو چشم پوشی کر سکتے ہو اور ذرا سی بات تمہاری نظروں میں کھٹکتی ہے!۔۔۔

---

(۱) وگ انگلستان کی پرانی حریت پسند اور ٹوری قدامت پسند پارٹی کا نام تھا۔

پارلیمینٹ میں جو تجویزیں اور قانون منظور ہے وہ نیلے سرورق کے شائع ہوتے ہیں Blue Books اس طرح ایک خاص اصطلاح ہو گئی ہے۔

پروٹنس اور ٹرٹین یونانیوں کے دریائی دیوتا تھے۔

درجہ نوآبادی اور کامل آزادی

پچھلے سترہ برس میں جن لوگوں نے کانگریس کی سیاست طے کی ہے وہ بیشتر متوسط طبقے کے لوگ تھے خواہ وہ لبرل ہوں یا کانگریسی وہ تھے ایک ہی طبقے کے لوگ اورانہوں نے ایک سے ماحول میں تربیت پائی تھی۔ان کی زندگی ان کا میل جول ان کے تعلقات ایک ہی رنگ کے تھے اور بورژوار (۱) نصب العین کی دو قسمیں جن سے انھیں الگ الگ عقیدت تھی ابتدا میں یوں سمجھیے کہ ایک ہی سے تھے۔مزاج اور طبیعت کے اختلاف نے ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا اوران کے نقطعہ نظر کو بدل دیا۔ایک گروہ کی نگاہ حکومت اور متوسط طبقے کے سر پرآوردہ، مالدار آدمیوں کی طرف اٹھی، دوسرے کی متوسط طبقہ کے کم حیثیت والے حصے کی طرف جھکی۔ان کے خیالات دراصل ایک سے تھے، ان کے مقاصد میں کوئی فرق نہ تھا، لیکن دوسرے گروہ کو بازار کے ادنیٰ پیشوں کے لوگوں اور تعلیم یافتہ مگر بے روزگار آدمیوں کی کثیر تعداد پیچھے سے دھکیلنے لگی۔ان کا لہجہ بدل گیا انہوں نے مراتب کا لحاظ اور ادب سے بات کرنا چھوڑ دیا اور زور زور سے اور بڑھ چڑھ کر بولنے لگے۔ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ عمل میں تاثیر پیدا کریں، اس لئے انہوں نے سخت کلامی کرکے کچھ تسکین حاصل کی۔سیاسیات کو اس طرح کروٹ بدلتے دیکھ کر اعتدال پسند (موڈریٹ) ڈر گئے انہوں نے اس دوڑ میں شریک ہونے کا خیال چھوڑ دیا اور تنہائی کو سلامتی جانا۔اس حالت میں بھی کانگریس کے اندر متوسط طبقہ کے اونچے درجہ کے نمائندوں کی تعداد بہت تھی، اگرچہ اکثریت انہیں کی رہی جو ادنیٰ درجہ کے تھے۔ان کو ادھر یہی ایک حوصلہ کھینچ کر نہیں لایا کہ قوم کو جنگ میں کامیابی ہو، بلکہ وہ اس جنگ کے ذریعے اپنے دل کی ایک خواہش بھی پوری کرنا چاہتے تھے۔وہ اس کی بدولت اپنی کھوئی ہوئی آبرو اور خودداری حاصل کرنا اوراپنی بگڑی حیثیت کو بنانا چاہتے تھے۔

قومیت کا جذبہ عام طور سے اسی طرح ابھرتا ہے اوراگرچہ یہ خصوصیات ہر خیال کے

لوگوں میں یکساں پائی جاتی تھیں۔ اعتدال اور انتہا پسندوں کے مزاج کا فرق یہیں پر ظاہر ہوا۔ آہستہ آہستہ متوسط طبقہ کا ادنٰی درجہ کانگریس پر حاوی ہو گیا اور اس کے بعد کسانوں کا اثر بھی محسوس ہونے لگا۔ جیسے جیسے کانگریس دیہاتی آبادی کی نمائندگی کرنے لگی اس کے اور لبرلوں کے درمیان جو خلیج حائل ہو گئی تھی وہ بڑھتی گئی یہاں تک کہ لبرلوں کے لئے کانگریس کا نقطۂ نظر سمجھنا یا اس کی قدر پہچاننا ناممکن سا ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والے بڑے آدمی کے لئے پھونس یا مٹی کے جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے والے کی بات سمجھنا مشکل ہے۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود دونوں کا فلسفہ قومی اور بورژوا تھا یا فرق تھا جو تھا وہ قسم کا نہیں تھا، شدت کا تھا۔ بہت سے لوگ جو لبرل جماعت میں بے تکلفی سے کھپ سکتے تھے آخر وقت تک کانگریس میں رہے۔

کئی پشتوں تک انگریز ہندوستان کو اسی وضع کا ایک بہت بڑا زمینداروں کا گھر سمجھتے رہے جیسے کہ اگلے زمانے میں انگلستان میں ہوتے تھے۔ وہ گویا میاں لوگ تھے جو اس مکان کے مالک تھے اور اس کے سب اچھے حصوں میں رہتے تھے اور ہندوستانی ملازموں کی طرح شاگرد پیشے، برتن دھونے کے کمرے اور باورچی خانہ میں رکھ دیئے گئے تھے۔ ہر باضابطہ زمیندار گھرانے کی طرح جس میں ملازموں کے مراتب مقرر ہوتے ہیں یعنی خانساماں، منتظم، باورچی، خادمہ، سائیس وغیرہ ویسے ہی یہاں کا بھی قاعدہ تھا اور اس کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ کس کا درجہ بڑا ہے کس کا کم۔ لیکن اس گھرانے کے اعلٰی اور ادنٰی طبقہ کے درمیان معاشرتی اور سیاسی تفاوت تھا جس کا مٹنا ناممکن تھا۔ ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ برطانوی حکومت نے ایسے انتظام کو ہمارے اوپر مسلط کیا، تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم نے یا ہم میں سے ایک بڑی تعداد نے اسے منظور کر لیا اور اسے اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کا ایک قدرتی اور لازمی نظام سمجھا۔ ہم میں وہی ذہنیت پیدا ہو گئی جو ایک زمیندار

گھرانے کے اچھے نوکر کی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ہمیں یہ انوکھی عزت بخشی جاتی تھی کہ ڈرائنگ روم میں چائے کی ایک پیالی پینے کو دے دی جاتی تھی اور ہمارے حوصلے کی انتہا یہ تھی کہ شریف سمجھے جائیں اور فرداً فرداً ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ میں پہنچ جائیں۔ انگریزوں کا ہماری طبیعتوں کو اس طرح قابو میں کر لینا نیک کارنامہ تھا جس کی عظمت ان کے تدبر اور ان کی فوج کی کامیابیوں سے زیادہ تھی۔ جیسا کہ اگلے زمانہ کے حکما نے کہا ہے۔ غلام کے دماغ میں غلامی سرایت کر گئی، وہ غلام کی طرح سوچنے بھی لگا۔

زمانہ بدل گیا ہے اب اس وضع کی تہذیب جس کا نمونہ انگریز زمینداروں کا گھرانا تھا نہ انگلستان میں خوشی سے تسلیم کی جاتی ہے، نہ ہندوستان میں۔ پھر بھی ہم میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو شاگرد پیشہ ہیں، گھسے رہنا چاہتے ہیں اور ملازمت کی سنہری پٹیوں اور وردیوں پر ناز کرتے ہیں۔ دوسرے ہیں جو لبرلوں کی طرح اس زمینداروں کے گھر اور اس کے تمام لوازمات کو قابل قبول سمجھتے ہیں، عمارت اور طرز تعمیر کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس کی امید رکھتے ہیں کہ ایک ایک کر کے خود اس کے مالکوں کی جگہ لے لیں گے۔ اسے وہ ہندوستانی بنانا یا ہندیانہ کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ نظام حکومت کا رنگ بدل جائے یا زیادہ سے زیادہ کوئی نیا انتظام قائم کیا جائے بالکل نئی ریاست قائم کرسکنے کا تو تصور بھی یہ نہیں کرسکتے۔

ان کے لئے سوراج کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز پہلے کی سی حالت پر قائم رہے بس رنگ زیادہ گہرا ہو جائے۔ مستقبل کا یہی ایک نقشہ ان کے ذہن میں آسکتا ہے کہ وہ یا انہیں کے سے لوگ سیاسی ڈرامہ کا خاص پارٹ کریں، اور اعلیٰ انگریز عہدہ داروں کے عہدے حاصل کریں، ملازمتوں، سرکاری محکموں، قانون ساز مجلسوں، تجارت، صنعت سب کی صورت یہی رہے۔ سول سروس والے اپنے کام میں لگے

رہیں، راجہ مہاراجہ اپنے محلوں میں براجتے رہیں اور کبھی کبھی فینسی ڈریس یا ناچ رنگ کے لباس جواہرات کی چمک سے اپنی رعایا کو مرعوب کرنے کے لئے جلوہ افروز ہوں یا زمیندار ایک طرف خاص تحفظ کا مطالبہ کرتے اور دوسری طرف کاشتکاروں کو ستاتے رہیں، یا ساہوکار اپنی روپیوں کی تھیلیاں لئے زمیندار اور کاشتکار دونوں کی زندگی دوبھر کرتا رہے یا وکیل اپنی فیس وصول کرے اور خدا اپنے آسمان پر رہے۔

اصل میں ان لوگوں کے فلسفہ کی بنیاد موجودہ صورت حال قائم رہنے پر ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو تبدیلیاں وہ چاہتے ہیں وہ بس شخصی ہیں۔ ان تبدیلیوں کو وہ انگریزوں کی رضامندی سے آہستہ آہستہ عمل میں لانا چاہتے ہیں، جیسے کوئی چیز چھن کر قطرہ قطرہ آتی ہے۔ ان کی سیاسیات اور معاشیات کا دارومدار برطانوی سامراج کے استحکام اور بقاء پر ہے۔ ان کے نزدیک اس سامراج کو کم از کم ایک بڑی مدت تک زوال نہیں آسکتا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اسی مطابق ڈھال لیا ہے اور وہ اس کے سیاسی اور معاشی فلسفے ہی کو بجا تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کے اخلاقی معیار کو مانتے ہیں جو برطانوی تسلط کے قیام کو مدنظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے۔

اس رویہ سے کانگریس کا رویہ بالکل مختلف ہے، اس لئے کہ کانگریس انتظام حکومت کو بدلنا ہی نہیں بلکہ ایک نئی ریاست کی طرح ڈالنے کی فکر میں ہے۔ اس نئی ریاست کا نقشہ اوسط قابلیت کے کانگریسیوں کے ذہن میں بالکل صاف نہیں ہے اور لوگ اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں۔ کانگریسی عام طور پر اس پر متفق ہیں کہ موجودہ حالات اور طرز عمل نہ جاری رہ سکتا ہے اور نہ رہے گا اور بنیادی تبدیلیاں کرنا ناگزیر ہے۔ اسی میں سمجھے درجہ نوآبادی اور کامل آزادی کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ درجہ نوآبادی میں پرانے معاشرتی نظام کا باقی رہنا اور انگلستان کے معاشی نظام سے ہمارا، ظاہری اور پوشیدہ زنجیروں سے جکڑے رہنا فرض کیا جاتا ہے آزادی میں ہمیں اس کا اختیار ہوگا یا ہونا چاہیے کہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام تعمیر کریں۔

اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انگلستان یا انگریزی قوم سے ایسی عداوت برتی جائے جسے کم یا دور کرنے کی گنجائش نہ ہو، اور نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان سے قطع تعلق کرنے کی خواہش کو ہر طرح کا نقصان اٹھا کر پورا کریں۔ گذشتہ واقعات کو دیکھتے ہوئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان بغض و کینہ کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ بے سلیقہ طاقت کنجی کو خراب کر کے کلہاڑی سے تالا کھولتی ہے۔ ہمارے دلوں کی کنجی مدتیں ہوئیں کہ توڑ ڈالی گئی اور انگریزوں سے ہمیں اس بنا پر رغبت ہو نہیں سکتی تھی کہ انہوں نے اس کنجی کی جگہ بے تکلف کلہاڑی سے کام لیا۔ لیکن اگر ہمارا حوصلہ یہ ہے کہ چھوٹی باتوں سے گزر کر ہندوستان اور نوح انسان کی بڑی خدمات انجام دیں تو ہمارے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ اپنے آپ کو وقتی جوش کے حوالے کریں اور اگر ہم اس طرف مائل بھی ہوں تو وہ سخت تربیت جو گاندھی جی پندرہ برس سے دے رہے ہیں ہمیں روک لے گی۔ میں یہ باتیں انگریزوں کے بنائے ہوئے جیل خانہ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ سات مہینے سے میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں اور جتنی تکلیف مجھے اس قید تنہائی میں ہوئی اتنی جیل میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے واقعات سے میرا دل غصہ اور عداوت سے بھر آیا ہے لیکن میں اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈتا ہوں تو وہاں مجھے انگلستان یا انگریزوں سے عداوت کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ مجھے برطانوی ملوکیت سے نفرت ہے اور مجھے اس پر غصہ آتا ہے کہ ہندوستان اس کا شکار ہوا ہے۔ مجھے سرمایہ داری کے نظام سے نفرت ہے اور جس طرح برطانیہ کے حاکم طبقے ہندوستان کا خون چوستے ہیں اس سے مجھے اور بھی نفرت ہے اور اس پر بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ لیکن میں انگلستان یا تمام انگریزی قوم کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا اگر میں ایسا کرتا تو اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلتا۔ اس لئے کہ پوری قوم کی قوم سے خفا ہو جانا یا اسے ملزم قرار دینا کسی قدر حماقت کی بات ہے، وہ بھی حالات سے اتنی ہی مجبور

ہوتی ہے جتنے کہ ہم۔

اپنی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ انگلستان کا میری ذہنی ساخت پر اتنا زیادہ اثر ہے کہ اس سے کبھی بھی پوری غیریت نہیں برت سکتا۔ میں چاہے جتنی کوشش کروں میں ان ذہنی عادتوں، اس معیار اور دوسری قوموں اور عام زندگی کے بارے میں رائے قائم کرنے کے ان طریقوں سے جو میں نے انگلستان کے اسکول اور کالج میں سیکھے تھے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

سیاسی معاملات کے سوا میرے ذہنی میلانات بھی مجھے انگلستان کی طرف مائل کرتے ہیں اور اگر میں ہندوستان میں انگریزی حکومت کا ایسا کٹر مخالف ہو گیا ہوں جو کسی مصالحت پر راضی نہیں ہو سکتا تو اس میں میری تربیت اور طبیعت کا کوئی قصور نہیں۔ انگریزوں کی قوم نہیں بلکہ یہ حکومت یہ تسلط اصل چیز ہے جس پر ہمیں اعتراض ہے اور اسی سے ہم خوشی سے مصالحت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم چاہیں تو انگریزوں سے اور دوسری غیر قوموں سے ضرور گاڑھا میل جول رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہم کو تازی ہوا چاہئے۔ تازے اور جاں بخش خیالات اور ایسا اتحادِ عمل جس سے ہماری سیرت کو نقصان نہ پہنچے کیونکہ ہم سٹھیا گئے ہیں، ہمارے خیالات بوسیدہ ہیں لیکن اگر انگریز شیر بن کر آنا چاہیں تو انہیں دوستی یا اتحادِ عمل کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ ملوکیت کے شیر کا اسی کی سی بے دردی سے مقابلہ کیا جائے اور آج ہمارے ملک کا اس خونخوار جانور سے سابقہ ہے۔ جنگل کے وحشی چیتے کو سدھانا اور اس کی خلقی خونخواری کو تربیت کے جادو سے دور کرنا ممکن ہے، لیکن جب سرمایہ داری اور ملوکیت مل جائیں اور کسی بدقسمت ملک پر جھپٹا ماریں تو انہیں قابو میں کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

کسی کا یہ کہنا کہ وہ یا اس کی قوم مصالحت نہ کرے گی ایک معنی میں بیوقوفی ہے، کیونکہ دنیا ہمیں ہر وقت مصالحت کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہے اور جب یہ بات کسی

اور قوم یا ملک کے بارے میں کہی جائے تب تو وہ صریحی حماقت ہے۔ لیکن لوگ اس پر اڑ جائیں کہ ہم فلاں نظام کو تسلیم نہ کریں گے یا فلاں صورت حال کو گوارا نہ کریں گے تو اس میں صداقت ہو سکتی ہے اور تب انہیں کوئی انسانی قوت اس پر مجبور نہیں کر سکتی کہ مصالحت کر لیں۔ ہندوستانی آزادی اور برطانوی ملوکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور انہیں نہ فوجی عمل داری ہم آہنگ اور یکجا کر سکتی ہے اور نہ مدبروں کی ساری لیس پوت۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان سچے اتحاد عمل کے لئے موافق حالات اسی وقت پیدا ہوں گے جب ہندوستان سے برطانوی ملوکیت مٹا دی جائے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ آج کل کی دنیا میں جب ہر روز ایک ملک کو دوسرے کی ضرورت روز بروز زیادہ ہو رہی ہے۔ کامل آزادی کا عقیدہ رکھنا تنگ نظری ہے اور ہم آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو گویا زمانہ کی گھڑی کو پیچھے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لبرل اور امن پرست اور برطانیہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں سب یہی دلیل پیش کر کے ہماری تنگ نظر قومیت پر ہماری سرزنش کرتے ہیں اور ضمناً یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ ہمارے لئے مکمل قومی زندگی کا ذریعہ برطانوی اقوام کی کامن ویلتھ ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ انگلستان میں ہر رنگ کی حکمت عملی (لبرل، امن پرست، اشتراکی وغیرہ) سامراج کے قیام کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ٹروٹسکی نے لکھا ہے کہ حاکم قوم کی یہ خواہش کہ ہر چیز بس اپنے حال پر قائم رہے اکثر ایک خاص انداز اختیار کرتی ہے جو اپنے کو قومیت کے خیال پر برتر جتاتا ہے۔ بالکل جیسے فاتح قوم مال غنیمت کو قبضہ میں رکھنے کے لئے بڑی آسانی سے اس پر مست بن جاتی ہے۔ اسی طرح تو گاندھی کے مقابلہ میں میکڈونلڈ اپنے آپ کو بین الاقوامی میل جول کا حامی سمجھتا ہے۔!

مجھے معلوم نہیں کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کیا کرے گا

اور اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ جو آج قومی آزادی چاہتے ہیں وہی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اشتراکیوں کے نزدیک تو قومیت کے کوئی معنی ہی نہیں، لیکن وہ لوگ جو اشتراکی نہیں اور کانگریس کی اگلی صفوں میں ہیں وہ بھی بین الاقوامی میل ملاپ سے پختہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اگر آج ہم کامل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب دنیا سے قطع تعلق نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ہم تیار ہیں کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنی اس آزادی کے ایک حصہ سے دست بردار ہو جائیں تاکہ ایک بین الاقوامی نظام قائم کیا جا سکے۔ ملوکیت کا کوئی نظام، اس کا نام چاہے جتنا شاندار ہو، ایسی تنظیم کا دشمن ہوگا اور اگر ہم دنیا میں اتحاد عمل اور امن چاہتے ہیں تو اسے حاصل کرنے کے لئے ملوکیت کا نظام کبھی کام نہ آئے گا۔

حال کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے تمام سامراجی نظام خود کفالتی اور معاشی سامراج کے ذریعہ اپنے آپ کو روز بروز دوسروں سے جدا کر رہے ہیں۔ اس لئے بجائے اس کے کہ قوموں کا تعلق زیادہ گہرا ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بالکل خلاف ہو رہا ہے۔

اس کے اسباب دریافت کرنا کچھ مشکل نہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حکمت عملی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ جہاں اس علاقے میں جو خود کفیل ہو اتحاد عمل بڑھ جاتا ہے، وہاں دوسری طرف باقی دنیا سے علیحدگی بھی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اوٹاوا اور دوسرے فیصلوں کا اثر یہ ہوا ہے کہ برطانوی سامراج کے سوا اور ملکوں سے ہمارے تعلقات اور میل جول میں کمی ہو رہی ہے۔ ہم پہلے سے بھی زیادہ برطانوی صنعت کے دست نگر ہو گئے ہیں اور ان نقصانات کے علاوہ جو ہم برداشت کر چکے آگے چل کر اس حکمت عملی کے خطرے بھی ظاہر ہیں۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ درجہ نو آبادی ہمارے بین الاقوامی تعلقات کو

بڑھانے کی جگہ ہمیں الٹا اوروں سے جدا کردے گا۔

مگر ہمارے لبرل دوستوں میں یہ حیرت انگیز صفت ہے کہ وہ دنیا اور خصوصا اپنے ملک کو برطانیہ کی خالص قومی رنگ کی عینکوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کانگریس کیا کہتی ہے اور کیوں کہتی ہے۔ بس انگریزوں کے اس پرانے اعتراض کو کہ آزادی درجہ نوآبادی کے مقابلے میں تنگ ہے اور روح کو اس سے اتنا فروغ نہیں ہو سکتا دہراتے رہتے ہیں۔ ان کیبین الاقوامی دنیا بس وائٹ ہال ہے، اس لئے کہ دوسرے ملکوں کے بارے میں کچھ تو زبان کی دشواری کے سبب سے مگر زیادہ تر اسی وجہ سے کہ وہ دوسرے ملکوں کو اطمینان کے ساتھ نظر انداز کرسکتے ہیں، انہیں مطلق کوئی علم نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے تو وہ ہر اس طرز عمل کے خلاف ہوتے ہیں جس میں حکومت کی براہ راست مخالفت ہو یا جس سے جنگجوئی ظاہر ہوتی ہو۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے بعض لیڈروں کا اس وقت کوئی اعتراض نہیں ہوتا جب کسی دوسرے ملک میں یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ وہ ایسی چیزوں کو دور سے سمجھ سکتے ہیں اور ان کی قدر بھی کرسکتے ہیں اور مغربی ملکوں کے کئی حاکم مطلق ہیں جنہیں ان سے ذہنی احترام اور عقیدت کا خراج ملتا رہتا ہے۔

ناموں سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ ہمارے مدنظر ایک نئی ریاست ہے یا صرف ایک بدلا ہوا انتظام حکومت۔ لبرل اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ صاف ہے۔ انہیں ایک بدلے ہوئے انتظام حکومت سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے اور وہ بھی ان کے نزدیک ایک ایسی منزل مقصود ہے جہاں تک ہم ایک لمبا سفر کرکے بتدریج ہی پہنچیں گے۔ وہ کبھی کبھی درجہ نو کا ذکر کرتے ہیں، لیکن فی الحال جو چیز دراصل ان کے مدنظر ہے وہ مرکز میں ذمہ داری کے پراسرار الفاظ سے ظاہر کی جاتی ہے ایسے جوشیلے لفظ جیسے کہ طاقت، خودمختاری، حریت، آزادی انہیں نہیں بھاتے۔ ان کی تو آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ

خطرناک ہیں۔ قانون دانوں کی زبان اور بحث کا طریقہ انہیں بہت پسند ہے اگر چہ اس سے عوام کے دلوں میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔ تاریخ میں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ افراد اور جماعتوں نے عقیدے اور آزادی کے لئے خطروں کا سامنا کیا اور جان کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ مگر اس میں شک ہے کہ مرکز میں ذمہ داریا ایسی کسی قانونی اصطلاح کی خاطر کوئی شخص کبھی بھی جان بوجھ کر ایک وقت کا کھانا چھوڑ دے گا یا کسی کی گہری نیند ہلکی ہو جائے گی۔

تو یہ ہے ان کا مطمع نظر اور یہ مقصد حکومت کی کھلم کھلا مخالفت یا کسی طرح کی پیش قدمی کر کے حاصل نہ کیا جائے گا۔ بلکہ جیسا کہ سری نواس شاستری صاحب نے فرمایا ہے، دانشمندی، تجربہ کاری، میانہ روی، دوسرے کو قائل کرنے کی قوت، خاموش اثر اور سچی مستعدی کی خوبیوں کو نمایاں کر کے۔ امید اس کی کی جاتی ہے کہ ہمارا نیک چلن اور ہمارے اچھے کام آخر کار ہمارے حاکموں کو اس پر آمادہ کر لیں گے کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دے دیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ہمارے حاکم آج کل ہماری مخالفت یا تو اس سبب سے کرتے ہیں کہ ہمیں لڑائی پر تلے ہوئے دیکھ کر انہیں غصہ آتا ہے یا اس وجہ سے کہ انہیں ہماری استعداد پر شبہ ہے یا ممکن ہے یہ دونوں باتیں یکساں ان کے رویئے پر اثر ڈال رہی ہوں۔ ملوکیت کی اور موجودہ حالات کی اس توضیح سے کسی قدر سادہ لوحی ظاہر ہوتی ہے۔ پروفیر آر۔ اج۔ ٹونی نے جو ایک تیز نظر انگریز مصنف ہیں، اس خیال کے متعلق کہ اقتدار درجہ بدرجہ اور حاکم طبقوں کی مدد سے حاصل کیا جا سکتا ہے، ایک جگہ بڑی اچھی اور چبھتی ہوئی بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا تو ہے برطانوی لیبر پارٹی کے متعلق، لیکن جو کچھ وہ کہتے ہیں ہندوستان پر اور بھی پورا اترتا ہے کیونکہ انگلستان میں کم از کم جمہوری ادارے تو ہیں جن کے ذریعہ سے اصولاً اکثریت کا ارادہ ظاہر کیا جا سکتا ہے، پروفیسر ٹونی لکھتے ہیں۔

پیاز تو پرت پرت کرکے کھائی جاسکتی ہے۔لیکن آپ چاہیں کہ
زندہ شیر کی کھال کھینچیں، پہلے ایک پنجہ کی اور پھر دوسرے کی تو یہ نہیں
ہوسکتا۔ چیر پھاڑ تو خود شیر کا پیشہ ہے،وہ پہلے کھال اتار لیتا ہے۔

دنیا میں شاید کوئی ایسا ملک ہو جہاں کے سربرآوردہ اور حاکم طبقہ کے لوگ سب بدھو ہیں۔لیکن انگلستان تو ہرگز ایسے ملکوں میں نہیں۔ یہ خیال کہ لیبر پارٹی کے مطالبات پیش کرنے میں موقع شناسی اور دوستانہ انداز سے کام لیا جائے تو یہ لوگ اس دھوکے میں ڈالے جاسکتے ہیں کہ یہ ان کے اپنے مطالبات ہیں ایسا ہی فضول ہے جیسے یہ کوشش کہ ایک چلتے ہوئے وکیل سے ایسی جائداد دھوکہ دہی سے حاصل کرلی جائے جس کی دستاویز حقیقت اس کے قبضہ میں موجود ہے۔ ہمارے یہاں کے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں دولت اور اقتدار ہے خوش گوار اخلاق کے، ہوشیار، زوردار اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے والے لوگ ہیں اور جب یہ زچ ہوتے ہیں تو پھر تو کسی اخلاقی اصول کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔وہ خوب جانتے ہیں کہ روٹی پر مکھن کس طرف لگا ہے۔اور وہ اس پر بھی تلے ہوئے ہیں کہ مکھن کی فراہمی میں کمی نہ ہو۔ ۔۔۔اگر انہوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں دیکھا تو وہ ہر سیاسی اور معاشی چال چلیں گے اور ہر ہتھیار سے کام لیں گے۔ایوان امراء، بادشاہ، اخبار فوج میں بدامنی، مالی دشواریاں، بین الاقوامی پیچیدگیاں اور جیسا کہ وہ حملہ جو اخباروں نے ۱۹۳۱ء میں پاؤنڈ پر کیا تھا ظاہر کرتا ہے وہ دیس تیاگیوں کی اس چال تک سے نہ چوکیں گے جس سے اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کی خاطر ملک کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

برطانوی لیبر پارٹی کا ایک زبردست نظام ہے مزدوروں کے یونین، جس کے لاکھوں چندہ دینے والے اراکین ہیں اور جنہوں نے ایک نہایت مکمل امداد باہمی کا نظام مرتب کرلیا ہے۔اس کی پشت پر ہیں اور اعلیٰ پیشوں کے بہت سے لوگ ان کے رکن اور ہمدرد ہیں۔برطانیہ میں جمہوری مشاورتی ادارے ہیں جن کی بنیاد عام

حق رائے دہندگی پر ہے اور سیاسی آزادی کا رواج صدیوں سے قائم ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود مسٹر ٹونی کی رائے ہے اور حال کے واقعات نے ثابت بھی کر دیا ہے کہ ان کی رائے درست ہے کہ لیبر پارٹی خالی مسکرانے اور نرمی سے بات سمجھانے سے اصل اقتدار حاصل نہیں کر سکتی، اگرچہ یہ دونوں طریقے اپنی جگہ مفید اور پسندیدہ ہیں۔ مسٹر ٹونی کہتے ہیں کہ اگر ایوان عام میں لیبر پارٹی کی اکثریت ہو گئی تب بھی اسے بنیادی اصلاحیں عمل میں لانے کا ذرا بھی اختیار نہ ہو گا۔ کیونکہ سربرآوردہ اور مقتدر طبقے کے لوگ جوان کے مقابلے میں صف آراء ہیں، بہت سے سیاسی، معاشرتی، معاشی، مالی اور فوجی قلعوں پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ہندوستان کی حالت بالکل اور ہے۔ یہاں جمہوری ادارے ہیں نہ روایات بلکہ اس کے برخلاف آرڈیننس اور حکومت مطلق کا رواج پرانا اور مستند ہو گیا ہے۔ یہاں آئے دن شخصی اور تقریر، تحریر، اجتماع اور پریس کی آزادی کا سر کچلا جایا کرتا ہے۔ لبرلوں کی پشت پر کوئی مضبوط نہیں ہے۔ اس لئے انہیں بس اپنے تبسم ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

لبرل ہر تحریک کی جو دستور یا قانون کے خلاف ہو سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ ایسے ملکوں میں جہاں کا دستور جمہوری ہو، دستور کے معنی بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ قانون سازی پر حاوی ہوتا ہے، آزادی کا تحفظ کرتا ہے، عاملہ کی روک تھام کرتا ہے اور سیاسی اور معاشی نظام میں تبدیلیاں کرنے کے جمہوری طریقے معین کر دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسا کوئی دستور نہیں اور یہاں یہ اصطلاح ایسے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ (۲) اسے استعمال کر کے ہم صرف ایک تصور کو اپنی سیاسی بحث میں داخل کرتے ہیں جس کے لئے ہماری موجودہ زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ لفظ اکثر عاملہ کی کم و بیش بے ضابطہ کارروائیوں کی تائید کے لئے کام میں لایا جاتا ہے، یا اس سے مراد فقط ''قانونی'' ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بہت بہتر ہے اگر ہم

قانون اور خلاف قانون پر اکتفا کریں، اگر چہ یہ اصطلاحیں بھی مبہم ہیں اور ان کے معنی آج کچھ ہوتے ہیں تو کل کچھ اور۔

ایک نیا قانون یا نیا آرڈیننس نئے جرم قائم کر دیتا ہے۔ کسی پبلک جلسہ میں شریک ہونا جرم ٹھہرایا جا سکتا ہے، یا بائیسکل پر چڑھنا، یا کوئی خاص کپڑے پہننا مغرب سے پہلے گھر کے اندر نہ پہنچ جانا، یا تھانہ میں روز حاضری نہ دینا، ہندوستان کے بعض حصے ہیں جہاں آج کل یہ سب باتیں قانون کی خلاف ورزی ہیں یہ ممکن ہے کہ ملک کے ایک حصے میں کوئی بات جرم مانی جائے اور دوسرے نہ مانی جائے۔ جب کوئی غیر ذمہ دار عاملہ مختصر سے مختصر اطلاع کے بعد ایسے قانون جاری کر سکتی ہے تو قانون سے مراد اس عاملہ کے ارادے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ معمولاً ایسے قانون کی خوشی سے یا منھ پھلا کر تعمیل کی جاتی ہے، اس لئے کہ نافرمانی کے نتیجے ناگوار ہوتے ہیں لیکن کوئی کہے کہ وہ ہمیشہ قانون کی فرماں برداری کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مطلق حکومت یا غیر ذمہ دار قوت کے سامنے زمین پر سر رکھ دیتا ہے، اپنے ضمیر کو اس کے حوالے کر دیتا ہے اور جہاں تک اس کے اپنے عمل کا تعلق ہے آزادی حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

آج کل ان ملکوں میں جہاں کی حکومت جمہوری اس پر بحث ہو رہی ہے کہ معاشی نظام میں ان ذریعوں کی بدولت جو دستور نے مہیا کیے ہیں بنیادی تبدیلیاں معمولی کاروائی کے طور پر عمل میں لائی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ بہت سے لوگوں کی رائے ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا اور کوئی غیر معمولی انقلابی تدبیر اختیار کرنا ہوگی۔ ہمارے لئے تو یہ دیکھنا بیکار ہے کہ اس بحث سے کیا نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ ہم جو تبدیلیاں چاہتے ہیں انہیں عمل میں لانے کے لئے دستور نے کوئی ذریعے مقرر ہی نہیں کیے ہیں۔ اگر وائٹ پیپر والی یا ایسی ہی کسی اور تجویز نے قانون کی شکل پائی تو ہماری دستوری نشو و نما کی طرف بالکل بند ہو جائے گی اور انقلاب یا غیر قانونی کاروائی کے سوا اس قید سے

آزاد ہونے کا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ کیا اصطلاح کا خیال چھوڑ کر قسمت پر شاکر ہو بیٹھیں؟

آج کل جو صورت ہے وہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ عاملہ کو اس کا اختیار ہے اور یہ اختیار کام میں بھی لایا جاتا ہے کہ ہر قسم کے پبلک کام کو بالکل بند کر دے یا اس میں رکاوٹیں پیدا کر دے۔ ہر کام جو اس کی رائے میں اس کے لئے خطرناک ہے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے اور اس طرح جیسے کہ پچھلے تین سال میں ہوتا رہا ہے، قوم کی ہر نتیجہ خیز جدوجہد بند کی جا سکتی ہے۔ اس صورت کو گوارا کرنے کے معنی ہیں کہ ہر قومی کام چھوڑ دیا جائے اور اس کا مان لینا تو ایک ناممکن سی بات کو مان لینا ہے۔

اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ہمیشہ اور بلا استثنا قانون کے مطابق عمل کرے گا۔ جمہوری ریاستوں میں بھی ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جب انسان کا ضمیر اسے قانون کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہے۔ جس ملک کی حکومت استبدادی یا غیر ذمہ دارانہ ہو ایسے موقعے بہت کثرت سے آتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی ریاست میں قانون اخلاقاً حق بجانب رہتا ہی نہیں۔

لبرل کہتے ہیں کہ براہ راست سیاسی عمل حکومت مطلق سے ملتی جلتی چیز ہے، جمہوریت سے نہیں اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت کو فتح ہو انہیں براہ راست سیاسی عمل کا یہ اصول چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ بات الجھے ہوئے خیالات اور مبہم عبارت کا ایک نمونہ ہے۔ کبھی کبھی یہ براہ راست سیاسی عمل مثلاً مزدوروں کی ہڑتال، قانونی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں غالباً صرف سیاسی کارروائیوں سے بحث ہے۔ جرمنی میں آج کل کس طرح کا عمل ممکن ہے؟ ہٹلر کی ذلت آمیز فرماں برداری یا کوئی انقلابی یا خلاف قانون کارروائی۔ جمہوریت کی وہاں اور کس طرح خدمت کی جا سکتی ہے؟

ہندوستانی لبرل اکثر جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں، مگر ان میں بہت سے اس

کے قریب بھی جانا نہیں چاہتے۔ سر سی۔پی شوسوامی آئیر نے جو ہندوستان کے سب سے ممتاز لیڈروں میں سے ہیں، مئی ۱۹۴۴ء میں کہا تھا کہ کانگریس کا یہ مطالبہ کہ ایک دستور ساز مجلس طلب کی جائے عوام کی سوجھ بوجھ پر بہت زیادہ بھروسا کرنا ہے۔ اور ان لوگوں کے خلوص اور قابلیت کے ساتھ ظلم ہے جنہوں نے مختلف گول میز کانفرنسوں میں حصہ لیا ہے۔ مجھے اس میں بہت شک ہے کہ دستور ساز مجلس اس سے کچھ بہتر کر دکھائی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمہوریت کا جو تصور سر شوامی آئیر کے ذہن میں ہے وہ عوام سے ایک جدا چیز ہے اور ایسے مخلص اور قابل لوگوں کا اجتماع جنہیں برطانوی حکومت نے نامزد کیا ہو اس سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جناب موصوف وائٹ پیپر کی تجویزوں کو دعائیں دیتے ہیں، اس لئے کہ گو وہ ان سے پورے طور پر مطمئن نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کا ساری کی ساری تجویزیں رد کر دینا عقلمندی کی بات نہیں، ہمیں اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حکومت برطانیہ اور سر شوسوامی آئیر کے درمیان پورا اتحاد عمل نہ ہو۔

کانگریس نے جب سول نافرمانی بند کر دی تو لبرل ظاہر ہے بہت خوش ہوئے اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس حماقت آمیز اور خلاف مصلحت تحریک سے الگ اور دور رہنے پر انہوں نے اپنی عقلمندی کی داد بھی لینا چاہی، دیکھو ہم نے کہا تھا نا؟ وہ اکثر ہم سے کہا کرتے تھے یہ دلیل بھی نرالی ہے۔ چونکہ ہم لڑنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور لڑے بھی خوب تھے، ہم گرا دیئے گئے اس لئے ہم کو یہ نصیحت کی گئی کہ کھڑا ہونا برا ہے۔ سب سے اچھی اور محفوظ چال پیٹ کے بل گھسٹنا ہے۔ آدمی اس طرح پڑا ہو تو نہ گرایا جاسکتا ہے نہ گر سکتا ہے۔

---

(۱) بورژوا (Bourgeois) کے اصل معنی ہیں متوسط طبقہ کے لوگ، لیکن اشتراکی ادب میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چاہے خود بڑے سرمایہ دار نہ ہوں مگر سرمایہ داری کے معاشرتی نظام اور تہذیب کو قائم رکھنا چاہتے ہوں۔ اور اسی طرح وہ ہر

اس شخص کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو اشتراکی نہ ہو۔

(۲) مسٹر سی وائی چنتا منی نے جو ایک ممتاز لبرل لیڈر اور اخبار ''لیڈر'' کے صدر مدیر ہیں۔ یو پی کونسل میں پارلیمنٹری جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان میں کسی قسم کی دستوری حکومت نہیں: ''بہتر یہ ہے کہ ہم موجودہ غیر دستوری حکومت کے ماتحت رہیں۔ بہ نسبت اس آئندہ کی حکومت کے جو اور بھی رجعت پسند اور بہت زیادہ غیر دستوری ہوگی۔''

پرانا اور نیا ہندوستان

یہ ایک قدرتی اور لازمی بات تھی کہ قوم پرست ہندوستانیوں کو غیروں کی حکومت پر غصہ آئے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانی شعوری یا غیر شعوری طور پر سلطنت کے برطانوی تصورات تسلیم کرتے رہے۔ وہ اپنی دلیلیں انہیں تصورات پر قائم کرتے تھے اور انھیں صرف ان کے چند خارجی نتائج پر اعتراض کرنے کی ہمت ہوتی تھی۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ اور اور معاشیات کی جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا نقطہ نظر بالکل برطانوی ملوکیت کا تھا۔ اس میں ہماری پچھلی اور موجودہ خامیاں جتائی جاتی تھیں اور انگریزوں کے اوصاف اور ان کی بلند اقبالی۔ ہم حالات کی اس بگڑی تصویر کو کسی حد تک صحیح مانتے تھے اور جہاں طبعیت اسے قبول نہ کرتی وہاں بھی ہم پر اس کا اثر ضرور پڑتا۔ پہلے تو ذہن کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کیونکہ ہم اور واقعات یا دلیلوں سے واقف ہی نہ تھے اس لئے ہم نے مذہبی قومیت کے دامن میں پناہ لی۔ اس خیال سے کہ کم سے کم مذہب اور فلسفہ کے میدان ہم کسی قوم سے بیٹے نہیں۔ مصیبت اور ذلت میں ہم اپنے آپ کو یقین دلاتے رہے کہ اگرچہ ہم میں مغرب کی سی ظاہری شان اور چمک دمک نہیں ہے پھر بھی ہم اس باطنی دولت کے مالک ہیں جو اصل چیز ہے جس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے اور جس کا حاصل کرنا بہت بہتر ہے۔ ایک طرف سوامی ودیکانند اور ان جیسے اور لوگوں نے۔ دوسری طرف اس دلچسپی نے جو مغربی عالم ہمارے قدیم فلسفوں سے رکھتے تھے ہمیں کسی قدر خود دار بنایا اور گذشتہ زمانے پر فخر کرنے کے جذبے کو بیدار کیا۔

آہستہ آہستہ ہم ان باتوں پر جو انگریز ہمارے ماضی اور موجودہ حالات کے متعلق کہتے تھے شبہ کرنے لگے۔ ہم نے ان کی تنقید شروع کردی لیکن اب ہمارا خیال اور عمل انگریزوں کے قائم کیئے ہوئے تصورات کے دائرے میں محدود رہا۔

کوئی بری بات ہوتی تو ہم کہتے کہ یہ انگریزوں کی فطرت کے خلاف ہے۔
ہندوستان میں کوئی انگریز بدتمیزی کرتا تو یہ قصور برطانوی نظام کا نہ ٹھہرایا جاتا بلکہ اس شخص کا لیکن برطانوی حکومت پر تنقیدوں کا مواد جمع ہونا لکھنے والوں کی اعتدال پسندی کے باوجود ایک انقلاب کا کام کر گیا اور اس نے ہماری قومیت کی سیاسی اور اقتصادی بنیاد ڈال دی۔ دادا بھائی نوروجی کی تصنیف ہندوستان کا افلاس اور برطانوی فطرت کے خلاف حکومت اور رمیش دت ولیم ڈگبی وغیرہ کی کتابوں نے قومیت کی نشو ونما میں ایک انقلابی عنصر پیدا کر دیا۔ قدیم تاریخ ہند کی تحقیق کی گئی تو ایسے درخشاں ادوار کا انکشاف ہوا جن میں تہذیب و تمدن عروج کو پہنچ گیا تھا اور ان کا حال پڑھ کر ہمیں بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے کارنامے اس سے بہت مختلف تھے جو ہم ان کی تاریخ کی کتابیں پڑھ کر سمجھا کرتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ، معاشیات اور نظام حکومت کے متعلق انگریزوں کے جو بیانات تھے ان کی ہم تردید کرتے رہے، لیکن اسی حلقہ کے اندر جو ان کے تصورات نے کھینچ دیا تھا۔ جب نئی صدی شروع ہوئی تو مجموعی حیثیت سے ہندوستانی قومیت کا یہ رنگ تھا۔ اب بھی لبرل جماعت، چند اور چھوٹی پارٹیوں اور اعتدال پسند کانگریسیوں کی ایک تعداد کا یہی حال ہے۔ ان کے جذبات وقتاً فوقتاً انھیں آگے بڑھاتے ہیں مگر خیالات کے اعتبار سے ان کی زندگی انیسویں صدی میں بسر ہو رہی ہے۔ اسی کے سبب سے ہندوستان کی آزادی کا تصور کسی لبرل کے دماغ میں سما ہی نہیں سکتا کیونکہ اس تصور اور انیسویں صدی کے طرز خیال میں بنیادی اختلاف ہے اور ان دونوں میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ لبرل یہ سوچتا ہے کہ وہ قدم بہ قدم اونچے عہدوں پر پہنچتا جائے گا۔ اس کے سامنے جو مسلیں پیش ہوں گی وہ زیادہ موٹی اور اہم ہوتی جائیں گی۔ حکومت کا دربار اسی طرح جمارہے گا بس اتنا

فرق ہو جائے گا کہ صدر میں وہ خود رونق افروز ہوگا اور ایک گوشہ میں برطانوی فوج ادب سے کھڑی رہے گی کہ ضرورت کے وقت اس کی حفاظت کرے۔ لبرل کے نزدیک برطانوی سامراج کے اندر درجہ نوآبادی حاصل کرنے سے مراد یہ صورت حال ہے۔ یہ سادہ لوحی کا ایک خواب ہے جسے حقیقت کا روپ کبھی نصیب نہ ہوگا کیونکہ انگریز حفاظت اسی وقت تک کریں گے جب تک ہندوستان غلام رہ کر حفاظت کی قیمت ادا کرے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ بات ہمارے عظیم الشان ملک کے لئے باعث ننگ ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا سر فرڈرک وائٹ جو ہرگز ہندوستانی قومیت کے حامی نہیں ہیں اپنی ایک تازہ تصنیف میں اس کے آڑے آئے گا اور جب تک وہ اس خیال خام میں مبتلا ہے وہ اس سوراج کی جو کہ اس کا نصب العین ہے بنیاد نہیں رکھ سکتا۔ یہاں پر بظاہر مصنف کا اشارہ لبرل یا رجعت پسند اور فرقہ پرست ہندوستانیوں کی طرف ہے۔ کیونکہ جب وہ قانون دان اسمبلی کے صدر تھے تو انہیں لوگوں سے ان کا زیادہ سابقہ رہا ہوگا۔ کانگریس کا یہ عقیدہ نہیں ہے اور جو دوسری ترقی پسند جماعتیں ہیں ان کا تو ذکر ہی نہیں مگر سر فرڈرک کے اس خیال سے انہیں اتفاق ہے کہ جب تک ہندوستانیوں کا یہ خیال خام مٹ جائے اور ہندوستان مفروضہ مصیبت کا سامنا کرنے کو اکیلا نہ چھوڑ دیا جائے تب تک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ برطانیہ کے فوجی تسلط کا بالکل دور ہو جانا ہندوستانی آزادی کا پہلا قدم ہوگا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انیسویں صدی میں تعلیم یافتہ ہندوستانی برطانوی تصورات کے قائل تھے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے جوش دلانے والے واقعات اور تغیرات کے بعد بھی بعض لوگ اس دام فریب میں گرفتار ہیں۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے حکمران طبقے اپنی دولت، کامیابی اور اقتدار کی روایات کی بنا پر دنیا میں امرا کی شان رکھتے تھے۔ ان روایات کے سائے میں تربیب پانے سے ان میں امارت کے کچھ اوصاف اور کچھ خامیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ ہم

ہندوستانی اس بات سے تسلی حاصل کر سکتے ہیں کہ پچھلے پونے دو سال میں ہم نے انہیں اس اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے وسائل اور مواقع بہم پہنچائے جیسا کہ پہلے بھی بہت سی نسلیں اور قومیں کر چکی ہیں۔ انگریز اپنے آپ کو خدا کے برگزیدہ بندے اور سلطنت کو خدا کی حکومت سمجھنے لگے۔ جب تک ان کا یہ مرتبہ تسلیم کیا گیا اور ان کے دعوے فضیلت کی تردید نہیں ہوئی وہ لطف و کرم سے کام لیتے رہے مگر وہیں تک جہاں تک ان کا کوئی نقصان نہ تھا لیکن ان کی مخالفت حکومت الٰہی کی مخالفت تھی اور یہ صریح کفر تھا جس کا توڑنا لازم ہو گیا۔

موسیو آندرے ژید نے انگریزی سیرت کے اس پہلو پر بہت دلچسپ طریقے سے لکھا ہے (۲)

اقتدار اور دولت کی موروثی روایات نے رفتہ رفتہ ان میں ایک امارت کی شان پیدا کر دی اور وہ اس کے مدعی بن گئے کہ ان کی قوم کو حکومت خداداد حق حاصل ہے۔ ان کا یہ زعم اس حالت میں بڑھتا ہی گیا، جب لوگ ان کے دعوے فضیلت کی تردید کرنے لگے یہاں تک کہ پچھلی صدی کے آخری حصہ کے نوجوان۔۔۔۔ غیر شعوری طور پر سمجھنے لگے کہ ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہم واقعی اس کے مستحق ہیں۔

اس طرز خیال پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں، کیونکہ اس سے انگریزوں کی نفسیات کے ایک باریک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تو سبھی نے محسوس کیا ہوگا کہ انگلستان سمجھتا ہے کہ اس کی مشکلات کا سرچشمہ خارجی اسباب میں ہے۔ وہ ہر معاملہ میں یہی کہتا ہے کہ فلاں کی غلطی ہے اور اگر یہ فلاں اپنی اصلاح کرنے پر راضی ہو جائے تو انگلستان پھر خوش حال ہو جائے گا۔۔۔۔ ہر موقع پر انگریزوں کی اس جبلت کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کے بجائے کسی دوسرے کی اصلاح کریں!۔

اگر اور ملکوں کے ساتھ انگریزوں کا یہ عام رویہ تھا تو ہندوستان میں یہ اور بھی زیادہ نمایاں رہا۔ ہندوستان کے مسئلے پر جس انداز سے انگریز غور کرتے ہیں وہ ہمارے لئے کتنا ہی تکلیف دہ ہو مگر دلکشی سے خالی نہیں، ان کا راسخ عقیدہ ہے کہ وہ ہر حال میں حق پر ہیں۔ اور ایک عظیم الشان فرض سے بہ خوبی عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ ان کی قوم خدا کی برگزیدہ قوم اور ان کی سلطنت دنیا کی بہترین سلطنت ہے۔ ان گنہگاروں کا جو اس سچے عقیدے کے منکر ہیں وہ غصہ اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس طرز خیال میں ایک مذہبی رنگ کی جھلک ہے۔ کلیسا کے قدیم محکمہ احتساب کی طرح وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں وہ ہمیں نجات ضرور دلا کر رہیں گے۔ اس روحانی کاروبار سے انہوں نے ضمناً دنیاوی منافع بھی حاصل کیا اور اس طرح ایک پرانی مثل کہ ایمانداری سب سے زیادہ نفع کی چیز ہے۔ صحیح ثابت ہوگئی۔ ہندوستان کی ترقی کے معنی یہ قرار پائے کہ وہ برطانوی سلطنت میں کھپ جائے اور منتخب ہندوستانی ولایتی سانچے میں ڈھل جائیں۔ برطانوی نصب العین اور مقاصد کو ہم جتنا زیادہ اختیار کرتے اتنی ہی زیادہ ہم میں اپنے آپ پر حکومت کرنے کی صلاحیت تسلیم کی جاتی۔ جس وقت ہم یہ دکھا دیتے اور اس کا یقین دلا دیتے کہ ہم اپنی آزادی برطانیہ کی خواہشوں کے مطابق استعمال کریں گے اسی وقت آزاد کر دیئے جاتے۔

برطانوی حکومت کے کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی رائے میں ضرور اختلاف ہوگا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ مگر جب بڑے پائے کے انگریز عہدہ دار، یہاں تک کہ بعض وزیر ہندوستان کے گزشتہ اور موجودہ حالات کی خیالی تصویریں کھینچتے ہیں اور بے بنیاد باتیں کہتے ہیں تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ چند ماہروں اور دوسرے لوگوں کے سوا ہندوستان کے متعلق عام انگریزوں کی لاعلمی نہایت حیرت انگیز ہے۔ جب وہ ٹھوس واقعات کو

نہیں دیکھ سکتے تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کی روح تک ان کی پہنچ کیونکر ہو سکتی ہے۔

انھوں نے اس کے جسم پر قبضہ کر لیا، لیکن یہ قبضہ جبر و تشدد کا تھا۔ وہ اس کی سیرت کو نہیں سمجھ سکے اور نہ انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کبھی اسے آنکھ ملا کر نہیں دیکھا کیونکہ ان کی نظریں پھری ہوئی تھیں اور اس کی نظریں شرم اور ذلت سے نیچی تھیں۔ صدیوں کے سابقہ کے بعد باہمی اجنبیت دور نہیں ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے بیزار رہیں۔

اس افلاس اور ذلت کے باوجود ہندوستان شرافت اور عظمت سے خالی نہیں تھا۔ اگر چہ وہ قدیم روایات اور موجودہ مصیبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کا خمار تھا مگر اسی کے ساتھ اس میں ایک حسن تھا جو روحانی کیفیت نے اس کے خط و خال میں پیدا کر دیا تھا، اس کے عجیب و غریب تصورات، نادر تخیلات اور پاکیزہ جذبات کے نقش ایک ایک کر کے اس کے چہرے پر ابھر آئے تھے۔ اس کے شکستہ جسم سے روحانی عظمت و وقار کی جھلک اب تک نظر آتی ہے۔ اس نے تاریخ کی طویل منزلیں طے کی ہیں اور اس سفر میں علم و حکمت کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اسے بہت سے اجنبیوں سے سابقہ پڑا۔ اس نے انھیں اپنے وسیع خاندان میں شامل کر لیا۔ اس نے بڑے نشیب و فراز اٹھائے سخت ذلتیں اور مصیبتیں جھلیں اور عجیب عجیب تماشے دیکھے، لیکن اس لمبے سفر میں اول سے آخر تک اس نے اپنی پراچین تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس سے تقویت اور زندگی حاصل کی اور دوسرے ملکوں کو بھی اس میں سے حصہ دیا۔ جھولے کی طرح وہ کبھی اوپر گیا کبھی نیچے آیا، اٹھا تو اپنے تخیل کی پرواز سے آسمانوں کی خبر لایا، گرا تو پستی کے گڑھے میں پاتال تک پہنچا۔ باوجود باطل اوہام اور لغو رسوم کے بوجھ کے جس نے اس کی کمر توڑ دی تھی، وہ اس روح افزا تعلیم کو بالکل بھولا نہیں تھا جو ابتدا میں اس کے دانا ترین روشن ضمیر حکیموں نے اپنشد کے ذریعہ دی تھی۔ ان کے تیز ذہن جو تلاش حق کی خلش

سے بے چین، ہمیشہ سعی و جستجو میں لگے رہتے تھے، انھوں نے اندھے عقائد کے دامن میں پناہ نہیں لی، بے جان رسوم اور معمولات پر تکیہ نہیں کیا، وہ اس لوک میں اپنی ذات کو تکلیف اور مصیبت سے بچانا اور پرلوک میں بیکنٹھ میں ٹھکانا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ بصیرت اور معرفت کے طلبگار تھے، مجھے مجاز سے حقیقت تک پہنچا دے اندھیرے سے روشنی تک، موت سے حیات دوام تک، (۳) یہ گاتیری منتر یہ علم اور بصیرت کی دعا، ان دعاوں میں جو آج کل بھی لاکھوں آدمی روزانہ پڑھتے ہیں سب سے زیادہ مشہور ہے۔

اگر چہ سیاسی اعتبار سے ہندوستانی روح اکثر منتشر رہی لیکن اس نے اپنے مشترک روحانی سرمائے کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور اس کثرت میں وحدت کا رنگ جھلکتا رہا (۴) تمام قدیم ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اچھائی یا برائی کا معجون مرکب تھا لیکن اس کی اچھائیاں چھپی ہوئی تھیں اور انہیں تلاش کرنے کی ضرورت تھی اور تنزل کے آثار کھلے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی تیز، بے رحم دھوپ انہیں اور چمکاتی تھی۔

ہندوستان اور اطالیہ کی حالت کچھ ملتی جلتی ہے۔ دونوں پرانے ملک ہیں اور ان کی تمدنی روایات کا سلسلہ بہت دور تک پہنچتا ہے، البتہ اطالیہ ہندوستان کے مقابلہ میں کم عمر ہے اور وسعت میں اس سے بھی بہت کم ہے۔ دونوں میں سیاسی انتشار رہا مگر متحدہ ہند اور متحدہ اطالیہ کا تصور کبھی فنا نہیں ہوا، اور گوناگوں اختلاف کے باوجود اتحاد کا رنگ غالب رہا۔ اطالیہ کا اتحاد بڑی حد تک رومی اتحاد تھا، کیونکہ یہ عظیم الشان شہر ملک پر حاوی رہا تھا اور یہی اتحاد کا مرکز اور نشان تھا۔ ہندوستان میں کوئی ایسا مرکز کوئی ایسا شہر نہیں تھا جو تمام ملک پر حاوی ہو۔ بنارس مشرق کا شہر لازوال (۵) کہا جا سکتا ہے، نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام مشرقی ایشیا کا۔ لیکن بنارس نے کبھی سلطنت کا کھیل نہیں کھیلا، نہ کبھی دنیاوی اقتدار کی فکر میں سر کھپایا۔

ہندوستانی تہذیب سارے ملک میں اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ ملک کا کوئی حصہ اس کا مرکز نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ جنوب میں راس کماری سے، شمال میں بدری ناتھ اور امرناتھ تک، مشرق میں دوارکا سے مغرب میں پوری تک ایک ہی قسم کے خیالات جاری اور ساری تھے اور اگر کسی جگہ پر خیالات کا تصادم ہوتا تو اس کی دھمک سارے ملک میں دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔ جیسے اطالیہ نے مغربی یورپ کو مذہب اور تہذیب عطا کی اسی طرح ہندوستان نے مشرقی ایشیا کو یہ دولت بخشی، اگرچہ چین قدامت اور عظمت میں اس سے کم نہ تھا۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ سیاسی اعتبار سے اطالیہ نحیف ونزار تھا، یورپ کی رگوں میں اسی کا خون دوڑ رہا تھا۔

اطالیہ کے متعلق شاید مترنش (٦) نے کہا تھا کہ وہ ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ بہت سے لوگ جو مترنش بننا چاہتے ہیں ہندوستان کی نسبت بھی یہی فقرہ کہتے ہیں اور اتفاق سے دونوں براعظموں میں ان ملکوں کا محل وقوع بھی ایک ہی سا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ انگلستان اور آسٹریا کی مشابہت ہے اور بیسویں صدی کے انگلستان کا انیسویں صدی کے آسٹریا سے مقابلہ کیا بھی گیا ہے۔ انگلستان بھی اس کی طرح متکبر اور مغرور اور بظاہر شاندار اور رعب دار ہے مگر وہ جڑیں جن سے اسے قوت حاصل ہوتی تھی اب سوکھ رہی ہیں اور اس عالیشان عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان ملکوں کو بھی اپنی طرح مجسم تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ عادات اور قدیم اختلافات کا اثر ہے۔ چنانچہ ہندوستان بھارت ماتا در ہند ایک خوبصورت خاتون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جو بہت بوڑھی ہیں مگر دیکھنے میں سدا جوان معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں غم سے بھری اور دل حسرت و یاس سے معمور ہے۔ بدیسیوں کے ظلم سے نالاں ہیں اور اپنے بچوں کو مدد کے لئے پکارتی ہیں۔ یہی تصور ہے جو لاکھوں آدمیوں کے جذبات کو ابھارتا ہے اور انہیں علم اور ایثار

پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں زیادہ تر کسان اور مزدور بستے ہیں اور وہ دیکھنے میں حسین نہیں ہیں کیونکہ افلاس میں کوئی حسن نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے تخیل کی خوبصورت خاتون کھیتوں اور کارخانوں کے ننگے اور کمر جھکے مزدوروں کی نمائندگی کرتی ہیں، یا ان لوگوں کی چھوٹی سی جماعت کی جو صدیوں سے غریبوں کو پیروں تلے روندتی اور ان کا خون چوستی رہی ہے۔ جس نے انھیں ظالمانہ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور ان میں سے بہتوں کو اچھوت تک بنا دیا ہے۔ ہم حقیقت میں تخیلات کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ واقعات کی دنیا سے بھاگ کر خواب وخیال کی دنیا میں پناہ لیں۔

لیکن ان مختلف طبقوں اور ان کی باہمی کشش کے باوجود ایک رشتہ تھا جو ان سب کو مربوط کئے ہوئے تھا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رشتہ کتنا مضبوط اور پائدار تھا۔ اس کی مضبوطی کا راز کیا تھا؟ یہ محض روایات اور جمود کی انفعالی قوت نہیں تھی، اگرچہ یہ قوت بہت بڑی ہوتی ہے اس میں کوئی جاندار اور جاں بخش جوہر کام کر رہا تھا کیونکہ اس نے قومی خارجی اثرات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ اور ان داخلی اثرات کو جو اس میں انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے جذب کر لیا لیکن اپنی اس قوت کے باوجود سیاسی آزادی کو محفوظ نہ رکھ سکا اور سیاسی اتحاد پیدا نہ کرسکا۔ ان چیزوں کو اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ ان کے لئے زحمت نہ اٹھائی جائے۔ اگلوں نے حماقت سے ان کی اہمیت کو نظر انداز کیا اور ہم اس غفلت کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ اپنی تاریخ میں ہم شروع سے آخر تک دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم نصب العین میں سیاسی اور فوجی کامیابی کو کبھی وقعت نہیں دی گئی۔ اور دولت پیدا کرنے والے طبقے ہمیشہ حقیر سمجھے گئے۔ عزت اور دولت کا ساتھ نبھ نہیں سکتا تھا اور عزت کم سے کم نظری طور پر ان لوگوں کا حصہ سمجھی جاتی تھی جو ادنے معاوضے پر سماج کی خدمت کریں۔

پرانی تہذیب بہت سے سخت طوفانوں سے سلامت گزر گئی لیکن اگرچہ اس کی

ظاہری صورت قائم رہی اس میں باطنی حقیقت باقی نہیں رہی۔ آج کل وہ خاموشی کے ساتھ مگر جی توڑ کر ایک نئے اور نہایت طاقت ور حریف سے مقابلہ کر رہی ہے۔ یعنی مغربی سرمایہ داری کی بنیوں والی تہذیب سے۔ اس نئے حریف سے وہ شکست کھا جائے گی، کیونکہ مغرب اپنے ساتھ سائنس لایا ہے اور سائنس سے لاکھوں فاقہ کشوں کو روٹی ملنے کی امید ہے لیکن قاتلانہ تہذیب کے زہر کا تریاق بھی مغرب اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ اشتراکیت ہے، یعنی اتحاد عمل اور عام مفاد کی خاطر جماعت کی خدمت کرنے کا اصول۔ برہمنوں کا جو پرانا خدمت کا نصب العین تھا، اس سے یہ کچھ زیادہ مختلف نہیں، لیکن اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر طبقہ اور جماعت کو برہمن کا رتبہ دیا جائے (ظاہر ہے کہ یہاں برہمن کے مذہبی معنی مراد نہیں) اور طبقوں کی تفریق اور امتیازات مٹا دیئے جائیں۔ ممکن ہے ہندوستان جب اپنا نیا لباس پہنے اور وہ تو پہننا ہی ہے اس لئے کہ پرانا پھٹ کر چیتھڑے ہو گیا ہے، تو اس کی تراش ایسی ہو کہ موجودہ حالات اور پرانی وضع دونوں کے ساتھ نبھ سکے، جو رنگ وہ اختیار کرے وہ ایسا ہونا چاہیے کہ قدیم رنگ میں کھپ جائے۔

---

(۱) The Future of East and West

(۲) Lirise britannique Auxxe Sicele.

۳۔ برہدآ زینک اپنشد، ۳۰۱، ۲۷

۴۔ ''ہندوستان میں جو تضاد پائے جاتے ہیں ان میں سب سے بڑا یہ ہے کہ اس کے اختلاف کی تہ میں ایک قومی اتحاد موجود ہے یہ جلد محسوس نہیں ہوتا، اس لیے کہ تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہوا، جب اس اتحاد نے ملک میں سیاسی ربط پیدا کر کے اسے ایک واحد ہستی بنا دیا ہو۔ لیکن یہ اتنی بڑی حقیقت ہے اور اتنی بڑی قوت رکھتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس دائرے میں آ کر وہ اس سے بہت کچھ متاثر ہوئے۔'' سر فرڈرک وائٹ: مشرق اور مغرب کا مستقبل'' (انگریزی)

۵۔ رومی سلطنت کے زمانہ میں روم ''شہر لازوال'' کہلاتا تھا۔

۶۔ آسٹریا کا مشہور مدبر، جو ۱۸۱۵ سے ۱۸۴۸ تک یورپ کی سیاسی زندگی پر حاوی رہا۔

انگریز حکومت کی کارگذاری

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگذاری کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی انگریز یا ہندوستانی اس لمبی کارگذاری کو ایک خارجی چیز ٹھہرا کر اس پر ٹھنڈے دل سے نظر ڈال سکے گا اور اگر یہ ممکن بھی ہو تو نفسیاتی اور دوسرے غیر مادی عناصر کا تولنا اور ان کا اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہوگا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو وہ دیا ہے جو پورے گذشتہ زمانہ میں کبھی اسے حاصل نہ تھا، یعنی ایک حکومت جس کا حکم اس ملک میں جو ایک براعظم سے کم نہیں ہر جگہ بے چون وچرا تسلیم کیا جاتا ہے۔(ا) اس نے قانون کی عملداری قائم کی ہے اور ایک نظام حکومت جو عدل پر مبنی اور کارپرداز ہے، اس نے ہندوستان میں نیابتی حکومت اور شخصی آزادی کے تصورات رائج کیے اور پیدا کیا اور اس طرح قومیت کی اس ابتدائی مدارج میں پرورش کی۔ یہ دعوے انگریزوں کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں اور بہت صحیح بھی ہیں، اگرچہ قانون کی عملداری اور شخصی آزادیاں اب کئی برس دیکھنے میں نہیں آئی ہیں۔

ہندوستانی اس دور پر نظر ڈالتے ہوئے اور بہت سے پہلوؤں پر زور دیتے ہیں اور یہ جتاتے ہیں کہ غیروں کی حکومت نے ہم کو کیا کیا مادی اور روحانی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ نقطہ نظر اس قدر مختلف ہے کہ وہ چیز جسے انگریز تعریف کے لائق سمجھتے ہیں اس کی ہندوستانی مذمت کرتے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر آنند کمار سوامی نے لکھا ہے:
ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سب سے عجیب خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستانی قوم پر جو سب سے بڑی زیادتیاں کیں وہی بظاہر نعمتیں معلوم ہوتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پچھلی صدی یا اس سے کچھ زیادہ میں ہندوستان کے اندر جو تبدیلیاں ہوئیں وہ عالمگیر تھیں اور مشرق اور مغرب کے ملکوں میں یکساں ہوئی ہیں۔

مغربی یورپ میں اور اس کے بعد باقی دنیا میں صنعتی ترقی نے ہر جگہ اپنے ساتھ ساتھ قومیت کا احساس اور ایک مضبوط مفرد ریاست پیدا کی۔ انگریز اس کی داد تو لے سکتے ہیں کہ انہوں نے سب سے پہلے مغرب کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھولا اور ایک نوعیت کی صںعت اور سائنس کو یہاں پہنچایا۔ لیکن یہ کرنے کے بعد وہ صنعت کا گلا دبا کر اس کی ترقی روکے رہے، جب تک کہ حالات نے انہیں مجبور نہیں کر دیا۔ ہندوستان پہلے بھی وہ مقام تھا جہاں دو مختلف تہذیبیں آ کر ملیں، مغربی ایشیا کی اسلامی تہذیب اور مشرقی تہذیب جو اس کی اپنی تھی اور مشرق بعید تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب ذرا اور دور مغرب سے ایک تیسری اور پچھلی تہذیبوں سے زیادہ قوی لہر آئی اور ہندوستان مختلف پرانے اور نئے تصورات کا مرکز اور میدان جنگ بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تیسری تہذیبی تحریک فتح یاب ہوتی اور اس طرح ہندوستان کے کئی پرانے مسائل حل کر دیتی، مگر انگریز جنہوں نے اسے یہاں پر قدم جمانے میں مدد کی تھی اس کو اور آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے ہماری صنعت کو نشو و نما نہیں پانے دیا اور اس طرح ہماری سیاسی ترقی میں بھی حائل ہوئے اور تمام ملک میں انہیں نظام جاگیری یا اور جو بھی فرسودہ آثار ملے ان کا انہوں نے تحفظ کیا۔ انہوں نے ہمارے بدلتے اور کسی قدر اصلاح پذیر قانون اور رسموں کے ساتھ کچھ ایسا کیا کہ وہ جس حالت میں تھیں اسی میں ٹھٹھر کر رہ گئیں اور ہمارے لئے ان کی زنجیروں سے رہا ہونا مشکل کر دیا۔ ہندوستان میں بورژوا طبقے نے ان کی خوشنودی یا مدد سے فروغ نہیں پایا۔ لیکن ریل اور صنعت کی پیدا کی ہوئی اور چیزوں کو ایک مرتبہ رائج کرنے کے بعد پھر وہ اس گاڑی کو آگے چلنا اور تغیرات کا سلسلہ جاری رہنا بند نہیں کر سکتے تھے، ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ رکاوٹیں ڈالیں اور رفتار سست کر دیں یہ انہوں نے بین طور پر اپنے فائدے کے لئے کیا۔

حکومت ہند کی شاہانہ عمارت اسی پختہ بنیاد پر قائم ہے اور اس کا یقین کے ساتھ

دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۸ء سے جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تمام مقبوضات برطانوی تاج کے زیر نگیں ہو گئیں، اس وقت تک ہندوستان نے جو تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے اسے حاصل کرنا اس کی لمبی اور رنگارنگ تاریخ نے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہیں تھی۔(۶) یہ دعویٰ ایسا واضح اور بین نہیں ہے جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور یہ اکثر کہا گیا ہے کہ دراصل برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کم ہوگئی۔لیکن اگر یہ بیان پورا پورا صحیح بھی ہوتا تو اس کا مطلب موجودہ صنعتی دور کا پچھلے زمانہ سے مقابلہ کرنا ہوا۔پچھلے سو سال میں سائنس اور صنعت کی بدولت دنیا کے ہر ملک نے بے حساب تعلیمی اور تمدنی ترقی کی ہے اور ہم کسی ایسے ملک کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی ترقی حاصل کرنا، اس کی لمبی اور رنگا رنگ تاریخ کے کسی دور میں اس کے بس کی بات نہ تھی۔چاہے اس کی تاریخ ہندوستان کے مقابلہ میں لمبی نہ کہی جاسکے تو پھر کیا یہ ہمارے بے کار کی کٹ حجتی اور کج فہمی ہوگی اگر ہم کہیں کہ اس صنعتی دور میں ہم بہر حال کچھ نہ کچھ میکانکی ترقی کر ہی لیتے اور برطانوی حکومت کے بغیر بھی کر لیتے اور دراصل اگر ہم اپنی حالت کا اور بہتیرے ملکوں سے مقابلہ کریں تو کیا ہم بغیر غلطی کے خوف کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ ترقی زیادہ ہوتی، کیونکہ خود انگریز اس ترقی کا گلا گھونٹنے کے لئے جو کچھ کر رہے تھے اس کے خلاف ہم کو جدوجہد کرنا پڑی؟ ریلیں، تار برقی، ٹیلی فون، لاسلکی، ان سے اور ایسی دوسری چیزوں سے برطانوی حکومت کی اچھائی اور فیض رسانی کو جانچنا درست نہیں۔یہ اچھی چیزیں ہیں اور ضروری تھیں اور چونکہ انگریز اتفاق سے انہیں پہلے پہل یہاں لائے، ہمیں ان کا احسان ماننا چاہیے۔لیکن صنعتی نظام کے یہ پیش خیمے ہمارے یہاں بالخصوص اس لئے آئے کہ برطانوی حکومت مستحکم ہوجائے۔یہ شریانیں اور شہ رگیں ہیں جن میں قوم کے خون کو دوڑنا چاہیے تھا، انہیں اس کی تجارت کو بڑھانا، اس کی پیداوار کو جگہ جگہ لے جانا اور اس کے لاکھوں کروڑوں

آدمیوں میں نئی جان ڈالنا اور انہیں دولتمند بنانا چاہیے تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ بالاخران سے کوئی ایسا نتیجہ نکلنے والا تھا، لیکن ان کی تنظیم اور ان سے کام لینے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ یعنی ملوکیت کی گرفت کو مضبوط کرنا اور منڈیوں کو برطانوی مال کے لئے قبضہ میں کرنا اور یہ مقصد ان کی بدولت حاصل ہوگیا۔ میں صنعتی تنظیم اور نقل وحمل کے جدید ترین ذریعوں کا بالکل موافق ہوں، لیکن کبھی کبھی ہندوستان کے میدانوں سے تیزی کے ساتھ گزرتے وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ ریلیں جو ملک کو زندگی بخشتی ہیں، ایک طرح کی آہنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ہیں جو ہندوستان کو جکڑے اور قید کیے ہوئے ہیں۔

جس تصور کے مطابق انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت کی اس میں ریاست پولیس کی عملداری ہے۔ حکومت کا کام یہ تھا کہ ریاست کی حفاظت کرے اور باقی سب دوسروں پر چھوڑ دے۔ انگریزی مالیات کا موضوع بس فوج کے اخراجات، پولیس، نظام حکومت، سرکاری قرضے کا سود تھے۔ شہریوں کی معاشی اغراض کی نگرانی نہیں کی گئی، بلکہ انہیں انگریزی اغراض پر قربان کیا گیا۔ سوائے ایک مٹھی بھر آدمیوں کے باقی سب کی تہذیبی اور دوسری ضروریات کی مطلق پرواہ نہیں کی گئی۔ مالیات عامہ کے نئے تصورات، جن کی بدولت دوسرے ملکوں میں سرکاری خرچ سے ہر ایک کی تعلیم، صحت کی ترقی، غریب اور کمزور دماغ والوں کی دیکھ بھال، مزدوروں کا بیمہ کہ بیماری بڑھاپے اور بے روزگاری کے زمانہ میں بالکل محتاج نہ ہو جائیں اور دوسری باتوں کا انتظام کیا جاتا ہے، ہماری حکومت کی حد نظر سے بالکل باہر تھیں۔ اس طرح کے کاموں کے لئے جن میں خرچ ہی خرچ ہوتا ہے اس کے یہاں کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، کیونکہ اس نے جس اصول پر لگان مقرر کیے تھے وہ بالکل الٹا تھا۔ جن لوگوں کی آمدنی کم تھی ان سے بڑی آمدنی والوں کی بہ نسبت حساب سے بہت زیادہ لیا جاتا تھا اور ملک کے تحفظ اور حکومت کے محکموں، پر اس کا خرچ بے انتہا

تھا اور ساری آمدنی کو کھا جاتا تھا۔

انگریزی حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی پوری توجہ ان باتوں پر صرف کرتی تھی جن کے ذریعہ اس کا سیاسی اور معاشی تسلط بڑھتا تھا۔ باقی سب ضمنی تھا۔ اگر انہوں نے ایک نہایت طاقتور مرکزی حکومت تعمیر کی اور پولیس کو بہت مستعد رکھا تو یہ ایک کارنامہ تھا۔ جس پر وہ فخر کر سکتے تھے، لیکن ہندوستانی قوم اس کو اپنی کامیابی نہیں سمجھ سکتی، اتحاد بڑی اچھی چیز ہے۔ مگر غلامی میں اتحاد کوئی فخر کی بات نہیں۔ ایک استبدادی حکومت کی طاقت لوگوں پر اور بھی گراں ہو سکتی ہے اور پولیس اگرچہ وہ بیشک کئی اعتبار سے کارآمد ہوتی ہے، انہی لوگوں کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہے اور کی جا چکی ہے۔ جن کی حفاظت کرنا اس کا کام سمجھا جاتا ہے۔ برٹرنڈ رسل نے موجودہ اور قدیم یونانی تہذیب کا مقابلہ کرتے ہوئے حال ہی میں لکھا ہے۔ یونانی تہذیب اگر ہماری تہذیب پر فضیلت رکھتی ہے تو اس لحاظ سے کہ اس کا پولیس کا نظام خراب تھا، جس کی بدولت بھلے آدمیوں کی نسبتاً زیادہ بڑی تعداد اس سے بچ نکلتی تھی۔

انگریزوں کا تسلط ہونے سے ہم کو امن ملا اور ان تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد جو مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے پر ہمیں سہنا پڑیں۔ ہندوستان کو بے شک امن کی ضرورت تھی۔ امن ایک قیمتی چیز ہے، ہر قسم کی ترقی کے لیے ضروری ہے اور ہمیں جب وہ حاصل ہوا تو ہم نے اس کی آؤ بھگت بھی کی۔ لیکن امن بھی بہت گراں داموں خریدا جا سکتا ہے، اگر وہ قبر کے کامل سکون، یا پنجرے یا قید خانہ کی قطعاً محفوظ زندگی کے برابر ہو جائے۔ امن ایسے لوگوں کی اشک آلود مایوسی سے بھی پیدا ہو سکتا ہے جو اپنی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ وہ امن جو کسی اجنبی فاتح نے جبراً قائم کیا ہو اصل میں امن کی تھکن مٹانے اور تسکین دلانے والی صفات پا ہی نہیں سکتا۔ جنگ ایک بڑی خوفناک چیز ہے اور اس سے بچنا چاہیے۔ لیکن چند اوصاف کو وہ ترقی دیتی

ہے جو نفسیات کے ماہر ولیم جیمز کے مطابق وفاداری، ربط، استقلال، بہادری، ضمیر کی بیداری، تعلیم، جدت کا مادہ، کفایت شعاری اور جسمانی صحت اور قوت کے اوصاف ہیں۔ اسی سبب سے جیمز ایک اخلاقی محرک کی تلاش میں تھا جو لڑائی کا اندھیر اڈھائے بغیر کسی انسانی جماعت میں ان اوصاف کو ترقی دے۔ اگر اسے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی خبر ہوتی تو اسے ایک ایسی چیز مل جاتی جو اس کے دل کو لگتی، یعنی لڑائی کا ہموزن اخلاقی اور پرامن محرک۔

تاریخ کے امکانات پر اور اس پر غور کرنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا، تضیع اوقات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے لئے اچھا تھا کہ اس کا مغرب کی سائنس اور صنعت سے سابقہ پڑا۔ سائنس مغرب کی بڑی دین تھی۔ ہندوستان میں اس کی کمی تھی اور اس کے بغیر اس کی حالت کا بد سے بدتر ہونا لازمی تھا۔ جس طریقہ پر ہمارا ایک دوسرے سے سابقہ ہوا وہ قابل افسوس تھا، لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ جب تک ہم کو متواتر سخت صدمے نہ پہنچتے ہماری غفلت دور نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو پروٹسٹنٹ انفرادیت پسند اینگلوسیکسن قوم کے انگریز ہمارے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے، کیونکہ مغربی قوموں میں وہی سب سے زیادہ مختلف ہیں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ صدمے پہنچا سکتے تھے۔

انہوں نے ہمیں سیاسی اعتبار سے متحد کردیا اور یہ ایک بہت اچھی بات تھی، لیکن یہ اتحاد موجود ہوتا یا نہ ہوتا، ہندوستان میں قومیت بڑھتی اور ایسے اتحاد کا مطالبہ کرتی۔ آج کل عرب کئی الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کردیئے گئے ہیں جن میں سے بعض آزاد ہیں، بعض کا کسی یورپی قوم نے اپنے آپ کو محافظ ٹھہرایا ہے۔ بعض کا کسی نے اپنے آپ کو نگران اور اتالیق بنالیا ہے، یا ایسا ہی کچھ اور لیکن عرب اتحاد کی خواہش سب میں موجزن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مغربی ملوکیت رستہ روکے نہ کھڑی ہوتی تو وہ اس اتحاد کو بڑی حد تک عمل میں لے آتے لیکن ہندوستان کی طرح

وہاں بھی ان مغربی ریاستوں کا مقصد یہ ہے کہ انتشار کے میلانات کو تقویت پہنچائیں، اقلیتوں کے مسائل پیدا کریں جو قومیت کے جذبے کو کمزور کرتے اور ایک حد تک اس کا ردعمل ہوتے ہیں اور ملوکیت پرست ریاست کو اس کا موقع دیتے ہیں کہ وہ قبضہ جمائے رہے اور غیر جانب دار پنچ بنی رہے۔

ہندوستان کا سیاسی اتحاد تو برطانوی ملوکیت کی ترقی کے لئے جو کوششیں کی گئیں ان کا بس ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ بعد کو، جب یہ اتحاد جذبہ قومیت کے ساتھ مل گیا اور غیروں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کو کھڑا ہوا تو ہم نے دیکھا کہ انتشار اور فرقہ بندیوں کی جو ہماری آئندہ ترقی کے رستہ میں زبردست رکاوٹیں ہیں، جان بوجھ کر پرورش کی گئی ہے۔

انگریزوں کو یہاں آئے اور تسلط حاصل کئے بھی کتنا زمانہ ہو گیا ہے پونے دو صدی! وہ سیاہ و سپید کے مالک تھے، جیسے کہ استبدادی حکومتیں ہوا کرتی ہیں اور ہندوستان کی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق تشکیل دینے کا انہیں ایک نایاب موقع ملا تھا۔ اسی دوران میں ساری دنیا، انگلستان، یورپ، امریکہ، جاپان سب اس قدر بدل گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جا سکتے۔ بحر اٹلانٹک کے ساحل کی وہ امریکی نوآبادیاں جن کی اٹھارویں صدی میں کوئی حیثیت نہیں تھی اب دنیا کی سب سے دولتمند اور طاقتور قوم ہیں اور صنعت میں سب سے آگے ہیں۔ جاپان میں ذرا سی مدت میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ روس کی وسیع سرزمین میں جہاں ابھی کل تک زار کی حکومت کا بھاری ہاتھ ترقی اور نشوونما کا گلا دباتا رہتا تھا، ایک نئی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا بنائی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی تغیرات ہوئے ہیں۔ یہ ملک اب وہ نہیں ہے جو اٹھارویں صدی میں تھا۔ اب ہم ریلیں دیکھتے ہیں، آب پاشی کا انتظام، کارخانے، اسکول اور کالج بڑے بڑے سرکاری دفتر وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان تغیرات کے باوجود، ہندوستان کی اس وقت کیا حالت ہے؟

ہندوستان ایک غلاموں کی ریاست ہے جس کی عظیم الشان قوت ایک پنجرے میں بند ہے، جس میں آزادی سے سانس لینے کی ہمت نہیں، جس پر اجنبی دور سے بیٹھے راج کررہے ہیں۔اس کے باشندوں سے زیادہ غریب کہیں کے باشندے نہیں، ان کی عمریں کم ہوتی ہیں۔اوران میں بیماری اوروباء کامقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔یہاں جہالت کادوردورہ ہے، بڑے بڑے علاقہ ہیں جن میں صفائی اورطبی امداد کاکوئی انتظام نہیں، متوسط طبقے اورعوام میں بے روزگاری بے پناہ ہے۔ہم سے کہاجاتا ہے کہ آزادی، جمہوریت، اشتراکیت، اشتمالیت کے نعرے ناقابل عمل حوصلوں کے شیدائی، عقیدوں کے کٹرپرستار یالفنگے لگاتے ہیں، اصل معیارلوگوں کی اجتماعی بہبودی ہے۔ بیشک سب سے اہم معیاریہی ہے اوراس پرآج کل کا ہندوستان جانچا جائے تواس کی قدربہت حقیر نکلے گی۔دوسرے ملکوں میں بے روزگاری میں امداد کرنے اورمصیبت زدوں کوسہارادینے کے لئے جوبڑے انتظامات تجویز ہوئے ہیں ان کے متعلق جوہم پڑھتے ہیں، لیکن ہمارے ملک میں جو کروڑوں بے روزگارہیں اورجس طرح ملک کے بیشترحصہ میں مصیبتیں گلے کا طوق بنی ہیں، اس کے لئے کیا کہاجاتا ہے۔دوسری جگہوں کے متعلق جوہم پڑھتے ہیں کہ رہنے کے لئے مکانوں کابندوبست کیاجارہاہے، ہمارے یہاں ان کروڑوں کے رہنے کے لیے کیاسوچاجاتا ہے۔جومٹی کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں یاجنہیں چھت کاسایہ بھی میسرنہیں؟ پھراس میں ہماراکیاقصورہے اگرہم ایسے ملکوں پررشک کریں جہاں تعلیم، صفائی، طبی امداد کے وسائل، مہذب زندگی کاسامان اورصنعتی پیداوارمیں روزافزوں ترقی ہوتی ہے، جب کہ ہم اسی ایک حال میں پڑے ہوئے ہیں یابڑھتے ہیں توگھونگے کی رفتار سے۔روس نے کوئی بارہ برس کے مختصر سے عرصہ میں ایک حیرت انگیز کوشش کرکے اپنے وسیع ملک میں جہالت کاخاتمہ کردیااورایک

نفیس اور جدید ترین اصولوں پر مبنی طریقہ رائج کر دیا ہے۔ جس کا عوام کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اتاترک مصطفےٰ کمال کی رہبری میں ترکی جو پیچھے رہ گیا تھا لمبے لمبے ڈگ رکھ کر تعلیم کو عام کرنے میں دوسروں کے برابر پہنچ گیا۔ فاشٹ اٹلی نے اپنے نئے مسلک پر پہلا قدم رکھتے ہی جہالت پر ایک زوردار حملہ کیا۔ وزیر تعلیم جنتیلے نے اعلان کیا کہ جہالت کی فوج کا قلب مارنا چاہیے۔ اس ناسوری مرض کو جو ہمارے جسم سیاسی کو سڑائے ڈالتا ہے، دہکتے ہوئے لوہے سے جلا کر دور کرنا چاہیے۔ یہ بہت سخت الفاظ ہیں، جنہیں کسی ڈرائنگ روم میں زبان پر لانا مناسب ہوگا، لیکن یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بات کہنے والے میں جوش کتنا ہے اور اس کا عقیدہ کتنا پختہ ہے۔ ہم یہاں زیادہ شائستہ ہیں اور ہماری زبان شستہ اور نرم ہوتی ہے ہم کمال احتیاط سے قدم رکھتے ہیں اور ہماری ساری قوت کمیشنوں اور کمیٹیوں میں صرف ہو جاتی ہے۔

ہندوستانیوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ باتیں کرتے ہیں اور کام کم۔ یہ الزام صحیح ہے۔ لیکن کیا انگریزوں میں کمیٹی اور کمیشن بنانے کی جو بے حد و حساب استعداد ہے، اس پر ہم اپنی حیرت ظاہر نہ کریں۔ وہ کمیٹیاں اور کمیشن جن میں سے ہر ایک مدتوں محنت کرنے کے بعد ایک عالمانہ رپورٹ شائع کرتا ہے۔ ایک سرکاری تالیف جس کی حسب دستور تعریف کی جاتی ہے اور جو پھر حسب دستور کسی خانے میں رکھ دی جاتی ہے، اس طرح کہ ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں، ترقی کر رہے ہیں اور یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ جہاں ہیں وہیں پر رہتے ہیں۔ خودداری جو چاہتی ہے وہ بھی ہو جاتا ہے اور جو مستقل اغراض وابستہ ہیں ان کا بال بیکا نہیں ہوتا اور وہ محفوظ رہتی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں اس پر بحث کی جاتی ہے کہ ترقی کیسے کریں۔ ہم روکنے اور بریک لگانے اور حقوق کا تحفظ کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں کہ کہیں بہت زیادہ تیزی سے آگے نہ بڑھ جائیں۔

۱۹۴۴ء کی مشترک پارلیمنٹیر کمیٹی کی رپورٹ میں مغل عہد کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ شہنشاہ کی شان وشوکت رعایا کی غربت کا پیانہ ہو گئی تھی۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے، لیکن کیا آج کل بھی ہم اسی پیانہ سے نہیں ناپ سکتے؟ آپ آج کل کی نئی دہلی اور وائسرائے کے ٹھاٹھ اور صوبوں کے گورنروں اور ان کے دکھاوے اور نمائش کو کیا کہیں گے؟ اس کا پس منظر بھی وہی انتہائی اور حیرت انگیز غربت ہے۔ دونوں کو مقابلہ پر دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے اور یہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ حساس لوگ اسے کیسے گوارا کرتے ہیں۔ شہنشاہی عمارت کی روکار کے پیچھے ہندوستان کا جو منظر ہے اس پر افلاس اور ویرانی برستی ہے۔ سامنے تو جوڑ جاڑ کر اور لیس پوت کر کچھ حیثیت بنالی گئی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے بدقسمت متوسط طبقہ کے ادنیٰ لوگ ہیں جنہیں موجودہ زمانہ کا نظام حیات روز بروز اور بے بس کیے دیتا ہے اور آگے بڑھے تو مزدور ہیں جو بڑی تکلیف سے رہتے ہیں، اور غربت کی چکی میں پسے جاتے ہیں پھر ہمارا کسان ہے، ہندوستان کا قومی نشان، جس کی قسمت میں زندگی کو ایک سدا چھائی ہوئی رات کے اندھیرے میں گزارنا لکھا ہے۔

صدیوں کے بوجھ سے جھکا ہوا۔

وہ اپنے پھاوڑے کی ٹیک لگائے زمین کو تک رہا ہے۔

جگوں کی محرومی اس کے چہرے پر نقش ہے۔

اور دنیا کا بار اس کی پیٹھ پر ہے۔

ہزاروں برس جو دکھ سہے گئے ان کی جھلک اس ہیبت ناک شکل میں نظر آتی ہے۔ سارے زمانے کا الم اس دکھتی اور جھکی ہوئی کمر میں ہے۔

یہ بھیانک شکل اس نوع انسانی کی

جسے دغا دی گئی، جو لٹی، رسوا ہوئی اپنے حق سے محروم کی گئی

صدائے احتجاج ہے ان قوتوں کے سامنے جنہوں نے دنیا کو

بنایا۔

اور یہ احتجاج ایک پیشین گوئی بھی ہے۔

ہندوستان کی تمام مصیبتوں کا الزام انگریزوں پر لگانا مہمل ہے۔ یہ ذمہ داری ہم کو اپنے سر لینا ہوگی اور ہمیں اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ اپنی کمزوری کے لازمی نتائج کا دوسروں کے سر تھوپنا بہت بری بات ہے۔ ایک تحکم پسند نظام حکومت خصوصاً اگر وہ غیر ملکی ہو لازمی طور پر غلامی کے جذبے کو ترقی دے گا اور محکوموں کے ذہن ونظر کو محدود کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ نوجوان کی بہترین صفات حوصلہ مندی، من چلے پن، جدت طبع، تیزی اور طراری کو کچل ڈالے گا اور بزدلی، کائیاں پن، کورانہ اطاعت، افسروں کو خوش رکھنے اوران کی خوشامد کرنے کی خواہش کو بڑھائے گا۔ ایسا نظام سچے جذبہ خدمت کو نہیں ابھارتا قوم کی خدمت کا حوصلہ اور نصب العین کی محبت نہیں پیدا کرتا، بلکہ ان لوگوں کو چن لیتا ہے جن میں جوش قومی سب سے کم ہو اور جن کا مقصد صرف ذاتی ترقی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کو کس قسم کے آدمی ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض تیز فہم ہوتے ہیں اور اچھا کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ سرکاری یا نیم سرکاری ملازمتوں کی طرف ڈھل جاتے ہیں اور اچھا کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ سرکاری یا نیم سرکاری کی طرف ڈھل جاتے ہیں اس لئے کہ اور کسی طرف جانے کا موقع نہیں ہوتا یہاں ان کی ساری تیزی جاتی رہتی ہے، وہ اس بڑی مشین کے پرزے بن کر رہ جاتے ہیں اور ان کے ذہن میں اس مرہٹی گھس گھس میں پڑ کر کند ہو جاتے ہیں۔ ان میں دفتری حکومت کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، یعنی مکر کی قابلیت اور دفتری کام کی حکمت عملی بہت ہو تو انہیں اپنے کام سے کچھ دھیمی سی محبت ہو جاتی ہے۔ سرگرمی اور جوش کا تو کوئی سوال ہی نہیں، کیونکہ غیروں کی حکومت میں

یہ چیز ناممکن ہے۔

ان کو چھوڑ کر، چھوٹے عہدہ دار عموماً کچھ قابل تعریف نہیں ہوتے کیونکہ وہ بس اپنے افسروں کی خوشامد کرنا اور اپنے ماتحتوں پر دھونس جمانا چاہتے ہیں۔ اس میں ان کا قصور نہیں۔ یہ نظام حکومت انہیں تربیت ہی ایسی دیتا ہے۔ اگر اس فضا میں خوشامد اور رعایت کا زور ہو، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟ ان لوگوں کا ملازمت میں کوئی نصب العین نہیں ہے، بے روزگاری اور اس کے ساتھ ساتھ فاقہ کشی کا خوف بھوت کی طرح ان کے پیچھے لگا رہتا ہے اور ان کا سارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے عہدوں پر برقرار رہیں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لئے اور نوکریاں حاصل کرلیں۔ جہاں جاسوس اور وہ ذلیل ترین مخلوق، یعنی مخبر ہمیشہ گھات میں لگے رہتے ہوں وہاں لوگوں میں عمدہ صفات کا نشوونما پانا آسان نہیں۔

حال کے واقعات نے ان لوگوں کے لئے جو حساس طبیعت اور جذبہ قومی رکھتے ہیں، سرکاری ملازمت اختیار کرنا اور بھی دشوار کردیا ہے۔ حکومت ان کو پسند نہیں کرتی اور وہ بھی جب تک معاشی حالات انہیں مجبور نہ کردیں۔ حکومت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔

لیکن دنیا جانتی ہے کہ، برطانوی سامراج کا بار گورے آدمی سنبھالے ہوئے ہیں، نہ کہ کالے آدمی، ہمارے یہاں سامراج کا بار گورے آدمی سنبھالے ہوئے ہیں، نہ کہ کالے آدمی۔ ہمارے یہاں سامراج کی روایات کو قائم رکھنے کے لئے متعدد امپیریل سروسیں ہیں۔ اور ان کے خاص حقوق کی حفاظت کے لئے کافی تحفظات ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ سب ہندوستان کے مفاد کے لئے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کا مفاد اسی چیز پر موقوف ہے جس میں ان سروسوں کا صریحی فائدہ ہو۔ اگر انڈین سول سروس کا کوئی خاص حق یا کوئی بڑا عہدہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے تو ایک شور مچ جاتا ہے کہ اس سے بدانتظامی اور بد دیانتی پھیلے

گی۔ انڈین میڈیکل سروس کے وہ عہدے جو گورے آدمیوں کے لئے مخصوص ہیں کم کر دیئے جائیں تو ہندوستانیوں کی صحت عامہ کے لئے خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر فوج کے اس حصے کو جس میں انگریز ہیں ہاتھ بھی لگایا گیا تو دنیا بھر کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی۔

میرے خیال میں یہ ایک حد تک ٹھیک ہے کہ اگر اعلیٰ عہدیدار سب یکبارگی چلے جائیں اور اپنے محکموں کو اپنے ماتحتوں کے حوالے کر دیں تو کارکردگی کا معیار گر جائے گا۔ لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سارا نظام قائم ہی اس ڈھنگ سے ہوا ہے۔ اور ماتحت نہ تو قابلیت کے لحاظ سے منتخب کئے گئے ہیں اور نہ کبھی ان پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں قابل آدمی کثرت سے موجود ہیں اور اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ لوگ کام کے بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری حکومت اور ہماری سماج کا نقطہ نظر بالکل بدل جائے۔ یعنی ایک نئی ریاست وجود میں آئے۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ ہم سے کہا جاتا ہے دستور میں چاہے جیسے تغیرات ہوں ان بڑی سروسوں کا جو ہماری محافظ اور پشت پناہ ہیں، یہ سنگین قلعہ بدستور قائم رہے گا۔ یہ سروسیں حکومت کے اسرار کی حامل ہیں وہ اپنے مندر کی پاسبانی کریں گی اور نامحرموں کو اس حریم پاک میں قدم نہیں رکھنے دیں گی۔ رفتہ رفتہ، جوں جوں ہم اس عزت کے مستحق ہوتے جائیں گے وہ پردوں کو ایک ایک کر کے ہٹاتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ کبھی نہ کبھی وہ دن آئے گا جب آخری پردہ ہٹ جائے گا اور یکایک اس معبد کا اندرونی حصہ ہماری متحیر اور مودب نگاہوں کے سامنے آ جائے گا۔

امپیریل سروسوں میں سب سے بڑا درجہ ہندوستانی سول سروس کا ہے اور ہندوستان کی حکومت کو چلانے کی نیک نامی یا بدنامی اسی کے حصے میں آتی ہے۔ اس سروس کے چند درچند اوصاف ہمیں بار بار سنائے جا چکے ہیں۔ اور سامراج کے

نظام میں اس کو جو عظمت حاصل ہے وہ ضرب المثل ہوگئی ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس کا مسلمہ اقتدار، اسے قریب سے قریب استبدادی حکومت کے اختیارات حاصل ہونا اور پھر اس طرح آسمان پر چڑھایا جانا کسی فرد یا جماعت کے ذہنی توازن کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ سول سروس کی میرے دل میں جو قدر ہے اس کے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے یہ حضرات بہت جلد اس بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جو پرانے زمانے سے چلی آتی ہے اور آج کل اور بڑھ گئی ہے یعنی اپنی بڑائی کا مالیخولیا۔

سول سروس کی خوبیوں سے انکار کرنا فضول ہے اس لئے کہ انہیں بھولنے کا ہم کو موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ لیکن اس کی تعریف میں اتنی لغو باتیں کہی جا چکی ہیں اور کہی جارہی ہیں کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے ذرا ان لغویات کی قلعی کھول دی جائے۔ امریکی ماہر معاشیات دبلن نے امتیازی حقوق، رکھنے والے طبقوں کو داشتہ طبقے کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آئی سی ایس اور دوسری امپریل سروسوں کو داشتہ سروسیں کہا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ یہ عیش ہمیں بڑا مہنگا پڑتا ہے۔

میجر گراہم پول نے، جو پارلیمنٹ کے سابق ممبر ہیں اور ہندوستان کے معاملات سے بھی بہت دلچسپی رکھتے ہیں، کچھ دن ہوئے موڈرن ریویو میں لکھا تا کہ ابھی تک کسی نے اس سے انکار نہیں کیا کہ آئی سی ایس ایک نہایت قابل اور مستعد سروس ہے۔ چونکہ انگلستان میں ایسی باتیں اکثر کہی جاتی ہیں اور مان لی جاتی ہیں اس لئے اس قول پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح کے قطعی دعوے جن کی آسانی سے تردید ہوسکتی ہے، خطرے سے خالی نہیں اور میجر گراہم کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس بات سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ بارہا اس کا انکار کیا جا چکا ہے۔ بہت دن ہوئے مسٹر گوکھلے نے آئی سی ایس کو کھری کھری سنائی تھیں۔ آج بھی تمام ہندوستانی خواہ وہ کانگریسی ہو یا نہ ہوں میجر گراہم پول کے اس قول کی تردید کے

لئے تیار ہو جائیں گے۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں فریقوں کی رائے اپنی اپنی جگہ صحیح ہو۔ ان کا اشارہ مختلف صفات کی طرف ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ سول سروس میں جو قابلیت اور مستعدی ہے وہ کس قسم کی ہے۔ اگر اس قابلیت اور مستعدی کا اندازہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کس حد تک مستحکم کی گئی اور اسے ملک سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کتنی مدد پہنچائی گئی تو بے شک آئی سی ایس والے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انہوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ لیکن اگر معیار ہندوستان کے عوام کی بہبودی ہے تو وہ صریحاً ناکامیاب رہے اور ان کی ناکامیابی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آمدنی اور معیار زندگی کے لحاظ سے ان میں اور عام لوگوں میں جن کی خدمت کے لئے وہ رکھے گئے ہیں اور جن پر ان کی تنخواہوں کا بار پڑتا ہے، زمین آسمان کا فرق ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ مجموعی حیثیت سے اس سروس نے ایک خاصی معیار قائم رکھا ہے۔ یہ معیار لازمی طور پر اوسط درجے کی قابلیت کا ہے۔ اگر چہ کبھی کبھی اس میں غیر معمولی لوگ بھی نکلے ہیں۔ اس قسم کی سروس سے اس سے زیادہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اصل میں اس میں انگلستان کے پبلک اسکول کی اسپرٹ مع اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے کام کر رہی ہے۔ (اگرچہ اس وقت آئی سی ایس کے بہت سے پبلک سکول کے تعلیم یافتہ نہیں) گو آئی سی ایس نے ایک معیار قائم رکھا، مگر وہ مقررہ نمونے کے مطابق نہ ہونے کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اس کے افراد کی خاصی صلاحیتیں کچھ تو ایک بندھے ہوئے ڈھرے میں پڑ جانے کی وجہ سے اور کچھ اس خوف سے کہ کہیں وہ دوسروں سے مختلف نہ ہوں، ٹھٹھر کر رہ گئیں۔ اس میں بہت سے لوگ دل سے کام کرنے والے تھے، بہت سے ایسے جن کے سامنے خدمت کا ایک نصب العین تھا، مگر یہ خدمت برطانوی سلطنت کی خدمت تھی، ہندوستان کا نمبر دوسرا تھا اور بہت بعد میں آتا تھا۔ اپنی تربیت کے لحاظ سے سول سروس کا طرز عمل

اس کے ساتھ کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چونکہ وہ تعداد میں کم تھے اور انہیں ایک غیر
قوم سے سابقہ تھا جو اکثر ان کی مخالف رہتی تھی اس لئے انہوں نے باہمی اتفاق، اور
ایک خاص معیار قائم رکھا اور چونکہ انہیں بڑی حد تک مطلق العنانی حاصل تھی، انہیں
ہر قسم کی تنقید ناگوار ہونے لگی، اسے گناہ کبیرہ سمجھنے لگے۔ ان کی ناروا داری بڑھتی گئی،
ان کا انداز معلمانہ ہوتا گیا اور ان میں غیر ذمہ دار حاکموں کے بہت سے عیب پیدا
ہو گئے۔ وہ خود پسند اور بر خود غلط تنگ نظر اور بے لوچ ہو کر رہ گئے یعنی ایک ترقی پذیر
ماحول سے انہیں بالکل مناسبت نہیں رہی۔ جب ان سے زیادہ قابل اور ماحول
مطابقت رکھنے والے دماغ، ہندوستان کے مسئلے پر غور کرنے لگے تو انہیں بہت برا
معلوم ہوا اور وہ ان لوگوں کو برا بھلا کہنے لگے انہیں دبانے لگے اور ان کے راستے
میں ہر طرح کے روڑے اٹکانے لگے۔ جب جنگ عظیم کے بعد کے تغیرات نے دنیا
میں ایک ہیجان اور حرکت پیدا کر دی تو ان کی عقل چکرا گئی اور یہ نئے حالات سے
نبٹنے کے قابل نہیں رہے۔ ان کی محدود اور جامد تعلیم نے انہیں غیر معمولی موقعوں پر
اور نئی صورتوں کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ ایک مدت تک غیر ذمہ دار رہنے سے ان کی
عادتیں بگڑ گئی تھیں۔ ایک جماعت کی حیثیت سے وہ قریب قریب خود مختار تھے محض
برائے نام برطانوی پارلیمینٹ کے ماتحت ہے۔ لارڈ ایکٹن نے کہا کہ اقتدار آدمی
کو بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار تو بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اپنی بساط کے موافق یہ لوگ بھروسے کے
عہدہ دار تھے، جو اپنا روزمرہ کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے اگر چہ اس میں
کوئی خاص ذہانت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کی تربیت ہی ایسی تھی کہ اگر کوئی غیر متوقع
صورت پیدا ہو جاتی تو وہ رہ جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی خود اعتمادی، ضابطہ
پسند طبیعت اور باہمی اتحاد کی بدولت فوری مشکلات پر قابو پا لیتے۔ عراق میں جو گڑ بڑ
ہوئی تھی اس نے ظاہر کر دیا کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت کتنی سست اور ٹھس

ہے۔ اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں مگر ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ سول نافرمانی کے روکنے کے لئے جو کاروائیاں حکومت نے کیں وہ بھی بہت بھونڈی تھیں۔ بندوق اور لاٹھی چلا کر مخالفوں کو تھوڑی دیر کے لئے دبا سکتے ہیں مگر اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، بلکہ خود وہ برتری کا احساس جس کا تحفظ مقصود ہے اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان لوگوں نے ایک بڑھتی ہوئی جارحانہ قومی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے تشدد سے کام لیا۔ یہ لازمی تھا کیونکہ سلطنتوں کا دارومدار اسی پر ہے اور ان کو مخالفت کا سامنا کرنے کا اور کوئی طریقہ سکھایا نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ بے ضرورت اور حد سے زیادہ تشدد سے کام لیا۔ یہ لازمی تھا کیونکہ سلطنتوں کا دارومدار اسی پر ہے اور ان کو مخالفت کا سامنا کرنے کا اور کوئی طریقہ سکھایا نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ بے ضرورت اور حد سے زیادہ تشدد سے کام لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاملہ ان کے قابو سے باہر ہو گیا تھا اور معمولی حالت میں جو ضبط و استقلال ان میں نظر آتا تھا وہ اس وقت باقی نہیں رہا تھا اکثر وہ بالکل بدحواس ہو جاتے تھے اور ان کی پبلک تقریروں میں ہسٹیریا کی سی کیفیت نظر آتی تھی۔ کوئی نازک موقع آتا ہے تو بے رحمی سے وہ سب کی قلعی کھول دیتا ہے اور طبیعت کی گہرائیوں میں جو کمزوریاں چھپی ہوں انھیں سطح پر لے آتا ہے۔ سول نافرمانی ایسا ہی آزمائش کا موقع تھا اور مورچے کے دونوں طرف یعنی کانگریس اور گورنمنٹ دونوں کے یہاں، ایسے لوگ بہت کم ہی تھے جو اس آزمائش میں پورے اترے۔ مسٹر لائڈ جارج کہتے ہیں نازک موقعوں پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد اور عورتیں جن میں واقعی اعلیٰ درجے کی قابلیت ہے بہت کم ہیں اور باقی لوگ ایسے موقعوں پر بیکار رہیں۔ جب کوئی بڑا اسیلاب آتا ہے تو وہ ٹیلے جو یوں خاصے بلند نظر آتے تھے، ڈوب جاتے ہیں اور صرف سب سے اونچی چوٹیاں پانی کی سطح کے اوپر نظر آتی ہیں۔

آئی سی ایس کے لوگ اپنے ذہن اور جذبات کے اعتبار سے اس طوفان کے

لئے جو ہندوستان میں آیا بالکل تیار نہ تھے۔ ان میں سے اکثر کی تعلیم کلاسیکی طرز پر ہوتی تھی، جس سے ان میں ایک خاص قسم کی شائستگی اور خاص قسم کی دلکشی پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن یہ طرز پرانے زمانہ کا تھا جو عہد وکٹوریہ کے لئے موزوں تھا مگر موجودہ حالات سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ اپنی ایک تنگ و محدود دنیا اینگلو انڈین دنیا میں رہتے تھے، جو نہ انگریزی تھی نہ ہندوستانی۔ وہ ان قوتوں کی قدر و قیمت کا جو اس عہد کی سماج میں کارفرما ہیں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ باوجود اس مضحک دعوے کہ وہ ہندوستان کے عام لوگوں کے ولی اور امین ہیں وہ ان سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے اور نئے اوسط طبقے کے شہریوں سے اور بھی کم۔ وہ ہندوستانیوں کی سیرت کا اندازہ ان خوشامدیوں اور ملازمت کے خواستگاروں کو دیکھ کر کرتے جو انھیں گھیرے رہتے تھے، باقی سب کو مفسد اور شریر جان کر قابل التفات نہ سمجھتے۔ لڑائی کے بعد ساری دنیا میں جو تغیرات خصوصا معاشی زندگی میں ہوئے، ان کا علم انہیں بہت ہی کم تھا۔ وہ اپنے اسی پرانے ڈھرے پر تھے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو بدلنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ جس نظام کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں وہ اب فرسودہ اور بے کار ہو گیا ہے اور وہ ایک جماعت کی حیثیت سے وہی طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جس کا نقشہ ٹی ایس ایلیٹ نے اپنی تصنیف کھوکھلے آدمی میں کھینچا ہے۔

یہ فرسودہ نظام ہے اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ برطانوی سلطنت قائم ہے۔ اور اب بھی خاصی طاقتور ہے اور اس کے چلانے والے قابل اور باتدبیر ہیں۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اس دانت کی طرح ہے جو سڑ گیا ہے مگر مسوڑھوں میں جڑ پکڑے ہوئے ہے اس سے درد ہوتا ہے مگر اسے اکھاڑنا آسان نہیں۔ یہ درد اسی طرح ہوتا رہے گا بلکہ اور بڑھتا جائے گا جب تک کہ دانت نکالا جائے یا خود ہی نہ گر جائے۔

انگلستان میں بھی پبلک سکول کے پڑھے ہوئے لوگوں کا دور دورہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ اب تک ملکی معاملات میں دخیل ہیں مگر اب ان کی وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ ہندوستان میں اور بھی زیادہ بے محل ہیں۔ جارحانہ قومی تحریک سے نبھانا ان کے لئے محال ہے اور سماجی انقلاب کی تحریک سے نبھانا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں

بے شک آئی سی ایس میں بہت سے اچھے لوگ ہیں، انگریز بھی اور ہندوستانی بھی۔ لیکن جب تک موجودہ نظام قائم ہے ان کے یہ اوصاف ان مقاصد میں کام آئیں گے جو ہندوستانیوں کے حق میں مفید نہیں۔ سول سروس کے بعض ہندوستانی پبلک سکول کے رنگ میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ وہ بادشاہ سے بھی زیادہ بادشاہی کے حامی بن جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں آئی سی ایس کے ایک نوجوان ہندوستانی سے ملا تھا جو اپنے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے مگر افسوس ہے کہ مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہ تھا انہوں نے سروس کے بہت سے اوصاف جتائے اور آخر میں برطانوی راج کی حمایت میں وہ دلیل پیش کی جو کا کوئی جواب نہیں کہ کیا برطانوی راج رومی اور چنگیزی اور تیموری راج سے بہتر نہیں؟

آئی سی ایس والوں کے خیالات کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض نہایت قابلیت سے انجام دیتے ہیں اس لئے انہیں حق ہے کہ اپنے چند در چند مطالبات پر جتنا چاہیں زور دیں۔ اگر ہندوستان غریب ہے تو یہ اس کے معاشرتی رسم و رواج کا قصور ہے یا اس کے بنیوں اور ساہوکاروں اور سب سے زیادہ اس کی بے شمار آبادی کا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے بنیئے یعنی برطانوی حکومت کو وہ چپ چاپ نظر انداز کر جاتے ہیں، معلوم نہیں آبادی کی کثرت کا وہ کیا علاج کریں گے اس لئے کہ گو انہیں آئے دن کے قحط، وبا اور شرح اموات کی زیادتی سے بہت بڑی مدد ملتی ہے مگر پھر بھی آبادی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لوگ ضبط تولید کی تجویز پیش کرتے ہیں اور میں خود اس سے پوری طرح متفق ہوں کہ ضبط تولید کے طریقوں کے متعلق

لوگوں کو معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ لیکن ان تدبیروں پر عمل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی بہت بلند ہو، ان میں تھوڑی بہت تعلیم پھیل جائے اور سارے ملک میں بے شمار اسپتال قائم ہوں۔ موجودہ حالات میں ضبط تولید کے وسائل عام لوگوں کی پہنچ سے بالکل باہر ہیں، البہ اوسط طبقے کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور میرے خیال میں بڑی حد تک اٹھا بھی رہے ہیں۔

لیکن آبادی کی کثرت کا مسئلہ دوسرے پہلو بھی غور و توجہہ کا مستحق ہے۔ آج کل دنیا کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ غذایا اور ضروریات کی کمی نہیں۔ اگر چہ آبادی بڑھ گئی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اشیائے خوردنی کی رسد آبادی کے تناسب سے زیادہ بڑھی ہے اور بڑھائی جاسکتی ہے اور پھر ہندوستان کی آبادی کا یہ اضافہ جس کا اس قدر شور ہے (بجز پچھلے دس سال کے) اکثر مغربی ممالک کے مقابلہ میں بہت کم رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آگے چل کر فرق بہت زیادہ ہوجائے گا کیونکہ مختلف محرک مغربی ملکوں میں آبادی کے بڑھنے کی رفتار کم کر رہے ہیں بلکہ روک رہے ہیں۔ لیکن ایسے اسباب ہندوستان میں بھی جلد پیدا ہو جائیں گے جو آبادی کو بڑھنے سے روکیں گے۔

جب کبھی ہندوستان آزاد اور اس قابل ہوگا کہ اپنی نئی زندگی کو حسب دلخواہ تعمیر کرے تو اسے لازمی طور پر اس کام کے لئے اپنے بہترین مرد اور عورتیں درکار ہوں گی۔ اچھے آدمی ہمیشہ کمیاب ہوتے ہیں اور ہندوستان میں اور بھی کمیاب ہیں اس لئے کہ برطانیہ کی حکومت میں ہمارے لئے مواقع کی کمی رہی ہے۔ ہم کو اپنے اجتماعی کاروبار کے کئی شعبوں میں غیر ملکی ماہروں کی ضرورت پڑے گی، خاص طور پر ان شعبوں میں جن کے لئے میکانکی یا علمی واقفیت درکار ہوتی ہے۔ ان لوگوں میں جنھوں نے آئی سی ایس یا دوسری امپیریل سروسوں میں کام کیا ہے بہت سے ہندوستانی اور غیر ملکی ہوں گے جو نئے نظام کے لئے مفید ہوں گے اور خوشی سے

رکھے جائیں گے۔ لیکن اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی نیا نظام اس وقت تک تعمیر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ آئی سی ایس کی روح ہمارے نظام حکومت اور سرکاری محکموں میں سمائی ہوئی ہے۔ تحکم پسندی شہنشاہی کی رفیق ہے اور آزادی کے ساتھ کسی طرح نبھ نہیں سکتی۔ یا تو یہ آزادی کو مٹا کر رہے گی یا خود مٹا دی جائے گی۔ یہ تو ریاست کے صرف ایک طرز میں کھپ سکتی ہے یعنی فاشٹی طرز میں باقی رہنا ممکن ہے۔ ان کو توڑے بغیر حقیقی معنی میں کوئی نیا نظام تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ افراد کی حیثیت سے ان سروسوں کے لوگ اگر وہ نیا کام کرنا چاہتے ہوں اور کرنے کی استعداد رکھتے ہوں خوشی سے لے لئے جائیں گے، مگر نئی شرائط پر۔ اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں یہ لمبی چوڑی تنخواہیں اور الاؤنس جو آج کل ملتے ہیں دیئے جا سکیں گے۔ نئے ہندوستان کی خدمت کے لئے ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی جو مخلص اور مستعد ہوں، جو اپنے نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کے حاصل کرنے کی دل و جان سے کوششیں کرتے ہوں، جو کام اس لئے کرتے ہوں کہ اس سے مسرت اور عزت حاصل ہوتی ہے اس لئے نہیں کہ بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ روپے کے لالچ کو جہاں تک ہو سکے کم کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ سب سے کم مانگ ان انتظامی افسروں کی ہوگی جو کسی قسم کی فنی واقفیت نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ ہندوستان میں بہت نکل آئیں گے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے لبرل پارٹی اور دوسری جماعتوں نے ہندوستان کے نظم و نسق کے معاملے میں برطانوی خیالات کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرلیا ہے۔ سروسوں کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے، کیونکہ ان حضرات کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ان میں ہندوستانی رکھے جائیں، یہ نہیں کہ ان سروسوں کی نوعیت اور ذہنیت اور ریاست کا سارا نظام بدلا جائے۔ یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے جس میں دوسرے کی بات مان لینا ممکن نہیں، کیونکہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ

صرف برطانوی فوج اور سروسوں کے چلے جانے سے حل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ سرکاری ملازموں کی تحکم پسندی مٹائی جائے اور ان کی تنخواہ اور امتیازی حقوق عام طور پر کم کیے جائیں۔ اس دستور سازی کے زمانے میں تحفظات کا بڑا چرچا ہے۔ اگر یہ تحفظات ہندوستان کے فائدے کے لئے ہیں تو ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہونی چاہیے کہ آئی سی ایس اور اسی قسم کی دوسری سروسوں کی موجودہ صورت کا، جس میں انہیں غیر محدود اختیارات اور امتیازی حقوق حاصل ہیں خاتمہ کر دیا جائے اور انہیں نئے دستور میں کوئی دخل نہ ہو۔

آئی سی ایس سے بھی زیادہ پراسرار وہ سروسیں ہیں جو محافظ سروسیں کہلاتی ہیں۔ ہم ان کے بارے میں زبان بھی نہیں ہلا سکتے، اس لئے کہ بھلا ہم ان معاملات کو کیا جانیں؟ ہمارا کام تو صرف یہ ہے کہ چپ چاپ کروڑوں روپیہ دیئے جائیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے، ستمبر ۱۹۳۴ء میں ہندوستان کے کمانڈر ان چیف سر فلپ چیٹووڈ نے کونسل آف اسٹیٹ کے جلسے میں جو شملے میں ہو رہا تھا ہندوستان کے سیاست دانوں سے اپنی اکھڑ فوجی زبان میں کہا کہ تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو میرے کام میں دخل نہ دو۔ کسی صاحب نے ایک رزولیوشن میں ترمیم پیش کی تھی، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا، کیا وہ اور ان کے دوست یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں جیسی جنگ آزمودہ قوم جس نے تلوار کے زور سے سلطنت حاصل کی اور تلوار ہی کے زور سے اس پر اب تک قابض ہے آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کی باتوں کو اپنی صدیوں کی جنگی قابلیت اور تجربے کے مقابلے میں کوئی وقعت دیگی؟ اس کے علاوہ انہوں اور دلچسپ باتیں کہیں اور اس خیال سے کہ کہیں ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ انہوں نے وقتی جوش میں یہ باتیں کہہ دی تھیں، ہم کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ انہوں نے اپنی تقریر بہت سوچ سمجھ کر لکھی تھی اور اسے دیکھ دیکھ کر پڑھ رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ناواقف فن کے لئے کسی کمانڈر ان چیف سے فوجی

معاملات پر بحث کرنا گستاخی ہے، لیکن دو چار باتیں کہنے کی اجازت تو آرام کرسی پر بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کو بھی ملنی چاہیے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کی اغراض جو سلطنت پر تلوار کے زور سے قابض ہیں، کچھ اور ہوں اور ان غریبوں کی اغراض کچھ اور جس کے سر پر یہ تلوار منڈلاتی رہتی ہے۔ ہندوستانی فوج سے ہندوستان کے فائدے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اور برطانوی سلطنت کے فائدے کا بھی اور ان دونوں کا مفاد کچھ ضروری نہیں کہ ایک ہو۔ اس میں اختلاف بلکہ تصادم بھی ہو سکتا ہے کہ آرام کرسی پر بیٹھنے والا نقاد اس بات میں بھی شبہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ جنگ عظیم کے تجربے کے بعد بڑے بڑے جرنیلوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے کام میں دخل نہ دیا جائے جائز ہے یا نہیں۔ جنگ عظیم میں یہ حضرات سفید و سیاہ کے مالک تھے اور ہر طرف سے یہی سننے میں آتا ہے کہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، آسٹروی، اطالوی، روسی غرض تمام فوجوں میں انہوں نے ہر کام کو چوپٹ کر دیا۔

انگلستان کی فوج کے نامور مورخ اور فن جنگ کے ماہر کیپٹن لڈل ہارٹ نے اپنی جنگ عظیم کی تاریخ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب انگریزی سپاہی دشمنوں سے لڑ رہے تھے اور انگریز جرنیل آپس میں لڑ رہے تھے۔ فوجی خطرے ان کے خیالات اور جدوجہد میں یک جہتی نہیں پیدا کر سکے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس لڑائی نے ہماری بت پرستی کو ہیرو ورشپ کے اس عقیدے کو کہ بڑے آدمی معمولی مٹی کے نہیں کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں بالکل مٹا دیا۔ لیڈروں کی اب بھی ضرورت ہے بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ، لیکن یہ احساس جو ہم میں اب پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بھی ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں ہم کو اس غلطی سے محفوظ رکھے گا کہ ان سے بہت زیادہ توقع رکھیں یا ان پر حد سے زیادہ بھروسہ کریں۔

سیاست دانوں کے جگت گرو مسٹر لائڈ جارج نے اپنے تذکرہ جنگ میں جرنیلوں اور امیر البحروں کی ان کمزوریوں اور غلطیوں کی ایک ہیبت ناک تصویر کھینچی

ہے جس کی بدولت لاکھوں آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ انگلستان اور اس کے اتحادی لڑائی تو جیت گئے لیکن خون میں نہا کر لڑکھڑاتے ہوئے فتح کی منزل تک پہنچے۔ بڑے افسروں نے آدمیوں اور موقعوں سے اس ناعاقبت اندیشی سے کام لیا کہ انگلستان کی تباہی کی نوبت آگئی تھی اور وہ اور اس کے اتحادی زیادہ تر اس وجہ سے بچ گئے کہ ان حریفوں سے ان سے بھی زیادہ ناقابل یقین حماقتیں سرزد ہوئی ہیں۔ یہ ہے انگلستان کے عہد جنگ کے وزیر اعظم کا بیان۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں عمل جراحی کے ذریعے امیر البحر لارڈ جیلیکو کی کھوپڑی میں معقول خیالات ٹھونسنے پڑے، خصوصا بدرقہ جہاز بھیجنے کے معاملے میں۔ فرانسیسی مارشل ژوفرے کے متعلق ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا خاص وصف یہی تھا کہ ان کی صورت سے مستقل مزاجی ظاہر ہوتی تھی اور اس سے لوگوں کی ہمت بڑھتی تھی۔ پریشانی کے مارے ہوئے لوگ مصیبت کے وقت میں ایسی ہی چیزوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انسان کی عقل ٹھوڑی میں ہوتی ہے۔

لیکن مسٹر لائڈ جارج نے سب سے زیادہ قابل الزام فوج کے افسر اعلیٰ فیلڈ مارشل ہیگ کو قرار دیا ہے۔ انہوں نے واقعات سے ثابت کیا ہے کہ لارڈ ہیگ انتہائی خود پسندی کی وجہ سے سیاست دانوں اور دوسرے لوگوں کی رائے سننا بھی نہیں چاہتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے خود برطانوی مجلس وزرا سے بعض نہایت اہم معاملات پوشیدہ رکھے اور فرانس میں برطانوی فوج کو اتنا سخت نقصان پہنچایا جتنا ساری لڑائی میں کہیں نہیں پہنچا تھا اور اس وقت بھی جب شکست سر پر کھڑی تھی وہ آخر تک اپنی بات پر اڑے رہے اور کئی مہینے تک انہوں نے پاشدیل اور کامبرے کی بے پناہ کیچڑ میں اپنی غلط پیش قدمی جاری رکھی، یہاں تک کہ ۷ ہزار تو صرف افسر کام آئے اور چار لاکھ بہادر انگریزی سپاہی مقتولوں اور مجروحوں کی فہرست میں داخل ہو گئے۔ غنیمت ہے کہ گمنام سپاہی کی آج اس کے مرنے کے بعد عزت کی

جارہی ہے۔ اس کا خون پانی کی طرح بہایا گیا اور جب تک وہ زندہ تھا کسی کو اس کی پرواہ بھی نہ تھی۔

دوسرے لوگوں کی طرح سیاست داں بھی اکثر غلطی کرتے ہیں، لیکن جمہوری ملک کے سیاست دانوں کو اشخاص اور واقعات سے متاثر ہونا اور ان کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ عموماً وہ اپنی غلطیوں کو محسوس کر لیتے ہیں اور ان کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں۔ سپاہی کی تربیت اور ہی فضا میں ہوتی ہے۔ جہاں تحکم پسندی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اور تنقید گوارا نہیں کی جاتی۔ اس لئے سپاہی کو دوسروں کا مشورہ برا لگتا ہے اور جب وہ غلطی کرتا ہے تو دل کھول کر کرتا ہے اور اس پر اڑا رہتا ہے۔ اس کے لئے ٹھوڑی ذہن اور دماغ سے زیادہ اہم چیز ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ہم نے ایک مشترک ٹائپ پیدا کیا ہے۔ ہمارے ملکی نظام حکومت نے تحکم پسندی اور خود بینی کی ایک نیم فوجی فضا میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے ملکی حکام کی ٹھوڑی بھی بڑی حد تک سپاہیوں کی سی ہے اور ان میں دوسرے سپاہیانہ اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ فوج میں ہندوستانی عنصر بڑھایا جا رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ تیس پینتیس برس کے بعد کوئی ہندوستانی جنرل بھی ہندوستانی اسٹیج پر نمودار ہو۔ شاید سو سوا سو سال میں ہماری فوج میں ہندوستانی عنصر ایک معقول حد تک بڑھ جائے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ آخر انگلستان نے ایک دو سال کے اندر کروڑوں آدمیوں کی زبردست فوج کیسے تیار کر لی۔ اگر اسے ہمارے جیسے دانا مشیر نصب ہوئے ہوتے تو شاید اس نے زیادہ احتیاط سے اور پھونک پھونک کر قدم رکھا ہوتا، یہ اور بات ہے کہ اس اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے تیار ہونے سے پہلے لڑائی کا فیصلہ ہو جاتا۔ اسی کے ساتھ ہمیں روسی فوج کا بھی خیال آتا ہے جو کچھ دن پہلے صفر کے برابر تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی بے شمار دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ان پر فتح پائی اور اب دنیا کی سب سے جرار فوجوں میں سمجھی جاتی ہے۔ شاید انہیں

مشورہ دینے کے لئے ایسے جنگ آزمودہ جرنیل نہیں ملے تھے۔

اب ہمارے یہاں دہرہ دون میں ایک فوجی اکادمی ہے جہاں شریف خاندانوں کے امیدوار فوجی افسر کی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ہم سے کہا جاتا ہے کہ پریڈ میں وہ بہت ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور یقیناً بہت اچھے افسر ہوں گے لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس ٹریننگ سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔اگر اسی کے ساتھ جدید آلات جنگ کا استعمال بھی نہ سکھایا جائے۔ پیادے اور سوار آج کل نئے اتنے ہی کام آسکتے ہیں جتنی رومی لشکر کی صفیں اور ایسے زمانے میں جب کی ہوائی جہاز، گیس کے بم، ٹینک اور بڑی زبردست توپیں جنگ کے آلات ہیں، رائفل بھی تیر کمان سے کچھ ہی زیادہ کارآمد ہوسکتی ہے۔فوجی اکادمی کے استاد اور دانشمند مشیران سب باتوں کو سمجھتے ہی ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی کارگذاری کیسی رہی؟ ہم اس کی خامیوں کی کس منہ سے شکایت کریں، جب یہ خامیاں ہماری اپنی کمزوریوں کا نتیجہ تھیں۔اگر ہم دنیا کے تغیرات کے دھارے کو چھوڑ کر کسی کھاڑی میں پناہ لیں، اپنے قدح کی خیر منائیں اور اپنی حالت میں مگن رہیں کنویں کے مینڈک کی طرح یہ نہ جانیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے تو یہ ہمارا ہی قصور ہے اور ہمیں کو اس کی سزا بھگتنی ہے۔انگریز یہاں بحر ہستی کے ایک نئے سیلاب کے زور میں، زبردست تاریخی قوتوں کے نمائندے بن کر آئے اگرچہ انہیں خود اس کا احساس نہ تھا۔اس سے کیا فائدہ کہ ہم اس طوفان کی شکایت کریں جو ہمیں اٹھا کر پھینک دیتا ہے یا اس سرد ہوا کی جس سے ہمارا بدن کانپتا ہے؟ ہمیں چاہیے کہ ماضی کے جھگڑوں سے پیچھا چھڑا کر مستقبل کا سامنا کریں۔ہمیں انگریزوں کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ وہ سائنس اور اس کی بیش بہا ایجادات کا تحفہ اپنے ساتھ لائے۔لیکن یہ بات ہمارے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور ہم اسے کبھی نہیں بھول سکتے کہ

برطانوی حکومت ہمارے ملک میں تفرقہ پیدا کرنے والے رجعت پسند، فرقہ پرست اور مطلب پرست عناصر کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مگر شاید یہ بھی ہمارے لئے ایک ضروری آزمائش ہے اور ہندوستان کو نئی زندگی اسی وقت عطا ہوگی جب وہ بار بار اس آگ میں تپے جو کھوٹ اور میل کو جلا دیتی ہے اور کچے لوہے کو فولاد بنا دیتی ہے۔

۱۔ یہ اقتباس ہندوستان کے دستور کی اصلاح کے متعلق جو مشترک پارلی منٹ کمیٹی بنی تھی۔ اسی کی رپورٹ میں سے لئے گئے تھے۔

۲۔ مشترک پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۳۴ء

۳۔ یہ اقتباسات ایک امریکی شاعر مارک ہیم کی نظم ''پھاوڑے والے'' سے لیے گئے ہیں۔

سول میرج اور رسم الخط کا مسئلہ

میں تقریبا ایک ہفتہ پونا اور بمبئی رہ کر وسط ستمبر ۳۳ء میں لکھنو واپس آیا، والدہ ابھی تک ہسپتال ہی میں تھیں اور رفتہ رفتہ صحت یاب ہو رہی تھیں۔ کملا بھی لکھنو میں تھی، اور تیمارداری کی کوشش کرتی تھی حالانکہ خود اس کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، بہنیں ہر سنیچر کو الہ آباد سے آ جاتی تھیں، میں دو تین ہفتے لکھنو ہی میں رہا، الہ آباد میں شاید اتنی فرصت نہ ملتی جتنی یہاں نصیب ہوئی، میں دن میں دوبار اسپتال جایا کرتا تھا۔ فارغ اوقات میں اخبارات کے لئے چند مضامین لکھنا شروع کر دیئے جن کی اشاعت سارے ملک میں خوب ہوئی۔ اس سلسلہ مضامین کا عنوان تھا ہندوستان کدھر جا رہا ہے اور ان مضامین میں، میں نے واقعات عالم کا تعلق ہندوستانی حالات سے بتا کر ان واقعات کا جائزہ لیا تھا۔ یہ مضامین بہت مقبول ہوئے بلکہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کابل اور طہران میں بھی ان مضامین کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع کیا گیا۔ جو لوگ حالات حاضرہ اور جدید مغربی افکار اور خیالات سے واقف ہیں ان کے لئے ان مضامین میں نہ کوئی ندرت تھی نہ کوئی جدت۔ لیکن ہندوستان میں ہم لوگ اپنی خانگی مشکلات اور مصائب میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ ہمیں مطلق خبر نہیں، کہ دوسرے ملکوں پر کیا گزری ہے۔ میرے مضامین کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے نیز بہت سی اور علامتوں سے یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگوں میں بھی زیادہ وسیع نقطہ نظر اب پیدا ہو رہا ہے۔

والدہ اسپتال میں رہتے رہتے عاجز آ گئی تھیں۔ اس لئے ہم لوگوں نے انہیں الہ آباد واپس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری بہن کرشنا کی نسبت کا اعلان حال ہی میں ہو چکا تھا اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ قبل اس کے کہ میں اچانک پھر جیل خانہ پہنچا دیا جاؤں جس قدر جلد ممکن ہو شادی سے فراغت کر لی جائے۔ مجھے بھی مطلق اس کا اندازہ نہ تھا کہ کتنے دن اور مجھے آزاد رہنے دیا جائے گا، اس لئے کہ

کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک باقاعدہ جاری تھی اور خود کانگریس اور اس کے علاوہ بیسیوں دیگر انجمنیں اور ادارے خلاف قانون قرار دیئے جا چکے تھے۔

شادی اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں بمقام الہ آباد قرار پائی اور یہ بھی طے ہوا کہ مروجہ سول قانون نکاح کے مطابق عقد کیا جائے۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم لوگوں کے طے کرنے نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دو مختلف ذاتوں یعنی برہمن اور غیر برہمن کے درمیان رشتہ قائم کیا جا رہا تھا اور برطانوی ہندی قانون کے مطابق یہ عقد جائز نہیں، لیکن خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں ایک نیا سول نکاح کا قانون بنا تھا، جس نے ہمیں تمام پریشانیوں سے بچا لیا۔ اس وقت دو قانون رائج ہیں اور دوسرا قانون جس کے مطابق میری بہن کی شادی ہوئی، صرف ہندوؤں یا اس قبیل کے دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت، جین اور سکھ مت والوں کے لئے ہے لیکن اگر فریقین کا شمار بوجہ پیدائش یا بوجہ تبدیلی دین ان مذاہب میں نہیں ہو سکتا تو پھر پہلے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے اور یہ پہلا قانون فریقین سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام مشہور مذاہب سے انکار کریں یا کم از کم یہ بیان داخل کریں کہ ان کا تعلق ان سے نہیں ہے۔ یہ بلا ضرورت انکار بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے اور اکثر لوگ جنہیں گو مذہبی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن وہ اس قسم کا غیر ضروری اعلان کرنے پر معترض ہوتے ہیں، اس قانون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے یا مختلف مذاہب کے اکثر لوگ ان تمام باتوں کی مخالفت کرتے ہیں جن سے آپس کے شادی بیاہ میں آسانیاں پیدا ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مجبور ہو کر یا تو انکاری بیان داخل کرتے ہیں یا محض حدود قانون میں رہنے کی خاطر صرف زبان سے تبدیلی مذہب کا اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں تو مختلف فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کا حامی ہوں، لیکن خواہ اس کی کوئی حمایت کرے یا نہ

کرے یہ بے حد ضروری ہے کہ سول نکاح کا ایک عام قانون ہو جس کا اطلاق تمام مذاہب کے لوگوں پر ہو اور ان کو اجازت دی جائے کہ مذہب کی تبدیلی یا کسی دین کو ترک کرنے کا اعلان کئے بغیر آپس میں شادی بیاہ کر سکیں۔

میری بہن کی شادی بغیر کسی دھوم دھام کے نہایت سادے طریقے سے ہوئی۔ ہندوستان میں شادیوں کے موقع پر جو بھیڑ اور دھوم دھام ہوتی ہے وہ مجھے یوں بھی ناپسند ہے۔ پھر والدہ بیمار تھیں اور علاوہ اس کے سول نافرمانی ابھی جاری تھی، میرے بہت سے ساتھ جیل خانہ میں تھے، ان حالات میں کوئی ایسی بات کرنا جس سے جشن کی صورت پیدا ہو بے موقع اور نا مناسب تھی، صرف چند اعزا اور مقامی دوستوں کو شرکت کی دعوت دی حالانکہ میرے والد کے بعض قدیم دوستوں کو بجا طور پر یہ ملال بھی ہوا کہ میں نے انہیں اس موقع پر عمداً نظر انداز کیا۔

شادی کے سلسلہ میں نیوتہ کا جو مختصر سا خط ہم لوگوں نے بھیجا وہ ہندوستانی زبان اور لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا تھا، یہ ایک جدت تھی اس لئے کہ نیوتے ہمیشہ یا تو نگری یا فارسی رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں اور علاوہ فوجی یا عیسائی مشنری حلقوں کے کسی جگہ لاطینی رسم الخط میں ہندوستانی زبان لکھنے کا بالکل رواج ہی نہیں۔ میں تجربہ کے طور پر لاطینی رسم الخط اختیار کیا تھا، محض یہ دیکھنے کے لئے کہ مختلف لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس نیوتے کے متعلق موافق اور مخالف دونوں طرح کی رائیں معلوم ہوئیں لیکن زیادہ لوگ مخالف ہی تھے۔ بہت تھوڑے لوگ بلائے گئے تھے، اگر اور زیادہ لوگوں کو یہ نیوتہ بھیجا جاتا تو مخالفت بھی اور زیادہ ہوتی۔ گاندھی جی نے بھی میری اس جدت کو ناپسند کیا۔

گو لاطینی رسم الخط مجھے ایک عرصہ سے پسند ہے لیکن نہ میں اس کا قائل ہوں اور اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا تھا۔ ترکی اور وسط ایشیاء میں اس کی کامیابی سے میں متاثر ضرور ہوا اور اس کی تائید میں دلائل بھی خاصے وزنی ہیں، لیکن اس کے

باوجود میں اس کا حامی نہیں ہوں اور اگر میں اس کا قائل بھی ہوتا تو بھی میں خوب جانتا تھا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کو اختیار کرنے کا ذرہ برابر امکان نہیں ہے۔قوم پرست، مذہب پرست، ہندو، مسلمان قدیم اور جدید غرض ہر گروہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت کی جائے گی اور یہ بھی میں جانتا ہوں کہ یہ مخالفت محض جذباتی نہیں ہوگی۔رسم الخط کا اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہے۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہوجاتی ہے اور قدیم اب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہوچکی ہے، جس زبان میں کوئی ایسا ادب موجود نہیں کہ اس کی حفاظت کی ضرورت ہو وہاں البتہ یہ تبدیلی کرکے دیکھ لینا چاہیے لیکن ہندوستان میں رسم الخط تبدیل کرنے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔نہ صرف اس لئے کہ ہمارے ادب اور زبان کا خزانہ بے حد گراں قدر اور انمول ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ہماری تاریخ اور ہماری ذہنی ترقی اس سے وابستہ ہے نیز عوام الناس کی زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔زبردستی اس قسم کی تبدیلی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زندہ زبان کو بے رحمی سے ذبح کرنا چاہتے ہیں جس سے عوام الناس کی تعلیمی ترقی بالکل مسدود ہوجائے گی۔

لیکن ہندوستان میں یہ مسئلہ اب صرف ایک علمی مسئلہ نہیں ہے اور میرے نزدیک رسم الخط کی اصلاح کے سلسلہ میں دوسرا قدم یہ ہوگا کہ سنسکرت کی مختلف شاخوں یعنی ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کرلیا جائے۔اس لئے ایک مشترکہ رسم الخط کی اصل ایک ہے اور ان میں بہت زیادہ اختلاف بھی نہیں ہے اس لئے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کرلینا زیادہ دشوار نہ ہوگا

جس کی بدولت یہ چاروں زبانیں ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں۔

منجملہ دیگر افسانوں کے ایک یہ افسانہ بھی ہمارے انگریز حکمرانوں نے تمام دنیا میں مشہور کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں کئی سو زبانیں (مجھے تعداد اس وقت یاد نہیں ہے!) رائج ہیں اور یہ بھی ایک عجیب دلچسپ واقعہ ہے کہ بہت تھوڑے انگریز ایسے ملیں گے جو تمام عمر ہندوستان میں گزار دینے کے باوجود ان سینکڑوں زبانوں میں سے ایک زبان بھی معمولی طور پر جانتے ہوں۔ یہ لوگ تمام زبانوں کو ایک ہی درجہ میں شمار کرتے ہیں۔ اس کا نام ورنا کولر یعنی غلاموں کی زبان رکھا ہے (لاطینی زبان میں ورنا کے معنی ہیں خانہ زاد غلام) اور ہم میں سے اکثر لوگوں نے بغیر جانے بوجھے اس اصطلاح کو اختیار کر لیا ہے۔ واقعی یہ حیرت کی بات ہے کہ یہ انگریز ساری ساری عمر ہندوستان میں گزار دیتے ہیں لیکن ہماری زبان اچھی طرح سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، ان لوگوں نے خانساموں اور آیاؤں کی مدد سے ایک عجیب زبان ایجاد کی ہے جو ایک طرح کی گٹ پٹ گورا شاہی ہندوستانی ہے یہ اسی کو اصل زبان سمجھتے ہیں۔ جیسے ہندوستان کی طرز معاشرت اور زندگی کے متعلق وہ اپنے ماتحتوں اور خوشامدیوں کی باتوں سے حالات معلوم کرتے ہیں اسی طرح ہندوستانی زبان کے متعلق بھی ان کی معلومات کا واحد ذریعہ گھر کے نوکر اور بیرے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اپنی زبان توڑ مروڑ کر صاحب لوگوں سے انہیں کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بات چیت کرتے ہیں، اس خیال سے کہ کوئی اور زبان صاحب سمجھ ہی نہیں سکتے۔ انگریز لوگوں کو یہ بالکل معلوم ہی نہیں کہ ہندوستانی زبان میں نیز دیگر ملکی زبانوں میں ہر قسم کا اعلیٰ ادب موجود ہے۔

اگر ہمیں مردم شماری کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں دو تین سو زبانیں ہیں تو اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں بھی پچاس ساٹھ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن میں تو یہ نہیں جانتا کہ کسی شخص نے بھی اس واقعہ کو جرمنی کے اندر

اختلافات اور جھگڑوں کے ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل کے پیش کیا ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ مردم شماری میں تو ہر قسم کی ان چھوٹی چھوٹی زبانوں کو بھی گنوا دیا جاتا ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی اور بسا اوقات ایک ہی زبان کی مختلف بولیوں کو جو مقامی طور پر بولی جاتی ہیں محض علمی ترتیب کی خاطر اصل زبان کے درجہ میں شمار کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی وسعت اور رقبہ کو دیکھتے ہوئے مجھے تو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ یہاں اتنی کم زبانیں کیوں ہیں۔ یورپ کے اسی رقبہ آبادی سے مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ یہاں باعتبار زبان ایک دوسرے سے بہت قریب تر ہیں۔ لیکن چونکہ بے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے کوئی مشترکہ معیاری زبان نہیں پیدا ہو سکی اور مقامی بولیاں رائج ہو کر رہ گئیں، برما کو چھوڑ کر ہندوستان کی خاص خاص زبانیں یہ ہیں۔ ہندوستانی (جس کی دو شاخیں ہیں یعنی اردو اور ہندی) بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلنگو، ملیالم، اور کناری اور اگر اس میں آسامی، اوڑیا، سندھی، پشتو، اور پنجابی کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس پورے ملک کی زبانیں آجاتی ہیں سوائے چند پہاڑی اور جنگلی قبائل کی بولیوں کے اس میں سے ہندی آریائی نسل کی تمام زبانیں جو شمالی، مغربی اور وسطی ہند میں بولی جاتی ہیں ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں، البتہ جنوبی ہند کی دراوڑی زبانیں گو بہت مختلف ہیں لیکن اس پر بھی سنسکرت کا بہت اثر پڑا ہے اور یہ بھی سنسکرت لفظوں سے بھری پڑی ہیں۔

مندرجہ بالا آٹھ خاص زبانوں کا ادب بہت قدیم اور گرانقدر ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک زبان آج ایک بہت وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے۔ ہر لسانی علاقے کے حدود بھی متعین طور پر بتلائے جا سکتے ہیں، چنانچہ یہ زبانیں بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ ۵ کروڑ آدمی بنگالی بولتے ہیں، جہاں تک ہندوستانی کا تعلق ہے مجھے صحیح اعداد تو یاد نہیں

پڑے لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں کے بولنے والوں کی تعداد ۱۴
کروڑ سے کم نہیں، اس کے علاوہ اس زبان کے تھوڑا بہت سمجھنے والوں کی ایک بہت
بڑی تعداد اور ہے جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان
کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں۔ یہ سنسکرت زبان کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے
اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے، چنانچہ دونوں زبانوں کے خزانوں سے یہ
مالا مال ہوسکتی ہے اور اب تو کچھ عرصہ سے انگریزی زبان سے بھی اس نے استفعادہ
کیا ہے، جنوبی ہند میں صرف دراوڑی علاقہ ہی ایسا ہے جہاں ہندوستانی زبان
تقریباً ایک اجنبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے لیکن وہاں بھی لوگ اس کو سیکھنے کی جان
توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ دو سال ہوئے ۳۳ء میں ایک انجمن نے جو محض خدمت کی
غرض سے جنوبی ہند میں ہندی زبان پھیلانے کا کام کر رہی ہے چند اعداد و شمار شائع
کئے تھے، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ ۱۴ سال کے اندر جب سے کہ وہ انجمن قائم
ہوئی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ آدمیوں نے محض اس انجمن کی کوشش سے احاطہ
مدراس کے اندر ہندی زبان سیکھ لی۔ ایک ایسے ادارے کی کوشش جو کو سرکار کی طرف
سے کوئی مدد نہ ملے بہت قابل تعریف ہے۔ اکثر لوگ جو ہندی زبان سیکھ لیتے ہیں
وہ خود بھی اس زبان کی تبلیغ کا کام کرنے لگتے ہیں۔

بہر حال مجھے تو اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی آگے چل کر
پورے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن جائے گی، اور سچ پوچھئے تو آج بھی معمولی
کاموں کے لئے اس زبان کی حیثیت یہی ہے، لیکن فارسی اور دیوناگری رسم الخط
کے متعلق احمقانہ جھگڑوں کی وجہ سے اور فریقین کی اس غلط روش کی وجہ سے کہ ہر
ایک یا تو اپنی زبان میں سنسکرت کے الفاظ ضرورت سے زائد ٹھونستا ہے یا فارسی کے
الفاظ، اس زبان کی ترقی رک گئی ہے۔ چونکہ اس جھگڑے کی وجہ سے بڑا غصہ اور
گرمی پیدا ہوتی ہے اس لئے رسم الخط کی مشکل حل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

سوائے اس کے کہ دونوں کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ اور لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ جس خط میں وہ چاہیں لکھیں۔ لیکن یہ کوشش ضرور کرنا چاہیے کہ انتہا پسندی کے رجحانات کو روکا جائے اور بول چال کی زبان جو عام طور پر رائج ہے اسی طرح کی ایک ملی جلی ادبی زبان پیدا کی جائے، جب تعلیم عام ہوگی تب تو لازماً اس کا نتیجہ یہی نکلے گا، لیکن اس وقت متوسط طبقے کے کچھ لوگ جو ادبی ذوق اور طرز انشاء کے ناقد اور استاد سمجھے جاتے ہیں بدقسمتی سے بہت زیادہ تنگ نظر اور لکیر کے فقیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بس ایک مردہ قالب اور فرسودہ زبان کے محاوروں میں الجھے ہوئے ہیں جس میں نہ کوئی زندگی ہے نہ اپنی قوم کے عوام الناس کی زبان ہے اور نہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے کوئی واسطہ۔

ہندوستانی زبان کی ترقی اور رواج میں کوئی تصادم نہ ہوگا۔ ان میں بعض زبانیں ہندوستانی زبان کے مقابلے میں پہلے ہی سے زیادہ ترقی یافتہ اور علمی حیثیت سے افضل ہیں اور اپنے اپنے علاقے میں ان زبانوں کی تعلیمی و دیگر کاموں کے لئے سرکاری زبان کی حیثیت برقرار رکھنا چاہیے، انہیں زبانوں کے ذریعہ تعلیم اور تمدن عوام الناس میں پھیلایا جاسکتا ہے۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ شاید انگریزی ہندوستان کی مشترکہ عام زبان بن جائے گی۔ لیکن مجھے تو یہ خیال بالکل دور دراز کا اور لغو معلوم ہوتا ہے اعلیٰ طبقہ کے مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگوں میں ممکن ہے کہ یہ زبان رائج ہو۔ لیکن جہاں تک عوام الناس کی تعلیم اور ان کے تمدنی مسائل کا تعلق ہے۔ انگریزی زبان ہمارے لئے محض بے کار ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی زبان کا استعمال کاروباری، ضروریات، علمی اور فنی کاموں میں بالخصوص بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں روز بروز بڑھتا جائے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کے لئے بدیسی زبانوں کا جاننا ضروری ہے تاکہ دنیا کے حالات اور واقعات سے ہم لوگ باخبر رہیں، اس لئے میں چاہتا

ہوں کہ یونیورسٹیوں میں علاوہ انگریزی کے فرانسیسی، جرمنی، روسی، اسپینی اور اطالوی زبانیں سکھانے کا بھی انتظام کیا جائے۔ انگریزی زبان سے بے توجہی ہرگز نہ برتی جائے، لیکن اگر واقعات عالم کے متعلق ہم صحیح رائے قائم کرنا چاہتے ہیں تو صرف انگریزی کی عینک لگا کر نہ دیکھنا چاہئے۔ ایک ہی پہلو اور ایک ہی رجحان فکر کو دیکھتے دیکھتے ہماری ذہنی اور دماغی صلاحیتیں بالکل چوپٹ ہو گئی ہیں اور ہمارے بڑے بڑے جوشیلے قوم پرست مشکل ہی سے یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ہندوستانی معاملات کے متعلق برطانوی نقطہ نظر نے ہمارے لئے غور و فکر کا میدان کتنا محدود اور تنگ کر دیا ہے۔

بہر حال دوسری بدیسی زبانوں کو رواج دینے کی چاہے جو کوشش کی جائے بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارا رشتہ اور تعلق یقیناً انگریزی زبان کے ذریعہ قائم رہے گا اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ گزشتہ کئی نسلوں سے ہم لوگ اس زبان کو سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں ہمیں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے، ہم لوگ سخت حماقت کریں گے اگر اس زبان کو بھلانا چاہیں یا اس سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھائیں۔ یوں بھی انگریزی زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو تمام دنیا میں پھیل گئی ہے اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بازی لئے جا رہی ہے۔ اور اگر امریکن زبان نے اس کی جگہ نہ لی تو اغلب ہے کہ بین الاقوامی تعلقات اور ریڈیو کی بات چیت میں اس کا رواج روز بروز بڑھتا جائے گا، اس لئے ہم لوگوں کو چاہئے کہ انگریزی زبان کی اشاعت کی کوشش برابر جاری رکھیں، اس زبان کو جتنا اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں سیکھنا اچھا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ کوشش جو ہم میں سے اکثر لوگ کرتے ہیں کہ زبان کے نکات اور باریکیوں کو سمجھیں، تضیع اوقات ہے۔ چند افراد اگر ایسا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن ایک بہت بڑی تعداد کے سامنے یہ مقصد اگر رکھا جائے تو ان پر خواہ مخواہ کا ایک بوجھ ڈالنا ہو گا اور اس سے دوسری راہوں میں ترقی مسدود

ہو جائے گی۔

مجھے بنیادی انگریزی بہت پسند آئی ہے اور میرا خیال ہے کہ انگریزی زبان کی اس سہل کی ہوئی شکل کے سامنے بڑا اچھا مستقبل ہے اور ہم لوگوں کے لئے یہ مفید ہوگا کہ بجائے معیاری انگریزی زبان کے یہ بنیادی انگریزی سکھلانے اور پڑھانے کا کام وسیع پیانہ پر شروع کریں۔ معیاری انگریزی صرف محققوں اور خاص خاص طالب علموں کے لئے رہنے دی جائے۔

ذاتی طور پر میں اس کا بھی حامی ہوں کہ ہندوستانی بنا کر داخل کیا جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے یہاں جدید اصطلاحیں بالکل نہیں ہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ معروف الفاظ ہی کو اختیار کیا جائے بہ نسبت اس کے کہ نئے اور مشکل الفاظ سنسکرت، فارسی اور عربی زبانوں کے نکالے جائیں۔ خالص زبان کے حامی بدیسی الفاظ کے استعمال پر معترض ہوتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، اس لئے کہ اپنی زبان کو ترقی دینے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس میں لچک اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور خیالات حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

بہن کی شادی کے بعد ہی مجھے اتفاق سے بنارس جانا پڑا۔ وہاں میرے پرانے دوست اور رفیق کار بابو شیو پرساد گپتا تقریباً ایک سال سے بیمار تھے اور میں ان کی عیادت کی غرض سے وہاں گیا تھا۔ بابو صاحب لکھنؤ کے جیل میں تھے کہ وہیں اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اب رفتہ رفتہ مرض کا ازالہ ہو رہا تھا، بنارس کے اس سفر میں ایک چھوٹی سی ہندی ادبی انجمن نے مجھے ایک سپاس نامہ دیا اور اس انجمن کے اراکین سے میری بڑے مزے سے گفتگو رہی۔ میں نے پہلے تو معذرت کی کہ جس مضمون کو میں نہیں جانتا اس مضمون کے متعلق ماہرین کے سامنے بات چیت کرتے ہوئے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے مگر بالآخر میں نے اپنی چند تجاویز ان کو بتلائیں اور میں نے مروجہ قدیم طرز کی ہندی پر اعتراض کیا جو اس وقت لکھی جاتی

ہے جس میں یا تو سنسکرت کے مشکل الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے یا ایسی پر تکلف اور پیچیدہ زبان ہوتی ہے جس کو کوئی نہ سمجھے، میں نے یہ خیال بھی جرات کرکے ظاہر کیا کہ اس درباری طرز نشاء کو ترک کرنا چاہیئے جس کے مخاطب صرف چند منتخب لوگ ہی ہوسکتے ہیں اور اب ہندی لکھنے والوں کو عوام الناس کے لئے لکھنا چاہئے جس کو سب لوگ سمجھ سکیں۔عوام کے ساتھ تعلق پیدا ہوجانے سے زبان میں ایک طرح کی صداقت اور زندگی پیدا ہوجائے گی اور ادیبوں میں بھی عوام کی جذباتی قوت کا کچھ اثر آئے گا۔اور وہ زیادہ بہتر کام انجام دے سکیں گے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندی مصنف مغربی افکاروخیالات اور ادب کا اور زیادہ مطالعہ کریں تو اس سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کرسکتے ہیں اور یہ بھی مفید ہوگا اگر مغربی زبان کی مستند کتابوں کا نیز ایسی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے جن میں جدید خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔اسی کے ساتھ میں نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس نقطہ نظر سے ہندی کے مقابلہ میں جدید بنگالی، گجراتی، اور مرہٹی زبانیں غالباً زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور یہ تو یقینی ہے کہ بمقابلہ ہندی کے بنگالی زبان میں تخلیقی کام اس زمانہ میں بہت کیا گیا ہے۔

غرض ان مسائل پر دیر تک دلچسپ گفتگو اور بات چیت ہوئی اور پھر میں چلا آیا۔مجھے اس کا گمان نہ تھا کہ میری گفتگو اخبارات کو بھیج دی جائے گی۔لیکن کوئی صاحب جو وہاں موجود تھے انہوں نے ایک رپورٹ ہندی اخبارات میں بھیج دی۔

پھر کیا تھا، ہر طرف سے میرے خلاف ہندی اخبارات میں ایک آفت مچ گئی کہ مجھے محض مغالطہ ہے۔ میں نے کیوں ہندی زبان کو برا بھلا کہا اور بنگالی، گجراتی اور مرہٹی کا مقابلہ کرکے ہندی زبان کی تنقیص کی۔ مجھے جاہل مطلق کہا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے میں واقعی جاہل ہوں۔اس کے علاوہ بھی بہت سخت سست الفاظ میرے متعلق کہے گئے۔تاکہ مجھے دبایا جائے اور میری زبان

بند کر دی جائے۔

میرے پاس تو اتنا وقت تھا نہیں کہ اس بحث و مباحثہ کو پڑھتا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ کئی مہینے تک یہ بحث جاری رہی یہاں تک کہ میں پھر جیل خانہ چلا گیا۔

اس واقعہ سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ اس سے معلوم ہوا ہندی ادیب اور اخبار نویس غیر معمولی طور پر زود رنج ہوتے ہیں اور اگر ان کا کوئی بھی خواہ دیانتداری کے ساتھ تنقید کرے تو اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ خود کو ذلیل اور کمتر سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہیں، خود اپنی تنقید کرنے کا ان میں بالکل مادہ نہیں، عام تنقید کا معیار بہت پست ہے اور بالعموم یہ ہوتا ہے کہ مصنف اور اس کے ناقد میں جھگڑا ہونے لگتا ہے اور ایک دوسرے کی نیت پر حملہ کرتا ہے۔ ان کی ساری ذہنیت وہی محدود اور تنگ بورژوا (سرمایہ دار) طبقہ والوں کی ذہنیت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اور اخبار نویس دونوں یا تو ایک دوسرے کے لئے لکھتے ہیں یا ایک مختصر سے حلقہ کے لئے اور عوام الناس کو نیز ان کے وسیع مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مجھے اس پر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف بے کار اتنی محنت ضائع کی جا رہی ہے اور دوسری طرف اتنا وسیع میدان عمل موجود ہے جو مفید کام کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

ہندی ادب کا ماضی بہت شاندار رہا ہے، لیکن اپنے ماضی پر وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بھی بہت شاندار رہا ہے، اور ہندی صحافت اس ملک میں ایک بہت زبردست قوت بن سکتی ہے۔ لیکن جب تک عوام الناس کو بے دھڑک مخاطب نہ کیا جائے اور رسمی زبان کی پابندیوں سے آزادی حاصل نہ کی جائے۔ اس وقت تک نہ صحافت ترقی کر سکتی ہے نہ ادب۔

فرقہ پرستی اور رجعت پسندی

جس زمانہ میں میری بہن کی شادی تھی اسی زمانہ میں یورپ سے یہ خبر آئی کہ وٹھل بھائی پٹیل کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک عرصہ سے بیمار تھے اور اسی علالت کی وجہ سے ان کو قید خانہ سے رہا کر دیا گیا تھا۔ ان کی موت ہم لوگوں کے لئے ایک اندوہناک سانحہ تھا اور یہ خیال کر کے دل بیٹھا جاتا تھا کہ ہماری جدوجہد ابھی جاری ہے اور ہمارے مقتدر رہنما ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ وٹھل بھائی کی تعریف میں یوں تو بہت کچھ کہا گیا لیکن سب سے زیادہ تعریف اس بات کی گئی کہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں انہوں نے اپنی قابلیت کا سکہ جمایا اور اسمبلی کے صدر کے حیثیت سے وہ بہت کامیاب رہے۔ یہ تعریفیں اپنی جگہ بالکل درست تھیں لیکن جب بار بار ان کا ذکر کیا جاتا تھا تو مجھے اس سے چڑ ہونے لگی کہ کیا ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کچھ کمی ہے جو اسمبلی کی صدارت کے فرائض قابلیت کے ساتھ انجام دے سکیں یا جو پارلیمینت کی رکنیت کے اہل ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ لے دے کے صرف یہی ایک کام ہے جس کے لئے وکالت کے پیشہ نے ہم کو تیار کیا ہے اور میرے نزدیک وٹھل بھائی کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ بلند تھی، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک بہت بڑے سورما اور سپاہی تھے۔

نومبر کے مہینے میں مجھے بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ ہندو یونیورسٹی کے طلباء نے مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی میں نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور ایک بہت بڑے جلسے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت مدن موہن مالویہ کی زیر صدارت میں نے تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران میں فرقہ پرستی کے متعلق بہت کچھ کہا اور پر زور الفاظ میں ہر قسم کی ذہنیت کی مذمت کی۔ بالخصوص ہندو مہا سبھا کی حرکتوں کو میں نے بہت برا کہہ ڈالا۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا اس میں پہلے سے سوچ بچار کو زیادہ دخل نہ تھا۔ ایک مدت سے مختلف جماعتوں کے فرقہ پرستوں کی روز افزوں رجعت

پسندی کو دیکھ دیکھ کر مجھے غصہ آتا تھا اور اس موضوع پر تقریر کرتے وقت جب مجھے جوش آیا تو قدرتاً اس غصہ کا بھی کچھ اظہار ہو گیا۔ میں اس وقت ہندوؤں کے جلسہ میں تقریر کر رہا تھا، اس لئے مسلمانوں کے اعمال کی مذمت کرنے کا یہ کوئی موقع نہ تھا اور میں نے عمداً صرف ہندو فرقہ پرستوں کی رجعت پسندی پر زیادہ زور دیا، مگر تقریر کرتے وقت مجھے یہ خیال نہ آیا کہ مالوی جی جلسہ کی صدارت کر رہے ہیں۔ وہ ہندو مہاسبھا کے رکن رکین رہے ہیں اس لئے ان کے منہ پر مہاسبھا کو یہ باتیں سنانا ذرا نامناسب بات تھی۔ ممکن ہے کہ یہ خیال مجھے اس لئے نہ رہا ہو کہ اس زمانہ میں انہیں مہاسبھا سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہاسبھا کے نئے تیز مزاج لیڈروں نے انہیں مہاسبھا سے نکال باہر کر دیا ہے۔ جب تک مالوی جی مہاسبھا کی روح رواں رہے اس وقت تک مہاسبھا باوجود اپنی فرقہ پرستی کے سیاسی حیثیت سے رجعت پسند نہیں ہوئی تھی، لیکن بعد میں چل کر اس کی رجعت پسندی سب کے لئے ایک مسلم اور امتیازی خصوصیت بن گئی تھی اور مجھے اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ مالوی جی کو اس سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہیں، پھر بھی مجھے بعد میں یہ محسوس ہوا کہ میرے لئے یہ کسی طرح بھی مناسب نہ تھا کہ انکی دعوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایسی باتیں کہوں جس سے وہ مخمصے میں پڑ جائیں، واقعی مجھے اپنی اس غلطی پر بہت افسوس ہوا۔

ایک اور غلطی بھی مجھ سے سرزد ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے کہ کسی شخص نے بذریعہ ڈاک مجھے ایک قرارداد کی نقل بھیجی اور لکھا کہ اجمیر میں ہندو نوجوانوں کی کسی انجمن نے اس کو پاس کیا ہے۔ یہ رزولیوشن بہت زیادہ قابل اعتراض نہ تھا۔ چنانچہ میں نے بنارس والی تقریر میں اس کا بھی حوالہ دے دیا حالانکہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کسی انجمن نے اس قسم کا کوئی رزولیوشن کہیں منظور نہیں کیا اور ہم لوگوں کو محض دھوکہ دے کر بیوقوف بنایا گیا۔

میری بنارس کی تقریر کی مختصر رپورٹ سے ایک ہنگامہ مچ گیا، اس میں شک نہیں کہ میں اس قسم کے شور وغل سننے کا عادی ہو گیا ہوں لیکن پھر بھی ہندو مہا سبھا کے رہنما تو اس بری طرح میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں حیران رہ گیا۔ زیادہ تر حملے ذاتیات پر کئے گئے شاذو نادر ہی کسی نے اصل معاملے کی طرف توجہ کی (یہ لوگ اس معاملہ میں حد سے تجاوز کر گئے) مجھے ان سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی اس لئے کہ انہوں نے مجھے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کا ایک موقع بہم پہنچا دیا۔ کئی مہینہ سے اس مسئلہ پر میں بھرا بیٹھا تھا یہاں تک کہ جیل خانہ میں بھی بہت بے چین رہا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس مسئلہ کو چھیڑا کس طرح جائے۔ اس کی کیفیت بھڑوں کے چھتے کی سی تھی اور اس چھتے کو چھیڑنے سے میں ڈرتا نہیں تھا۔ پھر اپنے دل میں سوچتا تھا کہ ایسی بحثوں می پڑے نے کیا لطیف آئے گا جس کا خاتمہ گالی گلوچ پر ہو، مگر اب تو خاموش رہنے کا کوئی موقع نہ تھا، چنانچہ میں نے ہندو اور مسلم فرقہ پرستی پر ایک مضمون لکھا جو میرا خیال ہے کہ بہت مدلل تھا اور کی میں میں نے ثابت کیا تھا کہ ان دونوں میں کوئی حقیقی فرقہ پرستی بھی نہیں ہے بلکہ محض سیاسی اور معاشرتی رجعت پسندی ہے جو فرقہ پرستی کے بھیس میں چھپ کر کام کر رہی ہے۔ اتفاق سے میرے پاس فرقہ پرست لیڈروں کی تقریروں اور بیانوں کے تراشے موجود تھے جو میں نے بڑے پرانے پرانے اخبارات سے کاٹ کر جیل خانہ کے قیام میں جمع کئے تھے اور میرے پاس اتنا زیادہ مواد جمع ہو گیا تھا کہ ایک اخباری مضمون کے لئے ان سب سے پورا فائدہ اٹھانا مشکل ہو گیا، ہندوستانی اخبارات میں میرے اس مضمون کی بہت اشاعت ہوئی اور تعجب کی یہ بات ہے کہ فرقہ پرست ہندو اور فرقہ پرست مسلمانوں دونوں میں سے کسی طرف سے اس کوئی جواب نہیں دیا گیا حالانکہ دونوں کے متعلق میں نے اس مضمون میں بہت کچھ لکھا تھا۔ ہندو مہا سبھا کے رہنما جنہوں نے مجھے گالیاں تک دی تھیں اب بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ مسلمانوں کی طرف سے

صرف سر محمد اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کے متعلق میرے چند بیانات کی تردید کرنے کی کوشش کی لیکن میرے دلائل کا کوئی جواب انہوں نے بھی نہ دیا۔ انہیں کو جواب دیتے ہوئے میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک نمائندہ اسمبلی منعقد کر کے تمام سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل کا تصفیہ کرنا چاہئے۔اس کے بعد میں نے ایک یا دو مضامین اور فرقہ پرستی پر لکھے۔ یہ دیکھ کر کہ ان مضامین کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور جو لوگ ان مسائل پر خود غور وفکر کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں انہوں نے بھی ان مضامین کو پسند کیا مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ یہ تو بہر حال میں جانتا تھا کہ میں اپنی جادو بیانی کے زور سے ان جذبات پر ہرگز قابو نہیں پا سکتا ہوں جو کہ فرقہ پرستی کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔میرا مقصد تو صرف یہ اقرار کرنا تھا کہ فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسندی لوگ کہے جا سکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی اور سیاسی سے بھی زیادہ معاشرتی اصلاح اور ترقی کے دشمن ہیں۔ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک مطالبہ بھی عوام الناس کے فائدے کے لئے نہیں ہے۔ان مطالبات کی غرض صرف یہ ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔میرا تو مقصد تھا کہ اس سلسلہ مضامین کو جاری رکھوں لیکن جیل خانہ نے مجھے پھر بلا لیا۔ہندو مسلم اتحاد کی جو کوششیں بار بار کی جاتی ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ مفید ضرور ہیں لیکن میرے نزدیک اس وقت تک ان کوششوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا جب تک کہ اختلافات کے اصل اسباب وجوہ سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے گی، بعض ناسمجھ اسی دھوکہ میں ہیں کہ محض ہندو مسلم اتحاد پکارنے اور رٹنے میں کوئی ایسا جادو ہے کہ اتحاد آپ ہی آپ ہو جائے گا۔

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد سے فرقہ وارانہ معاملات میں برطانوی حکومت کا جو طرز عمل رہا ہے اسکی تاریخ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔میرے خیال میں (حکومت

کے اس طرز عمل کی بنیادی اصول اور مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو اتحاد عمل سے روکا جائے اور ایک جماعت کو دوسرے کے خلاف کھڑا کیا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بمقابلہ ہندوؤں کے مسلمانوں پر برطانیہ کا ہاتھ زیادہ صاف ہوتا رہا۔ مسلمانوں کے دل میں حکومت کی یاد ابھی تازہ تھی اور وہ مقابلتاً ذرا زیادہ جنگجو اور لڑاکا سمجھے جاتے تھے اس لئے حکومت بھی ان کو زیادہ خطرناک سمجھتی تھی، مسلمانوں نے جدید تعلیم سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اس لئے سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ کم تھا۔ ان تمام وجوہ سے ان کے متعلق حکومت کو طرح طرح کے شبہات اور خطرات تھے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے زیادہ شوق سے آگے بڑھ کر انگریزی زبان سیکھی اور کلرکی کی ملازمتیں حاصل کیں، اس سے حکومت نے یہی اندازہ کیا کہ ہندو زیادہ آسانی سے قابو میں آسکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ دور آیا کہ اعلیٰ طبقہ کے انگریزی پڑھے لکھے لوگوں میں جدید قسم کی ذہنیت پیدا ہونا شروع ہوئی اور چونکہ تعلیمی حیثیت سے مسلمان پیچھے رہ گئے تھے اس لئے قدرتاً صرف ایک خاص طبقہ کے ہندوؤں ہی تک جذبہ وطنیت محدود رہا۔ اس وطنیت کا اظہار نہایت ہی ملائم اور حد درجہ خوشامدانہ الفاظ میں ہوا کرتا تھا لیکن حکومت اس کو بھی پسند نہ کرتی تھی۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب مسلمانوں کے سر پر ہاتھ رکھا جائے اور انہیں وطن پرستی کے اس نئے خطرے سے علیحدہ رکھا جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا انگریزی تعلیم کا نہ حاصل کرنا بجائے خود ان کی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس رکاوٹ کا دور ہوجانا بھی یقینی تھا، چنانچہ برطانیہ نے پوری دور اندیشی سے مستقبل کے لئے انتظام کرنا شروع کیا اور اس کام میں سرسید احمد خان جیسی ممتاز شخصیت سے حکومت کو بڑی مدد ملی۔

مسلمانوں کی ابتر حالت اور بالخصوص تعلیمی پستی کو دیکھ کر سرسید کو بڑا افسوس ہوا تھا اور یہ دیکھ کر بھی ان کو تکلیف ہوتی تھی کہ حکومت میں نہ مسلمانوں کا کوئی اثر ہے نہ

رسوخ اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح وہ بھی برطانیہ کے بہت بڑے مداح تھے اور یورپ کے سفر نے تو ان پر اور بھی گہرا اثر ڈالا۔ انیسویں صدی کے آخری پچاس سال کا وہ زمانہ ہے جب یورپ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مغربی یورپ اپنی تہذیب اور ترقی کے شباب پر تھا اور بلا خوف تردید ملکہ عالم بنا ہوا تھا اور جن خوبیوں کی بدولت اس کو یہ عظمت نصیب ہوئی وہ بھی نمایاں طور پر منصۂ مشہور تھیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ اپنی موروثی املاک اور جائدادوں پر قبضہ جمائے اطمینان اور چین سے بیٹھتے تھے بلکہ اس میں برابر اضافہ کرتے جاتے تھے۔ ان کو ذرہ برابر یہ گمان نہ تھا کہ ان کے مقابل کوئی اور دعویدار بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ آزاد خیالی کی ترقی کا عہد تھا اور ہر شخص ایک عظیم الشان مستقبل کا یقین واثق رکھتا تھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جو ہندوستانی وہاں اس زمانہ میں گئے وہ بھی ان حالات اور خیالات سے متاثر اور مرعوب ہوئے۔ شروع شروع میں ہندو زیادہ تعداد میں گئے اور پورے یورپ بالخصوص انگلستان کے مداح بن کر واپس لوٹے۔ لیکن رفتہ رفتہ آنکھیں اس ظاہری دمک کی عادی ہونے لگیں اور تحیر کا پہلا پردہ چاک ہوا۔ سرسید پر جو رعب اور اچنبھے کی کیفیت یورپ کے پہلے سفر میں طاری ہوئی اس کا نمایاں ثبوت جا بجا ملتا ہے۔ ۱۸۶۹ء میں جب انہوں نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں سے جو خطوط انہوں نے لکھے ان میں تاثرات کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتے۔ اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی بداخلاقی اور ہندوستانیوں کو جانوروں سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل سمجھنا گو میرے لئے ناقابل معافی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں سے ناواقفیت کی بنا پر وہ ایسا کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کے متعلق جو رائے انہوں نے قائم کی ہے وہ زیادہ غلط بھی نہیں ہے۔ انگریزوں کی بیجا تعریف کئے بغیر میں سچ کہتا ہوں کہ ہندوستانی خواہ اونچے طبقے کے ہوں یا نیچے طبقے کے ہوں سوداگر ہوں یا معمولی دوکاندار، تعلیم یافتہ یا جاہل جب ان کا مقابلہ تعلیم

اخلاق اور ایمانداری میں انگریزوں سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ نسبت ہے جو ایک گندہ جانور کو ایک خوبصورت اور لائق انسان سے ہوتی ہے۔ انگریز اگر ہندوستانیوں کو بزدل اور جانور سمجھتے ہیں تو ان کے پاس اس کے وجوہ بھی ہیں۔۔۔ ۔جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے اور ہر روز دیکھتا ہوں وہ ہندوستان کے باشندوں کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ وہ تمام روحانی اور مادی خوبیاں جو ایک انسان میں ہونی چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے یورپ کو بالخصوص انگلستان کو عطا فرمائی ہیں۔

یورپ اور برطانیہ کی اس سے زیادہ تعریف کوئی انسان نہیں کر سکتا اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر سید بہت زیادہ مرعوب اور متاثر ہو گئے تھے۔ موازنہ اور تقابل کے لئے جو شدید الفاظ انہوں نے استعمال کئے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ اپنی قوم کو غفلت کی نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہتے تھے اور شرمندہ کرنا چاہتے تھے تا کہ یہ لوگ بھی ترقی کی طرف قدم بڑھائیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ترقی کا یہ قدم وہ مغربی تعلیم ہی کی طرف اٹھانا چاہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ بغیر مغربی تعلیم کے ان کی حالت روز بروز کمزور اور پست ہوتی جائے گی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سرکاری ملازمت ملے۔ امن چین سے روزی ملے، اعزاز اور رسوخ حاصل ہو، چنانچہ انہوں نے اس قسم کی تعلیم کو رواج دینے کے لئے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں تمام تر توجہ وقف کر دی۔ وہ کسی دوسری طرف اپنی توجہ کو منتشر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے جمود اور جھجک پر غلبہ پانے کا کام خود ہی بہت مشکل تھا۔ دوسری طرف بورژوا ہندوؤں کی کوششوں سے وطن پرستی کی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ اس میں شرکت سے ان کے نزدیک انتشار کا ڈر تھا اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ ہندو جو مغربی تعلیم میں نصف صدی مسلمانوں سے آگے تھے حکومت وقت پر نکتہ چینی کرنے مشغلہ تفریحا کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے تعلیمی کاموں کو حکومت کے تعاون اور امداد کے بھروسے پر شروع کیا تھا اور اس

لئے وہ کوئی ایسا قدم بے سوچے سمجھے نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کام کو نقصان پہنچے۔ چنانچہ انہوں نے نوزائیدہ نیشنل کانگریس، کو پس پشت ڈال دیا، ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت یہی چاہتی تھی اور اس نے ان کی پوری حمایت کی۔

سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کردینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا، بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔

ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لئے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ ان کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ مسلمان بورژوا تحریک وطنیت میں شامل ہوجاتے۔

سرسید کی یہ تمام کاروائیاں جو بظاہر ہمیں معتدل قسم کی معلوم ہوتی ہیں حقیقتاً ایک قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ مسلمان ابھی تک اپنے خیالات کے اعتبار سے جمہوریت کے مخالف اور منصب داری نظام کے حامی تھے، برخلاف اس کے ہندوؤں میں جو متوسط طبقہ پیدا ہورہا تھا یہ یورپ کے آزاد خیال لوگوں سے متاثر تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک سے ایک بڑھ کر اعتدال پسند تھے اور دونوں حکومت برطانیہ کے وابستگان میں تھے۔ زیادہ سے زیادہ فرق یہ تھا کہ سرسید کا اعتدال زمیندا طبقہ کا اعتدال تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں تھوڑے بہت صاحب حیثیت لوگ جو رہ گئے تھے وہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ہندوؤں کا اعتدال ایک ہوشیار پیشہ کاروباری آدمی کا اعتدال تھا جو اپنی تجارت کی ترقی اور سرمایہ لگانے کے لئے راستہ نکالنا چاہتے ہے۔ ہندو مدبرین کی نظریں ہمیشہ گلیڈ اسٹون اور برائٹ وغیرہ کی طرف اٹھتی تھیں، اس لئے کہ انگلستان کے آزاد خیال گروہ کے یہی

چشم و چراغ ہیں۔ مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ غالباً انگلستان کے قدامت پرست گروہ توریز اور طبقہ امرائے کے زیادہ قائل اور مداح تھے۔ گلیڈ اسٹون نے چونکہ ترکی کی آرمینی قتل عام کی مذمت کی تھی اس لئے گلیڈ اسٹون کو مسلمان ہوا سمجھتے تھے اور ڈسرائیلی چونکہ ترکی سے کسی قدر ہمدردی رکھتا تھا اس لئے ان معاملات سے دلچسپی لینے والے مسلمان جن کی تعداد بہت تھوڑی تھی ذرا ڈسرائیلی کے طرفدار تھے۔

سرسید کی بعض تقریروں کو اگر آج پڑھا جائے تو بہت عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ دسمبر ۱۸۸۷ء میں انہوں نے لکھنو میں ایک تقریر کی نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس بھی اسی زمانہ میں ہو رہا تھا چنانہ اس تقریر میں انہوں نے کانگریس کے حد درجہ معتدل مطالبات پر بھی نکتہ چینی کی اور اس کی مذمت کی۔ سرسید نے کہا کہ حکومت اگر افغانستان سے جنگ کرتی ہے یا برما پر قبضہ کر لیتی ہے تو ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اس کے طرز عمل پر نکتہ چینی کریں۔۔۔۔ اس کونسل کے لئے وہ ہر صوبہ سے ایسے افسروں کا انتخاب کرتی ہے جو ملکی انتظامات اور لوگوں کی حالت سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ رئیسوں کو بھی لیا جاتا ہے جو اپنے بلند مرتبہ کی وجہ سے اس مجلس میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ کچھ لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ بجائے قابلیت کے محض بلند مرتبہ کی وجہ سے انہیں کیوں منتخب کیا جائے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے امراء اور روسا کا طبقہ اس کو پسند کرے گا کہ ایک نیچ ذات یا ایک بے نام و ننگ خاندان کے کسی آدمی کو خواہ وہ بی اے، ایم اے ہی پاس کر لے اور اس میں تمام قابلیتیں بھی کیوں نہ موجود ہوں کیا ایسا اختیار اور رتبہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ ان پر حکومت کرے اور اس کو ایسے قوانین بنانے کا اختیار حاصل ہو جس کا اثر ان کی زندگی اور املاک پر پڑے؟ ہرگز نہیں!۔۔۔ سوائے اعلیٰ خاندان کے لوگوں کے اور کسی شخص کو وائسرائے بہادر اپنا رفیق کار نہیں بنا سکتے، نہ اس سے برادرانہ

تعلقات رکھ سکتے ہیں، نہ ایسی عورتوں میں اس کو شریک کر سکتے ہیں جہاں اس کو ڈیوک اور ارل طبقہ کے لوگوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا ہو۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت نے قانون سازی کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں وہ رائے عامہ کا کوئی لحاظ نہیں کرتی؟ اور کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قانون بنانے میں ہم لوگوں کا کوئی نفع نہیں؟ میں دعوی کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

ہندوستان میں جمہوریت اسلام کے ایک نمائندہ اور رہنما کے یہ خیالات ہیں!

کیا اودھ کے تعلقدار یا صوبہ آگرہ، بہار اور بنگال کے بڑے بڑے زمیندار بھی اس قسم کے خیالات ظاہر کرنے کی جرات آج کر سکتے ہیں لیکن ایک بیچارے سرسید ہی اس قسم کے خیالات نہ رکھتے تھے۔ خود کانگریس کی بہت سی تقریریں، آج اگر پڑھی جائیں تو اتنی ہی عجیب معلوم ہوں گی، بہر حال یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کا سیاسی اور معاشی پہلو یہ تھا۔ کہ ہندوؤں کا ایک متوسط طبقہ تھا جو معاشی حیثیت سے ذرا بہتر حالت میں تھا اور ترقی کر رہا تھا۔ اس طبقہ کے اقتدار اور ترقی کی مخالفت کسی حد تک زمیندار طبقے کی طرف سے کی گئی جس میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ ہندو زمیندار بالعموم اپنے بورژوا طبقے سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور اس لئے اپنے متوسط طبقہ کے مطالبات میں یا وہ غیر جانب دار رہے یا ان سے ہمدردی کرتے رہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ مطالبات انھیں کے اشاروں سے کئے جاتے تھے۔ حکومت برطانیہ حسب معمول اس کش مکش میں منصب داروں اور جاگیرداروں کا ساتھ دیتی رہی اور جہاں تک بیچارے عوام الناس یا ادنیٰ متوسط طبقہ کا تعلق ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اس پوری تصویر میں ان کا چہرہ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

بالاخر سرسید کی پرزور اور چھا جانے والی شخصیت نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں پر اپنا سکہ جما دیا اور ان کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کی تشکیل علی گڑھ کالج کی

صورت میں ہوئی۔ تغیر اور تبدیلی کے زمانہ میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ترقی کی تحریک جلد ہی اپنی قوت ختم کر چکتی ہے اور پھر بجائے محرک کے الٹے روک کا کام کرنے لگتی ہے۔ اس کی ایک روشن مثال ہندوستان کی لبرل جماعت ہے وہ اکثر ہم لوگوں کو یاد دلاتے ہیں کہ کانگریس کی قدیم روایات کے اصل حامل اور جائز وارث وہی ہیں۔ ہم لوگ جو بعد میں داخل ہوئے خواہ مخواہ دخل بیجا کرنے والے لوگ ہیں۔ اور یہ بالکل درست ہے، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ بدلتی رہی ہے اور کانگریس کی قدیم روایات اسی طرح محو ہو چکی ہیں جیسے پارسال کا برف پہاڑوں پر سے گھل کر غائب ہو گیا اب صرف اس کی یاد ہی یاد باقی ہے۔ شاید سرسید کا پیغام بھی اسی طرح اس وقت کے لئے مناسب حال اور ضروری تھا، لیکن ایک ترقی کرنے والی جماعت کے لئے وہ آخری نصب العین نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ اگر وہ ایک نسل تک اور زندہ رہتے تو وہ خود اپنے پیغام کو کوئی نیا رخ دیتے۔ یا دوسرے رہنماؤں کا فرض تھا کہ وہ ان کے پیغام کی تاویل کر کے تغیر پزیر حالات میں اس سے کام لیتے۔ لیکن یہ ایسی عظیم الشان کامیابی سرسید کو حاصل ہوئی تھی اور ان کی ایسی عظمت لوگوں کے دلوں پر اسی وجہ سے قائم ہو گئی تھی کہ دوسرے لوگوں کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ ان کے عقیدے سے ہٹ کر کوئی نئی راہ نکالی جائے اور بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایسی غیر معمولی قابلیت کے لوگوں کا بھی فقدان تھا جو کوئی نئی راہ نکال سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ کالج نے بڑا اچھا کام کیا۔ قابل لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا کر دی اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کا رنگ ہی بدل دیا لیکن جن اصولوں پر اس کی بنیاد اول روز قائم کی گئی تھی ان میں پھر پوری طرح تبدیلی نہیں ہو سکی۔ امیرانہ ذہنیت وہاں ہمیشہ کارفرما رہی اور ایک اوسط درجہ کے طالب علم کا حوصلہ اور مقصد سرکاری ملازمت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نہ اس میں تحقیق کا جذبہ ہے

نہ تلاش اور جستجو کا حوصلہ اگر اس کو ڈپٹی کلکٹری مل جائے تو بس وہ خوش ہے اور مطمئن۔ اس کا جذبہ افتخار اس سے مطمئن ہو جاتا۔ اگر اس کو یاد دلایا جائے کہ وہ بھی جمہوریت اسلام کا ایک رکن ہے اور اپنے اس جذبہ اخوت کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایک سرخ ٹوپی ذرا ترچھی کر کے پہنتا ہے۔ (یہ ترکی ٹوپی کہلاتی ہے حالانکہ خود ترکوں نے اب اس کو بالکل ترک کر دیا ہے) جمہوریت اسلام میں شرکت کا یہ نا قابل انکار حق یقینی طور پر حاصل کر لینے کے بعد جس سے کہ اس کو دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کا حق مل جاتا ہے اب اس کو اس مطلق فکر نہیں ہوتی کہ اس کے وطن ہندوستان میں سیاسی جمہوریت کا وجود بھی کہیں ہے کہ نہیں ہے۔

سرکاری ملازمت کرنے کا یہ شوق اور تنگ نظری صرف علی گڑھ یا دوسرے مقامات کے مسلمان طلبہ ہی میں نہیں بلکہ ہندو طلبہ میں بھی پائی جاتی تھی جو طبعا بہت ہی کم حیثیت ہوتے تھے، لیکن حالات نے انہیں بالآخر اب اس چکر سے نکلنے پر مجبور کر دیا، ان کی تعداد بہت بڑھ گئی اور ملازمتوں میں اتنی جگہ نہ تھی کہ سب کو دی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا ایک طبقہ ہو گیا جو قومی انقلابی تحریکات کے پشت پناہ ہیں۔

سرسید کے سیاسی پیغام کا اثر ابھی ہندی مسلمانوں پر باقی تھا کہ بیسویں صدی کے اوائل میں چند واقعات نے برطانوی حکومت کو یہ موقع دیا کہ قومی تحریک اور مسلمانوں کے درمیان جو خلیج پہلے سے حائل ہے اس کو اور زیادہ وسیع کر دے، میں سر ولنٹائن چرول اپنی کتاب انڈین ان ریسٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے مفاد اور قومی اغراض کو برطانوی حکومت کے قیام و استحکام کے ساتھ جس حد تک اب وابستہ کر لیا ہے اس سے پہلے کبھی اس کی مثال نہیں ملتی لیکن سیاسی پیشگوئیاں خطرناک ہوتی

ہیں۔ سر ولنٹائن نے جب یہ لکھا اس کے پانچ سال کے بعد یہ دیکھا گیا کہ تعلیم یافتہ مسلمان بھی ان بیڑیوں کو توڑ پھینکنے کی کوشش اور جدوجہد کر رہے ہیں اور کانگریس کے دوش بدوش چلنے چاہتے ہیں اور اسی سال کے اندر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندی مسلمان کانگریس سے بھی دو قدم آگے نکل جائیں گے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ کانگریس کی رہنمائی کرنے لگے۔ لیکن یہ دس سال کا زمانہ بہت ہی اہم تھا۔ جنگ عظیم اسی زمانہ میں شروع ہوئی اور دنیا کو تباہی اور بربادی کے عالم میں چھوڑ کر اسی زمانہ میں ختم بھی ہوئی۔

بہر کیف سطحی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو سر ولنٹائن چرول نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس کے لئے بھی معقول وجود موجود تھے۔ آغا خان نے مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے ظہور فرمایا تھا اور اسی ایک واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان ابھی تک قدیم منصب داری نظام کی روایات سے وابستہ تھے۔ اس لئے کہ آغا خان بورژوا لیڈر تو کسی صورت میں نہیں کہے جا سکتے تھے۔ آغا خان ایک متمول امیر و کبیر ہیں اور ایک مذہبی فرقہ کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔ برطانوی نقطہ نظر سے تو مقربین بارگاہ میں ان کا شمار کیا جاتا ہے اس لئے کہ برطانیہ کے حکمران طبقہ سے ان کے نہایت گہرے تعلقات ہیں۔ وہ ایک نہایت شائستہ اور وسیع المشرب آدمی ہیں ان کا قیام زیادہ تر یورپ میں رہتا ہے جہاں ان کی طرز معاشرت اور بود و باش بالکل وہی ہے جو ایک فارغ البال اور سیر و تفریح میں وقت گزارنے والے انگریز رئیس کی بالعموم ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ جہاں تک فرقہ وارانہ مذہبی مسائل اور معاملات کا تعلق ہے آغا خان خود ذاتی طور پر تنگ نظری سے بہت دور ہیں۔ لیکن ان کی قیادت کے معنی یہ تھے مسلمانوں میں زمیندار طبقہ، مسلمان بورژوا طبقہ دونوں برطانوی حکومت کی حمایت میں صف بستہ ہو جائیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس پر ظاہرا طور پر اس لئے زور دیا جاتا تھا کہ اصل مقصد حاصل ہو۔ سر ولنٹائن

چرول لکھتے ہیں کہ آغا خان نے وائسرائے لارڈ منٹو کو بتلا دیا تھا کہ تقسیم بنگالہ سے جو سیاسی صورت حال پیدا ہوئی اس کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر کیا ہے تاکہ ہندوؤں کے ساتھ کوئی ایسی سیاسی مراعات کہیں رواداری میں نہ کر دیئے جائیں جس سے ہندو اکثریت کے اقتدار حاصل کرنے کے لئے راستہ صاف ہو جائے کہ یہ بات برطانوی حکومت کے استحکام اور مسلم اقلیت کے مفاد کے لئے جس کی وفاداری میں اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی یکساں طور پر خطرناک تھی۔

برطانوی حکومت کے ساتھ اسی سطحی حمایت کے پیچھے دوسری قوتیں بھی کام کر رہی تھیں۔ ناگزیر طور پر جدید مسلم بورژوا طبقہ روز بروز موجودہ حالات سے غیر مطمئن ہو کر تحریک وطنیت کی طرف کھنچتا جا رہا تھا۔ خود آغا خان کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا اور انہوں نے محض الفاظ میں برطانیہ کو متنبہ بھی کیا۔ انہوں نے جنوری ۱۹۱۴ء کے اڈنبرا ریویو میں (یعنی جنگ سے بہت پہلے) یہ لکھا تھا اور حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا طرز عمل ترک کر کے دونوں مذاہب کے معتدلین کو ایک مشترکہ محاذ پر جمع کرنا چاہیے تاکہ ہندوستان کے نوجوان ہندو اور مسلمان دونوں کے انتہاپسند قومی میلانات کا مقابلہ کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفاد کا اتنا خیال نہ تھا جتنا کہ ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو روکنے کا۔

لیکن قومیت کی تحریک کی طرف مسلم بورژوا طبقہ کے ناگزیر میلان کو نہ تو آغا خان روک سکے اور نہ حکومت برطانیہ۔ عالمگیر جنگ نے اس عمل میں اور زیادہ تیزی پیدا کر دی اور جیسے جیسے نئے رہنما پیدا ہوئے آغا خان کنارہ کش ہوتے گئے، یہاں تک کہ علی گڑھ کالج کا رنگ بدلا۔ نئے رہنماؤں میں سب سے زیادہ زوردار علی برادران تھے اور یہ دونوں علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور متعدد بورژوا لیڈروں نے مسلمانوں کے سیاسی معاملات

میں بہت اہم حصہ لینا شروع کیا۔اسی طرح مسٹر محمد علی جناح آگے بڑھے لیکن ذرا زیادہ اعتدال کے ساتھ۔گاندھی جی ان میں سے اکثر مسلم لیڈروں کو (مسٹر جناح کو چھوڑ کر) اور مسلمانوں کو بالعموم تحریک ترک موالات میں اپنے ساتھ گھسیٹ لے گئے اور ان لوگوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک تمام واقعات بہت نمایاں حصہ لیا۔

اس کے بعد ردعمل شروع ہوا، ہندو اور مسلمانوں دونوں جماعتوں کے فرقہ پرست اور پھسڈی لوگ جو مجبوراً کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے تھے نکلنا شروع ہو گئے۔اس عمل کی رفتار بہت سست تھی لیکن مسلسل جاری رہی۔چنانچہ ہندو مہا سبھا کو پہلی بار کچھ شہرت حاصل ہوئی لیکن یہ شہرت زیادہ تر فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے تھی ورنہ سیاسی حیثیت سے وہ کانگریس کو کچھ زیادہ مرعوب نہ کر سکی۔اسلامی فرقہ وارانہ انجمنوں کو البتہ عام مسلمانوں میں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے میں نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی لیکن اس کے بعد بھی مسلمان رہنماؤں کی ایک قومی جماعت برابر کانگریس کے ساتھ رہی۔اسی اثناء میں حکومت برطانیہ نے ان تمام فرقہ پرست مسلمان لیڈروں کی ہمت افزائی اور حمایت کی جو سیاسی حیثیت سے بالکل رجعت پسندی میں ان کا مقابلہ شروع کیا اور اس امید پر کہ حکومت کی خوشنودی اس طریقہ سے حاصل ہو جائے گی، مہا سبھا کے ترقی پسند عناصر یا تو نکال باہر کئے گئے یا آپ اپنی مرضی سے علیحدہ ہو گئے اور مہا سبھا روز بروز اعلیٰ متوسط طبقہ کی طرف اور بالخصوص ساہوکاروں اور مہا جنوں کی طرف جھکتی چلی گئی۔

دونوں طرف کے فرقہ پرست سیاسین جو کونسلوں کی نشستوں کی تقسیم پر برابر لڑ جھگڑ رہے تھے اگر کچھ سوچتے تھے تو بس یہ کہ حکومت میں اقتدار حاصل ہونے سے ان کو ہم قوموں کی سرپرستی کے مواقع ملیں گے غرض یہ سارا جھگڑا صرف متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ملازمتوں کے لئے تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ اتنی ملازمتیں تو تھیں نہیں جو سب کو ملا سکیں اس لئے ہندو مسلم فرقہ پرست اسی کے لئے جھگڑتے تھے اور

اول الذکر کے قبضہ میں چونکہ اکثر ملازمتیں تھیں اس لئے وہ ان کا تحفظ کرنا چاہتے تھے اور آخر الذکر برابر اور زیادہ چھیننے کی فکر میں تھے۔ ملازمتوں کے لئے اس جھگڑے کے پیچھے ایک اور بھی بہت زیادہ اہم مقابلہ تھا جو ٹھیک فرقہ وارانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن فرقہ وارانہ امور پر اس کا اثر ضرور پڑتا تھا۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو پنجاب، سندھ اور بنگال میں ہندو زیادہ مالدار، زیادہ قرض دینے والے اور زیادہ تر شہر کے رہنے والے ہیں۔ برخلاف اس کے ان صوبوں میں مسلمان زیادہ غریب، زیادہ مقروض اور زیادہ تر دیہات کے رہنے والے ہیں، چنانچہ ان دونوں کی لڑائی زیادہ تر معاشی ہے لیکن ہمیشہ اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا اور ادھر کچھ عرصے سے تو مختلف صوبجات کی کونسلوں میں اور بالخصوص پنجاب کونسل میں جہاں دیہی قرضوں کی تخفیف کا مسودہ قانون پیش ہوا تو بحث مباحثوں میں یہ کیفیت خاص طور پر ظاہر تھی اور ہندو مہا سبھا کے نمائندوں نے ہمیشہ ان قوانین کی مخالفت کی اور ساہوکار طبقہ کا ساتھ دیا ہے۔

ہندو مہا سبھا جب کبھی مسلمانوں کی فرقہ پرستی پر نکتہ چینی کرتی ہے تو اپنی اس خالص وطنیت کا ادعا بھی کرتی ہے جسے کوئی انکار نہیں سکتا۔ یہ بات مسلم انجمنوں نے اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر فرقہ پرست ظاہر کیا ہے ہر شخص پر عیاں ہے، لیکن ہندو مہا سبھا کی فرقہ پرستی اتنی آشکارا نہیں ہے اس لئے کہ وہ وطنیت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔ اس کی وطنیت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کسی جمہوری اور قومی تصفیہ سے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اس کو اندیشہ ہو اور اس وقت اس امتحان میں مہا سبھا بار بار ناکام ثابت ہو چکی ہے یہی وجہ تو ہے کہ اکثریت کی مرضی کے خلاف اور اقلیت کے معاشی مفاد کی خاطر یہ لوگ ہمیشہ سندھ کی علیحدگی کی مخالفت کرتے رہے۔

لیکن فرقہ پرست ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے وطن پرستی کی مخالفت

اور رجعت پسندی کی غیر معمولی نمائش گول میز کانفرنس میں ہوئی۔ برطانوی حکومت نے چن چن کر صرف فرقہ پرست مسلمانوں کو نامزد کرنے پر اصرار کیا تھا اور یہ لوگ آغا خان کی قیادت میں بڑے بڑے رجعت پسندوں سے جا کر مل گئے جو نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام ترقی پسند جماعتوں کے نقطہ نظر سے برطانیہ کی سیاسی زندگی میں سب سے خطرناک عناصر سمجھے جاتے ہیں۔ آغا خان اور ان کی جماعت کا لارڈ لانڈ اور ان کی جماعت کے ساتھ اتنا گہرا میل جول دیکھ کر یوں ہی تعجب ہوتا تھا، لیکن یہ لوگ تو ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور انہوں نے گول میز کانفرنس میں یورپین ایسوسی ایشن کے نمائندوں کے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے نمائندوں کے ساتھ جا کر عہدو پیان کر لئے۔ یہ بات بہت زیادہ تکلیف دہ اس لئے تھی کہ یہ ایسوسی ایشن (انجمن) ہندوستان میں ملکی آزادی کی سب سے بڑی مخالف اور دشمن ہمیشہ سے رہی ہے اور آج بھی ہے۔

ہندو مہا سبھا کے نمائندوں نے اس کے جواب میں یہ مطالبہ کیا، کہ ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص پنجاب کی خود اختیاری پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں یعنی ایسے تحفظات، رکھے جائیں جو برطانیہ کے حق میں مفید ہوں، انہوں نے کوشش کی کہ برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے میں مسلمانوں سے بھی آگے بڑھ جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ تو کچھ نہیں لگا البتہ اپنے ہی مقدمہ کو نقصان پہنچایا اور تحریک آزادی کے ساتھ غداری کی۔ مسلمانوں نے کم از کم وقار کے ساتھ تقریریں کی تھیں لیکن فرقہ پرست ہندوؤں کے پاس یہ بھی نہ تھا۔

سب سے زیادہ نمایاں حقیقت مجھے تو یہ نظر آتی ہے کہ دونوں طرف کے فرقہ پرست لیڈر کس طرح صرف ایک چھوٹے سے اعلیٰ طبقہ کے رجعت پسند گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور کس طرح یہ لوگ بھی اپنی اغراض کے لئے عوام کے مذہبی

جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ دونوں طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اصل معاشی مسئلہ پر غور وفکر کی خواہش کو دبایا جائے اور اس سے احتراز کیا جائے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ان امور کو اور زیادہ نہ دبایا جاسکے گا اور اس وقت پھر دونوں طرف کے فرقہ پرست لیڈروں کی زبان سے آغا خان کی بیس برس پہلے والی تنبیہ کی آواز بازگشت آئے گی کہ معتدلین ایک مشترکہ محاذ پر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انقلابی میلانات کے مقابلہ کے لئے مجتمع ہو جائیں، کسی حد تک تو یہ بات اب بھی ظاہر ہونے لگی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرقہ پرست خواہ عام جلسوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ معاہدہ اٹاوہ بھی اسی قسم کا ایک رشتہ تھا جس نے تینوں کو متحد کر دیا تھا۔

یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ کنزرویٹو جماعت کے انتہائی رجعت پسند لوگوں کے ساتھ آغا خان کا گہرا تعلق اب تک قائم ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں برطانوی بحری افواج کی لیگ کے ڈنر میں آغا خان بطور خاص مہمان کے مدعو تھے جس میں لارڈ لائڈ نے صدارت کی تھی اور انہوں نے دل وجان سے ان تجاویز کی تائید کی تھی جو برطانوی بحری بیڑے کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے لارڈ لائڈ نے برسٹل کی کنزرویٹو کانفرنس میں پیش کی تھیں۔

چنانچہ ایک ہندوستانی لیڈر کو اتنی زیادہ فکر برطانوی سلطنت اور بالخصوص انگلستان کی محافظت کی تھی کہ برطانوی افواج واسلحہ کے اضافہ کے معاملہ میں مسٹر بالڈون اور نیشنل گورنمنٹ سے بھی وہ آگے جانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ وہ صرف قیام امن کی خاطر کر رہے تھے!۔

اس کے بعد دوسرے مہینہ نومبر ۳۴ء میں یہ خبر ملی کہ ایک تصویر (فلم) نجی طور پر لندن میں دکھلائی گئی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی دنیا کے مستقل دوستانہ تعلقات کا رشتہ تاج برطانیہ کے ساتھ قائم کیا جائے ہم لوگوں کو اطلاع دی گئی کہ اس

موقع پر خاص مہمان آغا خان اور لارڈ لائڈ سلطنتی معاملات میں اس طرح ایک دوسرے سے متحد اور ایک جان دو قالب ہو گئے ہیں جیسے ہماری قومی سیاسیات میں ترتیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم آر جیکر ہیں اور یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ اسی چند مہینہ کے عرصہ میں جب یہ دونوں ایک دوسرے سے بار بار ساز باز کر رہے تھے، لارڈ لائڈ کنزرویٹو (قدامت پسند) جماعت کی باضابطہ قیادت پر اور اپنی نیشنل گورنمنٹ پر تلخ اور ناگوار حملے بھی کر رہے تھے اور یہ الزام دے رہے تھے کہ حکومت ہندوستان کو ضرورت سے زیادہ دے کر گویا کمزوری دکھلا رہی ہے۔

ادھر کچھ عرصہ سے بعض فرقہ پرست لیڈروں کے بیانات اور تقریروں میں ایک دلچسپ بات اور پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی کوئی خاص اہمیت تو ہے نہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ اور لوگوں کا بھی یہی خیال کہیں نہ ہو۔ بہرکیف فرقہ پرستی کی ذہنیت تو اس سے ظاہر ہی ہوتی ہے اور اس کو بہت زیادہ اہمیت بھی دی گئی ہے۔ پہلے تو ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تمدن پر اور ہندو تمدن پر اور اسلامی تمدن کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے (گو اس کو بھونڈے طریقہ پر نہیں پیش کیا جاتا) کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں تمدنوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کر سکے۔

تھوڑے سے فرقہ پرست ہندو لیڈر بھی ٹھیک اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ چونکہ وہ اکثریت میں ہیں اس لئے انہیں توقع ہے کہ ہندو تمدن بالآخر غالب آ جائے گا۔

ہندو اور مسلم تمدن اور ملت اسلامی، ان الفاظ سے ماضی کے کیسے کیسے دل پسند تاریخی واقعات اور موجودہ اور آئندہ کے متعلق کیسی کیسی امیدوں کے باب کھل جاتے ہیں! لیکن ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم (موجود ہے) جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم

ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطہ نظر سے یہ بہت دور دراز کا ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جاسکتا ہے۔ بہرکیف اس ذہنیت کے سمجھنے میں اس سے تھوڑی مدد ملے گی جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ اس قسم کی چند قوموں کا وجود عہد وسطی میں اور اس کے بعد بھی پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں اور گھل مل نہ سکتی تھیں۔ سلاطین عثمانی کے ابتدائی عہد کے قسطنطنیہ میں اس قسم کی ہر قوم علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی تھی اور اس کو کسی حد تک خود مختاری حاصل تھی مثلاً لاطینی عیسائی، ارتھوڈاکس عیسائی اور یہودی وغیرہ۔ یہ گویا ابتدا تھی اپنے وطن کے علاوہ دیگر ممالک سے رشتہ اخوت جوڑنے کی جو اس زمانہ میں اکثر مشرقی ممالک کے لئے ایک بہت ہی پریشان کن خواب بن گیا۔ اس لئے مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں صرف مذہبی اخوت کا رشتہ ایک چیز ہے اور اس لئے کوئی قوم (جدید مفہوم میں) ترقی نہ کرنے پائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید تہذیب وتمدن کو ترک کر کے ہم لوگ عہد وسطی کے طریقوں کو پھر اختیار کریں، یا پھر اس کا مطلب یہ ہے مطلق العنان حکومت یہاں رہنا چاہیے یا بدیسی حکومت۔ اور آخر میں تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ ذہن کی محض ایک جذباتی کیفیت ہے اور محسوس طریقہ پر یہ خواہش کہ حقائق سے بالخصوص معاشی حقائق سے کسی طرح دوچار ہونا نہ پڑے۔ جذبات کے سامنے منطق اوندھی ہو جاتی، مگر محض اس وجہ سے کہ وہ غیر معقول ہوتے ہیں ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے، اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد بھی ہوتا تو بھی حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔

یہی حال ہندو اور مسلم تمدنوں کے تخیل کا ہے۔ اب قومی تمدن کا زمانہ بھی بہت

تیزی کے ساتھ ختم ہوتا جا رہا ہے اور پوری دنیا ایک تمدنی وحدت بنتی جا رہی ہے۔ قوموں کو یہ حق ہے اور آئندہ بھی ایک عرصہ تک یہ حق رہے گا کہ اپنی خصوصیات کو مثلاً زبان، عادات اور طریق فکر کو باقی اور محفوظ رکھیں، لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ زمانہ اور تیزی سے سفر کرنے کی سہولتیں، اخبار عالم کا مسلسل ملتا رہنا، ریڈیو اور سینما وغیرہ کی ترقی کی وجہ سے روز بروز دنیا میں یک رنگی پیدا ہوتی جائے گی۔ اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اگر اس کو کوئی روک سکتا ہے تو بس ایک عالمگیر تباہی جو جدید تہذیب اور تمدن کو تہ و بالا کردے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو اور مسلم فلسفہ زندگی میں بہت سے روایتی اختلافات موجود ہیں لیکن یہ اختلافات مشکل ہی سے نظر آسکتے ہیں جب کہ ان دونوں کا مقابلہ زندگی کے متعلق جدید علمی اور تجارتی نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس آخر الذکر اور اول الذکر دونوں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج موجود ہے۔ آج ہندوستان میں اصل کش مکش ہندو تمدن اور اور مسلم تمدن کے درمیان نہیں ہے بلکہ ایک طرف یہ دونوں ہیں اور دوسری طرف تہذیب جدید کا فاتح علمی و حکمی تمدن، جو لوگ مسلم تمدن کا، خواہ اس کا مطلب جو کچھ بھی ہو تحفظ چاہتے ہیں، انہیں ہندو تمدن کے متعلق فکر کرنے کی بجائے مغرب کے اس دیو کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ ذاتی طور پر مجھے تو اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ جدید علمی اور تجارتی تمدن کے مقابلے کے لئے جتنی بھی کوشش کی جائے گی خواہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا ہندوؤں کی طرف سے ان کا حشر ناکامی ہوگا اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں بغیر کسی تاسف کے اس ناکامیابی کا تماشہ خوشی سے دیکھوں گا۔ جس دن ریلیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں یہاں آئیں ہماری پسند کا فیصلہ تو اسی دن بالکل غیر محسوس طریقہ پر اور بلا کسی خواہش کے ہو گیا تھا۔ سر سید احمد خان نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اپنی پسند کا فیصلہ اسی دن کر لیا تھا جس دن علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم میں سے کسی کی پسند کا

کوئی دخل ہی نہ تھا، یا اگر تھا بھی تو اس کی مثال وہی ہے کہ جب آدمی ڈوبنے لگتا ہے تو وہ تنکے کا سہارا پکڑتا ہے کہ شاید وہی اس کی جان بچائے۔

لیکن یہ مسلم تمدن ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں۔ مجھے نہیں یاد آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا ہو، جن دو زبانوں نے ہندی مسلمانوں کے خیالات و افکار پر اثر ڈالا ہے وہ عربی اور بالخصوص ایرانی زبان ہے، لیکن ایرانی زبان کے اثر میں کوئی جذبی عنصر شامل نہیں۔ ایرانی زبان اور بہت سی ایرانی رسوم اور روایات، ہزارہا سال کے عرصہ میں ہندوستان میں آئیں اور پورے شمالی ہند پر اپنا نقش قائم کیا۔ ایران گویا مشرق کا فرانس تھا جو اپنی زبان اور اپنے تمدن کو تمام پردیس کے ملکوں میں پھیلاتا تھا اور یہاں ایک ایسا گراں قدر ورثہ ہے جس میں ہم تمام ہندوستانی برابر کے شریک ہیں۔

مسلم اقوام اور ممالک کے تاریخی کارناموں پر فخر کرنا غالباً ایک بہت ہی مضبوط اسلامی رشتہ سمجھا جاتا ہے، لیکن کیا کوئی شخص مختلف اقوام کے عظیم الشان کارناموں پر فخر کرنے سے مسلمانوں کو روکتا ہے، جب تک وہ ان کی یاد کو تازہ رکھنا چاہیں گے اس وقت تک کوئی شخص انہیں اس سے محروم نہیں کر سکتا بلکہ واقع تو یہ ہے کہ تاریخی کارنامے بہت بڑی حد تک ہم سب لوگوں کے لئے بھی ایک مشترکہ ورثہ ہیں۔ اس لئے کہ ایشیائی ہونے کی وجہ سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے درمیان یہی ایک رشتہ ہے جو یورپ کی دست درازیوں کے خلاف ہمیں متحد کرتا ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ جب کبھی میں نے اسپین میں یا صلیبی جنگوں میں عربوں کی لڑائیوں کا ذکر پڑھا ہے تو میری ہمدردی ہمیشہ انہیں کے ساتھ رہی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جانب داری نہ کروں اور صرف واقعات پر بحث کروں، لیکن چاہے جتنی کوشش

کروں جہاں ایشیائی لوگوں کا تعلق ہوتا ہے میری ایشیائیت کا اثر میری قوت فیصلہ پر ضرور پڑتا ہے۔

میں نے اسلامی تمدن کا مطلب سمجھنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں صرف ایک مٹھی بھر متوسط طبقہ کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی جن پر ایرانی زبان اور ایرانی روایات کا اثر ہے، اور اگر عوام پر نظر ڈالی جائے تو اسلامی تمدن کی نشانی بظاہر یہ ہے، ایک خاص قسم کا پاجامہ جو نہ زیادہ لانبا ہو اور نہ زیادہ اونچا، ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کی تراش خراش اور داڑھی رکھنا اور ایک لوٹا جس میں ایک خاص قسم کی ٹونٹی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوؤں میں رواج ہے دھوتی پہننے کا، سر پر چوٹیا رکھنے کا اور ذرا مختلف قسم کا لوٹا رکھنے کا۔ درحقیقت یہ اختلافات بھی زیادہ تر شہری ہیں اور رفتہ رفتہ غائب ہوتے جا رہے ہیں، ورنہ ایک ہندو اور ایک مسلمان کسان اور کارخانہ کے مزدور میں مشکل ہی سے کوئی تمیز کی جا سکتی ہے۔ مسلمان تعلیم یافتہ شاذونادر داڑھی رکھتے ہیں، البتہ علی گڑھ والے ابھی تک ترکی ٹوپی کے فریفتہ ہیں (یہ ٹوپی ترکی کہلاتی ہے حالانکہ ترکی کو اب اس سے کوئی سروکار نہیں ہے) مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور رفتہ رفتہ پردے سے بھی نکل رہی ہیں۔ میرا اپنا مذاق ان میں سے بعض عادات اور خصائل سے میل نہیں کھاتا اور مجھے داڑھی پسند ہے نہ مونچھیں نہ چوٹیا، لیکن مجھے اس کی بھی خواہش نہیں ہے کہ اپنے مذاق کے اصول وقوانین دوسروں پر عائد کروں۔ جہاں تک داڑھیوں کا تعلق ہے، امان اللہ خان نے کابل میں جب سرسری طور پر ان کا صفایا کرنا شروع کیا تو مجھے خوشی ضرور ہوئی تھی۔

ان ہندوؤں اور مسلمانوں کی حالت بھی حد درجہ دردانگیز ہے جو ہمیشہ ماضی کی طرف نظر رکھتے ہیں اور ہمیشہ انہیں چیزوں کو پکڑتے ہیں جو ان کی گرفت سے نکلتی چلی جا رہی ہیں۔ میں نہ ماضی کو برا کہتا ہوں نہ اس کو رد کرتا ہوں اس لئے کہ ہمارے

ماضی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو حسن و جمال میں یکتا ہیں اور بلا شبہ باقی رہنے والے بھی ہیں لیکن یہ لوگ اس حسن و جمال کو باقی رکھنے کے آرزومند نہیں بلکہ ایسی چیزوں کے پیچھے پڑے ہیں جو آئندہ رکھنے کے قابل ہی نہیں بلکہ مضر ہیں۔

اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے غازی مرد ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لئے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور ہی لئے جا رہے ہیں۔ ترکی کے جدید دستور اساسی میں ایک دفعہ تھی کہ ترکی اسلامی ریاست ہے، لیکن اس اندیشہ سے کہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کمال پاشا نے ۱۹۲۷ء میں اعلان کیا کہ دستور اساسی کی یہ دفعہ کہ ترکی ایک اسلامی ریاست ہے محض سمجھوتہ کے طور پر داخل کی گئی ہے اور مقصد یہ ہے کہ اولین موقع ملتے ہی اس کو خارج کر دیا جائیگا۔ میرا خیال ہے کہ جو اشارہ اس نے کیا تھا اس پر بعد میں اس نے عمل بھی کیا۔ مصر بھی اسی راستے پر جا رہا ہے گو نسبتاً بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ اور مذہب سے سیاست کو بالکل علیحدہ رکھتا ہے۔ یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت زیادہ پیچھے ہے، ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیاء کے لئے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔ وطنیت کے پیچھے پیچھے اور بہت سے مسلک ہیں جو معاشرتی اور معاشی زبان میں گویا ہیں۔ ہاں مسلم قوم اور مسلم تمدن کا کیا ہوگا؟ کیا یہ آئندہ صرف شمالی ہند میں سرکار دولت مدار برطانیہ کے زیر سایہ پھلے پھولے گا؟

اگر ترقی کے معنی یہی ہیں کہ سیاست میں وسعت نظر سے کام لیا جائے تو آخر میں میں یہ ضرور کہوں گا ہمارے فرقہ پرستوں نے اور حکومت نے جان بوجھ کر اور

متواتر اس کے بالمقابل تنگ نظری کو اپنا مقصود نظر قرار دیا ہے۔

یہ مقولہ ہانس کون کی کتاب مشرق کی تاریخ وطنیت سے نقل کیا گیا ہے

یہ ٹکڑا ہانس کون کی کتاب مشرق کی تاریخ میں وطنیت سے نقل کیا ہے

نوٹ:۔ یہ پوری تقریر سرسید کے مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز میں شائع ہوئی ہے۔ ہم یہاں ان کی اصل تقریر کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس کا پنڈت جواہر لال نے متن میں اقتباس دیا ہے۔

اگر کوئی ملک گورنمنٹ فتح کرے۔ برہما لے لے۔ افغانستان سے لڑے، اس سے صلح کرے۔ ان سے ہم لوگ جو ملک کے باشندے ہیں کچھ سروکار نہیں رکھتے۔

اس کونسل میں چند ممبر تنخواہ دار ہیں۔ علاوہ ان کے ہر صوبہ میں جو گورنمنٹ کی دانست میں نہایت ہوشیار اہلکار گورنمنٹ کے ہیں۔ مثلاً کمشنر یا اور کوئی واقف کار حال صوبہ۔ جس نے مدت تک وہاں زندگی بسر کی ہے۔ عدالت کے کام فوجداری، کلکٹری کے کام سے اور اس ملک اور اس ملک کے حال سے واقف ہے ہر صوبہ سے بلاتی ہے۔ پنجاب سے اودھ، سے شمالی و مغرب، مدراس و بمبئی سے، اور ان کو مشورہ میں شریک کرتی ہے۔ گورنمنٹ ہندوستانی رئیسوں میں سے جن کو اس کرسی پر بیٹھنے کے قابل اور باعتبار عزت کے مناسب سمجھتی ہے ان کو بھی بلاتی ہے۔ شاید اس بات پر لوگوں کو شبہ ہوا ہو گا کہ باعتبار عزت کے کیوں بلاتی ہے۔ باعتبار لیاقت کے کیوں نہیں بلاتی؟ اس کی بابت اے حضرات میں کچھ بیان کروں گا۔ کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنے قوم یا ادنے درجہ کا آدمی خواہ اس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی اور گو وہ لائق بھی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے۔ ان کے مال، جائیداد اور عزت پر حاکم ہو کبھی نہیں، کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا (چیرز)۔ گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے گورنمنٹ مجبور ہے

کہ سوائے معزز کے کسی کو نہیں بٹھا سکتی اور نہ وائسرائے اس کو (مائی کلیگ یا مائی آنر ایبل کلیگ) یعنی برادر یا معزز صاحب کہہ سکتا ہے نہ شاہانہ ڈنروں میں اور نہ شہنشاہی جلسوں میں جہاں (ڈیوک) اور (ارل) اور بڑے بڑے معززین شامل ہوتے ہیں بلایا جا سکتا ہے۔

بہر حال قانون میں کچھ نقص ہو یا نہ ہو مگر طریقہ بنانے کا ایسا ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ خود مختاری سے جو چاہتی ہے وہ کرتی ہے۔ہم رعایا کی رائے نہیں لیتی اور نہیں سنتی ہے اور جو لوگ عذر کرنا چاہتے ہیں ان پر غور نہیں کرتی بلکہ اس بیان کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ گورنمنٹ کوئی قانون جاری نہیں کرتی جب تک رعایا اور اخباروں کی رائے نہیں سن لیتی اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا حصہ قانون پر نہیں ہے۔ بے شک ہے اور بلا شبہ ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کچھ برطانوی امراء اور ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کونسل قائم کی گئی ہے جو ان دو انتہا پسند رجعت پسند عناصر کو متحد کرے اور اس اتحاد کو اور زیادہ فروغ دے۔

تعطل

دوبارہ گرفتاری اور سزایابی کا امکان مجھے برابر پریشان کرتا رہا یہ امکان اس لئے اور بھی قوی تھا کہ ملک پر آرڈی نینس اور اسی نوع کے دیگر قوانین کا رواج تھا اور خود کانگریس ایک خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی، برطانوی حکومت کی آئینی ساخت اور اپنی طبیعت کو دیکھتے ہوئے میری گرفتاری ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں کام اطمینان کے ساتھ جم کر نہیں کر سکتا تھا یہی فکر تھی کہ جتنا زیادہ کام ہو سکے جلد نپٹا دیا جائے۔

پھر بھی میں خواہ مخواہ کی گرفتاری مول لینا نہیں چاہتا تھا اور حتی الواسع ایسی کاروائیوں سے احتیاط کرتا تھا جن سے میری گرفتاری عمل میں آئے اپنے صوبہ کے اکثر مقامات سے اور باہر سے بھی بہت سی دعوتیں آئیں کہ میں دورے پر نکلوں، لیکن میں نے ان سب کو مسترد کر دیا اس لئے کہ تقریر کرنے کی غرض سے اس قسم کا دورہ ایک اندھا دھندھاوے کی صورت کی اختیار کر لیتا جو یقین تھا کہ بیچ ہی سے یکا یک ختم کر دیا جائے گا مگر میرے لئے کوئی اور درمیانی راستہ بھی نہ تھا، میں جب کبھی کسی دوسرے کام سے مثلاً گاندھی جی سے اور ارا کین ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کرنے کہیں باہر گیا تو میں نے عام جلسوں میں نہایت آزادی سے تقریریں کیں۔ جبل پور میں ایک بڑا جلسہ ہوا اور نہایت شاندار جلوس نکلا اور دہلی کا اجتماع تو ان بڑے بڑے مجمعوں کے مقابلہ کا تھا جو میں نے وہاں دیکھے ہیں اور فی الحقیقت ان جلسوں کی کامیابی ہی سے یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ حکومت بار بار اس قسم کے جلسوں کا انعقاد گوارا نہ کرے گی۔ بلکہ دہلی میں تو جلسہ کے بعد ہی میری گرفتاری کی افواہ بہت گرم تھی، لیکن بچ گیا اور الہ آباد واپس چلا آیا البتہ راستہ میں مسلم یونیورسٹی کے طلباء کے سامنے تقریر کرنے کے لئے علی گڑھ میں بھی اتر گیا۔

جب حکومت یوں ہر قسم کے مفید سیاسی کاموں کو روکنے کی کوشش کر رہی تو اس

وقت غیر سیاسی پبلک کاموں میں حصہ لینے کا خیال مجھے بہت برا لگتا تھا۔ میں نے کانگریسیوں میں شدت کے ساتھ یہ میلان دیکھا کہ کانگریس کے کام سے جان بچا کر ایسے انٹ سنٹ کاموں میں لگتے جا رہے تھے جو اگرچہ بجائے خود پسندیدہ بھی مگر ہماری جدوجہد سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، یہ میلان طبع قدرتی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کو تقویت نہ دینا چاہیے۔

وسط اکتوبر ۳۳ء میں صورت حال پر غور کرنے اور آئندہ کے لئے طریق کار کا فیصلہ کرنے کی غرض سے ہم لوگوں نے صوبہ متحدہ کے کارکنان کانگریس کے جلسے الہ آباد میں منعقد کئے، صوبہ کانگریس کمیٹی ایک غیر قانونی جماعت تھی اور ہم لوگوں کا منشا صرف مشاورت کرنا تھا نہ کہ قانون کی خلاف ورزی کرنا۔ اس لئے ہم نے اس کمیٹی کو باقاعدہ طلب بھی نہیں کیا تھا، ہم نے صرف ان تمام اراکین کو جو جیل سے باہر تھے نیز چند اور منتخب کارکنوں کو ایک غیر رسمی جلسہ میں مدعو کر لیا تھا۔ یہ جلسے بالکل نجی تھے مگر ان کے متعلق کوئی رازداری بھی نہیں کی گئی تھی، چنانچہ آخر وقت تک ہم لوگوں کی زیادہ توجہ واقعات عالم پر مبذول رہی مثلاً شدید کساد بازاری، جرمنی میں نازی تحریک اور کمیونزم وغیرہ وغیرہ، ہم چاہتے تھے کہ ہمارے ساتھی ہندوستان کی جدوجہد کا مطالعہ ان واقعات کے تعلق سے کریں جو دیگر ممالک میں پیش آ رہے ہیں۔ بالآخر کانفرنس نے ایک اشتراکی قرارداد منظور کی، جس میں ہمارے نصب العین کی توضیح اور تعریف کی گئی تھی اور یہ اعلان کیا کہ کانفرنس سول نافرمانی بند کر دینے کی مخالف ہے۔ ہم میں سے ہر شخص یہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وسیع پیمانہ پر سول نافرمانی کرنے کا اس وقت کوئی امکان نہیں بلکہ انفرادی سول نافرمانی بھی یا تو بہت جلد ختم ہو جائے گی یا بہت ہی محدود پیمانے پر جاری رہے گی۔ لیکن جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے سول نافرمانی جاری رکھنے یا نہ رکھنے سے کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ حکومت کی طرف سے حملے اور قوانین آرڈی نینس

کا نفاذ برابر جاری تھا۔ چنانچہ اور کسی غرض سے نہیں صرف اپنے طرزِ عمل کو ظاہر کرنے کی خاطر ہم نے رسمی طور پر سول نافرمانی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا لیکن اسی کے ساتھ ہم نے اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ اپنے کسی کام کو چھوڑ کر گرفتار ہونے کی کوشش نہ کریں، بلکہ اپنا معمولی کام کئے جائیں اور اگر اس سلسلہ میں گرفتار ہو جائیں تو خندہ پیشانی سے اس کو قبول کر لیں۔ انہیں خصوصیت کے ساتھ یہ ہدایت کی گئی کہ دیہاتی علاقوں سے اپنے تعلقات اور رواسطہ دوبارہ قائم کریں اور یہ معلوم کریں کہ تخفیف لگان اور حکومت کے تشدد سے کسانوں کا حال کیسا ہے اس وقت عدم ادائیگی لگان کی تحریک کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ تحریک پونا کانفرنس کے بعد ہی باقاعدہ روک دی گئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت حالات ایسے نہ تھا کہ اس کو دوبارہ شروع کیا جاتا۔

یہ پروگرام بہت ہی بے ضرر اور مدہم قسم کا تھا اور اس میں بظاہر کوئی بات ایسی خلاف قانون بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود ہم جانتے تھے کہ اس کی وجہ سے گرفتاریاں کی جائیں گی۔ چنانچہ جون میں ہمارے کارکن دیہاتوں میں گئے۔ ان کو گرفتار کر کے یہ الزام بالکل غلط طور پر لگایا گیا کہ وہ عدم ادائیگی لگان کا پرچار کرتے ہیں (جو آرڈیننس کے مطابق جرم قرار دیا گیا تھا) اور وہ سزایاب ہوئے، بہت سے رفقاء کار کی گرفتاری کے بعد میرا مقصد بھی دیہاتی علاقوں میں جانے کا تھا لیکن بعض اور کاموں میں لگ گیا اور مجھے اپنا دورہ ملتوی کرنا پڑا یہاں تک کہ اس کا وقت ہی نکل گیا۔

ان چند مہینوں کے دوران میں دو مرتبہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین پورے ہندوستان کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ خود کمیٹی کا تو کوئی وجود نہ تھا اور یہ اس لئے نہیں کہ وہ ایک خلاف قانون جماعت تھی بلکہ اس لئے کہ گاندھی جی کے ایماء سے پونا کے فیصلہ کے بعد تمام کانگریس کمیٹیاں اور ان کے

دفاتر بند کردیئے گئے تھے۔میری حیثیت بھی اس وقت اتفاق سے کچھ عجیب ہوگئی تھی اس لئے کہ جیل سے نکلنے کے بعد میں نے خود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرنے سے انکار کردیا تھا اوراپنے آپ کو کانگریس کا جنرل سیکرٹری کہنے پر مصر تھا، لیکن اپنے فرائض منصبی صرف ہوائی طور پر ادا کرسکتا تھا۔نہ تو کوئی دفتر تھا، نہ عملہ نہ قائم مقام صدر۔گاندھی جی صلاح ومشورہ کے لئے ضرور موجود تھے مگروہ سارے ملک کا ایک عظیم الشان دورہ کرنے میں مشغول تھے اوراس مرتبہ ان کا یہ دورہ ہریجن تحریک کے لئے تھا، اس دورہ میں بھی ہم لوگوں نے کسی نہ کسی طرح جبل پوراور دہلی جا کرانہیں پکڑا اوران کے ساتھ ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے صلاح ومشورہ کیا۔ان ملاقاتوں میں مختلف اراکین کا اختلاف رائے بھی بہت صاف ظاہر ہوگیا۔ اورایک تعطل سا پیدا ہوگیا۔ کوئی ایسی سبیل نہیں نکلتی تھی جوسب کے لئے قابل قبول ہوتی۔جولوگ سول نافرمانی بند کرنا چاہتے تھے اور جواس کے مخالف تھے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کن ذات بس گاندھی جی کی تھی اورچونکہ وہ اس وقت آخرالذکرگروہ کی رائے سے متفق تھےاس لئے معاملات جس طرح سے تھے بدستور جاری رہے۔

مجالس قانون ساز کے انتخابات میں کانگریس کی طرف سے مقابلہ کرنے کے مسئلہ پر کارکنان کانگریس میں کبھی کبھی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔مگرورکنگ کمیٹی کے اراکین کواس وقت اس مسئلے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی اورواقعہ یہ ہے کہ یہ سوال اس وقت کسی طرح پیدا ابھی نہیں ہوتا تھا۔بلکہ اس وقت اس مسئلہ پر بحث کرنا بدیہی طور پرقبل ازوقت تھا، اصلاحات کا نفاذ کم ازکم آئندہ دوتین سال تک ہوتا نظرنہیں آتا تھا،اورنہ اس وقت اسمبلی کے لئے جدید انتخاب کا کوئی تذکرہ تھا۔ذاتی طورپرالیکشن لڑنے کے خلاف مجھے کوئی اصولی اعتراض نہ تھا، اور مجھے اپنی جگہ پرپورایقین تھا کہ جب وقت آئے گا تو کانگریس کواس میں حصہ لیناہی پڑے گا،لیکن اس وقت اس سوال کوپیدا کرنے کے معنی یہ تھے کہ توجہ دوسری طرف ہوجائے ،میرا یہ خیال تھا کہ

اگر ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں تو جو مسائل درپیش ہیں وہ صاف اور واضح ہو جائیں گے اور اپنے اصولوں کو چھوڑ کر سمجھوتہ کرنے والے لوگوں کو معاملات پر حاوی ہونے سے روکا جا سکے گا۔

اس دوران میں برابر مضامین اور بیانات اخبارات کو بھیجتا رہا۔ کسی حد تک مجھے اپنی تحریروں کو نرم اور ملائم بنانا پڑا، اس لئے کہ وہ اشاعت کی غرض سے لکھی گئی تھیں اور ادھر سنسر صاحب موجود تھے اور مختلف قوانین تھے جن کی گرفت کے پنجوں کی طرح بہت دور تک پہنچتی تھی اور میں اگر ان خطرات میں پڑنے کے لیے تیار بھی ہوتا تو طابع اور ناشر اور مدیر اس کے لئے آمادہ نہ تھے، بہر حال مجموعی حیثیت سے اخبارات نے مجھ پر عنایت کی اور بہت سی باتیں میری تائید میں لکھیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات میرے بیانات اور مضامین کے حصہ کے حصہ حذف کر دیئے جاتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو میرا ایک پورا اور طویل مضمون جس کو میں نے بڑی محنت سے لکھا تھا شائع ہی نہیں ہوا۔ جنوری ۳۴ء میں جب میں کلکتہ میں تھا تو ایک مقتدر روزنامہ کے مدیر صاحب مجھ سے ملنے تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے آپ کا ایک بیان کلکتہ کے جملہ اخبارات کے مدیر خصوصی کے پاس استصواب رائے کے لیے بھیجا تھا، اور چونکہ انہوں نے اس کو مسترد فرما دیا اس لئے وہ شائع نہیں کیا گیا یہ مدیر خصوصی کلکتہ گورنمنٹ پریس کے سنسر صاحب تھے۔

میں نے اپنے بعض بیانات میں اور اخبارات کے نمائندوں سے گفتگو کے دوران میں چند افراد اور جماعتوں پر نکتہ چینی کی تھی، اس پر اظہار ناراضگی کیا گیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا اور گاندھی جی نے بھی اس خیال کو پھیلانے میں مدد دی تھی کہ کانگریس پر بلا خوف انتقام ہر طرح کے حملے کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ خود گاندھی جی نے اس کی ایک مثال قائم کر دی تھی اور بعض سربرآوردہ کانگریسی بھی حسب مراتب ان کا اتباع کیا کرتے تھے اگرچہ سب نہیں۔

وجہ یہ تھی کہ علی العموم ہم لوگ مبہم اور دوراز کا باتیں کیا کرتے تھے۔ جس سے ہمارے نکتہ چینیوں کو موقع ملتا تھا کہ غلط استدلال اور موقع پرستی کی چال بازیوں سے ہماری باتوں کو لے اڑیں اور پھر دونوں طرف سے اصل مسائل پر بحث کرنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے بحث و مباحثے جو دیانت داری سے کیے جائیں اور جن میں موقع بموقع وار اور بچاؤ کی نوبت بھی آئے شاذونادر ہی ہوتے تھے جیسے کہ ان مغربی ممالک میں ہوا کرتے ہیں۔ جہاں تحریک فاشزم رائج نہیں ہوئی ہے۔

ایک خاتون دوست نے جن کی رائے کی میں قدر کرتا ہوں مجھے لکھا تھا کہ اخبارات میں تمہارے بعض مضامین کا زور دیکھ کر مجھے ذرا تعجب سا ہوا کہ تم تو بالکل کٹ کھنے ہوتے جاتے ہو۔ میں نے سوچا کہ کیا یہ کیفیت اس وجہ سے ہوگئی ہے کہ مجھے مایوسیاں ہوئی ہیں۔ شاید کسی حد تک تو یہ بات صحیح ہے اس لئے کہ قومی حیثیت سے تو ہم سب ہی لوگ مایوسی کے مرض میں مبتلا ہیں اور انفرادی طور پر بھی میرے نزدیک یہ بات ضرور صحیح ہوگی لیکن خود مجھے اس کا پورا پورا احساس نہ تھا شاید اس وجہ سے کہ ذاتی طور پر مجھے اپنی ناکامی یا درماندگی کا مطلق کوئی خیال ہی نہیں پیدا ہوا۔ سیاسی حیثیت سے گاندھی جی کا میرا ساتھ جب سے ہوا ہے میں نے کم از کم ایک بات ان سے ضرور سیکھی ہے کہ نتائج کے ڈر سے اپنے خیالات کو اپنے دل میں دبائے نہ رکھوں سیاسی میدان میں اس عادت سے (دوسرے میدانوں میں تو کم ازکم اس پر عمل کرنا زیادہ خطرناک ہے) مجھے بسا اوقات بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس سے بڑا اطمینان بھی ملا ہے اور میرا خیال ہے کہ اسی عادت کی بدولت ہم میں سے اکثر لوگ قلبی تکلیف اور رنج سے اور بدترین قسم کی مایوسیوں سے بچ گئے ہیں۔ یہ معلوم کرکے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کسی سے محبت کرتی ہے بڑا تشفی بخش اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور احساس شکست اور مایوسی کے مرض کے لئے یہ بڑا تریاق بھی ہے۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ تکلیف دہ

احساس انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے، اور سبھوں نے اس کو فراموش کر دیا ہے۔

اس سب کے باوجود انسان کو اس رنج و محن کی عجیب و غریب دنیا میں بھلا احساس مایوسی سے کس طرح مفر ہو سکتا ہے۔ بار بار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام غلط ہو رہا ہے اور اگر چہ کام جیسے تیسے جاری رہتا ہے اور پھر بھی جب ہم اپنے اردگرد کی انسانی خلقت کے خصائل پر نظر ڈالتے ہیں تو طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ بسا اوقات مختلف واقعات اور حالات پر بلکہ اشخاص اور جماعتوں پر بھی غم اور غصہ کے جذبات طاری ہوتے ہیں اور اب کچھ عرصہ سے تو میرا غصہ اور برہمی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ جب میں زندگی کے متعلق لوگوں کے آرام طلب طرز عمل کو دیکھتا ہوں نیز یہ کہ کس طرح اہم ترین امور سے چشم پوشی کی جاتی ہے بلکہ ان کا ذکر تک اس لئے نامناسب خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا اثر یا تو کسی کی جیب پر پڑتا ہے یا مرغوب خاطر تعصّبات پر، لیکن باوجود اس غصہ اور برہمی کے اور باوجود مایوسیوں کے اور اپنے کٹ کھنے ہونے کے اپنے متعلق مجھے یہ حسن ظن ضرور ہے کہ خود اپنی اور دوسروں کی حماقتوں پر ہنسنے اور قہقہے لگانے کی خداداد قابلیت مجھ میں ہنوز مفقود ہوئی ہے۔

ایک رحیم و کریم خدا پر لوگوں کا ایمان دیکھ کر مجھے بعض اوقات بہت تعجب ہوتا ہے کہ پیہم دھچکوں کے بعد یہ کس طرح قائم رہتا ہے اور کس طرح خود تباہیاں اور بربادیاں اور ایسی باتیں جن سے صفت رحیمی کا بطلان ہو صحت ایمان اور اعتقاد کی پختگی جانچنے کے لئے بس آزمائشیں سمجھی جاتی ہیں، رچرڈ ہاپکنس کے اندر سرور انگیز اشعار کی صدائے بازگشت اکثر قلب محسوس کرتے ہوں گے۔

"اے میرے مولا اگر میں تیرے ساتھ تکرار کرتا ہوں تو حق
تیری طرف ہے لیکن جس بات کے لئے میں لڑتا ہوں وہ بھی تو حق

بجانب ہے؟ آخر تیرے گنہگار بندوں کے طور طریقے اس دنیا میں کیوں کامیاب ہوتے ہیں اور میری تمام سعی اور کوششیں مایوسی اور ناکامی پر کیوں ختم ہو جاتی ہیں تو جو میرا دم ساز ہے اگر تو بھی میرا دشمن ہوتا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تو اس سے زیادہ اور کون سی برائی میرے ساتھ کرتا جو تو مجھے شکست دینے اور کامیابی سے روکنے کے لئے کرتا ہے؟ افسوس کہ شراب میں مدہوش رہنے والے اور ہوا و ہوس کے بدمست بندے فارغ اوقات میں زیادہ خوش اور اطمینان سے رہتے ہیں جتنا کہ یہ عاجز بندہ جو تیری راہ میں اپنی ساری عمر گنوا رہا ہے۔"

اعتقاد خواہ ترقی پر ہو خواہ کسی تحریک اور نصب العین پر یا انسانی کی نیکی اور انسانی تقدیر پر، کیا یہ سب قریب قریب اعتقاد الٰہی سے ملتے جلتے نہیں؟ اگر ہم ان کی توجیہ عقل سے اور منطق سے کرنا چاہیں تو فوراً مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں، لیکن ہمارے سینوں میں کوئی چیز ہے جو اس اعتقاد اور آس کو پکڑے رہتی ہے ورنہ اگر زندگی اس سے بھی محروم کردی جائے تو پھر وہ ایک ایسے دشت ویراں کے مانند ہو جائے جس میں کوئی نخلستان تک نہ ہو۔

میرے اشتراکی پروپیگنڈے کا جو اثر ہوا اس سے میرے ورکنگ کمیٹی کے رفقائے کار بھی گھبرا گئے۔ میں تو کئی سال سے یہ پروپیگنڈ جاری رکھ سکتا ہوں۔ اس لئے مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ بعض اراکین ورکنگ کمیٹی کی رائے میں مجھے یہ آزادی حاصل نہ تھی اور وہ برہم تھے کہ میں ان کے متعلق بھی غلط فہمی پیدا کررہا ہوں، لیکن میں اس کے علاوہ اور کیا کرتا؟ میں اس چیز کو ترک نہیں کرسکتا تھا جس کو میں اپنے کام کا سب سے زیادہ اہم جزو سمجھتا تھا بلکہ اگر ان دونوں میں کوئی تصادم ہوتا تو میں شاید یہ گوارا کرتا کہ ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو جاؤں لیکن میں

استعفے کیسے دیتا جب کہ ورکنگ کمیٹی خلاف قانون جماعت تھی اور باقاعدہ طور پر اپنے فرائض منصبی تک ادا نہیں کرتی تھی۔

یہی دشواری ایک بار پھر بعد میں پیش آئی۔ غالباً دسمبر کا یہ آخری زمانہ تھا جب گاندھی جی نے مجھے مدراس سے خط لکھا اور اخبار مدراس میل کا ایک تراشہ بھیجا جس میں ان کی وہ گفتگو نقل کی گئی تھی جو اخبار مذکور کے نمائندہ سے انہوں نے کی تھی۔ نمائندہ نے میرے متعلق ان سے دریافت کیا تھا اور انہوں نے جواب میں میری کاروائیوں کے متعلق تقریباً اظہار افسوس کیا تھا لیکن میری دیانتداری کے متعلق اپنا پورا اعتماد ظاہر کیا تھا کہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کانگریس کو ان جدید طریقوں کا پابند بناؤں میرے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا اس پر خصوصیت کے ساتھ مجھے کوئی گمان نہیں گزرا لیکن جس بات نے مجھے زیادہ پریشان کیا وہ یہ تھی کہ اس گفتگو کے دوران میں آگے چل کر گاندھی جی نے بڑی بڑی زمینداریوں کے نظام کی حمایت کی تھی۔ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ یہ نظام ہماری دیہی اور قومی معیشت کا ایک مفید حصہ ہے۔ مجھے اس سے سخت حیرت ہوئی اس لئے کہ آج کل بڑی زمینداریوں اور تعلقداریوں کے حامی بہت کم ملیں گے۔ دنیا بھر میں ان کا خاتمہ ہو چکا ہے اور ہندوستان میں بھی اکثر لوگ یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ زیادہ عرصے تک یہ باقی نہیں رہ سکتی۔ خود زمیندار اور تعلقہ دار خوش ہوں گے اگر یہ نظام ختم کر دیا جائے بشرطیکہ اس کا معقول معاوضہ ملے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ نظام خود اپنے ہی بوجھ سے دب کر ڈوب رہا ہے پھر بھی گاندھی جی اس کے حامی ہیں اور اس کی تولیت وغیرہ کے متعلق گفتگو کرتے رہے، میں نے پھر اس بات پر غور کیا کہ ان کا مطمع نظر مجھ سے کس قدر مختلف ہے اور اس فکر میں پڑ گیا کہ آئندہ کہاں تک میرا اور ان کا اشتراک عمل ہو سکے گا۔ کیا ورکنگ کمیٹی میں میرا رہنا بدستور ضروری ہے؟ اس وقت تو اس کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا اور چند ہفتہ بعد

میرے جیل خانہ واپس جانے کی وجہ سے یہ سوال ہی بے محل ہوگیا۔

خانگی معاملات نے میرا بہت سا وقت لے لیا، والدہ کی صحت رو بہ ترقی رہی مگر بہت آہستہ آہستہ وہ اب بھی صاحب فراش تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے مالی معاملات کی طرف متوجہ ہوا جو ایک عرصہ سے بالکل ابتری میں پس پشت پڑے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اپنی استطاعت سے بہت زیادہ خرچ کرتے چلے جا رہے تھے اور اخراجات کم کرنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی کہ اخراجات آمدنی کے مطابق ہو جائیں بلکہ میں تو خوشی کے ساتھ اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب میرے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ جدید دنیا میں روپیہ پیسہ اور املاک مفید ضرور ہیں لیکن اکثر اوقات اس شخص کے لئے جو ایک طول طویل سفر کی ٹھان رہا ہو یہ بار بھی بن جاتے ہیں۔ روپے پیسے والے لوگوں کے لئے ایسے کاموں میں حصہ لینا بہت مشکل ہو جاتا ہے جن میں خطرات ہوں۔ انہیں ہمیشہ اپنے مال واسباب کے ضائع ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ایسے زرو مال اور جائیداد سے فائدہ ہی کیا کہ حکومت جب چاہے اس پر قبضہ کر لے اور زبردستی اسے بحق سرکار ضبط کرلے؟ اس لئے جو کچھ تھوڑا بہت میرے پاس ہے اس سے گویا چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہم لوگوں کی ضروریات بہت تھوڑی تھیں اور مجھے پورا اعتماد تھا کہ میں اپنی قابلیت سے اتنا کما سکتا ہوں۔ مجھے صرف اتنی فکر تھی کہ والدہ کو اخیر عمر میں کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے اور انکے معیار زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہ ہونے پائے۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ میری لڑکی کی تعلیم میں جس کے لئے یورپ کا قیام میرے خیال کے بموجب ضروری تھا کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو، اس کے علاوہ روپیہ کی کوئی خاص ضرورت نہ مجھے تھی نہ میری بیوی کو، یا یوں کہا جائے کہ ایسا ہم لوگوں کا خیال تھا کہ صحیح معنوں میں کبھی روپیہ پیسہ کی تکلیف اٹھانے کی ہم لوگ عادی نہیں رہے تھے، چنانچہ مجھے یہ یقین ہے کہ جب وہ وقت آجائے گا کہ ہم

کو بھی روپے کی قلت محسوس ہوتو ہم اس سے خوش نہ ہوں گے۔ اور ایک اسراف جس کو میں نے ابھی تک جاری رکھا ہے اس کو ترک کرنا میرے لئے بہت مشکل ہو جائے گا اور یہ کتابوں کی خریداری ہے۔

اپنی مالی حالت فوری طور پر درست کرنے کی غرض سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ بیوی کے زیورات، چاندی کی یا اسی قسم کی اور چیزیں جو ہمارے پاس تھیں اور اس کے علاوہ کئی چھکڑوں بھر مختلف قسم کا سامان گرہستی فروخت کر دیا جائے۔ زیورات علیحدہ کر دینے کی تجویز کملا کو پسند نہ تھی حالانکہ گزشتہ دس بارہ سال سے اس نے ایک زیور بھی نہیں پہنا تھا، سب بنک میں رکھے ہوئے تھے لیکن اس کی یہ آرزو تھی کہ یہ سب اپنی بیٹی کے حوالے کر دے۔

یہ جنوری ۳۲ء کا زمانہ تھا۔ ضلع الہ آباد کے دیہاتوں میں ہمارے کارکنوں کے بے ضرر مشاغل کے باوجود ان کی مسلسل گرفتاریوں کا تقاضا یہ تھا کہ ہم لوگ بھی ان کے نقش قدم پر جائیں اور انہیں دیہاتوں کا دورہ کریں۔ صوبہ متحدہ کی صوبہ کانگریس کمیٹی کے بہت ہی کام کرنے والے سیکرٹری رفیع احمد قدوائی بھی جیل میں تھے، ۲۶ جنوری کو یوم آزادی بھی قریب آرہا تھا اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے کہ باوجود آرڈیننس اور امتناعی احکام کے ۱۹۳۰ء سے یہ دن ہر سال پابندی کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں منایا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملہ میں رہنمائی کون کرے؟ اور پھر یہ کہ لوگوں کو ہدایت کس بات کی دی جائے۔ میرے علاوہ اور کوئی تھا نہیں جو آل انڈیا کانگریس کے عہدہ دار کی حیثیت سے عملی نہ سہی نظری طور پر بھی فرائض منصبی ادا کر رہا ہو۔ میں نے چند احباب سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے اس پر اتفاق نہ تھا۔ عام رجحان خیال میں نے یہ دیکھا کہ ایسی کاروائیوں سے اجتناب کیا جائے جن کی وجہ سے وسیع پیمانہ پر گرفتاریاں عمل میں آئیں، بالاخر یوم آزادی منانے کے متعلق میں نے ایک مختصر اپیل شائع کی اور یہ معاملہ کہ کس

صورت یہ دن منایا جائے، مقامی طور پر ہر علاقہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ خود الہ آباد میں ہم لوگوں نے تمام ضلع میں وسیع پیانہ پر یوم آزادی منانے کا اہتمام کیا۔

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ جشن یوم آزادی کے منتظمین اس دن گرفتار ہو جائیں گے۔ اس لئے قبل اس کے کہ میں جیل خانہ واپس جاؤں، میں بنگال کا ایک دورہ کرنا چاہتا تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں اپنے قدیم رفقائے کار سے وہاں ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن اصل غرض یہ تھی کہ گذشتہ چند سال سے اہل بنگال جو مصائب برداشت کر رہے ہیں اس کی داد دی جائے اور اس طریقہ سے اعتراف کیا جائے۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی اعانت اور مدد کے لئے میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے اور محض اظہار ہمدردی اور شرکت غم سے کچھ بہت فائدہ نہیں پہنچتا تاہم یہ بھی غنیمت ہے اور اس وقت بنگال خصوصیت کے ساتھ اپنی کسمپرسی کو محسوس کر رہا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ مصیبت کے وقت میں پورے ہندوستان نے اسے فراموش کر دیا۔ ان کا یہ خیال صحیح تو نہ تھا مگر بہر حال وہ سمجھتے یہی تھے۔

مجھے کملا کے ساتھ کلکتہ اس لئے بھی جانا تھا کہ وہاں اس کے علاج کے متعلق ڈاکٹروں سے مشورہ کروں۔ اس کی حالت کسی طرح بھی قابل اطمینان نہ تھی لیکن ہم دونوں نے ایک حد تک اس کی کوئی پرواہ نہ کی تھی اور کلکتہ یا کسی دوسری جگہ جانے کا خیال ملتوی کر رکھا تھا کہ جہاں زیادہ مدت تک علاج کے لئے ٹھہرنا پڑے۔ جیل خانہ کے باہر میری تھوڑے دنوں کی رہائی کے زمانہ میں ہم دونوں چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، پھر جب میں جیل خانہ چلا جاؤں گا تو ڈاکٹروں سے ہر مشورہ اور علاج کے لئے اس کو بہت کافی وقت ملے گا، اور اب چونکہ گرفتاری کا وقت بظاہر قریب آ گیا تھا اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کلکتہ جا کر اپنی موجودگی میں کم از کم ڈاکٹروں کو دکھلا دیا جائے باقی بعد میں ہوتا رہے گا۔

چنانچہ میں اور کملا نے ۱۵ جنوری کو کلکتہ جانا طے کیا اور یہ ارادہ تھا کہ ایسے وقت

پر واپس آجاؤں کہ یوم آزادی کے جلسوں میں شریک ہوسکیں۔

ا۔مسٹر پی، ان۔ٹگور صدر مجلس استقبالیہ آل بنگال زمیندار کانفرنس نے اپنے خطبہ صدارت میں ۲۳ دسمبر ۱۹۳۴ کو کہا تھا۔ کہ ذاتی طور پر مجھے اس دن بالکل افسوس نہ ہوگا۔ جب زمینداروں کو مناسب معاوضہ دے کر جائدادیں قومی ملک بنالی جائیں جیسا کہ آئرستان میں کیا گیا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ بندوبست استمراری کی وجہ سے بنگال کے زمیندار دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں جہاں بندوبست استمراری نہیں ہے زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ لیکن مسٹر پی، ان ٹیگور کے خیالات زمینوں کو قومی ملکیت بنانے کے متعلق بہت مبہم معلوم ہوتے ہیں۔

زلزلہ

۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو سہ پہر کے وقت میں الہ آباد میں اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑا کسانوں کی ایک جماعت سے باتیں کر رہا تھا۔ سالانہ ماگھ میلہ شروع ہو چکا تھا اور دن بھر ہمارے یہاں ملنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ دفعتہً میرے پیر لڑکھڑانے لگے مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اور قریب کے ایک کھمبے کا سہارا لینا پڑا۔ سارے گھر کے کواڑ دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ سوراج بھون قریب ہی تھا وہاں سے ایک گھڑگھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی اس لئے کہ بہت سے کھپرے لڑھک لڑھک کر چھت کے نیچے گر رہے تھے۔ مجھے زلزلے سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا اس لئے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے مگر پھر فوراً ہی خیال آیا کہ یہ زلزلہ ہے۔ مجھے اس نئے تجربے میں ایک طرح کا لطف آ رہا تھا میں سلسلہ گفتگو جاری رکھا اور کسانوں کو زلزلہ کا حال بتانے لگا۔ میری بوڑھی چچی کچھ دور سے چلائیں کہ بھاگ کر باہر چلے جاؤ مگر مجھے یہ بات مہمل معلوم ہوئی۔ میں نے زلزلے کو کوئی اہمیت نہ دی اور پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا میں اپنی بوڑھی ماں کو جو کوٹھے پر بستر علالت پر پڑی ہوئی تھیں اور اپنی بیوی کو جو غالباً وہیں سامان سفر باندھ رہی تھی چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر کرتا۔ کچھ دیر جھٹکوں کا سلسلہ جاری رہا پھر ختم ہو گیا۔ چند منٹ زلزلہ کے موضوع پر گفتگو رہی اس کے بعد قریب قریب سب اسے بھول گئے۔ اس وقت ہمیں سان گمان بھی نہ تھا کہ ان چند لمحوں میں بہار اور دوسرے مقامات پر لاکھوں آدمیوں پر کیا کچھ گذر گئی۔

اسی دن شام کو میں اور کملا کلکتے روانہ ہو گئے۔ رات کو ہم بے خبری کی حالت میں زلزلہ کے جنوبی رقبے میں ہو کر گذرے۔ دوسرے دن اس حادثے کا کلکتہ میں کچھ چرچا نہیں تھا۔ اگلے دن تھوڑی تھوڑی خبریں آنے لگیں۔ چوتھے دن ہمیں اس ہولناک حادثہ کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ کلکتہ پہنچتے ہی ہم اپنے کاموں میں مشغول

ہو گئے بہت سے ڈاکٹروں سے متعدد مرتبہ ملے اور یہ قطعی طور پر طے کیا گیا کہ کملا علاج کے لئے مہینے دو مہینے بعد واپس آئے گی۔ بہت سے احباب اور کانگریسی رفقاء ایسے تھے جن سے ایک مدت سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ہر جگہ ایک افسردگی کی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ لوگ بڑی مصیبتیں اٹھا چکے تھے اس لئے اب قریب قریب کام کے لئے قدم اٹھاتے ڈرتے تھے کہ کہیں انہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہاں کے اخبارات ہندوستان کے دوسرے مقامات کے مقابلے میں زیادہ محتاط تھے۔ اور مقامات کی طرح یہاں بھی لوگ آئندہ کام کے براے میں شبہے اور الجھن میں پڑے ہوئے تھے۔ اصل میں یہی شبہات ہر قسم کی سیاسی جدوجہد میں مانع تھے ورنہ خوف کچھ زیادہ نہ تھا۔ ایک طرف فاشستی رجحانات تھے دوسری طرف اشتراکی اور اشتمالی رجحانات مگر سب مبہم تھے اور ایک دوسرے سے غلط ملط ہو گئے تھے۔ ان جماعتوں کی حدود معین کرنا بہت دشوار تھا۔ میرے پاس اتنا وقت تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ تخویفی تحریک کے متعلق کچھ زیادہ دریافت حال کرسکوں جس کی طرف حکومت اس قدر متوجہ تھی اور دنیا بھر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھی۔ جہاں تک مجھے اندازہ ہو سکا یہ تحریک کوئی سیاسی اہمیت نہیں رکھتی اور خود اس جماعت کے پرانے ارکان اب اس کے قائل نہیں رہے۔ ان کے خیالات کا رخ بدل گیا ہے البتہ بنگال میں حکومت کے تشدد سے مشتعل ہو کر کہیں کہیں بعض افراد اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ایک ذاتی لڑائی سی چھڑ گئی۔ سچ پوچھئے تو دونوں کے طرز عمل میں جنگ انتقام کا رنگ تھا۔ تخویف پسندوں کی حرکتوں میں تو یہ رنگ بالکل ظاہر تھا۔ حکومت کی طرف سے بھی یہ نہیں تھا کہ ان حرکتوں کو خلاف معاشرت جرائم سمجھ کر سکون کے ساتھ ان کے انسداد کی تدبیریں سوچی جائیں بلکہ وہی صورت تھی جیسے انتقام جنگ میں حریفوں سے بدلہ لیا جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر حکومت جس کو تخویفی حرکتوں سے سابقہ پڑے گا اس پر مجبور ہوگی کہ ان کا مقابلہ اور انسداد کرے مگر حکومت کی

شان یہ ہے کہ اطمینان اور وقار کے ساتھ ان مشکلات پر قابو حاصل کرے نہ یہ کہ بلا تفریق مجرموں اور بے گناہوں، بلکہ زیادہ تر بے گناہوں پر کیونکہ ان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے حد سے زیادہ تشدد شروع کر دے۔ شاید ایسے خطرے کے وقت اوسان قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ تخویف کی حرکتیں بہت ہی کم ہوتی جاتی تھیں لیکن ان کا امکان ہر وقت موجود تھا اور جن لوگوں کو ان سے سابقہ تھا انہیں بدحواس کرنے کے لئے یہی بات کافی تھی یہ ظاہر ہے کہ یہ حرکتیں خود مرض نہیں بلکہ مرض کی علامتیں ہیں اور اصل مرض کو چھوڑ کر علامات کا علاج کرنا بے سود ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ بہت سے نوجوان مرد اور عورتیں جن کی بابت یہ بات سمجھا جاتا ہے کہ انہیں تخویف پسندوں سے تعلق ہے، حقیقت میں اس وجہ سے ان کی طرف کھنچتے ہیں کہ خفیہ کاروائیوں میں ایک خاص کشش ہوتی ہے۔ من چلے نوجوانوں کی طبیعتیں ہمیشہ چھپی ہوئی باتوں اور خطرات کی جانب مائل ہوتی ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ حالات سے باخبر ہوں اور پتہ چلائیں کہ یہ شور و غوغا کس بات کا ہے اور میں پس پردہ کون لوگ کام کر رہے ہیں۔ گویا جاسوسی کے قصوں کا ذوق انہیں کھینچتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ ارادہ ہرگز نہیں ہوتا کہ خود بھی کچھ کریں خصوصاً کسی تخویفی حرکت سے انہیں قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن پولیس کے نزدیک صرف ان کا مشتبہ لوگوں سے ربط ضبط رکھنا اس کے لئے کافی ہے کہ وہ بھی مشتبہ قرار دئے جائیں۔ اس لئے تھوڑے دن کے بعد اگر وہ اور زیادہ سخت مصیبت میں گرفتار نہ ہو گئے تو نظر بندوں کے کیمپ میں پہنچ جاتے ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قابل فخر کارناموں میں سے ایک کارنامہ نظم کا قیام اور قانون کا نفاذ ہے۔ میں بھی طبعاً امن پسند ہوں۔ ضبط و نظم کو اچھا سمجھتا ہوں اور بدامنی اور ابتری کو برا سمجھتا ہوں لیکن تلخ تجربات کی بنا پر اس نظم و قانون کی قدر و قیمت مجھے مشکوک نظر آتی ہے جو سلطنتیں اور حکومتیں رعایا پر

نافذ کرتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے وہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قانون کے معنی ہیں غالب طبقہ کی مرضی اور نظم نتیجہ ہے اس عام خوف کا جو سب پر طاری ہے۔ سچ پوچھئے تو بعض اوقات اس نام نہاد نظم و آئین کو بے نظمی اور بے آئینی کہنا زیادہ صحیح ہے۔ جس کارنامے کی بنیاد عام خوف و دہشت پر ہو اس کو مشکل سے پسندیدہ کہا جا سکتا ہے اور جو امن حکومت کے آلات جبر پر مبنی ہو اور بغیر ان کے قائم نہ رہ سکتا ہو وہ بمقابلہ آئینی حکومت کے فوجی تسلط سے زیادہ مشابہ ہے۔

راج ترنگنی ایک ہزار سال کی پرانی اور کلہان شاعر کی لکھی ہوئی کاشمیری تاریخی نظم ہے اس میں جو الفاظ نظم و قانون کے معنی میں بار بار آتے ہیں جن کا قائم رکھنا حکمران اور حکومت کا فرض قرار دیا گیا ہے وہ دھرم اور ابھائے ہیں یعنی راست بازی اور بے خوفی۔ یہاں قانون معمولی قانون سے برتر چیز ہے اور نظم رعایا کی بے خوفی کا نام ہے۔ لوگوں کو خوف زدہ کر کے نظم قائم کرنے کے بجائے بے خوفی کی تلقین کرنے کا خیال کتنا پاکیزہ ہے۔ کلکتے میں ہم لوگوں کے ساڑھے تین دن صرف ہوئے اور اس عرصے میں میں نے تین عام جلسوں میں تقریریں کیں۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی میں نے تخویف کی مذمت کی اور اس کے خلاف دلائل پیش کئے۔ اس کے بعد ان تدابیر سے بحث کی جو صوبہ بنگال میں حکومت نے اختیار کی تھیں۔ میں نے بڑے جوش میں تقریر کی کیونکہ اس صوبے میں جو واقعات پیش آ چکے تھے ان کے حالات سن کر میں بہت متاثر تھا۔ مجھے اس طرز عمل سے حد درجہ تکلیف پہنچی کہ انسانوں کے گروہ بلا تفریق بھیڑ بکری کی طرح باڑوں میں بند کر دیئے گئے۔ یہ انسانی وقار کی توہین تھی۔ سیاسی مسئلہ کتنا ہی اہم سہی مگر یہ انسانی مسئلہ اس وقت اس سے مقدم تھا۔ یہی تین تقریریں تھیں جی کی بنیاد پر بعد کو مجھ پر کلکتہ میں مقدمہ چلایا گیا اور وہ سزا جو آج میں کاٹ رہا ہوں انہیں کی وجہ سے ہوئی۔

کلکتہ سے ہم لوگ رابندرناتھ ٹیگور سے ملنے شانتی نکیتن گئے۔ ان سے مل کر

ہمیشہ طبیعت کو فرحت ہوتی تھی اس لئے اس قدر قریب آجانے کے بعد ہمارا جی نہ مانا کہ ان سے ملے بغیر چلے جائیں۔ اس سے پہلے میں دو بار شانتی نکیتن آچکا تھا۔ کملا پہلے پہل آئی تھی اور اس مدرسے کو دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ ہم لوگ یہ ارادہ کر رہے تھے کہ اپنی لڑکی کو وہاں بھیج دیں۔ اندرا کچھ دنوں میں میٹریکولیشن کے امتحان میں شریک ہونے والی تھی اور اس کی آئندہ تعلیم کا مسئلہ ہمیں پریشان کر رہا تھا۔ میں اس کے بالکل خلاف تھا کہ وہ کسی باقاعدہ سرکاری یا نیم سرکاری یونیورسٹی میں داخل ہو کیونکہ ان یونیورسٹیوں کو میں ناپسند کرتا تھا۔ ان کا ماحول بالکل سرکاری، جابرانہ اور تحکم پسندانہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ زمانہ میں ان یونیورسٹیوں نے بڑے بڑے قابل مرد اور عورتیں پیدا کی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ لیکن یہ چند مستثنیات ان یونیورسٹیوں کو اس الزام سے نہیں بچا سکتیں کہ وہ نوجوانوں کے لطیف احساسات کو کچل دیتی ہیں۔ شانتی نکیتن نے اس استبداد سے بچنے کی صورت نکالی تھی۔ اس لئے ہم نے اسی کو منتخب کیا، اگرچہ بعض باتوں کے لحاظ سے وہ دوسری یونیورسٹیوں سے پیچھے تھا۔

واپسی پر ہم پٹنہ میں ٹھہرے کہ زلزلے کے مصائب سے نجات دلانے کے مسئلے میں راجندر بابو سے گفتگو کریں۔ وہ ابھی جیل سے چھوٹے تھے اور غیر سرکاری طور پر امداد پہنچانے کا کام لامحالہ انہیں کو شروع کرنا پڑا۔ ہم لوگوں کا وہاں پہنچنا بالکل خلاف توقع تھا اس لئے کہ ہمارا کوئی تار انہیں نہیں پہنچا تھا۔ جس مکان میں ہم کملا کے بھائی کے ساتھ ٹھہرنے والے تھے وہ ایک کھنڈر بن گیا تھا۔ یہ بہت بڑا پختہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس لئے ہم لوگوں نے بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح میدان ہی میں قیام کیا۔

دوسرے دن میں مظفر پور دیکھنے گیا۔ زلزلے کو پورے سات روز گذر چکے تھے لیکن سوائے چند خاص خاص سڑکوں کے اور دوسرے مقامات سے ملبہ اٹھانے کا

بہت تھوڑا کام کیا گیا تھا۔ ان سڑکوں کی صفائی کے وقت لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ بعض لاشوں سے عجیب وغریب انداز نمایاں تھا گویا وہ گرتی ہوئی دیوار یا چھت کو اپنے جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بربادی کا یہ منظر نہایت موثر اور ہولناک تھا جو لوگ بچ رہے تھے انہیں ان دلدوز تجربات نے بالکل پست کر دیا تھا۔

الہ آباد واپس پہنچنے کے بعد روپے اور سامان کی فراہمی کا انتظام فوراً شروع کر دیا گیا اور ہم سب خواہ کانگرسی ہوں یا غیر کانگرسی اس میں سرگرمی سے شریک ہو گئے۔ میرے بعض ساتھیوں کی رائے تھی کہ زلزلے کی وجہ سے یوم آزادی منانا ملتوی کر دینا چاہئے لیکن دوسرے ساتھیوں کو اور خود مجھے اس کی کوئی معقول وجہ نظر نہ آئی کہ زلزلے کی وجہ سے ہم اپنا پروگرام بدل دیں۔ چنانچہ ۲۶ جنوری کو ضلع الہ آباد میں دیہات میں متعدد جلسے ہوئے اور ایک جلسہ شہر میں بھی ہوا۔ ان سب میں ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ توقع تھی کہ پولیس مداخلت کرے اور گرفتاریاں عمل میں لائے گی۔ چھوٹے پیانہ پر کچھ مداخلت ہوئی بھی لیکن ہم لوگوں کو اس سے بہت تعجب ہوا کہ جلسے کے بعد ہم لوگ کس طرح گرفتاری سے بچ گئے۔ ہمارے یہاں کے بعض گاؤں میں اور بعض شہروں میں کچھ گرفتاریاں ہوئیں بھی۔

بہار سے واپسی کے بعد ہی زلزلہ کے بارے میں میں نے ایک بیان شائع کیا جس کے آخر میں سرمائے کی فراہمی کی درخواست تھی، اس بیان میں میں نے حکومت بہار کے اس تساہل پر نکتہ چینی کی جو اس نے زلزلہ کے بعد ابتدائی چند دنوں میں کیا۔ میرا منشا ان حکام کی نکتہ چینی کرنا نہ تھا جو زلزلے کے علاقوں میں موجود تھے۔ ان کو ایسے سخت اور مشکل حالات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا جن سے مضبوط طبیعت کا آدمی بھی گھبرا جاتا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے بعض الفاظ کا یہ مطلب بھی نکل سکتا تھا لیکن اس کا مجھے یقیناً دل سے صدمہ تھا۔ بہار کے اعلیٰ حکام نے ابتداً کچھ زیادہ

قابلیت کا ثبوت نہیں دیا۔ خاص کر ملبے کے ہٹانے میں، کیونکہ اگر وہ ہٹا دیا جاتا تو بہت سی جانیں بچ جاتیں۔

اکیلے مونگو شہر میں ہزارہا آدمی مر گئے اور تین ہفتے گذرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ملبہ ایک بہت بڑی مقدار میں اب بھی پڑا ہوا ہے جس میں ہاتھ تک نہیں لگایا گیا۔ حالانکہ چند ہی میل کے فاصلے پر جمال پور میں کئی ہزار ریلوے مزدوروں کی بستی موجود تھی جس سے اس حادثے کے چند ہی گھنٹے بعد یہ کام لیا جا سکتا تھا۔ زلزلہ کے بارہ دن بعد بھی آدمی زندہ برآمد ہوئے۔ حکومت نے جائداد کی حفاظت کی فوری تدابیر اختیار کیں لیکن جو لوگ دبے پڑے ہوئے تھے ان کی جانیں بچانے میں اتنی عجلت نہیں کی۔ میونسپلٹیوں کا کام ان علاقوں میں بالکل بند تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرا اعتراض بالکل ٹھیک تھا اور بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ زلزلے کے رقبہ میں رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس سے متفق تھی۔ لیکن چاہے یہ نکتہ چینی صحیح ہو یا نہ ہو ایمانداری سے ضرور کی گئی تھی اور اس کا مقصد حکومت پر الزام نہیں لگایا کہ اس نے قصداً غلط طریقے سے کام کیا یا جان بوجھ کر غفلت برتی۔ یہ ایک بالکل نیا اور بہت سخت موقع تھا اس لئے یہ غلطیاں درگذر کے قابل تھیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے (کیونکہ میں جیل میں تھا) حکومت بہار نے بعد کو محنت اور قابلیت سے زلزلہ کی تباہ کاریوں کی تلافی کا کام انجام دیا۔

لیکن میری نکتہ چینی سے ناراضگی پیدا ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بہار کے چند لوگوں نے حکومت کی حمایت میں ایک بیان شائع کر دیا جو میرے اعتراضات کا گویا جواب تھا۔ اس میں زلزلے اور اس کی ضرورتیں ان کے لئے محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ اہم بات یہ تھی کہ حکومت کی نکتہ چینی کی گئی اس لئے وفادار رعایا کا فرض تھا کہ اس کی صفائی پیش کرے۔ یہ ایک دلچسپ مثال ہے اس عجیب و غریب چیز کی جو ہندوستان میں بہت عام ہے یعنی حکومت پر نکتہ چینی کرنا گناہ

سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مغربی ممالک میں یہ معمولی بات ہے۔ یہ فوجی ذہنیت ہے جو نکتہ چینی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ بادشاہ کی طرح ہندوستان میں حکومت برطانیہ اور اس کے تمام اعلیٰ حکام خطا سے بالاتر قرار دیئے گئے ہیں۔ اسی کسی بات کی طرف اشارہ بھی کرنا بغاوت سمجھا جاتا ہے۔

اس کا ایک عجیب وغریب پہلو یہ بھی ہے کہ حکومت پر ظلم و جور کا الزام لگانا اتنا زیادہ برا نہیں مانا جاتا جتنا نا اہلی اور قابلیت کا الزام لگانا۔ ظلم و جور کا الزام لگانے والا بے شک جیل پہنچا دیا جا سکتا ہے لیکن حکومت اس قسم کے الزامات کی عادی ہو چکی ہے اس لئے اصل میں اس کا کچھ زیادہ خیال نہیں کرتی۔ ایک حیثیت سے یہ تمام باتیں ایک حکمراں قوم کی صفات میں داخل سمجھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر اسے نا قابل اور بودا کہا جائے تو تکلیف پہنچتی ہے کیونکہ اس سے اس کی خود پسندی کی جڑیں ہل جاتی ہیں اور ہندوستان کے انگریز حکام کا ادعائے مسیحائی باطل ہو جاتا ہے۔ ان کی مثال کلیسائے انگلستان کے اس استعف کی سی ہے جو بے دین کے الزام کو صبر و تحمل سے برداشت کرتا تھا لیکن جب کوئی اس کو احمق اور نا قابل کہتا تو وہ ناراض ہوتا اور سختی سے جواب دیتا۔

انگریزوں کا عام عقیدہ ہے جس کا اعلان اکثر اس طور سے کیا جاتا ہے کہ گویا یہ ایک نا قابل انکار کلیہ ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت میں کوئی ایسا تغیر کیا گیا جس سے برطانوی اثر کم یا زائل ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت اور زیادہ ابتر اور خراب ہو جائے گی۔ انتہا پسند اور بلند نظر انگریز اس عقیدے کے باوجود جوش ہمدردی میں ہندوستانیوں کی حمایت یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اچھی حکومت اپنی حکومت کا بدل کبھی نہیں ہو سکتی اور اگر ہندوستانی اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی مارنا چاہتے ہیں تو ان کو ایسا کرنے دیا جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ برطانوی اثر کے زائل ہو جانے کے بعد ہندوستان کا کیا حشر ہوگا۔ اس کا دارومدار زیادہ تر اس پر ہے کہ

برطانیہ کس صورت سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اوراس وقت ہندوستان پر کس طبقہ کی حکومت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سے قومی اور بین الاقوامی امور قابل لحاظ ہیں۔ بالکل قرین قیاس ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی مدد سے ایسی حکومت قائم ہو جو موجودہ حکومت سے بدتر ہو، جس میں موجودہ حکومت کی تمام خرابیاں ہوں اور خوبیاں کوئی نہ ہوں مگراس سے زیادہ قرین قیاس ہے کہ ہندوستان کا نظم بالکل بدل جائے اور وہ اہل ہند کے نقطہ نظر سے موجودہ نظم سے کہیں بہتر اور مفید تر ہو۔شاید اس وقت حکومت کے جابرانہ آلات اتنے کارگر نہ ہوں اور اس کی انتظامی مشین میں یہ چمک دمک نہ ہو۔مگر یہ یقینی بات ہے کہ دولت کی پیداوار اور اس کا صرف بہت بہتر ہوگا۔اوران امور میں ترقی ہوگی جو عام لوگوں کے جسمانی، روحانی اور تمدنی معیار کو بلند کرتے ہیں۔میرا عقیدہ ہے کہ خوداختیاری کو اپنی فوقیت ثابت کرنا ہے تو لازمی طور پر اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ مفاد عامہ کے لئے بہتر ثابت ہو۔ مجھے دل سے یقین ہے کہ برطانوی حکومت کا استحقاق عہد ماضی میں جو کچھ بھی رہا ہو موجودہ زمانہ میں وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتی کہ عام لوگوں کے لئے اچھی حکومت ثابت ہو اوران کے معیار زندگی کو بلند کرسکے۔اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دن پورے ہو چکے اور اس کے فوائد جتنے کچھ بھی، ختم ہو گئے۔سچ پوچھئے تو ہندوستان کے دعوی آزادی کی بناء اسی امید پر ہے کہ آزاد حکومت بہتر حکومت ہوگی، عوام کے معیار زندگی کو بلند کردے گی ملک کی صنعت اور تہذیب کو ترقی دے گی اوراس خوف اور دہشت کی فضا کو دور کردے گی، جو ہمیشہ غیر ملکی شہنشاہی حکومت کے جلو میں ہوتی ہے۔حکومت برطانیہ اوراس کے سول سروس چاہے اتنی قوی ہو کہ اپنا حکم ہندوستان سے منوالے لیکن اس میں یہ اہلیت وقابلیت نہیں ہے کہ ہندوستان کے آئندہ مسائل کو بھی حل کرسکے اس لئے کہ اس کی بنیادیں اوراس کے تصورات سراسر غلط ہیں اور وہ حقیقی حالات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ایک

حکومت یا حکمران طبقہ جس میں کافی قابلیت نہیں ہے یا جس کی بنیادیں پائدار نہیں ہیں زیادہ عرصے تک جبر سے بھی کام نہیں چلا سکتا۔

الہ آباد میں جو انجمن بہار کے مصیبت زدوں کی امداد کے لئے قائم ہوئی تھی اس نے مجھے متعین کیا کہ میں زلزلہ کے علاقہ کا معائنہ کروں اور وہاں جو طریقے امداد پہنچانے کے اختیار کئے گئے تھے ان کی بابت رپورٹ پیش کروں۔ میں فوراتن تنہا چل کھڑا ہوا اور دس دن تک برابر برباد شدہ علاقے میں پھرتا رہا۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا اور مجھے اس عرصے میں رات کو نیند بھر سونا بھی نصیب نہیں ہوا۔ ۵ بجے صبح سے لے کر قریب قریب آدھی رات تک ہم لوگ دوڑ دھوپ کیا کرتے تھے۔ کبھی موٹر میں سوار ہو کر ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے گزرتے تھے کبھی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر ان مقامات کو پار کرتے تھے جہاں پل منہدم ہو گئے تھے اور سڑکیں سطح کے تہ و بالا ہو جانے سے زیر آب تھیں۔ شہروں اور قصبوں کا منظر کچھ کم ہیبت ناک نہ تھا۔ ان کے کھنڈر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سڑکوں میں شگاف پڑ گئے تھے اور اس قدر الٹ پلٹ گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی دیو پیکر ہاتھ نے انہیں توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ بڑے بڑے شگافوں سے پانی اور ریت پھوٹ نکلی تھی اور سیلاب زور آدمیوں اور جانوروں کو بہا لے گیا تھا مگر ان قصبات سے بھی زیادہ شمالی بہار کے میدانوں میں جنہیں گلشن بہار کہا جاتا تھا، ویرانی اور تباہی کے آثار نمایاں تھے۔ میلوں تک ریت ہی ریت نظر آتی تھی رقبے کے رقبے زیر آب تھے۔ زمین میں جا بجا بڑے بڑے شگاف اور بے شمار چھوٹے چھوٹے آتش فشاں کے سے دہانے تھے۔ جن سے یہ ریت اور پانی نکلا تھا۔ چند برطانوی افسر جو اس علاقے پر ہوائی جہازوں میں پرواز کر چکے تھے کہتے تھے کہ یہ علاقہ کچھ اس شکل سے مشابہت رکھتا ہے جو دوران جنگ میں یا اس کے فوراً بعد شمالی فرانس کے میدان جنگ کی ہو گئی تھی۔

یہ تجربہ کس قیامت کا ہوگا! لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ پہلے تو زلزلے کی لہر ایک

جانب سے دوسری جانب گزر گئی اور جتنے آدمی کھڑے تھے سب گر گئے۔ پھر ایک ہالا ڈولا آیا اور ایک گڑگڑاہٹ اور گونج پیدا ہوئی جیسے بہت سی توپیں چھوٹ رہی ہوں یا سینکڑوں ہوائی جہاز اڑ رہے ہوں۔ بے شمار مقامات پر بڑے بڑے شگافوں اور دہانوں سے پانی ابل ابل کر دس بارہ فٹ اونچا جانے لگا۔ یہ حالت غالباً تین منٹ یا اس سے کچھ ہی زیادہ رہی لیکن یہ تین منٹ قیامت کے تھے۔ کوئی تعجب نہیں اس واقعے کے بہت سے دیکھنے والے یہ سمجھے کہ اب دنیا کا خاتمہ ہے۔ شہروں میں مکانات کے گرنے کا شور برپا تھا، پانی زوروں میں بہہ رہا تھا اور فضا گرد و غبار سے مکدر تھی جس کی وجہ سے چند گز فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔ دیہاتی علاقوں میں گرد زیادہ نہیں تھی، اس لئے وہاں دور دور تک نظر پہنچ سکتی تھی مگر اس وقت کون تھا جو اطمینان سے یہ تماشا دیکھتا جو بچ گئے تھے وہ زمین پر پڑے تھے اور دہشت سے مرے جاتے تھے۔

شاید مظفر پور میں ایک بارہ سال کا کمسن لڑکا دس دن بعد کھود کر زندہ نکالا گیا وہ سخت متحیر تھا جس وقت گرتے ہوئے ملبے نے اس کو گرا کر قید کر دیا تو وہ سمجھا کہ دنیا کا خاتمہ ہو گیا ہے اور ایک وہی بچ رہا ہے۔

اسی مظفر پور میں عین زلزلے کے وقت جب مکانات گر گئے تھے اور ہر طرف سینکڑوں آدمی مر رہے تھے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ناتجربہ کار نوجوان سخت پریشان تھے اور ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ماں اور لڑکی دونوں صحیح سلامت ہیں۔ زلزلے کی یادگار میں لڑکی کا نام کمپو دیوی رکھا گیا۔

ہمارے دورے میں آخری مقام شہر مونگیر تھا۔ ہم لوگ بہت دور دور پھرے تھے اور قریب قریب نیپال کی سرحد تک پہنچ گئے تھے۔ ہم نے بہت سے ہیبت ناک سین دیکھے تھے اور ہماری آنکھیں تباہی اور بربادی کے نظارے کی عادی ہو چکی تھیں مگر جب مونگیر جیسے مرفہ الحال شہر کی کامل ویرانی پر نظر پڑی تو ہم لوگ دہشت سے

کانپ اٹھے مجھے وہ خوفناک منظر کبھی نہ بھولے گا۔

زلزلے کے علاقے میں ہر جگہ، خواہ شہر ہوں یا دیہات، باشندوں میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ بالکل مفقود تھا۔ غالباً شہر کے اوسط طبقے اس بارے میں سب سے زیادہ قصوروار تھے۔ وہ سب اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے کہ حکومت یا کوئی غیر سرکاری امدادی جماعت پہنچ کر ان کی مدد کے لئے کچھ کرے۔ بعض لوگ جنہوں نے امدادی کاموں کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں یہ سمجھتے تھے کہ کام سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کو حکم دیا جائے کہ ایسا کرو ایسا کرو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے بسی کچھ اس وجہ سے بھی پھیلی ہوئی تھی کہ زلزلے کی دہشت نے سب کو بدحواس کر دیا تھا اور یہ حالت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی ہوگی۔

اس کے مقابلے میں ان لوگوں کی ہمت اور مستعدی خاص طور پر نمایاں تھی جو امداد رسانی کا کام کرنے کے لیے بہار کے دوسرے حصوں اور غیر صوبوں سے بکثرت آرہے تھے۔ ان نوجوان مردوں اور عورتوں کے جذبہ خدمت اور کارکردگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور باوجود اس کے کہ متعدد امدادی جماعتیں جدا جدا کام کر رہی تھیں، ان میں بڑی حد تک اتحاد عمل تھا۔

میں نے مونگیر میں کوشش کی کہ ملبہ کھودنے میں لوگ اپنی مدد آپ کریں اور اس تحریک کو ابھارنے کے لئے ایک نمائشی حرکت کی۔ میں کسی قدر ہچکچاتے ہوئے یہ قدم اٹھایا مگر اس میں پوری کامیابی ہوئی۔ سب امدادی جماعتوں کے رہنما پھاوڑے اور ٹوکرے لے کر پہنچ گئے اور دن بھر کھدائی کا کام کرتے رہے۔ ہم لوگوں نے ایک کم سن لڑکی کی لاش کھود کر نکالی۔ میں تو اس دن مونگیر سے چلا آیا لیکن کھدائی ہوتی رہی اور بہت سے مقامی لوگوں نے اس کام کو اٹھالیا جس سے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

تمام امدادی جماعتوں میں سب سے زیادہ اہم مرکزی امدادی جماعت تھی جس

کے صدر راجندر پرشاد تھے۔ یہ خالص کانگریسی جماعت نہیں تھی۔ بڑھتے بڑھتے یہ آل انڈیا کی جماعت بن گئی۔ جس میں مختلف گروہوں اور معطیوں کے نمائندے شامل تھے۔ ایک خاص آسانی اس کو یہ تھی کہ وہ دیہاتی علاقوں میں کانگریس کمیٹیوں سے کام لے سکتی تھی۔ ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں سوا گجرات یا بعض اضلاع ممالک متحدہ کے، کانگریسی کارکنوں کا اتنا زیادہ گہرا تعلق اور ربط کسانوں سے نہیں ہے جتنا کہ میں نے صوبہ بہار میں دیکھا بلکہ اصل میں کانگریس کے زیادہ تر کارکن کسان ہی تھے۔ صوبہ بہار کسانوں کا صوبہ ہے اور اس صوبے کے متوسط طبقے کے لوگ بھی کسانوں میں شامل ہیں۔ کانگریس کے سیکرٹری کی حیثیت سے مجھے بارہا بہار کی صوبہ کانگریس کمیٹی کے دفتر کا معائنہ کرنے کا اتفاق ہوا اور میں نے بعض اوقات سخت الفاظ میں اس ابتری اور سستی پر اعتراض کیا جو مجھے دفتر کے کام میں نظر آئی۔ لوگ کھڑے رہنے سے زیادہ بیٹھنے اور بیٹھنے سے زیادہ لیٹنے کی طرف مائل نظر آتے تھے۔ میں نے اس سے زیادہ کوئی دفتر سازوسامان سے خالی نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ بہت سی چیزوں کے بغیر کام چلائیں جو دفتر کے معمولی لوازم میں داخل ہیں۔ مگر باوجود ان اعتراضات کے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کانگریس کے نقطہ نظر سے یہ صوبہ ملک بھر میں سب سے زیادہ مستعد اور وفادار تھا۔ وہاں کانگریس اپنے کام کی کوئی نمائش نہیں کرتی تھی لیکن اس کو کسانوں کی زبردست تائید حاصل تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں بھی بہار کے ممبر شاذونادر ہی کسی معاملے میں پیش قدمی کرتے تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں تعجب ہو کہ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ لیکن سول نافرمانی کی دونوں تحریکوں میں بہار نے نمایاں کارنامے دکھائے اور بعد کی انفرادی سول نافرمانی میں بھی اچھا کام کیا۔

کانگریس کی اس عمدہ تنظیم کی بدولت امدادی کمیٹی نے کسانوں تک پہنچنے کی صورت نکالی۔ دیہاتی علاقوں میں نہ کوئی دوسری جماعت اور نہ خود حکومت اتنی مفید

ہوسکتی تھی۔ امدادی کمیٹی و نیز صوبہ بہار کی کانگریس دونوں کے صدر راجندر بابو تھے جو بہار کے مسلمہ لیڈر ہیں۔ سرزمین بہار کے بسنے والوں کی تمام خصوصیات ان میں نمایاں ہیں۔ ان کی صورت کسانوں کی سی ہے اور پہلی نظر میں دیکھنے والا کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد ان کی آنکھیں جن سے تیزی اور صاف دلی اور ان کا چہرہ جس سے جوش اور خلوص ٹپکتا ہے دل میں گھر کرلیتا ہے۔ کوئی شخص جس نے ان آنکھوں کو اور اس چہرے کو ایک بار دیکھ لیا ہے انہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس لئے کہ ان میں صداقت کا جلوہ نظر آتا ہے، جس میں کھوٹ کا نام تک نہیں۔ کسانوں کی سی طبیعت ہونے کی وجہ سے شاید ان کا زاویہ نظر کسی قدر محدود ہے اور آج کل کے معیار سے وہ سیدھے سادھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی نمایاں قابلیت، ان کی کامل راست بازی، ان جوش عمل ان کا ہندوستان کی آزادی کے لئے جان لڑا دینا وہ اوصاف ہیں جنھوں نے ان کو نہ صرف اپنے صوبے میں بلکہ سارے ہندوستان میں محبوب بنادیا ہے۔ راہنمائی کا جو مسلمہ مرتبہ راجندر بابو کو بہار میں حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی شخص کو حاصل نہیں ہے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جن کی بابت یہ کہا جاسکے کہ انہوں نے گاندھی جی کے پیام کی حقیقی روح کو ان سے زیادہ جذب کیا ہے۔

بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان جیسا آدمی بہار کے امدادی کام کی رہنمائی کے لئے مل گیا اور یہ اس اعتماد کا نتیجہ تھا جو لوگ ان پر رکھتے تھے کہ ہندوستان بھر سے اس قدر کثیر تعداد میں روپیہ ملا۔ ان کی صحت کمزور تھی مگر وہ امدادی کام میں جٹ گئے۔ انہیں حد سے زیادہ کام کرنا پڑا۔ اس لئے کہ ساری جدوجہد کا مرکز انہیں کی ذات تھی اور ہر شخص انہیں سے ہدایت اور مشورہ لیتا تھا۔

جب میں زلزلے کے علاقے میں دورہ کررہا تھا یا شاید وہاں جانے سے ایک آدھ روز پہلے مجھے گاندھی جی کا یہ بیان پڑھ کر سخت صدمہ ہوا تھا کہ زلزلہ چھوت

چھات کی سزا ہے۔ انہوں نے یہ ایسی بات کہی کہ آدمی سر پکڑ کر بیٹھ جائے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کا جو جواب دیا وہ مجھے بہت پسند آیا اور میں اس سے لفظ بہ لفظ متفق ہوں۔ سائنس کے نقطہ نظر سے یہ بات اس قدر بعید تھی کہ اس سے بعید تر کوئی چیز تصور میں نہیں آسکتی۔ یہ مانا کہ جذباتی کیفیات یا نفسی واردات کا جو اثر مادے پر پڑتا ہے اس کے متعلق سائنس صحیح حکم لگانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی ممکن ہے کہ دماغی صدمے کے اثر سے انسان کو بدہضمی ہو جائے یا اس کے جسم پر اس سے بھی زیادہ اثر پڑے لیکن یہ کہنا کہ انسانی رسوم یا کوتاہیوں کے کوئی اثرات سطح ارضی کی حرکت پر پڑیں گے۔ سخت حیرت ناک ہے، گناہ، غضب الٰہی اور نظام کائنات میں انسان کی اہمیت کا تخیل ہم کو چند صدی پیچھے دھکیل کر اس زمانے میں لے جاتا ہے جب پورے یورپ میں کلیسا کے احتساب کا دور دورہ تھا کیورڈانو برونو عملی تحقیقات کے جرم میں ملحد قرار دے کر جلا دیا گیا تھا اور بہت سی عورتیں سحر کے الزام میں آگ میں جھونک دی جاتی تھیں۔ امریکا میں اٹھارویں صدی میں بوسٹن کے سر برآوردہ پادریوں نے میساچوسٹس کے زلزلے کا سبب اس بدعت کو ٹھہرایا تھا کہ عمارتوں پر برق ربا سلاخیں نصب کی گئی تھیں۔

اگر زلزلے کو عذاب الٰہی تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ ہمارے کس گناہ کی سزا ہم کو دی جا رہی ہے۔ کیونکہ افسوس! ہمارے گناہ لاتعداد ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی توجیہہ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سزا ہم کو اس لئے دی گئی ہو کہ ہم ایک غیر ملکی حکومت کی غلامی پر راضی ہیں یا اس لئے کہ ہم ایک ظالمانہ سماجی نظام کو برداشت کر رہے ہیں۔ مہاراجہ دربھنگہ کو جو ایک بہت بڑے زمیندار ہیں، مالی حیثیت سے زلزلے کی وجہ سے بہت برا نقصان پہنچا اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظام زمینداری کے لئے تازیانہ عبرت ہے۔ یہ اس سے زیادہ قرین قیاس ہے کہ بہار کے کم و بیش بے گناہ لوگوں کو جنوبی ہندوالوں کی

چھوت چھات کے گناہ کی سزا ملے۔ یہ سوال بھی ہوسکتا ہے کہ آخر وہ چھوت چھات کی زمین پر زلزلہ کیوں نہیں آیا؟ حکومت برطانیہ کہہ سکتی ہے کہ یہ عذاب سول نافرمانی کی وجہ سے نازل ہوا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ شمالی بہار نے جسے زلزلے سے بہت زیادہ نقصان پہنچا آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

غرضیکہ ہم اس طرح کی بے شمار قیاس آرائیاں کرسکتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ ہم قضاوقدر کے کاموں میں دخل ہی کیوں دیں اور اپنی انسانی جدوجہد سے عذاب الٰہی کے نتائج کو ہلکا کرنے کی کوشش کیوں کریں؟ پھر ہم اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ قدرت نے ستم ظریفی ہمارے ساتھ کیوں روا رکھی ہے ہمیں کمزور، اور خطا کار بنایا، ہماری راہ میں قدم قدم پر پھندے لگادیئے، دنیا کو مصیبت اور ظلم سے معمور کردیا، شیر اور بھیڑ کو پیدا کیا اور پھر ہمیں کو سزا بھی دیتی ہے۔

جب ستاروں نے اپنی شعاعوں کے نیزے پھینک دیئے
اور آسمان کو اپنے آنسوؤں سے تر کردیا
تو کیا وہ اپنی مخلوق کو دیکھ کر خوش ہوسکتا ہے؟
کیا تجھے بھی اسی نے پیدا کیا ہے جو میمنے کا پیدا کرنے والا ہے؟

میں اپنے پٹنے کے قیام کی آخری شب میں بہت رات گئے تک اپنے رفیقوں اور دوستوں سے گفتگو کرتا رہا۔ جو امدادی کام میں شریک ہونے کے لئے مختلف صوبوں سے آکر جمع ہوگئے تھے۔ ممالک متحدہ کی نمائندگی کافی تھی اور ہمارے بعض چیدہ کارکن وہاں موجود تھے۔ ہم لوگ ایک اہم مسئلے پر غور کررہے تھے۔ وہ یہ تھا کہ ہم کو زلزلہ کے امدادی کام میں کس حد تک حصہ لینا چاہئے کیونکہ اسی حد تک ہمیں سیاسی کام سے علیحدہ ہونا پڑتا۔ امدادی کام بہت محنت طلب تھا اور سرسری طور پر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر ہم اسی کے ہو رہتے تو ایک بڑی مدت تک عملی سیاسی جدوجہد سے الگ رہنا ضروری تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ سیاسی حیثیت سے ہمارے

صوبہ پر اس کا برا اثر پڑتا۔ یوں تو کانگریس کے کارکنوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ایسے لوگ جن کی شرکت اور عدم شرکت کا اثر پڑتا ہے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں اور ان کے بغیر کام چلانا مشکل تھا۔ تاہم زلزلے کے مصیبت زدوں کے تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خود میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ میں صرف امدادی کام میں منہمک ہو کر رہ جاؤں۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کام کے لئے تو بہت سے آدمی مل جائیں گے مگر دوسرا کام ذرا خطرناک ہے اس لئے بہت کم آدمی ہیں

ہم لوگ بڑی دیر تک یہی گفتگو کرتے رہے۔ پھر گزشتہ یوم آزادی کا ذکر چھڑ گیا کہ ہمارے فلاں فلاں ساتھی گرفتار ہو گئے اور ہم بچ گئے۔ میں نے ان لوگوں سے ہنسی میں کہا کہ میں نے ایسی ترکیب معلوم کر لی ہے کہ آدمی جارحانہ سیاست کے باوجود گرفتاری سے بچا رہے۔

۱۱ فروری کو میں الہ آباد واپس آیا۔ اس دورے کے بعد تھک کر چور ہو چکا تھا۔ دس دن کی سخت محنت سے میں پیلا پڑ گیا تھا اور میرے اعزاء کو میری صورت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے الہ آباد امدادی انجمن کے لئے رپورٹ لکھنے کی کوشش کی لیکن نیند غالب آ گئی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں سے کم از کم بارہ گھنٹے میں نے سونے میں گزار دیئے۔

دوسرے دن شام کے قریب میں اور کملا چائے پی چکے تھے اور پرشوتم داس ٹنڈن ہم سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ ہم لوگ برآمدے میں کھڑے تھے کہ ایک موٹر آ کر رکی اور اس میں سے ایک پولیس افسر اترا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ میرا وقت آ گیا ہے میں نے پاس جا کر کہا کہ بہت دنوں سے آپ کا انتظار تھا۔ وہ کسی قدر عذر خواہی کے انداز میں بولا کہ میرا قصور نہیں ہے یہ وارنٹ کلکتے سے آیا ہے۔

پانچ مہینے تیرہ دن باہر رہنے کے بعد پھر اپنے گوشہ تنہائی میں واپس آ گیا۔ اصل میں میرے لئے کوئی مشکل نہ تھی۔ مصیبت بے چاری عورتوں یعنی میری بیمار

ماں، بیوی اور بہن کی تھی اور اب کیا ہمیشہ ہی ہوتی تھی۔

علی پور جیل

میں اس حالت اور کیفیت سے اب کتنی دور ہوں، کیا میں اب بھی اس جھاڑی دار درخت کی لٹوں کی طرح بلا کسی رکاوٹ کے ان ہلکی ہلکی ہواؤں میں اڑتا ہوں جہاں راستہ دکھانے والا کوئی دم ساز ستارہ نہیں ہے۔ (رابرٹ براؤننگ)

اسی رات مجھے کلکتہ لے گئے اور ہوڑا اسٹیشن سے ایک بہت بڑی اور سیاہ رنگ کی کار یا گاڑی میں لال بازار پولیس کی چوکی پر پہنچا دیا۔ کلکتے کے اس مشہور صدر تھانہ کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اس لئے ذرا دلچسپی کے ساتھ میں نے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔

یورپین سارجنٹ اور تھانہ داروں کی بہت بڑی تعداد نظر آئی۔ جتنی شمالی ہند کے کسی صدر تھانہ میں نہیں ہوتی۔ سپاہی تقریبا تمام صوبہ بہار کے یا صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ جیل خانہ کی بڑی لاری میں متعدد بار مجھے جیل خانہ جانا ہوا تو ان سپاہیوں میں سے کچھ لوگ اندر بیٹھ کر میرے ہمراہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ بے حد رنجیدہ نظر آتے تھے، اپنی نوکری سے بیزار تھے اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ میرے ساتھ انہیں بڑی ہمدردی تھی اور کبھی کبھی ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

ابتدا مجھے پریذیڈنسی جیل میں رکھا گیا۔ وہاں سے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کے لئے مجھے لے جاتے تھے یہاں مجھے عجیب وغریب تجربہ ہوا۔ عدالت کا کمرہ اور پوری عمارت کی ظاہری شکل وصورت بجائے کھلی کچہری کے ایک محصور قلعہ کی سی معلوم ہوتی تھی۔ سوائے چند اخباری نمائندوں اور وکیلوں کے جو وہاں ہوتے ہی ہیں کسی اور آدمی کو کہیں آس پاس تک آنے کی اجازت نہیں تھی۔

پولیس کے سپاہی البتہ خاص تعداد میں موجود تھے، یہ وہاں روزانہ کا دستور تھا۔ جب

مجھے عدالت کے کمرے میں لے گئے تو کمرہ کے اندر ایک لمبے راستہ سے مجھے گزرنا پڑا جس کے اوپر اور ادھر اُدھر دونوں طرف تاروں کی جالی لگی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پنجرے میں چل رہے ہیں۔ ملزم کا کٹھرا مجسٹریٹ کی کرسی سے بہت دور تھا اور عدالت کا کمرہ پولیس کے سپاہیوں اور وکیلوں سے بھرا تھا جو سیاہ کوٹ اور چغے پہنے ہوئے تھے۔

عدالتی مقدموں کا میں خاصا عادی تھا۔ میرے بہت سے مقدمات جیل خانہ کے اندر ہی ہوتے تھے، لیکن ہمیشہ کچھ دوست عزیز اور جان پہچان کے لوگ موجود ہوتے تھے، جس سے یہ پوری فضا اتنی زیادہ مکدر معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہاں پولیس کے سپاہی بھی بالعموم ذرا علیحدہ رہتے تھے اور پنجرے کی شکل کی کوئی چیز آس پاس نہیں ہوتی تھی، لیکن یہاں حالت بالکل مختلف تھی اور میں گھور گھور کر اجنبی اور ناواقف لوگوں کی طرف دیکھتا تھا جن میں اور مجھ میں کسی قسم کا کوئی واسطہ نہ تھا، یہ مجمع کچھ زیادہ دلکش بھی نہ تھا اور میرا خیال ہے کہ وکلاء جب چغے پہن کر اکٹھے ہو جاتے ہیں تو یہ اجتماع کچھ زیادہ حسین بھی نہیں معلوم ہوتا اور پولیس کی مخصوص عدالتوں کے وکلا تو خصوصیت کے ساتھ ایک مہیب شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آخر کار میں نے کسی طرح ایک وکیل صورت پہچانی جو پیچھے قطار میں تھے، لیکن پھر وہ بھی اس مجمع میں گم ہو گئے۔

مقدمہ شروع ہونے سے قبل جب میں باہر کی طرف برآمدہ میں بیٹھا تو مجھے اپنی تنہائی اور سب لوگوں سے علیحدگی بہت محسوس ہوئی۔ اس وقت میری نبض کی حرکت بھی یقیناً تیز ہو گئی اور اندرونی طور پر طمانیت قلب بھی اتنی نہ تھی جتنی کہ اس سے پہلے مقدمات کے دوران میں رہا کرتی تھی۔ اس وقت مجھے یہ بات کھٹکی کہ اگر مجھ سا آدمی جو اتنے مقدمات اور سزاؤں کا تجربہ حاصل کر چکا ہے ایسے حالات میں غیر معمولی طور پر گھبرا سکتا ہے تو پھر نوجوان اور ناتجربہ کار لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

ملزم کے کٹھرے میں کے اندر جا کر پھر میری حالت ذرا ابتر ہوگئی حسب معمول نہ میں نے کوئی صفائی پیش کی اور نہ پیروی کی صرف ایک مختصر سا بیان پڑھ کر سنا دیا۔ دوسرے دن ۵ فروری کو مجھے دو برس کی سزا دے دی گئی اور ساتویں مرتبہ میری قید کی مدت شروع ہوئی۔

اب جو میں ساڑھے پانچ ماہ کے جیل سے باہر قیام پر نظر ڈالتا تھا تو مجھے اطمینان اور خوشی ہوتی تھی کہ میرا وقت اچھی طرح صرف ہوا اور میں نے اس عرصہ میں بعض مفید کام کیئے۔

والدہ نے بیماری پر قابو پا لیا تھا اور فوری طور پر کوئی خطرہ ان کے لئے نہ تھا، میری چھوٹی بہن کرشنا کی شادی ہوگئی تھی میری لڑکی کی آئندہ تعلیم کا بندوبست ہوگیا تھا، میں نے اپنی بعض خانگی اور مالی دشواریوں کو بھی درست کرلیا تھا اور بہت سے ذاتی معاملات جنہیں میں نے ایک عرصے سے نظر انداز کر رکھا تھا ان کا بھی کچھ انتظام ہو ہی گیا، سیاسی امور کا جہاں تک تعلق ہے میں جانتا تھا کہ کانگریس کے طرز عمل کو تھوڑا اور کس دیا اور ایک حد تک اس کو معاشرتی اور معاشی نقطہ نظر سے غور وفکر کرنے کی طرف مائل کیا۔ پہلے تو گاندھی جی کے ساتھ میری پونا والی خط وکتابت سے اور اس کے بعد میرے مضامین سے جو اخبارات میں شائع ہوئے، کچھ فرق پیدا ہوا۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر میرے مضامین سے بھی کچھ فائدہ ضرور رہا، اس کے علاوہ تقریباً دو برس کے بعد میں نے گاندھی جی سے اور دوسرے دوستوں اور ساتھیوں سے مل لیا اور اس ملاقات سے میں نے اپنی رگوں میں اور اپنے جذبات میں ایک نئی قوت ایک مدت کے لئے حاصل کرلی تھی۔

صرف ایک بات البتہ میرے لئے پریشان کن رہی اور وہ کملا کی علالت تھی، اس وقت مجھے اس کا اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ کتنی علیل ہے، اس لئے کہ اس کی عادت ہے کہ جب تک بالکل گر ہی نہ پڑے کام چلاتی رہتی ہے۔ بہر حال میں متفکر اور

پریشان تھا۔لیکن اس کے باوجود یہ توقع تھی کہ اب چونکہ میں جیل خانہ میں ہوں اس کو فرصت ملے گی کہ اپنے علاج کی طرف توجہ کرے۔ جب تک میں باہر رہا اس وقت تک اس کے لئے یہ ذرا دشوار تھا اس لئے کہ وہ مجھے زیادہ عرصہ تک چھوڑنے کے لئے کسی طرح راضی نہیں ہوتی تھی۔

ایک بات کا مجھے اور بھی افسوس تھا کہ میں نے ایک بار ضلع الہ آباد کے دیہاتی علاقہ کو جا کر نہیں دیکھا، میرے بہت سے نوجوان ساتھی جو وہاں ہم لوگوں کی ہدایت کے مطابق کام کرنے گئے تھے، گرفتار ہو گئے تھے اور ان کے پیچھے ضلع کے اندر دیہاتوں میں نہ جانا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ بے وفائی کرنا ہے۔

ایک بار پھر سیاہ رنگ کی قیدیوں کی گاڑی مجھے جیل خانہ واپس لے گئی۔ راستہ میں ہم لوگ ایک بہت بڑی فوج کے پاس سے گذرے جو مشین گن، فوجی موٹر کار وغیرہ وغیرہ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر جا رہی تھی۔ جیل خانہ کی گاڑی کے اندر چھوٹے چھوٹے روشندانوں سے جھانک کر میں نے ان کو دیکھا، اور اپنے دل میں سوچنے لگا کہ فوجی موٹر کار اور ٹینک بھی کتنے بدشکل ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے قرون قبل تاریخ کے مہیب دیوہیکل اور اسی طرح کے دوسرے جانور یاد آ گئے۔

مجھے پریذیڈنسی جیل سے علی پور مرکزی جیل میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں مجھے ایک کوٹھری ملی جس کی لمبائی چوڑائی تقریباً نو فٹ ہو گی۔ اس کے سامنے ایک برآمدہ اور ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کے اردگرد کی دیوار ذرا نیچی تھی، تقریباً ۷ فٹ کی ہو گی۔ اس کے دوسری طرف ایک عجیب منظر مجھے نظر آیا۔ ہر قسم کی عجیب عجیب عمارتیں تھی، کوئی ایک منزل کی کوئی دو منزلہ کوئی گول ہے تو کوئی مستطیل۔ چھتیں بھی عجیب و غریب، یہ عمارتیں ہر چہار طرف کھڑی تھیں، ان میں سے بعض عمارتیں دوسری عمارتوں سے اونچی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عمارتیں ایک ایک کر کے کھڑی ہوتی گئیں، اور کچھ اس طرح اپنی اپنی جگہ جما دی گئیں کہ جتنا بھی رقبہ تھا وہ سب پوری

طرح کام میں آجائے۔ تقریباً یہ نقشہ تھا جیسے کوئی گورکھ دھندا ہو یا کسی استقبالی، مصور کی تخیلی کاوش۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہی سمجھایا گیا کہ یہ عمارتیں ترتیب سے بنائی گئی ہیں جس کے بیچ میں ایک مینارہ ہے جو عیسائی قیدیوں کے لئے گرجا کا کام دیتا ہے۔ اور وہیں سے قطاریں پھوٹ کر نکلتی ہیں۔ چونکہ جیل خانہ شہر میں تھا اس لئے اس کا رقبہ بہت محدود تھا اور اس کے چپہ چپہ زمین کو کام میں لانا ضروری تھا۔

میں اپنے اردگرد کی ان بظاہر عجیب وغریب عمارتوں کو پہلی بار دیکھ کر بمشکل اپنے حواس درست کرسکا تھا کہ ایک اور ہیبت ناک منظر دکھائی دیا، میری کوٹھڑی اور اس کے صحن کے ٹھیک سامنے دو چمنیاں تھیں جن میں سے سیاہ اور کثیف دھوئیں کے بگولے نکل رہے تھے اور کبھی کبھی ہوا اس دھوئیں کو میری طرف اڑالاتی تھی جس سے دم گھٹنے لگتا تھا۔ یہ چمنیاں جیل کے باورچی خانہ کی تھیں۔ میں نے بعد میں سپرنٹنڈنٹ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ اس حملہ کی مدافعت کے لئے گیس کے نقاب فراہم کرنا چاہیے۔

جیل کی زندگی کی یہ ابتداء کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھی اور مستقبل بھی زیادہ خوش آئند نہ تھا یعنی علی پور جیل کی سرخ اینٹوں والی عمارتوں کے غیر متغیر منظر سے لطف اندوز ہوتے رہنا اور اس کے باورچی خانہ کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو نگلنا اور سانس کے ساتھ اندر لینا۔ میرے صحن میں نہ کوئی درخت تھا نہ سبزہ، پورا کا پورا فرش پختہ اور پکا اور صاف ستھرا رہتا تھا، (سوائے اس کوڑے کے جو دھوئیں کی وجہ سے ہر روز ہو جایا کرتا تھا)۔ لیکن وہ بھی بالکل خالی اور ویران تھا۔ پاس کے صحن میں ایک یا دو درختوں کی پھنگیاں مجھے دکھائی دیں، لیکن میں جس زمانہ میں پہنچا ان میں نہ کوئی پتی تھی نہ کوئی پھول۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک پراسرار تبدیلی ان میں ہوئی اور ان کی تمام شاخوں پر ہری ہری کونپلیں نکلنے لگیں، کونپلوں سے پتیاں نکلیں اور جلدی جلدی بڑھ کر انھوں نے سرسبز شاخوں کو اپنے خوش گوار سبزہ سے چھپا لیا۔ یہ ایک ایسی خوش

گوار تبدیلی تھی جس سے علی پور جیل میں بھی رونق اور زندگی معلوم ہونے لگی۔

انہیں میں سے ایک درخت میں چیل کا ایک گھونسلا تھا جس سے مجھے دلچسپی ہو گئی۔ میں اکثر اس کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ چیل کے بچے بڑے ہو رہے تھے اور اپنے کاروبار کے گر بھی سیکھ رہتے تھے، کبھی کبھی وہ نہایت تیز رفتاری اور نشانہ کی حیرت انگیز صحت سے نیچے جھپٹتے اور قیدی کے ہاتھ سے روٹی بلکہ منہ سے نوالہ تک جھپٹ کر لے جاتے تھے۔

غروب آفتاب کے وقت سے لے کر طلوع آفتاب تک کم وبیش ہم لوگ اپنی کوٹھڑیوں میں مقفل رہتے تھے اور جاڑوں کی طویل شام کا کاٹنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ساعت بہ ساعت جب میں لکھتے لکھتے یا پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو اپنی کوٹھڑی کے اندر ٹہلنا شروع کرتا تھا اور وہ بھی کیا! چار پانچ قدم آگے جانا اور پیچھے لوٹنا، اس وقت مجھے جانور گھر کے ریچھ یاد آتے تھے جو کٹہرے میں بند آگے پیچھے ٹہلتے ہیں۔ بعض اوقات جب میرا جی بہت زیادہ اکتا جاتا تھا تو میں اپنا مرغوب علاج (شرش آشن) سر کے بل کھڑے ہو کر کیا کرتا تھا!

رات کے ابتدائی حصہ میں کچھ خاموشی رہتی تھی اور شہر کی کچھ آوازیں اندر آجایا کرتی تھیں مثلاً ٹرام گاڑی کا شور، گراموفون کی آواز، یا کہیں دور سے کسی شخص کے گانے کی آواز۔ دور سے دھیمی موسیقی کی آواز سن کر فرحت ہوتی تھی، لیکن کچھ رات گزرنے کے بعد پھر زیادہ آرام نہیں ملتا تھا اس لئے کہ پہرے کے سپاہی ادھر سے اُدھر ٹہلتے رہتے تھے۔ اور ہر گھنٹہ کوئی نہ کوئی معائنہ رہتا تھا، بعض لالٹین لے کر آتے تھے یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ ہم لوگ بچ کر بھاگ تو نہیں گئے، ہر روز یا یوں کہنا چاہئے کہ ہر رات کو تین بجے ایک بڑا شور اور مٹی سے برتن مانجھنے اور رگڑنے کا غل ہوا کرتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ باورچی خانہ میں کام شروع ہو گیا۔

محافظ، پہرہ دار، افسر اور منشی بہت بڑی تعداد میں پریذیڈنسی جیل میں بھی متعین

تھے۔اور علی پور جیل میں بھی۔ان دونوں جیل خانوں کی آبادی اور نینی جیل کی آبادی تقریبا برابر برابر تھی یعنی ۲۴۰۰ سے ۲۳۰۰ تک لیکن ان میں سے ہر جیل خانہ کا عملہ نینی جیل کے عملہ سے دگنا تھا۔ان میں بہت سے یورپین وارڈ اور ہندوستانی فون کے پنشن یافتہ افسر تھے۔یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بہ نسبت صوبہ متحدہ کے کلکتہ میں حکومت برطانیہ کا انتظام زیادہ زوردار اور زیادہ مسرفانہ ہے۔سلطنت برطانیہ کی قوت اور جبروت کی ایک نشان اور مستقل طور پر یاد دہانی کرنے والی ایک بات اور تھی کہ جب اعلیٰ افسر قیدیوں کے قریب آتے تھے تو قیدیوں کو ایک نعرہ زور سے لگانا پڑتا تھا۔یہ نعرہ سرکار سلام کا ہوتا تھا۔ جو ذرا لمبی آواز اور ایک خاص جسمانی حرکت کے ساتھ ادا کیا جاتا تھا۔اس نعرہ کی آوازیں دن میں کئی بار میرے صحن کی دیوار کے اس طرف آیا کرتی تھیں اور بالخصوص اس وقت جب سپرنٹنڈنٹ صاحب روزانہ وہاں سے گزرتے تھے۔میں سات فٹ کی اونچی دیوار کی دوسری طرف ایک بہت بڑے شاہی چتر کا صرف اوپر کا حصہ دیکھ سکتا تھا۔جس کے سایہ میں یہ سپرنٹنڈنٹ صاحب چلا کرتے تھے۔

معلوم نہیں کہ سرکار سلام کا یہ غیر معمولی نعرہ اور جس انداز سے لگایا جاتا تھا زمانہ قدیم کی یادگار ہے یا کسی ذہین انگریز افسر کی ایجاد ہے۔لیکن میرا گمان ہے کہ کسی انگریز افسر ہی کی ایجاد ہوگی۔اس کی آواز میں ایک خاص اینگلو انڈین لہجہ پایا جاتا تھا۔خوش قسمتی سے ممالک متحدہ کی جیلوں میں اور غالبا علاوہ بنگال اور آسام کے اور کسی صوبہ میں یہ نعرہ رائج نہیں ہے۔جس طریقہ سے یہ زبردستی کا سلام سرکار کی عظمت وجبروت کے سامنے کیا جاتا ہے مجھے باعث تذلیل معلوم ہوتا حتا۔

البتہ علی پور جیل میں ایک اصلاح دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ معمولی قیدیوں کا کھانا ممالک متحدہ کے جیل کے کھانے سے بہت زیادہ بہتر تھا اور جہاں تک جیل کی خوراک کا تعلق ہے ممالک متحدہ بہت سے صوبوں سے گیا گزرا ہے۔

جاڑوں کا مختصر زمانہ بہت جلد ختم ہوگیا۔ بہار کے دن بھی یوں ہی گزر گئے اور گرمیاں شروع ہوئیں روز بروز گرمی بڑھتی گئی مجھے کلکتہ کی آب و ہوا کبھی پسند نہ تھی۔ تھوڑے دن بھی اس آب وہوا رہتا ہوتا تو طبیعت پژمردہ اور پست ہو جاتی تھی۔ جیل میں حالات قدرتا اور بھی ابتر تھے اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے میری صحت اچھی نہ رہی۔ غالبا اس وجہ سے کہ ورزش کے لئے جگہ نہ تھی اور دیر تک اس آب وہوا میں مقفل رہنا پڑتا تھا۔ میری صحت پر کسی قدر اس کا برا اثر پڑا۔ اور میرا وزن تیزی سے کم ہونے لگا، مجھے تالوں اور چٹخنیوں سے، لوہے سینچوں اور دیواروں سے بڑی نفرت پیدا ہونے لگی۔

علی پور جیل میں ایک مہینے کے بعد مجھے اپنے صحن سے باہر کچھ ورزش کرنے کی اجازت ملی۔ یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی اور اب اصلی دیوار کے نیچے صبح شام ٹہل لیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ علی پور جیل اور کلکتہ کی آب وہوا کا عادی ہوگیا اور باورچی خانہ اور اس کا دھواں اور شور وغل بھی ایک قابل برداشت مصیبت بن گیا۔ اب دوسرے معاملات میرے دماغ میں سمانے لگے۔ دوسری پریشانیوں میں مبتلا ہوگیا۔ کیونکہ باہر کی خبریں کچھ خوش کن نہ تھیں۔

مشرقی اور مغربی جمہوریت کا مقابلہ

علی پور جیل میں مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ سزایابی کے بعد پھر مجھے کوئی روزانہ اخبار منگانے کی اجازت نہ ہوگی۔ جب تک میرا مقدمہ زیر سماعت رہا کلکتہ کا روزنامہ اسٹیٹس مجھے مل جاتا تھا۔ لیکن جس دن مقدمہ ختم ہوا اس کے دوسرے ہی دن سے یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔ ہمارے صوبہ متحدہ میں ۱۹۳۲ء سے برابر ایک روزانہ اخبار (جس کو حکومت پسند کرے) درجہ الف یا درجہ اول قسم کے قیدیوں کو دینے کی اجازت تھی۔ یہی حال اکثر دوسرے صوبوں میں تھا۔ اور اسی وجہ سے غالبا میرا یہ گمان تھا کہ یہی باقاعدہ بنگال میں بھی ہوگا۔ بہر کیف بجائے روزنامہ اسٹیٹس مین کے اب ہفتہ وار اسٹیٹس مین مجھے دیا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ اخبار صرف ان انگریز افسروں کے لئے ہوتا ہے جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں یا ان تاجروں کی دلچسپی کے لئے ہوتا ہے جو انگلستان واپس چلے گئے ہوں۔ اس میں ایسی ہی خبروں کا خلاصہ دیا جاتا ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ بیرونی خبریں اس میں بالکل نہیں دی جاتی تھیں۔ اور چونکہ میں ان خبروں کا بالالتزام پڑھنے کا عادی تھا اس لئے ان کا نہ ہونا اور بھی محسوس ہوتا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے پھر ہفتہ وار مانچسٹر گارجین منگانے کی مجھے اجازت مل گئی اور اس کے ذریعہ میں یورپ اور بین الاقوامی معاملات سے باخبر رہنے لگا۔

فروری میں جب میری گرفتاری اور مقدمہ ہوا اسی زمانہ میں یورپ میں بڑے تلخ جھگڑے، لڑائیاں اور ہنگامے ہوئے، فرانس میں ہنگاموں کا نتیجہ فاشٹ بلوؤں کی صورت میں ظاہر ہوا اور ایک قومی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ اس سے کہیں زیادہ ابتر حالت آسٹریا میں تھی جہاں چانسلر ڈائفس نے مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر اشتراکی جمہورت کا قلع قمع کردیا۔ آسٹریا میں خونریزی کی خبروں نے مجھے بہت افسردہ کیا۔ یہ دنیا بھی کیسی بری اور مصیبت کی جگہ ہے اور انسان بھی کتنی وحشی ہوجاتا

ہے۔ جب وہ اپنے مستقل اغراض کی حفاظت کرنے پر تل جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں فاشزم پھیلتا جارہا ہے۔ جرمنی میں جب ہٹلر کا اقتدار ہوا تو میرا خیال تھا کہ اس کی حکومت غالبا زیادہ عرصے تک نہیں رہے گی اس لئے کہ جرمنی کی مالی مشکلات کا اس نے کوئی حل پیش نہیں کیا تھا۔ اسی طرح جہاں کہیں فاشزم پھیلا میں نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید ترقی دشمن کا یہ آخری مورچہ ہے اور اس کے بعد یقیناً وہ وقت آئیگا کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن پھر سوچتا تھا کہ یہ میرے خیالات ہیں یا میری آرزوئیں۔ کیا یہ واقعی اتنی ہی بدیہی بات ہے کہ فاشزم کی روح اس قدر آسانی اور تیزی سے فرو ہوجائے گی۔ اور اگر فاشٹ مطلق العنانی (ڈکٹیٹرشپ) کیلئے حالات بالکل ناقابل برداشت بھی جائیں تو ایسی حالت میں کیا وہ لوگ اپنے ملکوں کو تباہ کن جنگوں میں نہ پھنسادیں گے۔ بجائے اس کے کہ خود ہار مان لیں؟ اور پھر اس کشمکش کا آخر حشر کیا ہوگا؟

اسی اثناء میں قسم قسم کا فاشزم دنیا میں پھیلا۔ اسپین جہاں ایماندار لوگوں کی جمہوری حکومت کا جدید نظام قائم ہوا تھا جس کے متعلق کسی نے خوب کہا کہ بس گویا ہو بہو حکومتوں کا مانچسٹر گارجین ہے وہ بھی بری طرح رجعت پسندی کی طرف واپس لوٹ گیا تھا۔ وہاں کے ایماندار لبرل رہنماؤں کی اچھی باتوں کے باوجود اس کو نیچے کی طرف پھسلنے سے نہیں روکا جاسکتا۔ ہر جگہ لبرل تحریک جدید حالات کا مقابلہ کرنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ وہ لوگ بس الفاظ اور جملوں کے پیچھے پڑے رہے اور رنا دانی سے یہ سمجھتے رہے کہ باتیں بنانا اور کام کرنا برابر ہے چنانچہ جب کوئی نازک موقع آیا تو وہ اسی طرح چپ چپاتے غائب ہوئے جیسے کسی فلم کے آخری حصے کا اختتام ہوتا ہے۔

آسٹریا کے المناک حالات پر مانچسٹر گارجین کا مقالہ افتتاحیہ میں نے بڑی

دلچسپی سے پڑھا اور اس کو پسند کیا۔ اس نے لکھا تھا کہ معلوم نہیں اس خونریز جھگڑے کے بعد اب آسٹریا کی صورت کیا ہوگی؟ کیا آسٹریا پر اب یورپ کے سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ بندوقوں اور مشین گنوں کے زور سے حکومت کریں گے؟ لیکن اگر انگلستان آزادی کا حامی ہے تو آخر اس کے وزیر اعظم کی زبان اتنی خاموش کیوں ہوگئی ہے؟ ہم نے ان کی زبان سے ڈکٹیٹر شپ کی تعریفیں سنی ہیں ہم نے انہیں یہ کہتے سنا ہے کہ اس کی بدولت قوموں کی روح کیسے زندہ ہوتی ہے اور ایک نیا نقطہ نظر اور نئی جان پیدا ہو جاتی ہے اس نئے انگلستان کے وزیر اعظم کو ان بے رحموں اور سفاکیوں کے متعلق بھی کچھ اظہار خیال کرنا چاہئے۔ خواہ وہ کسی ملک سے تعلق رکھتی ہوں، جو اکثر جسموں کو قتل کرتی ہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ روح کو موت کا منہ دکھاتی ہیں اور اس سے کہیں بری موت کا۔

لیکن خود مانچسٹر گارجین اگر آزادی کا حامی ہے تو جب ہندوستان میں آزادی کا سر کچلا جاتا ہے اس وقت اس کی زبان سے کچھ کیوں نہیں نکلتا؟ ہم لوگوں نے بھی نہ صرف جسمانی تکالیف برداشت کی ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ مصیبت ہے جو ہماری روح نے جھیلی ہے۔

آسٹریا کی جمہوریت تباہ کردی گئی گو اس نے آخر دم تک مقابلہ کیا جس سے اس کی عظمت اور شان ہمیشہ قائم رہے گی اور ایک ایسی داستان باقی رہے گی جس سے شاید آئندہ پھر کبھی یورپ کی آزادی کی چنگاری روشن ہو جائے۔

یورپ اب آزادی کی سانس نہیں لے سکتا۔ اس لئے کہ وہ آزاد نہیں رہا اب وہاں صحیح قسم کے جذبات اور خیالات کا اظہار اور تبادلہ مفقود ہے۔ رفتہ رفتہ دم گھٹنے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور اب سوائے اس کے کہ کوئی شدید لرزے کی کیفیت یا اندر ہی اندر سے کوئی تشنجی کیفیت ظاہر ہو اور خود بخود دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ مارنا شروع کر دیا جائے۔ تو شاید اس فالج سے بچ سکے جو دماغ پر گرنے والا ہے۔

دریائے دھائن سے لے کر کوہ یورال تک یورپ ایک بہت بڑا قید خانہ ہے۔

یہ وہ دل ہلانے والی عبارتیں تھیں جن کی صدائے بازگشت میرے دل سے بھی اٹھی لیکن اسی کے ساتھ میں حیرت سے سوچتا تھا کہ آخر ہندوستان کے متعلق کیا ہو گیا ہے؟ مانچسٹر گارجین یا آزادی کے دوسرے حامی جن کا وجود انگلستان میں یقیناً ہے ہماری حالت کی طرف سے ایسے باخبر کیوں ہیں؟ جس بات کو دوسری جگہ وہ اس قدر جوش سے برا کہتے ہیں اس کی طرف سے یہاں کیسے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ایک بہت بڑے انگریز لبرل لیڈر نے جن کی تعلیم و تربیت انیسویں صدی کے ماحول اور روایات میں ہوئی تھی جو طبعاً بہت محتاط اور بہت سنبھل کر گفتگو کرنے والے آدمی تھے۔ بیس سال ہوئے جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل کہا تھا کہ بجائے اس کے کہ میں خاموشی کے ساتھ قانون کے مقابلہ میں تشدد کی اس افسوس ناک کامیابی کا نظارہ دیکھوں میں یہ پسند کروں گا کہ ہمارا یہ ملک صفحہ تاریخ سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ یہ ایک بہادرانہ خیال تھا جو نہایت فصاحت سے بیان کیا گیا اور انگلستان کے لاکھوں جاں باز نوجوان اس کے تحفظ کے لئے نکل کھڑے ہوئے لیکن آج اگر کوئی ہندوستانی مسٹر اسکوفتھ کی طرح کوئی بیان دینے کی جرات کرے تو معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔

قوموں کی نفسی کیفیت بھی کس قدر پیچیدہ ہوتی ہے۔ اپنے متعلق ہم میں سے اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ تو حق و انصاف پر ہیں باقی دوسرے لوگ اور دوسرے ممالک غلطیاں اور نا انصافیاں کرتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ہمیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کی طرح نہیں ہیں کچھ ضرور ہے لیکن آداب شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر زیادہ زور نہ دیا جائے۔ اور اگر خوش قسمتی سے ہم لوگ ایک حکمران قوم ہونے کی حیثیت سے دوسرے ممالک کی قسمتوں کے مالک ہوں تو پھر تو یقین نہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس بہترین دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہی سب

سے بہتر ہے اور جو لوگ اس کے خلاف شور کرتے ہیں وہ یا تو خود غرض ہیں یا فریب خوردہ احمق جو ہماری بخشی ہوئی نعمتوں اور برکتوں پر ناشکری کرتے ہیں۔

برطانوی لوگ ایک جزیرے کی رہنے والی قوم ہیں اور مسلسل کامیابی اور مرفہ الحالی کی وجہ سے وہ تمام دوسرے لوگوں کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ کسی نے ان کے متعلق کہا ہے کہ ان کے خیال میں تو جیسوں کی بستی کیلے سے شروع ہو جاتی ہے لیکن یہ الفاظ بہت زیادہ عام ہیں غالباً برطانیہ کے اعلیٰ طبقوں کی نظر سے دنیا کو تقریباً حسب ذیل درجوں میں تقسیم کیا جائیگا۔ (۱) برطانیہ اس کے بعد بہت جگہ چھوڑ کر پھر (۲) برطانوی نوآبادیات (صرف گورے رنگ کی آبادی) اور امریکہ لیکن صرف اینگلوسیکسن باقی دوسرے یورپی ممالک کے مہاجر اس میں شامل نہیں (۳) مغربی یورپ (۴) یورپ کا باقی حصہ (۵ جنوبی امریکہ) لاطینی اقوام اس کے بعد پھر بہت جگہ چھوڑ کر (۶) ایشیا اور افریقہ کی سانولے زرد اور سیاہ رنگ کی اقوام سب کو کم وبیش ایک ہی طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہم آخری درجے والے ان بلندیوں سے کتنی دور ہیں جہاں ہمارے حکمران رہتے ہیں! پھر یہ کیا کوئی تعجب کی بات ہے کہ جب کبھی وہ ہماری طرف نظر کرتے ہیں تو انہیں سب دھندلا دھندلا دکھائی دیتا ہے اور پھر جب ہم لوگ لگتے ہیں آزادی جمہوریت کی بات چیت کرنے تو انہیں اس سے چڑ ہوتی ہے۔ یہ الفاظ (آزادی و جمہوریت) شاید ہم لوگوں کیلیے نہیں بنے ہیں۔ ایک بہت بڑے لبرل مدبر جان مارلے نے کیا یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ مستقبل بعید میں وہ ہندوستان کے لئے جمہوری نظام حکومت کا تصور کبھی نہیں کرسکتے۔ کناڈا کے بالوں والے لبادے کی طرح ہندوستان کی آب وہوا کیلئے جمہوری نظام حکومت موزوں اور مناسب ہی نہیں ہے اور بعد میں برطانیہ کے مزدوروں کی جماعت نے جو تحریک اشتراکیت کی علمبردار اور غریبوں کی حامی اور مددگار سمجھی جاتی ہے اپنی فتح و کامیابی کے جوش میں ہم لوگوں کو

۱۹۲۴ء میں جو تحفہ دیا وہ بنگال آرڈی نینس کی تجدید کی صورت میں تھا اوران کے دوسرے دور حکومت میں ہماری قسمت پہلے سے بھی زیادہ کھوٹی نکلی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے بدخواہ نہیں ہیں اور جب وہ اپنے واعظانہ انداز میں ہمیں مخاطب کرکے کہتے ہیں پیارے اور محبوب بھائیو تو ان کا دل نیکی کے احساس سے یقیناً منور ہو جاتا ہے۔ لیکن بہرحال ہم ان کی نظروں میں وہ نہیں ہو سکتے جو وہ خود ہیں اور ہمیں دوسرے ہی معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے۔ جب ایک انگریز اور ایک فرانسیسی لسانی اور تمدنی اختلاف کی وجہ سے ہم خیال نہیں ہو سکتے تو پھر ایک انگریز اور ایک ایشیائی میں کتنا زبردست فرق ہوگا۔

حال ہی میں ہندوستان کے اصلاحات کے مسئلے پر دارالامرا میں بحث و مباحثے ہو رہے تھے اور معزز امراء نے کئی بصیرت افروز تقریریں کیں ان میں سے ایک تقریر لارڈ لٹن کی تھی جو ہندوستان کے ایک صوبے میں سابق گورنر رہ چکے ہیں اور جنہوں نے کچھ عرصے تک وائسرائے کی قائمقامی بھی کی تھی۔ ان کے متعلق اکثر سنا گیا ہے کہ وہ آزاد خیال اور بہت ہمدرد گورنر تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجموعی حیثیت سے حکومت ہندوستان کی اس سے کہیں زیادہ نمائندگی کرتی ہے جتنی کہ سیاسیین حکومت نمائندگی کر سکتی ہے۔ حکام کی طرف سے فوج اور پولیس کی طرف سے والیان ریاست کی طرف سے اور ہندو مسلمان دونوں کی طرف سے۔ برخلاف اس کے کانگریس کے سیاسیین جملہ فرقوں میں کسی ایک فرقے کی نیابت کا دعوے نہیں کر سکتے۔ آگے چل کر انھوں نے اپنے مطلب کو اور زیادہ واضح کر دیا کہ جب میں ہندوستان کی رائے عامہ کا ذکر کرتا ہوں تو میرے ذہن میں وہ لوگ ہیں جن کے تعاون عمل پر مجھے بھروسا کرنا پڑا تھا اور آئندہ بھی وائسرائے اور گورنروں کو جن کے تعاون پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

اس تقریر سے دو بہت دلچسپ باتیں نکلتی ہیں ایک تو یہ کہ ہندوستان سے

مطلب صرف وہ ہندوستان ہے جو برطانیہ کی مدد کرتا ہے۔ اور دوسرے کہ کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں سب سے زیادہ نمائندہ جماعت ہے۔اس لئے اس ملک میں سب سے زیادہ جمہوری ادارہ یہی ہے۔چونکہ یہ دلیل سنجیدگی سے پیش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہر سویز کے اس پار انگریزی الفاظ کے معنی کچھ تبدیل ہو جاتے ہیں چنانچہ اس دلیل کے بعد بہ ظاہر دوسرا دعوی یہ کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ بادشاہ ہر شخص کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے مطلق العنان حکومت سب سے زیادہ نمائندہ اور جمہوری ہوتی ہے اور اس صورت سے ہم لوگ ایک بار پھر اس نظریے پر پہنچ جاتے ہیں کہ بادشاہ مامور من اللہ ہوتا ہے اور ریاست کیا ہے میں ہی ریاست ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ حال ہی میں خالص مطلق العنانی کی حمایت بھی ایک بہت ہی ممتاز شخص نے کی ہے۔انڈین سول سروس کے مایہ ناز رکن سر مالکم سیلیے نے بحیثیت گورنر صوبجات متحدہ نومبر ۴۴ء کو بنارس میں تقریر کرتے ہوئے دیسی ریاستوں میں مطلق العنانی کی حمایت کی تھی۔ حالانکہ اس قسم کے نصیحت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔اس لئے کہ کوئی دیسی ریاست خود اپنی مرضی سے مطلق العنانی کو ترک کرنے والی نہیں معلوم ہوتی اور ایک دلچسپ بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مطلق العنانی کی حمایت کے لئے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ یورپ میں جمہوریت ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمعیل نے تعجب ظاہر کیا ہے کہ ایک طرف پارلیمنٹری جمہوریت ہر جگہ زوال پذیر ہے اور دوسری طرف کایا پلٹ دینے والی اصلاحات کی تائید کی جا رہی ہے۔اور مجھے یقین ہے کہ اس ریاست کا ضمیر گواہی دیگا کہ ہمارا موجودہ دستور اساسی ہماری تمام ضروریات کیلئے عملاً کافی طور پر جمہوری ہے ریاست میسور کا ضمیر غالباً مہاراجہ اور دیوان کے لئے ایک مابعد الطبیعی تصور ہے۔میسور میں جس قسم کی جمہوریت اس وقت رائج ہے اس میں اور مطلق العنانی

میں کوئی فرق نہیں۔

اگر ہندوستان کے لئے جمہوری نظام حکومت موزوں نہیں ہے تو یہ ظاہر مصر کے لئے بھی اسی طرح یہ نظام جمہوری ناموزوں ہوگا۔ میں نے بھی اسٹیٹس مین میں اس لئے کہ یہ اخبار موجودہ جیل میں مجھے دیا جاتا ہے قاہرہ کا ایک طویل مراسلہ پڑھا ہے۔ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ وزیر اعظم نسیم پاشا نے ذمہ دار حلقوں میں اپنے اس اعلان سے کچھ کم خطرہ نہیں پیدا کیا ہے کہ انہیں توقع ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں سے اور بالخصوص وفد جماعت سے اشتراک عمل حاصل ہوگا۔ اور یا تو ایک مقامی کانفرنس ہوگی یا Constituent Assembly کیلئے انتخابات ہوں گے لیکن بہر صورت ایک جدید دستور اساسی کی تشکیل کی جائے گی۔ اس کا مطلب بالاخر صرف یہ ہوگا کہ ایک جمہوری نظام حکومت کی طرف پھر عود کیا جائے حالانکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کیلئے یہ طرز عمل ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوا، اس لئے کہ ماضی میں اس نے ہمیشہ عوام الناس کے خراب سے خراب جذبات کا پاس اور لحاظ کیا جو شخص بھی مصری سیاست کی اندرونی حالت سے کچھ ہی واقف ہے اس کو ایک لمحے کیلئے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انتخابات میں ایک بار پھر وفد جماعت اکثریت کے ساتھ منتخب ہوگی۔ اسلئے اگر اس طریق کار کو روکنے کیلئے کوئی تدبیر اختیار کی گئی تو کچھ عرصے کے بعد ایک ہمارے سر ایک ایسی حکومت ڈالی جائے گی جو ضرورت سے زیادہ جمہوری پر دیسیوں کی مخالف انقلابی حکومت ہوگی۔

یہ تجویز کی گئی ہے کہ انتخابات اس طرح کرائے جائیں کہ وفد جماعت کے توڑ کیلئے حکومت کے اثر واقتدار سے کام لیا جائے لیکن بدقسمتی سے وزیر اعظم کا دماغ اتنا زیادہ قانونی واقع ہوا ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی بات نہیں کرسکتے۔ اس کے علاوہ دوسری صورت یہ باقی رہ گئی ہے کہ وہائٹ ہال مداخلت کرے۔ اور یہ جتلادے کہ اس قسم کی حکومت کو وہ دوبارہ برداشت نہ کریگا۔

اب میں یہ نہیں جانتا کہ وہائٹ ہال اس معاملے میں کوئی کاروائی کریگا یا نہیں یا مصر میں کیا ہوگا۔ لیکن اس دلیل سے جو غالباً ایک حریت پسند انگریز نے پیش کی ہے ہمیں ہندوستان اور مصر کے حالات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں کسی قدر مدد ضرور ملے گی اسٹیٹس مین نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ خرابی جڑ ہمیشہ یہ رہی ہے کہ مصری رائے دہندہ کا طرز زندگی اور زاویہ نگاہ اس طرز زندگی اور زاویہ نگاہ سے مطابقت نہیں رکھتا جس سے جمہوریت کی نشوونما ہوتی ہے، اس عدم مطابقت کی مثال آگے چل کر دی گئی ہے۔ یورپ میں بالعموم جمہوریت کا خاتمہ اس لئے ہوا کہ وہاں بہت زیادہ جماعتیں تھیں۔ اور مصر میں یہ مشکل درپیش ہے کہ وہاں صرف ایک ہی جماعت ہے یعنی وفد۔

ہندوستان میں ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری فرقہ وارانہ تقسیم ہماری جمہوری ترقی میں حائل ہے اور اس لئے ناقابل تردید منطق کی وجہ سے ان تقسیموں کو مستقل طور پر قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم سے کہا جاتا ہے ہم لوگ پورے طور پر متحد نہیں ہیں۔ مصر میں کوئی فرقہ وارانہ اختلاف نہیں ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مکمل سیاسی اتحاد قائم ہے۔ اس کے باوجود یہی اتحاد آزدی اور جمہوریت کی راہ میں ایک روڑا بن جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ جمہوریت کا راستہ بالکل سیدھا اور تنگ ہے۔ ایک مشرقی ملک کے لئے جمہوریت کے معنی صرف یہ معلوم ہوتے ہیں کہ فرماں روا سلطنت کے احکام کی تعمیل کی جائے اور اس کے مفاد کو نہ چھوا جائے صرف اس ایک شرط کے بعد جمہوری آزادی بلا روک ٹوک یہاں پھل پھول سکتی ہے۔

۱۔ دارالامرا، ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء

۲۔ میسور، ۲۱ جون ۱۹۳۴ء ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲۳ کا حاشیہ۔

۳۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۳۴ء

۴۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں برطانوی تسلط کے خلاف مصر بھر میں بلوے ہوئے تھے۔

اداسی

اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنا سر اس جگہ رکھ دوں جہاں گھاس
ٹھنڈی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا، اے ماں یہ تھکا ہوا بچہ تیرے قدموں میں
پڑا ہے۔اس کے سارے خواب اس کے دل سے محو ہو گئے ہیں

اپریل کا مہینہ آ گیا باہر کے واقعات کی کچھ اڑتی اڑتی خبریں علی پور جیل کی کوٹھڑی میں میرے کانوں تک پہنچیں۔اور یہ خبریں بہت ناخوشگوار اور پریشان کن تھیں۔ایک روز جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے اور باتوں کے سلسلے میں مجھ سے یہ کہا کہ مسٹر گاندھی نے تحریک سول نافرمانی کو روک دیا ہے۔اس سے زیادہ مجھے بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔یہ خبر میرے لئے خوش آئند نہ تھی۔اور مجھے اس چیز کے ختم ہو جانے کا قلق ہوا۔جس میں میں نے اپنے آپ کو کئی سال سے محو کر دیا تھا پھر بھی اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ اس کا خاتمہ تو بہر حال ہونا ہی تھا۔میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی نہ کسی وقت سول نافرمانی کو کم از کم مدت کے لئے بند کرنا ہی پڑے گا۔افراد تو بے شک نتائج کی پروا کئے بغیر ایک غیر محدود مدت تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔لیکن قومی ادارے اس طریقے سے کام کبھی نہیں کرتے ہیں۔مجھے اس بارے میں مطلق شبہ نہ تھا کہ گاندھی جی نے عام ملک کی اور اکثر کانگرسی کارکنوں کی ذہنی کیفیت کا صحیح اندازہ کیا ہے اس لئے ہر چند کہ یہ جدید تبدیلی ناخوشگوار تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

میں نے یہ بھی افواہ سنی کہ کونسلوں میں جانے کی غرض سے سوراج پارٹی کو دوبارہ زندہ کرنے کی ایک نئی تحریک اٹھائی گئی ہے۔یہ چیز بھی ناگزیر سی معلوم ہوتی تھی اور ایک عرصے سے میری یہ رائے تھی کہ کانگریس آئندہ انتخابات سے کنارہ کشی نہیں اختیار کر سکتی۔جیل خانہ سے باہر پانچ مہینے کی آزادی کے زمانے میں میں نے

اس رجحان کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے کہ میں اسے قبل از وقت سمجھتا تھا اور مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے عملی جدوجہد ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اور پھر عام کانگریسیوں میں سماجی تبدیلیوں کے متعلق جن نئے خیالات کا خمیر اٹھ رہا ان کی طرف سے توجہ ہٹ جائے گی میں سمجھتا تھا کہ جتنی دیر تک یہ کشمکش جاری رہے گی اتنے ہی زیادہ خیالات عوام میں اور تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی پھیلیں گے۔ اور ہماری سیاست اور معیشت کی تہ میں جو حقائق ہیں وہ صاف صاف ظاہر ہو جائیں گے۔ جیسا کہ لینن نے کسی جگہ کہا ہے ہر قسم کی سیاسی کشمکش مفید ہوتی ہے اس لئے کہ اس کی وجہ سے چھپی ہوئی باتیں کھل جاتی ہیں اور میدان سیاست میں جو اصل قوتیں کارفرما ہیں وہ ظاہر ہو جاتی ہیں۔ واقعات منظر عام پر آجاتے ہیں اور لوگ حقیقت کے سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مجھے بھی یہ توقع تھی کہ اس طریقے سے کانگریس کے خیالات سلجھ جائیں گے۔ اس کی منزل مقصود واضح ہو جائے گی۔ اور اس کا شیرازہ زیادہ مضبوطی سے بند ہو جائے گا۔ غالبا کچھ کمزور عناصر اس میں سے نکل جائیں گے لیکن اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور جب وہ وقت آئے گا کہ اصولی حیثیت سے بھی عملی جدوجہد کے طریقے کو ترک کر کے آئینی اور قانونی طریقوں کی طرف رجوع کیا جائے گا تو کانگریس کا ترقی پسند اور کام کرنے والا عنصر ان طریقوں کو بھی اپنے اصل مقصد کے وسیع نقطہ نظر سے استعمال کر سکے گا۔

بہ ظاہر تو وہ وقت اب آگیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ جو لوگ کانگریس کے موثر کام اور سول نافرمانی کی تحریک کے روح رواں سمجھے جاتے تھے وہ پیچھے ہٹ رہے تھے اور دوسرے حضرات جنھوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا برسر اقتدار ہوتے جاتے تھے۔

کچھ روز بعد ہفتہ وار اسٹیٹس مین میرے پاس آیا اور اس میں گاندھی جی کا وہ بیان تھا جو انہوں نے تحریک سول نافرمانی واپس لیتے وقت شائع کیا تھا۔ میں نے

اس کو حیرت سے پڑھا اور مجھے اس قدر رنج ہوا کہ دل بیٹھنے لگا۔ میں نے اس کو بار بار پڑھا اور سول نافرمانی اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو دماغ میں تھا غائب ہو گیا اور اس کی جگہ شکوک وشبہات اور خیالات کی کشمکش نے لے لی۔ گاندھی جی نے لکھا تھا کہ سیہ گرہ آشرم کے رہنے والوں سے ایک نج کی بات چیت اس بیان کی محرک ہوئی۔ ایک گفتگو کے دوران میں مجھے یہ عبرت انگیز اطلاع ملی کہ میرے ایک قابل قدر قدیم رفیق نے جیل خانہ کا مقررہ کام پورا کرنے میں تامل کیا اور اپنے کتب بینی کے شغل کو اس پر ترجیح دی۔ بلاشبہ یہ بات سیہ گرہ کے اصول کے خلاف ہے لیکن اپنے ان عزیز دوست کی خامی سے بھی زیادہ مجھے خود اپنی خامیوں کا اتنا احساس ہوا جتنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرے دوست نے کہا کہ وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کمزوریوں سے واقف ہوں۔ لیکن میں اندھا تھا اور ایک قائد کا اندھا ہونا ہرگز قابل معافی نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال صرف مجھی کو سب کی طرف سے سول نافرمانی کرنی چاہیے۔

گاندھی جی کے ان دوست کی خامی یا قصور اگر اسے قصور کہا جا سکتا ہے۔ ایک بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ میں خود اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے بارہا یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ اور مجھے اس کا مطلق افسوس اور پچھتاوا نہیں ہے لیکن اگر یہ معاملہ سنگین بھی تھا تو کیا ایک اتنی وسیع قومی تحریک کو جس میں بیسیوں ہزار آدمی بلاواسطہ اور لاکھوں آدمی بالواسطہ شریک تھے محض اس لئے بند کر دینا چاہیے تھا کہ ایک فرد سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی۔ مجھے تو یہ بات بالکل خلاف عقل اور منافی اخلاق معلوم ہوئی۔ میں یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ کونسی بات سیہ گرہ کے مطابق ہے اور کونسی نہیں ہے! لیکن اپنی بساط کے لائق میں نے بھی بعض اصولوں کی پیروی کی کوشش کی ہے اور گاندھی جی کے اس بیان سے یہ سارے اصول درہم برہم ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ عموماً گاندھی جی اپنے وجدان کے مطابق عمل کرتے ہیں میں اسے

صدائے وطن یا دعاؤں کے جواب کے بجائے وجدان ہی کہوں گا، اور اکثر ان کا وجدان صحیح ہوتا ہے۔ انھوں نے بار بار یہ ثابت کر دیا ہے کہ عوام کی ذہنیت کو سمجھنے اور تنت کے وقت کام کرنے کا انہیں ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ بعد میں وہ اپنے عمل کی جو توجیہیں کرتے ہیں وہ عموماً نکتہ بعد از وقوع کی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی کو مطمئن کر سکیں۔ ہر لیڈر یا عملی آدمی کو نازک موقعوں پر ہمیشہ تحت شعوری کام کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر وہ اپنے عمل کی توجیہیں تلاش کرتا ہے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ سول نافرمانی کو ملتوی کرنے میں گاندھی جی نے وہی کیا جو قرین مصلحت تھا لیکن جو دلیل انھوں نے دی وہ میرے نزدیک عقل و فہم کیلئے باعث توہین تھی اور ایک قومی تحریک کے لیڈر سے بہت بعید تھی۔ انہیں پورا حق حاصل تھا کہ اپنے آشرم والوں کے ساتھ جو چاہتے کرتے، ان حضرات نے طرح طرح کے عہد کئے تھے، ایک خاص ضابطے کی پابندی کا اقرار کیا تھا۔ لیکن کانگریس نے ایسا نہیں کیا تھا اور نہ میں نے کیا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ ہم اس طرح جھلائے جائیں۔ ان وجوہ کی بنا پر جو میرے نزدیک تصوف یا مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں کیا یہ تصور میں آ سکتا ہے کہ کوئی سیاسی تحریک اس بنیاد پر چل سکتی ہے؟ میں نے اپنی خوشی سے ستیہ گرہ کے اخلاقی پہلو کو جہاں تک میں اس کو سمجھ سکتا تھا (بعض شرائط کے ساتھ) تسلیم کیا تھا۔ اس کا بنیادی اصول مجھے پسند تھا کہ وہ سیاست کو بلند تر اور برتر سطح پر پہنچا دے گا۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار تھا کہ اچھے مقصد کیلئے برے ذرائع اختیار کرنا جائز نہیں لیکن اس نئی تاویل کے نتائج بہت دور تک پہنچے تھے اور اس میں ایسے پہلو نکل سکتے تھے جن سے مجھے طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو گئے۔

اس پورے بیان نے مجھے سخت تردد اور پریشانی میں ڈال دیا۔ آخر میں کانگریس والوں کو یہ نصیحت دی گئی تھی۔ انہیں لازم ہے کہ ایثار اور اختیاری افلاس کی خوبیوں کو سمجھیں اور اس کی عادت ڈالیں۔ انہیں چاہئے کہ قومی تعمیر کے کاموں میں

لگ جائیں یعنی خود چرخہ کات کر اور کپڑا بن کر کھدر کو رواج دیں زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کر کے مختلف فرقوں میں قلبی اتحاد پیدا کریں۔ اپنی ذات سے چھوت چھات کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو دور کر دیں۔ ان لوگوں پر جو نشے کے عادی ہیں ذاتی اثر ڈال کر اور خود ہر لحاظ سے ایک صاف زندگی بسر کر کے ترک منشیات کی تلقین کریں۔ ان خدمات کے ذریعہ انسان اتنا کما سکتا ہے کہ غریبوں کیسی زندگی گزار لے۔ لیکن جو لوگ اس قدر عسرت سے بسر نہیں کر سکتے انھیں چاہئے کہ ان چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو جو قوم کیلئے مفید ہیں اور جن میں زیادہ آمدنی کی گنجائش ہے اختیار کر لیں۔

یہ وہ سیاسی پروگرام تھا جس پر ہم لوگوں کو عمل کرنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے اور گاندھی جی کے درمیان ایک بہت بڑا خلیج حائل ہو گیا۔ درد کی ایک ٹیس کے ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ اطاعت اور وفاداری کے جن رشتوں نے سالہا سال سے مجھے ان کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گئے۔ ایک عرصہ سے میرے اندر ایک ذہنی کشمکش جاری تھی۔ گاندھی جی کی بہت سی باتیں یا تو میری سمجھ میں نہیں آئی تھیں یا مجھے پسند نہیں آئی تھیں۔ ان کے فاقے تحریک سول نافرمانی کے زمانے میں جب ان کے ساتھی لڑائی میں مصروف تھی ان کے دوسرے مسائل میں منہمک ہو جانا، ان کی ذاتی اور خود پیدا کی ہوئی پابندیاں جن کی بدولت انہیں عجیب و غریب روش اختیار کرنی پڑی کہ جیل کے چھوٹنے کے بعد بھی اپنے عہد کی رو سے سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، ان کا پرانے تعلقات اور عہد و پیمان کو نظر انداز کر کے اور ان کاموں کو جو بہت سے رفیقوں کے ساتھ مل کر شروع کئے تھے ناتمام چھوڑ کر نئے تعلقات اور نئے عہد و پیماں میں الجھ جانا سب باتوں سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

مجھے اپنی رہائی کے مختصر زمانے میں یہ اور دوسرے اختلافات پہلے سے بھی

زیادہ محسوس ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ میرے اور ان کے مزاج میں اختلاف ہے لیکن شاید یہ اختلافات، اختلاف مزاج سے کچھ بڑھ کر تھے۔ اور میں یہ دیکھتا تھا کہ اکثر معاملات کے متعلق میں ایک صاف اور صریح رائے رکھتا ہوں جو ان کی رائے کے مخالف ہے۔ اس کے باوجود اب تک میں نے یہ کوشش کی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اپنے خیالات کو اس بڑے مقصد یعنی قومی آزادی کے تابع رکھوں جس کے لئے کانگرس کام کر رہی تھی۔ میں اپنے لیڈر اور اپنے رفیقوں کا وفادار رہا اس لئے کہ میرے اصول اخلاق میں وفاداری بہت بلند درجہ رکھتی ہے چنانچہ جب مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرے عقیدے کی کشتی کا لنگر ٹوٹا جاتا ہے تو مجھے سخت روحانی کشمکش کا سامنا ہوتا تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح مفاہمت کر لیا کرتا تھا۔ شاید میں نے غلطی کی، اس لئے کہ یہ کسی شخص کی لئے جائز نہیں کہ اپنے عقیدے کا لنگر ٹوٹ جانے دے۔ بہر حال مقاصد کی کشمکش میں اپنے رفیقوں کی وفاداری پر قائم رہا اور یہ یقین کرتا رہا کہ واقعات کی پر زور رفتار اور ہماری جدوجہد کی ترقی ان ساری مشکلات کو جو میری راہ میں حائل ہیں دور کر دے گی۔ اور میرے رفیقوں کو میرے نقطہ نظر سے قریب تر کر دے گی۔

مگر سوال یہ تھا کہ اب کیا کروں؟ یکایک مجھے علی پور جیل کی اس کوٹھڑی میں شدید تنہائی کا احساس ہونے لگا، زندگی ایک وحشت ناک صحرا کی طرح سنسان نظر آنے لگی۔ مجھ پر اس تلخ ترین حقیقت کا انکشاف ہوا کہ کسی اہم معاملہ میں دوسروں پر بھروسا کرنے سے دل ٹوٹ جاتا ہے۔

میرے دل میں جو غصہ بھرا ہوا تھا وہ میں مذہب اور جذبہ مذہب پر اتارنے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہ فصاحت خیال اور استقامت رائے کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ اس کی بنیاد محض جذبہ اور جوش پر ہے۔ اسے روحانیت کا دعویٰ ہے مگر حقیقت میں یہ روحانیت سے کوسوں دور ہے۔ اسے تو بس دوسری دنیا کی فکر ہے۔

انسانی مقاصد، سماجی مقاصد اور سماجی انصاف سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اپنے من مانے عقائد میں مگن رہتا ہے اور زندگی کی حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ کہیں یہ ان عقائد سے ٹکرا نہ جائے۔ اس نے اپنی بنیاد حق پر رکھی ہے لیکن اس گھمنڈ میں کہ اس نے حق کی کام معرفت حاصل کر لی ہے وہ تلاش حق کی زحمت نہیں گوارا کرتا اور اب اس کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ دوسروں کو تلقین کرے۔ حق پرستی اور عقیدہ پرستی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارومدار ظلم پر ہے۔ وہ تلوار کے جبر و تشدد کو برا کہتا ہے لیکن اس جبر و تشدد کو نہیں دیکھتا جو خاموشی کے ساتھ امن کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے اور کروڑوں غریبوں کو فاقوں مار ڈالتا ہے اور اس سے بدتر یہ کہ بظاہر کوئی جسمانی تکلیف پہنچائے بغیر ذہن کو شل کر دیتا ہے، روح کو کچل دیتا ہے اور دل کو توڑ دیتا ہے۔

اور اس کے بعد مجھے پھر اس شخص کا خیال آیا جو میرے اندر یہ ہیجان برپا کرنے کا باعث تھا۔ گاندھی جی بھی کس قدر عجیب و غریب آدمی ہیں۔ ان میں ایک حیرت انگیز کشش اور ایک پراسرار تاثیر ہے۔ ان کی تحریروں سے اور ان کے اقوال سے کوئی ان کی ذات کو نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ بلند ہے جتنا ان چیزوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کی انہوں نے کس قدر زبردست خدمت کی ہے۔ انہوں اس ملک کے باشندوں میں ہمت اور مردانگی، انضباط اور تحمل کی صفات پیدا کیں، انہیں مقصد کی خاطر قربانی کرنا سکھایا اور اپنے عجز و انکسار کے باوجود ان کے دلوں کو فخر و تمکنت سے معمور کر دیا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ سیرت کی محکم بنیاد صرف ایک ہی ہے یعنی ہمت بغیر ہمت کے نہ اخلاق کوئی چیز ہے، نہ مذہب اور نہ محبت جب تک انسان ڈرتا ہے اس وقت تک نہ وہ حق کی پیروی کر سکتا ہے نہ محبت کی راہ پر چل سکتا ہے۔ تشدد سے اس قدر بیزار ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیں

بتایا تھا کہ بزدلی ایسی چیز ہے جو تشدد سے بھی زیادہ قابل نفرت ہے اور انضباط اس کی دلیل ہے کہ انسان جو کچھ کہتا ہے وہ کر دکھائے گا۔ ایثار، انضباط اور ضبط نفس کے بغیر نہ فلاح کی امید ہے اور نہ نجات کی صورت۔ جب تک انضباط نہ ہو صرف ایثار و قربانی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بظاہر یہ خالی خولی الفاظ پیش پا افتادہ معلوم ہوتے ہے۔ لیکن ان الفاظ کے پیچھے ایک قوت تھی اور سارا ہندوستان یہ جانتا تھا کہ یہ چھوٹا سا انسان جو کچھ کہتا ہے وہ کر دکھائے گا۔

ان کی ذات ہندوستان کی نمائندہ اور اس قدیم اور مظلوم ملک کی روح مظہر بن گئی گویا وہ مجسم ہندوستان تھے اور ان کی تمام کمزوریاں ہندوستان کی کمزوریاں تھیں۔ اگر ان کی کوئی توہین کرے تو یہ ایک محض ذاتی معاملہ نہیں بلکہ سارے ملک کی توہین تھی اور وائسرائے یا دوسرے حضرات جو ان کے ساتھ حقارت کا اظہار کرتے تھے، یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے نتائج کس قدر خطرناک ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دسمبر ۳۱ء میں گول میز کانفرنس سے واپسی کے وقت جب پاپائے اعظم نے گاندھی جی سے ملاقات کرنے سے انکار کیا تو مجھے کتنا رنج ہوا تھا۔ میرے نزدیک ان کے انکار سے ہندوستان کی توہین ہوئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ انکار قصداً کیا گیا تھا اگرچہ غالباً اس سے ان کی توہین مقصود نہ تھی۔ کیتھولک کلیسا اپنے حلقے کے باہر مہاتماؤں اور سنیاسیوں کی بزرگی تسلیم نہیں کرتا اور چونکہ پروٹسنٹ پادریوں نے گاندھی جی کو ایک بہت بڑا مذہبی آدمی اور سچا عیسائی کہا تھا اس لئے کلیسائے کے روم کے لئے یہ اور ضروری ہو گیا کہ اس الحاد سے اپنی بے تعلقی ظاہر کر دے۔

اسی زمانے میں یعنی اپریل ۳۲ء میں نے علی پور جیل کے اندر برنرڈ شا کے نئے ڈرامے پڑھے اور چٹانوں کے اوپر کا دیباچہ اور اس میں حضرت مسیح اور پائلٹ کا مباحثہ مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہمارے زمانہ پر صادق آتا ہے جب کہ ایک اور سلطنت کا ایک مذہبی آدمی سے مقابلہ ہے۔ اس دیباچہ میں حضرت

مسیح پائیلٹ سے کہتے ہیں کہ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو خون کو ترک کر دے۔ روم کی عظمت کے متعلق بے کار باتیں نہ کر۔ جسے تو روم کی عظمت کہتا ہے وہ سوائے خوف کے اور کچھ نہیں۔ ماضی کا خوف، مستقبل کا خوف، غریبوں کا خوف، امیروں کا خوف، مہنتوں کا خوف، ذی علم یہودیوں اور یونانیوں کا خوف، وحشی گاتھوں اور ہنوں کا خوف، اس کارتھج کا خوف جسے تم نے اس لئے برباد کیا کہ تم اس سے ڈرتے تھے اور سب سے بڑھ کر خود اپنے تراشتے ہوئے بت قیصر روم کا خوف، اور مجھ جیسے غیرب بے کس آدمی کا خوف جو در بدر ذلتیں سہتا اور دھکے کھاتا پھرتا ہے، غرض خوف ہر چیز کا سوائے خوف خدا کے، اور کسی چیز پر ایمان نہیں سوائے خون اور لوہے اور سونے کے تم جو روم کی حمایت کے لئے کھڑے ہو دنیا بھر کے بزدل ہو اور میں جو سلطنتِ الٰہی کی حمایت کے لیے کھڑا ہوا ہوں ہر مصیبت کا مقابلہ کیا سب کچھ کھو دیا اور ایک ابدی تاج حاصل کر لیا۔

لیکن اس وقت گاندھی جی کی عظمت، یا ان کی ملکی خدمات، یا ان بے شمار احسانات کا جو انہوں نے مجھ پر کئے ہیں، کوئی سوال نہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ ممکن تھا کہ بعض معاملات میں وہ سراسر غلطی پر ہوں، میں اس الجھن میں تھا کہ آخر ان کا مقصد کیا ہے؟ سالہا سال سے میرے ان کے گہرے تعلقات ہیں لیکن آج تک ان کا مقصد صاف طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور مجھے شبہ ہے کہ شاید وہ خود بھی اسے صاف طور پر نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے لئے بس ایک قدم کافی ہے۔ نہ وہ مستقبل کے متعلق غور کرتے ہیں اور نہ کوئی واضح مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ بار بار کہتے کہا کرتے ہیں کہ تم وسائل اور ذرائع کی فکر کرو مقصد اپنی فکر آپ کر لے گا۔ اپنی انفرادی زندگی کو نیک بناؤ پھر سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔ لیکن یہ طرز خیال نہ سیاسی ہے اور نہ علمی اور نہ غالباً اخلاقی ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک تنگ نظرانہ ناصحانہ انداز ہے اور اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیکی کیا

ہے؟ یہ محض انفرادی چیز ہے یا اجتماعی؟ گاندھی جی سیرت پر سارا زور دیتے ہیں اور ذہنی تربیت اور نشوونما کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ ذہنی قابلیت بغیر اخلاقی سیرت کے خطرناک ہوتی ہے، لیکن سیرت بغیر ذہنی قابلیت کے کیا معنی رکھتی ہے؟ آخر سیرت کی نشوونما کیونکر ہوتی ہے؟ گاندھی جی کو قرونِ وسطے کے عیسائی ولیوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور ان کے بہت سے اقوال ان لوگوں کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہیں۔ لیکن موجودہ نفسیاتی تجربات اور طریقوں کے ساتھ یہ باتیں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں۔

لیکن اور جو کچھ بھی ہو مقصد کا مبہم ہونا میرے خیال میں بہت افسوس ناک ہے اگر عمل کو موثر بنانا ہے تو ایک معین اور واضح مقصد سامنے ہونا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی سراسر منطق کی پابند نہیں اور وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے مقصد میں تبدیلی کرنا پڑے گی لیکن کوئی نہ کوئی مقصد ہمیشہ صریحی طور پر پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

غالباً مقصد کے متعلق گاندھی جی کے خیالات اتنے زیادہ مبہم نہیں ہیں جتنے بظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک خاص مقصد ہے اور وہ دل و جان سے اسے حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں لیکن اس مقصد اور دور حاضرہ کے حالات اور خیالات میں بھی پورا اختلاف ہے اور وہ اب تک ان دونوں چیزوں میں مطابقت نہیں پیدا کر سکے اور نہ ان وسائل کو سوچ سکے جن سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات مبہم معلوم ہوتے ہیں اور وہ خود انہیں واضح کرنے سے بچتے ہیں۔ لیکن ان کا عام رجحان چوتھائی صدی سے بالکل صاف اور واضح رہا ہے جب سے کہ انہوں نے جنوبی افریقہ میں اپنے فلسفے کو ترتیب دینا شروع کیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب بھی ان کے وہی خیالات ہیں جو ابتدائی تحریروں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ شاید اب ان میں کچھ تبدیلی ہوگئی ہے مگر پھر ان تحریروں سے ان کی

خیالات کی بنیاد کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹۰۹ء میں انہوں نے لکھا تھا کہ ہندوستان کی نجات اس پر موقوف ہے کہ گذشتہ پچاس سال کے اندر اس نے جو سیکھا ہے اس کو بھلا دے۔ ریلیں، تار، ہسپتال وکلاء، ڈاکٹر اور اس قسم کی تمام چیزیں ختم ہو جانی چاہیں اور جو اونچے طبقے کہلاتے ہیں انہیں شعوری اور ارادی طور پر جوش اور خلوص کے ساتھ کسان کی سادہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے یہ جان کر کہ حقیقی مسرت اس زندگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر مرتبہ جب میں ریل گاڑی یا موٹر میں سوار ہوتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے عقیدے پر ظلم کر رہا ہوں۔ انتہا درجے کی مصنوعی اور تیز رفتار سواریوں کے ذریعے دنیا کی اصلاح کی کوشش کرنی ہے طلب محال سے کم نہیں۔

میرے نزدیک یہ تمام اصول بالکل غلط، مضر اور نا قابل حصول ہیں۔ ان کہ تہ میں افلاس، مصیبت اور راہبانہ زندگی کی محبت اور قدر پوشیدہ ہے جو گاندھی جی کے دل میں ہے۔ ان کے نزدیک ترقی اور تہذیب بلند معیار زندگی پر احتیاجات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اس پر موقوف ہے کہ انسان بالقصد اور خوشی سے اپنی احتیاجات کو محدود کرے، اسی سے حقیقی خوشی اور قناعت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے خدمت کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔ اگر یہ مقدمات ایک بار تسلیم کر لئے جائیں تو پھر گاندھی جی کے بقیہ خیالات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور ان کے عمل کی نوعیت بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگ ان کے ان اصولوں کو تو تسلیم نہیں کرتے اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ ان کا عمل ہماری پسند کے مطابق ہو اور جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر شکایت کرتے ہیں۔

ذاتی طور پر میں افلاس اور مصیبت کی تعریفوں کو برا سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک دونوں چیزیں ہرگز پسندیدہ نہیں ہیں اور ان کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ اس طرح میں راہبانہ زندگی کو اجتماعی مقصد کی حیثیت سے پسند نہیں کرتا اگرچہ ممکن ہے

کہ وہ بعض افراد کے لئے موزوں ہو۔ سادگی، مساوات اور ضبط نفس کا میں بھی قائل ہوں مگر نفس کشی کا نہیں۔ میرے خیال میں جس طرح ورزش کرنے والے کو جسم کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح نفس اور عادتوں کی تربیت کرنا اور انہیں قابو میں لانا بھی ضروری ہے۔ یہ توقع کرنا حماقت ہوگی کہ ایک شخص جو بہت آرام طلب ہے موقع پر سخت تکلیفیں اٹھا سکے گا، غیر معمولی ضبط نفس سے کام لے سکے گا یا کوئی بہادری کا کام کر سکے گا۔ اخلاقی صحت کے لئے کم از کم اتنی ہی تربیت اور محنت کی ضرورت ہے جتنی جسمانی صحت کے لئے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ رہبانیت اور نفس کشی اختیار کی جائے۔

اور نہ مجھے یہ پسند ہے کہ کسان کی سادہ زندگی کو اس قدر بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے۔ مجھے تو اس زندگی سے وحشت ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ میں خود اس کو اختیار کروں میں چاہتا ہوں کہ کسانوں کو اس سے نجات دلاؤں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دیہات کو شہر بنا دیا جائے بلکہ یہ ہیں کہ دیہاتی علاقوں میں شہر کی تمدنی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ یہ زندگی بجائے اس کے کہ اس زندگی سے مجھے مسرت حاصل ہو میرے لئے قید سے کم نہ ہوگی۔ پھاوڑا چلانے والے آدمی میں کون سی ایسی خوبی ہے کہ اس کی اس قدر تعریف کی جائے؟ وہ پشت ہا پشت سے اس قدر لوٹا اور کچلا گیا ہے کہ جن جانوروں کے ساتھ وہ رہتا ہے۔ ان میں اور اس میں بہت تھوڑا سا فرق رہ گیا ہے۔

"کس نے اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ نہ اسے رنج کا احساس
ہے نہ مسرت کا، نہ اس کے دل میں امید کی لگن ہے نہ یاس کی خلش"
وہ بیل کی طرح ٹھس اور مٹھا ہو کر رہ گیا ہے۔"

یہ خواہش کہ عقل کو خیرباد کہہ کر اس ابتدائی عہد کی طرف رجوع کیا جائے جس میں عقل کسی شمار میں نہ تھی، میرے لئے بالکل ناقابل فہم ہے۔ اس چیز کو جو انسان کی

عظمت وشان کی بنیاد ہے برا کہا جاتا ہے اور ایک خالص جسمانی اور مادی زندگی، جس میں ذہنی اور روحانی نشوونما کی گنجائش نہ ہو، پسندیدہ قرار دی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ تہذیب میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ لیکن اس میں خوبیاں بھی بہت ہیں اور وہ اپنی خرابیوں کو دور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ لیکن اسے جڑ سے کھود کر پھینک دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی یہ صلاحیت مٹا دی جائے اور ایک بے کیف، تاریک اور مصیبت کی زندگی کی طرف رجوع کیا جائے۔ نہ ہم انقلابات اور تغیر کے اس سیلاب کو روک سکتے ہیں اور نہ اس سے کنارہ کش ہو سکتے ہیں۔ اور نفسیاتی حیثیت سے ہم لوگ جو جنت عدن کے سیب کا مزہ چکھ چکے ہیں، اس مزے کو کبھی نہیں بھول سکتے اور ابتدائی زندگی کی طرف ہرگز نہیں لوٹ سکتے۔

لیکن یہاں بحث اور دلیل سے کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ یہ دونوں نقطہ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ گاندھی ہمیشہ شخصی نجات کے اور گناہ کے نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگوں کا نصب العین سماج کی فلاح و بہبود ہے۔ گناہ کے تخیل کو سمجھنا میرے لئے دشوار ہے اور شاید اسی لئے میں گاندھی جی کے طرز خیال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ انہیں سماجی زندگی کے نظام کا بدلنا مقصود نہیں بلکہ وہ افراد کے نفس کو گناہ سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ سودیشی کا ماننے والا یہ لاحاصل کوشش نہیں کرتا کہ دنیا کی اصلاح کرے، اس لئے کہ اس کا ایمان ہے کہ دنیا خدا کے بنائے ہوئے قاعدوں کے مطابق چلتی ہے اور ہمیشہ چلتی رہے گی۔ اس کے باوجود دنیا کی اصلاح کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے پیش نظر انفرادی اصلاح ہے یعنی حسیات اور خواہشات پر، جن کا پورا کرنا گناہ ہے، قابو حاصل کرنا۔ غالباً وہ آزادی کی اس تعریف سے اتفاق کریں گے جو ایک رومن کیتھولک مصنف نے فاشزم کے متعلق اپنی کتاب میں کی ہے۔ آزادی اس کے سوا کچھ نہیں کہ گناہ کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔ لندن کے لاٹ پادری نے جو

الفاظ اب سے دو سال پہلے لکھے تھے وہ اس سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ عیسائیت جو آزادی بخشتی ہے وہ آزادی ہے گناہ کی زنجیروں سے شیطان سے اور انسان کے جذبات، شہوات اور ناجائز خواہشات کی حکومت سے۔

اگر یہ نقطہ نظر ایک بار اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر جنسی تعلقات کے متعلق گاندھی جی کا طرز خیال کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ آج کل کے عام آدمیوں کو عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر اولاد کی خواہش مفقود ہو تو پھر ہر قسم کا جماع جرم ہے اور (منع حمل کے) مصنوعی طریقے اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ نامردی اور اعصاب کی کمزوری ہوگا۔ اپنے عمل کے نتائج سے بچنے کی کوشش کرنا ناجائز اور منافی اخلاق ہے اس کے لئے یہ برا ہے کہ شہوانی خواہشات کو دل کھول کر پورا کرے اور ان کے نتائج سے بچنے کے لئے مقویات اور دوسری دواؤں کا استعمال کرے اور یہ اس سے بھی بدتر ہے کہ اپنی خواہشوں کو نہ روکے مگر اپنے فعل کے فطری نتیجے (یعنی حمل) کو روکنے کی کوشش کرے۔

میں ذاتی طور پر اس طرز خیال کو خلاف فطرت اور خوفناک سمجھتا ہوں اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں تو میں ایک مجرم ہوں اور عنقریب نامردی اور اعصابی کمزوری میں مبتلا ہونے والا ہوں۔ رومن کیتھولک مذہب والوں نے بھی شدت ضبط سے تولید کی مخالفت کی ہے۔ لیکن وہ منطقی استدلال کی اس انتہا تک پہنچے جہاں گاندھی جی پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے مصلحت سے کام لیا ہے اور انسانی فطرت کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ لیکن گاندھی جی نے اپنے دلائل کو دھر تک پہنچا دیا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی جماع کے جواز اور ضرورت کو تسلیم ہی نہیں کرتے سوائے اس کے کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی غرض سے کیا جائے۔ بلکہ وہ تو اس سے بھی انکار کرتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان کوئی فطری جنسی کشش ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اصول ناقابل عمل ہے اور میں نے اس

فطری کشش کا لحاظ نہیں رکھا جو مرد اور عورت میں ہوتی ہے میں اسے ہرگز نہیں مانتا کہ جس شہوانی کشش کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ کسی صورت میں بھی فطری کہی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو وہ ہے جو بھائی بہن، ماں بیٹے، باپ بیٹی کے درمیان ہوتی ہے، اور یہی فطری کشش ہے جس سے دنیا قائم ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ پر زور الفاظ میں نہیں، میں اپنی پوری قوت کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان شہوانی کشش خلاف فطرت ہے۔

اس زمانے میں جب اڈیپس گرہ اور فرائڈ اور تحلیل نفسی کا دور دورہ ہے یہ عقیدہ، جو اس زور شور سے ظاہر کیا گیا ہے، عجیب اور دور از کا معلوم ہوتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو انسان اس عقیدے پر ایمان لائے یا اس سے انکار کر دے۔ کوئی درمیانی راہ اختیار کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ یہ عقل کا نہیں بلکہ عقیدے کا سوال ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ سمجھتا ہو کہ گاندھی جی اس معاملہ میں سراسر غلطی پر ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض خاص صورتوں کے لئے ان کا مشورہ موزوں ہو لیکن اگر یہ عام اصول قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر مایوسی، نفسی رکاوٹ، خلل اعصاب اور طرح طرح کی جسمانی اور اعصابی بیماریاں ہوں گی۔ ضبط نفس یقیناً پسندیدہ چیز ہے لیکن مجھے شبہ ہے گاندھی جی کے اصول کی پابندی سے ضبط نفس کا فروغ پانا دشوار ہے۔ یہ اصول بے حد سخت ہے اور اکثر لوگ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے اس لئے یا تو وہ اپنے پرانے طریقے پر قائم رہتے ہیں یا پھر میاں بیوی میں ان بن ہو جاتی ہے۔ بظاہر گاندھی جی کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ ضبط تولید کا منشا لازمی طور پر نفس پرستی اور بے اعتدالی ہے۔ اور اگر عورت و مرد کے درمیان جنسی کشش کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہر مرد اور ہر عورت کے پیچھے اور ہر عورت ہر مرد کے پیچھے دوڑتی پھرے گی۔ لیکن یہ دونوں نتیجے بے انصافی پر مبنی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی کے ذہن پر

جنسی مسئلہ وہ کتنا ہی اہم سہی، کیوں اس قدر مسلط ہو گیا ہے۔ ان کے نزدیک تو سیاہ و سفید کا سوال ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں کوئی اور رنگ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ ضبط نفس اور نفس پرستی دونوں کو انتہائی صورت میں پیش کرتے ہیں جو میرے نزدیک غیر طبعی اور خلاف فطرت ہے۔ شاید یہ ان جنسیات کی کتابوں کا ردعمل ہو جو آجکل سیلاب کی طرح اُمڈ رہی ہیں۔ میرا اپنے متعلق یہ خیال ہے کہ میں ایک طبعی انسان ہوں اور میری زندگی میں جنسی جذبات کو بھی دخل رہا ہے، لیکن نہ یہ کبھی میرے نفس پر مسلط ہوئے اور نہ ان کی وجہ سے میرے دوسرے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ یہ محض ایک ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔

اصل میں ان کی روش ایک تارک الدنیا راہب کی سی ہے جو زندگی کی نفی کرتا ہے۔ اور اس کو شر محض سمجھتا ہے۔ ایک راہب کے لئے تو یہ ایک قدرتی بات ہے، لیکن اس اصول کو دنیا دار مردوں اور عورتوں میں جو زندگی کا اثبات کرتے ہیں اور اس سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، نافذ کرنا دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح ایک برائی سے بچنے کے لئے بہت سی دوسری برائیوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ شدید ہیں۔

بات میں بات نکل آئی اور میں اپنے موضوع سے دور ہو گیا۔ لیکن علی پور جیل میں ان مصیبت کے دنوں میں میرے دل پر ان خیالات کا ہجوم تھا اور وہ بھی ربط اور سلسلے کے ساتھ نہیں بلکہ بے حد بے ترتیبی اور پریشانی کی حالت میں جس سے مجھے سخت الجھن اور کوفت تھی۔ اور پھر تنہائی اور اداسی کا احساس تھا جس میں جیل اور کال کوٹھری کی دم گھوٹنے والی فضا نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو اس صدمے کا اثر زیادہ دیر تک نہ رہتا بلکہ میں بہت جلد نئے حالات سے نبٹ لیتا اور اظہار خیال اور عمل سے تسکین حاصل کرتا۔ مگر جیل میں اس قسم کی تسکین کی کوئی صورت نہ تھی اور میں نے کچھ دن بڑی مصیبت اور تکلیف میں گذارے۔ خوش قسمتی

سے میری طبیعت میں اتنی لچک ہے کہ مجھے مایوسی کے دورے سے بہت جلد افاقہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری یہ افسردگی رفتہ رفتہ دور ہونے لگی اور اس کے بعد جیل میں کملا سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور تنہائی کا احساس جاتا رہا۔ میں نے سوچا کہ جو کچھ بھی ہو کم سے کم ہم دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو موجود ہیں۔

۱۔ یہ خط پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

۲۔ پاپائے اعظم پائس یازدہم نے اپنے فرمان میں، جو عیسائیوں کے نکاح کے متعلق ۳۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جاری کیا تھا، فرماتے ہیں "یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شادی شدہ لوگ قانون فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے وقوف کا استعمال فطری اور معقول وجوہ کی بناء پر کریں، چاہے اس صورت میں صورت کے حالات یا کسی نقص کی وجہ سے بچہ پیدا ہونے کا امکان نہ بھی ہو۔" "وقت کے حالات" کا اشارہ صریحی طور پر اس "بے خطر" زمانے کی طرف ہے جب استقرار حمل کا احتمال نہ ہو۔

۳۔ تحلیل نفسی کا یہ نظریہ کہ ماں بیٹے اور باپ بیٹی کے درمیان جنسی کشش ہوتی ہے۔

متضاد باتیں

جو لوگ گاندھی جی سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اور صرف ان کی تحریروں کو پڑھتے ہیں وہ غالباً یہ خیال کرتے ہوں گے کہ گاندھی جی اسی قسم کے آدمی ہیں جیسے مذہبی پیشوا ہوا کرتے ہیں۔ یعنی رونی صورت، بسورتی شکل کے زاہد خشک، کالوینی فرقے کے پیرووں کی طرح خوشی اور زندہ دلی کے دشمن، ان پادریوں سے کچھ کچھ مشابہ جو سیاہ چغے پہنے ہوئے پیدل پھرا کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریریں ان کی غلط تصویر پیش کرتی ہیں، اور ان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ ہم صرف ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر ان پر تنقید کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کالوینی پادریوں کے بالکل برعکس ہیں ان کی مسکراہٹ دل کو لبھاتی ہے، ان کی ہنسی روتوں کو ہنساتی ہے، ان کی ذات فرحت و انبساط کا سرچشمہ ہے۔ ان میں بچوں کا سا بھولا پن ہے جس میں ایک عجیب دلکشی ہے۔ جب وہ کسی کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے تازہ ہوا کا جھونکا آگیا جس نے فضا کی کثافت کو دور کر دیا۔

وہ ایک عجیب مجموعہ اضداد ہیں اور میرا خیال ہے کہ سب بڑی شخصیتیں کسی حد تک ایسی ہی ہوتی ہیں۔ سالہا سال میں سے اس الجھن میں ہوں کہ آخر اس تمام محبت اور تعلق کے باوجود جو انہیں غریبوں کے ساتھ ہے، وہ کیوں ایک نظام کی حمایت کرتے ہیں جو خود ہی لوگوں کو مفلس بناتا ہے اور پھر انہیں کچلتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ عدم تشدد کی اس قدر جوش و خروش سے تلقین کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسے سیاسی اور معاشرتی کے حامی ہیں۔ اصل میں وہ ایک قسم کے نراجی فلسفے کے قائل ہیں۔ لیکن چونکہ نراجی ریاست کا قیام ابھی بہت دور ہے اور اس کا آسانی سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے دو چار و ناچار موجودہ نظام کو قبول کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سماجی نظام کو تشدد کے ذریعے سے بدلنے پر انہیں جو

عتراض ہے وہ محض وسائل تک محدود نہیں ہے اس لئے کہ وسائل سے قطع نظر کر کے اس نظام کو بدلنے کا ایک ایسا نصب العین مقرر کیا جا سکتا ہے جو مستقل قریب میں حاصل ہو سکے۔

کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اشترا کی کہتے ہیں، لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں جو انہیں کے ذہن میں ہیں اور ان کی اشترا کیت کو سوسائٹی کے اس معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں جو بالعموم اشترا کیت کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تقلید میں بہت سی ممتاز کانگریسیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ اور اس سے ان کی مراد ایک قسم کی انسانی ہمدردی ہے۔ سیاسی اصطلاحوں کا یہ مبہم استعمال انہیں حضرات کے لئے مخصوص نہیں بلکہ بڑے بڑے آدمی ان کے ساتھ شریک ہیں چنانچہ ان کے سامنے برطانیہ کی نیشنل گورنمنٹ کے وزیر اعظم کی مثال موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ گاندھی جی اس موضوع سے ناواقف نہیں ہیں ا نہوں نے معاشیات، اشترا کیت، بلکہ مارکس کے فلسفلے پر بھی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور اس پر دوسروں سے بحث اور تبادلہ خیال کر چکے ہیں، لیکن میرا روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ اہم معاملات میں عقل و دماغ بجائے خود ہماری کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے۔ ولیم جیمس نے لکھا ہے اگر تمہارا دل نہ چاہے تو یقیناً تمہارا دماغ تمہیں کچھ قائل نہیں کر سکتا جذبات ہمارے تصور زندگی پر حاوی ہیں اور دماغ پر حکومت کرتے ہیں، ہماری گفتگو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا معاشی اصل میں جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے جیسا کہ شوپنہار نے کہا ہے انسان جو ارادہ کر لے وہ کر سکتا ہے مگر ارادہ اس کے اختیار میں نہیں۔

جنوبی افریقہ کے ابتدائی دور میں گاندھی جی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوئی جس نے انہیں بے حد متاثر کیا اور ان کا سارا تصور زندگی بدل دیا۔ اس وقت سے ان کے خیالات ایک خاص بنیاد پر قائم ہو گئے ہیں اور ان کا دماغ نئ

باتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جو لوگ نئی تجویزیں پیش کرتے ہیں ان کی باتوں کو وہ بہت صبر و سکون اور توجہ سے سنتے ہیں لیکن اس دلچسپی کے باوجود جو وہ اخلاقاً ظاہر کرتے ہیں کہنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کے دل کا دروازہ بند ہے۔ وہ اس مضبوطی سے بعض خیالات پر قائم ہیں کہ ان کے علاوہ اور تمام باتیں ان کو غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے ضمنی معاملات پر زور دینے سے اس بڑے کام میں خلل پڑتا ہے جو ان کے پیش نظر ہے، جب انسان ایک بنیادی خیال پر رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے مسائل خود بخود ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ اگر مقدمات صحیح ہیں تو نتیجہ یقیناً صحیح ہوگا۔

یہ میرے نزدیک ان کے خیالات کی اصل بنیاد ہے۔ وہ اشتراکیت خصوصاً مارکسیت کو شبہے کی نظر میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تحریکیں تشدد سے وابستہ ہیں طبقوں کی جنگ کے الفاظ ہی سے ان کو تشدد اور لڑائی کی بو آتی ہے۔ اور اس لئے انہیں اس سے نفرت ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ عام لوگوں کا معیار زندگی ایک مقررہ حد سے بڑھنے پائے۔ اس لئے کہ بلند معیار زندگی اور فرصت سے اندیشہ ہے کہ لوگ عیش پرستی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہی کیا کم برا ہے کہ تھوڑے سے خوش حال لوگ عیش پرست ان گئے ہیں، یہ اور بھی برا ہوگا کہ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ایک خط لکھا تھا۔ جس سے اس قسم کے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک خط کا جواب تھا جو کوئلے کی بڑی ہڑتال کے زمانے میں ان کے پاس انگلستان سے آیا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ اس معاملہ میں مزدوروں کو شکست ہوگی کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور انہیں چاہئے کہ ضبط تولید کا طریقہ استعمال کر کے اپنی تعداد کو کم کریں۔ گاندھی جی نے اپنے جواب کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر کانوں کے مالک حق پر نہ ہونے کے باوجود جیت جائیں تو اس کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ مزدوروں کے حد سے زیادہ

اولاد ہوتی ہے بلکہ یہ کہ مزدور کسی چیز میں ضبط نفس سے کام نہیں لیتے، اگر مزدوروں کے اولاد نہ ہوتی تو ان کے لئے ترقی کا کوئی محرک نہ رہتا اور وہ مزدوری بڑھانے کے لئے کوئی ایسی دلیل پیش نہ کرسکتے جس کا ثبوت آسان ہو، کیا ان کے لئے شراب نوشی، جوا کھیلنا، تمباکو پینا ضروری ہے! یہ کوئی جواب نہیں کہ کانوں کے مالک بھی یہی سب حرکتیں کرتے ہیں۔ اور پھر بھی غالب رہتے ہیں، اگر مزدور سرمایہ داروں سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے تو انہیں دنیا کی ہمدردی چاہئے کا کیا حق ہے؟ یہی کہ سرمایہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہو اور سرمایہ داری کو اور قوت حاصل ہو جائے؟ ہم سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کرو اس لئے کہ جب اس کا دور دورہ ہوگا تو دنیا کی حالت بہتر ہو جائے گی یہ نہ ہو کہ ہم انہیں برائیوں کو جو سرمایہ دار اور سرمایہ داری کی طرف منسوب کی جاتی ہیں بہت بڑے پیمانے پر پیدا کردیں۔

جب میں اس کو پڑھ رہا تھا تو فاقہ کش مزدور کان کنوں ان کی بیویوں اور بچوں کے اترے ہوئے چہرے میری آنکھوں میں پھر گئے جن کو میں نے ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں بے بسی کی حالت میں ایک ایسے خوفناک نظام کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا جو انہیں کچلے ڈالتا تھا۔ گاندھی جی کے بیان کردہ واقعات بھی صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ کان کن مزدوری میں اضافے کا مطالبہ نہیں کررہے تھے بلکہ اس لئے لڑ رہے تھے کہ ان کی مزدوری کم کردی گئی تھی، اور وہ کام سے ہٹا دئے گئے تھے بہرحال اس وقت ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں اور نہ اس سے غرض ہے کہ کان کن مزدور ضبط تولید کے طریقے استعمال کریں یا نہ کریں اگرچہ اس میں شک نہیں کہ صنعتی جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے یہ ایک غیر معمولی تجویز ہے۔

میں نے گاندھی جی کے جواب سے یہ ٹکڑا اس لئے نقل کیا ہے کہ یہ اندازہ ہوسکے کہ مزدوروں کے مسائل اور ان کے معیار زندگی کو بڑھانے کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ نقطہ نظر اشتراکیت بلکہ سرمایہ داری کے نقطہ نظر سے بھی

کوسوں دور ہے۔ یہ اگر کہا جائے کہ سائنس اور صنعتی تنظیم آج ہر شخص کے کھانے پہننے، رہنے سہنے کا معقول بندوبست کرسکتی ہے اور ان کے معیار زندگی کو بہت بلند کرسکتی ہے بشرطیکہ مستقل حقوق رکھنے والے اس میں مداخلت نہ کریں تو اس سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ وہ لوگوں کے معیار زندگی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کے قائل ہی نہیں۔ چنانچہ اشتراکیت سے جو امیدیں ہیں وہ ان کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتیں بلکہ ان کے نزدیک سرمایہ داری پھر بھی ایک حد تک قابل برداشت ہے اس لئے کہ وہ عیش پرستی کے گناہ کو ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود رکھتی ہے۔ انہیں ان دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں۔ لیکن فی الحال وہ سرمایہ داری سے نباہ رہے ہیں اس لئے کہ یہ اتنی بری نہیں اور پھر یہ ایک امر واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ممکن ہے کہ میں یہ خیالات ان کی طرف منسوب کرنے میں غلطی کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ذہن کا عام رجحان یہی ہے اور ان کی تحریر و تقریر میں ہمیں جو الجھن اور پیچیدگی نظر آتی اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ ان خیال کی بنیاد ہی دوسری ہے وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ روز افزوں آرام و آسائش اور فرصت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، بلکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی زندگی کو سدھارنے کی فکر کریں، بری عادتوں کو ترک کریں، خواہشات کو کم کرتے رہیں اور اس طریقے سے اپنی انفرادی اور روحانی اصلاح کریں، اور جو لوگ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کی مادی زندگی کی سطح کو بلند کریں بلکہ خود ان کی سطح پر اتر آئیں اور مساوی حیثیت سے ان کے ساتھ میل جول پیدا کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو لازمی طور پر عام لوگوں کی سطح زندگی کسی قدر بلند ہو جائے گی یہی گاندھی جی کے نزدیک حقیقی جمہوریت ہے۔ اس بیان میں جو انہوں نے ۱۷ ستمبر ۳۴ء کو شائع کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری مخالفت کرنا بیکار ہے اس لئے

کہ میرے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے جیسے پیدائشی جمہوریت پسند کے لئے یہ انکشاف باعث شرم ہے۔ اگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو غریب سے غریب لوگوں میں کھپا دیا ہے، جس کی یہ آرزو ہے کہ انہیں کی سی زندگی بسر کرے اور اسی کے ساتھ پوری کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس سطح پر پہنچ جائے، جمہوریت پسندی کا دعویٰ کر سکتا ہے تو میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں۔

اس استدلال سے غالباً موجودہ زمانے کا کوئی جمہوریت پسند یا سرمایہ دار، یا اشتراکی اتفاق نہیں کرے گا بجز اس کے کہ یہ بات معیوب اور نامناسب ہے کہ ہم عام لوگوں سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کرلیں اور اپنے تعیشات اور بلندتر معیار زندگی کی نمائش ان بے شمار آدمیوں کے سامنے کریں۔ جو ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کی چیزوں کے بھی محتاج ہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو قدیم مذہبی نقطہ نظر رکھتا ہے شاید کسی حد تک اس سے متفق ہو اس لئے کہ یہ دونوں اپنے جذبات کے اعتبار سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ہر چیز کو ماضی کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہیں اس کی زیادہ فکر ہے کہ کیا ہو چکا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ان لوگوں میں جو نفسیاتی حیثیت سے ماضی سے وابستہ ہیں اور ان میں جو مستقبل پر نظر رکھتے ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم زمانے میں عام لوگوں کی معاشی سطح کو بلند کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غریبوں کا وجود لازمی تھا۔ مٹھی بھر دولتمند آدمی اس زمانے میں سماج کے روح رواں تھے اور ان کا ہونا نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری تھا اس لئے اخلاقی مصلحوں، اور اہل دل نے ان کے وجود کو جائز رکھا لیکن اسی کے ساتھ انہیں یہ تلقین کرتے رہے کہ ان کے حاجتمند بھائیوں کا بھی ان پر کچھ حق ہے۔ وہ غریبوں کے امانت دار ہیں۔ انہیں خیرات کرنا چاہئے۔ چنانچہ خیرات کا شمار ان بڑی نیکیوں میں ہونے لگا جن کی مذہب نے تاکید کی ہے۔ گاندھی جی بھی ہمیشہ اس نظریہ پر زور دیتے ہیں کہ راجہ مہاراجہ، بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار

غریبوں کے امانت دار ہیں۔ان سے پہلے بہت سے مذہبی آدمی بھی کہتے آئے ہیں۔پاپائے اعظم نے یہ اعلان کیا ہے امیروں کا یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ خدا کی طرف سے خدمت خلق پر مامور ہیں اور اس کی دولت کے خازن اور قاسم ہیں اور خود حضرت مسیح نے غریبوں کی قسمت ان کے سپرد کی ہے۔ہندو دھرم اور اسلام کا عام عقیدہ بھی یہی ہے۔یہ دونوں امیروں کو خیرات کی تاکید کرتے ہیں، جس کی تعمیل میں یہ حضرات مندر، مسجد، دھرم شالے بنواتے ہیں۔اپنی وافر دولت میں سے تانبے کے پیسے اور چاندی کے روپے غریبوں کو خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک اور دین دار ہیں۔

دنیائے قدیم کے مذہبی نقطہ نظر کی ایک نمایاں مثال پاپائے اعظم لیویزوہم کا مشہور فرمان ریرم نوارم ہے جو مئی ۱۸۱۹ء میں جاری کیا گیا تھا۔وہ جدید صنعتی حالات کا استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں غرض مصیبت سہنا اور تکلیف اٹھانا نوع انسانی کی قسمت میں لکھا ہے۔انسان چاہے جتنی کوشش کرے کوئی طاقت اور کوئی تدبیر انسانی زندگی کو اس دردوالم سے نجات دلانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔جو لوگ اس کے خلاف دعوی کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کو یہ امید دلاتے ہیں کہ انہیں رنج والم سے نجات مل جائے گی اور دائمی راحت وعشرت نصیب ہوگی، دھوکا دے رہے ہیں اور سبز باغ دکھا رہے ہیں اور ان کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کر رہے ہیں اور سبز باغ دکھا رہے ہیں اور ان کے یہ جھوٹے وعدے اور زیادہ ابتری پیدا کردیں گے۔انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ دنیا کو اس کی اصلی حالت میں دیکھے اور ان مصیبتوں کا علاج کہیں اور تلاش کرے۔

آگے چل کر بتایا جاتا ہے کہ یہ کہیں اور کا اشارہ کدھر ہے۔اس دنیا کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کی صحیح قدر کرسکتے ہیں، جب تک اس زندگی کا لحاظ

نہ رکھیں جو آنے والی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی جس حقیقت عظمٰی کا سبق خود فطرت ہمیں دیتی ہے وہی عیسائی مذہب کا عظیم الشان عقیدہ ہے جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری اصلی زندگی اس وقت شروع ہوگی جب موجودہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ خدا نے ہمیں اس دنیا کی آنی جانی چیزوں کے لئے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ ان آسمانی چیزوں کے لئے جو ہمیشہ رہنے والی ہیں، اس نے اس دنیا کو ہمارے لئے عارضی جلاوطنی کی جگہ بنایا ہے نہ کہ ہمارا حقیقی وطن، روپیہ پیسہ اور دوسری چیزیں جنہیں لوگ اچھا اور پسندیدہ سمجھتے ہیں، خواہ ہمارے پاس افراط سے ہوں یا بالکل نہ ہوں، جہاں تک ہماری ابدی راحت و مسرت کا تعلق ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

یہ مذہبی طرز خیال اس قدیم زمانے سے وابستہ ہے جب موجودہ مصیبتوں سے نجات پانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ آنے والی زندگی کا سہارا ڈھونڈا جائے لیکن باوجود اس کے کہ حالات بدل گئے اور انسانی کی مادی خوش حالی کی سطح اتنی بلند ہوگئی جو زمانہ قدیم میں انسان کے خواب وخیال میں بھی نہ آسکتی تھی، لیکن ماضی کے خیالات اب بھی ہم پر مسلط ہیں، البتہ اب زیادہ زور چند مبہم روحانی قدروں پر دیا جاتا ہے جن کے جانچنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ کیتھولک عیسائی ہمیشہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے خیال میں مگن رہتے ہیں (یہ زمانہ ہے جسے دوسرے لوگ عہد مظلمہ کہتے ہیں) اور اسے عیسائیت کا عہد زریں سمجھتے ہیں، جب اولیاء کا دوردورہ تھا۔ عیسائی فرمان روا صلیبی لڑائیاں لڑنے کو جایا کرتے تھے، اور گوتھک طرز کے بڑے بڑے گرجے تعمیر ہو رہے تھے، ان کے خیال میں یہ زمانہ سچی عیسائی جمہوریت کا تھا جو پیشہ وروں کی انجمنوں کے ماتحت ترقی کے اس درجہ پر پہنچ گئی تھی جس پر نہ اس سے پہلے کوئی پہنچ سکی اور نہ اس کے بعد۔ مسلمان بڑی حسرت سے ابتدائی عہد خلافت کی اسلامی جمہوریت اور اس دور کی حیرت انگیز فتوحات کو یاد کیا

کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی ویدوں کے عہداور رامائن اور مہا بھارت کے زمانے کی دھن میں رہتے ہیں اور رام راج کا خواب دیکھتے ہیں۔ مگر تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ اسی عہد ماضی میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد انتہائی مصیبت کی حالت میں زندگی بسر کرتی تھی اور اسے پیٹ بھر کھانا اور زندگی ادنیٰ ترین ضرورت بھی میسر نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ چھوٹے سے حکمران طبقہ کو فرصت اور فراغت حاصل ہو لیکن جہاں تک زندگی کا لطف اٹھانے سے اور لوگوں کا تعلق ہے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ وہ سوائے قوت لایموت کی جدوجہد میں لگے رہنے کے اور بھی کچھ کر سکتے تھے۔ اس شخص کے لئے جو بھوکوں مر رہا ہو کسی قسم کی تمدنی اور روحانی ترقی ممکن نہیں، اسے تو بس ایک ہی فکر ہو گی کہ کسی طرح کھانے کو روٹی مل جائے۔

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے، جن پر فوراً ہماری نظر پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں خصوصاً ان حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ ہوا ہے، اس نے مادی خوش حالی کی ایک ایسی بنیادی قائم کر دی ہے۔ جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اس لئے کہ ہمیں صنعتی ترقی سے فائدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے۔ اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی اور اس سے زیادہ تمدنی اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے اس وقت تو نظام جاگیرداری کو اور مستحکم کر دیا ہے اور ہماری دشواریوں کو حال کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ شدید بنا دیا۔ لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہئے۔

موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری

اور مناسب نہیں رہا۔ امراء کا طبقہ بالکل بے کار ہے اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہوگیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تلقین کی جائے۔ اور غریبوں کو قناعت کی، صبر و شکر کی، کفایت شعاری اور نیک چلنی کی۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اس قدر وسیع ہوگئے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل اچھی طرح نبٹ سکتا ہے۔ امیروں میں سے بہت سے لوگ صریحی طور پر طفیلی بن گئے ہیں۔ اور ایک طفیلی طبقے کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے مسائل دولت ضائع ہوتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام کو اور دولت آفرینی کو روکتا ہے اور دو طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے۔ یعنی ایک تو ان لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا ہے اور فاقہ کرنے پر مجبور کرتا ہے خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گذرا لکھا تھا ان لوگوں کے سامنے جو بھوکوں مرتے ہیں اور بے کار ہیں، خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہوسکتا ہے۔ یعنی کام کی اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت کر کے روٹی کمائے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ بغیر محنت کے کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔

دنیائے جدید کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اس وقت کے قدیم طریقوں اور اصولوں سے کام لینا جب ان مسائل ہی کا وجود نہ تھا اور ان کا ذکر دقیانوسی الفاظ میں کرنا محض الجھن پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوسکتا خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے۔ ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا اس کے علاوہ جاگیردار ہر دلہن کی شب عروسی کا، سڑکوں، مندروں کشتیوں، پلوں، مفاد عامہ کی چیزوں کا زمین اور ہوا کا مالک تھا، جانور آج

بھی پالنے والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ بعض ملکوں میں ملکیت کے حقوق قانونا محدود کر دیئے گئے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں برابر حقوق ملکیت میں دست اندازی کی جاتی ہے۔ املاک روز بروز غیر مرئی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ مثلا کمپنی کے حصے، اعتبار وغیرہ۔ جیسے جیسے ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے۔ رائے عامہ برابر جائداد والوں کے لامحدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے اور قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے محصول لگائے جاتے ہیں، جنہیں ایک طرح کی ضبطی سمجھنا چاہئے۔ اور اس طرح مفاد عامہ کی خاطر حقوق ملکیت کم ہوتے جاتے ہیں۔ مفاد عامہ کا خیال پبلک پالیسی کی بنیاد بنتا جاتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفاد عامہ کے خلاف کوئی کام کرے، خواہ اس کی غرض اپنے حقوق ملکیت کا تحفظ ہو اور پرانے زمانے میں تو اکثر لوگ حقوق ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے۔ آج بھی یہ حقوق صرف تھوڑے لوگوں کو حاصل ہیں۔ ہم مستقل حقوق کا ذکر بہت سنتے آئے ہیں، لیکن آج کل ایک نیا مستقل حق اور تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندہ رہے، محنت کرے، اور اپنی محنت کا پھل پائے۔ ان نئے نظریوں کی رو سے املاک اور سرمایہ معدوم نہیں ہو جاتے بلکہ بہت سے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور ان کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جمع ہو جانے سے ان اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ اسے سماج ان سے واپس لے لیتی ہے۔

گاندھی جی کے پیش نظر افراد کی باطنی، اخلاقی، اور روحانی اصلاح ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بری عادتوں کو اور لذتوں کو ترک کریں اور پاکباز بن جائیں۔ وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب اور تمباکو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ ممکن ہے اس

بارے میں اختلاف رائے ہو کہ ان میں کون سی چیز زیادہ بری ہے اور کون سی کم، کیا اس میں کوئی شبہ ہوسکتا ہے کہ انفرادی نقطہ نظر سے بھی، اور اس سے زیادہ سماجی نقطہ نظر سے ان ذاتی کمزوریوں سے بدرجہا بدتر لالچ، خودغرضی، زرپرستی، افراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، طبقوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کش مکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بے دردی سے لوٹنا اور کچلنا، قوموں کی ہولناک لڑائیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آفریں جھگڑوں سے اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی زبردست سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستائے اور جس کا عمل اس پرانے مقولے پر ہیں جس میں طاقت ہو وہ چھین لے اور جو رکھ سکے وہ رکھے۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر لڑائی جھگڑا پیدا کرتی ہے، اور سارا نظام انسان کی غارت گرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے اور اسے ان سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات کو بھی ابھارتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ انسان کے کمینے جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے۔ کامیابی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دوسروں کو نیچے گرا کر ان کی جگہ لے لی جائے۔ جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ ہمارے بہترین آدمی ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں تو کیا گاندھی جی یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کرلیں گے! وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چند افراد کو متاثر کرنے میں انہیں کامیابی ضرور ہوگی، لیکن جب تک سماج ان لوگوں کو جو دوسروں کو لوٹ کر ترقی کرتے ہیں، کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرے گی اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گے اس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ مسئلہ محض اخلاق اور فلسفہ اخلاق کا نہیں ہے بلکہ آج کل کے عملی اور

ضروری مسائل میں سے ہے، دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے اور اس مشکل کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ڈکنس کا مکاپر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا اور نہ منفی طرز اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہے کہ سرمایہ داری، اشتراکیت، اور اشتمالیت وغیرہ کے خراب پہلوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں اور اس دھندلی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین درمیانی طریقہ خود بخود نکل آئے گا جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں کی خوبیاں جمع ہوں، ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے، علاج تجویز کیا جائے اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالات پر قائم نہیں رہ سکتے یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو پیچھے ہٹنے کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

مگر گاندھی جی کی اکثر کاروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس محدود قومی معیشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف قوم اور قوموں سے بلکہ ہر گاؤں اور گاؤنوں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہو۔بس قدیم زمانے کی سماج میں ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا، اپنا کھانا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی بہت ہی پست ہو جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں کیونکہ مستقل طور پر تو یہ چل ہی نہیں سکتی۔بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گے کہ حسرت اور فاقے کی زندگی کی طرف لوٹیں۔ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بے حد پست ہے۔دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے لیکن اوروں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اور میرے خیال میں ان سے قطع تعلق کرنا ناممکن

ہے اس لئے ہمیں ان مسائل پر ساری دنیا کے نقطہ نظر سے غور کرنا چاہئے اور اس نقطہ نظر سے محدود قومی حیثیت کا کوئی سوال ہی نہیں اور میں ذاتی طور پر ایسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں، یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقے سے ہونا چاہئے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تبدیلی کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کا مٹا دینا چاہئے۔ ان چیزوں کی خاطر ایسے مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی غداری ہوگی۔ ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں۔ لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی نہ ہو جائے یہ انقلاب مشکل ہی سے ہوسکے گا۔ اس لئے ان لوگوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیں جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یہ بہت بعید از قیاس ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کرسکیں گے۔

کھادی کی تحریک یعنی ہاتھ سے کاتنا اور بننا جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی ہے اور ہمیں قبل صنعتی عہد کے طرف واپس لے جاتی ہے۔ آج کل کے کسی اہم مسئلے کو ان

طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ ان سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور عارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک سے بہت فائدہ پہنچا ہے آئندہ بھی اس وقت تک پہنچتا رہے گا جب تک خود حکومت زرعی اور صنعتی مسائل کا کوئی معقول حل نہ تلاش کر لے گی جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جا سکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں کروڑوں بے روزگار ہیں جن کا کوئی ریکارڈ نہیں اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصہ میں بیکار رہتے ہیں۔ حکومت نے بے روزگاری کو دور کرنے یا بے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کی جو بالکل بے روزگار ہیں یا جو کچھ عرصے بیکار رہا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ ترقی خود اپنی کوشش سے ہوئی ہے اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے مگر اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے وہ نفسیاتی تبدیلی ہے۔ کھادی نے کسی حد تک اس فاصلے کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں سے قریب تر کر دیا۔ اس لباس کا پہننے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ اوسط طبقے میں کھادی کے رواج سے سادگی آ گئی ہے۔ نمود و نمائش اور بد مذاقی کم ہو گئی ہے اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس کے معاملہ میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں۔ اور نہ سستی پوشاک پہننے میں ذلت و شرم محسوس کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کھادی کے لباس کو خاصا باوقار سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو اب بھی ریشم اور ساٹن پہن کر اتراتے ہیں، اپنی قومیت کا احساس رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب لوگوں میں بھی یہ خودداری اور وقار

کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ کھادی پہننے والوں کے بڑے مجمعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کون غریب ہے اور کون امیر اور اس سے برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ عام لوگوں تک پہنچنے میں کانگریس کو کھادی سے بڑی مدد ملی۔ اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھاتے چلے جائیں کھادی ہی نے روکا ورنہ پہلے ان کی روک تھام صرف بدیسی اور خصوصاً لنکا شائر کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی اور جب کبھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگ عظیم کے زمانے میں، تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ملوں نے کروڑوں روپیہ کمایا۔ سودیشی کی تحریک اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ملوں کو بڑی مدد ملی، لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اب اتنی زیادہ بڑھ سکتیں۔ ان ملوں نے (اور جاپان نے بھی) کھادی کی ہر دل عزیزی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس قسم کو موٹا کپڑا تیار کیا کہ اس میں اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ اگر اب کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے مثلاً جنگ چھڑ جائے جس سے بدیسی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے۔ تو غالباً ہندوستان کے ملوں کے مالک خریداروں کو اتنا نہیں لوٹ سکیں گے جتنا کہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال تک لوٹتے رہے۔ کھادی کی تحریک اس کو روکے گی اور کھادی کی تنظیم میں اتنی گنجائش ہے کہ تھوڑی سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی ایک ضمنی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے تاکہ اس مدت میں جو ایک اعلیٰ معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی اس سے کام چلتا رہے لیکن آئندہ ہماری اصل کوشش یہ

ہوگی کہ زراعتی نظام کی از سر نو تنظیم کی جائے اور صنعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ اراضی کے نظام میں دفع الوقتی کے لئے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں اور طرح طرح کے کمیشن مقرر ہوں جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو اور وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کردیں۔ ہمارا نظام اراضی دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ رہا ہے اور موجودہ صورت حال میں دولت کی پیدائش اور تقسیم اور بڑے پیمانے پر معقول طریقے سے کام کرنے میں حائل ہے۔ جدید عہد کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا کہ چھوٹی چھوٹی زمینیں اسامیوں کو بانٹنے کا طریقہ ختم کردیا جائے اور اس کی جگہ منظم طور پر امداد باہمی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ کم محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے (جیسا کہ گاندھی جی کا اندیشہ ہے) زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ باقی لوگوں میں سے بعض شاید چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں مگر ان کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی صنعتوں اور سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہے لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا بھی عنصر موجود ہے یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام آراضی کو سہارا دے رہی ہے اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو لیکن یہ رجحان اس میں بہر حال موجود ہے۔ کسانوں یا کاشتکاروں زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا جو حصہ ملتا ہے وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ جس پست ترین سطح پر وہ پہنچ گئے ہیں اسی پر قائم رہ سکیں۔ اس لئے ان کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کی اور صورتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ ورنہ لگان یا مالگزاری کے لئے اور قرض لینا پڑتا ہے۔ اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے تو اس

سے زمیندار یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہو سکتا ہے۔ اگر یہ اوپر کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زائد محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہنری جارج نے اپنی کتاب ترقی اور غربت میں اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے اور بہت سی مثالیں دی ہیں جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے اس سے فوری طور پر ضرور فائدہ ہوگا، جس میں سے کچھ کم وبیش مستقل ہوگا مگر زیادہ تر محض وقتی۔ اس سے دیہاتیوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی۔ اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنما نمونے جو مٹ رہے تھے۔ محفوظ ہو جائیں گے، لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد مشینوں کی صنعتی نظام کی مخالفت ہے اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ گاندھی جی نے حال میں ہریجن میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں مشینوں کو رواج دینا اس وقت مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو اور کرنے والے تھوڑے ہوں لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے تو یہ چیز مضر ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں کہ لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں فرصت کا وقت نکالا جائے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے خالی وقت کو جو سال میں چھ مہینے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے۔ یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ ان تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو بے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں وقت کام کی کمی کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت آجروں کو کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں

کرو۔ مثلاً سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر، آب پاشی کی اسکیم، حفظان صحت، طبی وسائل، صنعت وحرفت اور برقی قوت کی ترقی، سماج اور تمدنی خدمات، تعلیم اور ان بیسیوں ضروری اشیاء کی فراہمی جس کی لوگوں کو ضرورت ہے، ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں تب بھی کام ختم نہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک نفع کی خواہش نہیں بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو اور سماج کی تنظیم مفاد عامہ کو پیش نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کی سوویت یونین میں اور چاہے جو نقائص ہوں لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے۔ ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بیکار نہیں ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے لئے کام کرنے کی اور تمدنی اصلاح وترقی کی کوئی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کردیا جائے۔ ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے تو لڑکے، مزدوروں اور بے روزگاری کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے۔ اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

گاندھی جی نے اس بات کی کوشش کسی قدر کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ چرخے اور تکلے میں اصلاح وترمیم کی جائے اور ان کی قوت پیداوار بڑھائی جائے۔ یہ بھی تو اوزار اور مشین کو ترقی دینے کی کوشش ہے اور اگر یہ ترقی اسی طرح جاری رہی (بہت ممکن ہے گھریلو صنعتوں میں بجلی کی قوت سے کام لیا جانے لگے) تو منافع کی خواہش پھر نمودار ہو جائے۔ اور اس کی وجہ سے وہی چیز پیدا ہوگی جس کو ضرورت سے زیادہ پیداوار اور بے روزگاری کہتے ہیں۔ اگر دیہی صنعتوں میں جدید صنعتی طریقوں سے کام نہ لیا گیا تو وہ ان ضروری مادی اور تمدنی اشیاء کو بھی تیار نہیں کرسکتیں جو ہمیں اس وقت درکار ہیں۔ اور پھر وہ مشینوں کے ساتھ مقابلہ کیونکر کریں گی؟ کیا ہندوستان میں بڑی بڑی مشینوں کے رواج کو روکنا مفید ہے اور فرض کیجئے کہ مفید ہو تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟ گاندھی جی نے بار بار یہ کہا ہے کہ وہ سرے سے مشینوں کے مخالف

نہیں ہیں بلکہ ان کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لئے ان کا استعمال موزوں نہیں۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا بنیادی صنعتیں مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت یا اس سے کم درجے کی صنعتیں جو پہلے سے موجود ہیں مٹائی جاسکتی ہیں؟

یہ بات صریحی طور پر ناممکن ہے۔ جب ہمارے یہاں ریلیں، پل، نقل وحمل کے وسائل وغیرہ موجود ہیں تو یا تو ہم یہ چیزیں خود پیدا کریں یا دوسروں کے محتاج رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی حفاظت اور مدافعت کے وسائل ہمارے پاس ہوں تو ہمیں نہ صرف بنیادی صنعتوں کی بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ صنعتی نظام کی ضرورت ہے۔ آج کوئی ملک جو صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ نہیں ہے نہ حقیقی معنوں میں آزاد ہے اور نہ بیرونی حملے کی مدافعت کرسکتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ ایک بنیادی صنعت کی مدد اور تکمیل کے لیے دوسری بنیادیں صنعتیں درکار ہیں اور پھر مشینری بنانے کی صنعت ضروری ہو جاتی ہے۔ جب یہ بنیادیں صنعتیں قائم ہو جائیں تو پھر لازمی طور پر دوسری صنعتیں بھی پھیل جاتی ہیں۔ غرض یہ سلسلہ کسی طرح روکا نہیں جاسکتا۔ اس لیے کہ نہ صرف ہماری مادی اور تمدنی ترقی بلکہ ہماری آزادی کا بھی اسی پر انحصار ہے۔ جوں جوں بڑے پیانے کی صنعت پھیلتی جائے گی چھوٹی چھوٹی دیہاتی صنعتوں کو اس کا مقابلہ کرنا دشوار ہوتا جائے گا۔ اشتراکی نظام میں تو ان کے لیے پھر بھی موقع ہے، مگر نظام سرمایہ داری میں ان کی مطلق گنجائش نہیں۔ اشتراکی ریاست میں بھی وہ گھریلو صنعتوں کی حیثیت سے باقی رہ سکتی ہیں جن میں وہ چیزیں تیار ہوتی ہیں جو بڑے پیانے پر تیار نہ کی جاسکیں۔

کانگریس کے بعض لیڈر صنعت کی ترقی سے خوفزدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صنعتی ممالک کی تمام موجودہ مشکلات اور پریشانیاں بڑے پیانے پر مال تیار کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی (۳) ہے، اگر عام لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو، تو اس میں کیا برائی ہے کہ وہ کافی مقدار میں تیار

کی جائے؟ کیا لوگ اس کو ترجیح دیں گے کہ خواہ ان کی ضرورت پوری نہ ہو لیکن بڑے پیمانے پر چیزیں نہ تیار کی جائیں؟ واقعہ یہ ہے کہ دولت آفرینی کے طریقے میں کوئی خرابی نہیں بلکہ تقسیم دولت کا موجودہ نظام بہت ناقص اور مہمل ہے۔

ایک اور مشکل جس کا دیہی صنعت کے حامیوں کو سامنا کرنا ہے یہ ہے کہ ہماری زراعت دنیا کی منڈی کی پابند ہے۔ کسان اس پر مجبور ہے کہ انہی چیزوں کی کاشت کرے جن کی بازار میں مانگ ہے اور وہی قیمتیں رکھے جو اور ملکوں میں ہیں۔ قیمتیں گھٹی بڑھتی رہتی ہیں اور اس کو اپنا مقررہ لگان یا مالگزاری نقد کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح اس کو یہ روپیہ فراہم کرنا پڑتا ہے یا کم سے کم وہ اس کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ اس لیے وہ ایسی چیز بوتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت ہوگی۔ وہ ان چیزوں کی کاشت نہیں کر سکتا جن کی اس کو خود ضرورت ہے تاکہ وہ اور اس کے بال بچے کم سے کم کھانے کے معاملے میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں۔

حال میں اجناس خوردنی اور دوسری چیزوں کی زرعی قیمتیں یکبارگی گر جانے کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں مجبوراً گنے کی کاشت کرنی پڑی۔ باہر کی شکر پر محصول لگ جانے کی وجہ سے شکر کے کارخانے برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہو گئے اور گنے کی مانگ بہت بڑھ گئی، لیکن بہت جلد رسد طلب سے کہیں زیادہ ہوگئی، کارخانوں کے مالکوں نے بڑی بے رحمی سے کسانوں کو لوٹنا شروع کر دیا، اور گنے کی قیمت گر گئی۔

ان تمام امور اور ان کے علاوہ بہت سی باتوں کی وجہ سے نہ یہ مناسب ہے کہ اور نہ ممکن ہے کہ ہمارے زرعی اور صنعتی مسائل محدود ملکی مصلحتوں کے مطابق حل کیے جا سکیں اور یہی صورت ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو کی ہے۔ ہم مبہم اور جذبات انگیز فقروں میں پناہ نہیں لے سکتے بلکہ ہمیں زندگی کے واقعات کا سامنا کرنا ہے اور

ان سے مطابقت پیدا کرنا ہے تاکہ ہم تاریخ کی بساط کے شاطر بنیں اس کے مہرے بن کر نہ رہ جائیں۔ پھر مجھے اس مجموعہ اضداد یعنی گاندی جی کا خیال آ جاتا ہے (۴)۔ باوجود اپنی تیز فہمی اور مظلوموں کے جوش حمایت کے وہ کیوں اس زوال پذیر نظام کی حمایت کرتے ہیں جو موجودہ مصیبت اور اسراف کا ذمہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس مصیبت سے نجات پانے کی راہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن کیا ماضی کی راہ قطعاً مسدود نہیں ہو چکی ہے؟ ایک طرف تو وہ راہ کی تلاش میں مصروف ہیں اور دوسری طرف پرانے نظام کے بچے کھچے آثار جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں، مثلاً دیسی ریاستیں، بڑی بڑی زمینداریاں اور تعلقہ داریاں اور موجودہ سرمایہ داری نظام، ان سب پر اپنا دست شفقت رکھے ہوئے ہیں۔ کیا ''امانت داری'' کے اس نظریے کو عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک فرد کو غیر محدود دولت اور اختیارات دے دیئے جائیں اور پھر اسی سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اس کی مفاد عامہ کے لیے استعمال کرے گا؟ کیا ہم میں سے بہتر لوگ بھی اخلاقی تکمیل کے اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ ان پر اس طریقے سے اعتماد کیا جا سکے؟ افلاطون کے فلسفی بادشاہ بھی مشکل ہی سے اس بوجھ کے اٹھانے کے اہل ثابت ہوتے۔ اس کے علاوہ کیا دوسروں کے لیے یہ اچھا ہوگا کہ یہ شفیق مافوق الانسان ان پر مسلط کر دیئے جائیں۔ لیکن دنیا میں نہ تو کوئی مافوق الانسان ہے نہ کوئی فلسفی بادشاہ، یہاں تو ناقص انسان بستے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ذاتی مفاد میں اور ان کے خیالات کے پھیلنے میں ساری قوم کا بھلا ہے، اس خیال کی بدولت خاندانی شرافت اور دولت کا اقتدار ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔ جس کے نتائج ہر طرح مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ اس وقت میں اس مسئلے پر غور نہیں کر رہا ہوں کہ سماجی نظام کی تبدیلی کس طرح عمل میں آئے اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ کیونکر دور کی جائیں۔ جبر سے یا خیالات پر اثر ڈالنے کے ذریعے سے، تشدد سے یا عدم تشدد سے،

اس پہلو سے میں بعد میں بحث کروں گا۔ بہر حال تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کر لینا چاہیے اور اس کو صاف الفاظ میں بیان کر دینا چاہیے۔ جب تک سیاسی اور ذہنی رہنما اس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھتے اور صاف صاف بیان نہیں کرتے اس وقت تک وہ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے یا لوگوں میں وہ ذہنیت پیدا کر سکیں گے جس کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات خود سب سے بہتر معلم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان واقعات کی صحیح اہمیت کو ظاہر کرنا ہے اور ان سے مناسب کام لینا ہے تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم خود انہیں اچھی طرح سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔

کبھی کبھی میرے احباب اور رفقا میری باتوں سے چڑ کر پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے کبھی کوئی کریم النفس رئیس، مخیّر زمیندار، نیک نیت اور با مروت سرمایہ دار اب تک نہیں دیکھا؟ بے شک میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں بلکہ میں خود اس طبقے سے ہوں جو زمینداروں اور دولت مندوں سے میل جول رکھتا ہے، میں خود ایک نمونہ کا "بورژوا" (۵) ہوں۔ اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی اور اسی کے خیالات نے ابتداء میں مجھے متاثر کیا۔ بعض اشتمالیوں نے مجھے "پیٹی بورژوا" (٦) کہا تھا اور بالکل ٹھیک کہا تھا۔ غالباً اب وہ مجھے "اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا بورژوا" کہیں گے۔ لیکن یہاں اس سے کچھ بحث نہیں کہ میں کیا ہوں۔ یہ بالکل مہمل بات ہے کہ قومی، بین الاقوامی، معاشی اور سماجی مسائل پر غور کرتے وقت افراد کی ذاتی حیثیت کو اہمیت دی جائے۔ وہی احباب جو مجھ پر اعتراض کرتے ہیں برابر یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ ہمارا جھگڑا گناہ سے ہے نہ کہ گنہگار سے۔ میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ میرا جھگڑا نظم سے ہے نہ کہ افراد سے۔ مگر ہر نظام بڑی حد تک افراد اور جماعتوں سے لڑنا ہے یا انہیں اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ اگر کوئی نظام اب ہمارے لیے مفید نہیں رہا اور ترقی کی راہ میں حائل ہے تو وہ مٹ کر رہے گا اور جو

طبقے اور جماعتیں اس سے وابستہ ہیں ان کو بھی اپنی کایا پلٹ کرنی پڑے گی۔ اس عمل تغیر میں جہاں تک ہو سکے تکلیف کے عنصر کو کم کرنا چاہیے، لیکن بد قسمتی سے صورت ہی ایسی ہے کہ لوگوں کو تکلیف پہنچنا اور معاملات کا درہم برہم ہونا ناگریز ہے بہر حال یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اتنی بڑی برائی کو اس ڈر سے برداشت کرتے رہیں کہ کہیں چھوٹی چھوٹی برائیاں نہ اٹھ کھڑی ہوں۔ یہ برائیاں تو پیدا ہوتی ہی ہیں اور ان کا روکنا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

ہر قسم کی انسانی جماعتیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا معاشرتی کسی نہ کسی فلسفے پر مبنی ہوتی ہیں، اور جب ان جماعتوں میں کوئی تبدیلی پیدا ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس بنیادی فلسفے میں بھی تبدیلی کی جائے تاکہ وہ نئے خیالات کے ساتھ کھپ سکے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے مگر عموماً فلسفہ واقعات کی رفتار سے پیچھے رہ جاتا ہے اور اسی سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انیسویں صدی میں جمہوریت اور سرمایہ داری کی نشو ونما ساتھ ساتھ ہوئی۔ لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں ایک بنیادی تضاد تھا۔ کیونکہ جمہوریت اس بات پر زور دیتی تھی کہ زیادہ لوگوں کو سیاسی قوت حاصل ہو اور سرمایہ داری اصل قوت کو صرف چند افراد تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ان دونوں کا بے تکا ساتھ اس لیے نبھ گیا کہ سیاسی پارلیمانی جمہوریت اب بہت بدنام ہو گئی۔ یہ اسی کا رد عمل ہے کہ دنیا میں طرح طرح کی نئی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہندوستان میں بھی برطانوی حکومت اور زیادہ رجعت پسند بن گئی ہے اور اسے ایک بہانہ ہاتھ آ گیا ہے کہ سیاسی آزادی کو ظاہری شکلوں سے بھی محروم رکھے۔ لطف تو یہ ہے کہ ریاستیں بھی پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کو اپنی غیر محدود مطلق العنانی کے جائز ہونے کی دلیل قرار دیتی ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے یہ ارادہ ظاہر کرتی ہیں کہ اپنے یہاں وہی قرون وسطی کا طرز قائم رکھیں گی جس کا دنیا میں کہیں اور وجود نہیں۔ (۷)

لیکن پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت آگے بڑھ گئی ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ زمانے کی رفتار سے پیچھے رہ گئی ہے۔ یہ جمہوریت ناقص تھی اس لیے کہ اس نے معاشی جمہوریت کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا طریق کار بہت سست اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے لیے بالکل موزوں تھا۔

دیسی ریاستیں غالباً آج دنیا میں انتہائی مطلق العنانی کا نمونہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برطانیہ کی محکوم ہیں، لیکن برطانوی حکومت ان کے معاملات میں صرف اسی حد تک دخل دیتی ہے جہاں تک برطانوی مفاد کا تقاضا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ قدیم جاگیرداری نظام کے نمونے جو چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح غیر ملکی حکومت کے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں۔ کیونکر بغیر کسی تغیر اور تبدیلی کے بیسویں صدی تک باقی رہے، وہاں اب تک ہوا بند اور بھاری ہے، پانی دھیرے دھیرے بہتا ہے اور ایک نو وارد جو تبدیلی اور حرکت کا عادی ہے بلکہ شاید اسی سے کسی قدر گھبرا بھی گیا ہے، وہاں پہنچ کر اونگھنے لگتا ہے اور اس پر ایک جادو کی سی کیفیت چھا جاتی ہے۔ ایک بے جان تصویر سی نظر آتی ہے۔ جو وقت کی حرکت سے محفوظ ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتی ہے۔ تقریباً بالکل غیر محسوس طریقے پر دیکھنے والا ماضی کے تصور میں ڈوب جاتا ہے اور بچپن کے خواب اس کی نظروں میں پھرنے لگتے ہیں۔ طرح دار جوان زرہ بکتر سے آراستہ، حسین لڑکیاں، منارہ دار قلعے، سورماؤں کا زمانہ، سپاہیانہ آن بان، بے نظیر شجاعت اور جاں بازی۔ خصوصاً اگر وہ راجپوتانہ کے علاقے میں ہے جو رومان اور من چلے پن کے کارناموں کا گھر ہے۔

لیکن بہت جلد یہ تصور دھندلا پڑ جاتا ہے اور ہوا کی کثافت سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے دھیرے دھیرے بہنے والے تالاب کی تہہ میں بند پانی کی سڑاند محسوس ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر طرف سے گھرا ہوا ہے

اوراس کا جسم اور دماغ زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ ایک طرف پرجا کی انتہائی پستی اور مصیبت اور دوسری طرف راجا کے محل کے ٹھاٹ کو دیکھ پر دل پر عجیب اثر پڑتا ہے۔ ریاست کی دولت کا کتنا بڑا حصہ محل میں رئیس کے تعیّشات اور ذاتی ضروریات کی نذر ہوتا ہے اور کتنا تھوڑا حصہ عام لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ یہ رئیس ریاست کو بڑے مہنگے پڑتے ہیں ان پر اتنا خرچ کرکے اس کے بدلے میں کیا ملتا ہے؟

ان ریاستوں پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اخبار وہاں پہنچنے نہیں دیئے جاتے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ادبی یا نیم سرکاری ہفتہ وار اخبار چل سکتا ہے، بیرونی اخبارات کا داخلہ اکثر بند کردیا جاتا ہے۔ سوائے جنوبی ریاستوں کے مثلاً ٹراونکور اور کوچن وغیرہ (جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد برطانوی علاقے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے) اور ریاستوں میں عام تعلیم بہت کم ہے۔ سب سے اہم خبریں جو ریاستوں سے آتی ہیں وہ یہ ہوتی ہیں:

وائسرائے کی تشریف آوری کا تزک و احتشام، دربار، ایک دوسرے کی تعریف میں تقریریں، رئیس کی شادی یا سال گرہ کا پرتکلف جشن، یا پھر کسانوں کی شورش۔ خود برطانوی ہند میں رئیسوں کو لوگوں کی نکتہ چینی سے محفوظ رکھنے کے لیے خاص قوانین بنادیئے گئے ہیں اور ریاست کے اندر تو معمولی سے معمولی تنقید بھی نہایت سختی کے ساتھ دبادی جاتی ہے۔ عام جلسے قریب قریب مفقود ہیں، یہاں تک کہ وہ جلسے بھی جو کسی معاشرتی مقصد سے کیے جائیں اکثر روک دیئے جاتے ہیں۔ (۸) اکثر باہر کے سربرآوردہ قومی کارکنوں کا داخلہ ریاستوں میں روک دیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے وسط میں مسٹر سی۔ آر۔ داس بہت بیمار تھے اور انہوں نے صحت حاصل کرنے کی غرض سے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں کوئی سیاسی غرض نہیں تھی مگر کشمیر کی سرحد پر پہنچنے کے بعد وہ آگے بڑھنے سے روک دیئے گئے۔

مسٹر جناح کو بھی حیدر آباد میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی، اور مسز نائڈو جن کا گھر خاص حیدر آباد شہر میں ہے ایک مدت تک وہاں نہیں جانے پائیں۔

جب ریاستوں کی یہ حالت تھی تو ظاہر ہے کہ کانگریس کو ریاست کے باشندوں کے بنیادی حقوق کی حمایت اور ان کی پامالی پر نکتہ چینی کرنی چاہیے تھی لیکن گاندھی جی نے ریاستوں کے متعلق ایک انوکھی ایجاد کی۔ یعنی ''ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت'' اس چپ چپ کی پالیسی پر وہ ان تمام غیر معمولی اور افسوس ناک واقعات کے باوجود قائم رہے جو ریاستوں میں پیش آئے۔ حالانکہ ریاستوں کی حکومتیں بے وجہ کانگریس پر حملے کرتی رہیں۔ بظاہر شاید یہ خطرہ ہے کہ کانگرس کی نکتہ چینی رئیسوں کو ناراض کر دے گی اور پھر ان کو ہم خیال بنانا اور زیادہ دشوار ہو جائے گا۔ گاندھی جی نے اپنے جولائی ۱۹۳۴ء کے خط میں جو انہوں ریاستوں کی رعایا کی کانفرنس کے صدر مسٹر این۔ سی کالکار کے نام لکھا تھا۔ اپنے اس خیال کو دہرایا کہ عدم مداخلت کی پالیسی بالکل صحیح اور دانشمندانہ ہے۔ ان ریاستوں کی آئینی اور قانونی حیثیت کے متعلق جو خیال انہوں نے ظاہر کیا وہ عجیب وغریب تھا، انھوں نے لکھا تھا کہ ''یہ دیسی ریاستیں برطانوی ہند کہلاتا ہے ان ریاستوں کی پالیسی کی تشکیل کا اس سے زیادہ اختیار نہیں جتنا کہ مثلاً افغانستان اور سیلون کی پالیسی میں دخل دینے کا''۔ چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیسی ریاستوں کی رعایا کی نرم اور اعتدال پسند کانفرنس اور لبرل پارٹی نے بھی ان کی رائے اور مشورے پر اعتراض کیا۔

لیکن یہ خیالات رئیسوں کو بہت پسند آئے۔ انہوں نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ایک ہی مہینے کے اندر حکومت ٹرانکور نے اپنے حدود میں نیشنل کانگریس کو ممنوع قرار دے دیا، اس کے تمام جلسوں کو اور ممبر بنانے کی تحریک کو روک دیا۔ اس کارروائی کے ساتھ اس نے یہ اعلان کیا کہ ذمہ دار لیڈروں نے خود ہی یہ مشورہ دیا

ہے (صریحاً یہ اشارہ گاندھی جی کے بیان کی طرف تھا)۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ ممانعت اس وقت کی گئی جب برطانوی میں سول نافرمانی موقوف ہو چکی تھی (ریاستوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا) اور حکومت ہند نے کانگریس کو دوبارہ مطابق قانون قرار دے دیا تھا، یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حکومت ٹراونکور کے مشیر قانونی اس وقت سر سی۔ پی۔ راما سوامی آئر تھے (اور اب تک ہیں) جو ایک زمانے میں کانگریس اور ہوم رول لیگ دونوں کے جنرل سیکرٹری تھے، آگے چل کر لبرل بن گئے اور حکومت ہند اور حکومت مدراس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔

کانگریس کی پالیسی اور گاندھی جی کے مشورہ کے مطابق حکومت ٹراونکور کے اس بے وجہ حملے کے جواب میں جو امن کے زمانے میں کانگریس پر کیا گیا اس کی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا، (۹) حالانکہ بعض لبرل حضرات نے بڑے زور شور سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ حقیقت میں ریاستوں کے معاملے میں گاندھی جی نے لبرل پارٹی سے کہیں زیادہ اعتدال اور احتیاط کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ سربرآوردہ قومی لیڈروں میں شاید صرف پنڈت مدن موہن مالوی ایک ایسے شخص ہیں جو بہت سے رئیسوں سے گہرے تعلقات رکھنے کی وجہ سے اس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں، اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ والیان ریاست کے جذبات کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔

گاندھی جی پہلے رئیسوں کے معاملے میں اتنے زیادہ محتاط نہ تھے۔ ۱۶ء میں ایک مشہور موقع پر جب بنارس میں ہندو یونیورسٹی کی افتتاحی رسمیں ادا ہو رہی تھیں، انہوں نے ایک جلسے میں تقریر کی تھی، جس کے صدر ایک مہاراجہ تھے اور جس میں بہت سے اور رئیس شریک تھے۔ وہ نئے نئے افریقہ سے واپس آئے تھے اور ہندوستان کی ریاست کا بوجھ ہنوز ان کے کاندھوں پر نہ تھا۔ سچے مصلحانہ جوش سے انہوں نے ان حضرات کو ہدایت کی کہ اپنے اطوار کو درست کریں اور خود پسندانہ عیش و عشرت و شان و شوکت کو چھوڑ دیں۔ انہوں نے کہا ''رئیسو جاؤ اور اپنے زیور اور

جواہرات کو بیچ ڈالو" زیورات اور جواہرات تو وہ کیا بیچتے مگر چلے ضرور گئے۔ سراسیمگی کی حالت میں ایک ایک دو دو کر کے سب رئیس وہاں سے اٹھ گئے یہاں تک کہ جناب صدر بھی مقرر کو تنہا چھوڑ کر چل دیئے، مسز ؟؟؟ بھی جو اس وقت وہاں موجود تھیں گاندھی جی کی باتوں سے خفا ہو گئیں اور جلسے کو چھوڑ کر چلی گئیں۔

ایک خط میں جو گاندھی جی نے مسٹر کالکار کے نام لکھا تھا وہ فرماتے ہیں "میں چاہتا ہوں کہ ریاستیں اپنی رعایا کو خود اختیاری حکومت عطا کر دیں اور رئیس اپنے آپ کو جمہور کا امانت دار سمجھیں"۔ اگر واقعی اس "امانت داری" کے نظریئے میں کوئی بات ہے تو ہم پھر برطانوی حکومت کے اس دعوے پر کیوں اعتراض کرتے ہیں کہ "وہ ہندوستان کی حکومت کی امانت دار ہے"۔ بجز اس کے کہ وہ بدیسی ہے اس میں اور ہندوستانی رئیسوں میں کیا فرق ہے؟ اور رنگ، نسل اور تہذیب کا اختلاف تو خود ہندوستان کے لوگوں میں بھی موجود ہے۔

گزشتہ چند سال سے ریاستوں میں تیزی کے ساتھ برطانوی حکام ٹھونسے جا رہے ہیں۔ رئیس عموماً اس کے مخالف ہیں مگر وہ بالکل بے بس ہیں۔ یوں تو حکومت ہند ہمیشہ سے ریاستوں پر تسلط رکھتی ہے مگر اب ریاستیں اندر سے بھی جکڑ دی گئیں۔ چنانچہ جب کبھی ریاستوں کی زبان سے کچھ نکلتا ہے تو، اصل میں یہ حکومت ہند کی بدلی ہوئی آواز ہوتی ہے جو جاگیرداری نظام کے پردے سے بولتی ہے۔

یہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ ریاستوں میں ہمیشہ اس قسم کی جدوجہد جیسی برطانوی ہند میں ہوتی ہے ممکن نہیں خود برطانوی ہند کے مختلف صوبوں کی زراعتی صنعتی، فرقہ وارانہ اور انتظامی حالت میں بھی بہت فرق ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی پالیسی سب کہیں قابل عمل ہو۔ لیکن جدوجہد کے طریقے میں حالات کے لحاظ سے اختلاف ہونا اور بات ہے۔ ہماری عام پالیسی مختلف علاقوں میں مختلف نہیں ہونی چاہیے اور جو چیز ایک جگہ بری سمجھی جاتی ہے وہ دوسری جگہ بری سمجھی جانی چاہیے۔

ورنہ ہم پر یہ الزام لگایا جائے گا اور لگایا جا چکا ہے کہ ہم کوئی مستقل پالیسی اور اصول نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف قوت اور اقتدار حاصل کرنا ہے۔

مختلف ملتوں اور دوسری اقلیتوں کو جداگانہ حق انتخاب دینے کے خلاف بجا طور پر بہت کچھ نکتہ چینی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ جمہوریت کے ساتھ کسی طرح نہیں کھپ سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب حلقہ ہائے انتخاب مذہبی جماعتوں میں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوں، تقسیم کر دیئے جائیں تو جمہوریت یا ذمہ دار حکومت کے قائم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن جو لوگ اس پر بڑے زور شور سے نکتہ چینی کرتے ہیں مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی یا ہندو سبھا کے لیڈر، تعجب ہے کہ وہ ریاستوں کے حالات سے مطمئن ہیں اور بظاہر اس پر آمادہ ہو گئے کہ استبدادی ریاستوں اور جمہوری برطانوی ہند (یہ حضرات اسے جمہوری کہتے ہیں) کے درمیان وفاقی اتحاد ہو جائے۔ اس سے زیادہ بے تکا اور نامعقول اتحاد مشکل سے تصور میں آ سکتا ہے۔ لیکن ہندو سبھا کے حامیان جمہوریت وقومیت بے تکلف اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم زبان سے تو منطقی صحت اور استقامت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ہمارے عمل کا بنیادی محرک اب تک جذبات کے سوا کچھ نہیں۔

غرض ریاستوں کے متعلق کانگریس کا رویہ ایک عجیب معما ہے مجھے ٹامس پین کا ایک جملہ یاد آ گیا جو اس نے تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوئے برک کے متعلق کہا تھا کہ "انہیں پروں پر ترس آتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ چڑیا مری جاتی ہے" گاندھی جی مرتی ہوئی چڑیا کو تو دیکھتے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پروں کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں۔

کم و بیش یہی صورت تعلقہ داریوں اور بڑی زمینداریوں کے نظام کی ہے۔ اس معاملہ میں تو اب کسی دلیل و بحث کی ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی ہے کہ یہ نیم جاگیرداری نظام فرسودہ ہو گیا ہے اور دولت آفرینی اور عام ترقی کی راہ میں حائل

ہے۔خود سرمایہ داری کے ترقی پذیر نظام کے ساتھ اس کا نبھنا ممکن نہیں چنانچہ قریب قریب دنیا کے سب ملکوں میں بڑی بڑی زمینداریاں غائب ہوتی جاتی ہیں اور کاشتکاران زمینداری کی جگہ لے رہے ہیں۔میرا اب تک یہی خیال تھا کہ ہندوستان میں اگر کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ جن زمینداروں سے زمین چھینی جائے انہیں اس کا کوئی معاوضہ دیا جائے۔لیکن سال گزشتہ مجھے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ گاندھی جی موجودہ تعلقہ داری نظام کو فی نفسہ پسند کرتے ہیں اور اسے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔جولائی ۱۹۳۴ء میں انہوں نے کانپور میں کہا تھا ''زمیندار اور کسان کے دل میں ایک دوسرے کی محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ان کے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔پھر دونوں امن اور سلوک سے رہ سکتے ہیں۔ میں ہرگز تعلقہ داری اور زمینداری نظام کو مٹا دینے کا حامی نہیں ہوں اور جو لوگ اس کو مٹانا چاہتے ہیں وہ خود اپنے خیالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے'' (یہ انہوں نے بڑی بے انصافی کی بات کہی)۔

آگے چل کر انہوں نے فرمایا ''میں ہرگز اس کوشش میں شریک نہیں ہوں گا کہ املاک رکھنے والے طبقے سے اس کی املاک چھین لی جائے، میرا مقصد آپ کے دلوں پر اثر ڈالنا اور آپ کو اپنا ہم خیال بنانا ہے (وہ بڑے بڑے زمینداروں کے ایک وفد سے مخاطب تھے) تاکہ آپ اپنی ذاتی املاک کو رعایا کی امانت کے طور پر رکھیں اور اس کا اصل مصرف ان کی فلاح و بہبود کو سمجھیں۔اگر بے انصافی سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ آپ کی جائداد آپ سے چھین لی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کی طرف سے لڑوں گا۔مغرب کی اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد ایسے تصورات پر ہے جو بنیادی طور پر ہمارے تصورات سے مختلف ہیں۔ان میں سے ایک ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے اس لیے ہماری اشتراکیت اور اشتمالیت کی بنیاد عدم تشدد پر اور مزدور اور سرمایہ دار، زمیندار اور

کاشتکار کے ہم آہنگ تعاون پر ہونی چاہیے" میں نہیں کہہ سکتا کہ مشرق اور مغرب کے بنیادی تصورات میں اس قسم کا اختلاف ہے یا نہیں، ممکن ہے کہ ہو مگر اس زمانے میں تو صریحی اختلاف یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستانی سرمایہ دار اور زمیندار، مزدوروں اور کسانوں کے مفاد سے مغربی سرمایہ داروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ غفلت اور بے پروائی برتتے ہیں۔ ہندوستان کے زمیندار نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ کسانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیں۔ ایک یورپی مسٹر ایچ ای بریلس فورڈ نے ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "ہندوستانی ساہوکار اور زمیندار ایسی خون چوسنے والی جونکیں ہیں جن کی مثال کسی موجودہ سماجی نظام نہیں مل سکتی" (۱۰) لیکن غالباً ہندوستانی زمیندار کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ وہ خود زمانے کے حالات سے مجبور ہے۔ اس کی حالت گرتی چلی جاتی ہے۔ اور اب ایسی مشکل میں پڑ گیا ہے جس سے نجات پانا اس کے بس کی بات نہیں۔ مہاجنوں نے اکثر زمینداروں کی جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور چھوٹے زمیندار اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اسی زمین پر جس کے وہ کسی زمانے میں مالک تھے، کاشتکار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ شہر کے مہاجنوں نے جائدادیں رہن رکھیں اور روپیہ وقت پر ادا نہ ہونے سے فائدہ اٹھا کر ان پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہ زمیندار بن بیٹھے۔ گاندھی جی کے قول کے مطابق یہ لوگ امانت دار ہیں ان غریبوں کے جن سے انہوں نے خود زمینیں چھینی ہیں اور ان سے یہ توقع ہے کہ اپنی آمدنی کا اصل مصرف اسامیوں کی فلاح و بہبود کو سمجھیں گے۔

اگر واقعی تعلقہ داری نظام اچھا ہے تو اسے سارے ہندوستان میں کیوں نہ رائج کیا جائے؟ ہندوستان میں بڑے بڑے علاقے ہیں جہاں کسان حق ملکیت رکھتا ہے۔ کیا گاندھی جی اسے پسند کریں گے کہ گجرات میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار بنا دئے جائیں؟ میرے خیال میں تو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ پھر کیا وجہ

ہے کہ صوبہ متحدہ یا بہار یا بنگال کے لیے تو کوئی اور نظام اچھا ہو اور گجرات یا پنجاب کے لیے کوئی اور۔ غالباً شمالی اور جنوبی، مشرقی اور مغربی ہندوستان کے لوگوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ اور ان کے بنیادی تصورات ایک ہی ہیں۔ مطلب اصل میں یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی رہے "حالت موجودہ" میں کوئی تغیر نہ کیا جائے نہ تو کسی معاشی تحقیقات کی ضرورت ہے کہ کون سی چیز لوگوں کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور مفید اور نہ کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ لوگوں کے دل میں محبت اور ہمدردی پیدا کر دی جائے۔ یہ زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنے کا خالص مذہبی نقطہ نظر ہے اور اسے سیاسیات، معاشیات اور اجتماعیات سے بھی ذرا لگاؤ نہیں۔ مگر گاندھی جی مذہب کے دائرے سے آگے بڑھ کر سیاسی اور قومی معاملات میں بھی اس سے کام لینا چاہتے ہیں۔

اس قسم کے متضاد حالات اور خیالات آج کل ہندوستان کے سامنے ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں بہت سی گتھیاں ڈالی ہیں جن کو سلجھائے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ مگر یہ جذبات کی مدد سے نہیں سلجھ سکتیں۔ اب سے بہت پہلے اسپنوزا نے یہ سوال کیا تھا کہ کون سی چیز بہتر ہے " علم اور عقل کے ذریعے آزادی حاصل کرنا یا جذبات کی زنجیروں میں جکڑے رہنا؟" اس نے پہلی صورت کو ترجیح دی تھی۔

---

(۱) اپنے ایک پیام میں، جو قدامت پسند اور اتحادی پارٹی کی متحدہ انجمن کو جس کا جلسہ جنوری ۱۹۳۵ء میں اڈنبرگ میں ہوا بھیجا گیا تھا مسٹر ریمزے میکڈ انلڈ فرماتے ہیں "زمانے کی مشکلات ہر قوم کو متحد ہونے اور ایک مرکز پر جمع ہونے پر مجبور کر رہی ہیں۔ یہی حقیقی اشتراکیت ہے، یہی حقیقی قومیت بھی ہے بلکہ یہی حقیقی انفرادیت بھی ہے۔"

(۲) ضبط نفس اور نفس پرستی مصنفہ ایم کے گاندھی سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔

(۳) ۳ جنوری کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "حقیقی اشتراکیت دیہاتی صنعتوں کی ترقی پر موقوف ہے۔ ہم اپنے ملک میں وہ ابتری پیدا نہیں کرنا چاہتے جو مغربی ملکوں میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔"

(۳) ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے جلسے میں گاندھی جی نے فرمایا تھا ''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کانگرس اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان نیم فاقہ کش غریبوں کی نمائندہ ہے جو ملک کے طول وعرض میں سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں، چاہے وہ برطانوی ہند کے ہوں یا ''ہندی ہند'' کے۔ جن جن گروہوں کی اغراض کانگریس کے نزدیک قابل حمایت ہیں ان میں سب پر مقدم ان بے زبانوں کی فلاح ہے۔ اکثر یہ اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہو کہ مختلف گروہوں کی اغراض ٹکرا جائیں تو میں بے دھڑک کہتا ہوں کہ کانگرس ہر گروہ کی اغراض کو ان کروڑوں بے زبانوں کی فلاح پر قربان کر دے گی۔''

(۴) اوسط طبقے کا شہری۔

(۵) نیچے اوسط طبقے کا شہری۔

(۶) ۲۲ جنوری ۱۹۳۵ء کو مہاراجہ پٹیالہ چانسلر مجلس رؤسا نے چیمبر کے اجلاس دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے بعض سیاستدان وفاقی نظام کی تائید اس امید پر کرتے ہیں کہ حالات خودبخود دیسی ریاستوں کو اس پر مجبور کر دیں گے کہ وہ بھی اپنے یہاں جمہوری طرز حکومت قائم کریں۔ اس کے متعلق انہوں نے یہ فرمایا ''اگرچہ دیسی ریاستیں ہمیشہ اس بات کی خواہاں رہی ہیں کہ اپنی رعایا کے لیے وہ سب کچھ کریں جو ان کے لیے بہتر ہے اور آئندہ بھی وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلیں اور اپنی ریاستوں کے دستور اساسی میں مقتضائے وقت کے لحاظ سے ترمیم کریں۔ ہم صاف صاف یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ اگر برطانوی ہند اس دھوکے میں ہے کہ وہ ہمارے تندرست سیاسی جسم کو ایک بدنام سیاسی نظریے کی اترن پہننے پر مجبور کر دے گا تو وہ ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔'' اسی روز مجلس رؤسا میں تقریر کرتے ہوئے مہاراجہ بیکانیر نے فرمایا ''ہم دیسی ریاست کے فرمانروا قسمت آزمائی کرنے والے سپاہی نہیں ہیں، میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ کہ کئی صدی کی خاندانی روایات کی بناء پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حکومت ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ اور حکمت عملی اور تدبر میں ہمیں تھوڑا بہت حصہ ملا ہے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ کہیں دوسروں کے دباؤ میں آ کر ہم عجلت میں بے سوچے سمجھے کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ اگر اجازت ہو تو میں نہایت انکسار کے ساتھ عرض کروں گا۔ کہ ہندوستانی رئیس ہرگز اس کے لیے تیار نہیں کہ کسی سے دب کر حکومت سے دست بردار ہو جائیں۔ اور اگر بدقسمتی سے کبھی ایسا وقت آ گیا کہ تاج برطانیہ اپنے عہدناموں کی شرائط کے مطابق دیسی ریاستوں کی حفاظت نہ کر سکا تو رئیس اور ریاستیں مرتے دم تک میدان سے ہٹنے والی نہیں۔''

(۷) حیدر آباد دکن کی ایک اخباری اطلاع مورخہ ۳ اکتوبر ۳۴ء مظہر ہے ''گاندھی جی کی سالگرہ منانے کے لیے جو عام جلسہ دو یک درونی تھیٹر میں ہونے والا تھا وہ نہیں ہو سکا۔ جلسے کا انتظام حیدر آباد ہریجن سیوک سنگھ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس انجمن کے سیکرٹری نے اخبارات کے نام ایک خط میں بیان کیا ہے کہ جلسے کے وقت سے ۲۴ گھنٹے پہلے حکام نے یہ اطلاع دی کہ جلسہ کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی جائے گی کہ دو ہزار روپے کی نقد ضمانت داخل جائے اور یہ وعدہ کیا جائے کہ سیاسی نوعت کی تقریر نہ کی جائے گی اور حکام ریاست کے کسی سرکاری فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی جائے گی چونکہ اتنا وقت نہ تھا کہ داعی حکام سے مل کر معاملات طے کر سکتے اس لیے جلسہ کا خیال مجبوراً ترک کر دیا گیا''۔

(۸) سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۹ جنوری ۳۵ء کو بڑودے میں تقریر کرتے ہوئے اسی عدم مداخلت کی پالیسی پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ ریاستوں کے کارکنوں کو چاہیے کہ ریاست کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے دائرے میں رہ کر اپنا کام کریں، اور ریاست کے کام پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے یہ کوشش کریں کہ رعایا اور راعی کے درمیان عمدہ تعلقات قائم رہیں۔

(۹) ''ملکیت یا امن؟'' مصنفہ ایچ این بریلس فورڈ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خیالات پر اثر ڈالنا بہتر ہے یا جبر سے کام لینا

سولہ برس گزرے گاندھی جی نے ہندوستان پر اپنا اہنسا کے اصول کا سکہ بٹھا دیا تھا۔اس وقت سے اب تک ہندوستانی سیاست پر اس کا تسلط رہا ہے۔ بے شمار لوگ ایسے ہیں جنھوں نے بغیر سمجھے بوجھے اس کی تائید کی بعض نے اسے بڑی کش مکش کے بعد مشروط یا غیر مشروط طور پر قبول کیا اور بعض نے کھلم کھلا اس کا مذاق اڑایا۔ ہماری سیاسی اور سماجی زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور ہندوستان کے باہر بھی دوسرے ممالک میں اس کا بہت چرچا ہوا۔یوں تو یہ اصول اس وقت سے چلا آتا ہے جب سے انسان میں قوت فکر پیدا ہوئی۔لیکن غالباً گاندھی جی پہلے آدمی ہیں۔ جنھوں نے اس سے بڑے پیانے پر سیاسی اور سماجی تحریکوں میں کام لیا۔ابتدا میں یہ ایک انفرادی چیز تھی اور اس وجہ سے اس کی حیثیت دراصل مذہبی تھی۔اس کا مقصد انفرادی ضبط نفس ہوتا تھا اور اس کے ذریعہ انسان ذاتی اغراض سے بری اور دنیاوی کش مکش سے بلند ہو کر ایک قسم کی شخصی آزادی اور نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔اس میں یہ مقصد پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے سماجی مسائل کو حل کیا جائے اور سماجی حالات میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ہاں بالواسطہ اسی کا اثر کسی قدر سماجی زندگی پر پڑتا تھا۔اصل میں موجودہ سماجی نظام اور اسی بے انصافیوں اور عدم مساوات کو لوگ اٹل سمجھ کر بے چون و چرا تسلیم کرتے تھے۔گاندھی جی نے یہ کوشش کی کہ اس شخصی نصب العین کو بدل کر ایک اجتماعی نصب العین بنا دیں۔وہ سیاسی اور سماجی حالات دونوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے بالارادہ اس اہنسا کے طریقے کو اس وسیع اور نئے مقصد کے لیے استعمال کیا۔انھوں نے لکھا ہے کہ "جو لوگ انسانوں کے ماحول اور ان کے حالات زندگی میں کوئی اہم تبدیلی کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ سوسائٹی میں ایک ذہنی ہیجان پیدا کریں۔اس کے دو ہی

طریقے ہو سکتے ہیں یا

تشدد اور جبر سے کام لیا جائے یا اہنسا پر عمل کیا جائے۔ جبر کا دباؤ انسان کے جسم پر پڑتا ہے اور اس سے کام لینے والا خود ذلیل ہوتا ہے۔ اور دوسرے کو پست کرتا ہے لیکن اہنسا کا دباؤ جو خود تکلیف اٹھا کر مثلاً فاقہ کشی کے ذریعے ڈالا جائے اس سے بالکل مختلف اثر پیدا کرتا ہے۔ یہ جن لوگوں کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے جسم پر نہیں بلکہ ان کی اخلاقی قوتوں پر اثر ڈالتا ہے اور انہیں تقویت پہنچاتا ہے۔"

(۱)

یہ خیال ایک حد تک ہندوستانی فلسفہ سے ہم آہنگ ہے۔ اس لیے لوگوں نے اس کو کم سے کم سطحی طور پر نہایت جوش کے ساتھ قبول کر لیا۔ بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ اس کے نتائج کتنی دور تک پہنچتے ہیں اور جنہیں تھا انہوں نے بھی اس کے نظری پہلو کو سمجھے بغیر محض عقیدے اور عمل کے دامن میں پناہ لی۔ مگر جب عمل کا جوش کم ہوا تو لوگوں کے ذہن میں بے شمار سوالات پیدا ہوئے جن کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔ ان سوالوں کا کوئی خاص اثر اس موجودہ سیاسی طرز عمل پر نہیں پڑا بلکہ یہ دراصل اس تمام فلسفہ حیات سے متعلق تھے جس پر اس قسم کے بے تشدد مقابلے کی بنیاد ہے۔ سیاسی نقطہ نظر سے اس تحریک کو ابھی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندوستان اب تک شہنشاہیت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ سماجی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے ابھی کسی زبردست سماجی انقلاب کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا۔ مگر باوجود اس کے اگر کسی شخص میں تھوڑی سی نظر بھی ہے تو دیکھ سکتا ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کے کروڑوں باشندوں میں کس قدر زبردست تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے ان میں سیرت کی پختگی، قوت اور خود اعتمادی پیدا کر دی ہے اور یہ ایسی صفات ہیں جن کے بغیر سیاسی اور سماجی ترقی حاصل کرنا یا اس کا قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔ اس کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہو سکتا کہ یہ فوائد کہاں تک اہنسا کے اصول کی وجہ سے حاصل ہوتے

ہیں اور کہاں تک ہماری سیاسی کش مکش کا لازمی نتیجہ ہیں۔ بہت سی قوموں کو اکثر موقعوں پر یہ تمام فوائد ایسی کش مکش سے بھی حاصل ہوئے ہیں جس میں تشدد کو دخل تھا۔لیکن میرے خیال میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس اعتبار سے عدم تشدد (اہنسا) کا طریقہ ہمارے ملک کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں سوسائٹی میں وہ "ذہنی ہیجان" پیدا کرنے میں مدد ملی ہے۔جس کی طرف گاندھی جی نے اشارہ کیا تھا، گو یہ واقعہ ہے کہ وہ ہیجان بعض بنیادی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہے۔اس نے عام لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جو ہر انقلاب کی تمہید ہوا کرتی ہے۔

اہنسا کی یہ خوبی تو کھلی ہوئی ہے مگر یہ بجائے خود کافی نہیں۔اصل شبہات اس سے دور نہیں ہوتے۔بدقسمتی سے خود گاندھی جی سے اس مسئلے کے حل میں کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی۔انہوں نے اس موضوع پر بے شمار موقعوں پر تقریریں کی ہیں اور مضامین لکھے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے کبھی پبلک میں اس کے تمام فلسفیانہ اور عملی نتائج پر روشنی نہیں ڈالی (۲)۔وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ذرائع مقصد سے زیادہ اہم ہیں، روحانی اثر، جبر سے بہتر ہے اور ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہنسا کو حق اور خیر سے تعبیر کریں بلکہ وہ اکثر انہیں ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ایک رجحان یہ بھی ہے کہ ان سب لوگوں کو جو اس اصول سے اتفاق نہ کریں حلقہ خاص میں شامل نہ کیا جائے اور وہ قانون اخلاق کی خلاف ورزی کے مجرم قرار دیئے جائیں۔گاندھی جی کے بعض چیلوں پر اس لازمی طور پر یہ اثر ہوا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کو بہت مقدس سمجھنے لگے ہیں۔لیکن ہم میں جو لوگ اس قدر عقیدت نہیں رکھتے انہیں بہت سے شکوک اور شبہات ہیں۔ان شکوک کا تعلق جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں فوری ضروریات سے نہیں، بلکہ ذہنی ضرورت سے ہے کہ عمل کے لیے کوئی ایسا یک رنگ فلسفہ اختیار کیا جائے جو انفرادی نقطہ نظر سے اخلاقی قدر

بھی رکھتا ہو اور سماجی لحاظ سے بھی مفید اور موثر ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں ابھی یہ شکوک باقی ہیں اور اس مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل سمجھ میں نہیں آتا۔ میں جبر اور تشدد کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ لیکن خود مجھ میں تشدد موجود ہے اور میں جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اکثر دوسروں پر جبر کرنا چاہتا ہوں اور پھر یہ سوال ہے کہ اس ذہنی جبر سے بڑھ کر اور کون سا جبر ہو سکتا ہے۔ جس سے گاندھی جی اپنے خاص پیرووں اور رفیقوں کے دماغ کو معطل کر دیتے ہیں۔

مگر اصل سوال یہ ہے کہ آیا قومیں اور جماعتیں اہنسا کے اس انفرادی اصول کو پوری طرح اختیار بھی کر سکتی ہیں کیونکہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب نوع انسانی بحیثیت مجموعی محبت اور نیکی کی بلند تر سطح پر پہنچ جائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا انتہائی نصب العین یہی ہونا چاہیے کہ انسانوں کو اس بلندی پر پہنچائیں۔ اور نفرت، شر اور خود غرضی کو مٹائیں۔ یہ امر بجائے خود بحث طلب ہے کہ کبھی ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں لیکن اس امید کے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز بن جائے گی "کسی دیوانے کی کہانی جس میں شور ہی شور ہے مطلب کچھ نہیں۔" کیا اس مقصد کے حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم براہ راست ان اخلاقی خوبیوں کی تلقین کریں اور ان رکاوٹوں کا مطلق خیال نہ کریں جو اس کے راستے میں حائل ہیں اور اس کے مخالف رجحانات کو تقویت پہنچاتی ہیں؟ یا یہ بہتر ہو گا کہ پہلے ان رکاوٹوں کو دور کر کے ہم ایک زیادہ موزوں اور سازگار ماحول تیار کریں جس میں محبت، حسن اور خیر نشوونما پا سکیں؟ یا ان دونوں طریقوں کو ملانے کی ضرورت ہے؟

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تشدد اور عدم تشدد، روحانی اثر اور جبر کی حد فاصل اس قدر صاف اور واضح ہے جیسا عام طور پر کہا جاتا ہے۔ بعض دفعہ اخلاقی قوت کا جبر جسمانی تشدد سے کہیں زیادہ سخت ہوتا ہے۔ کیا اہنسا اور حق ایک ہی چیز ہیں؟ حق کیا ہے؟ اس قدیم سوال کے ہزاروں جواب دیئے گئے ہیں اور پھر بھی یہ سوال آج

تک حل نہیں ہوا۔لیکن خواہ اس کی ماہیت کچھ بھی ہو اس کو اہنسا کا ہم معنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔تشدد بجائے خود بری چیز ہے لیکن لازمی طور پر خلاف اخلاق نہیں۔اس کی بہت سی شکلیں اور بہت سے مدارج ہیں اور ممکن ہے کہ بعض حالات میں یہ اور طریقوں پر قابل ترجیح ہو۔گاندھی جی نے خود کہا کہ تشدد بزدلی، خوف اور غلامی سے بہتر ہے اور اس فہرست میں اور بھی بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔یہ سچ ہے کہ عام طور پر تشدد کا تعلق نفرت اور بدخواہی سے ہوتا ہے۔لیکن کم سے کم نظری طور پر یہ کوئی لازمی تعلق نہیں۔یہ بات قیاس میں آسکتی ہے کہ تشدد کی بنیاد خیر خواہی پر ہو (مثلاً ایک سرجن کا تشدد) اور جو چیز خیر خواہی پر مبنی ہو وہ اصولاً خلاف اخلاق نہیں ہوسکتی۔اخلاق کا اصل معیار نیت کا اچھا یا برا ہونا ہے۔لہذا اگرچہ تشدد اکثر اوقات اخلاقاً جائز ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس کو خطرناک سمجھنا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔

زندگی میں جنگ اور تشدد کا دور دورہ ہے۔یہ صحیح ہے کہ عموماً تشدد کا نتیجہ تشدد ہی ہوتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔لیکن اس کو بالکل ترک کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ ایک بالکل ہی فلسفیانہ رویہ اختیار کیا جائے جو زندگی سے سراسر بے تعلق ہے۔موجودہ حکومت اور نظام معاشرت کی بنیاد تمام تر تشدد پر ہے۔ریاست کے تشدد کے بغیر نہ ٹیکس وصول ہو سکتے ہیں نہ زمینداروں کو اپنی زمینوں کا لگان مل سکتا ہے، نہ ذاتی ملکیت قائم رہ سکتی ہے۔قانون فوجی قوت کی امداد سے ایک شخص کو دوسرے کو ذاتی ملکیت میں دخل دینے سے روکتا ہے۔خود قومی ریاست کی بنیاد جارحانہ دفاعی تشدد اور مدافعانہ تشدد پر قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی کا اہنسا کا اصول محض ایک منفیانہ نظریہ نہیں ہے۔یہ عدم مقاومت نہیں بلکہ بے تشدد معاومت ہے جو اس سے مختلف اور ایک مثبت اور موثر طریق کار ہے۔یہ ان لوگوں کے لیے نہیں جو موجودہ حالات کو بے

چون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ تو جاری ہی اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ سوسائٹی میں ایک ہیجان برپا کیا جائے اور اس طرح موجودہ حالات میں تبدیلی کی جائے۔ خواہ یہ روحانی اثر ڈالنے کی نیت سے جاری کی گیا ہو مگر عملاً یہ جبر کا ایک پر زور آلہ ثابت ہوا ہے اگر چہ یہ جبر بہت ہی مہذب اور معقول قسم کا تھا یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود گاندھی جی نے اپنی ابتدائی تحریروں میں "جبر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کی اس تقریر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جو انہوں نے پنجاب میں مارشل لا کے مظالم کے متعلق کی تھی وہ لکھتے ہیں۔

ہز ا کسی لینسی نے کونسل کے افتتاح کے موقع پر جو تقریر کی، اس سے ایک ایسا ذہنی رجحان ظاہر ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی خود دار شخص کے لیے ان کے یا ان کی حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا ممکن نہیں۔ پنجاب کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی تلافی کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم "مستقبل" قریب کے مسائل پر اپنی پوری توجہ صرف کریں! ہمارے لیے مستقبل کا فوری مسئلہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کو مجبور کریں کہ اس نے جو کچھ پنجاب میں کیا ہے اس پر پچھتائے اور اس کی تلافی کرے مگر اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ بہ خلاف اس کے ہز ا کسی لینسی معترضوں کا جواب دینے سے بچنا چاہتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان تمام اہم مسائل میں جن کا تعلق ہندوستان کی قومی خودداری سے ہے۔ ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ تمام معاملات کو تاریخ کے فیصلے پر چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کے الفاظ سے ہندوستانیوں کو اور زیادہ اشتعال ہوگا۔ تاریخ کا فیصلہ ان غریبوں کے کس کام آئے گا جن پر ظلم کیا گیا ہے اور جواب تک ایسے حکام کا پنجہ غضب میں گرفتار ہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو اعتماد اور ذمہ داری کے عہدوں کا سراسر نا اہل ثابت کیا ہے؟ پنجاب کے ساتھ انصاف کرنے سے صریحاً انکار کرنا اور اس کے

ساتھ ساتھ تعاون عمل کی دعوت دینا سراسر ریاکاری ہے۔"

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ حکومتوں کا قیام تشدد پر منحصر ہے اور یہ تشدد محض فوجی قوت کا کھلا ہوا تشدد ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک اور چھپا ہوا تشدد ہوتا ہے جس میں جاسوسوں، مخبروں، حکومت کے گرگوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مدرسوں اور اخباروں وغیرہ کے ذریعے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ مذہب اور دوسری قوتوں کا دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ افلاس اور فاقہ کشی سے کمر توڑ دی جاتی ہے۔ جہاں تک حکومتوں کے باہمی معاملات کا تعلق ہے، یہ بات مسلمہ ہے کہ نہ صرف جنگ کے زمانے میں بلکہ صلح کے زمانے میں بھی ہر قسم کا جھوٹ اور دغابازی جائز ہے بشرطیکہ وہ پوشیدہ رہے۔ تین سو برس گزرے سرہنری ووٹن نے جو شاعر تھے اور برطانوی سفیر بھی تھے۔ سفیر کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی کہ "وہ دیانت دار آدمی جو اپنے ملک کی خاطر جھوٹ بولنے کے لیے دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے" آج کل سفیروں کے ساتھ بہت سے فوجی، بحری اور تجارتی مددگار ہوتے ہیں جن کا کام ہی ہے کہ وہ ان ملکوں میں جاسوسی کریں جہاں وہ تعینات ہیں۔ ان کی مدد کے لیے خفیہ پولیس کا وسیع نظام ہوتا ہے جس کی ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کا جال دور دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ جس کے اپنے جاسوس الگ ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے جاسوسوں کا کاٹ کرنے والے الگ، جس میں جرائم پیشہ لوگوں سے کام لیا جاتا ہے، رشوت کے ذریعہ انسانی فطرت ذلیل کی جاتی ہے اور لوگ پوشیدہ طور پر قتل کرائے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں امن کے زمانے میں بھی کچھ کم نہیں ہوتیں لیکن جنگ میں ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور ان کا تباہ اثر ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے جو جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا، مخالف ملکوں کے متعلق جو غلط خبریں پھیلائی گئیں اور اس کام پر اور محکمہ جاسوسی پر جو بے اندازہ رقمیں صرف ہوئیں ان کا حال پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن آج کل امن بھی محض دو جنگوں کے درمیان کے وقفے اور

جنگ کی تیاری کا نام ہے اور اس زمانے میں بھی اقتصادی میدان اور دوسرے میدانوں میں لڑائی جاری رہتی ہے۔ فاتحوں اور مفتوحوں، شہنشاہی حکومتوں اور ان کی نوآبادیوں، لوٹنے والوں اور لٹنے والوں میں برابر ایک کش مکش رہتی ہے، غرض اس نام نہاد صلح میں بھی ایک حد تک جنگ کی فضا مع اپنے لوازم یعنی فریب وتشدد کے قائم رہتی ہے اور فوجی اور ملکی ملازموں کو اسی کی تربیت دی جاتی ہے۔ لارڈ ولزلی نے اپنی کتاب "فیلڈ سروس کی پاکٹ بک" میں لکھا ہے "ہم اس عقیدے کو ہمیشہ دہراتے رہیں گے کہ دیانتداری سب سے بہتر پالیسی ہے اور جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ یہ جملے ایک بچے کی کاپی پر بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن جو شخص جنگ میں ان اصولوں پر عمل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی تلوار میان میں رکھ لے۔"

آج کل قوموں اور جماعتوں میں جو اختلاف اور کشمکش ہیں ان کی وجہ سے سیاسی زندگی کا تشدد اور جھوٹ کی بنیاد پر قائم ہونا تقریباً ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے۔ جو قومیں اور جماعتیں دوسروں سے زیادہ حقوق رکھتی ہیں وہ اپنے حقوق کو قائم رکھنا اور دوسروں کی نشوونما کے مواقع کو روکنا چاہتی ہیں۔ لہذا وہ اس پر مجبور ہیں کہ تشدد جبر اور جھوٹ سے کام لیں۔ اس کا امکان ضرور ہے کہ جب رائے عامہ کا اثر زیادہ بڑھ جائے اور لوگ ان مخالفتوں اور رکاوٹوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں تو اس تشدد میں کمی ہو جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حال میں جو کچھ تجربہ اس بارے میں ہوا ہے اس سے برعکس نتیجہ نکلتا ہے اور جوں جوں موجودہ اداروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ کیا گیا ان کا تشدد اور بڑھتا گیا۔ اگر کھلے ہوئے تشدد میں کچھ کمی بھی ہوئی تو اس نے زیادہ خطرناک اور پوشیدہ شکلیں اختیار کرلیں۔ تشدد کا یہ رجحان نہ تو اقلیت کی نشوونما سے رک سکا اور نہ مذہب واخلاق سے۔ بیشک بعض افراد نے انسانیت کی مدارج میں ترقی کی ہے اور اعلیٰ درجے کے نہ سہی مگر اوسط درجے کے لوگ پہلے

سے زیادہ ہیں۔ اس لحاظ سے سماج نے ترقی کی ہے اور ایک حد تک قدیم وحشیانہ جبلتوں پر قابو پانے کی کوشش بھی شروع ہوگئی ہے۔ لیکن یہ افراد تک محدود ہے۔ جماعتوں اور گروہوں کے طرز عمل میں کوئی خوشگوار تغیر نہیں ہوا۔ افراد کے مہذب ہو جانے سے ان کے بتہ سے ابتدائی جذبات اور برائیاں جماعت کی طرف منتقل ہوگئی ہیں اور چونکہ تشدد کو ہمیشہ وہی لوگ پسند کرتے ہیں جو اخلاقاً کمتر درجے کے ہوں، اس لیے ان جماعتوں کے لیڈران کے بہترین اشخاص نہیں بن سکتے۔ لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ تشدد کی بدترین صورتیں رفتہ رفتہ دور ہو جائیں گی تو اس وقت بھی ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کرسکتے کہ حکومت اور سماجی زندگی دونوں کے قیام کے لیے جبر کی ضرورت ہے۔ سماجی زندگی کے لیے کسی قسم کی حکومت ضروری ہے اور جو لوگ برسر حکومت ہوں وہ اس پر مجبور ہیں کہ وہ ان تمام انفرادی اور اجتماعی رجحانات کی روک تھام کریں جو سر بسر خودغرضی پر مبنی ہیں اور جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ عموماً وہ اس معاملے میں ضرورت کی حد سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ حکومت اور قوت کا خاصہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس کے اخلاق کو خراب اور پست کردیتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خواہ ان لوگوں کو آزادی سے کتنی ہی محبت ہو اور وہ جبر کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ سرکشوں پر جبر کریں اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک ملک کے تمام افراد اخلاقی حیثیت سے کامل، بے غرض، بے نفس اور دل و جان سے فلاح عامہ کے طالب نہ بن جائیں۔ حکومت کے اراکین کو ان بیرونی جماعتوں کے خلاف بھی جبر و تشدد سے کام لینا پڑے گا جو ملک پر حملہ کریں۔ یعنی انہیں قوت کے مقابلے میں قوت استعمال کر کے اپنی مدافعت کرنا پڑے گی۔ اس کی ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ایک عالمگیر سلطنت قائم نہ ہو جائے۔

اگر قوت اور جبر بیرونی مدافعت اور اندرونی نظم و استحکام دونوں کے لیے

ضروری ہے تو اس کی حدود کس طرح قائم کی جائیں؟ جب کہ رائن ہولڈ نائی بور (۴) نے کہا ہے ''جب ایک دفعہ اخلاق کی طرف سے سیاست کو جبر کی اجازت دے دی جائے اور اسے سماجی استحکام کا ایک لازمی ذریعہ تسلیم کرلیا جائے تو تشدد آمیز اور بے تشدد جبر کے درمیان کوئی معین حد فاصل قائم نہیں جاسکتی اور حکومت کے جبر اور انقلاب پسندوں کے جبر میں بھی تمیز نہیں ہوسکتی''۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر میرا خیال ہے کہ گاندھی جی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اس ناقص دنیا میں قومی ریاست کو بھی بیرونی طاقتوں کے حملوں کی مدافعت کے لیے تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ یقیناً ریاست کو اپنے ہمسایوں اور دوسری ریاستوں سے دوستانہ اور پر امن تعلقات کی توقع کرنی چاہیے۔ لیکن حملے کے امکان سے انکار کرنا سراسر مہمل بات ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کو کچھ جبری اور تشدد آمیز قوانین بھی پاس کرنے پڑیں گے یعنی ایسے قوانین جن سے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے کچھ حقوق اور مراعات ان سے چھین لیے جائیں گے اور ان کی آزادیٔ عمل محدود ہو جائے گی۔ پھر کچھ نہ کچھ جبر و تشدد تو سبھی قوانین میں پایا جاتا ہے۔ کانگریس کے کراچی والے پروگرام کے مطابق ''عوام کی محنت سے جو ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اسے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کی سیاسی آزادی کے مفہوم میں اس ملک کے کروڑوں فاقہ کش باشندوں کی حقیقی معاشی آزادی کو بھی شامل کیا جائے'' اس مناسب خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان لوگوں کو جنہیں آج ضرورت سے زیادہ مراعات حاصل ہیں اپنے حصے میں بہت کچھ انہیں دینا پڑے گا جو ان مراعات سے محروم ہیں۔ مزید برآں اس پروگرام میں یہ بھی ہے کہ مزدوروں کو کم سے کم اتنا ضرور ملنا چاہیے کہ ان کی زندگی بسر ہو سکے اور انہیں دوسری ضروری سہولتیں میسر آسکیں۔ نیز یہ کہ جائداد پر خاصے محاصل عائد کیے جائیں گے۔ ''ریاست بنیادی صنعتوں اور محکموں، معنی ذرائع دولت، ریلوے،

نہروں، جہازوں اور دوسرے ذرائع نقل وحمل کی یا خود مالک ہوگی یا ان پر نگرانی رکھے گی''۔ آبادی کی ایک کثیر تعداد اس کی مخالفت کرے گی۔ وہ اکثریت کی مرضی کو گوارا کریں گے لیکن اسی حالت میں جب ان کے دل میں نافرمانی کے نتائج کا خوف موجود ہوگا۔ دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔

اگر اکثریت کوئی ایسا قانون پاس کرتی ہے جس سے حقوق ملکیت پر اثر پڑتا ہے یا وہ بالکل منسوخ کر دیئے جاتے ہیں تو کیا اس پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ یہ جبر وتشدد ہے؟ ظاہر ہے اس قسم کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی طریقہ تمام جمہوری قوانین کے پاس کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لیے جبر وتشدد کا الزام تو نہیں لگایا جا سکتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت غلطی پر ہے یا اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ پھر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جس قانون کو اکثریت نے پاس کیا ہے وہ کسی اخلاقی اصول کے منافی تو نہیں لیکن اس کا فیصلہ کون کرے۔ اگر افراد اور جماعتوں کو یہ حق دے دیا جائے کہ اپنے مفاد کے مطابق اخلاقی قوانین کی تفسیر کر لیا کریں تو جمہوری طرز حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ذاتی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے (اگر وہ ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے) افراد کو جماعت کے مقابلہ میں مجموعی طور پر ایک خطرناک اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ جو جماعت کے لیے سخت مضر ہے میں اس اقتدار کو اخلاقی اصول کے خلاف اور شراب خوری سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ نقصان فرد کو پہنچتا ہے نہ کہ جماعت کو۔

بعض لوگ عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ذاتی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس دلیل کو نہایت شدومد کے ساتھ

وہ بڑے بڑے زمیندار میرے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جنہیں اپنے لگان کو حکومت کی امداد سے جبراً وصول کرنے میں مطلق باک نہیں اور وہ سرمایہ دار جو بیسیوں کارخانوں کے مالک ہیں اور جنہیں یہ گوارا نہیں کہ ان کے علاقے میں مزدور اپنی آزاد انجمنیں قائم کریں۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے۔ بلکہ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انہیں بھی راضی کر لینا چاہیے۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو چند ارباب غرض جب چاہیں اچھی سے اچھی تبدیلیوں کو جن کی ضرورت بالکل مسلم ہو، روک دیں گے۔

دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔ معاشی اغراض کے سامنے نہ عقلی دلائل کا زور چلتا ہے۔ نہ اخلاقی اصول کا۔ ممکن ہے افراد کے عقائد بدلے جا سکیں اور وہ اپنے امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائیں، اگر چہ یہ بھی شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ لیکن جماعتیں اور طبقے کبھی ایسا نہیں کرتے اس لیے ایسی سب کوششیں جن کا مقصد یہ تھا کہ امتیازی حقوق رکھنے والے طبقے کا عقیدہ بدل دیا جائے تا کہ وہ اپنے اقتدار اور ناجائز حقوق سے از خود دست بردار ہو جائے، ہمیشہ ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ سمجھیں کہ آئندہ اس قسم کی کوششیں کامیاب ہوں گی۔ رائن ہولڈ میبور اپنی کتاب (۴) میں ان معلمین اخلاق کی تردید کرتا ہے "جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اقلیت کی ترقی یا مذہبی ہمدردی کی نشوونما سے لوگوں کی خود غرضی میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور انسانی جماعتوں اور گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے بس یہی کافی ہے کہ اسی عمل ترقی کو جاری رکھا جائے۔" وہ کہتا ہے "یہ معلمین اخلاق اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ انسانی جماعت میں انصاف قائم کرنے کے لیے سیاسی جدوجہد بھی ضروری ہے کیونکہ انہیں یہ احساس

نہیں کہ انسان کے مجموعی عمل میں بعض طبعی عناصر شامل ہیں جو کسی طور پر عقل یا ضمیر کے تابع نہیں ہو سکتے۔ وہ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ جب کوئی مجموعی قوت، چاہے وہ شہنشاہی کی شکل میں ظاہر ہو چاہے طبقوں کے اقتدار کی شکل میں کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیتی ہے تو اس کا توڑ قوت ہی سے ہو سکتا ہے۔" ایک جگہ اور وہ لکھتا ہے "چونکہ سماجی معاملات میں عقل ایک حد تک ہمیشہ اغراض کے تابع ہوتی ہے۔ اس لیے سماجی انصاف محض اخلاقی اور عقلی دلیلوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے جنگ کرنا لازمی ہو جاتا ہے اور اس جنگ میں قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کرنا پڑتا ہے"۔

اس لیے یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبہ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ بغیر موثر دباؤ ڈالے ہوئے یعنی بغیر جبر و تشدد سے کام لیے ہوئے کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھا لے گی۔ یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ گاندھی جی بھی موثر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں، اگرچہ وہ اس کو جبر و تشدد نہیں کہتے۔ ان کے نزدیک یہ دباؤ اپنی ذات پر تکلیف اٹھا کر ڈالا جا سکتا ہے۔ اس کا سمجھنا ذرا مشکل ہے کیونکہ اس میں ایک مابعد الطبیعاتی عنصر شامل ہے جو کسی مادی پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا حریف پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ اس سے اس کی اخلاقی مزاحمت کی قوت کمزور ہو جاتی ہے، اس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا ہے، اس میں جو بہترین صفات ہیں وہ بیدار ہو جاتی ہیں اور مصالحت کے لیے دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ محبت سے پیش آنے اور اپنے اوپر تکلیف اٹھانے کا نفسیاتی اثر دشمن پر اور دیکھنے والوں پر بہت قوی ہوتا

ہے۔ اکثر شکاری اس بات سے واقف ہیں کہ ایک وحشی جانور کے نزدیک پہنچنے کے مختلف طریقوں سے کس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جانور جارحانہ انداز کو دور سے محسوس کرلیتا ہے اور اس کا اثر قبول کرلیتا ہے۔ اگر آدمی کے دل میں خوف کا شائبہ بھی پیدا ہو جسے وہ خود پوری طرح محسوس نہیں کرتا تو جانور کو کسی نہ کسی طرح اس کا علم ہو جاتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر حملہ کردیتا ہے۔ اگر شیر کو سدھانے والے کی ہمت ایک لمحے کے لیے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے تو یہ خطرہ ہے کہ شیر فوراً حملہ کردے گا۔ جو آدمی بالکل نڈر ہوا سے وحشی جانوروں سے گزند پہنچنے کا بہت کم احتمال ہوتا ہے سوا اس کے کہ کوئی اتفاقی واقعہ پیش آ جائے، اس لیے یہ بالکل فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان بھی اسی نفسی اثرات سے متاثر ہو۔ لیکن افراد پر اثر پڑنا اور چیز ہے، شبہ تو اس میں ہے کہ کسی طبقے یا جماعت پر بھی اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ جماعت من حیث الجماعت فریق مخالف سے ذاتی اور گہرے تعلقات نہیں رکھتی اور اسے جو خبریں پہنچتی ہیں وہ یک طرفہ اور مسخ شدہ ہوتی ہیں۔ بہر حال اسے دوسرے فریق پر جو اس کی قوت کو توڑنا چاہتا ہے۔ اس شدت سے غصہ آتا ہے کہ اور سب چھوٹے چھوٹے جذبات اس غصہ سے دب جاتے ہیں۔ وہ ایک مدت سے یہ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے کہ اس اقتدار اور اس کے امتیازی حقوق سماج کے مفاد کے لیے ضروری ہیں اور اگر کوئی اس سے اختلاف کرے تو اسے کفر اور الحاد معلوم ہوتا ہے۔ نظم و امن اور موجودہ حالت کا قائم رکھنا اس کی نظر میں سب سے بڑی نیکی بن جاتا ہے اور اس کی مخالفت سب سے بڑا گناہ۔

اس لیے جہاں تک فریق مخالف کا تعلق ہے، عقائد کو بدلنے کی کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات تو اسے دوسروں کی نیکی اور نرمی پر اور بھی غصہ آتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس کا غلطی پر ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جب آدمی کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہی غلطی پر ہے تو اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ جاتی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ

عدم تشدد کے طریقے سے مخالفوں کے چند افراد متاثر ہوتے ہیں اور مخالفت کی مجموعی قوت کم ہو جاتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ غیر جانبداروں کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے اور دنیا کی رائے رامہ پر بڑا زبردست اثر پڑتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس بات کا امکان ہے کہ حکمراں طبقہ خبروں کو باہر نہ جانے دے یا ان کو مسخ کر دے کیونکہ اشاعت کے جتنے ذرائع ہیں وہ اسی کے قبضہ میں ہوتے ہیں اور وہ یہ کر سکتا ہے کہ لوگوں کو صحیح واقعات کا علم نہ ہونے دے۔ عدم تشدد کے طریقے کا سب سے قوی اور وسیع اثر اس ملک کے بے حس لوگوں پر پڑتا ہے۔ جہاں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے ان کے عقائد یقیناً بدل جاتے ہیں اور وہ اکثر نہایت جوش وخروش کے ساتھ تائید کرنے لگتے ہیں۔ لیکن انہیں ہم خیال بنانا کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ جو مقصد پیش نظر ہوتا ہے اس سے تو وہ متفق ہوتے ہیں۔ کسی نصب العین کے لیے تکلیفیں اٹھانا ہمیشہ اچھا سمجھا گیا ہے۔ اپنے مقصد کی خاطر سختیاں جھیلنے، ظلم وجور کا مقابلہ کرنے پر مگر ظالم سے انتقام نہ لینے میں وہ عظمت وشان ہے جو خواہ مخواہ دل پر اثر کرتی ہے۔ لیکن اس میں اور بے بسی کی مظلومی میں بہت ہی کم فرق ہے اور یہ بے بسی کی مظلومی بہت جلد ایک مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور انسان کے لیے باعث ذلت بن جاتی ہے۔ اگر تشدد میں اس کا خوف ہے کہ انسان کو ایذا رسانی کا شوق نہ ہو جائے تو عدم تشدد کی منفی صورتوں میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اسے ایذا اٹھانے کا چسکا نہ ہو جائے اور پھر اس کا بھی امکان ہے کہ عدم تشدد اپنی کاہلی اور بزدلی کو چھپانے اور موجودہ حالت کو قائم رکھنے کا بہانہ بنا لیا جائے۔

پچھلے چند سال سے۔ جب سے ہندوستان میں بنیادی معاشرتی تبدیلیوں کے خیال نے اہمیت حاصل کی ہے، یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اس قسم کی تبدیلی میں لازمی طور پر تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ اس لیے اس کی حمایت جائز نہیں۔ طبقوں کی جنگ کا (چاہے وہ آج بھی ہو) نام تک نہ لینا چاہیے اس لیے کہ اس سے ہمارے

اس خواب میں خلل پڑتا ہے کہ ہم سب طبقوں کے اتحاد عمل سے بغیر تشدد کے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے رہیں گے اور ایک روز کسی نہ کسی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ سماجی مسئلے کے حل کرنے میں کسی وقت تشدد سے کام لینا ضروری ہو جائے کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ حقوق رکھنے والی جماعتیں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے تشدد کے استعمال کرنے میں کبھی تامل نہ کریں گی۔ لیکن اصولاً اگر عدم تشدد کے طریقے سے ایک زبردست سیاسی تبدیلی کا پیدا کرنا ممکن ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس طریقے سے بنیادی سماجی تبدیلی پیدا کرنا ناممکن سمجھا جائے۔ اگر ہم عدم تشدد کے ذریعے سے سیاسی آزادی حاصل کر سکتے ہیں اور ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا خاتمہ کر سکتے ہیں تو اسی کے ذریعے سے جاگیرداروں اور زمینداروں کا مسئلہ اور دوسرے معاشرتی مسائل بھی حل کر سکتے ہیں اور اشتراکی ریاست بھی قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ واقعی یہ سب چیزیں عدم تشدد کے ذریعے سے حاصل کی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ یا تو عدم تشدد کے ذریعے سے دونوں مقصد حاصل ہو سکتے ہیں یا دونوں میں سے ایک بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ عدم تشدد کا طریقہ صرف ایک غیر ملکی حکمراں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صریحی بات ہے کہ ملک کے اندر خود غرض طبقوں اور ترقی کے دشمنوں کے خلاف اسے استعمال کرنا زیادہ سہل ہے۔ کیونکہ اس پر اس کا نفسیاتی اثر کہیں زیادہ قوی ہوگا۔ البتہ جو لوگ تبدیلی سے ڈرتے ہیں ان پر اس کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں عدم تعاون اور سول نافرمانی کے اس تیزی سے پھیل جانے سے ثابت ہو گیا کہ کس طرح ایک بے تشدد تحریک بے شمار آدمیوں پر زبردست اثر ڈالتی ہے اور بہت سے لوگوں کو جو پہلے مذبذب تھے اپنا ہم خیال بنا لیتی ہے، لیکن جو لوگ سرے سے اس کے مخالف تھے ان کو تو یہ ہم خیال نہیں بنا سکی بلکہ اس تحریک کی کامیابی نے ان کے اندیشوں میں اور اضافہ کر دیا اور ان کی مخالفت اور بڑھ گئی۔

اگر اس بات کو ایک دفعہ تسلیم کرلیا جائے کہ ریاست کو اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے جبر وتشدد استعمال کرنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے جبر وتشدد سے کام لینا جائز نہ سمجھا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ تشدد کا طریقہ مصلحت کے خلاف ہو۔ لیکن اسے ناجائز اور ممنوع نہیں کہہ سکتے۔ محض اس لیے کہ حکومت برسر اقتدار فرقے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے قبضے میں ملک کی مسلح افواج ہیں، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے جبر وتشدد کے استعمال کا حق مل جاتا ہے جس سے وہ پہلے محروم تھی؟ اگر اس کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی جائے تو وہ اس کا مقابلہ کس طرح کرے گی؟ ظاہر ہے کہ وہ تشدد کے طریقے اختیار کرنے سے پرہیز کرے گی اور اس کی پوری کوشش کرے گی کہ پرامن طریقے سے کام چلائے۔ لیکن وہ تشدد کے استعمال کا حق تو نہیں چھوڑ سکتی۔ جو لوگ تبدیلی کے مخالف ہیں ان میں بہت سے غیر مطمئن اور شورش پسند عناصر ہوں گے جو پہلی حالت کی طرف لوٹنا چاہیں گے۔ اگر انہیں یہ خیال ہوگا کہ ان کے تشدد کو روکنے کے لیے نئی ریاست سختی سے کام نہیں لے گی تو وہ اور دل کھول کر تشدد کریں گے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تشدد اور عدم تشدد سے کام لینے اور عقائد پر اثر ڈالنے میں کوئی واضح حد فاصل مقرر نہیں کی جاسکتی۔ یہ مشکل سیاسی تبدیلیوں کے مسئلے میں بھی ہوتی ہے لیکن جب امیروں اور غریبوں کی کش مکش کا سوال ہو تو اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان میں آج کل یہ رجحان ہے کہ کسی مقصد یا پالیسی کو محض اس لیے برا کہا جائے کہ وہ عدم تشدد کے منافی ہے۔ میرے خیال میں مسائل پر غور کرنے سے یہ بالکل الٹا طریقہ ہے۔ ہم نے پندرہ سال ہوئے عدم تشدد کو اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کا سب سے معقول اور موثر طریقہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہمارا مقصد عدم تشدد سے جدا تھا۔ صرف اس کا ضمیمہ یا نتیجہ نہ تھا۔ اس وقت کسی شخص کے منہ سے یہ بات نہیں نکلی تھی کہ آزادی اور مکمل خود مختاری کی کوشش صرف اسی صورت

میں کرنی چاہیے جب یہ عدم تشدد کے طریقوں سے حاصل ہوسکیں۔ لیکن اب خود ہمارا مقصد عدم تشدد کے معیار پر رکھا جاتا ہے اور اگر اس کے مطابق نہ نکلے تو رد کر دیا جاتا ہے۔ غرض عدم تشدد کا تخیل ایک اٹل عقیدہ بنتا ہے جس پر کبھی کسی قسم کا اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لیے عقل کے نزدیک اس کی روحانی کشش زائل ہوتی جاتی ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ مذہب کی مثل میں نتھی ہو کر داخل دفتر کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ مستقل حقوق رکھنے والوں کی کشتی کے لیے لنگر کا کام دے رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ موجودہ حالت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ بات بہت قابل افسوس ہے کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے لیے عدم تشدد کا اصول اور بے تشدد جنگ کا طریق عمل بہت مفید ہے اور گاندھی جی نے لوگوں کے خیالات اس کی طرف متوجہ کر کے زبردست خدمت انجام دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بنی نوع انسان انہیں مکمل طور پر اختیار کرنے کے لیے ابھی تک تیار نہ ہو۔ اے۔ ای کے ڈرامے Interpreters میں ایک شخص کہتا ہے کہ "تم اندھے کے ہاتھ میں شمع دیتے ہو لیکن وہ اس سے سونٹے کے سوا اور کیا کام لے سکتا ہے؟" تو یہ ممکن ہے کہ ابھی اس شمع کی روشنی زیادہ نہ پھیلے لیکن تمام بڑے خیالات کی طرح اس کا اثر رفتہ رفتہ بڑھے گا اور ہمارے اعمال کو روز بروز متاثر کرے گا۔ عدم تعاون یعنی اس حکومت یا جماعت سے جو بری سمجھی جاتی ہے کسی قسم کا تعاون نہ کرنا بڑا قوی اور موثر اصول ہے۔ معدودے چند اخلاقی قدر رکھنے والے اشخاص بھی عمل کریں تو اس کا اثر پھیلتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ جب زیادہ تعداد میں لوگ اسے اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا ظاہری اثر اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے لیکن بعض خارجی چیزیں اس کے اخلاقی پہلو دھندلا کر دیتی ہیں۔ جب اس کا دائرہ وسیع کیا جاتا ہے تو اس کی شدت کم ہو جاتی ہے مجموعی ذہنیت رفتہ رفتہ شخصی ذہنیت پر غالب آجاتی ہے مگر خالص عدم تشدد پر

جو زور دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے یہ چیز زندگی سے جدا اور دور ہوگئی ہے اور لوگ یا تو
اسے آنکھ بند کرکے مذہبی عقیدے کے طور پر قبول کر لیتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے۔
ذہنی عنصر بالکل دب کر رہ گیا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اس کا تخویف پسندوں پر بڑا اثر پڑا
تھا۔ ان میں سے بہت سے اس گروہ سے نکل آئے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ بھی شبہ
میں پڑ جانے کی وجہ سے سست ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے تشدد آمیز مشاغل کو
روک دیا تھا۔ لیکن اب ان پر اس کا یہ اثر نہیں ہے۔ خود کانگرس کے اندر ایک اہم
جماعت جس نے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور
ایمانداری کے ساتھ عدم تشدد کے طریقے کی شرائط پوری کرنے کی کوشش کی اب ملحد
اور منکر سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسے کانگریس میں رہنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ
وہ اس کے لیے تیار نہیں کہ عدم تشدد کو اپنا دین و ایمان مانے اور اس مقصد کو ترک کر
دے جو اسے دل سے عزیز ہے۔ یعنی اشتراکی ریاست، جس میں سب کے ساتھ
یکساں انصاف کیا جائے اور ہر شخص کو برابر کے حقوق دیئے جائیں، ایک منظم
سوسائٹی جس کے قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ موجودہ امتیازی حقوق اور
ملکیت کے حقوق میں سے اکثر منسوخ کر دیئے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی
تک گاندھی جی کا بہت بڑا اثر ہے، ان کے عدم تشدد میں حرکت اور جارحانہ کیفیت
پائی جاتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس روز وہ ملک میں برقی لہر دوڑا کر ترقی کی
جدوجہد شروع کر دیں گے۔ وہ اپنی عظمت اور متضاد خصوصیات اور عوام میں حرکت
پیدا کرنے کی غیر معمولی قوت کی وجہ سے عام معیاروں سے بہت بلند ہیں۔ ان کو ہم
اس پیمانے سے نہیں ناپ سکتے جس سے دوسروں کو ناپتے ہیں لیکن بہت سے لوگوں
میں ان کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس قسم کی نکمی صلح پسندی اور عدم
مزاحمت کی جھلک نظر آتی ہے۔ جس کی تعلیم ٹالسٹائی نے دی ہے یا وہ ایک تنگ
خیال فرقے کے رکن بن کر رہ جاتے ہیں جنہیں زندگی اور واقعات سے لگاؤ تک

نہیں۔ ان لوگوں کے گرد بہت سے وہ لوگ جمع ہو جاتے ہیں جن کا مفادہ موجودہ نظام کے قائم رکھنے سے وابستہ ہے اور جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عدم تشدد کی آڑ لیتے ہیں۔ اسی طرح زمانہ سازی اور مصلحت پرستی کا قدم درمیان میں آ جاتا ہے، مخالف کو ہم خیال بنانے کی کوشش کا انجام عدم تشدد کی بدولت یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود دشمن کا ہم خیال بن کر اسی طرف سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ جب ہمارا جوش گھٹتا ہے اور ہم کمزور ہونے لگتے ہیں تو ہم پیچھے ہٹنے اور مصالحت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اپنا جی خوش کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ دشمن کو پرچا رہے ہیں۔ اور بعض وقت یہ کامیابی ہم اپنے پرانے رفیقوں کو قربان کر کے حاصل کرتے ہیں۔ ہم ان کی انتہاپسندیوں اور ان کے ان بیانات کی جو ہمارے نئے دوست کو ناگوار ہوں مذمت کرتے ہیں اور ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے ہم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ سماجی نظام میں بنیادی تبدیلی کی جگہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ موجودہ نظام میں فراخ دلی اور احسان و مروت پیدا کر کے اس کی اصلاح کی جائے۔ اور اونچے طبقوں کے مستقل حقوق بدستور قائم رہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ گاندھی جی نے وسائل کی اہمیت پر زور دے کر ہماری بہت خدمت انجام دی ہے مگر اس کے باوجود میری یہ قطعی رائے ہے کہ مقصد کو وسائل سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ جب تک ہم اس بات نہیں سمجھیں گے اس وقت تک اس رہرو کی طرح بھٹکتے پھریں گے جس کی کوئی منزل نہ ہو اور اپنی قوتوں کو ضمنی زور غیر اہم مسائل پر ضائع کرتے رہیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ذرائع کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اخلاقی پہلو سے قطع نظر ان کا ایک عملی پہلو بھی ہے۔ برے اور غیر اخلاقی ذرائع اختیار کرنے سے اکثر اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اور نہایت زبردست نئی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کسی شخص کے متعلق صحیح رائے اس کے مقصد کے لحاظ سے نہیں بلکہ ذرائع کے لحاظ سے قائم کی جاتی ہے جو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔

اگر ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا ہوں اور دلوں میں نفرت بڑھے تو راہ کی مشکلات بڑھتی جائیں گی اور منزل مقصود دور ہوتی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مقاصد اور ذرائع کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں اس لیے لازمی طور پر ذرائع ایسے ہونے چاہئیں جن سے مخالفت اور نفرت نہ پیدا ہو یا کم سے کم ایک حد سے آگے نہ بڑھے (کیونکہ اس کا پیدا ہونا تو ناگزیر ہے) اور باہمی محبت کو ترقی ہو، غرض سوال کسی خاص طریقے کے اختیار کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ محض نیت، ارادے اور مزاج کا ہے چنانچہ گاندھی جی کا زور بھی نیک نیتی پر ہے اور اگر انہیں ایک طرف انسانی فطرت کے بدلنے میں ناکامیابی ہوئی تو دوسری طرف ایک ایسی بڑی تحریک میں، جس میں لاکھوں آدمی شریک تھے یہ نیک نیتی پیدا کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ سخت اخلاقی ضبط و انضباط پر انہوں نے جو زور دیا وہ بہت ضروری تھا اگرچہ ان کے انفرادی ضبط کے معیار کو شاید ہر شخص تسلیم نہ کرے۔ وہ انفرادی گناہوں اور کمزوریوں کو بہت زیادہ اور معاشرتی گناہوں کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ اس ضبط کی ضرورت بالکل واضح ہے کیونکہ مصیبت اور تکلیف کی زندگی کو چھوڑ کر ارباب اقتدار میں شامل ہونے کے لالچ نے بہت سے کانگریسیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ ہر مشہور کانگریسی کے لیے اس دنیاوی جنت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔

ساری دنیا آج مختلف قسم کی کش مکش میں نظر آتی ہے لیکن ان میں سب سے سخت روحانی کش مکش ہے۔ مشرق میں یہ کش مکش خاص طور پر نمایاں ہے۔ کیونکہ ایشیا کے ملکوں میں جو تبدیلیاں حال میں ہوئی ہیں ان کی رفتار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی، اس لیے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا یہاں اور زیادہ تکلیف دہ ہے۔ سیاسی مسئلہ جو اس وقت سب پر حاوی نظر آتا ہے نسبتاً سب سے کم اہمیت رکھتا ہے۔ گو ہمارے لیے یہ مسئلہ سب سے مقدم ہے اور دوسرے اہم تر

مسائل کو حل کرنے سے پہلے اس کا قابل اطمینان تصفیہ ہونا ضروری ہے۔ گذشتہ کئی قرنوں سے ہم ایک غیر تغیر پذیر سماجی نظام کے عادی ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کا ابھی تک یہ عقیدہ ہے کہ صرف یہی نظام صحیح اور قابل عمل ہے، لیکن ماضی اور حال میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں اس طرح کی جاتی ہیں وہ لازمی طور پر ناکام رہتی ہیں۔ امریکہ کے ماہر معاشیات ویبلن نے لکھا ہے کہ ''معاشی اخلاق اصل میں معاشی ضروریات کا تابع ہے''۔ موجودہ زمانے کی ضروریات ہمیں مجبور کریں گی کہ ہم ان کے مطابق ایک نیا نظام مرتب کریں اگر ہمیں اس روحانی کش مکش سے نجات پانا ہے اور اس بات کو دریافت کرنا ہے کہ صحیح روحانی معیار کے مطابق آج کل کون سی قدریں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں تو ہمیں ان مسائل پر جرات اور دلیری کے ساتھ غور کرنا پڑے گا مذہبی عقیدوں کی آڑ میں پناہ لینے سے کام نہیں چلے گا۔ مذہب کی تعلیم اچھی ہو یا بری لیکن اس کا طریقہ تعلیم اور اس کا یہ مطالبہ کہ ہم اس کے اصولوں کو آنکھ بند کر کے مان لیں ہمیں کسی مسئلے پر عقلی نقطہ نظر سے غور ہی نہیں کرنے دیتا، بہ قول فرائڈ کے'' مذہب کے اذعانی عقائد کو مان لینا چاہیے کیونکہ اول تو ہمارے آباؤ اجداد انہیں ابتدا سے مانتے آئے ہیں، دوسرے ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جو اسی قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں، تیسرے ہمیں ان کے بارے میں چون و چرا کرنے کی معانعت کر دی گئی ہے۔''

(۵)

اگر ہم عدم تشدد اور اس کے تمام لوازمات کو مذہب کے اذعانی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس میں دلیل اور بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس کی حیثیت ایک تنگ نظر فرقے کے معتقدات کی سی ہو جاتی ہے اور نہ اسے موجودہ مسائل سے تعلق رہتا ہے لیکن اگر ہم موجودہ حالات کی روشنی میں اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں دنیا کی از سر نو تشکیل کرنے میں اس سے بہت مدد ملے گی۔ اس صورت میں ہمیں

ایک انسانی جماعت کی فطرت اور کمزوریوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کوئی تحریک جو عوام میں پھیلائی جائے خصوصاً ایسی تحریک جس کا مقصد بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں کرنا ہو، صرف لیڈروں کی ذہنیت سے متاثر نہیں ہوتی، بلکہ اس پر عام حالات کا اور اس سے بھی زیادہ ان لوگوں کے خیالات کا اثر پڑتا ہے جن سے وہ کام لیتی ہے۔

تشدد کا دنیا کی تاریخ میں بہت اہم حصہ رہا ہے۔ آج بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی، شاید ایک عرصے تک کم نہیں ہوگی۔ ماضی کی اکثر تبدیلیاں تشدد اور جبر کے ذریعے ہوئی ہیں۔ ڈبلیو۔ ای۔ گلیڈ اسٹون نے ایک دفعہ کہا تھا ''مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس ملک کے لوگوں کی سیاسی بے چینی کے زمانے میں صرف یہی وعظ سنایا جاتا کہ تشدد سے نفرت کرو، نظم و امن سے محبت کرو اور صبر سے کام لو تو ملک کو کبھی آزادی نصیب نہ ہوئی ہوتی۔''

جبر و قوت کو جو اہمیت حاصل رہی ہے اور اب بھی حاصل ہے اس سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ اس سے انکار کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم زندگی کی حقیقتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تاہم تشدد بری چیز ہے۔ اور اس سے بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہے اور تشدد سے بھی بدتر نفرت، ظلم، انتقام اور سزا کے وہ جذبے ہیں جو اکثر اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو تشدد بجائے خود اتنی بری چیز نہیں ہے جتنے اس کے یہ لوازم۔ تشدد ان جذبوں سے پاک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا استعمال اچھے مقصد کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے اور برے مقاصد کے لیے بھی۔ لیکن اسے ان جذبوں سے پاک رکھنا سخت دشوار ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس سے پرہیز کیا جائے مگر تشدد سے پرہیز کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی اس سے بدتر چیزوں کو برداشت کرے۔ دوسروں کے تشدد کے آگے سر جھکانا یا کسی غیر منصفانہ نظام حکومت کو قبول کرنا جس کی بنیاد تشدد پر قائم ہے، عدم تشدد کے اصول کے قطعاً منافی ہے۔ عدم تشدد کا طریقہ اسی جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب اس میں

حرکت ہو اور غیر منصفانہ حکومت یا نظام جماعت کو بدلنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ عدم تشدد میں اس کی قابلیت ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ ہمیں ترقی کے مرحلے طے کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے مگر اس میں مجھے شبہ ہے کہ یہ ہمیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ بہر حال جبر کی کوئی نہ کوئی شکل ناگزیر ہے کیونکہ جو لوگ اقتدار اور حقوق کے مالک ہوتے ہیں انہیں اس وقت نہیں چھوڑتے جب تک وہ اس پر مجبور نہ کیے جائیں یا جب تک ایسے حالات نہ پیدا کر دیئے جائیں کہ ان کے لیے ان حقوق کا نہ چھوڑنا چھوڑنے سے زیادہ مضر ہے۔ سماج کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور طبقوں کی جنگ کا تصفیہ بجز جبر کے اور کسی صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک معاشرتی تبدیلی کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہو سکے گی لیکن اس کے بعد اشخاص پر جبر کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس بنیادی اختلاف پر پردہ ڈال دیں اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ اس قسم کے اختلافات کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے ہم نہ صرف حق کو چھپانے کے مجرم ہوں گے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اصل واقعات سے ناواقف رہیں گے، موجودہ نظام کو ایک سہارا مل جائے گا اور حکمراں طبقوں کو اپنے امتیازی حقوق کے لیے ایک اخلاقی بنیاد ہاتھ آ جائے گی جس کی وہ ہمیشہ تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام سے جنگ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان غلط مفروضات کی تردید کی جائے جن پر اس کا دارومدار ہے اور حقیقت بے نقاب کر دی جائے۔ تحریک عدم تعاون کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان جھوٹے مفروضات کی قلعی کھول دیتی ہے اور ہماری اس کوشش کو تقویت پہنچاتی ہے کہ ہم انہیں تسلیم کرنے اور ان سے اشتراک کرنے سے انکار کر دیں۔

ہمارے پیش نظر ایک ایسی سماج ہے جس میں مختلف طبقوں کا فرق مٹ جائے، معاشی معاملات میں سب کے ساتھ یکساں انصاف برتا جائے اور سب کو یکساں موقع دیا جائے۔ ایک منظّم سماج، جس کا مقصد یہ ہو کہ بنی نوع انسان بلند تر مادی اور تمدنی سطح پر پہنچ سکے اور اس میں روحانی صفات یعنی اشتراک عمل، بے غرضی، خدمت خلق، حق پسندی، ہمدردی اور محبت نشوونما پا سکیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ایک دن اس طرح کا ایک عالمگیر نظام قائم ہو جائے۔ اس راہ میں جو چیز حائل ہو اسے ہٹانا پڑے گا۔ اگر ممکن ہو تو نرمی سے ورنہ مجبوراً سختی سے۔ یہ یقینی بات ہے کہ جبر کی ضرورت اکثر پیش آئے گی۔ لیکن اگر قوت کا استعمال کیا جائے تو وہ نفرت اور ظلم کے جذبے کے ساتھ نہ ہونا چاہیے بلکہ ٹھنڈے دل سے محض رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے، ظاہر اس میں سخت دشواری پیش آئے گی۔ منزل بڑی کٹھن ہے اور قدم قدم پر لغزش کا اندیشہ ہے مگر ان مشکلات کا علاج یہ نہیں کہ ہم ان کو نظر انداز کر دیں بلکہ یہ ہے کہ ہم ان کی حقیقت کو سمجھیں اور بہادری سے ان کا مقابلہ کریں۔ بظاہر یہ باتیں خیالی اور دور از کار معلوم ہوتی ہیں اور یقین نہیں آتا کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت میں یہ اعلیٰ جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن ہمیں انہیں پیش نظر رکھنا چاہیے اور ان پر زور دیتے رہنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان نفرتوں اور تلخیوں میں کمی واقع ہو جائے جن سے ہمارے دل بھرے ہوئے ہیں۔

ہمارا طریقہ وہی ہونا چاہیے جو ہمیں اس منزل تک پہنچا سکے اور ان جذبات پر مبنی ہو۔ لیکن ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کی فطرت اجتماعی کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے عام لوگ ہمیشہ ہماری تعلیم و تلقین پر دھیان نہیں دیں گے اور اعلیٰ اخلاقی اصول پر عمل نہ کریں گے اس لیے لوگوں کے خیالات پر اثر ڈالنے کے علاوہ ہمیں اکثر جبر سے بھی کام لینا پڑے گا زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اس جبر کو محدود رکھیں اور اس سے اس طرح کام لیں کہ اس کی خرابیاں کم ہو جائیں۔

۱: یہ اقتباس گاندھی جی کے ایک بیان سے لیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے ایک برت کے موقع دسمبر ۳۲ءکو دیا تھا۔

۲: رچارڈ۔ ب۔ گریگ نے اپنی کتاب ''عدم تشدد کی قوت'' میں اس مسئلے پر علمی بحث کی ہے ان کی کتاب بہت دلچسپ اور محرک فکر ہے۔

۳: اپنی کتاب ''نیک فرد اور بد جماعت'' میں

Moral man immoral Socitey:۴

The Future of an illusion:۵

پھر دہرہ جیل میں

علی جیل میں میری صحت اچھی نہیں تھی۔ میرا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور کلکتے کی ہوا اور گرمی سے تکلیف ہو رہی تھی۔ کچھ دن سے یہ افواہیں سننے میں آتی تھیں کہ میری بدلی کسی بہتر آب و ہوا کے مقام پر ہو جائے گی۔ ۷ مئی کو مجھے حکم دیا گیا کہ اپنا بوریا بند سنبھال کر یہاں سے چل دو۔ معلوم ہوا کہ دہرہ دون جیل میں بھیجا جا رہا ہوں۔ کئی مہینے کال کوٹھڑی میں بند رہنے کے بعد شام کے ٹھنڈے وقت گاڑی میں کلکتے کی گلیوں سے گزرنا بہت بھلا معلوم ہوا اور ہوڑے کے اسٹیشن پر لوگوں کو مجمع دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

میں اپنی بدلی سے خوش تھا اور مجھے دہرہ دون پہنچنے کا اشتیاق تھا جہاں سے پہاڑ اس قدر قریب ہیں۔ وہاں آ کر معلوم ہوا کہ جو حالت اب سے نو مہینے پہلے میری نینی جاتے وقت تھی وہ اب نہیں ہے۔ اب میں ایک نئی جگہ رکھا گیا۔ یہ ایک مویشیوں کے باندھنے کا سائبان تھا جس کی صفائی اور درستی کر لی گئی تھی۔

جیل کی کوٹھڑی کی حیثیت سے یہ اچھی خاصی جگہ تھی اس سے ملا ہوا کوئی پچاس فٹ لمبا صحن بھی تھا۔ یہ اس کوٹھڑی سے جو مجھے دہرہ دون میں پہلی بار ملی تھی بہتر تھی مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس میں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ چار دیواری جو پہلے دس فٹ اونچی تھی خاص طور پر میرے لیے چار پانچ فٹ اور اونچی کر دی گئی تھی۔ پہاڑ کا منظر جس کا مجھے اس قدر اشتیاق تھا بالکل چھپ گیا تھا۔ صرف چند درختوں کی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ میں تین مہینے سے زیادہ اس جیل میں رہا اور مجھے پہاڑوں کی ایک جھلک تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ پہلی بار مجھے جیل کے دروازے کے سامنے ٹہلنے کی اجازت تھی مگر اب وہ بھی نہیں رہی۔ کوٹھڑی کے کے ساتھ چھوٹا سا صحن میری ورزش کے لیے کافی سمجھا گیا۔

یہ اور اسی قسم کی اور بندشیں بہت مایوس کن تھیں اور میں ان سے دق آ گیا'

طبیعت میں ایک مٹھا پن سا پیدا ہو گیا اور جو تھوڑی بہت میرے لیے ورزش جائز رکھی گئی تھی اس کے کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کبھی تنہائی کا اور دنیا سے بے خبر ہونے کا اس قدر احساس نہیں ہوا تھا جتنا اس مرتبہ ہو رہا تھا۔ اس قید تنہائی کا اثر میرے اعصاب پر پڑنے لگا اور میرے جسم اور دماغ کی قوت گھٹنے لگی۔ میں خوب جانتا تھا کہ دیوار کے پار صرف چند فٹ کے فاصلہ پر تازگی اور فرحت کا سماں چھایا ہوا ہوا۔ ہری ہری گھاس اور نرم نرم مٹی کی ٹھنڈی خوشبو آ رہی ہو گی، دور دور تک منظر نظر آ رہا ہو گا۔ مگر یہ سب چیزیں میری پہنچ سے باہر تھیں اور میری آنکھیں ان دیواروں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ جیل کی معمولی زندگی کی چہل پہل بھی نہیں تھی۔ اس لیے کہ میں اور قیدیوں سے الگ رکھا گیا تھا۔

چھ ہفتے کے بعد برسات شروع ہو گئی۔ اب ہوا کچھ اور ہی ہو گئی اور اس میں نئی زندگی کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ حرارت کے کم ہونے سے جسم کو تو آرام ملا مگر آنکھوں کو اور دل کو چین نہ آیا۔ کبھی کبھی میرے احاطے کا پھاٹک کسی پہرے والے کے آنے جانے کے لیے کھلتا اور مجھے دم بھر کو باہر کی دنیا کی ایک جھلک نظر آ جاتی۔ ہرے بھرے کھیتوں اور درختوں کے شوخ رنگ اور ان پر موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے شبنم کے قطرے مگر یہ صرف چند لمحے کا نظارہ ہوتا جو بجلی کی طرح کوند کر چھپ جاتا۔ پورا دروازہ شاید ہی کبھی کھلتا ہو۔ غالباً پہرے والوں کو حکم تھا کہ اگر میں کہیں آس پاس موجود ہوں تو دروازہ ہرگز نہ کھلنے پائے اور جب کھلے بھی تو بس تھوڑا ہی سا۔ سبزی اور شادابی کی یہ جھلک دیکھ کر مجھے تسکین نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک درد سا دل میں اٹھتا تھا یہاں تک کہ بعض اوقات دروازہ کھلتا تو ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی۔

اصل میں یہ ساری اداسی جیل کی وجہ سے نہیں تھی، اگرچہ اس کا بھی اس میں کچھ حصہ تھا۔ یہ باہر کے واقعات، کملا کی بیماری اور میری سیاسی پریشانیوں کا ردعمل تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ کملا کو پھر پرانی بیماری نے آلیا ہے۔ اور میں اپنی بےبسی پر

کڑھتا تھا کہ اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اسے بہت تقویت پہنچتی۔

بہ خلاف علی پور کے، دہرہ دون جیل میں مجھے ایک روزانہ اخبار کو پڑھنے کو ملتا تھا۔ باہر کے سیاسی واقعات اور دوسرے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ تقریباً تین سال کے بعد (اس مدت کے بہت بڑے حصے میں وہ خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی) پٹنے میں ہوا تو اس کی کارروائی بہت مایوس کرنے والی تھی۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ ہندوستان میں اور ساری دنیا میں اتنا کچھ ہو چکنے کے بعد اس پہلے جلسے میں صورت حال کا جائزہ لینے اور واقعات پر مفصل بحث کر کے پرانی لیکھ سے ہٹنے کی کوشش کوئی نہیں کی گئی۔ گاندھی جی دور سے دیکھنے میں اپنی قدیم تحکمانہ شان میں نظر آ رہے تھے۔ ان کا قول تھا کہ "اگر تم میرے پیچھے چلنا چاہتے ہو تو تمہیں میری شرطیں ماننی پڑیں گی۔" یہ مطالبہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھا اس لیے کہ اگر انہیں ساتھ لینا تھا تو ان سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی دلی عقیدوں کے خلاف عمل کریں، مگر معلوم ہوتا تھا کہ حکم منوانے پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے اور آپس کے مشورے سے ایک پالیسی تجویز کرنے پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ یہ عجب بات ہے کہ گاندھی جی دلوں پر اپنی مرضی کا سکہ بٹھا دیتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ لوگ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں بہت کم شخصوں کو جمہور کی عقیدت اور اطاعت اس حد تک نصیب ہوئی تھی جتنی انہیں حاصل ہے۔ اور لوگوں کو اس وجہ سے قصور وار ٹھہرانا کہ وہ ان کے اونچے معیار تک نہیں پہنچ سکتے، بے انصافی ہے۔

پٹنے کے جلسے میں گاندھی جی آخر تک ٹھہرے بھی نہیں اس لیے کہ انہیں اپنا ہریجنوں کی اصلاح کا دورہ جاری رکھنا تھا۔ انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو رائے دی کہ مستعدی سے کام کرے اور ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولیوشن بھیجے ہیں انہیں جلدی سے نمٹا دے کر یہ کہہ کر وہ چل دیئے۔

مگر غالباً زیادہ طول طویل بحث سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ کمیٹی کے ممبروں کے خیالات الجھے ہوئے تھے اور وہ معاملات کو وضاحت سے نہیں سوچ سکتے تھے۔ اعتراض کرنے کو تو بہت سے لوگ تیار تھے مگر تعمیری تجویز ایک بھی پیش نہیں ہوئی۔ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ قدرتی بات تھی اس لیے کہ تحریک نافرمانی کا سارا بوجھ انھیں لوگوں پر جو مختلف صوبوں کے لیڈر تھے پڑا تھا اور ان کے جسم اور دماغ بھٹکے ہوئے تھے۔ اس بات کا ایک دھندلا سا احساس سب کو تھا کہ سول نافرمانی کو روک دینا چاہیے۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس کے بعد کیا کیا جائے؟ لوگوں کے دو فریق ہو گئے تھے ایک تو یہ چاہتا تھا کہ کونسلوں کے ذریعے سے خالص آئینی جدوجہد کی جائے اور دوسرا کچھ دھندلے سے اشتراکی خیالات رکھتا تھا۔ ممبروں کی بہت بڑی تعداد دونوں فریقوں میں سے کسی میں شریک نہیں تھی۔ وہ آئینی طریقوں کی طرف لوٹنا پسند نہیں کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ اشتراکیت سے بھی ڈرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ ان میں پھوٹ پیدا کر دے گی۔ یہ لوگ کوئی تعمیری خیالات نہیں رکھتے تھے اور انہیں جو کچھ امید تھی اور جو کچھ سہارا تھا وہ گاندھی جی کی ذات سے تھا۔ پہلے کی طرح وہ ان کی طرف مڑ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ حالانکہ وہ ان کی رائے سے پوری طرح متفق نہیں تھے گاندھی جی کی مدد سے اعتدال پسند اور آئین پسند حضرات کو کمیٹی میں اور کانگرس میں غلبہ حاصل ہو گیا۔

ان سب باتوں کی پہلے ہی سے توقع تھی کہ ان کے ردعمل سے کانگرس اس قدر پیچھے ہٹ گئی جس کا مجھے خیال بھی نہیں تھا۔ پچھلے پندرہ سال میں یعنی ترک موالات کی تحریک کے بعد سے کانگریس کے لیڈروں نے اس قدر آئین پسندی کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ پرانی سوراج پارٹی بھی جو خود ردعمل کا نتیجہ تھی، ان نئے لیڈروں سے بہت آگے تھی اور پھر ان میں ایسی زبردست شخصیتیں بھی نہیں تھیں جیسی سوراج پارٹی میں تھیں۔ بہت سے لوگ جو کانگریس کی تحریک سے جب تک اس

میں شریک ہونا خطرناک تھا۔ دور دور ہی رہتے تھے اب آموجود ہوئے اور انہیں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔

گورنمنٹ نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دینے کا حکم منسوخ کر دیا اور وہ ایک جائز انجمن بن گئی۔ مگر اس کی بہت سی ملحقہ اور ماتحت جماعتیں مثلاً سیوا دل، کسان سبھائیں اور تعلیمی ادارے اور نوجوان سبھائیں جن میں بچوں کی ایک انجمن بھی شامل تھی۔ بدستور خلاف قانون تھیں۔ خصوصاً خدائی خدمتگار جو سرحد کے سرخ پوش کہلاتے تھے، اب تک قانون کے باغی سمجھے جاتے تھے۔ یہ انجمن ۱۹۳۱ء میں باقاعدہ کانگریس میں شامل کی جا چکی تھی، اور صوبہ سرحد کی کانگریس کی شاخ قرار دی گئی تھی۔ یعنی باوجود اس کے کہ کانگریس نے عملی احتجاج بالکل ترک کر دیا اور آئینی طریقوں کی طرف لوٹ آئی، حکومت نے وہ تمام خاص قانون جو سول نافرمانی کو روکنے کے لیے بنے تھے اسی طرح قائم رکھے بلکہ کانگریس کی اہم ماتحت جماعتوں کو خلاف قانون رہنے دیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی انجمنوں کو دبانے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ بڑے بڑے حکام نے زمینداروں کے پاس جا کر تاکید کی کہ تم اپنی تنظیم کرو۔ زمینداروں کی انجمنوں کے لیے تمام سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ چنانچہ صوبہ متحدہ کی دو بڑی انجمنوں کا چندہ سرکاری طور پر مال گزاری کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے۔

یوں تو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ انجمنوں کو ہمیشہ سے ناپسند کرتا ہوں مگر ایک واقعے کی وجہ سے خاص طور پر مجھے ہندو مہا سبھا سے سخت رنج پہنچا۔ اس کے ایک سیکرٹری نے یہ غضب کیا کہ بغیر کسی تعلق کے اس حکم کی تائید کر ڈالی جو سرحد کی سرخ پوش جماعت کو خلاف قانون قرار دینے کے لیے جاری کیا گیا تھا اور حکومت کو اس فعل پر شاباش دی۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ لوگوں سے ان سے معمولی مدنی حقوق چھیننے کی حمایت کی جا رہی ہے اور وہ بھی اس وقت جب کوئی جارحانہ

تحریک موجود نہیں ہے۔اصول کے سوال کو چھوڑ کر دیکھا جائے تب بھی ہر شخص جانتا تھا کہ ان سرحد والوں نے تین سال کی کش مکش میں کمال کر دکھایا اور ان کا لیڈر خان عبدالغفار خاں جس کا سا بہادر اور کھرا آدمی ہندوستان میں مشکل سے نکلے گا، اب تک جیل میں ہے جہاں وہ بغیر عدالتی تحقیقات کے شاہی قیدی کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔میرے نزدیک فرقہ وارانہ تعصب کی اس سے بدتر مثال نہیں ہو سکتی اور مجھے توقع تھی کہ ہندو مہا سبھا کے بڑے بڑے لیڈر فوراً اپنے رفیق کار کی اس رائے سے بے تعلق ہونے کا اعلان کریں گے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہوا ان میں سے کسی نے اس معاملے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ہندو مہا سبھا کے سیکرٹری کے اس بیان سے مجھے سخت پریشانی تھی۔یہ بجائے خود بہت بری چیز تھی مگر میرے لیے اس وجہ سے اور زیادہ تکلیف دہ تھی کہ میں اسے ملک کی موجودہ حالت کا ایک نمونہ سمجھتا تھا۔اس دن سہ پہر کو گرمی سے نڈھال ہو کر سو گیا تو ایک عجیب خواب نظر آیا۔میں نے دیکھا کہ خان عبدالغفار خاں پر لوگ ہر طرف سے حملہ کر رہے ہیں اور میں ان کو بچانے کے لیے لڑ رہا ہوں۔آنکھ کھلی تو طبیعت بہت پست اور اداس تھی اور سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔اس پر مجھے تعجب ہوا اس لیے کہ جاگتے میں کبھی میرے جذبات کا جوش اس طرح ظاہر نہیں ہوا کرتا۔

بات یہ ہے کہ ان دنوں میرے اعصاب بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔سوتے میں بے چینی رہتی تھی، جو میرے لیے غیر معمولی چیز تھی اور طرح طرح کے بھیانک خواب نظر آتے تھے۔بعض وقت میں نیند میں چیخ اٹھتا تھا۔ایک بار شاید بہت زور سے چیخ نکل گئی۔اس لیے کہ جب میں چونکا تو دیکھا کہ دو پہرے والے میرے شور وغل سے پریشان میرے پاس کھڑے ہیں۔میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔

اسی زمانے میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک ریزولیوشن سے بھی مجھے تکلیف ہوئی۔ اس ریزولیوشن کے پاس کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ "ذاتی املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ کی ضرورت کے متعلق بہت سی غلط باتیں مشہور کی جارہی ہیں" اور اس میں کانگریس والوں کو یہ یاد دلایا گیا تھا کہ کراچی کے ریزولیوشن میں "نہ تو بغیر معقول وجہ اور مناسب معاوضے کے ذاتی املاک کی ضبطی کی تجویز ہے اور نہ طبقوں کی جنگ کی حمایت۔ ورکنگ کمیٹی کی رائے میں املاک کی ضبطی اور طبقوں کی جنگ، کانگریس کے عقیدہ عدم تشدد کی منافی ہے"۔ اس ریزولیوشن کے الفاظ مبہم تھے اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ترتیب دینے والے طبقوں کی جنگ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی زد صریحی طور پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی پر تھی، جو نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ سچ پوچھئے تو اس جماعت کے کسی ذمہ دار رکن نے ضبطی کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ ہاں یہ بہت سے لوگوں نے کہا تھا کہ طبقوں کی جنگ اس وقت بھی موجود ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن میں یہ اشارہ پایا جاتا تھا کہ کوئی شخص جو طبقوں کی نزاع کا قائل ہو، کانگریس کا معمولی ممبر بھی نہیں ہو سکتا۔ کانگریس پر کبھی یہ الزام نہیں لگایا گیا تھا کہ اس نے اشتراکیت اختیار کرلی ہے یا وہ ذاتی املاک کے خلاف ہے البتہ اس کے بعض ممبر یہ خیالات رکھتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو اس ہمہ گیر قومی انجمن کے معمولی ممبروں کی صف میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔

یہ بات کئی کہی جاچکی تھی کہ کانگریس راجا سے لے کر پرجا تک قوم کے ہر طبقے اور ہر جماعت کی نمائندگی کرتی ہے۔ قومی تحریکیں اکثر یہ دعویٰ کرتی ہیں جس کے معنی غالباً یہ ہوتے ہیں کہ وہ بڑی اکثریت کی نمائندہ ہیں اور ان کی پالیسی سب کے فائدے کے لیے ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں اس لیے کہ کوئی سیاسی انجمن متضاد اغراض رکھنے والے طبقوں کی نمائندہ نہیں ہوسکتی اور اگر ہونا چاہے گی۔ تو وہ ایک بے شکل، بے رنگ اور بے معنی جماعت بن کر رہ جائے گی۔ کانگریس یا تو

ایک سیاسی پارٹی ہے جو سیاسی قوت حاصل کرنے اور اسے قوم کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کا ایک واضح (یا دھندلا) مقصد اور اصول رکھتی ہے یا محض ایک راہ عام کی انجمن ہے جو اپنے کوئی خاص خیالات نہیں رکھتی بلکہ ہر شخص کا بھلا چاہتی ہے۔ اگر وہ سیاسی پارٹی ہے تو وہ صرف انہیں لوگوں کی نمائندہ کہلائے گی جو مجموعی طور پر اس کے مقصد اور اصول سے اتفاق رکھتے ہیں۔ جو اس مقصد کے مخالف ہیں وہ اس کے نزدیک قوم کے بدخواہ سماج کے مخالف اور رجعت پسند قرار پائیں گے اور ان کے اثر کو روکنا یا توڑنا اس کے اصول کی کامیابی کے لیے ضروری سمجھا جائے گا۔

کانگریس کی تحریک شہنشاہی کے خلاف اٹھی ہے اور اسے سماج کی باہمی نزاع سے تعلق نہیں ہے اس لیے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں بہت سے لوگوں کے اتفاق رائے کی گنجائش ہے۔ اسی لیے اسے ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت کی نمائندگی کم و بیش حد تک حاصل ہوگئی ہے اور اس میں مختلف خیالات کی جماعتیں شریک ہوگئیں جو صرف ایک چیز میں یعنی شہنشاہی کی مخالفت میں متحد تھیں اور ان کی اس مخالفت میں بھی درجوں کا فرق تھا۔ وہ لوگ جو شہنشاہی کی مخالفت کے بنیادی مسئلے میں کانگریس کے ہم رائے نہیں تھے اس سے الگ ہوگئے اور کم و بیش برطانوی حکومت کا ساتھ دینے لگے۔ غرض کانگریس کئی جماعتوں کی متحدہ انجمن بن گئی۔ جن میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا مگر سب کی سب ایک مشترک مقصد اور گاندھی جی کی باقتدار شخصیت کے رشتے میں مربوط تھیں۔

بعد میں ورکنگ کمیٹی نے طبقوں کی جنگ کے متعلق اپنے رزولیوشن کی تاویل کی کوشش کی۔ اس رزولیوشن کے الفاظ کی یا اس اصول کی جو اس میں بیان کیا گیا تھا اس قدر اہمیت نہیں تھی جتنی اس بات کی کہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریس کی پالیسی کس رخ جا رہی ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات تھی کہ یہ رزولیوشن کانگریس کی نئی

کونسل پارٹی کے اثر سے پاس ہوا ہے جو اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں سرمایہ داروں کی مدد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ان کے کہنے سے کانگریس رفتہ رفتہ رجعت پسندی کی طرف سرکتی جاتی تھی اور ملک کے اعتدال پسندوں اور قدامت پسندوں کو پرچانے کی فکر کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ جو لوگ پہلے کانگریس کے دشمن تھے اور نافرمانی کے زمانے میں حکومت کا ساتھ دے چکے تھے ان سے بھی میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی تھیں۔ شور مچانے والے اور نکتہ چینی کرنے والے انتہا پسندوں کی پارٹی اس تالیف قلوب میں سدراہ سمجھی جاتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن اور کئی حضرات کے شخصی بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ کانگریس کے ارباب اختیار انتہا پسندوں کے اعتراضات کی وجہ سے اپنی راہ سے ہٹنے والے نہیں اور اگر یہ شرارت سے باز نہ آئے تو سزا پائیں گے اور کانگریس سے نکال دیئے جائیں گے۔

کانگریس کے لیڈروں میں گاندھی جی کے علاوہ اور بھی بہت سے مشہور بزرگ تھے جنہوں نے قومی آزادی کی جنگ میں بڑے بڑے کارنامے دکھائے تھے اور اپنی دیانت داری اور بہادری کی وجہ سے سارے ملک میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، مگر نئی پالیسی کی وجہ سے کانگریس کی دوسری بلکہ پہلی صف میں بعض ایسے لوگ پہنچ گئے جو کسی طرح اصول پرست نہیں کہے جاسکتے۔ یوں تو کانگریس کے حلقوں میں اب بھی اصول پرستوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی مگر اب مطلب پرستوں کے لیے اس میں داخل ہونا اتنا سہل ہو گیا جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ گاندھی جی کی پراسرار شخصیت کے علاوہ جو سب پر چھائی ہوئی تھی کانگریس کے دو رخ نظر آتے تھے ایک تو خالص سیاسی رخ جس نے ایک خفیہ شوریٰ کی شکل اختیار کر لی تھی (یعنی چند آدمی مل کر ہر معاملے کا فیصلہ کر لیتے تھے اور اسے کانگریس سے منوا لیتے تھے) اور دوسرا مذہبی رخ جس میں ایک پرارتھنا منڈلی کی شان تھی اور زہد و تقویٰ اور رقت قلب کو جوش تھا۔

حکومت کے یہاں فتح کے شادیانے بج رہے تھے کیونکہ اس کے خیال میں نافرمانی کی تحریک اوراس کی شاخوں کو کچلنے کی پالیسی پوری طرح کامیاب ہوگئی تھی۔ آپریشن بہ خیروخوبی ہوگیا تھا۔مریض مرتا ہے یا جیتا ہے اس سے فی الحال بحث نہیں تھی۔اگرچہ کانگریس اس وقت تک کسی حد تک ہموار ہوگئی تھی مگر حکومت نے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اپنی وہی پالیسی جاری رکھی۔اسے معلوم تھا کہ جب تک اصل مسئلہ طے نہ ہو قومی پالیسی میں اس طرح کے تغیرات محض عارضی ہیں اور اگر ذرا ڈھیل دی گئی تو یہ آگ پھر بھڑک اٹھے گی۔شاید اس کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کانگریس کے یا کسانوں اورمزدروں کی جماعت کے انتہاپسندوں پر سختی کرنے سے ان کانگریسی لیڈروں کو کچھ زیادہ شکایت نہیں ہوگی جو احتیاط کی راہ پر چل رہے ہیں۔

میرے خیالات دہرہ دون جیل میں کچھ اس قسم کے تھے۔سچی بات یہ ہے کہ میں دور ہونے کی وجہ سے واقعات کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔علی پور میں تو مجھے کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔دہرہ دون میں حکومت کا تجویز کیا ہوا اخبار دیکھنے کو ملتا تھیں۔اگر مجھے اپنے ان ساتھیوں سے جو جیل کے ماہر تھے ملنے کا اور واقعات کو غور سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوتا تو شاید میری رائے تھوڑی بہت بدل جاتی۔

حال کے تصور سے مجھے تکلیف ہوتی تھی اس لیے میں ماضی کا تصور کرنے لگا اور یہ سوچنے لگا کہ جب سے میں نے قومی معاملات میں حصہ لینا شروع کیا ہندوستان میں سیاسی واقعات کی رفتار کیا رہی ہے اور ہم نے جو کچھ اب تک کیا اس میں کون سی بات بجا تھی اور کونسی بے جا تھی؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں اسے لکھ ڈالوں تو میرے خیالات زیادہ باترتیب اور مفید ہوں گے۔اور ایک معین کام میں لگ جانے سے مجھے اس پریشانی اور اداسی سے بھی نجات مل

جائے گی۔ چنانچہ جون ۳۴ء میں، میں نے دہرہ جیل کے اندر آپ بیتی لکھنی شروع کی اور پچھلے آٹھ مہینے برابر یہ کرتا رہا کہ جب کبھی لہر آگئی بیٹھ کر سے لکھ ڈالا۔ بیچ میں کئی ایسے وقفے آئے کہ لکھنے کو جی نہیں چاہا۔ ان میں سے تین وقفے تین تین مہینے کے تھے مگر کسی نہ کسی طرح یہ کام چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اب خاتمے پر آپہنچا ہے اور اس کا بڑا حصہ میں نے غیر معمولی پریشانی کے زمانے میں لکھا ہے جب میرے دل پر رنج اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ شاید اس کی جھلک اس کتاب میں بھی آتئ ہے مگر اس کے لکھنے ہی سے مجھے ان پریشانیوں سے نجات ملی۔ لکھتے وقت میں نے پڑھنے والوں کو پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ میرا خطاب اپنے دل سے تھا۔ میں آپ ہی سوال کرتا تھا اور آپ ہی جواب دیتا تھا جس میں بعض اوقات ہنسی بھی آجاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو جذبات سے الگ ہو کر بے لاگ طریقے سے غور کروں اور میں سمجھتا تھا کہ ماضی کے اس جائزے سے مجھے اس میں مدد ملے گی۔

جولائی کے آخر میں کملا کی طبیعت بگڑنے لگی اور چند روز میں حالت نازک ہو گئی ۱۱ اگست کو یکایک مجھے دہرہ دون جیل سے رخصت ہونے کا حکم دیا گیا اور اسی روز رات کو میں پولیس کی حراست میں الہ آباد روانہ کر دیا گیا۔ دوسرے دن تک شام کو ہم الہ آباد کے پریاگ اسٹیشن پر پہنچے اور وہاں مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ اطلاع دی کہ تم اپنی بیوی کی عیادت کے لیے عارضی طور پر رہا کیے جاتے ہو۔ اس دن میری گرفتاری کو پورے چھ مہینے ہو گئے تھے۔

گیارہ دن

تلوار اپنے نیاک کو گھس ڈالتی ہے
اور روح جسم کو ریت کر رکھ دیتی ہے
(بائرن)

میری رہائی عارضی تھی۔ مجھے یہ کہا گیا تھا کہ مجھے دو ایک روز کے لیے یا اتنی مدت کے جتنی ڈاکٹر اشد ضروری سمجھیں آزادی دی جاتی ہے۔ اس بے اطمینانی کی حالت میں جم کر کوئی کام کرنا ناممکن تھا۔ اگر میعاد مقرر ہوتی تو مجھے ایک اندازہ ہو جاتا اور میں اس کے لحاظ سے اپنے اوقات کا تعین کرتا۔ اب تو ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ نہ جانے کب دوبارہ جیل میں بھیج دیا جاؤں۔

یہ تبدیلی یکا یک ہوئی اور میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دم بھر میں قید تنہائی سے نکل کر بھرے گھر میں پہنچ گیا جہاں ڈاکٹروں، نرسوں اور عزیزوں کا مجمع تھا۔ میری لڑکی اندرا بھی شانتی نکیتن سے آگئی تھی۔ دوست احباب کملا کی عیادت کے لیے برابر چلے آرہے تھے رہنے سہنے کا ڈھنگ بالکل بدل گیا تھا۔ گھر کی آسائش میسر تھی، اچھا کھانا مل رہا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا۔ مگر کملا کی علالت کی فکر سب پر غالب تھی۔

وہ نحیف و زار بستر پر پڑی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ کملا نہیں کملا کی پرچھائیں ہے۔ اس میں مرض سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی اور اس کی جدائی کا خیال میرے لیے سوہان روح بنا گیا تھا۔ ہماری شادی کو ساڑھے اٹھارہ برس گزر چکے تھے۔ وہ دن اور اس کے بعد کا زمانہ میری آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ شادی کے وقت میں چھتیس برس کا تھا اور وہ کوئی سترہ برس کی دبلی پتلی بھولی بھالی لڑکی۔ ہم دونوں کی عمر میں بہت فرق تھا مگر اس سے بھی زیادہ فرق ہمارے خیالات میں تھا اس لیے کہ میں اس سے زیادہ پختہ کار تھا۔ مگر اس عقل دنیاوی کے دکھاوے کے باوجود مجھ میں

بہت لڑکپن تھا اور مجھے یہ احساس نہ تھا کہ اس نازک حساس لڑکی کے نفس کی کلی کھل کر پھول بن رہی ہے اور اس کی پرداخت بڑی نرمی اور احتیاط سے ہونی چاہیے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی اس لیے آپس میں اچھی طرح نبھ رہی تھی مگر ہماری خیالات کی بنیادی الگ الگ تھیں اور ان میں میل نہ تھا۔ اس اختلاف کی وجہ سے ان بن رہتی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو جایا کرتے تھے۔ مگر یہ بچپن کے قصے زیادہ طول نہیں کھینچتے تھے اور ہم لڑ بھڑ کر پھر ایک ہو جاتے تھے۔ پھر بھی ہماری محبت بڑھتی گئی اگرچہ خیالات کا اختلاف بہت آہستہ آہستہ کم ہوا۔ ہماری شادی کے ۲۱ مہینے بعد ہماری اکلوتی لڑکی اندرا پیدا ہوئی۔

جن دنوں ہمارا شادی ہوئی قریب قریب اس زمانے میں ہندوستان کی سیاست نیا رنگ بدل رہی تھی اور میرا انہماک اس میں بڑھتا جاتا تھا۔ یہ ہوم رول کا دور تھا اور تھوڑے دن بعد ہی پنجاب میں مارشل لای اور اسی کے ساتھ ترک موالات شروع ہو گیا اور میں روز بروز قومی کاموں کے چکر میں پڑتا گیا۔ مجھے ان چیزوں سے اتنا شغف ہو گیا کہ بالکل غیر شعوری طور پر میں اس کی طرف سے قریب قریب غافل ہو گیا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ یہی زمانہ تھا جب اسے میری مدد کی بہت ضرورت تھی۔ اس سے مجھے جو محبت تھی وہ قائم رہی بلکہ اور بڑھ گئی اور مجھے بڑا اطمینان رہتا تھا کہ وہ میری تسلی کے لیے موجود ہے۔ مجھے تو اس سے تقویت پہنچتی تھی مگر اسے میری بے پروائی سے ضرور صدمہ پہنچتا ہوگا۔ وہ اس طبیعت کی تھی کہ اگر میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا تو شاید اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس غفلت اور کم التفاتی سے ہوئی ہوگی۔

اس کے بعد اس پر رہ رہ کر بیماری کے حملے ہونے لگے اور میں برسوں جیل میں رہنے لگا۔ اس عرصے میں ہم دونوں کا ملنا بس کبھی کبھی جیل کے دروازے پر ہو جایا کرتا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں وہ ہماری فوج کی صف اول میں

پہنچ گئی اور جب اسے قید کی سزا ملی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے۔ ہم ملاقات کی مختصر گھڑیوں کو جو مدتوں کے بعد نصیب ہوتی تھیں ایک بیش بہا دولت سمجھتے تھے اور فرقت کے دن گن گن کر کاٹتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی صحبت سے کبھی سیر نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ ہماری مختصر ملاقاتوں میں ہمیشہ ایک جدت اور تازگی ہوتی تھی۔ ہم پر ایک دوسرے کی سیرت کے نئے نئے پہلوؤں کا انکشاف ہوتا تھا اگرچہ بعض اوقات ہمیں یہ نئے پہلو پسند نہیں آتے تھے۔ ہماری ان جوانی کی نا اتفاقیوں میں بچپن کے جھگڑوں کا رنگ تھا۔

اٹھارہ برس کی ازدواجی زندگی کے بعد بھی اس کی صورت میں وہی لڑکپن اور کنوارپن کی کیفیت تھی۔ وہ روڑھاپن جو بیاہی عورتوں میں ہوتا ہے نام کو بھی نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک دلہن ہے جو ابھی بیاہ کر آئی ہے۔ مگر میں بہت بدل گیا تھا اور گو اپنی عمر کے اعتبار سے خاصا چاق و چوبند تھا اور لوگ کہتے تھے کہ مجھ میں اب تک لڑکپن کی بعض خصوصیتیں موجود ہیں مگر میرا چہرہ میری عمر کا راز فاشا کر دیتا تھا۔ میرے سر کے بال کچھ اڑ گئے تھے۔ اور جو بچ رہے تھے وہ سفید ہو گئے تھے۔ میرے چہرے پر جھریاں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ پچھلے چار برس کی مصیبتیں اور پریشانیاں اپنے نقش میرے چہرے پر چھوڑ گئی تھیں۔ ان دنوں اکثر ایسا ہوا کہ کملا اور میں کسی مقام پر گئے تو لوگوں نے اسے میری لڑکی سمجھا اور مجھے بڑی خفت اٹھانی پڑی۔ وہ اور اندرا بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔

ازدواجی زندگی کے اٹھارہ برس کہنے کو تو یہ اٹھارہ برس تھے مگر ان میں سے نہ جانے کتنے میں نے جیل خانہ میں اور کملا نے اسپتالوں اور صحت گاہوں میں گزارے تھے اور اب پھر میں جیل میں سزا کاٹ رہا تھا اور صرف چند روز کے لیے چھوٹ کر آیا تھا اور وہ بیماری کے پنجے میں تڑپ رہی تھی۔ میں کسی قدر خفا تھا کہ وہ اپنی صحت کی پرواہ نہیں کرتی۔ مگر میں اسے کس طرح الزام دے سکتا تھا اس کی من

چلی طبیعت اس پر کڑھتی تھی کہ وہ بیماری سے بے بس ہے اور قومی جنگ میں پوری طرح شریک نہیں ہو سکتی۔ وہ عجیب دغدغے میں رہتی تھی، نہ تو کام کی طرف پوری توجہ کر سکتی تھی اور نہ علاج کی طرف۔

میں اپنے دل میں کہتا تھا کیا سچ مچ وہ ایسے وقت میں جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے مجھ سے منہ موڑ کر چلی جائے گی؟ ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننا اور سمجھنا شروع کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اب ہماری ازدواجی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کا بڑا سہارا ہے اور بہت سے کام ساتھ ساتھ کرنے ہیں۔

یہ خیالات دل میں لیے ہوئے میں ہر روز ہر وقت اس کی حالت کو دیکھا کرتا تھا۔ میرے رفیق اور دوست مجھ سے ملنے کو آتے تھے۔ وہ مجھے بہت سے واقعات سنایا کرتے تھے جن کی مجھے خبر نہیں تھی۔ وہ موجودہ سیاسی مسائل پر بحث کرتے تھے اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں کیا جواب دوں۔ میرے لیے اپنے خیال کو کملا کی بیماری سے ہٹانا آسان نہیں تھا اور جیل میں اتنے عرصے تک واقعات سے الگ اور دور رہنے کے بعد یکایک ایسے مسائل کو حل نہیں کر سکتا تھا۔ جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مدت کے تجربے سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جیل میں جو محدود اطلاعات ملتی ہیں ان کی بنا پر صورت حال کا صحیح اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ صحیح رائے قائم کرنے کے لیے لوگوں سے ملنا ضروری تھا۔ اگر بغیر اس کے کوئی رائے ظاہر کی جاتی تو وہ اصلیت سے دور ہوتی۔ یہ گاندھی جی اور پرانے کانگریسی رفیقوں کی کے ساتھ بے انصافی ہوتی اگر میں ان سے ملنے اور بحث کرنے سے پہلے کانگریس کی پالیسی کے متعلق کوئی قطعی بات کہہ دیتا۔ مجھے بہت سی کارروائیوں پر سخت اعتراض تھا مگر میرے ذہن میں کوئی عملی تجاویز نہیں تھیں مجھے اس وقت جیل سے چھوٹنے کی مطلق توقع نہیں تھی اس لیے

میں نے ان چیزوں پر اس پہلو سے غور بھی نہیں کیا تھا۔

پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ جب حکومت نے اتنی عنایت کی کہ مجھے اپنی بیوی کے پاس پہنچنے کی اجازت دے دی تو یہ بڑی نا مناسب بات ہے کہ میں اس سے فائدہ اٹھا کر سیاسی کام کروں۔ میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اس قسم کے کام نہیں کروں گا پھر بھی یہ خیال مجھے روکتا تھا۔

میں عام بیانات شائع کرنے سے بھی احتراز کرتا رہا البتہ بعض غلط افواہوں کی تردید ضرور کی۔ نج کی گفتگو میں بھی صاف صاف کسی پالیسی کی تائید نہیں کرتا تھا البتہ پچھلے واقعات پر دل کھول کر تنقید کیا کرتا تھا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی ابھی حال ہی میں قائم ہوئی تھی اور میرے بہت سے گہرے رفیق اس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس معلومات کی بنا پر جو مجھے اس کے متعلق حاصل ہوسکیں مجھے اس کی عام پالیسی سے اتفاق تھا مگر یہ ایک عجیب قسم کی بے میل جماعت تھی اور اگر میں بالکل آزاد ہوتا تب بھی اس میں شریک ہونے میں تامل سے کام لیتا۔ مقامی سیاسی معاملات میں مجھے کچھ وقت صرف کرنا پڑا اس لیے کہ اور مقامات کی طرح یہاں بھی لوکل کانگریس کمیٹی کے انتخابات میں سخت کشمکش پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا صرف ذاتیات کا معاملہ تھا۔ مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں ان جھگڑوں کو چکانے میں مدد دوں۔

میں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اور نہ مجھے اتنی فرصت تھی۔ اس کے باوجود مجھے بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے سخت صدمہ ہوا۔ تعجب کی بات تھی کہ کانگریس کے مقامی انتخابات کے معاملے میں لوگوں میں اس قدر جوش کیونکر پیدا ہوگیا۔ ان میں سب سے پیش پیش وہ حضرات تھے جو لڑائی کے زمانے میں مختلف قسم کے ذاتی عذروں کی وجہ سے الگ ہوگئے تھے۔ سول نافرمانی کے ختم ہوتے ہی یہ عذر رفع ہوگئے اور یہ حضرات پردے سے باہر نکل کر آپس میں بازاری لوگوں کی طرح

لڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ حریفوں کو نیچا دکھانے کے جوش نے انہیں اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ معمولی تہذیب کی حد سے بھی گزر گئے تھے۔ مجھے اس بات سے اور بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ کملا کے نام بلکہ اس کی بیماری سے بھی ان انتخابات میں ناجائز فائدہ اٹھایا گیا۔

جن وسیع تر مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ان میں اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں کانگریس کی شرکت کا مسئلہ بھی تھا۔ بہت سے نوجوان اس فیصلہ کے مخالف تھے کیونکہ وہ اس کے معنی یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کونسل کے کام اور مصالحت کے چکر میں پڑ جائے گی مگر وہ کوئی اور معقول تجویز پیش کرنے سے قاصر تھے۔ تعجب ہے کہ ان حضرات میں سے جو اعلیٰ اصولوں کی بنا پر کونسل کی شرکت کے مخالف تھے بعض کو انتخاب میں دوسری انجمنوں کے حصہ لینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کا منشا یہی معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ پرور جماعتوں کے لیے میدان خالی چھوڑ دیا جائے۔

مجھے ان نامعقول جھگڑوں سے اور ناپاک سیاست سے جو الہ آباد میں پیدا ہو رہی تھی کراہت آئی تھی۔ میں ان سے اور اپنے شہر سے بیزار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب وہ وقت آئے گا کہ میں ان معاملات کی طرف توجہ کروں تو میں اس فضا میں کیا کرسکوں گا۔

میں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا جس میں کملا کی حالت کا ذکر تھا۔ چونکہ میں سمجھتا تھا کہ بہت جلد جیل بھیج دیا جاؤں گا اور مجھے پھر خط لکھنے کا موقع نہیں ملے گا اس لیے میں نے انھیں ان خیالات اور جذبات سے بھی آگاہ کر دیا جو اس وقت میرے دل میں تھے۔ حال کے واقعات سے مجھے سخت مایوسی اور صدمہ ہوا تھا اور میرے خط میں کچھ تھوڑی سی جھلک اس کی بھی تھی۔ میں نے خود کوئی تجویز پیش نہیں کی کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے بلکہ صرف گزرتے ہوئے واقعات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی۔ یہ خط جذبات کے جوش سے بھرا ہوا تھا اور مجھے بعد میں معلوم ہوا

کہ گاندھی جی کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی۔

دن گزرتے جاتے تھے اور میں منتظر تھا کہ جیل خانے سے طلبی یا حکومت کے پاس سے کوئی اور اطلاع آئے۔ وقتاً فوقتاً مجھے یہ اطلاع ملتی رہتی تھی کہ مزید احکام، کل پرسوں تک جاری ہو جائیں گے۔ اس اثنا میں ڈاکٹروں کو یہ ہدایت تھی کہ میری بیوی کی صحت کی روزانہ رپورٹ حکومت کو بھیجتے رہیں۔ میرے آنے کے بعد کملا کو کچھ خفیف سا افاقہ ہوا تھا۔

یہ عام خیال تھا اور اس میں وہ حضرات بھی شریک تھے جو عموماً حکومت کے محرم راز رہا کرتے ہیں کہ میں بالکل چھوڑ دیا جاتا مگر دو باتوں کی وجہ سے نہیں چھوڑا گیا، ایک یہ کہ اکتوبر میں کانگریس کا پورا جلسہ بمبئی میں ہونے والا تھا دوسرے یہ کہ اسمبلی کے انتخابات نومبر میں شروع ہونے کو تھے۔ اگر میں جیل کے باہر ہوتا تو ان موقعوں پر شورش پیدا کرتا اس لیے اغلب یہ تھا کہ میں پھر تین مہینے کے لیے جیل بھیج دیا جاؤں گا اور اس کے بعد چھوڑ دیا جاؤں گا۔ مگر اس کا بھی امکان تھا کہ شاید واپس نہ بھیجا جاؤں گا اور جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے یہ امکان بظاہر بڑھتا جاتا تھا۔

مجھے جیل سے چھوٹے گیارھواں دن تھا یعنی اگست کی تیئسویں تاریخ تھی۔ دفعتہً پولیس کی موٹر کار آ کر رکی اور ایک پولیس افسر نے مجھ سے آ کر کہا کہ آپ کا وقت پورا ہو گیا اور آپ کو نینی واپس واپسی چلنا ہے۔ میں اپنے عزیزوں سے رخصت ہوا اور پولیس کی موٹر میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ بار ماں ہاتھ پھیلائے میرے پاس دوڑی آئیں ان کے چہرے کی وہ کیفیت میرے دل پر ایک عرصے تک نقش رہی۔

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

''سایہ یکساں پھیلا ہوا ہوتا ہے مگر دھوپ میں رنگ کا اتار
چڑھاؤ لازمی ہے۔اسی طرح رنج راحت سے بالکل الگ ہے مگر
راحت میں گونا گوں آلام کی خلش اور کسک پوشیدہ ہے''۔
(راج ترنگنی ترجمہ۔ س۔ پنڈت)

میں پھر نینی جیل میں واپس آ گیا اور اب معلوم ہوتا تھا کہ میری قید نئے سرے سے شروع ہوتی ہے۔میری حالت گیند کی سی ہو گئی تھی جسے اندر سے باہر، باہر سے اندر پھینکتے ہیں۔جذبات کے مسلسل اتار چڑھاؤ نے میرے نظام عصبی کو تہ و بالا کر دیا تھا اور ان پیہم تغیرات سے نبھانا سہل نہ تھا۔مجھے امید تھی کہ اپنی پرانی بارک میں رکھا جاؤں گا۔اتنے دن رہتے رہتے میں اس سے کسی قدر مانوس ہو گیا تھا۔اس میں میرے برادر نسبتی رنجیت پنڈت کے لگائے ہوئے پھول اب تک موجود تھے اور اس کا برآمدہ بھی کشادہ تھا۔مگر اب اس نمبر کی بارک میں ایک صاحب شاہی قیدی کی حیثیت سے رہتے تھے جو بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دیئے گئے تھے۔میرا ان کے ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔اس لیے مجھے جیل کے ایک اور حصے میں جگہ دی گئی جہاں ہوا گھٹی ہوئی تھی اور سبزے اور پھولوں کا نام تک نہ تھا۔

مگر مجھے تو دن اور راتیں کاٹنی تھیں وہاں نہ سہی یہاں۔میرا جسم قید میں تھا مگر میرا دل کہیں اور تھا۔مجھے اندیشہ تھا کہ کملا کو جو ذرا سا افاقہ ہوا ہے وہ میرے دوبارہ گرفتار ہو جانے کے صدمے سے قائم نہیں رہے گا اور یہی ہوا۔کچھ عرصے تک مجھے ڈاکٹروں کی رپورٹ روزانہ پہنچتی رہی اور وہ بھی بڑے پھیر سے۔ڈاکٹر پولیس کو ٹیلی فون کرتا تھا، پولیس جیل کے دفتر کو اطلاع دیتی تھی اور وہاں سے مجھے خبر ملتی تھی۔ڈاکٹروں کا جیل کے عملے سے براہ راست بات چیت کرنا خلاف مصلحت سمجھا جاتا تھا۔دو ہفتے تک مجھے یہ رپورٹیں، پابندی سے تو نہیں مگر خیر پہنچتی رہیں۔پھر ان کا

سلسلہ بند ہوگیا حالانکہ کملا کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔

پہلے بری خبریں سن کر اور پھر خبروں کے انتظار میں مجھے دن دوبھر اور راتیں پہاڑ ہوگئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وقت ساکن ہے چلت بھی ہے تو چیونٹی کی چال سے۔ ایک ایک گھڑی قیامت کی گھڑی تھی۔ مجھے یہ احساس اس شدت کے ساتھ پہلے کبھی نہیں رہوا تھا۔ مجھے یہ توقع تھی کہ میں کوئی دو مہینے میں یعنی بمبئی کانگرس کے اجلاس کے بعد رہا کر دیا جاؤں گا مگر یہ دو مہینے دو جگ کے برابر تھے۔

دوبارہ گرفتاری کے پورے ایک مہینے کے بعد میں ایک پولیس افسر کے ساتھ اپنی بیوی سے ملنے کے لیے بھیجا گیا۔ مجھ سے یہ کہا گیا کہ اب سے تمہیں ہفتے میں دو بار یہاں آنے کی اجازت ملا کرے گی بلکہ وقت بھی مقرر کر دیا گیا۔ چوتھے دن میں انتظار کرتا رہا۔ مگر کوئی لینے نہیں آیا۔ پانچواں، چھٹا، ساتواں دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ستم ظریفی تھی۔

خدا خدا کر کے ستمبر کا مہینہ گزرا۔ یہ تیس دن میری زندگی کے سب سے کٹھن دن تھے بیچ والوں کے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچائی گئی کہ اگر تم بے ضابطہ طور پر وعدہ کر لو کہ قید کی معیاد ختم ہونے تک سیاست سے الگ رہو گے تو تم کملا کی تیمارداری کے لیے رہا کر دیئے جاؤ گے۔

میں اس وقت سیاست کے خیال سے کوسوں دور تھا اور گیارہ دن تک باہر رہ کر میں نے جو سیاسی حالات دیکھے تھے ان کی وجہ سے میرا دل کھٹا ہو گیا تھا۔ مگر وعدہ کرنے کے یہ معنی تھے کہ میں اپنے قول سے، اپنے مقصد سے، اپنے رفیقوں سے، اپنے آپ سے پھر جاؤں! چاہے کچھ بھی ہو یہ شرط تو میں ہرگز منظور نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا وعدہ کرنا اپنی روح کو ہلاک کرنے، اپنے عقائد کا گلا گھوٹنے سے کم نہ تھا۔ سمجھانے والے سمجھاتے تھے کہ دیکھو کملا کی حالت بگڑتی جاتی ہے اگر تم اس کے پاس رہو تو شاید اس کی جان بچ جائے۔ کیا تمہیں اپنی آن کملا کی جان سے زیادہ

پیاری ہے؟ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ واقعی میرے لیے سخت مشکل تھی مگر خوش قسمتی سے یہ مشکل مجھے درپیش نہ تھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ خود کملا اسے ہرگز پسند نہیں کرے گی اور اگر میں نے اس قسم کا وعدہ کرلیا تو اسے صدمہ اور ضرر پہنچے گا۔

شروع اکتوبر میں مجھے اسے دیکھنے کی اجازت ملی وہ تیز بخار میں قریب قریب بے ہوش پڑی تھی۔ اسے یہ آرزو تھی کہ میں اس کے پاس رہوں مگر جب میں رخصت ہونے لگا تو وہ بڑی بہادری سے مسکرائی اور مجھے جھکنے کا اشارہ کیا۔ میں جھک گیا اور اس نے میرے کان میں کہا ''یہ کیا قصہ ہے؟ کیا تم سے کہا جاتا ہے کہ تم حکومت سے کوئی وعدہ کرلو؟ دیکھو یہ ہرگز نہ کرنا!''

میری گیارہ دن کی رہائی کے دوران یہ طے ہوگیا تھا کہ کملا کو ذرا افاقہ ہو تو وہ کسی بہتر مقام پر علاج کے لیے بھیج دی جائے۔ تب سے ہم برابر اس کی طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ تو اور گرتی جاتی تھی اور اب چھ ہفتے کے بعد صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی حالت پہلے سے بدتر ہے۔ اب زیادہ انتظار کرنا فضول تھا اور یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ وہ اسی حالت میں بھوالی بھیج دی جائے۔

اس کی روانگی سے ایک دن پہلے میں اسے رخصت کرنے کے لیے لے جایا گیا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ دیکھئے اب مجھے اس کی صورت دیکھنا کب نصیب ہوتا ہے اور ہوتا بھی ہے یا نہیں مگر وہ اس روز بہت بشاش تھی اور مجھے ایک عرصے کے بعد اپنے دل میں کسی قدر خوشی کی جھلک نظر آئی۔

تقریباً تین ہفتے بعد میں نینی جیل سے الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا تاکہ کملا سے قریب رہوں۔ بھوالی راستے میں پڑتا تھا اور میں اپنے پولیس کے نگرانوں کے ساتھ چند گھنٹے وہاں ٹھہرا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ کملا کی حالت کسی قدر بہتر تھی اور میں اطمینان سے الموڑے روانہ ہوا۔ سچ پوچھئے تو کملا سے ملنے سے پہلے پہاڑ کی ہوا نے میرے دل کو مسرت سے معمور کر دیا تھا۔

میں دوبارہ پہاڑ پر آنے سے بہت خوش تھا۔ ہماری موٹر سڑک کے پیچ وخم کے ساتھ چکر کھاتی چلی جارہی تھی صبح کی ٹھنڈی ہوا اور پہاڑ کے دلفریب مناظر سے دل کو ایک عجیب فرحت ہوتی تھی۔ ہم اونچے ہوتے چلے جاتے تھے۔ اور کھڈ کی گہرائی بڑھتی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئیں۔ درخت بالکل بدل گئے۔ ہر طرف پہاڑیاں دیودار اور صنوبر سے ڈھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کبھی کبھی سڑک کے موڑ سے نکل کر ایک نیا منظر سامنے آجاتا تھا، پہاڑیوں اور وادیوں کی ایک وسیع فضا اور نیچے کھڈ میں زور شور سے بہتا ہوا چھوٹا چشمہ، اس نظارے سے میرا جی کسی طرح نہیں بھرتا تھا۔ میں اسے ندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے سمیٹ کر حافظے کے خزانے میں بھر لوں تاکہ جب یہ نظروں سے چھپ جائے تو اس کی یاد سے دل بہلاؤں۔

پہاڑیوں کے پہلو میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے جھنڈ تھے اور ان کے آس پاس ذرا سے کھیت جو بڑی محنت سے زمینوں پر بنائے گئے تھے۔ دور سے یہ چوڑی چوڑی سیڑھیاں معلوم ہوتی تھیں جن کا سلسلہ بعض جگہ وادی کی سطح سے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچتا تھا۔ کس قدر شدید مشقت سے ان بستیوں کے رہنے والے فطرت سے ذرا سی غذا حاصل کرتے تھے! ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر وہ بس اتنا پیدا کر پاتے تھے کہ روکھی سوکھی روٹی میسر آجائے۔ ان جتے ہوئے کھیتوں سے اس کوہستان میں آبادی کی شان پیدا ہو گئی تھی اور کھری یا درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے مقابلے میں یہ عجب لطف دیتے تھے۔

دن کو یہ منظر بڑا خوشگوار تھا۔ جب سورج اونچا ہوا اور چڑھتی ہوئی دھوپ نے پہاڑوں میں حرارت اور زندگی پیدا کر دی تو ان کی بیگانہ روشنی کم ہو گئی اور ان میں انس اور محبت کی شان نظر آنے لگی۔ مگر شام ہوتے ہی ان کا رنگ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ جب رات دیو کی طرح لمبے لمبے قدم اٹھاتی دنیا سے گزرتی ہے اور زندگی وحشی

فطرت کے ہاتھ میدان چھوڑ کر امن کے گوشے میں چھپ جاتی ہے تو یہی پہاڑ کس قدر سرد مہر اور وحشت ناک نظر آنے لگتے ہیں۔ چاندنی رات یا تاروں کی دھیمی روشنی میں یہ اسرار، مہیب، طلسمی دیواریں فضا کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں اور وادیوں سے ہوا کے سائیں سائیں چلنے کی آواز آنے لگتی ہے۔ بیچارے مسافر کو جو اکیلا چلا جا رہا ہو۔ ایک خفی احساس ہوتا ہے کہ ہر طرف دشمن ہی دشمن ہیں اور وہ خوف لرزنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا بھی اس پر ہنستی اور اسے للکارتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہوا بالکل تھم جاتی ہے اور اس قدر گہرا سناٹا چھا جاتا ہے کہ اس سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ صرف تار برقی کے تار کی خفیف سی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے۔ اور ستارے زیادہ روشن اور قریب معلوم ہوتے ہیں۔ پہاڑ خشمناک نظروں سے گھورتے ہیں اور انسان ایک راز سربستہ کے مقابل کھڑا ہوتا ہے جس کی ہیبت دل میں بیٹھ جاتی ہے وہ پیسکال کا ہم زبان ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے ''ان وسیع فضاؤں کی ابدی خاموشی سے مجھے ہول آتا ہے'' میدان میں راتوں کو اس قدر سناٹا نہیں ہوتا۔ وہاں زندگی کی سن گن کانوں میں پہنچتی رہتی ہے اور مختلف جانوروں اور کیڑوں کی آوازیں رات کی خاموشی کو توڑتی رہتی ہے۔''

مگر جس وقت ہم موڑ پر الموڑے جا رہے تھے رات کی سرد مہری اور بے مہری ابھی بہت دور تھی۔ ہم منزل مقصود کے قریب تھے کہ راستے کے مڑنے اور بادلوں کے یکایک پھٹ جانے سے ایک نیا منظر سامنے آ گیا جسے دیکھ کر میں خوشی اور حیرت سے دم بخود رہ گیا۔ پر اشجار پہاڑوں کی دیواروں سے اونچی، بہت دور ہمالیہ کی برف آلود چوٹیاں سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ یہ ماضی کی حکمت و دانش کے وارث، ہندوستان کے وسیع میدانوں کے زبردست محافظ کس قدر پر وقار اور پر اسرار نظر آتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی قلب کا ہیجان اور اضطراب دور ہو گیا اور ان کی شان ابدیت کے آگے میدانوں اور شہروں کی چھوٹی چھوٹی سازشیں اور جھگڑے،

حرص و ہوس اور مکر و فریب ہیچ نظر آنے لگے۔

الموڑے کا چھوٹا جیل ایک اونچی سی پہاڑی پر تھا۔ اس میں ایک شاندار پارک مجھے رہنے کے لیے ملی یعنی ایک بڑا سا ہال جو سترہ گز لمبا اور پونے چھ گز چوڑا تھا۔ اس کا فرش کچا اور ناہموار تھا، چھت کو کیڑوں نے کھا لیا تھا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹوٹ کر گرتے رہتے تھے۔ اس میں پندرہ کھڑکیاں اور ایک دروازہ تھا یا یوں کہیے کہ دیواروں میں روزن تھے۔ جن میں سلاخیں لگی تھیں۔ کواڑ کسی میں بھی نہ تھے۔ غرض تازہ ہوا کی کمی نہیں تھی۔ جب سردی زیادہ پڑنے لگی تو ان کھڑکیوں پر موٹی چٹائی چڑھا دی گئیں۔ اس وسیع مکان میں (جو دہرہ دون جیل کے ہر احاطے سے بڑا تھا) میں اکیلا بڑی شان سے رہا کرتا تھا۔ مگر سچ پوچھئے تو میں بالکل تنہا بھی نہ تھا، اس لیے کہ کم سے کم چالیس چڑیوں نے ٹوٹی ہوئی چھت میں اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کبھی کوئی سیلانی بادل آ نکلتا اور اس کے بہت سے ٹکڑے دیوار کے روزنوں سے کمرے میں گھس آتے اور ساری فضا کو مرطوب کہر سے بھر دیتے۔

یہاں میں ساڑھے چار بجے سہ پہر کے ناشتے کے بعد جو میری آخری غذا تھی پانچ بجے مقفل کر دیا جاتا اور صبح سات بجے اس سلاخ دار دروازے کا قفل کھلتا۔ دن کو میں یا تو اپنی بارک میں بیٹھا رہتا یا ایک احاطے میں جو اس سے متصل تھا بیٹھ کر دھوپ کھایا کرتا! احاطے کی دیوار کے اوپر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کی چوٹی کی ذرا سی جھلک دکھائی دیتی تھی اور سر پر آسمان نیلی چادر تنی رہتی تھی جس میں جا بجا بادل بکھرے نظر آتے تھے۔ یہ بادل طرح طرح کے روپ بدلا کرتے تھے اور میں اس تماشے سے کبھی نہیں اکتاتا تھا۔ تصور کی مدد سے ان میں ہر قسم کے جانوروں کی شکلیں بنا جاتی تھیں۔ کبھی کبھی یہ بادل مل کر ایک بحر موج معلوم ہوتے تھے یا وہ ساحل بحر سے مشابہ نظر آتے تھے اور دیوار کے درختوں میں ہوا کی

سرسراہٹ پر یہ دھوکا ہوتا تھا کہ بہت فاصلے پر کہیں سمندر کی موجیں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی بادل دور سے ٹھوس نظر آیا مگر پاس آ کر گھل جاتا اور ہمیں ہر طرف سے گھیر لیتا۔

مجھے یہ بڑی سی بارک چھوٹی کوٹھڑی کے مقابلے میں پسند تھی، اگرچہ اس میں تنہائی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا۔ جب باہر بارش ہوتی تھی اس وقت بھی اس میں ٹہل سکتا تھا مگر جوں جوں سردی بڑھتی گئی اس کی اداسی اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور جب حرارت گرتے گرتے نقطہ انجماد تک پہنچی تو میرا کھلے میدان اور تازہ ہوا کا شوق بھی کم ہو گیا۔ نئے سال کے شروع میں خوب برف گری جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور جیل کے گردوپیش کے بے لطف منظر میں بھی ایک لطف پیدا ہو گیا۔ دیودار کے درخت جو جیل کے احاطے سے باہر تھے نہایت خوش نما معلوم ہوتے تھے جیسے برف کی پوشاک پہنے پریاں کھڑی ہوں۔

کملا کی صحت کو ایک حالت پر قرار نہ تھا اس لیے مجھے ہر وقت فکر رہا کرتی تھی۔ بری خبر سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے بدحواس ہو جاتا تھا۔ مگر پہاڑ کی ہوا طبیعت میں سکون پیدا کرتی تھی اور مجھے پھر رات کو اچھی طرح نیند آنے لگی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ عین اسی وقت جب آنکھ لگنے والی ہے میں سوچنے لگتا تھا کہ نیند بھی کس قدر عجیب وغریب اور پراسرار چیز ہے آخر آدمی سونے کے بعد جاگے ہی کیوں؟ کیا اچھا ہو اگر اب میں کبھی نہ جاگوں۔

ان دنوں مجھے رہائی کی آرزو اس شدت سے تھی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بمبئی کی کانگریس ہو چکی، نومبر آیا اور چلا گیا۔ اسمبلی کے انتخابات کا جوش بھی ٹھنڈا ہو گیا مجھے خیال تھا کہ شاید اب میں چھوڑ دیا جاؤں۔

مگر خبر آئی تو یہ آئی کہ خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر کے سزا دے دی گئی اور سبھاش بوس پر ہندوستان کے مختصر قیام کے زمانے میں عجیب وغریب پابندیاں عائد

کی گئیں۔ یہ احکام بجائے خود وحشیانہ اور بے دردانہ تھے اور پھر یہ اس شخص کے خلاف جاری کیے گئے تھے جسے ملک میں کروڑوں آدمی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور جو اپنی بیماری کے باوجود اپنے باپ کے آخری دیدار کے لیے دوڑا آیا اور وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اگر حکومت کا یہی رنگ تھا تو ظاہر ہے کہ میری قبل از وقت رہائی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ آگے چل کر سرکاری اعلانات سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

الموڑا جیل میں ایک مہینہ رہنے کے بعد میں کملا کو دیکھنے کے لیے بھوالی لے جایا گیا دو بار کہتے تو زیادہ صحیح ہوتا۔ الموڑے کے پچھلے ساڑھے تین مہینے کے قیام میں میں کل پانچ بار اس سے ملنے پایا۔ میں یہ شکایت کے طور پر نہیں کہتا اس لیے کہ میرے خیال میں حکومت نے میرے ساتھ بڑی عنایت کی اور مجھے کملا سے ملنے کی غیر معمولی سہولتیں دیں۔ میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔ یہ مختصر ملاقاتیں میرے لیے نعمت تھیں اور شاید کملا کے لیے بھی۔ جس روز میں اس سے ملنے جاتا تھا ڈاکٹر اپنے قواعد کی سختیاں کم کر دیتے تھے اور مجھے اس سے دیر تک باتیں کرنے کی اجازت تھی۔ ہم ایک دوسرے سے روحانی حیثیت سے بہت قریب ہو گئے تھے اور مجھے اس سے چھوٹنا بہت شاق گزرتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھنے بھی نہیں پاتے تھے کہ جدائی کی گھڑی آن پہنچتی تھی اور کبھی کبھی میں یہ خیال کر کے تڑپ جاتا تھا کہ شاید ایک دن ہمیں ہمیشہ کے لے جدا ہونا پڑے گا۔

میری والدہ علاج کے لیے بمبئی گئی تھیں کیونکہ انہیں ابھی تک صحت نہیں ہوئی تھی۔ وہاں سے یہ اطلاعیں آ رہی تھیں کہ انہیں فائدہ ہو رہا ہے۔ مگر وسط جنوری میں ایک روز دفعتہً ایک تارہ پہنچا اس سے میں بدحواس ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ ممکن تھا کہ میں بمبئی کے جیل میں بھیج دیا جاؤں تا کہ ان کے پاس رہ سکوں مگر خبر آئی کہ ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے اس لیے نہیں بھیجا گیا۔

فروری کا مہینہ آ گیا ہے۔ ہوا میں بہار کی کیفیت محسوس ہونے لگی ہے۔ بلبلیں چہک رہی ہیں۔ درختوں میں پراسرار طریقے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور اس عجیب و غریب دنیا کو حیران ہو کر دیکھتی ہیں۔ پہاڑیوں کے پہلو میں سرخ پھولوں سے بھری جھاڑیاں دور سے خون کے دھبے معلوم ہوتی ہیں۔ آلوچے اور شفتالو کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔ دن گزرتے جاتے ہیں اور میں ایک ایک گھڑی گن رہا ہوں کہ بھوالی جانے کا وقت آ جائے۔ خدا جانے یہ بات سچ ہے یا نہیں کہ مصیبت کے بعد راحت اور جدائی کے بعد وصل کے دن آتے ہیں۔ شاید ایسا نہ ہو تو ہم راحت کی قدر ہی نہ کریں۔ کہتے ہیں کہ مصیبت انسان کے دماغ کو روشن کر دیتی ہے۔ مگر حد سے زیادہ مصیبت آئے تو وہ اور دھندلا ہو جاتا ہے۔ جیل میں رہ کر مشاہدہ نفس کا بہت موقع ملتا ہے۔ اور اتنے دن قید رہنے سے مجھے اپنی نفسی زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں خلقی طور پر داخل بیں نہیں ہوں مگر قیدی زندگی میں قہوے یا کچلے کی طرح یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو داخل بیں بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات میں دل بہلانے کے لیے پروفیسر میک ڈوگل کے کعب کا خاکہ کھینچتا ہوں جس سے داخل بینی اور خارج بینی ناپی جاتی ہے۔ میں اسے نظر جما کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شکل بڑی تیزی سے بار بار بدل رہی ہے۔

حال کے چند واقعات

''رات کی صبح ہوتی ہے مگر ہماری زندگی کے گئے ہوئے دن واپس نہیں آتے۔ آنکھ آنے والے زمانے کو دیکھتی ہے مگر گزری ہوئی بہار کا داغ دل سے نہیں مٹتا۔'' (لی ٹائی پو)

مجھے جو اخبار پڑھنے کو ملتے تھے ان سے بمبئی کی کانگریس کا حال معلوم ہوا۔ مجھے قدرتی طور پر کانگریس کی سیاست سے اور اس کے لیڈروں کی شخصیت سے دلچسپی تھی۔ بیس سال کے گہرے تعلقات کی وجہ سے میں اس سے اس قدر وابستہ ہو گیا تھا کہ میری ذات اس میں محو ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ تعلق کچھ اس عہدے کی وجہ سے نہ تھا جو مجھے اس میں حاصل تھا۔ مخفی روحانی رشتوں نے مجھے اس عظیم الشان انجمن اور اپنے بے شمار پرانے رفیقوں سے جکڑ رکھا تھا۔ پھر بھی مجھے اس کی کارروائی پڑھ کر کچھ جوش نہیں آیا۔ بہت سے اہم فیصلوں کے باوجود مجھے یہ اجلاس پھیکا معلوم ہوا۔ جن چیزوں سے مجھے دلچسپی تھی ان کا اس میں ذکر تک نہیں آیا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو کیا کرتا۔ میں خود یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نئے حالات کو اور اپنے ماحول کا مجھ پر کیا اثر پڑتا اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں جیل میں اس مشکل مسئلے میں سر کھپاتا۔ جبکہ میرے فیصلے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا جب وقت آئے گا تو میں اس وقت کی صورت حال پر غور کر کے فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اس وقت کوئی فیصلہ کرنا، چاہے وہ اپنے دل ہی میں کیوں نہ ہو محض حماقت تھی اس لیے کہ بدلنے والے واقعات کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک میں اتنی دور سے اپنے پہاڑی مسکن میں بیٹھ کر سمجھ سکتا تھا اس جلسے کے دو نمایاں پہلو تھے ایک یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت جلسے پر چھائی ہوئی تھی دوسرے یہ کہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر آنے نے جو قصے چھیڑے وہ بالکل نہیں چلنے

پائے۔ جو لوگ ہندوستان کے عام لوگوں اور اوسط طبقوں کے حقیقی حالت سے واقف ہیں ان کے لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ گاندھی جی کا اثر اب تک ہندوستان میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ سرکاری حکام اور بعض گوشہ نشین سیاست دان جو اپنی خواہش کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ گاندھی جی کا اثر سیاست کے میدان میں ختم ہو گیا ہے یا کم سے کم بہت گھٹ گیا ہے مگر جب یہ شخص پھر اسی قوت اور شان سے میدان میں آتا ہے۔ تو یہ حیرت میں رہ جاتے ہیں اور اس ظاہری تغیر کے اسباب تلاش کرنے لگتے ہیں۔ گاندھی جی کا یہ اقتدار کانگریس میں کچھ تو ان خیالات کی بنا پر ہے جنہیں لوگ عام طور پر مانتے ہیں مگر اس سے بڑھ کر ان کی عجیب و غریب شخصیت کی وجہ سے۔ شخصیت ہر جگہ اہمیت رکھتی ہے اور ہندوستان میں اس کی اہمیت اور سب ملکوں سے زیادہ ہے۔

ان کا کانگریس سے علیحدہ ہونا اس اجلاس کا سب سے اہم واقعہ تھا اور بہ ظاہر اس سے کانگریس اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک بڑا دور ختم ہو گیا، مگر اصل میں ان کی علیحدگی کا اعلان کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے کہ کانگرس میں جو ان کا اقتدار ہے اسے وہ چاہیں بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کی بنا کسی عہدے یا کسی محسوس رشتے پر نہیں ہے۔ کانگریس پر ان کے خیالات آج بھی اسی طرح چھائے ہوئے ہیں جیسے پہلے تھے اور اگر وہ گاندھی جی کی راہ سے الگ بھی ہو جائے تب بھی غیر شعوری طور پر اس پر اور ملک پر ان کا اثر باقی رہے گا۔ وہ اس ذمہ داری سے کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ جب ہندوستان کے واقعی حالات پر نظر ڈالی جائے تو ان کی شخصیت سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اور اس سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

فی الحال وہ کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں غالباً اس وجہ سے کہ وہ اسے الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید وہ کسی قسم کی انفرادی، عملی جدوجہد شروع کرنا

چاہتے ہیں جس میں حکومت سے جھگڑا ہونا لازمی ہے اور وہ اسے کانگریس کا معاملہ نہیں بنانا چاہتے۔

مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ کانگریس نے ملک کے دستور کی تشکیل کے لیے ایک مجلس اساسی قائم کرنے کی تجویز منظور کی۔ میرے خیال میں اس مسئلے کو حل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں اور کبھی نہ کبھی ایسی مجلس منعقد کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کا انعقاد برطانوی حکومت کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ملک میں انقلاب ہو جائے تو اور بات ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں حکومت اسے منظور نہیں کرے گی۔ اس لیے ایسی مجلس جو حقیقی معنی میں اساسی مجلس کہی جا سکے۔ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک ملک میں اتنی قوت نہ پیدا ہو جائے کہ وہ حکومت کو اس پر مجبور کر دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی مسئلہ بھی اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا۔ کانگریس کے بعض لیڈروں کی جو اساسی مجلس کے خیال سے اتفاق رکھتے ہیں یہ کوشش ہے کہ وہ اسے اعتدال کے سانچے میں ڈھال کر پرای آل پارٹیز کانفرنس کے نمونے کی چیز بنا دیں اس سے مطلق کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہی پرانے لوگ جو زیادہ تر خود ہی اپنے آپ کو منتخب کر لیتے ہیں، ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور آپس میں لڑیں گے۔ اساسی مجلس کا اصل اصول یہ ہے کہ اسے عام لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد منتخب کرے اور اس میں جمہور کی قوت اور ان کی روح کام کرتی ہو۔ ایسی مجلس فوراً حقیقی مسائل پر غور کرنا شروع کر دے گی اور وہ پہلے کی طرح فرقہ وارانہ قضیوں اور اس قسم کے اور جھگڑوں میں پھنس کر نہیں رہ جائے گی۔

اس تجویز کا شملہ اور لندن پر جو اثر ہوا اس کا مطالعہ بہت دلچسپ تھا۔ نیم سرکاری طور پر یہ کہا گیا کہ حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا یعنی اس نے مربیانہ انداز سے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ پرانی آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کی قسم کی چیز ہو گی جو یقیناً ناکامیاب رہے گی اور اسے تقویت پہنچائے گی۔

آگے چل کر اسے یہ احساس ہوا کہ اس میں بڑے بڑے خطرے ہیں اور اس نے زور شور سے اس کی مخالفت شروع کر دی۔

بمبئی کانگریس کے تھوڑے ہی دن بعد اسمبلی کے انتخابات شروع ہو گئے۔ گو مجھے کانگریس کے کونسل کے پروگرام سے کوئی خاص شغف نہ تھا۔ پھر بھی ان انتخابات سے بڑی دلچسپی تھی۔ میں کانگریس کے امیدواروں کی فتح کا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے حریفوں کی شکست کا متمنی تھا۔ حریفوں کی یہ جماعت عہدوں کے طلب گاروں، فرقے پرستوں، غداروں اور حکومت کے جبر و تشدد کے حامیوں کا ایک معجون مرکب تھی۔ یہ یقین تھا کہ ان میں سے اکثر لوگ مقابلہ میں ہار جائیں گے مگر فرقے وارانہ تصفیے کی وجہ سے بڑی الجھن پیدا ہو گئی تھی اور ان میں سے بہتوں نے فرقے وارانہ جماعتوں کے وسیع دامن میں پناہ لی تھی۔ پھر بھی کانگریس کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی اور میں بہت خوش ہوا کہ بہت سے ناپسندیدہ اشخاص کونسلوں میں نہیں جانے پائے۔

مجھے سب سے زیادہ قابل افسوس نام نہاد کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کا طرز عمل معلوم ہوتا تھا۔ ان کا فرقے وارانہ تصفیے کی شدید مخالفت کرنا تو سمجھ میں آتا تھا مگر انہوں نے یہ غضب کیا کہ اپنی قوت بڑھانے کے لیے انتہائی فرقے پرست جماعتوں سے دوستی کر لی۔ یہاں تک کہ سناتن دھرمی پنڈتوں سے بھی جن سے زیادہ رجعت پسند سیاسی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان میں کوئی اور جماعت نہیں ہے اور بہت سے سیاسی رجعت پسندوں سے جو سارے ملک میں بدنام ہیں سوائے بنگال کے جہاں بعض خاص وجوہ سے کانگریس کے ایک طاقتور جماعت کی ان کی موئید تھی اور سب کہیں ان میں سے اکثر لوگ ہر طرح کانگریس کے مخالف تھے بلکہ سچ پوچھیے تو یہی لوگ کانگریس کے سب سے بڑے حریف تھے۔ باوجود ان کے مختلف قوتوں کی مخالفتوں کے جن میں زمیندار، لبرل اور سرکاری ملازم شامل تھے کانگریس کے

امیدواروں کو بہت بڑی کامیابی ہوئی۔

فرقے وارانہ تصفیے کے معاملے میں کانگریس کا رویہ عجیب وغریب تھا، مگر موجودہ حالات میں کوئی صورت اور بھی نہ تھی۔ یہ اس کی پچھلی غیر جانب دارانہ اور کمزور پالیسی کا لازمی نتیجہ تھا۔ اگر وہ شروع سے ایک مضبوط پالیسی اختیار کرتی اور فوری نتائج کو نظر انداز کر کے اس پر قائم رہتی تو اس کی روش زیادہ باوقار اور صحیح ہوتی۔ مگر چونکہ اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے اس کے سامنے وہی ایک راہ تھی جو اس نے اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ نہایت لغو اور ناقابل قبول ہے کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ہندوستان کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔ میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ اس سے مسلمانوں کو بہت زیادہ حقوق مل گئے غالباً یہ ممکن تھا کہ دوسرے طریقے سے ان کے سارے مطالبات پورے کردیئے جاتے۔ موجودہ صورت میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کو بہت سے الگ الگ خانوں میں تقسیم کردیا۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کی قوت کو بے کار کردیں اور غیر ملکی برطانوی عنصر غالب رہے۔ اس طرح سے تو ہندوستان ہمیشہ برطانوی حکومت کا محتاج رہے گ۔

خصوصاً بنگال میں، جہاں مٹھی بھر یورپین جماعت کو صحیح تناسب سے کہیں زیادہ حقوق دیئے گئے ہیں، ہندوؤں کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی۔ یہ تصفیہ یا فیصلہ، یا اسے جو کچھ بھی کہا جائے (اسے تصفیہ کہنے پر بعض لوگوں کو اعتراض ہے) بہت سے لوگوں کو سخت ناگوار ہے چاہے یہ زبردستی نافذ کردیا جائے اور سیاسی وجوہ سے لوگ اسے عارضی طور پر برداشت بھی کرلیں مگر اس کی وجہ سے ہمیشہ فساد کی وجہ قائم رہے گی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کا برا ہونا بہت اچھا ہے کیونکہ برا ہونے کی وجہ سے یہ مستقل طور پر قائم نہیں رہ سکتا۔

نیشنلسٹ پارٹی کو اور اس سے بھی بڑھ کر ہندو مہا سبھا اور دوسری فرقے پرست انجمنوں کو یہ مداخلت قدرتی طور پر ناگوار ہوئی مگر ان کے اور ان کے حامیوں کے

اعتراضات کی بنا اصل میں یہ تھی کہ وہ برطانوی حکومت کے خیالات سے متاثر تھے۔ اس کی وجہ سے انہوں نے ایک عجیب پالیسی اختیار کی اور کر رہے ہیں جس سے حکومت بہت خوش ہوگی۔ فرقے وارانہ تصفیہ ان کے دماغ پر مسلط ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسرے اہم معاملات میں حکومت کی مخالفت میں کمی کر رہے ہیں۔ انھیں یہ امید ہے کہ وہ خوشامد کے ذریعے سے حکومت کو اپنے موافق کر لیں گے۔ اور اس تصفیے میں اپنے حسب منشا ترمیم کرا لیں گے۔ ہندو مہا سبھا اس معاملے میں سب سے پیش پیش ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس میں نہ صرف ان کی ذلت ہے بلکہ اس سے فرقے وارانہ تصفیے میں ترمیم ہونا اور مشکل ہو جائے گا کیونکہ اس سے مسلمانوں میں اور برہمی پیدا ہو رہی ہے۔ اور وہ صلح کے راستے ہٹتے جاتے ہیں۔ حکومت قوم پرستوں کو ہرگز نہیں توڑ سکتی۔ دونوں فرقوں کی اغراض میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ بھی کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ فرقے وارانہ اغراض کے معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے فرقہ پرستوں کو راضی کر سکے۔ اسے دونوں میں سے ایک کو ترجیح دینی تھی اور اس نے مسلم فرقہ پرستوں کو ترجیح دی جو اس کے نقطہ نظر سے بالکل صحیح ہے۔ کیا وہ مٹھی بھر ہندو فرقہ پرستوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی طے شدہ اور مفید پالیسی بدل دے گی اور مسلمانوں کو ناراض کر دے گی؟۔ خود بات کہ ہندو، جماعت کی حیثیت سے، سیاست میں آگے ہیں اور قومی آزادی کے لیے زیادہ شور مچاتے ہیں ان کے خلاف پڑتی ہے۔ حکومت سمجھتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی فرقہ وارانہ رعایتوں سے (ظاہر ہے کہ بڑی رعایتیں تو دی نہیں جا سکتیں) ان کی سیاسی مخالفت کم نہیں ہونے کی، البتہ مسلمان ان رعایتوں سے کچھ دن کے لیے خوش کیے جا سکتے ہیں۔

آسمبلی کے انتخابات سے ظاہر ہو گیا کہ سب سے زیادہ رجعت پسند فرقہ پرست جماعتوں یعنی ہندو مہا سبھا اور مسلم کانفرنس کی پشت پر کون حضرات ہیں۔ ان دونوں

کے امیدوار اور موید بڑے بڑے زمیندار اور مہاجن تھے۔ ہندو مہا سبھا اس چھوٹی سی جماعت پر جو ہندو سماج میں چوٹی کی جماعت سمجھی جاتی ہے، اور لبرل پارٹی کے چند وکلا وغیرہ مشتمل ہے۔ ان کی ہندوؤں میں کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ نیچے اوسط طبقے میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ کارخانوں کے مالک بھی ان سے الگ ہیں اس لیے کہ ابھرتے ہوئے صنعتی طبقے اور زمینداروں کے طبقے میں جو جاگیرداری نظام کی یادگار رہے، ایک حد تک اغراض کا تصادم ہے۔ مالکان صنعت میں اتنی ہمتی نہیں کہ وہ عملی جدوجہد یا اور خطرناک کاموں میں شریک ہوں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ حکومت اور قوم پرور جماعت دونوں سے اچھے تعلقات قائم رکھیں۔ وہ لبرل یا فرقہ پرست جماعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ان کا مقصد صرف صنعتی ترقی اور نفع حاصل کرنا ہے۔

مسلمانوں کے نیچے اوسط طبقے میں ابھی تک سیاسی بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے اور صنعت میں وہ پیچھے ہیں۔ اس لیے نہ صرف ان کی انجمنوں پر سخت رجعت پسند، جاگیرداری رنگ میں ڈوبے ہوئے لوگ اور سابق سرکاری ملازم حاوی ہیں بلکہ پوری جماعت پر ان کا اچھا خاصا اثر ہے۔ مسلم کانفرنس میں خطاب یافتوں، سابق وزیروں اور بڑے زمینداروں کا جمگھٹ نظر آتا ہے۔ پھر بھی میرے خیال میں عام مسلمان عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے کہ ان کے معاشرتی نظام میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ میں زیادہ تیزی سے قدم بڑھائیں گے بالفعل تعلیم یافتہ مسلمانوں پر ذہنی اور جسمانی حیثیت سے ایک جمود سا چھایا ہوا ہے اور ان میں حرکت کا نام نہیں۔ وہ اپنے پہرہ داروں کو ٹوکنے کی جرات نہیں کر سکتے۔

کانگریس سیاسی اعتبار سے سب سے آگے ہے اور سب سے بڑی جماعت ہے۔ مگر اس کے لیڈر بھی اس سے کہیں زیادہ احتیاط کرتے ہیں جتنی عام لوگوں کی

حالت کو دیکھتے ہوئے کرنی چاہیے۔ وہ عام لوگوں سے مدد تو چاہتے ہیں مگر یہ بتہ کم کرتے ہیں کہ ان سے کسی بات میں رائے لیں۔ ان کی مصیبتوں کا سبب معلوم کریں۔ اسمبلی کے انتخابات سے پہلے انھوں نے اپنے پروگرام کو معتدل بنانے کی انتہائی کوشش کی تا کہ اعتدال پسند غیر کانگریسی جماعتوں کی مدد حاصل کر سکیں۔ یہاں تک کہ مندروں کے داخلے کے مسودہ قانون میں بھی ان کے رویئے میں اختلاف تھا اور ان میں سے بعض نے مدراس کے کٹر ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لیے انہیں بہت کچھ اطمینان دلایا۔ اگر وہ ایک سیدھا سچا جارحانہ انتخابی پروگرام پیش کرتے تو لوگوں میں زیادہ جوش ہوتا اور انہیں اچھی سیاسی تربیت حاصل ہوتی، مگر موجودہ پروگرام کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ان جماعتوں کو جو سیاسی اور سماجی حیثیت سے رجعت پسند ہیں پرچانے کی اور زیادہ کوشش کی جائے گی تا کہ کسی موقع پر ان کے چند ووٹ حاصل ہو سکیں اور اس سے کانگریس کے لیڈروں اور عام لوگوں میں اور زیادہ بیگانگی پیدا ہو سکی۔ دھواں دھار تقریریں کی جائیں گی، پارلیمنٹ کے آداب کی پوری پوری پابندی ہوگی اور کبھی کبھی حکومت کو شکست ہو جایا کرے گی جسے وہ پہلے کی طرح بے پروائی سے نظر انداز کر دے گی۔

پچھلے چند سال میں جب کانگریس کانسلوں کا بائیکاٹ کر رہی تھی اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ اسمبلی اور صوبوں کی کونسلیں جمہور کی حقیقی نمائندہ اور رائے عامہ کا آئینہ ہیں۔ اب یہ لطف دیکھئے کہ جب انتہا پسند جماعت اسمبلی پر حاوی ہوگئی تو حکومت کا نقطہ نظر بدل گیا۔ جب کبھی انتخابات میں کانگریس کی کامیابی کا ذکر آتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ انتخاب کنندوں کا حلقہ بہت محدود ہے، تیس پینتیس کروڑ کی آبادی میں صرف تیس لاکھ آدمی رائے دہندگی کا حق رکھتے ہیں گویا سرکاری نقطہ نظر سے، جتنے آدمی حق رائے دہندگی سے محروم ہیں وہ سب کے سب حکومت برطانیہ کے حامی ہیں۔ اس کا علاج تو کھلا ہوا ہے۔ کل بالغوں کو یہ حق دیدیجیے تو آپ ہی معلوم ہو جائے

گا کہ ان لوگوں کی کیا رائے ہے۔

اسمبلی کے انتخابات کے تھوڑے ہی دن بعد اس مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوگئی جو ہندوستان کے دستور اساسی کی اصلاح کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ اس پر ہر طرف سے مختلف قسم کے اعتراضات ہوئے، جن میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ہندوستانیوں کی طرف سے "بے اعتمادی" اور "شبہات" رکھتی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ ہمارے قومی اور سماجی معاملات کو عجیب وغریب نظر سے دیکھتے ہیں۔ آخر برطانوی سامراج کی پالیسی کو قائم رکھیں؟ برطانوی حکومت کا توصریحی طور پر یہی خیال ہے اس لیے کہ ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ "تحقیقات" سے اس وقت تک کام نہیں لیا جائے گا جب تک ہم کوئی شرارت نہ کریں یعنی ہماری حکومت خود اختیاری کی قابلیت کا ثبوت یہ ہے کہ ہم وہی کریں جو برطانوی حکومت چاہتی ہے۔ اگر برطانوی پالیسی کو ہندوستان میں قائم رکھنا ہے تو پھر سوراج کے لیے اس قدر ہنگامے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اٹاوا کے معاہدے سے انگلستان کو جو کچھ معاشی فائدہ ہوا وہ صرف ہندوستان کی تجارت (۱) کے معاملے میں ہوا۔ برطانوی تاجر جو ہندوستان سے تجارت کرتے ہیں بیشک نفع میں رہے (گو ہندوستان کے سیاسی اور تجارتی حلقوں کی رائے میں یہ نفع عام ہندوستانیوں کی اغراض کو نقصان پہنچا کر حاصل کیا گیا) مگر نوآبادیات خصوصاً کینیڈا اور آسٹریلیا (۲) میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ انھوں نے برطانیہ سے بڑا چوکھا سودا کیا اور اسے نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھایا۔ پھر بھی ان کی یہ کوشش ہے کہ اٹاوا کے معاہدے کے چکر سے نکلیں تاکہ وہ خود اپنی صنعت کو اور دوسرے ملکوں سے اپنی تجارت کو ترقی دے سکیں۔ (۳) کینیڈا میں لبرل پارٹی جو ایک ممتاز سیاسی جماعت ہے اور غالباً بہت جلد برسر اقتدار آ جائے گی

صاف الفاظ میں اعلان کر چکی ہے کہ وہ اٹاوا کے معاہدے کو ختم کر دے گی (۴)
آسٹریلیا میں اٹاوا کے معاہدے کی تاویلیں کر کے بعض قسم کے کپڑے اور سوت پر
محصول بڑھا دیا گیا ہے۔ اس پر لنکا شائر کے کارخانوں کے مالک بہت برہم ہوئے
اور انھوں نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا۔ احتجاج اور انتقام کے طور پر
لنکا شائر میں آسٹریلیا کے مال کو بائیکاٹ کرنے کی تحریک شروع ہوئی مگر آسٹریلیا پر
اس کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ (۵)

ظاہر ہے کہ یہ معاشی نزاعین اس وجہ سے نہیں ہیں کہ کینیڈا اور آسٹریلیا کو
برطانیہ سے کسی قسم کی پرخاش ہے البتہ آئرستان کو ضرور اس سے کد ہے۔ نزاعین اس
وجہ سے ہوتی ہے کہ اغراض میں تصادم ہوتا ہے اور ہندوستان کے "تحفظات" کا
مقصد یہی ہے کہ جب کبھی تصادم ہو تو برطانیہ کی اغراض مقدم رکھی جائیں۔ حال
میں ہندوستان اور برطانیہ میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے اس میں ہندوستان کے
تاجروں اور مالکان صنعت سے رائے نہیں لی گئی اور وہ چیختے ہی رہے البتہ برطانیہ
کے مالکان صنعت سے برابر مشورہ ہوتا رہا۔ اسمبلی نے اس معاہدے کو مسترد کر دیا مگر
حکومت اسی پر اڑی رہی۔ اس سے کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے کہ "تحفظات" کا کیا
نتیجہ ہوگا۔ اس قسم کے "تحفظات" کی کینیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں بڑی
ضرورت ہے تاکہ ان نوآبادیوں کے لوگ نہ صرف تجارتی معاملات میں بلکہ اور
کاموں میں بھی جو سلطنت کی حفاظت اور مضبوطی کے لیے ان سے زیادہ اہم ہیں راہ
راست سے بھٹکنے نہ پائیں۔ (۶)

کہا جاتا ہے کہ سلطنت قرض خواہ ہے اور "تحفظات" اس غرض سے وضع کیے
گئے ہیں کہ سلطنت کا مہاجن بدنصیب قرض دار کا گلا دبائے رہے اور اپنی اغراض
اور قوت کی حفاظت کرتا رہے۔ ایک اور عجیب و غریب نظریہ جو سرکاری طور پر اکثر
پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ہے، کہ گاندھی جی اور کانگریس نے ان تحفظات کے اصول کو

تسلیم کرلیا ہے اس لیے کہ ۱۹۳۱ء کے معاہدہ دہلی کی رہ سے وہ ''ایسے تحفظات جو ہندوستان کے لیے مفید ہوں'' قبول کر چکے ہیں۔

اور پھر اٹاوا کا معاہدہ اور تجارتی تحفظات تو نسبتاً چھوٹی چیزیں ہیں۔(۷) ان سے کہیں زیادہ اہم وہ شرائط ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کا سیاسی اور معاشی تسلط ہندوستان پر قائم رہے جس نے پہلے انھیں خوب لوٹا اور اب بھی لوٹ رہا ہے۔ جب تک یہ شرائط اور ''تحفظات'' باقی ہیں نہ کسی قسم کی حقیقی ترقی ہوسکتی ہے۔ اور نہ آئینی طریقوں سے کوئی تغیر ممکن ہے۔ جو کوشش بھی آئینی طریقہ سے کی جائے گی اس کی راہ میں ''تحفظات'' کی دیوار حال ہوگی اور یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ صرف ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ غیر آئینی راہ ہے۔ سیاسی تغیر کے نقطہ نظر سے یہ مجوزہ دستور اور اس کا عجیب الخلقت وفاق بالکل مہمل چیز ہے اور سماجی اور معاشی نقطہ نظر سے اور بھی بدتر ہے۔ اشتراکیت کا رستہ خاص کر کے بند کر دیا گیا ہے۔ بظاہر بہت سے اختیارات منتقل کئے گئے ہیں (وہ بھی زیادہ ان طبقوں کو جس سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے) مگر کوئی مفید کام کرنے اختیار اور وسائل نہیں دیئے گئے۔ اختیار برطانیہ کے ہاتھ میں ہے اور ذمہ داری ہندوستانیوں پر۔ استبداد کی برہنگی کو چھپانے کے لیے دستور کے مطابق انجیر کا پتہ تک بھی تو نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل ملکوں کے دستور اساسی میں بہت زیادہ لوچ ہونا چاہیے تاکہ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی حالت کے مطابق بدلا جاسکے جلد فیصلہ کرنے اور اس فیصلے کو نافذ کرنے کا اختیار ضروری ہے۔ آج کل خود مغربی ملکوں کی پارلیمنٹری جمہوریت بھی ان تغیرات کو عمل میں نہیں لاسکتی جو موجودہ زمانے کے لیے ضروری ہیں، مگر یہاں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اس لیے کہ حرکت کو روکنے کے لیے خاص کر کے ہمارے پیروں میں بھاری بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں، اور ہمارے سامنے ایک آہنی دروازہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ہمیں ایک ایسی موٹر کار دی گئی ہے جس میں بریک ہی بریک ہیں، انجن کوئی

نہیں۔ یہ دستور ا ساسی ان لوگوں کو بنایا ہوا ہے جن کی نظروں میں ہمیشہ مارشل لا سمایا رہتا ہے۔ جس شخص کا دارومدار تشدد پر ہو اس کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں یا تو مارشل لا یا تباہی۔

برطانیہ کے اس تحفے سے ہندوستان کو جس قدر آزادی دی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ملک میں جو سب سے زیادہ اعتدال پسند اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ جماعتیں ہیں، انھوں نے بھی اس کو رجعت پسندانہ قرار دیا ہے۔ حکومت کے پیشہ ور حامیوں نے اعتراض کے ساتھ ساتھ اپنی عادت کے مطابق تھوڑی بہت خوشامد بھی کی ہے مگر دوسرے جوش وخروش سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

مجوزہ دستور کو دیکھنے کے بعد لبرل جماعت کا یہ راسخ عقیدہ بھی متزلزل ہو گیا کہ

_______صفحہ نمبر ۴۰۷ تک

بنگال ۱۵۰۰ اور ۱۶۰۰ کے درمیان، دیولی کیمپ ۵۰۰ میزان ۲۰۰۰ اور ۲۱۰۰ کے درمیان۔ یہ صرف نظر بندوں یعنی ان لوگوں کی تعداد ہے جو بغیر عدالتی تحقیقات اور سزا کے قید کر دیئے گئے ہیں۔ سزا یافتہ سیاسی قیدی ان کے علاوہ ہیں۔ ان کو عموماً بہت بھاری سزائیں دی گئیں ہیں۔ ایسوی ایٹڈ پریس کی ۱۷ دسمبر ۱۹۳۴ء کی خبر ہے کہ کہ حال میں کلکتے کے ایک مقدمے میں ہائی کورٹ میں ایک شخص کو بغیر لائسنس اسلحہ رکھنے کے جرم میں ۹ سال قید با مشقت کی سزا دی اس کے پاس ایک ریوالور اور ۶ کارتوس نکلے تھے۔

(۱۰) ۱۲ نومبر ۱۹۳۴ء۔

(۱۱) ۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو اسمبلی میں سرکاری طور پر پریس ایکٹ کی عملی درآمد کے متعلق ایک بیان دیا گیا۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ ۱۹۳۴ء سے اب تک ۵۱۴ اخبارات پر ضمانت کی طلبی اور ضبطی کا اثر پڑا۔ ان میں سے ۳۴۸ اخبارات بند ہو گئے ہیں اس لیے کہ وہ مزید ضمانتیں نہیں دے سکتے تھے اور ۱۶۶ نے ضمانتیں داخل کیں جن کی

مجموعی مقدار ۲لاکھ ۵۲ ہزار ۸۲۵ روپے تھی۔

حال میں (یعنی ۱۹۳۵ء کے نصف آخر میں) کئی اور قانون جو شہری آزادی کو سلب کرتے ہیں ایک طویل عرصے کے لیے وضع کئے گئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم قانون ترمیم ضابطہ فوجداری ہے جس کا نفاذ سارے ہندوستان میں ہے اسے اسمبلی نے نامنظور کر دیا تھا۔ مگر گورنر جنرل نے اس کی تصدیق کر دی اکثر صوبوں میں بھی اس قسم کے قانون بنائے گئے ہیں۔

خاتمہ

ہمیں سعی کی تاکید کی گئی ہے مگر سعی کا پورا کرنا ہمارا نصیب میں نہیں۔ (تالمود)

میری کہانی ختم ہوگئی۔ سفر زندگی کے یہ حالات، جو بالکل شخصی نقطہ نظر سے لکھے گئے ہیں، جیسے کچھ بھی ہیں، آج کی تاریخ یعنی ۱۴ فروری ۱۹۳۵ء تک الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں مکمل ہو گئے۔ تین مہینے ہوئے میں نے اسی جیل میں اپنی پینتالیسویں سالگرہ منائی تھی اور غالباً ابھی زندگی کے بہت سے سال باقی ہیں۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور تھک گیا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا تازہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میرا جسم خاصہ مضبوط ہے اور میرا دماغ صدمے جھیلنے کی قوت رکھتا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آ گیا تو میں ابھی بہت دن جیوں گا۔ لیکن آنے والی زندگی تک بیت نہ جائے اس کا حال کیونکر لکھا جاسکتا ہے۔

شاید میری سرگذشت لوگوں کو ہیجان خیز نہ معلوم ہو۔ جس کی عمر قید میں کٹی ہو اس کی زندگی میں ہیجان خیز واقعات کہاں سے آئیں؟ سچ پوچھیے تو میری کہانی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ جو مجھ پر گذری وہی میرے ملک کے لاکھوں مردوں عورتوں پر بھی گذری۔ بدلتی ہوئی کیفیتوں امیدوں اور مایوسیوں، شگفتگی اور افسردگی، سخت جدوجہد اور جبری تنہائی کی یہ داستان ہم سب کی داستان ہے۔ ایک فرد قوم کی حیثیت سے میں قوم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، کبھی اس پر اثر ڈالا، کبھی اس سے متاثر ہوا۔ اس کے باوجود دوسرے افراد کی طرح میں ایک جداگاہ شخصی زندگی رکھتا تھا اور سب کے بیچ رہتے ہوئے سب سے الگ رہتا تھا۔ یوں تو ہم لوگ اکثر بنتے بھی تھے مگر ہمارے بہت سے کاموں میں حقیقت اور سچائی معلوم ہوتی تھی جس کی وجہ سے ہم اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر وہ اہمیت حاصل کر لیتے تھے۔ جو

ہمیں ان کاموں کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی۔ کبھی کبھی ہمیں خوش قسمتی سے اس مکمل زندگی کا تجربہ ہوتا تھا جو نصب العین اور عمل کی مطابقت کا نام ہے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہم نصب العین کو ترک کر کے غالب قوت کے آگے چپ چاپ سر جھکا دیتے تو ہماری زندگی برباد اور ہماری اوقات تلخ ہو جاتی۔

مجھے اس زمانے میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ میں زندگی کو ایک نہایت دلچسپ سفر سمجھنے لگا جس میں انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، بہت کچھ کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ میں عقل اور تجربے میں ترقی کر رہا ہوں۔ یہ احساس اب بھی ہے اور اس سے مجھے اپنے کاموں میں اور کتابوں کے مطالعہ میں خاص لطف آتا ہے اور زندگی اچھی طرح گزرتی ہے۔

اس سرگذشت کے لکھنے میں، میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر واقعے کے ساتھ ان خیالات اور جذبات کا بھی ذکر کروں جو اس وقت میرے دل میں تھے، تا کہ جہاں تک ممکن ہو میری اندرونی حالت کا اندازہ ہو جائے۔ گذری ہوئی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ اس میں بعد کے واقعات کی جھلک نہ آنے پائے سہل نہیں ہے۔ اس لیے لازمی طور پر اگلے حالات کے بیان میں پچھلے خیالات کا رنگ آ گیا ہو گا مگر جو مقصد میرے پیش نظر تھا وہ یہی تھا کہ خود اپنی بصیرت کے لیے اپنی ذہنی نشوونما کا نقشہ کھینچوں۔ شاید میں اس تحریر میں اپنے آپ کو ایسا نہیں دکھا سکا جیسا میں واقعی تھا بلکہ ایسا جیسا میں ہونا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا کہ ہوں۔

چند مہینے ہوئے سر سی۔ پی۔ راما سوامی آئر نے مجمع عام میں یہ کہا تھا کہ جواہر لال جمہور کے خیالات کے نمائندہ نہیں ہے مگر اپنی قربانی، تصور پرستی اور جوش عقیدت کی وجہ سے، جو بقول ان کے محض "فریب نفس" ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص "فریب نفس" میں مبتلا ہو وہ اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں اس ذاتی معاملہ میں سی۔ پی سے بحث کرنے کی جرات نہیں

کروں گا۔کئی سال سے مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔مگر اب سے بہت پہلے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ اور میں دونوں ہوم رول لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔وہ ترقی کے مدارج طے کرکے آسمان پر پہنچ گئے اور میں خاک کا پتلا زمین پر پڑا رہا۔اب مجھ میں اور ان میں اس کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں ہی ایک قوم کے افراد ہیں۔وہ آج کل، خصوصا! پچھلے چند سال سے ہندوستان کی برطانوی گورنمنٹ کے قصیدہ خواہ، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں حکومت مطلق کے حامی، اور خود بھی ایک دیسی ریاست کے وزیر اور استبداد کے چشم و چراغ ہیں۔غالبًا ان میں اور مجھ میں ہر معاملے میں اختلاف رائے ہے مگر ایک جزوی چیز میں ہم دونوں متفق ہیں۔ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ میں جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہں ہوں۔مجھے ہرگز یہ مغالطہ نہیں ہے۔

سچ پوچھئے تو بعض وقت میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں کسی کا بھی نمائندہ ہوں اور میرا دل کہتا ہے نہیں، کسی کا نہیں۔یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے انس اور محبت رکھتے ہیں۔مشرق اور مغرب کا معجون مرکب بن کر نہ میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ غالبًا میرے خیالات اور تصور حیات میں مغربی رنگ مشرقی رنگ پر غالب ہے۔مگر اور ہندوستانیوں کی طرح میں بھی اپنے دیس سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہوں اور میرے نفس کے نیم شعوری طبق میں برہمنوں کی سیکڑوں پشتوں کی روایات دبی ہوئی ہیں۔نہ تو میں قدیم اثرات سے آزاد ہو سکتا ہوں۔نہ جدید خیالات سے۔یہ دونوں میری سیرت کا جز بن گئے ہیں اور اگرچہ وہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ میرے کام آتے ہیں مگر اسی کے ساتھ انہوں نے میرے دل میں روحانی ترقی کا احساس پیدا کر دیا ہے جو نہ صرف سیاسی جدوجہد میں بلکہ ساری زندگی میں مجھ پر چھایا ہوا رہتا ہے۔مغرب میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہوں، وہاں کی زندگی میں کسی طرح نہیں کھپ سکتا مگر بعض اوقات اپنے دیس میں بھی مجھے بدیسی ہونے کا

احساس ہوتا ہے۔

پہاڑ کو دور سے دیکھ کر اس پر چڑھنا سہل معلوم ہوتا ہے اور چوٹی اشارہ کرتی ہے کہ چلے آؤ مگر پاس پہنچ کر مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور جتنا اوپر چڑھتے جایئے اتنا ہی رستہ کٹھن ہوتا جاتا ہے اور چوٹی دور ہٹتی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی چڑھنے کی کوشش بیکار نہیں، اس میں بجائے خود ایک لطف ہے۔ شاید زندگی کی قدر و قیمت سعی پر منحصر ہے انجام پر نہیں۔ اکثر راستے کا ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر غلط راستے کا پہچان لینا آسان ہے اور اگر انسان اس سے بچ کر چلے تب بھی غنیمت ہے۔ نہایت عجز و انکسار سے میں حکیم جلیل سقراط کا یہ قول نقل کرتا ہوں "مجھے نہیں معلوم موت کیا ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو اس لیے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں یہ خوب جانتا ہوں کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا برا ہے اور جس چیز میں بھلائی کا احتمال ہو اسے میں اس چیز پر ترجیح دیتا ہوں جس کی برائی کا یقین ہے۔"

نہ جانے کتنے سال میں نے جیل میں بسر کیے! کتنے موسم آئے اور چلے گئے، کتنے چاند بڑھے اور گھٹ گئے، ستارے بڑے ثبات اور وقار سے اپنے محور پر چلتے رہے اور میں تنہائی اور محویت کے عالم میں تماشے دیکھتا ہوا۔ میری جوانی کے بے شمار دن یہاں دفن ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھوت بن کر میرے سامنے آتے ہیں، گزرے ہوئے زمانے کی تلخیاں یاد دلاتے ہیں۔ اور چپکے سے میرے کان میں کہتے ہیں" اس سے کچھ حاصل بھی ہوا؟" میں اس کا جواب دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مجھے اپنے موجودہ علم اور تجربے کے ساتھ گزری ہوئی زندگی پھر سے بسر کرنے کا موقع ملے تو بے شک میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت تبدیلیاں کروں، اپنے پچھلے کاموں میں کچھ ترمیم اور اصلاح کروں مگر خاص خاص قومی معاملات میں میرے فیصلے وہی ہوں گے جو پہلے تھے۔ سچ پوچھئے تو میں ان کو بدل ہی نہیں سکتا۔ میں خود ان کے آگے بے بس ہوں یہ فیصلے میں نے نہیں کیے بلکہ ایک ایسی قوت نے مجھ سے

کرائے جو میرے اختیار میں نہیں۔

مجھے سزا پائے ٹھیک ایک سال ہو گیا۔ دو برس کی میعاد میں سے ایک برس گزرا ہے اور ابھی پورے بارہ مہینے باقی ہیں۔ اس بار تخفیف کی کوئی امید نہیں۔ قید محض میں تخفیف نہیں ہوا کرتی۔ وہ گیارہ دن جو میں نے پچھلے اگست میں جیل سے باہر گزارے تھے محسوب نہیں ہوئے بلکہ دو سال کی میعاد میں گیارہ دن اور بڑھا دیئے گئے۔ مگر یہ سال بھی کسی نہ کسی طرح گزر جائے گا۔ اور میں رہا ہو جاؤں گا۔ پھر کیا ہو گا؟ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر کا ایک باب ختم ہو گیا اور دوسرا باب شروع ہو گا۔ اس میں کیا مضمون ہو گا۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ کتاب زندگی کے اگلے ورق سر بہ مہر ہیں۔

تتمہ

باڈن وائلر، شوارتش والڈ (جرمنی) ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء

مئی میں میری بیوی مزید علاج کے لیے بھوالی سے یورپ روانہ ہوگئیں۔ ان کے جانے کے بعد میرا بھوالی جانا بند ہوگیا اور پندرہویں دن جیل سے باہر نکل کر پہاڑی سڑکوں سے گزرنے کا جو موقع ملتا تھا وہ جاتا رہا۔ مجھے اس کا بڑا قلق ہوا اور الموڑے کا جیل اور بھی سنسان معلوم ہونے لگا۔

کوئٹے کے زلزلے کی خبر آئی اور اس نے کچھ دن کے لیے اور سب چیزوں کو بھلا دیا۔ مگر حکومت اپنی انوکھی حرکتوں کی یاد لوگوں کے دل سے محو نہیں ہونے دیتی۔ تھوڑے ہی دن کے بعد معلوم ہوا کہ کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد کو۔ جن سے زیادہ زلزلے کے امدادی کام کی واقفیت ہندوستان میں کوئی نہیں رکھتا، اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ کوئٹہ جا کر امدادی کام میں شریک ہوں۔ اسی طرح گاندھی جی اور دوسرے مشہور لیڈر بھی وہاں جانے سے روک دیئے گئے۔ بہت سے ہندوستانی اخباروں کی ضمانت اس جرم میں ضبط کر لی گئی کہ انہوں نے کوئٹے کے متعلق مضامین لکھے۔ ہر جگہ وہی فوج اور پولیس کی ذہنیت نظر آتی ہے چاہے اسمبلی ہو، یا سول حکومت یا سرحد پر گولہ باری کرنے والا توپ خانہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کی برطانوی حکومت اور ہندوستانی قوم کی بہت بڑی جماعت میں ایک مستقل جنگ چھڑی رہتی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ پولیس ایک مفید اور ضروری چیز ہے لیکن اگر دنیا میں پولیس کے سپاہیوں اور پولیس کے ڈنڈوں کے سوا کچھ نہ ہو تو شاید انسان کو اس میں رہنا دوبھر ہو جائے۔ یہ ایک مشہور قول ہے کہ جو شخص دوسروں پر بے اندازہ تشدد کرے وہ صرف انہیں پست اور ذلیل نہیں کرتا بلکہ خود بھی پست اور ذلیل ہوتا ہے۔

آج ہندوستان میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے حکام

خصوصاً سول سروس والوں کی اخلاقی اور ذہنی پستی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا اثر سب سے زیادہ بڑے افسروں میں نظر آتا ہے۔ مگر ایک حد تک تمام سرکاری افسروں میں پھیل گیا ہے۔ جب کبھی کوئی بڑی جگہ خالی ہوتی ہے تو اس کے لیے ہمیشہ وہ شخص منتخب کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔

۴ ستمبر کو میں اچانک الموڑا جیل سے رہا کر دیا گیا کیونکہ یہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ جرمنی کے علاقے شوارتس والڈ می باڈن وائلر مقام پر زیر علاج تھیں مجھ سے کہا گیا کہ تمہاری سزا ملتوی کی جاتی ہے اور مجھے اپنی میعاد کے ختم ہونے سے ساڑھے پانچ مہینے پہلے رہائی مل گئی۔ میں انتہائی عجلت کے ساتھ ہوائی جہاز سے یورپ روانہ ہو گیا۔

یورپ میں ہلچل مچی ہوئی ہے ایک طرف جنگ اور شورش کا خوف ہے دوسری طرف معاشی تباہی کا ڈر ہے۔ حبش پر چڑھائی ہو رہی ہے۔ اس کے باشندوں پر گولے برسائے جا رہے ہیں۔ شہنشاہی پسند سلطنتوں میں ان بن ہے اور وہ ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہی ہیں۔ انگلستان جو سب سے بڑی شہنشاہی قوت ہے، ایک طرف صلح و امن اور انجمن اقوام کے قانون کی حمایت کر رہا ہے اور دوسری طرف اپنی محکوم قوم کو پیس رہا ہے اور ان پر گولہ باری کر رہا ہے۔ مگر یہاں شوارتس والڈ میں امن اور سکون چھایا ہوا ہے اور نازیوں کی سواستکا بھی بہت نظر آتی ہے۔ میں اس کہر کر دیکھ رہا ہوں جو آہستہ آہستہ وادی پر چھا رہا ہے۔ فرانس کی سرحد، جو یہاں سے بہت دور ہے نظر سے چھپتی جاتی ہے اور سارے منظر پر ایک سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے میں دل میں سوچتا ہوں کہ خدا جانے اس کہر کے پیچھے کیا ہے۔

ضمیمہ الف

وہ حلف جو یوم آزادی اٹھایا گیا

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اور قوموں کی طرح ہندوستانی قوم کا لازمی حق ہے کہ وہ آزاد ہو، اس کی محنت کا پھل اس کے پاس رہے اور اسے وہ چیزیں میسر ہوں جو زندگی کے لیے ضرور ہیں تا کہ اسے پنپنے اور بڑھنے کا پورا پورا موقع ملے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی حکومت کسی قوم کو ان حقوق سے محروم کرے اور اس پر ظلم کرے تو قوم کو حق ہے کہ اس حکومت کو بدل دے یا ختم کر دے۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ہندوستانی قوم کو نہ صرف آزادی محروم کر دیا ہے بلکہ اس نے اپنی بناپر اس پر قائم کی ہے کہ عام لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس نے ہندوستان کو معاشی، سیاسی، تمدنی اور روحانی حیثیت سے برباد کر دیا ہے اس لیے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں ہندوستان برطانیہ سے قطع تعلق کر لے اور پورن سوراج یعنی کامل آزادی حاصل کر لے۔

معاشی حیثیت سے ہندوستان تباہ کر دیا گیا ہے۔ہم سے جو محصول وصول کئے جاتے ہیں وہ ہماری آمدنی کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روز ہے اور جو بھاری محصول ہم کو ادا کرنے پڑتے ہیں ان میں سے بیس فی صدی لگان کی صورت میں کسانوں سے وصول کئے جاتے ہیں اور تین فی صدی تک کے محصول سے جس کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں پر پڑتا ہے۔

دیسی صنعتیں مثلاً ہاتھ سے سوت کاتنا مٹا دی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کسان کم سے کم سال میں چار مہینے بیکار رہتے ہیں اور دستکاری کی شغل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن کند ہو جاتے ہیں۔ بہ خلاف دوسرے ملکوں کے

یہاں ان برباد شدہ صنعتوں کی کسی صورت سے تلافی نہیں کی گئی۔

چنگی کی شرح اور روپے کی قیمت اس ترکیب سے مقرر کی گئی ہے کہ کسانوں پر اور زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ ہماری درآمد کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے کارخانوں کا بنا ہوا مال ہے۔ چنگی کی شرح سے برطانوی کارخانہ داروں کے ساتھ کھلم کھلا رعایت ظاہر ہوتی ہے اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ وہ غریبوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے استعمال نہیں کی جاتی بلکہ مسرفانہ حکومت کے چلانے میں۔ اس سے بھی زیادہ اندھیر یہ ہے کہ شرح مبادلے میں اس ڈھب سے مداخلت کی گئی کہ کروڑوں روپیہ ملک سے کھینچ کر باہر چلا گیا۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان کا درجہ اتنا پست کبھی نہیں تھا جتنا برطانوی حکومت میں ہے۔ اصلاحات کے ذریعے سے لوگوں کو کوئی حقیقی سیاسی اختیارات حاصل نہیں ہوئے۔ ہمارے بڑے بڑے آدمی کو بدیسی حکومت کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ ہم رائے کی آزادی اور میل جول کی آزادی کے حق سے محروم رکھے گئے اور ہمارے بہت سے بھائی جلاوطن کر دیئے گئے اور انھیں اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں۔ ہماری انتظامی قابلیت فنا کر دی گئی اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ ہم مجموعی طور پر چوکیداری اور محرری پر قناعت کرنے لگے۔

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے موجودہ نظام تعلیم نے ہمیں اپنے لنگر سے چھڑا کر ڈانواں ڈول کر دیا اور ہمیں یہ سکھایا کہ غلامی میں مگن رہیں۔

روحانی اعتبار سے ہتھیار چھن جانے نے ہمیں نامرد بنا دیا اور بیرونی فوج کی موجودگی نے بڑی بے دردی سے ہماری دفاعی قوت کو کچل دیا اور ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ہم خود اپنی حفاظت اور بیرونی حملے کی مدافعت نہیں کر سکتے بلکہ اپنے گھر بار کو چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے حملے سے بھی نہیں بچا سکتے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ جس حکومت نے ان چار طریقوں سے ہمارے ملک کو برباد

کیا اس کی اطاعت کرنا انسانیت کی ذلت اور خدا کی نافرمانی ہے۔مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ تشدد ہمارے لیے آزادی حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ نہیں ہے اس لیے ہم یہ طریقہ اختیار کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہے برطانوی حکومت سے بالارادہ کوئی تعلق نہ رکھیں اور سول نافرمانی کی تیاری کریں جس میں محصول ادا نہ کرنا بھی شامل ہے۔ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم حکومت کو بالارادہ کسی قسم کی مدد نہ دیں، محصول دینا بند کر دیں اور خواہ کتنا ہی اشتعال ہو۔تشدد سے ہرگز کام نہ لیں تو اس ظالمانہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔اس لیے ہم صدق دل سے عہد کرتے ہیں کہ کانگریس وقتاً فوقتاً پورن سوراج قائم کرنے کے لیے جو ہدایات دے گی ان پر عمل کریں گے۔

ضمیمہ ب

خط مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۳۰ء جو کانگرس کے لیڈروں نے یرودا جیل سے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ایم۔ آر۔ جیکار کو صلح کی شرائط کے متعلق بھیجا۔

یرودا سنٹرل جیل

۱۵ اگست ۱۹۳۰ء

صاحبان مکرم

ہم آپ کے دل سے شکر گزار ہیں کہ آپ نے برطانوی حکومت اور کانگرس میں صلح کرانے کا ذمہ لیا ہے۔ اس خط و کتابت کو پڑھ کو جو آپ لوگوں میں اور ہز ایکسی لینسی وائسرائے میں ہوئی ہے اور آپ سے مفصل گفتگو اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا جب کوئی ایسی صلح ہو سکے جو ہمارے ملک کی عزت و وقار کے شایان شان ہو۔ اگرچہ پچھلے پانچ مہینے میں جمہور میں حیرت انگیز بیداری پیدا ہو گئی ہے اور ہر طبقے اور جماعت، ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی تک یہ تکلیفیں نہ اس قدر مسلسل ہیں اور نہ اتنی زیادہ ہیں کہ ہمارے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کافی ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم آپ کے اور وائسرائے کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ سول نافرمانی سے ملک کو نقصان پہنچا۔ یہ تحریک بے وقت اور غیر آئینی ہے۔ انگلستان کی تاریخ خون ریز شورشوں کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے جن کی خود انگریزوں نے دل کھول کر تعریف کی اور ہمیں بھی ان کی تعریف کرنا سکھایا۔ لہذا وائسرائے کے لیے یا کسی بھی سمجھدار انگریز کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ایک ایسی تحریک کو برا کہے جو اپنے مقصد کے لحاظ سے اور بہت بڑی حد تک اپنے عمل کے لحاظ سے بھی پر امن رہی ہے۔ مگر یہاں ہم ان الزامات کی تردید نہیں کرنا

چاہتے جو سرکاری یا غیر سرکاری طور پر موجودہ سول نافرمانی کی تحریک پر لگائے گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس تحریک کو جو حیرت انگیز مقبولیت عام لوگوں میں حاصل ہوئی وہ اس کے جواز کا کافی ثبوت ہے۔ اس وقت تو صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ ہم بھی آپ کی طرح دل سے چاہتے ہیں کہ اگر کسی طرح بھی ممکن ہو سول نافرمانی ملتوی یا ختم کر دی جائے۔ ہمیں خود یہ گوارا نہیں کہ بلا ضرورت اپنے ملک کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو قید، لاٹھی چارج اور اس سے بھی بدتر خطروں میں ڈالیں۔ اس لیے ہم آپ کو اور وائسرائے کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم باعزت صلح کی تمام امکانی صورتیں تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھیں گے۔ مگر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ابھی تک اس کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ انگریز حکام اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو اپنے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہمیں ان خالی خولی وعدوں پر اعتبار نہیں ہے جو حکام کی طرف سے کیے جاتے ہیں اگرچہ یہ اکثر نیک نیتی پر مبنی ہوتے ہیں۔ انگریز مدتوں سے ہماری قوم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں اس لیے انھیں اس اخلاقی معاشی اور سیاسی تباہی کا احساس باقی نہیں رہا جو ان کے ہاتھوں ہمارے ملک پر آئی ہے۔ وہ کسی طرح اپنے دل کو یہ نہیں سمجھا سکتے کہ ان کا ایک ہی فرض ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی حکومت کو جو ہماری گردنوں سے اتاریں اور اپنی پچھلی زیادتیوں کی تھوڑی بہت تلافی کے لیے ہمیں اس روز افزوں تنزل سے نجات پانے میں مدد دیں جو برطانوی حکومت کے ماتحت ایک صدی سے ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔

مگر ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اور ہمارے بعض فاضل ہم وطنوں کو ان خیالات سے اتفاق نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت کی ذہنیت کم سے کم اس حد تک بدل گئی ہے کہ مجوزہ کانفرنس میں شرکت کرنے سے مفید نتیجہ نکلے گا اس لیے باوجود ان دقتوں

کے جو ہمیں درپیش ہیں ہم خوشی سے تیار ہیں کہ جہاں تک ہمارے امکان میں ہے آپ کے ساتھ تعاون کریں۔ اس لیے موجودہ حالت میں آپ کی دوستانہ تجویز کے جواب میں ہم جو زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) ہمارا خیال ہے کہ آپ کے اس خط کے جواب میں جو مجوزہ کانفرنس کے متعلق تھا وائسرائے نے مبہم الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ہم کوئی اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ قومی مطالبے سے جو پچھلے سال لاہور میں پیش کیا گیا تھا کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اس وقت تک کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتے۔ جب تک کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے باضابطہ اجلاس میں اس مسئلے پر غور نہ کر لیا جائے۔ البتہ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ذاتی طور پر ہمیں وہی فیصلہ منظور ہو گا جس کی رو سے:

(الف) صاف الفاظ میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان جب چاہے برطانوی سلطنت سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔

(ب) ہندوستان کو مکمل قومی حکومت دی جائے جو رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ جسے ملک کی حفاظت اور معاشی امور کے متعلق پورے پورے اختیارات حاصل ہوں اور جو ان گیارہ شرطوں کو پورا کرتی ہو جو گاندھی جی نے وائسرائے کو اپنے خط میں لکھی تھیں۔

(ج) ہندوستان کو یہ حق دیا جائے کہ اگر ضرورت ہو تو ایک آزاد عدالت کے ذریعے سے ان برطانوی مطالبات (جن میں ہندوستان کا نام نہاد ملکی قرضہ بھی شامل ہے) کی تنقیح کرائی جائے تو قومی حکومت کے نزدیک غیر واجبی یا ہندوستانیوں کے مفاد کے خلاف ہوں۔

(نوٹ) انتقال حکومت کے دوران میں جو خاص انتظامات ہندوستان کے مفاد کے لیے ضروری ہوں ان کا فیصلہ ہندوستان کے

منتخب شدہ نمائندے کریں۔

(۲) اگر برطانوی حکومت مندرجہ بالا شرائط کو منظور کر لے اور اس کا قابل اطمینان طریقے سے اعلان کر دے تو ہم ورکنگ کمیٹی کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ سول نافرمانی بند کر دے یعنی بعض خاص قوانین کی نافرمانی جو محض قانون شکنی کی غرض سے کی جاتی ہے۔ مگر بدیسی کپڑے اور شراب کی فروخت کی ممانعت نہ کر دے۔ عام لوگوں کو نمک بنانے کی اجازت ہوگی اور نمک کے قانون کی تعزیزی دفعات نافذ نہ کی جائیں گی۔ حکومت کے یا نجی نمک کے کارخانوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) سول نافرمانی کے بند کرنے کے ساتھ ساتھ:۔

(الف) تمام ستیا گرہی اور دوسرے سیاسی قیدی، خواہ وہ جیل میں ہوں یا حوالات میں جو تشدد یا ترغیب تشدد کے مجرم نہیں ہیں رہا کر دیئے جائیں۔

(ب) جو املاک قانون، قانون مطبع اور قانون مالگزاری وغیرہ کے ماتحت ضبط کی گئی ہے وہ واپس کر دی جائے۔

(ج) جرمانے اور ضمانت کی رقمیں جو سزا یافتہ ستیہ گرہیوں یا پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں سے وصول کی گئی ہوں واپس کر دی جائیں۔

(د) تمام ملازم جن میں دیہات کے مقدم، چوکیدار وغیرہ بھی شامل ہیں، جو سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں مستعفی یا برطرف ہوئے ہوں اور دوبارہ حکومت کی ملازمت کرنا چاہتے ہوں بحال کر دیئے جائیں۔

(نوٹ) یہ دفعات ترک موالات کے زمانے میں بھی عائد ہوں گی۔

(۵) وائسرائے کے جاری کئے ہوئے تمام تعزیری ضابطے منسوخ کردیئے جائیں

(۴) مجوزہ کانفرنس کی نمائندگی اور اس میں کانگرس کی شرکت کا مسئلہ اسی وقت طے ہو سکتا ہے جب مندرجہ بالا مقدمات کا قابل اطمینان تصفیہ ہو جائے۔

آپ کے مخلص

موتی لال نہرو

م۔ک۔گاندھی

سروجنی نائڈو

ولبھ بھائی پٹیل

جے رام داس دولت رام

سید محمود

جواہر لال نہرو

ضمیمہ ج

عہد آزادی کی تجدید کا رزولیوشن

۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء

ہم باشندگان فخر و مسرت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم دل سے شکر گزار ہیں۔ ہندوستان کے ان بیٹوں اور بیٹیوں کے جنھوں نے مادر وطن کی آزادی کی خاطر تکلیفیں جھیلیں اور قربانیں کیں، اپنے جلیل القدر اور محبوب رہنما مہاتما گاندھی کے جن کے فیض ہدایت نے ہمیں بلند مقصد اور برتر سعی کی راہ دکھائی۔ ان سیکڑوں بہادر نوجوانوں کے جنھوں نے اپنی جان آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دی یعنی پشاور اور کل صوبہ سرحد، شولاپور، ضلع مدنا پور اور بمبئی کے شہیدوں کے ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے جنہوں نے دشمنوں کے وحشیانہ لاٹھی چارج کی چوٹیں کھائیں گڑھوالی رجمنٹ اور فوج اور پولیس کے اور سپاہیوں کے جنھوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے بھائیوں پر گولی چلانے اور کسی قسم کی سختی کرنے سے انکار کردیا، گجراب کے ان جرار کسانوں کے جنھوں نے نہایت ثابت قدمی سے ہر طرح کی تخویف اور تشدد کا مقابلہ کیا، ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بہادر اور مظلوم کاشتکاروں کے جنھوں نے انتہائی سختیوں کے باوجود جنگ آزادی میں پورا پورا حصہ لیا، ان تاجروں اور کاروباری لوگوں کے جنہوں نے سخت نقصان اٹھا کر قومی تحریک خصوصاً بدیسی کپڑے اور برطانوی مال کے بائیکاٹ میں مدد دی، ان ایک لاکھ مردوں اور عورتوں کے جنہوں نے جیل جا کر ہر قسم کی تکلیفیں اٹھائیں اور کبھی کبھی جیل کے ملازموں کے ہاتھ مار تک کھائی خصوصاً عام رضا کاروں کے جنہوں نے ہندوستان کے سچے سپاہیوں کی طرح بغیر شہرت یا انعام کی امید کے محض اپنے اعلیٰ مقصد کی خاطر سخت دقتوں کے باوجود محنت اور استقلال سے ملک وقوم کی خدمت

انجام دی۔

اور ہم اعتراف کرتے ہیں انتہائی عقیدت اور احترام کا ہندوستان کی عورتوں سے جنھوں نے مصیبت کے وقت مادر وطن کی مدد کرنے کے لیے اپنے گھروں کے امن و آرام کو خیر آباد کہا اور ہندوستان کی فوج کی صف اول میں مردوں کے دوش بدوش جا کر کھڑی ہوئیں کہ جانبازی اور فتح میں ان کے ساتھ شریک ہوں اور ہم فخر کرتے ہیں اپنے ملک کے نوجوانوں اور روانر سینا کے بچوں پر جنھوں نے اپنی کم سنی کے باوجود حصہ لیا اور شہادت پائی۔

اور آخر میں ہم خوشی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں اس بات کا کہ ہندوستان کے سب چھوٹے بڑے فرقے اور طبقے اس عظیم الشان جنگ میں شریک ہیں اور انھوں نے اس کے لیے بیش بہا قربانیاں کیں خصوصاً اقلیتوں یعنی مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور دوسرے فرقوں کے جنھوں نے اپنی بہادری اور مادر وطن کی وفاداری کا ثبوت دے کر ایک متحدہ قوم کی بنیاد ڈالی جو اپنی فتح کا یقین رکھتی ہے۔اور اس پر تلی ہوئی ہے کہ ہندوستان کو آزاد کرائے اور آزاد رکھے اور اس آزادی سے یہ کام لے کہ ہندوستان کے تمام طبقوں کی بیڑیاں کٹ جائیں اور ان کے حقوق کا فرق و امتیاز کٹ جائے جو حقیقت میں ساری نوع انسانی کی خدمت ہے۔ہندوستان کی خاطر قربانی اور جان بازی کی ان شاندار جوش آفریں مثالوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنے عہد آزادی کی تجدید کرتے ہیں اور مصمم ارادہ کرتے ہیں کہ اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک ہندوستان کو کامل آزادی حاصل نہ ہو جائے۔

--------The End--ختم شد------